بچے کی دعا

(از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ام اے پی

یا اللہ میں اپنے دل کا حال تجھ سے کہتا ہوں۔ اور کس
ناوان سمجھتے ہیں۔ کوئی میری بات نہیں سُنتا۔ مگر سُنا ہے کہ
سُنتا ہے۔

یا اللہ جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو مجھے بڑا ڈر لگتا ہے۔ میں چھوٹا سا
آس پاس بڑی بڑی ڈراونی چیزیں ہیں:۔ اندھیری رات، اونچا
کالے بادل، تیز ہوائیں، گہرے دریا۔ یہ چیزیں اور ان کا خیال ب
ہے۔ مگر یہ سب چیزیں تو نے پیدا کی ہیں اور مجھے بھی تو ہی نے پیدا کیا ہے۔ یہ بھی تیر
ہیں اور میں بھی تیرا ہوں مجھے اتنی سمجھ دے کہ انھیں اپنا دوست سمجھوں اور اتنی ہمت
دے کہ انھیں دیکھ کر نہ ڈروں۔

یا اللہ مجھے ہر طرف ہزاروں آدمی، مرد، عورتیں، بچے نظر آتے ہیں، ان میں تھوڑے ایسے
ہیں جنھیں میں جانتا ہوں اور جو مجھے جانتے ہیں میرے ماں باپ، اور عزیز، مدرسے کے لڑکے
اور استاد۔ باقی اور لوگ نہ جانے کون ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر میرا جی گھبراتا ہے۔
مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ سب تیرے بندے ہیں اور میں بھی تیرا بندہ ہوں۔ یا اللہ ایسا کر کہ
یہ سب مجھے جان جائیں اور میں انھیں جان جاؤں اور یہ مجھ سے محبت کریں اور میں ان

ہر میں انھیں دیکھ کر گھبراؤں گا نہیں بلکہ خوش ہوں گا۔ تیری دنیا میں

پنا کام بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ صبح سویرے اُٹھنا، ورزش کرنا، نہانا، ےسے کا سبق یاد کرنا، پانچ وقت نماز پڑھنا، ماں باپ کو استادوں ھیوں کو سب کو خوش رکھنا۔ اب تو یہ ہے اور جب بڑا ہو جاؤں گا تو روپیہ بڑے گا۔ اپنے عزیزوں کی اور قوم کی خدمت کرنی ہوگی اپنے ملک کی آزادی کے ے لڑنا ہوگا۔ یہ سارے کام بڑے کٹھن ہیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ دوسرے یہ سب کچھ کرتے ہیں اور وہ بھی میرے جیسے آدمی ہیں۔ یا اللہ میرے دل میں یہ امید پیدا کر دے تو سارے کام میرے لئے آسان ہو جائیں گے اور میں انھیں ہنستے کھیلتے کروں گا۔

یا اللہ ہمت، محبت، اُمید یہ تین چیزیں مجھے دے دے۔ میرے لئے مانگنا جتنا سہل ہے تیرے لئے دینا اُس سے زیادہ سہل ہے تیرے ہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ تو بڑا دینے والا ہے ؎

بچوں سے

(از جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہٗ)

سالہا سال سے بچوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد میں تمھیں یہ نصیحت کرتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس پر کاربند ہوئے تو تمھارا ذہن پوری نشو و نما پائے گا اور تم بڑے ہو کر اچھے آدمی بنوگے، تمھاری سیرت پر کوئی ایسے پردے نہ پڑیں گے جو اُس کی اصلیت کو چھپائیں۔ اور وہ نصیحت یہ ہے کہ تم اکیلے ہو یا اوروں کے ساتھ اپنے کمرہ میں ہو یا مدرسے میں، یا کھیل کے میدان میں ہر جگہ اور ہمیشہ وہ کرو جو سچ مچ تمھارا من چاہتا ہے۔ اپنی اصلی دلی خواہشوں کو دباؤ مت دوسروں سے ڈر کر یا دوسروں کو خوش کرنے کی خاطر دوسروں کی خواہ مخواہ نقالی نہ کرو۔ خود اپنی اُپج سے کام کرو۔ ایسا کروگے تو تمھارا ذہن، تمھاری سیرت، تمھارا جسم، سب کے سب وہ اچھی سے اچھی شکل اختیار کریں گے جن کے حاصل کرنے کی صلاحیت و قدرت، ان میں رکھی ہے

سُلطانُ العلوم

(- از جناب احمد اللہ صاحب قادری ایڈیٹر تاریخ ۔ حیدرآباد دکن)

حیدرآباد اور حیدرآباد کے بادشاہ کا نام تم نے سنا ہوگا، اور یہ بھی جانتے ہوگے کہ حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست ہے۔

حیدرآباد کی شہرت اس وجہ سے بھی قایم ہے کہ وہاں کے بادشاہ، اعلیٰ حضرت قدر قدرت، سلطان العلوم، نواب میر عثمان علی خان بہادر مدظلہ العالی آصف جاہ ہفتم بڑے مدبر اور ہردلعزیز فرمان روا ہیں۔ آج دنیا میں کوئی بادشاہ ان کے برابر محبوب خلایق نہیں ہے۔

"شاہان حیدرآباد" کا خاندان تاریخ میں "خاندان آصفیہ" کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور انگریز مورخ "نظام حیدرآباد" کے نام سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ جب مغلوں کی سلطنت تباہی کے قریب ہوگئی تو اس خاندان کو قدرت نے ان کا جانشین بناکر دکن پر حکمرانی کے لئے بھیجا۔

ہندوستان میں جب انگریزوں کے قدم پوری طرح نہیں جمے تھے۔ اس وقت شاہان آصفیہ تمام جنوبی ہند کے مالک و مختار تھے اور ہندوستان کا تقریباً آدھا حصہ ان کے قبضہ و اقتدار میں تھا۔ اب سے کوئی پونے دو سو سال پہلے آصفیہ سلطنت مالوے سے راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں مدراس، میسور، ارکاٹ، ترچناپلی، سری رنگاپٹم، پانڈیچری، تنجاور، بیجاپور اور کرنول بھی شامل تھے۔ خلیج بنگالہ اور ساحل کارومنڈل کی بندرگاہیں شاہان آصفیہ کے زیرنگیں تھیں، جہاں ساری دنیا کے جہاز آکر لنگرانداز ہوتے تھے۔ یہاں تجارت کی خوب گرم بازاری تھی، چین سے لے کر انگلستان تک کل دنیا کا سامان، ان بندرگاہوں میں آیا کرتا تھا۔ یہاں کی مصنوعات و پیداوار غیر ممالک میں بھیجی جاتی تھیں۔

رفتہ رفتہ یہ مقامات شاہان آصفیہ کے قبضے سے نکلتے گئے۔ اس کے اسباب ہر وہ

عالب علم سمجھ سکتا ہے۔ جس کو تاریخ سے خاص ذوق ہو۔

یہ واقعات بہت اہم ہیں۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ اس میں حکومت کی کمزوری، امیروں کی سازش، حکام کی غداری اور انگریزوں کی سیاست کو بہت کچھ دخل ہے۔ جب تم بڑے ہو کر ہندوستان کی تاریخ غور سے پڑھو گے تو یہ باتیں خود بخود معلوم ہو جائیں گی۔ اب میسور و تنجاور پر راجہ حکمرانی کرتے ہیں۔ پانڈیچری، فرانسیسیوں کے قبضہ میں ہے۔ دوسرے علاقوں پر خود انگریز قابض متصرف ہیں۔

برار، حکومت نظام کا ایک صوبہ ہے، جس کا رقبہ سوئیزرلینڈ سے بڑا ہے۔ صرف اس کے محاصل پر وسط ہند کے انتظامات کا دار مدار ہے۔ اس کو انگریزوں نے حضور نظام سے پٹہ پر لے لیا ہے۔ اس کی آمدنی سے جو رقم بچ جاتی ہے۔ اس سے ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ حکومت نظام کو دئے جاتے ہیں اور برار پر اعلیٰ حضرت کی بادشاہی مسلم ہے۔ اور ان کی سالگرہ کے موقع پر ہر سال یہاں کے ہیڈکوارٹر پر، پرچم آصفی لہرایا جاتا ہے۔

حیدرآباد کا رقبہ اس قدر گھٹنے پر بھی بہت بڑا ہے۔ اگر ایک شخص اس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل سفر کرے تو یہ مسافت ڈیڑھ مہینے میں طے ہوگی

حیدرآباد کا موجودہ رقبہ برار کو خارج کرنے کے بعد بیاسی ہزار چھ سو اٹھانوے (۸۲۶۹۸) مربع میل ہے۔ اگر برار شامل کر لیا جائے تو ایک لاکھ چار سو آٹھ (۱۰۰۴۰۸) مربع میل ہوتا ہے۔ یہ اتنا بڑا رقبہ ہے کہ ہندوستان کی ریاستیں تو کیا، یورپ کی بڑی سلطنتیں بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ انگلستان، اسکاٹ لینڈ، بلجیم اور ہالینڈ ان چاروں ممالک کو اگر ایک جا کیا جائے تب جا کر یہ، حیدرآباد کے برابر ہوں گے۔

سارے ہندوستان میں صرف حیدرآباد ہی ایک بے نظیر ریاست ہے جو خود مختار ہے۔ یہاں حضور نظام کی اپنی ریل ہے۔ سکہ ڈبہ[۵] بھی انہی کا جاری ہے۔ یہاں کے عہدہ داروں کو جو تنخواہیں دی جاتی ہیں، صرف ان کو جمع کیا جائے تو یہ خرچ بڑی بڑی ریاستوں کی آمدنی سے بڑھ جائے گا۔ یہاں کے وزیر اعظم کی تنخواہ گیارہ ہزار ہے، جو مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے گورنر سے بھی زیادہ ہے۔ وزراء کو چار پانچ ہزار کے درمیان تنخواہ دی جاتی ہے۔ سات وزیر ہیں اور ہر وزیر کے کئی معتمد (سکرٹری) ہیں۔ بعض معتمدوں کی تنخواہیں ساڑھے تین ہزار بھی ہیں۔ ہائی کورٹ و جوڈیشل کمیٹی میں بارہ جج اور ایک چیف جسٹس ہے

---

۵ خاص حیدرآبادی لفظ ہے۔ ڈاک کو کہتے ہیں ڈبہ خانہ ڈاک خانہ۔

ن کی تنخواہ تقریباً ساڑھے تین ہزار ہے ججوں کو
ہزار دیئے جاتے ہیں۔ اس کے ماسوا سیشن جج
ایٹ و سب مجسٹریٹ ہیں۔ جن کی تعداد بہت
یادہ ہے۔

حضور نظام سے متوسل جو امرا ہیں وہ خود اتنے
ب القدر ہیں کہ ان میں سے بعض کی اسٹیٹ کی
نہ آمدنی ۴۰ - ۲۷ - ۱۸ - ۱۱ - لاکھ کے درمیان ہے

. . . . کئی راجہ ایسے
ہیں جن کی اسٹیٹ کی آمدنی ۵ سے ۸ لاکھ تک
ہے۔ اس سے کم آمدنی کی اسٹیٹ بھی بہت ہیں۔

حضور نظام چونکہ ایک زبردست فرماں روا ہیں
اس لئے آپ ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ آپ کا خاندان
اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ بادشاہی و شاہی اس خاندان میں
کئی سو برس سے چلی آرہی ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب خلیفہ
اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔
حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ جو مشہور صوفی تھے
آپ کے اجداد سے ہیں۔ شیخ شہاب الدین وہ بزرگ ہیں
جن سے اسلام کو بہت تقویت پہنچی۔

حضرت شیخ شہاب الدین بادشاہ نہیں، درویش
تھے، مگر آپ کی آمدنی اتنی تھی کہ موجودہ زمانہ میں کسی
بڑے سے بڑے بادشاہ کو بھی اس کی ذات کے لئے
اتنی رقم نہیں ملتی ہوگی۔ آپ کو روزانہ ایک ہزار طلائی
دینار ملا کرتے تھے۔ ایک طلائی دینار آج کل کے ایک
پونڈ کے مساوی ہے۔ اگر اس کے روپے کئے جائیں تو
تیرہ ہزار سے بھی زیادہ ہوں گے۔ آپ وہ رقم اسی
روز راہ خدا میں خیرات فرما دیتے تھے اور غروب آفتاب
تک اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں بچتا تھا۔ جب
آپ کا وصال ہوا، اس وقت آپ کے پاس کل سات
دینار تھے۔

حضور نظام کے اجداد میں شیخ عزیزان بھی بہت
مشہور بزرگ ہوئے ہیں۔ سلاطین شیبانیہ کے زمانہ
میں ماوراالنہر کی مذہبی ریاست ان سے وابستہ تھی۔
شیخ عزیزان کا خاندان تقریباً سو برس تک باشندگان
سمرقند و بخارا کا دینی پیشوا رہا تھا۔ شیخ عزیزان کی
عبادت اور تقدس کی یہ کیفیت تھی کہ ان کے آگے
بادشاہوں کی گردنیں جھکا کرتی تھیں۔ عبداللہ خاں
جو بخارا کا بادشاہ تھا وہ ایک دن ان کی خدمت میں
اس طرح حاضر ہوا کہ اس کے گلے میں رسی بندھی تھی،
جس کا سرا غلام کے ہاتھ میں تھا۔ اب آپ غور فرمائے
کہ ایک بادشاہ جب ایک درویش کے سامنے
اس طرح آئے تو وہ درویش کس پایہ کا ہوگا؟

سلطنت آصفیہ کے بانی یعنی اس کو قائم
کرنے والے نواب قمر الدین خان بہادر تھے جو آصف
جاہ اول کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کو محمد شاہ
بادشاہ (دلی) نے اپنا وکیل مطلق بنایا تھا۔ آپ نے

وکالت مطلقہ چار سال انجام دی۔ یہ عہدہ دربار مغلیہ کا سب سے
اعلیٰ منصب تھا وزیر، میر بخشی وغیرہ سب اس کے ماتحت ہوا
کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ دکن چلے آئے۔ جب سلطنت
مغلیہ بد اندیش امرا کی وجہ سے کمزور ہوگئی تو آپ نے اقتضائے
وقت کے مد نظر اور سلطنت مغلیہ کے نام کو باقی رکھنے کے
لئے اپنی بادشاہت کا اعلان فرمایا۔ جس کو کم و بیش دو سو
برس ہو چکے۔ آپ کے انتقال (۱۱۶۱ھ) کے بعد آپ کے
صاحبزادے نواب ناصر جنگ بہادر بادشاہ ہوئے اور
سلسلہ بہ سلسلہ یہ بادشاہی موجودہ حضور نظام کو ملی۔ آپ
اس سلسلے کے دسویں بادشاہ ہیں۔ ۵ اپریل ۱۸۸۶ء کو
پیدا ہوئے۔ اپنے والد بزرگوار نواب میر محبوب علی خان رح
کی وفات کے بعد ۲۹ اگست ۱۹۱۱ء کو ستائیس سال کی
عمر میں مسند شاہی پر بیٹھے۔

آپ نے تخت نشین ہونے کے بعد حیدرآباد کو خوب
سنوارا۔ آپ کے عہد میں حیدرآباد نے جو حیرت انگیز ترقی کی
ہے، اس کو دیکھ کر ہندوستان کے وائسرائے کی عقل بھی دنگ
ہوگئی تھی۔ یعنی حیدرآباد اب طلسمات بن گیا ہے۔ سڑکیں لمبی
اور چوڑی ہیں، ان کی تیاری پر کئی کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے،
جو ساری کی ساری سمنٹ کی ہیں۔۔۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔

قحط روکنے اور ملک کو زرخیز بنانے کے لیے حضور
نے کروڑہا روپیہ صرف کرکے تالاب اور نہریں از سر نو تعمیر
کرائیں۔ حمایت ساگر اور عثمان ساگر کے نام سے دو تالاب
شہر سے بارہ میل کے فاصلے پر بنوائے، جن سے کھیتیاں
بھی سینچی جاتی ہیں۔ شہر سے کوئی ایک سو بیس میل دور ضلع
نظام آباد میں نظام ساگر تعمیر کرایا گیا۔ یہ بہت بڑا تالاب ہے،
جس کے لئے کئی لاکھ ایکڑ زمین خریدی گئی ہے۔ یہ تالاب
نہ صرف حیدرآباد بلکہ سارے ہندوستان کے تالابوں سے
بڑا ہے۔

موجودہ اعلیٰ حضرت کے زمانہ میں کئی عالیشان
عمارتیں تعمیر ہوئی ہیں۔ جن میں عثمانیہ یونیورسٹی، دواخانہ
عثمانیہ، ہائی کورٹ اور کتب خانہ آصفیہ کی عمارتیں بے نظیر ہیں۔

آپ کے زمانے میں کئی جدید محکمے قائم ہوئے۔ جن
کے نام نیچے درج کئے جاتے ہیں:-

۱۔ محکمہ آثار قدیمہ - ۲۔ محکمہ معلومات عامہ
۳۔ محکمہ آرائش بلدہ - ۴۔ محکمہ تالیف و ترجمہ
۵۔ عثمانیہ یونیورسٹی

حضور کا سب سے بڑا اور درخشاں کارنامہ عثمانیہ
یونیورسٹی کا قیام ہے جس میں اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔
یہ تمام ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی یونیورسٹی ہے۔ یہ ا
زندہ جاوید کارنامہ ہے، جس پر حیدرآباد ہمیشہ فخر کرتا رہے
گا۔ یونیورسٹی کی تعمیر سے قبل اس کے لئے جو منصوبے
باندھے گئے تھے اس کو سن کر تم یقیناً حیرت کرو گے
بڑے بڑے ماہرین تعمیر صرف اس فکر میں برسوں رہے کہ
یونیورسٹی کی عمارت کیسی ہونی چاہیے۔ اس کے نقشے پر غور
کرنے کے لئے دو انجینیر مغربی یونیورسٹیوں کی عمارتیں دیکھنے

کے لئے یورپ بھیجے گئے۔ اس کے بعد کہیں اس کا نقشہ تیار ہوا۔ جس سے اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی عمارت شہر سے کوئی سات میل کے فاصلہ پر ایک بلند و پر فضا مقام پر واقع ہے۔ اب یہ خود ایک اچھا خاصا شہر بن گئی ہے۔ اس میں تعلیم دینے کے لئے ہزار ہزار روپے کے کئی پروفیسر نوکر ہیں۔ پرنسپل کو تقریباً تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے۔ اس کے رہنے کے لئے ابھی حال میں ستر ہزار روپیہ کا مکان حدود یونیورسٹی میں تعمیر ہوا ہے۔ یونیورسٹی کے کاغذات اور نصاب کی کتابیں چھاپنے کے لئے خاص یونیورسٹی کا اپنا پریس ہے جس کا سالانہ خرچ ستر ہزار کے قریب ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو زبان کو جو تقویت، استحکام اور فروغ حاصل ہوا ہے اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ علاوہ اس کے حضرت سلطان العلوم نے علم کی روشنی پھیلانے میں وہ کام کیا ہے جو شاید ہی کسی امیر یا بادشاہ نے کیا ہو۔ ہندستان کے بہت سے مفید ادارے آپ کی سرپرستی کی بدولت چل رہے ہیں۔ جامعہ ملیہ دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بھی آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہیں مسلم یونیورسٹی کے تو آپ چانسلر بھی منتخب ہوئے ہیں۔ خود حیدر آباد میں اپنی رعایا کی تعلیم میں لاکھوں روپیہ سالانہ خرچ کرتے ہیں۔ پہلے حیدر آباد کے مدرسوں میں ایک لاکھ طالب علم بھی مشکل سے پڑھتے ہوں گے لیکن حضرت سلطان العلوم کے مبارک زمانے میں تھوڑے ہی دنوں میں یہ تعداد کئی لاکھ تک پہنچ چکی ہے پھر جامعہ عثمانیہ کی بدولت ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

حضور اور ان کی سلطنت کے حالات مختصر نہیں ہیں کہ دو چار صفحوں میں آ جائیں۔ ان کے لکھنے کے لئے سینکڑوں صفحے چاہئیں۔ حضور کی داد و دہش کے قصے تم نے اخباروں میں ضرور پڑھے ہوں گے۔ حضور کی خیرات اتنی ہے کہ ساری دنیا میں حضور کے وظیفہ خوار پائے جاتے ہیں غرض کہ حضور کی سخاوت نے حاتم کے نام کو بھلا دیا ہے۔ اس حیثیت سے حضور نظام نہ صرف حیدر آباد کے سلطان ہیں بلکہ وہ کل عالم اسلامی کے سلطان ہیں! ان کی بے تعصبی، حق رسی، نیک نفسی اور سادگی کا سکہ تمام دنیا پر بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی خیر و خوبی و سلامتی نہ صرف مسلمان ہی چاہتے ہیں بلکہ ہر مذہب و ملت کا آدمی آپ کے لئے دست بہ دعا ہے۔

ہماری دعا ہے کہ ہمارے سروں پر حضور کا سایہ تا دیر سلامت رہے اور آپ کی آل اولاد بھی آپ ہی کی طرح کامران رہے۔ .... آمین ثم آمین

مولانا حالی

یہ مضمون ہم نے مولانا حالی مرحوم کی نواسی مسز صالحہ عابد حسین صاحبہ سے لکھوایا ہے۔ ہم موصوفہ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست قبول فرمائی۔ اور ایسا اچھا مضمون لکھ دیا۔ (ایڈیٹر)

تم نے اپنی کورس کی کتابوں میں کوئی نہ کوئی نظم یا مضمون مولانا حالی کا ضرور پڑھا ہوگا۔ شاید اپنے بزرگوں کو بھی مولانا حالی کی نظم پڑھتے اور اُن کا ذکر کرتے سنا ہو۔ آؤ آج ہم تمھیں ان بزرگ کا تھوڑا سا حال سنائیں۔

آپ کا نام خواجہ الطاف حسین اور تخلص حالی تھا۔ آپ بڑے مشہور شاعر اور زبردست مصنف تھے، اور آپ کی شاعری اور نثر دونوں قومی محبت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

آپ کا وطن پانی پت ہے جو ایک تاریخی مقام ہے اور جس کا ذکر تم نے اپنی تاریخ کی کتاب میں ضرور پڑھا ہوگا آپ کے والد کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا تھا آپ کے بڑے بھائی نے آپ کو پرورش کیا۔ اور ان ہی کی نگرانی میں تعلیم شروع ہوئی۔ اُس زمانے میں آج کل کی طرح اسکول اور کالج نہ تھے، اور نہ تعلیم حاصل کرنا ایسا سہل تھا جیسا اب ہے۔ اس وجہ سے مولانا حالی کو اپنی تعلیم میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ مگر آپ کے سچے شوق نے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔ اردو فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم آپ نے پانی پت ہی میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی آ گئے اور یہاں علم کی پیاس جس طرح ممکن ہوا

بہلاتے رہے۔ کچھ دنوں میں اتنا علم حاصل کر لیا کہ عربی، فارسی پر پورا عبور ہو گیا جس روانی سے اردو لکھ پڑھ سکتے تھے اسی طرح عربی اور فارسی لکھنے پڑھنے لگے۔

آپ کو قدرت کی طرف سے شعر کہنے کا مادّہ عطا ہوا تھا۔ مرزا غالبؔ ہندوستان کے بڑے مشہور شاعر گذرے ہیں وہ لوگوں کو شعر کہنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر حالی کی ایک غزل سُن کر انھوں نے کہا "اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر بہت ظلم کروگے" اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ زبردستی تک بندی کر کے شاعر نہیں بنے۔ بلکہ بنے بنائے شاعر تھے آپ عام شاعروں کے خلاف مبالغے اور جھوٹے خیالات سے پرہیز کرتے تھے اور نظم و نثر دونوں میں سچی اور سیدھی باتیں بیان کرتے تھے۔ نظم میں مولانا کا ایک دیوان اور بہت سی متفرق نظمیں، قصیدے، رباعیاں ہیں، نظموں میں بیوہ کی مناجات

چپ کی داد، برکھارت وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت آپ کی جس نظم نے حاصل کی ہے وہ **مُسَدّسِ حالی** ہے۔ قوم کی حالت کا یہ مرثیہ انھوں نے سرسید مرحوم کی فرمائش پر لکھا تھا اس میں انھوں نے مسلمانوں کے بڑھنے اور گھٹنے کا نقشہ کھینچا ہے اور اسلام کے سچے اور سادے اصول بیان کئے ہیں۔ مسلمانوں کی پستی افلاس اور ذلت کا حال اس قدر موثر پیرائے میں دکھایا ہے کہ جو پڑھتا ہے بے چین ہو جاتا ہے اس مسدس کے اب تک سیکڑوں اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں۔ اور ملک کی بہت سی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا ہے۔

علاوہ شاعر ہونے کے آپ بڑے مصنف بھی تھے، 'حیات سعدی'، 'یادگارِ غالبؔ'، 'حیات جاوید' (سرسید کی سوانح عمری)، مقدمہ شعر و شاعری، مجالس النسا

وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ جو ہندوستان میں بہت مقبولیت حاصل کر چکی ہیں اس کے علاوہ بہت سے مختلف مضامین ہیں جن کا مجموعہ حال ہی میں "مقالات حالی" کے نام سے انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔

مولانا حالی سرسید مرحوم کے بڑے رفیق اور مددگار تھے۔ علی گڈھ کالج کے قائم کرنے اور سرسید کے قومی اور تعلیمی خیالات کے پھیلانے میں انھوں نے بہت مدد دی۔ مولانا کی ذات میں وہ ساری خوبیاں جمع تھیں جو ایک سچے مسلمان میں ہونی چاہئیں۔ سخاوت، مروت، محبت خاکساری، سادگی تو اُن کے حصے کی چیزیں تھیں۔ کسی کام کے کرنے کو عیب نہ سمجھتے تھے۔ اور ضرورت کے وقت خدمت گار کا کام خود کر لیتے تھے۔ نوکروں سے عزیزوں کی طرح برتاؤ کرتے تھے جو ایک مرتبہ آپ کے یہاں نوکر ہو جاتا تھا وہ کبھی نوکری چھوڑنے کا نام نہ لیتا تھا آپ ہر شخص کی مدد کرنے کو تیار رہتے تھے خواہ وہ خود مدد چاہے یا کسی ذریعے سے اس کی ضرورت کا علم ہو جائے، ان کی طبیعت کی نیکی اور صلح جوئی کا کچھ اندازہ تمھیں اس بات سے بھی ہوگا کہ وہ اپنے مخالفوں کے ساتھ بھی بُرا سلوک کرنے کے روا دار نہ تھے چوں کہ مولانا اس زمانے کی عام شاعری کی جو سراسر زنگین تھی بہت مذمت کرتے تھے اور وہ شاعری اس وقت بہت مقبول تھی۔ اس لئے بہت سے پرانے خیالات کے لوگ آپ کے مخالف ہو گئے تھے وہ اخباروں میں آپکے خلاف بہت کچھ نامہذب باتیں لکھا اور لکھوایا کرتے تھے۔ مگر مولانا نے کبھی ان کی کسی بات کی پروا نہیں کی۔ نہ جواب دیا بلکہ کبھی کبھی آپ کے دوست کہتے کہ آپ خود ان لوگوں کی باتوں کا جواب نہیں دیتے تو ہم کو تو اجازت دیجئے کہ ہم اس کا جواب

دیں۔ مگر آپ نے ہمیشہ ان سب کو منع کر دیا اور فرمایا کہ میرا اور تمھارا کیا ہرج ہے جس کا جو دل چاہے کہنے دو۔

مولانا کو بچوں سے بہت محبت تھی خاندان میں جس قدر بچے تھے اُن سب کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھتے تھے اگر کوئی بیمار ہوتا تو ہر طرح اس کی تیمار داری دوا علاج اور دل جوئی کرتے تھے آپ کے چھوٹے نواسے بچپن ہی سے ایک سخت مرض میں گرفتار رہے اُن کی تیمار داری اور علاج میں مولانا کو بڑی بڑی تکلیفیں اُٹھانا پڑیں۔ مگر آپ نے ہمیشہ ہر بات کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

مولانا کے خطوط کا مجموعہ، جو چند سال ہوئے شائع ہوا ہے اس کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ہمارے رسول صلعم کی طرح بچوں پر کس قدر شفقت کرتے تھے۔ ہر خط میں کسی کو پڑھنے کی ہدایت ہے کسی کو ورزش اور کھیل کی تاکید ہے کہیں پیار اور محبت سے سمجھایا ہے۔ کہیں سختی اور تنبیہہ سے کام لیا ہے۔

خواجہ غلام الثقلین مرحوم کی منجھلی صاحب زادی سیدہ خاتون (مرحومہ) سے آپ کو بہت محبت تھی اور ان کے متعلق ایک بڑی دل کش نظم لکھی تھی جو "جواہرات حالی" میں شائع ہوئی ہے۔

اپنے نواسے خواجہ غلام السیدین کو بھی بہت چاہتے تھے۔ آپ اپنے مکان کی اوپر کی منزل میں رہا کرتے تھے۔ جب سیدین صاحب کی والدہ مولانا کے ہاں جاتیں تو اکثر ایسا ہوتا کہ سیدین صاحب نیچے سے پکارتے " بابا" اور مولانا اوپر سے باوجود اپنی ضعیفی اور کم زوری کے اُتر کر آتے اور انھیں پیار کر کے واپس چلے جاتے، یہ بچوں کی عادت کے موافق پھر پکارتے "بابا" اور مولانا پھر اوپر سے اُتر کر آتے اسی طرح جتنی مرتبہ یہ پکارتے وہ زینے سے اترتے اور اُنھیں پیار کر کے چلے جاتے

ان کی طبیعت یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ بچہ پکارے اور وہ اس کو اوپر ہی سے جواب دے دیں۔

اب مولانا کے انتقال کو بیس برس اور آپ کی پیدائش کو پورے سو برس گذر گئے ہیں۔ اس اکتوبر کی ۲۶ اور ۲۷ تاریخ کو پانی پت میں مولانا کی صد صالہ جوبلی کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا جائے گا اور ہندوستان کے بڑے بڑے لوگ اس میں شریک ہو کر مولانا سے اپنی عقیدت مندی کا اظہار کریں گے۔ اور اس طرح ان قابل قدر قومی اور ادبی خدمات کا شکریہ ادا کریں گے جو مولانا حالی نے اپنی زندگی میں انجام دی تھیں۔ اس موقع پر یہ کوشش بھی کی جائے گی کہ حالی مسلم ہائی اسکول کو جو ان کی یادگار کے طور پر اُن کے وطن میں قائم کیا گیا ہے زیادہ ترقی دی جائے اور اس کی مالی حالت درست ہو جائے

بچو! دعا کرو کہ خدا حالی کی قوم کو اتنی توفیق عطا کرے کہ وہ اپنے اس محسن کو فراموش نہ کرے اور یہ چھوٹی سی یادگار بڑھ کر ایک بڑا تعلیمی مرکز بن جائے جہاں سے طالب علم حالی کا سا دل اور دماغ لے کر نکلیں۔ خدا ساری قوم کے بچوں کو حالی کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت فرمائے۔ آمین
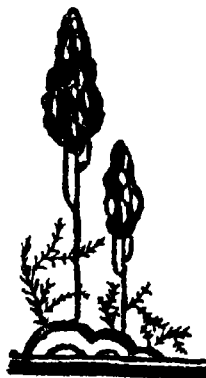
جگنو

(از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیّر، استاد، ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی)

آؤ سنو، اک بات سناؤں ؛ اک دن کے حالات سناؤں
سورج ہم کو چھوڑ چکا تھا ؛ دنیا سے منہ موڑ چکا تھا
رات اندھیری چھائی ہوئی تھی ؛ کالی گھٹا منڈلائی ہوئی تھی
سیر کا سودا سر میں سمایا ؛ گھر سے نکل کر باغ میں آیا
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا تھی باہر ؛ چین ملا اس جی کو پل بھر
باغ میں ہر سُو گھوم رہا تھا ؛ وجد میں تھا دل جھوم رہا تھا
پھول بنی تھیں کلیاں کھل کر ؛ جھول رہی تھیں شاخیں مل کر
کیا میں بتاؤں کیا کیا دیکھا ؛ جگنوؤں کا اک میلا دیکھا
چمکیلے بجلی کے شرارے ؛ اُڑنے والے نور کے پارے
چاند کے ٹکڑے پیارے پیارے ؛ یا چھوٹے چھوٹے انگارے
ننھے ننھے نکھرے نکھرے ؛ جیسے ہوں موتی باغ میں بکھرے
جھم جھم اُن کا دُم چمکانا ؛ دُم چمکانا اور چھپ جانا
جادو اور چھلاوہ کہئے ؛ بچوں کا بہلاوا کہئے

کیا میں بتاؤں کیا ہے جگنو
نیّر شانِ خدا ہے جگنو

اسلام کی کہانی

از جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب ام اے پی ایچ ڈی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ایک باغ تھا بالکل اُجڑا ہوا، ویران، چہار دیواری گری ہوئی، روشیں ٹوٹی پھوٹی، درخت سوکھے ہوئے، پھولوں کی کیاریاں کوڑے کرکٹ اور گھاس پھوس سے بھری۔ جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں اور درخت۔ نہ کوئی درختوں کو پانی دینے والا نہ پودوں کو سینچنے والا۔ غرض ایسی خراب حالت کہ دیکھے سے دحشت ہو۔ مگر تم جانو بارہ برس بعد تو گھورے کے دن بھی پھر جاتے ہیں۔ اس باغ کی قسمت کیوں نہ بدلتی۔ اللہ نے اس کے لئے ایک مالی پیدا کیا ایسا اچھا مالی جس نے بڑی ہی دل سوزی سے اس باغ کو سنوارا جھاڑیوں کو صاف کیا۔ درختوں میں پانی دیا۔ روشیں ٹھیک کیں اور تھوڑے ہی دنوں میں ایسا خوب صورت بنا دیا کہ دیکھے سے نگاہ نہ ٹھہرے بس یوں سمجھو کہ جنت کا نمونہ!

آج سے کوئی تیرہ سو برس پہلے کی بات ہے۔ دنیا کے باغ میں ایسی خزاں آئی ہوئی تھی کہ ہر طرف خاک اُڑتی تھی۔ دل کی بستیاں اُجاڑ ہوگئی تھیں۔ اور روح کی کھیتیاں سب جل چکی تھیں۔ ہر طرف ویرانی تھی اور سناٹا۔ جب آدمی اپنی غفلتوں سے سب کام یوں بگاڑ چکتا ہے تو اس کا بنانے والا کام کو سدھارنے کے لئے اپنا کوئی بہت ہی چہیتا بندہ بھیجتا ہے۔ یہ ہمیشہ سے اس کی عادت رہی ہے۔ اس مرتبہ چوں کہ خرابی کا حال ایسا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ اس لئے اُس نے سدھارنے کے لئے ایسے مالی کو پیدا کیا جس نے اس ویرانے کو پھر گلزار بنا دیا اور آنے والوں کے لئے چمن بندی کا ایسا دستور بھی تیار کر گیا کہ جب پھر غفلتوں اور غلطیوں کی وجہ سے ویرانی پیدا ہو تو اس پہ چل کر اسے درست کیا جا سکے، اللہ کا یہ چہیتا بندہ کون تھا؟ یہ ہمارے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ نے آدمی کو جو غلام تھا آزاد کیا، اس کا سر جو ہر در پر جُھکتا تھا اب صرف اپنے بنانے اور پرورش کرنے والے خدا کے سامنے جھکا تو وہ اور

سب جگہ سر بلند ہو گیا۔ آپؐ نے آدمیوں کو جو اپنی خود غرضیوں کی وجہ سے الگ الگ تھے اور ہمیشہ لڑتے جھگڑتے تھے، ملا کر ایک کر دیا۔ نہ دیس کا فرق باقی رکھا نہ نسل کا، نہ امیر کا نہ غریب کا۔ آپ نے کم زوروں کو زور آوروں سے لا ملایا۔ یتیموں اور غلاموں کو آپ ہی کے طفیل شہر یاری ملی۔ عورتوں کو جنھیں گائے بکری سے زیادہ ذلیل مانا جاتا تھا مرد کے برابر حق دلائے۔ دولت کی تقسیم کا ایسا انتظام کر دیا کہ سب اپنی طاقتوں سے پورا پورا کام لیں پر مفلس اور نادار کوئی نہ رہے۔ سب کو برابر اُبھرنے کا موقع ہو مگر محنت اور صلاحیت کے فرق کی بھی گنجایش باقی رہے۔ لوگ دولت کمائیں تو اُسے اللہ کی امانت جانیں اور اُسے اللہ کی مخلوق کی بہبودی کے کام میں لائیں۔ غرض اُس نے یہ سب سکھایا اور سکھایا ہی نہیں کر کے اور کرا کے دکھلایا۔ اس لئے کہ اُس کی نظر نے اُس کے ساتھیوںؓ کے دل بدل دیئے وہ دن میں اللہ کی مخلوق کے کام کرتے اور دنیا کو سنوارتے تھے تو رات کو اپنے اللہ کے سامنے سجدوں میں پڑے رہتے تھے۔ ان کے بازو مخلوق کی خدمت سے مضبوط تھے تو ان کے ماتھوں پر عبادت گزاری کی پُر نور مہریں تھیں۔ وہ، جن کے سامنے معرکوں میں بڑے بڑوں کے دل دہلتے تھے رات کو اپنے خیموں میں اپنے خدا کی یاد میں زار زار رویا کرتے تھے +

یہی وجہ تھی کہ جب اس سچی راہ دکھانے والے

نے آنکھیں موندیں تو اپنے بعد دنیا کے لئے سچی رہنمائی کا ایک دستورالعمل ہی نہیں چھوڑا بلکہ ایسے آدمیوں کا ایک گروہ بھی چھوڑا، جنھوں نے آپ کی آنکھیں دیکھی تھیں اور اس لئے ان کے دلوں میں نیکی تھی اور نیکی کو پھیلانے کا ولولہ فیض کا جو سرچشمہ مکہ سے نکلا تھا وہ ۶۳۲ء میں جب اللہ نے آپ کو اس دنیا سے اُٹھا لیا کچھ بند نہیں ہوگیا بلکہ اس نے عرب سے باہر بھی ساری دنیا کو سیراب کیا۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے چار جانشینوں، یعنی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ نے جن کے کاموں سے خدا راضی تھا ایران شام اور مصر میں۔ اس پیام کو پہنچایا اور زندگی کو نیکی کا راستہ دکھایا۔

۶۶۱ء میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ جو بنو امیہ کے خاندان سے تھے خلیفہ بن گئے یہ بڑے سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ بنوامیہ کے خاندان میں خلافت کی بنیاد ان ہی نے ڈالی۔ اس خاندان میں چودہ خلیفہ ہوئے جن میں سب سے لائق اور حق پر چلنے والے حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ تھے۔ بنوامیہ کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی حکومت دور دور ملکوں تک پہنچ گئی تھی طارق بن زیاد نے ۷۱۱ء میں اسپین فتح کیا اور فرانس کے جنوبی حصے کو اسلامی حکومت میں شامل کیا اسی سال محمد بن قاسم نے ہندوستان پر حملہ کرکے۔ سندھ، ملتان اور جنوبی پنجاب پر عربوں کی حکومت قائم کی اسی زمانے میں قتیبہ بن مسلم نے تمام وسط ایشیا کو کاشغر کی حدوں تک فتح کیا اور چین کی حکومت کو اپنا باج گذار بنایا۔

یہاں پر ہم تمھیں ایک بات بتا دیں اور وہ یہ کہ مسلمانوں میں سب سے بڑے حاکم یا آں حضرتؐ کے جانشین یعنی خلیفہ کو عام مسلمان منتخب کرتے تھے یہ نہیں ہوتا تھا کہ خلیفہ کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا خلیفہ بنے خلفائے راشدین اسی انتخاب کے ذریعہ خلیفہ بنے تھے۔ امیر معاویہ نے بڑی غلطی یہ کی کہ دستور کے خلاف اپنے بیٹے کو خلیفہ بنا دیا۔ اس سے بنی امیہ کی حکومت میں بہت سی خرابیاں اور کمزوریاں پیدا ہوگئیں، اس لئے کہ مسلمان تو اس کو بڑا سمجھتے تھے جو اچھا ہو۔ رنگ اور نسل کا امتیاز تو اُن میں تھا نہیں۔ اس وجہ سے بھی مسلمان اس حکومت سے ناراض

تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۷۵۰ء میں بنو عباس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ آپ حضرتؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد میں تھے۔

اس خاندان میں ۳۷ خلیفہ ہوئے۔ ان میں سے اکثر بہت اچھی لیاقت اور بڑی سوجھ بوجھ کے لوگ تھے۔ یہ پایہ دارالخلافہ دمشق سے بغداد میں لے گئے۔ یہ شہر خلیفہ منصور عباسی نے بسایا تھا

سلطنت امویہ

خلیفہ ہارون الرشید اور اس کے بیٹے مامون الرشید کے زمانے میں اس نے بڑی ترقی کی۔ یہ خلیفہ خود علم و فن کے بہت قدردان تھے اس لئے بڑے بڑے عالم و فاضل صناع اور کاریگر دور دور سے اس شہر میں کھنچ آئے تھے۔ اس زمانے میں مسلمانوں نے تہذیب و تمدن اور شائستگی میں اتنی غیر معمولی ترقی کر لی تھی کہ دوسری قومیں حیرت سے دیکھتی تھیں۔

خلافت عباسیہ کے شروع زمانے میں بنی امیہ کے خاندان کے ایک شہزادے عبدالرحمٰن نے اسپین میں حکومت قائم کی جو ۱۰۳۱ء تک رہی اس کا دارالخلافہ قرطبہ تھا جو اپنی شان و شوکت میں بغداد کا مقابلہ کرتا تھا۔ جب قوم میں جان ہوتی ہے تو اس کے بھاگے ہوئے غریب الوطن آدمی بھی سلطنتیں قائم کر لیتے ہیں۔

بنو امیہ کی طرح خلافت عباسیہ میں بھی یہ ہی کمزوری تھی کہ باپ کے بعد بیٹا خلیفہ ہوتا تھا۔ اس کی، اور بعض دوسری خرابیوں کی وجہ سے دسویں صدی میں یہ بھی کمزور پڑ گئی، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ۹۴۵ء میں ایک خاندان "بویہ" بغداد پر قابض ہو گیا، اور کوئی ایک سو برس تک خلیفہ کو وظیفہ خوار بنا کر اس کی جگہ حکومت کرتا رہا۔ اس سے کچھ پہلے ۹۱۹ء میں عبداللہ نے شمالی افریقہ میں ایک حکومت قائم کی اور پچاس برس کے اندر اندر مصر و شام کے ملک فتح کر کے مقامات مقدسہ مکے اور مدینے پر قبضہ کر لیا۔ اسی بدانتظامی کے زمانے میں دور دور کے صوبوں کے حاکم آزادی کا پرچم لہرانے لگے، ان میں سب سے مشہور محمود غزنوی ہے۔ جس نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی، غزنی خاندان کے بعد غوریوں نے ہندوستان پر

خلافتِ عباسیہ

متواتر حملے کئے آخر تیرھویں صدی میں اس خاندان کے غلاموں نے ہندوستان میں مستقل حکومت قائم کرلی اور ۱۵۲۶ء تک بہت سے پٹھان خاندانوں نے اس ملک پر حکومت کی ان میں سلطان محمد تغلق بہت مشہور بادشاہ گزرا ہے ۱۵۲۶ء میں مغل بادشاہ بابر نے مغل حکومت قائم کی یہ سلطنت ۱۸۵۷ء تک رہی شروع کے چھ مغل بادشاہوں کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا بہت روشن زمانہ ہے۔ ہندوستان جو خود غرض راجاؤں کی وجہ سے ٹکڑے ہو رہا تھا ان کی وجہ سے ایک حکومت کے ماتحت آکر متحد ہوگیا۔ اس کے فن جو مردہ ہوتے جاتے تھے زندہ ہوگئے مثلاً اس کے فنِ تعمیر ہی کو دیکھو۔ ہندوستان میں جدھر جاؤ اُن کی بنائی ہوئی عمارتیں آج تک یاد دلاتی ہیں کہ انھوں نے جس ملک کو اپنا وطن بنایا تھا اس کو کیسی اچھی اچھی چیزوں سے سجایا ہے۔ ہندوستان ہمیشہ سے مذہبی ملک تھا مگر یہاں کے پجاریوں اور خود غرض پنڈتوں نے مذہب کو اپنا پیٹ پالنے کے لئے ایک گورکھ دھندا بنا دیا تھا۔ مسلمانوں کے اثر سے یہاں نئی مذہبی زندگی پیدا ہوئی۔ کبیر داس اور گرو نانک نے ان ہی کی باتوں سے اثر لے کر توا پنے ہم قوموں کو سچائی کا پیام سنایا اور رچوں کہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا دیس ہی بنا لیا تھا یہ دیسی کی طرح بس یہاں حکومت ہی نہ کرتے تھے اس لئے ان کے اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے میل جول اور بات چیت سے وہ میٹھی زبان بنی جسے ہم اُردو کہتے ہیں۔

۱۰۵۰ء میں سلجوقی خاندان نے عباسی خلیفہ کو آل بویہ سے آزاد کرایا اور خلافت کو دوبارہ ایک حقیقی قوت بنا دیا اور اب پھر تمام اسلامی ملک، افغانستان کی مغربی سرحد سے لے کر بحر روم تک ایک حاکم کی ماتحتی میں آگئے۔ سلجوقیوں کا سب سے مشہور بادشاہ ملک شاہ سلجوقی گزرا ہے جس کا وزیر نظام الملک طوسی تاریخ کے بہت ہی قابل و لائق وزیروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن سلجوقیوں کے

کم زور پڑجانے پر مسلمانوں پر عیسائیوں کے حملے شروع ہوگئے۔ یہ لڑائیاں صلیبی جنگیں کہلاتی ہیں اور ان کا سلسلہ کوئی تین سو سال تک جاری رہا۔ آخر سلطان صلاح الدین نے جو مسلمانوں بلکہ دنیا کا بہت بہادر اور پُرجوش مذہبی بادشاہ سمجھا جاتا ہے، مسلمانوں کو یورپ کے متحدہ حملوں سے بچایا اور مسیحی قوتوں کو پاش پاش کر دیا۔

عباسی خلافت اور شاہانِ خوارزم (جو اس عرصے میں فارس میں سلجوقیوں کے قائم مقام بن گئے تھے) کے آپس کے جھگڑوں نے تاتاریوں کو شرارت کا موقع دیا اور اور انھوں نے ۱۲۵۸ء میں ان تمام علاقوں کو جو عباسی خلافت کے ماتحت تھے۔ تباہ و برباد کرکے اس خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ عباسیوں کے ایک جانشین نے مصر میں پناہ لی اور وہاں کے ملوک بادشاہوں نے اُسے ایک نظربند خلیفہ کی حیثیت سے رکھا۔ یہ اسلام کی خوش نصیبی تھی کہ تاتاری بادشاہ مسلمان ہوگئے اور اُن ملکوں پر حکومت کرنے لگے جو پہلے عباسی خلافت کے ماتحت تھے۔

تاتاریوں کے عہد میں ایشیائے کوچک میں دولتِ عثمانیہ کے نام سے ایک اور سلطنت کی بنیاد پڑی اس نے دیکھتے دیکھتے اتنی ترقی کرلی کہ ایشیائے کوچک کی تمام عیسائی حکومتیں اس میں شامل ہوگئیں ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد نے قسطنطنیہ فتح کیا۔ اور سلطان سلیمان ویانا دارالحکومت آسٹریا تک پہنچ گیا۔ سلطان سلیم مصر پر قبضہ کرکے ۱۵۱۷ء میں خلیفہ عباسی کو ترکی لے گیا وہاں اُسے اپنی مذہبی حکومت سے علیحدہ ہونے پر مجبور کیا اور اپنی ذات کے اندر سلطان اور خلیفہ کی یعنی دونوں حیثیتیں جمع کرلیں۔ لیکن جیسا تم پہلے پڑھ چکے ہو ان میں بھی وہی خرابی تھی کہ باپ کے بعد بیٹا جانشین ہوتا تھا۔ ایک تو اس خرابی نے دوسرے اس بات نے کہ ترک بادشاہ ایران کے شیعہ بادشاہ سے لڑتے رہتے تھے۔ ترکوں میں کمزوری پیدا کردی۔ یورپ کی عیسائی حکومتوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا، اور وہ لڑائیوں میں ترکوں پر غالب آنے لگے۔ چنانچہ ایک دن وہ آیا کہ یورپ میں ترکوں کی حکومت صرف قسطنطنیہ اور اُس کے آس پاس کے علاقے تک محدود ہوکر رہ گئی۔ جنگ عظیم کے وقت سلطنت عثمانیہ کی یہی حالت تھی۔ یورپ کی بعض طاقتوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے دنیا سے اس حکومت کا خاتمہ ہی کر دینا چاہا تھا لیکن اس غیرت والی مسلمان قوم میں ابھی ایمان کی ایک چنگاری باقی تھی۔ جب ظاہری اسباب کا سہارا اُٹھ چکا تھا اس وقت اُس نے اپنی آزادی باقی رکھنے کے لئے کمر باندھی۔ رؤف بے اور خالدہ ادیب خانم نے قسطنطنیہ سے، اپنے گھر سے اس طرح بھاگ کر جیسے کوئی چور بھاگتا ہے اناطولیہ میں ترکوں کو جگایا اور وطن اور قوم کی حفاظت کے لئے اُبھارا ان کے ساتھ مصطفےٰ کمال جیسا جوان مرد سپہ سالار بھی ہوگیا اور ان سب کی کوشش سے دشمنوں کے منصوبے سب رہ گئے۔ اور ترک آج ایک آزاد قوم ہیں۔ انھیں آج کل لوگ بہت بدنام کرتے ہیں کہ یہ مسلمان نہیں۔

مگر سچ پوچھو تو یہ بڑے سچے مسلمان ہیں کہ مسلمان کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ خدا کا غلام بن کر دوسرے کا غلام نہیں بننا چاہتا۔ یہ اپنے ملک کے بسنے والوں کے لئے بہتری اور بھلائی کی سب تدبیریں کر رہے ہیں اور اسلام کی بھی غرض یہی ہے کہ دین کے ذریعے دنیا میں زندگی کو سُدھارے۔

دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی مدتوں کی غفلت کے بعد ذرا بیداری کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اگر وہ ملک جو مسلمان کہلاتے ہیں یا وہ حکومتیں جو مسلمان حکومتیں سمجھی جاتی ہیں سیاست کے اُتار چڑھاؤ سے مضبوط یا کمزور ہو جائیں تو اُسے اسلام کی مضبوطی یا کمزوری نہ سمجھنا چاہئے۔ اسلام حکومتوں سے نہیں پھیلتا نہ قوت پکڑتا ہے بلکہ اسلام سے حکومتیں بن جاتی ہیں اور مضبوط ہو جاتی ہیں۔ اسلام زندگی کا نام ہے۔ آزادی کا نام ہے۔ انسانی برادری کا نام ہے۔ آدمیوں میں مساوات اور محبت کا پیام ہے۔ خدمت کا مطالبہ ہے۔ مگر وہ خدمت جس کا ثمرہ سرداری ہوتا ہے۔ اس کی تعلیم آج بھی اسی طرح موجود ہے جیسے ۱۳ سو سال پہلے تھی اگر یہ مسلمان سینوں میں گرمی پیدا کرے اور اس سے مسلمان پھر دنیا کو ان مصیبتوں سے چھڑانے کا بیڑا اُٹھائیں۔ جن میں وہ مبتلا ہے تو دنیا پھر امن اور سلامتی کی جگہ بن سکتی ہے۔

آگے چل کر اسلام کا کیا حال ہوگا اس کا جواب تمھاری زندگیوں میں ہے اور اسلام کی کہانی آگے چل کر کیسی رہے گی اس کا فیصلہ تم پر ہے۔ اس یتیم بچے کا دھیان رکھو جس نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ہر طرح کی مشکلات کے باوجود دنیا میں وہ انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ جس کے اثرات آج تک موجود ہیں اور جن کی یاد سے ہمارے دل آج تک خوش ہیں۔
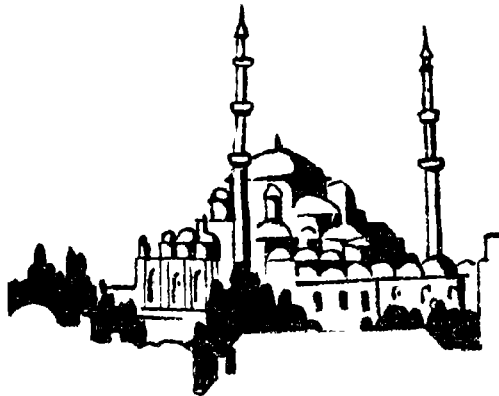
ہم سے جب کوئی پوچھتا ہے۔ کہ بتائیے ہندوستان کی تاریخ سے کیا سبق حاصل کیا جا سکتا ہے تو ہمیں اپنے ایک عزیز یاد آجاتے ہیں۔ جن کو خدا نے بہت دولت دی تھی اور جن پر وہ ایسا مہربان تھا کہ کئی بار کھو دینے پر بھی ان کو دولت عطا ہوتی رہی۔ جب ان بے چارے کا بڑھاپا آیا تو وہ مفلس کے مفلس ہی رہے۔ اور انھیں کوئی ایسا زمانہ یاد نہ تھا جب وہ چین سے رہ سکے ہوں اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے کئی بھائی تھے جو چاہتے تھے کہ دولت کا کچھ حصہ انھیں بھی دیا جائے لیکن یہ خدا کے بندے ایسے تھے کہ مقدمے لڑے، فوجداری کی، چوروں ڈاکوؤں اور دغاباز نوکروں اور مصاحبوں سے لٹنا گوارا کیا مگر بھائیوں کو خوشی سے ایک پیسہ نہ دیا ان کے بھائی طبیعت کے اوچھے پر زور بھرے تھے۔ پہلے وہ نیاز مندی سے پیش آتے محبت جتاتے، خوشامد کرتے، پھر خفا ہو جاتے اور طرح طرح کی دھمکیاں دیتے، اور جب کسی طرح کام نہ نکلتا تو غیروں سے مشورہ کرتے یا بیچ میں پڑنے کی درخواست کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وکیل اور ساہوکار انھیں مقدمہ لڑنے پر تیار کر لیتے خود فیس یا سود کے ذریعے خوب کماتے اور بھائیوں کو کچھ نہ ملتا اسی طرح آپس کے بیر نے سب کو برباد کیا اور اب خدا جانے وہ کن حالوں میں ہیں۔

یہی انجام بارہا ہندوستان کے رہنے والوں کا ہوا ہے۔ عزت اور دولت کی دیوی نے کئی مرتبہ اس ملک میں جنم لیا، حق پرستی اور دین داری نے یہاں کی ہوا کو صاف کیا ہمت، حوصلے اور ذوق سلیم نے عجیب عجیب طلسمی محل بنا کر کھڑے کئے۔ مگر خود غرضی اور نااتفاقی نے پھر سب کچھ مٹا دیا۔ بستیاں ویران ہوگئیں۔ آبرو خاک میں مل گئی، غلامی اور فاقہ مستی کی ایسی وبا پھیلی کہ انسان اور حیوان سب پناہ مانگنے لگے۔ بھوک سے تنگ آکر آدمی جو کچھ کر بیٹھے کم ہے۔ اسی وجہ سے ہم آج کل دیکھتے ہیں کہ ہندوستانی اپنی آزادی کی فکر نہیں کرتے اور ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں

دہلی کی پرانی عمارتیں اور کھنڈر دیکھنے کو لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ یہ کھنڈر جس زمانے کی یادگار ہیں۔ اس زمانے کی تاریخ ہم کو معلوم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ عمارت فلاں بادشاہ نے بنوائی۔ یہ شہر فلاں نے آباد کیا یہاں پر شیخ نظام الدین کا مزار ہے۔ یہ ہمایوں کا مقبرہ ہے، یہ خان خاناں کا۔ یوں سمجھو کہ یہ سب کل پرسوں کی باتیں ہیں اور ہماری تاریخ ہزار ہا سال کی داستان ہے۔ آٹھ نو سال ہوئے سندھ میں دو تین ٹیلے کھودنے سے ایک تہذیب اور تمدن کے آثار ملے جو آج سے چھ ہزار برس پہلے کی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے اس تمدن نے بھی کئی رنگ بدلے۔ کئی انقلاب دیکھے۔ یہ دراوڑ نسل کا تمدن تھا۔ لیکن آریوں نے آکر تباہ کیا۔ اور وہ ہندوستان میں اس طرح چھا گئے کہ ہمارے مورخ برسوں کے خیال میں رہے کہ آریوں سے پہلے یہاں کوئی مہذب قوم آباد ہی نہ تھی۔ دراوڑ عالی شان عمارتیں، خوب صورت زیور اور مورتیں بنائے تھے۔ مگر شاید لڑنے میں بہت کچے تھے۔ یا بھول گئے تھے کہ جو شخص ہر وقت جان دینے پر تیار نہ ہو اس کا سلامت رہنا مشکل ہے۔ آریوں نے تھوڑا تھوڑا کر کے سارا ملک ان سے چھین لیا۔ اور انھیں غلام بنا کر رکھا۔

اس وقت اگر ڈھونڈھو تو آریوں کا بھ

کچھ پتا نہیں۔ بس تھوڑی سی مقدس کتابیں یا
جوان کی یادگار ہیں۔ ان کے آنے کے بعد
ہندوستان کئی مرتبہ فتح ہو چکا ہے۔ اور کئی
نئی تہذیبیں یہاں قائم ہو چکی ہیں۔ اسی طرح
جیسے فصل کٹنے کے بعد کھیت میں پھر نئے
سرے سے ہل چلتا ہے اور بیج بوئے جاتے
ہیں۔ ہندوستان میں آنے کے ایک ہزار برس
بعد آریوں کی تہذیب کو زوال آنے لگا۔ تب
گوتم بدھ نے جو بڑے کامل اور حق پرست تھے
اپنی تعلیم اور اپنی شخصیت کی بدولت ہندوستان
کو ایک عظیم الشان ریاست اور تہذیب کا گہوارہ
بنایا۔ یہ تہذیب مذہب کے ساتھ ساتھ تمام
ایشیا میں پھیل گئی اور بہت سی نیم وحشی قوموں
کو شائستگی کا سبق پڑھایا۔ انھیں قوموں میں
سے ایک نے جو کشان کہلاتی تھی شمالی ہندوستان
مغربی تبت، ماوراء النہر، خراسان اور افغانستان
کو ایک ریاست میں شامل کر لیا۔ اس ریاست
کا دارالحکومت پشاور تھا۔ اور اس وقت کی
تجارت، تمدن اور تہذیب کا مرکز تھی۔ کشان

بادشاہ ترک تھے۔ شمالی ہند قریب سو برس
تک ان کے قبضے میں رہا۔ اس لئے کہ یہاں
کوئی ایسا شاہی خاندان نہیں تھا جو ملک کو متحد
کر کے اس کی قوت کو بڑھاتا اور اسے غیروں
کی حکومت سے آزاد کرتا۔ جب کشان سلطنت
کو زوال ہو گیا تو ہندوستان میں پھر ایک
بڑی سلطنت قائم ہوئی جو گپت سلطنت
کہلاتی ہے۔ یہ ہندوستانی تہذیب اور
تمدن کے عروج کا زمانہ تھا (۳۵۰ - ۶۵۰ء)
اس وقت ہندوستان کے تاجروں نے
جاوا، سماترا سے لے کر عراق اور مصر تک اپنا
کاروبار پھیلا رکھا تھا۔ اور دور دراز ملکوں میں
ان کی نوآبادیاں تھیں۔ لیکن اس زمانے کے
لوگ عیش و عشرت میں ملک کی حفاظت کا خیال
رکھنا بھول گئے اور جب ایک وحشی نسل نے
جو ہون کے نام سے مشہور ہے ملک پر حملہ کیا
تو وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکے اور ان کی عالی
شان تہذیب دیکھتے دیکھتے نیست و نابود
ہو گئی

ہندوستان میں اس وقت بہت سی نئی نسلیں آکر آباد ہوئی تھیں اور اُن کے سرداروں نے جو اپنے آپ کو راجپوت کہتے تھے، اپنی اپنی راج دھانیاں قائم کیں۔ مگر ان میں اتحاد کا شوق کبھی پیدا نہ ہوا۔ اس وجہ سے جب محمود غزنوی نے حملے کئے تو وہ اسے روک نہ سکے۔ اور محمود کے ڈیڑھ سو برس کے بعد شہاب الدین غوری نے پورا شمالی ہند فتح کرلیا۔ تیرھویں صدی عیسوی کے شروع سے اٹھارھویں صدی کے وسط تک ترک، پٹھان اور مغل ہندوستان میں حکومت کرتے رہے ان میں حوصلہ بہت تھا اور وہ جانتے تھے ملک کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کی ترکیب کیا ہے لیکن اس زمانے میں جب ریل اور تار ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ پورے ہندوستان پر حکومت کرنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ پھر بھی مسلمانوں نے ہندوستان کی بڑی خدمت کی انھوں نے صدیوں محنت کرکے اور اپنا خون بہا کر اتحاد کے خیال کو ایسا پھیلایا کہ وہ ایک عزیز حوصلہ اور نصب العین بن گیا۔ انھوں نے ایک زبان، رہنے سہنے کا ایک طریقہ رائج کیا۔ توحید کے سائے میں ایسی تہذیب کی پرورش کی جس نے بڑی مدت تک ملک کو متحد رکھا۔ انھوں نے مہماں نوازوں کی طرح اپنے گھر کے دروازے کھول دئے اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی جگہ دنیا کی دوسری قوموں کے تجربے سے سبق لیا اور اُن کی ترقی کو اپنی ترقی کا ذریعہ بنایا۔ مغل بادشاہوں کے عروج کے زمانے میں ہندوستان سے زیادہ شایستہ اور دولت مند کوئی ملک نہیں تھا۔ اور اس وقت کی عمارتیں، تصویریں اور دوسری صنعتی یادگاریں اب تک لوگوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں۔ مغلوں نے حکومت کا جو انتظام کیا وہ بھی ایسا مضبوط تھا کہ اب تک قائم ہے۔ نئے حاکموں نے ہر چیز کا ایک نیا نام رکھ لیا ہے اور کاغذ اور روشنائی کا خرچ بہت بڑھا دیا ہے۔ آخر میں یہاں کے مسلمان حاکموں نے بے اعتدالیوں اور

اور نفس پرستی میں اپنی ذہنی اور جسمانی صحت بہت کچھ ضائع کر دی۔ وہ یہ بھی بھول گئے کہ اتحاد عمل کتنی ضروری چیز ہے اور تب ایک دن آیا کہ انگریز اور فرانسیسی تاجر جنھوں نے خوشامد کر کے ہماری بندرگاہوں میں کارخانے کھولے۔ ہماری باہمی عداوتوں سے فائدہ اٹھا کر ملکی معاملات میں دخل دینے لگے۔ اور اب جیسا کہ دیکھتے ہو۔ انگریزوں نے سارے ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔

لیکن ہمیں یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہم اب ہمیشہ انگریزوں کے غلام رہیں گے جس طرح آپس کے نفاق نے ہمیں رسوا کیا ہے ویسے ہی اتفاق اور اتحاد عمل نے ہمیں کامیابی کے عروج پر پہنچایا ہے۔ اگر ہماری قوم کے نوجوان ارادہ کر لیں کہ آپس میں نہ لڑیں گے ایک دوسرے کے لئے قربانیاں کر کے اعتبار پیدا کریں گے اور جئیں گے تو خوددار آدمیوں کی طرح یا خدا کی دی ہوئی جان، اسی کی راہ میں صرف کر دیں گے تو پھر کوئی ایسی قوم نہیں ہے جو ہم کو غلام بنا سکے۔ یا ہماری ترقی کو روک سکے۔
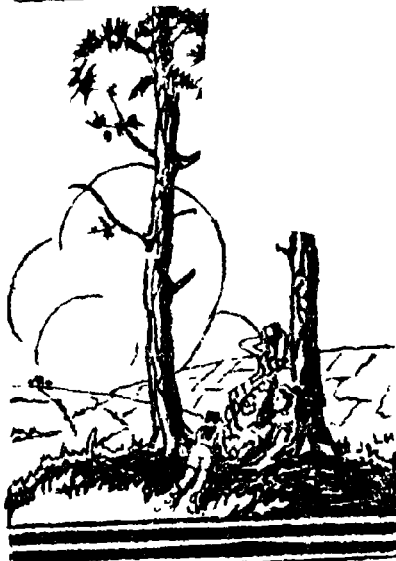
از جناب سید غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علی گڑھ

آج میں تمہارے رسالے پیام تعلیم کے ذریعے تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں لیکن سوچتا یہ ہوں کہ کس کے متعلق باتیں کروں۔ مضمون ایسا ہونا چاہئے جس میں باتیں کرنے والے اور باتیں سننے والے دونوں کو دلچسپی ہو۔ وہ کون سا مضمون ہے؟ دیکھو تم اپنی عمر کی اس منزل میں ہو جب تمہارا سب سے زیادہ ضروری کام تعلیم حاصل کرنا ہے۔ تعلیم سے میری مراد صرف لکھنا پڑھنا نہیں بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کے بغیر تم نیک اور شریف اور کارآمد انسان نہیں بن سکتے۔ اس لئے تمھیں تعلیم سے دلچسپی ہونی چاہئے اور یقیناً تم بھی کبھی کبھی سوچتے ہوگے کہ تمھیں تعلیم کیوں دی جا رہی ہے۔ اس کی غرض اور مقصد کیا ہے؟ اتفاق سے مجھے بھی تعلیم کے فن میں دلچسپی ہے اور میرا کام یہ ہے کہ ان استادوں کو تعلیم دوں جو تمھیں مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔ اس لئے مجھے اور تمھیں دونوں کو تعلیم کے مسئلے سے دلچسپی ہے۔ اور میں اس مضمون میں ان چند باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن پر میں اپنے استادوں کے کالج میں زور دیتا ہوں۔ اس سے تمھیں اندازہ ہو جائے گا کہ ایک اچھا استاد تمھیں کس قسم کی تعلیم و تربیت دینا چاہتا ہے اور تم سے کن باتوں کی توقع رکھتا ہے۔

سب سے پہلی بات جو میں استادوں کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ انھیں اپنے عزیز شاگردوں یعنی تم سب سے سچی محبت کرنی چاہئے۔ بغیر محبت کے جادو کے وہ تمھارے دلوں کو تسخیر نہیں کر سکتے۔ اور جب تک تمھارے دلوں کو تسخیر نہ کریں ان کے علم اور ان کی تربیت کا پورا اثر تم پر نہیں پڑ سکتا۔ محبت کی عینک لگا کر وہ تمھارے دل کی باتوں اور خواہشوں اور خیالات کو سمجھ لیتے ہیں اور صحیح طریقے پر تعلیم دیتے ہیں اس کے اثر سے تم بھی خود بخود ان سے محبت کرنے لگتے ہو۔ جو کچھ وہ بتاتے ہیں اور سکھاتے ہیں اسے دل لگا کر سنتے اور سیکھتے ہو اور ان کی اچھی عادتوں کو خوشی سے اختیار کر لیتے ہو۔ اس طرح مدرسے کا کام بہت اچھی طرح چلتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جو استاد اپنے شاگردوں سے محبت کرتے ہیں وہ خواہ مخواہ ان کو سزا نہیں دیتے۔ ان پر ڈانٹ ڈپٹ

نہیں کرتے ۔ مارنے سے عقل نہیں آتی بلکہ استاد اور شاگرد دونوں کا مزاج خراب اور دل ایک دوسرے کھٹا ہو جاتا ہے اس لئے اچھے استاد بید اور طمانچہ کے بجائے محبت اور مسکراہٹ سے کام لیتے ہیں بے شک یہ ان کا فرض ہے کہ اگر تم اپنی ناواقفیت اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے کوئی ایسی بات یا کام کرنا چاہو جو تمھارے لئے نقصان دہ ہے ۔ تو وہ تمھیں روک دیں ۔ یہ بات تمھیں یاد رکھنی چاہیئے ۔ کہ وہ تمھاری بھلائی چاہتے ہیں ۔ اور اکثر باتوں کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں اس لئے ۔ جب وہ اپنی محبت اور خیر خواہی کی وجہ سے تمھیں کوئی نصیحت کریں تو تمھیں اس پر عمل کرنا چاہیئے ۔

دوسری بات جس پر میں زور دیتا ہوں وہ یہ ہے کہ بچپن کا زمانہ ہنسی خوشی اور کھیل کود کا زمانہ ہے اور بچوں کو تعلیم اس طرح دینی چاہیئے کہ وہ ان کے کھیل کود کا ایک جزو بن جائے ۔ مدرسہ ایک ایسی دلچسپ ، بارونق اور خوش گوار جگہ ہو کہ بچے وہاں اپنی مرضی اور خواہش سے آئیں اور جب تک وہاں رہیں خوش و خرم رہیں ۔ انھیں یہ نہ معلوم ہو کہ پانچ چھ گھنٹے کے لئے وہ ایک قید خانے میں بند کر دیئے گئے ہیں جہاں ہر وقت ان پر جبر کیا جاتا ہے سخت حکم لگائے جاتے ہیں اور ایسے کام لئے جاتے ہیں جن سے اُن کی طبیعت اکتا جاتی ہے میں اُن سے یہ کہتا ہوں کہ تم اپنے مدرسے کو اس طرح چلاؤ کہ چھوٹے بچے کام اور کھیل میں فرق نہ کر سکیں ۔ اُن کے مدرسے کا سارا وقت ایسا دلچسپ ہو جیسے کھیل اور کھیل ایسے مفید ہوں جیسے کام ۔ تم شاید یہ بات سن کر تعجب کرو ۔ تمھارے استاد بھی بعض مرتبہ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مدرسہ کام کرنے کی جگہ ہے یا کھیل کی ۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ، لکھنا ، پڑھنا حساب ، تاریخ ، جغرافیہ ، سائنس وغیرہ سیکھنے آتے ہیں ۔ یا سیر اور تفریح کرنے اور دل بہلانے ؟ بعض پرانے خیال کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مدرسے میں بچے ہر وقت استاد سے سہمے ہوئے ۔ چپ چاپ دم سادھے اپنا سبق یاد کرتے رہیں یا کم از کم یہ ظاہر کریں کہ سبق یاد کر رہے ہیں ۔ وہاں نہ کھیل ہو ، نہ ورزش ، نہ دستکاری ۔ نہ مل جل کر کام کرنے کا موقع ۔ مگر میں ایسے مدرسے کا قائل نہیں ۔ اور میں کیا قائل نہیں آج کل جتنے بڑے بڑے تعلیم کے ماہر ہیں جو ان باتوں کو مجھ سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسے مدرسوں کو پسند نہیں کرتا میں استادوں سے یہ کہتا ہوں کہ اگر تم بچوں کی طبیعت اور مزاج کو ٹھیک طرح پر سمجھ لو اور تمھیں تعلیم کے صحیح طریقے معلوم ہوں تو اُن کو پڑھانے اور تربیت کرنے میں نہ زبردستی کرنا پڑے ۔ نہ انعام کا لالچ دینے کی ضرورت ہو ۔ نہ سزا کا خوف دلانے کی ۔ بچے ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں ۔ جو نہایت دلچسپ اور وسیع ہے جس میں طرح طرح کی دلکش اور حیرت انگیز چیزیں موجود ہیں اور انھیں یہ قدرتاً شوق ہے کہ وہ ان سب چیزوں کا حال معلوم کریں ۔ اچھا استاد اسی شوق کو تعلیم کی بنیاد بناتا ہے ۔

یہ ایک بہت ضروری اور دلچسپ بحث ہے میں چند مثالیں دے کر اسے صاف کر دوں ۔ اگر تم اپنے چاروں طرف کی دنیا پر نظر ڈالو تو تمھیں کتنی بہت سی چیزیں نظر آئیں گی جن کا حال جاننے کے لئے تمھارا دل تڑپتا ہے نیلا آسمان جس میں دن کو سورج چمکتا ہے اور رات کو چاند

اور ستارے جگمگاتے ہیں، آسمان میں ٹہلتے ہوئے
بادل، بادلوں کی بارش جو مردہ زمین میں جان ڈال دیتی
ہے اور اس میں طرح طرح کے خوب صورت درخت اور
پھل پھول اُگاتی ہے۔ دن اور رات کی آنکھ مچولی۔
(ایک آیا اور دوسری غائب!) گرمی سردی اور برسات
کا چکر۔ چرندے اور پرندے اور انسان اونچے اونچے پہاڑ
اور طویل میدان، دریا اور سمندر —— کیا یہ تمام چیزیں
تمھیں حیرت میں نہیں ڈالتیں؟ کیا تمھارا دل یہ نہیں چاہتا
کہ تم معلوم کرو کہ یہ قدرت کا عجیب وغریب کارخانہ کس
طرح چل رہا ہے؟ اور اس دنیا میں صرف قدرت ہی کا ایک
کارخانہ نہیں بلکہ ایک انسان کا کارخانہ بھی ہے جو اس
نے قدرت کی گود میں اور قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں
سے کام لے کر تیار کیا ہے۔ جس کے بنانے میں ہمارے
تمھارے جیسے کروڑوں آدمیوں نے ہزاروں برس محنت
کی ہے۔ اس کارخانے کی بے شمار مفید اور عجیب وغریب
چیزیں ہمارے چاروں طرف موجود ہیں۔ دھوپ اور بارش
سے بچنے کے لئے مکان (کہیں ٹوٹے ہوئے جھونپڑے اور
کہیں عالی شان اور خوب صورت محل) گرمی اور سردی
سے محفوظ رہنے کے لئے لباس (کہیں پتے اور ٹاٹ کے
ٹکڑے اور کہیں نفیس اور ملائم اون اور ریشم) رات کو
اندھیرا ہو تو اس کو دور کرنے کے لئے روشنی (کہیں
مٹی کا دیا، کہیں تیل کا لیمپ، کہیں بجلی کا قمقمہ) زمین
کے سینے پر دوڑنے پھرنے کے لئے گاڑیاں، ریلیں
موٹرکاریں۔ سمندر کے سینے پر تیرنے کے لئے کشتیاں
اور جہاز، ہواؤں میں اڑنے کے لئے طیارے اور ایروپلین
خوں خوار جانوروں سے بچنے کے لئے بندوقیں (جنھیں
بعض پاگل خود اپنے جیسے انسانوں کو مارنے کے لئے
استعمال کرتے ہیں) بیماریوں سے بچنے کے لئے دوائیں
کھانے کے لئے کسانوں اور باغبانوں کی محنت کے پھل
آرام اور آسائش کے لئے کلوں اور مشینوں کی بے شمار
بنائی ہوئی چیزیں۔ یہ سب انسان کی محنت اور دستکاری
اور دماغ سوزی کا نتیجہ ہیں۔ ان ہی کی بدولت وہ قدرت
کی تمام طاقتوں، پانی، ہوا، بھاپ، بجلی، وغیرہ
کے اوپر قابض ہو گیا ہے اور ان کی مدد سے انسانی
کارخانے کی رونق بڑھاتا رہتا ہے۔ کیا تمھارا جی نہیں
چاہتا کہ تم ان سب کا حال سنو، اور پڑھو اور اس قابل
ہو کہ خود بھی اس کارخانے کے کام میں حصہ لے سکو، تم
آج اپنے باپ دادا کی محنت کا فائدہ اٹھا رہے ہو
ان کی بدولت تمھیں ہزاروں آرام اور آسانیاں حاصل
ہیں۔ کل تمھارے بعد آنے والے لوگ تمھاری محنت
کا ثمر پائیں گے۔ یقیناً تمھارا دل چاہتا ہے کہ تم اس
زبردست اور عظیم انسانی کوشش میں شریک ہو۔ اس
وجہ سے تم ہر وقت ان چیزوں کے متعلق اپنے عزیزوں
دوستوں، استادوں اور اپنی کتابوں سے سوال کرتے
رہتے ہو۔ اگر دنیا میں اس طرح رہنا چاہتے ہو۔ جیسے
کوئی اپنے گھر میں رہتا ہے تو اس کا پورا علم حاصل کرو
اور اس کے کاروبار میں حصہ لینا سیکھو ورنہ تم اس
میں اجنبی اور اپاہج بن کر رہو گے جو ایک شریف
انسان کی شان سے گری ہوئی بات ہے۔
ان سب چیزوں کے علاوہ بعض اور باتیں

ہیں جن سے دنیا کے اچھے اور عقل مند لوگ بڑا لطف حاصل کرتے ہیں۔ اور انھیں ہر قسم کے سامان اور مال و دولت سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟ مثال کے طور پر چند کا ذکر کرتا ہوں کسی اچھی نظم یا خوب صورت تصویر یا عمدہ منظر یا میٹھے راگ سے خوشی حاصل کرنا کسی اعلیٰ درجے کے مصنف کے خیالات کو پڑھ کر ان سے فائدہ اُٹھانا۔ سچ یا حقیقت کی تلاش کرنا جس کی ایک شاخ کو فلسفہ کہتے ہیں۔ اور دوسری کو سائنس گذرے ہوئے زمانوں اور قوموں کے حالات کا مطالعہ جس سے ہماری عقل کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور بہت سے مشکل مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ دوستوں کی دوستی اور پیاروں کی محبت کی قدردانی، خدا کو پہچاننا اور اس سے دل لگانا۔ لوگوں کی خدمت کرنا۔ جس شخص کے پاس یہ دولت ہے۔ اس کی زندگی ایک اچھی اور مکمل زندگی ہے۔ جو اس سے محروم ہے وہ زندگی کے سب سے بڑے اور حقیقی لطف سے محروم ہے۔ کیا تمھارا دل نہیں چاہتا کہ تم خوب صورت چیزوں کو دیکھو اور سنو۔ اور ان سے لطف حاصل کرو۔ عمدہ کتابوں کو پڑھو اور اُن سے عقل اور علم حاصل کرو اپنے ساتھیوں کے ساتھ سلوک اور محبت سے رہو۔ اپنے خدا کی عبادت اور اپنے بھائی بندوں کی خدمت کرو یقیناً چاہتا ہے اور بچپن ہی سے تم میں ان باتوں کی طرف میلان ظاہر ہوتا ہے تم خوب صورت چیزوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہو۔ نئی باتوں کے جاننے اور سمجھنے کا تمھیں شوق ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنا اور کام کرنا چاہتے ہو؛ پھر تمھیں کیوں الزام

دیا جاتا ہے۔ یہ تو ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا والا معاملہ ہے۔

تو میں تمھارے استادوں سے کہتا ہوں کہ بھائیو! تمھیں بگڑنے اور بد مزاجی کرنے اور غصے میں لال پیلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک طرف دنیا ہے حیرت انگیز اور دل کش چیزوں سے بھری ہوئی دوسری طرف بچے ہیں جنھیں اس کو جاننے اور سمجھنے کی خواہش ہے۔ چیزیں بنانے، کام کرنے، نئے نئے تجربے حاصل کرنے کا شوق ہے، تمھارا کام تو صرف اتنا ہے کہ پردے اُٹھا کر اس دنیا کے نئے نئے نظارے انھیں انھیں دکھاتے رہو۔ باقی جو کچھ ہوتا ہے وہ ان کی فطرت اور طبیعت خود کرے گی۔ تعلیم کے معنی صرف کتابیں پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ وہ تو دوسرے لوگوں کی آنکھیں ہیں۔ جو ہمیں مل جاتی ہیں۔ اگر ہم ان کی مدد سے دیکھیں اور ساتھ ہی اپنی آنکھوں اور اپنے دماغ سے کام لیں تو ہم دنیا اور اس کے کاروبار کو، انسان کو، اور اُن کے قوانین کو، قدرت کو اور اس کی قوتوں کو سمجھ لیں گے اور سمجھ داری کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی بسر کریں گے اور یہی دراصل تعلیم کا اصلی مقصد ہے۔ اس لئے میں اُن سے کہتا ہوں کہ مدرسے میں بچوں کے لئے نت نئے تجربے فراہم کرو۔ انھیں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر کام کرنا سکھاؤ۔ انھیں مناظر قدرت کی سیر کراؤ۔ دستکاری سکھاؤ۔ ان میں اپنے بل بوتے پر دماغی اور جسمانی کام کرنے کی عادت ڈالو۔ پھر دیکھو کہ وہ تمھارے مدرسے میں ایسے تندرست اور خوش و خرم رہیں گے جیسے کسی

سرسبز باغ میں پھول اور پودے کیا تمھیں معلوم نہیں کہ ایک بڑے معلم نے اپنے اسکول کا نام "بچوں کا باغ" رکھا ہے۔ اور آج کل چھوٹے بچوں کے بہت سے نئی طرز کے مدرسے اسی نام سے پکارے جاتے ہیں۔؟

مضمون لمبا ہوگیا۔ صرف ایک بات کا ذکر اور کروں گا۔ میں تمھارے استادوں سے پوچھتا ہوں کہ تم اپنے شاگردوں میں کس قسم کی طبیعت اور عادتیں پیدا کرنا چاہتے ہو۔ اور ہم اس بات پر بہت غور اور بحث کرتے ہیں۔ آج کل کی دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن میں نہ جرأت ہے اور نہ ہمدردی وہ اپنی زندگی کو اس طرح گذارتے ہیں جیسے کوئی خوف زدہ خرگوش جسے ہر وقت یہ اندیشہ ہو کہ کوئی اس کو پکڑے گا یا مار ڈالے گا۔ وہ ہر بات میں اور ہر کام میں یہ سوچتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے اپنی رائے اور عقیدے پر عمل نہیں کرتے۔ بلکہ غلاموں کی طرح دوسروں کی تقلید کرتے ہیں۔ انھیں نئی چیزوں اور نئے تجربوں سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف انسانوں سے ڈرتے ہیں بلکہ ایسی چیزوں سے بھی خائف رہتے ہیں جن کا وجود ہی نہیں۔ مثلاً بھوت پریت ایسی چیزوں سے ڈرتے ہیں جن سے ڈرنا فضول ہے۔ کیوں کہ ان سے بچنا ممکن نہیں۔ جیسے موت اور بیماری وہ بجائے زندگی کے روشن پہلو کے دیکھنے کے ہر وقت اس اندیشے میں گھلا کرتے ہیں کہ کہیں ان سے وہ چیزیں نہ چھین لی جائیں جو انھیں حاصل ہیں۔ مثلاً دولت عزت ساز و سامان وغیرہ اس قسم کے لوگوں کی زندگی بہت تلخ اور ناگوار ہوتی ہے اور وہ اس سے کوئی لطف حاصل نہیں کرتے ...... میں چاہتا ہوں کہ ہمارے مدرسوں سے جو بچے نکلیں ان کے دلوں میں جرأت اور حوصلہ ہو۔ وہ خوشی اور غم۔ سکھ اور دکھ، دولت اور افلاس ہر حالت کا مقابلہ مضبوط دل کے ساتھ کریں ان کو اپنے پر اعتماد ہو اور وہ اپنی عزت کریں اور خواہ مخواہ دولت اور قوت والوں کے سامنے اپنا سر نہ جھکائیں۔ جس شخص میں سچی جرأت نہیں ہوتی (جس میں جسمانی بہادری، دماغی آزادی اور اخلاقی جرأت سب شامل ہیں) وہ کبھی دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا اسی طرح ان لوگوں کی حالت بھی قابل افسوس ہے جو خودغرضی کا شکار رہیں اور سوائے اپنی ذات کے اور کسی کی ہمدردی نہیں رکھتے ان کی زندگی بہت تنگ اور محدود اور تاریک ہوتی ہے۔ اور وہ اس سے حقیقی خوشی حاصل نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ انھیں ہر وقت اپنی ذات کی فکر لگی رہتی ہے۔ وہ کسی بڑے کام یا عظیم الشان مقصد میں شریک ہوکر اس کی خدمت نہیں کرسکتے کیوں کہ ہر بات میں اپنا نفع نقصان سوچتے ہیں اور کنجوس کی طرح اپنی چیزوں کو گنتے رہتے ہیں ...... ہم بچوں کی ایسی تربیت کرنا چاہتے ہیں کہ انھیں اپنے خاندان والوں سے اپنے شہر اور گاؤں والوں سے۔ اپنے ہم وطنوں سے اور اس سے اور آگے بڑھ کر تمام انسانوں سے ہمدردی ہو۔ وہ ہر ایسی بات میں دلچسپی لیں جس میں دوسروں کا سچا فائدہ ہو۔ اور ان کی خاطر اپنی ذات پر تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں۔ وہ ہمیشہ انصاف کی حمایت اور ہر بات میں ظلم اور ناانصافی کی مخالفت کریں انھیں اپنے وطن کی سچی محبت ہو۔ وہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی اور

اور ایثار کرنے کو تیار ہوں لیکن ان کی ہمدردی محض اپنے وطن تک محدود نہ ہو بلکہ وہ صداقت اور حق کو سب سے زیادہ عزیز رکھیں۔ اگر ان کی قوم یا وطن ناحق پر ہو تو وہ حق کی خاطر اس کی مخالفت کریں ایسے بچے جو سچے اور شریف بہادر اور ہمدرد ہوں گے پہلے اپنے ملک میں اور پھر اپنے اثر سے تمام دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر سکتے ہیں اور اس ظلم اور ناانصافی کی دنیا کو رہنے کے قابل بنا سکتے ہیں

میں تمھارے استادوں سے کہتا ہوں کہ نوجوانوں کی ایک ایسی نسل تیار کرنا ناممکن نہیں ہے۔ اگر تمھارے مدرسے میں آزادی کی فضا ہوگی۔ محبت کی حکمرانی ہوگی۔ مل جل کر کام کرنے کا موقع ہوگا۔ اور تم بے جا روک ٹوک اور سزا سے پرہیز کروگے تو بچوں میں جرأت اور ہمدردی اور حق پرستی کی صفات پیدا ہو جائیں گی۔ یہ کام مشکل ہے اس کے لئے محنت، عقل مندی، صبر اور دل سوزی کی ضرورت ہے لیکن دنیا میں اس سے زیادہ بڑا اور ضروری اور کوئی کام نہیں۔ کیوں کہ اس کے ذریعے ہم ایک بہتر دنیا کی بنیاد ڈال سکتے ہیں۔ میں انھیں ہندوستان کے مشہور شاعر رابندرناتھ ٹیگور کا یہ قول سناتا ہوں۔

"ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ وہ ابھی انسانوں کی طرف سے مایوس نہیں ہوا"۔ آیندہ کی امیدیں تم بچوں کی ذات سے وابستہ ہیں خدا کرے اس کی عنایت اور تمھارے استادوں کی کوشش اور تمھاری اپنی جدوجہد سے یہ امیدیں پوری ہوں!

بچوں کے نام

پیارے بچو! بچپن کا زمانہ بیج بونے کا وقت ہے جو کسان کھیتوں کو بھی طرح گوڑ جوت کے ٹھیک وقت پر اچھا بیج بوتا ہے وہ فصل بھی اچھی کاٹتا اور اپنا گھر بھر لیتا ہے۔ اگر تم بچپن میں نیک خیالات اور بلند ارادوں کا بیج بولوگے تو آگے چل کر تمھاری زندگی۔ کامیابی کا نمونہ ہوگی۔ تمھارے لئے پرماتما سے میری بس یہی پرارتھنا ہے۔

تمھارا دوست

دیوان چند

پرنسپل دیانند اینگلو ویدک کالج (کان پور)

از جناب منشی پریم چند صاحب مدظلہٗ

تم جغرافیے میں نئی دنیا کی دریافت کا حال پڑھ چکے ہو۔ مگر وہ نئی دنیا نہ تھی وہ اتنی ہی پرانی دنیا تھی جتنی ایشیا یا افریقہ بلکہ اس سے بھی پرانی۔ جس وقت اس پرانی دنیا میں جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اس قدیم تر دنیا میں تہذیب کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ نئی دنیا وہ ہے جس کی طرف تم جا رہے ہو اور اگر تم نے ہمت نہ ہاری اور راستے کی کٹھن منزلوں سے تھک نہ گئے تو ایک دن اس نئی دنیا میں ضرور پہنچو گے

وہ نئی دنیا رسم و رواج کی بے معنیٰ قیدوں سے آزاد ہوگی۔ تم جو کچھ کرو گے بدنامی کے ڈر سے نہیں عاقبت کے خوف سے نہ سزا کے خوف سے نہ نقصان کے خوف سے۔ تمھیں مدرسے پہنچنے میں دیر ہو جائے گی تو تم جھوٹے عذر پیش کر کے سزا سے بچنے کی کوشش نہ کرو گے۔ تمھارا ضمیر تمھیں جھوٹ بولنے سے روکے گا اور تم اس کا کہنا مانو گے۔

وہ دنیا امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ حاکم و محکوم کی دنیا نہ ہوگی۔ اس دنیا میں سبھی بھائی بھائی ہوں گے۔ جسمانی طاقت کی بنا پر اونچی تعلیم کی بنا پر یا سیم و زر کے انباروں کی بنا پر کسی کی عزت نہ ہوگی عزت کا معیار ہوگی انسانیت، حق پسندی اور خدمت کا ذوق۔ لوگ ثروت اور

رتبے کے لئے کسب کمال نہ کریں گے
بلکہ اپنے بھائیوں کی خدمت کے لئے
تب حکومت کے معنیٰ ہوں گے زیادہ سے
زیادہ خدمت کرنے کی صلاحیت جسمانی
طاقت کے معنیٰ ، کمزوروں کو تکلیف
پہنچانا نہ ہوگا بلکہ کمزوروں کی حمایت، تب
علم کے معنیٰ اونچے عہدے نہ ہوں گے،
بلکہ حق پر قربان ہونے کی طاقت۔ اور
دولت کو تو اس دنیا میں لعنت سمجھا جائے
گا۔ جس نے تمھاری اس پرانی دنیا کو دوزخ
بنا رکھا ہے۔ اس دنیا میں پنڈت اور ملا
پادری اور راہب نہ ہوں گے جو عذاب
و ثواب کا خوف دلاکر لوگوں کو گمراہ کرتے
ہیں۔ جو مذہب کو جتھے بندی کی پستی تک
لے جاچکے ہیں۔ وہاں عابد و معبود (خدا)
کے درمیان کسی دلال کی ضرورت نہ ہوگی
وہاں مذہب کے معنیٰ ہوں گے ہمدردی، صاف
دلی اور اتحاد۔ آج کی مذہبی تنگ خیالیوں
اور فتنہ انگیزیوں کا وہاں نام بھی نہ ہوگا
مذہب کا تخیل بہت وسیع ہو جائے گا
ہندو ، مسلم ، عیسائی ، بودھ کی تفریقیں،
دنیا میں فساد پھیلانے کا باعث نہ ہوں
گی مذہب کو کاروبار بنانے والوں نے
جو پردے ڈال دیئے ہیں ان سے نکل
کر ہم خدا کی قدرت کا جلوہ دیکھیں گے
ایک ایک پھول میں ایک ایک پتی میں
ایک ایک جان دار میں۔ جب ہماری
نظر اتنی وسیع ہو جائے گی تو اس میں
مذہب کے نام پر پھیلنے والی لغویوں کا
گذر کہاں۔

اس نئی دنیا میں قدرت کی نعمتوں
پر کسی انسان کا اجارہ نہ ہوگا۔ روشنی
ہوا ، پانی ، زمین سے پیدا ہونے والی
غذائیں۔ بھاپ سے چلنے والی گاڑیاں
اور ریڈیو سے پیدا ہونے والے نغمے سب
کو یکساں طور پر مل سکیں گے

اس نئی دنیا میں جائداد نام کی
کوئی چیز نہ ہوگی۔ جس نے ہماری اہر

پرانی دنیا کو حرص وحسد، غرور اور خود غرضی کا اکھاڑا بنا رکھا ہے۔ جس نے آدمیوں کو حیوان سے بدتر، خون خوار جانوروں سے بھی زیادہ خون خوار، زہریلے سانپوں سے بھی زیادہ قاتل بنا ڈالا ہے وہی دنیا تمہاری منزل مقصود ہے۔ وہی تمہاری زندگی کی معراج ہے۔

بیگم خبیر

(از جناب الیاس احمد مجیبی صاحب مصنف "سرکار کا دربار" وغیرہ)

یوں تو دنیا کے سبھی ملک اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں اور ہر ملک میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ تمام دنیا میں مشہور ہے۔ کسی ملک میں ایسے ایسے رشی منی اور پیر پیمبر گذرے ہیں کہ آج تک اُن کا نام روشن ہے اور بے شمار آدمی اُن کی بتائی ہوئی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ اُن سے پہلے آدمی صورت شکل میں تو آدمی تھے پر عادت خصلت میں جانوروں سے کچھ بڑھ کے نہ تھے۔ اُن ہی کی تعلیم کا اثر ہے کہ انسانوں میں انسانیت کا بلند اور پاکیزہ جذبہ پیدا ہوا بھائی نے بھائی کو جانا، بیٹے نے باپ کو پہچانا۔ اور دوست نے دوست کے ساتھ سچی محبت اور دوستی کا حق ادا کر کے دکھایا۔ غرض یہ اُجاڑ سی دنیا جس کی ہر چیز خود رو تھی اور جس میں دل لگنے کی کوئی بات نہ تھی رفتہ رفتہ جنت بن گئی۔

کسی ملک میں ایسے ایسے عالم فاضل حکیم اور وید پیدا ہوئے کہ دنیا بھر نے اُن کے علم سے فائدہ اٹھایا اور اُسی علم کی روشنی میں آج وہ چیزیں نظر آتی ہیں اور وہ وہ کام ہو رہے ہیں کہ اگلے وقتوں کے لوگ جو کہیں اُٹھ کھڑے ہوں تو وہ غریب مارے حیرت کے پھر سے اپنی قبروں میں جا لیٹیں۔

کسی ملک کے راجہ مہاراجہ، امیر اور بادشاہ ایسے ہوئے کہ پرجا کے سکھ چین کے فکر میں انھوں نے اپنی زندگی بسر کر دی۔ اُن کے گُن آج بھی ماننے والے مانتے ہیں اور پرجا کے ساتھ اُن کی سیوا کے آج تک گیت گائے جاتے ہیں۔

کسی دیس کے سورما اور سیوک ایسے ایسے ہوئے کہ آج اُن کے حالات ہی سے ہم اپنے دلوں میں زندگی اور سیوا کی لگن پیدا کرتے ہیں۔

کسی ملک میں قدرتی مناظر ایسے ایسے پائے جاتے ہیں کہ بس خدا کی شان ہی نظر آتی ہے وہ ساری دنیا میں مشہور ہیں اور لوگ دور دور سے انھیں دیکھنے جاتے ہیں اور قدرت کی کاری گری کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ سچ سچ وہ ایسی چیزیں ہیں کہ انھیں دیکھ کے آدمی بے اختیار اپنے کرتار کا نام جپنے لگتا ہے اور خدا کے ہونے کا اقرار کرتا ہے

بعض ملک اپنی خوب صورت اور عالی شان عمارتوں کے لئے مشہور ہیں اور دور دور کا سفر کر کے یہاں تک کہ سات سمندر پار سے لوگ انھیں دیکھنے جاتے۔ اور اگلے وقتوں کی کاری گری کے نمونے دیکھ دیکھ کے دانتوں تلے انگلی دباتے ہیں۔

پر عجب خدا کی شان ہے اور داتا کی دین بے حساب۔ یہ تو بس اسی کی کرپا ہے کہ ہمارے دیس میں دنیا بھر کی یہاں اکٹھا ہو گئیں۔ اور یہاں یہی تو بات ہے کہ ہمارا دیس ہندوستان، جنت نشاں کہا جاتا ہے۔ اور دنیا بھر کی نظریں اس پر لگی رہتی ہیں۔ جس کسی کے قبضے میں یہ رہتا ہے پھر وہ اپنے بس بھر تو اسے اپنے چنگل سے نہ نکلنے کے لئے سب جتن کرتا ہے۔

دیکھو بھائی یہ موقع ایک ایک چیز کو بیان کرنے کا تو نہیں ایڈیٹر صاحب کا حکم ہے کہ مضمون ۶، صفحے سے بڑھنے نہ پائے۔ البتہ اگر تم نے اس خیال کو پسند کیا مدانے بھی چاہا تو کسی اور موقع پر اپنے دیس کی ان سب باتوں کو الگ الگ اور "ذرا کھول کے بیان کریں گے؟ اس وقت تو ایڈیٹر صاحب کی مرضی کے مطابق تمھاری معلومات بڑھانے کو بس اپنے دیس کی چند بہت ہی مشہور عمارتوں کا تھوڑا تھوڑا حال بیان کرتے ہیں خدا کرے تم کو پسند بھی آئے۔ تو پھر ہماری یہ حقیر محنت ٹھکانے لگ جائے گی

اچھا تو لو سنو سب سے پہلے ہم سب سے پرانی عمارتوں کا حال سناتے ہیں اور رامیشورم کا مندر" سے شروع کرتے ہیں۔

۱۔ رامیشورم کا مندر

مدراس علاقے کے ضلع مدورا میں رامیشورم ایک شہر ہے بہت مشہور، یہ ہندوؤں کی بہت بڑی تیرتھ گاہ ہے۔ کیوں کہ یہاں اُن کا ایک بہت ہی پاک مندر ہے اور مشہور ہے کہ اسے شری رام چندر جی مہاراج نے بنوایا تھا اس کی جاترا یا تیرتھ کرنے ہمارے دیس کے ہر حصے سے سینکڑوں جاتری پیدل اور سواریوں پر جاتے ہیں۔

یہ مندر ہمارے دیس کی بہت قدیم قوم دراوڑیوں کی بنوائی ہوئی عمارتوں کی وضع کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے یہ اتنی بڑی اور شان دار عمارت ہے کہ اس کے برآمدے کی لمبائی (۴۰۰۰) فٹ ہے جو بہت سے ستونوں (کھمبوں) پر کھڑا اگلے لوگوں کی یاد دلاتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے کے ہمارے بڑوں نے وہ وہ کام کر چھوڑے جن کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے دور دور کا سفر کر کے دنیا بھر کے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں اور ہکا بکا رہ جاتے ہیں خدا ہمارے دیس کو پھر زندہ کرے اور اس کے بسنے والوں کے دلوں میں وہی زندگی، وہی حوصلہ، وہی ہمت اور ویسے ہی شان دار کام کرنے کی قابلیت پیدا ہو۔

۲۔ سانچی

ہمارے دیس کی بعض قدیم عمارتیں ایسی ہیں کہ ایک سادہ نظر میں وہ آدمیوں کے تو کیا جنوں، دیوتاؤں یا فرشتوں ہی کے کام معلوم ہوتے ہیں اسی طرح کے بہت

سے نشان سانچی میں ہیں۔ ایک مشہور انگریز استاد
سرجان مارشل نامی یورپ بھر سے کے ساتھ ہندوستان
کے جن خاص خاص آثار قدیمہ[1] کے نام گنانے ہیں ان میں انھوں نے
سانچی کے ٹوپوں کو بھی لیا ہے۔

سانچی :۔ شہر بھوپال سے (جو ہمارے دیس
کی ایک مشہور ریاست کی راج دھانی ہے) ——
میل دور ایک گاؤں کا نام ہے اور اسی کے پڑوس میں ایک
پہاڑ ہے۔ جہاں ڈھائی برس پہلے اور کچھ اس سے کم مدت
کے آثار ہمارے بڑوں کی یاد تازہ کرتے ہیں

اس علاقے پر کوئی بارہ میل کے پھیلاؤ میں
اس قسم کی بہت سی یادگار عمارتیں ہیں۔ سانچی پہاڑ پر چار
قسم کے آثار ہیں۔ ایک تو بھٹوں کے نام سے مشہور ہیں۔ جو
مہاتما بدھ جی کے چیلوں کی یادگار ہیں دوسرے ستون
جیسے مہاراجہ اشوک کی لاٹیں۔ جگہ جگہ پائی جاتی ہیں۔ تیسرے
بڑے بڑے ہال۔ جن میں پجاری اکٹھا ہوتے اور پوجا پاٹ
کرتے تھے، چوتھی خانقاہیں یا آشرم جن میں بھکشو[2]
رہتے تھے۔

بھٹے یا ٹوپ چھوٹے بڑے سیکڑوں ہی تو ہیں۔
سب سے بڑے کی شکل بس ٹوپ ہی جیسی سمجھو۔ اس کا
قطر ۱۱۰ فیٹ ہے۔ مگر بینو کے پاس ۱۲۱ ½ فیٹ ہوگیا
ہے۔ اور اونچائی ،، ½ فیٹ ہے

پھاٹک خاص کر بہت نشان دار ہیں ا
پر جو نقش و نگار ہیں وہ دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈا
دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ملائم لکڑی پر کسی بہت
کاری گر بڑھئی نے اپنا کمال دکھایا ہے کیوں کہ پتھر پر
قسم کا باریک اور نازک کام یوں تو ناممکن ہی سا معلو
ہے۔ پھر اس سے بھی بڑھ کے حیرت کی بات یہ ہے
دو ڈھائی ہزار برس پہلے کا یہ مہین کام اب تک جوں کا
موجود ہے۔ پھر جگہ جگہ ایسی ایسی مورتیاں بنی ہیں
بولنے کی دیر ہے دیسے اصل اور نقل میں کورکسر نہ

بڑی مشکل ہے بھلا کس کس چیز کو بتائیں او
چھوڑیں۔ دیکھو بھی، پھر کبھی دیکھا جائے گا۔ ابھی تو
اسی پر بس کرو۔ اور یہ سمجھ لو کہ سانچی کے آثار بھی ہما
دیس میں وہ چیزیں ہیں جن کا دنیا بھر میں نام ہے اور ا
اگر ہم فخر کریں تو کچھ بے جا نہیں۔

۴۔ اِجنٹا

اجنٹا کے غار ہمارے دیس کی نامی گرامی ا
بڑی ریاست حیدرآباد دکن میں اورنگ آباد سے کو
میل دور ہیں۔ مگر اورنگ آباد سے جانے میں راس
کٹھن پڑتا ہے۔ اس لئے عموماً جی، آئی، پی کے سٹ
جل گاؤں سے جانا ٹھیک ہوتا ہے وہاں سے ۵۰
کا فاصلہ ہے اور راستہ بھی ادھر سے کچھ سہل ہے
اجنٹا اصل میں ایک گاؤں کا نام ہے جو ال
کے پاس ہے۔ اسی کے نام پر یہ مشہور ہیں۔ یہ

[1] قدیم عمارتوں وغیرہ کو کہتے ہیں۔
[2] بودھ مت کے مرد سادھوؤں کو بھکشو۔ اور عورتوں کو بھکشنی کہے جاتے ہیں۔

مہاتما بدھ کے زمانے کی یادگار اور کوئی دو ہزار برس پہلے کی تہذیب کا گویا ایک صحیح نمونہ ہیں۔

اجنٹا کے غار ایک پہاڑی کو کاٹ کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ جو کوئی دو سو فیٹ اونچی ہوگی اور غار کوئی پانچ سو فیٹ کے پھیر میں ہیں۔ یہ کل ۲۹ غار ہیں اور ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عجیب بات ہے۔

ایک غار کی چھت میں ہاتھی گھوڑوں، پرندوں اور پھل پھلاری کی تصویریں ہیں، مہاتما بدھ اور ان کے چیلوں کی بہتیری تصویریں بہت ہی عجیب عجیب ہیں۔ ایک غار میں کسی جلوس اور جنگ کے نقشے کھینچے گئے ہیں اور دوسری عجیب عجیب تصویریں ہیں۔ ایک غار میں ایک شہزادی کی تصویر ہے جو غریب دنیا سے رخصت ہو رہی ہے۔ بعض سیلانیوں[۵] اور استادوں نے اس کی تعریف میں بہت کچھ لکھا ہے۔ ایک غار میں مہاتما بدھ کی ایک ۱۸ فیٹ کی مورتی ہے۔ ایک اور غار میں دو ہاتھیوں کی لڑائی دکھائی گئی ہے۔ اس کے سوا کچھ اور بھی تصویریں بہت اچھی اچھی ہیں۔ نقاشی اور مصوری کے لحاظ سے یہ غار خاص الخاص ہے۔ ایک غار میں بدھ جی مہاراج کے لڑکپن کی کچھ تصویریں ہیں اور کچھ ایرانی انداز کی ہیں۔

۴۔ ایلورا

ممالک محروسہ سرکار عالی دکن میں ایلورا ایک گاؤں کا نام ہے۔ جی۔ آئی۔ پی کے اسٹیشن نندگاؤں سے ۴۴ میل پر ہے۔

ایلورا میں ہندو، جین اور بدھ متوں کے مندر پانچ سو فیٹ بلند پہاڑی میں کاٹ کاٹ کے بنائے گئے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سب سے پرانا مندر حضرت عیسیٰؑ سے دو سو برس پہلے کا ہے اور سب سے نیا بھی سنہ ۱۲۰۰ء میں بنایا گیا۔

یہ غار خوب لمبے چوڑے ہیں۔ جن میں آٹھ آٹھ دس دس فیٹ کی مورتیاں دیوار کے سہارے کھڑی ہیں یہاں کوئی ۳۰ مندر اور مٹھ ہیں۔ اور کوئی ۲ میل تک ادھر ادھر پھیلے ہوئے ہیں۔

ایلورا میں کیلاش کا مندر خاص چیز ہے اور اس کے چپے چپے پر سنگ تراشی کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں۔

کیلاش سے لگی ہوئی چند اور دلچسپ یادگاریں ہیں۔ ٹھیک دکھن میں (۹) غار ڈھیر وار کے نام سے مشہور ہیں۔ اور بودھوں کے عمارتی فن کا نمونہ ہیں۔ ایک میں (۱۱۰) خوبصورت ستون ہیں۔ سب سے بڑا غار (۱۰۴) فیٹ لمبا اور (۴۰) فیٹ چوڑا۔

وشوکرما کا مندر ہمارے دیس کے سبھی مندروں سے اچھا مانا گیا ہے۔ جس کا دالان (۸۵) فیٹ لمبا اور (۴۵) فیٹ چوڑا۔ اور (۳۵) فیٹ اونچا ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ ایک ہی چٹان کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

دوتل دو منزلہ ستون کا غار ہے جو بالکل بودھوں کی تعمیر کا نمونہ ہے اور جس کا سب سے بڑا دالان (۱۱۰) فیٹ

۵؎ سیر یا سیل دلی کا خاص لفظ ہے "یہ سیلانی" ہم نے سیاح کی جگہ استعمال کیا ہے

لمبا اور ۶۰ فیٹ چوڑا ہے۔ ایلورا کی سب سے اعلیٰ
سنگ تراشی اسی میں ہے۔ اس سے اگلے غار میں راون کی
کھائی ہے جو برہمنوں کے زمانے کی پہلی نشانی ہے۔ اس میں
ہندو دیوتاؤں مثلاً درگا، لکشمی، وشنو، سیتا، کالی
گنپتی، شیو اور پاربتی وغیرہ کی کتھائیں نقش کی گئی ہیں۔

دس اوتار۔ برہمنوں کے زمانے کا سب سے
پرانا غار معلوم ہوتا ہے۔ جس کی تعمیر اور تراش بودھوں نے
شروع کی اور بعد میں برہمنوں نے ختم کی۔ اس کا بڑا دالان
۱۰۳ فیٹ لمبا اور ۴۵ فیٹ چوڑا ہے۔

کیلاش سے کوئی ڈیڑھ میل کے فاصلے پر جینیوں
کے بنائے ہوئے غار ہیں جو اندر سبھا کہلاتے ہیں، ان میں راجہ
اندر اور رانی اندرانی کی بے حد حسین مورتیاں ہیں۔ یہ عمارتیں
سنگ تراشی کے باریک نفیس اور نازک سے
نازک کام میں اوروں سے بازی لے گئی ہیں۔

غرض ایلورا کے غار بھی اجنتا کی طرح ہمارے دیس
کی قدیم تہذیب کا ہو بہو خاکہ ہیں۔ وہاں (ایلورا میں) عجیب
عجیب رنگین تصویریں ہیں جن کے رنگ اور نقش آج تک
اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور بنانے والوں کے کمال کو ظاہر
کرتے ہیں تو یہاں (اجنتا میں)، سنگ تراشی کے وہ نمونے
ہیں کہ دیکھنے والوں کے ہوش اُڑتے ہیں اور وہ بس دانتوں
تلے انگلی دبا کے رہ جاتے ہیں۔

۵۔ قطب مینار

یہ مشہور عمارت دِلّی شہر سے دکھن جانب ۱۱ میل
پرے بنی ہے۔ یہ مینار ۲۳۸ فیٹ بلند ہے اور ہمارے
دیس کے سب میناروں سے زیادہ اونچا ہے اندر اندر چکر
دار ۳۷۹ سیڑھیاں ہیں جن سے اوپر تک چڑھ جاتے ہیں
اور جہاں سے دور تک عجیب غریب نظارہ دکھائی دیتا
ہے۔

محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں جب دلی کو سر کیا
اور لاہور میں اس کی تاج پوشی کی خوشی منائی گئی تو قطب الدین
ایبک نے اس کی بنیاد ڈالی۔ سلطان تو قطب الدین کو اپنا
جانشین بنا کے چلا گیا۔ قطب الدین کے بعد شمس الدین
التمش دلی کا بادشاہ ہوا اور اسی کے زمانے میں اس
کی تعمیر ختم ہوئی۔

یہ نیچے سے اوپر تک لال پتھر کی بنی ہوئی ہے اور
اور سنگ مرمر کی پچی کاری سے پٹیاں یا دھاریاں ڈالی گئی
ہیں۔ جو بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ باہر باہر طرح طرح
کے بیل بوٹے بنائے گئے ہیں اور جگہ جگہ قرآن شریف کی
آیتیں کھدی ہوئی ہیں۔ جو خوش نویسی کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔

قطب مینار دیکھنے سے دل پر ہمارے بڑوں کے
بڑے حوصلوں عظمت اور جبروت کا سکہ بیٹھتا ہے۔

۶۔ جامع مسجد دہلی

شہنشاہِ اعظم شاہ جہاں کی بنوائی ہوئی دِلّی کی جامع
مسجد کو ہم جب جب دیکھتے ہیں تو اوبدا کے ہمارے دل میں
یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بنوانے والے سے دنیا میں اگر
کچھ بھول چوک ہوئی ہوگی تو یقیناً اللہ میاں نے اسے اپنی رحمت
سے ایسی نرالی مسجد بنانے کے بدلے میں معاف ہی کر دیا ہوگا
عجیب اتفاق ہے کہ ہمارے اس خیال کی تائید ایک

تاریخی واقعے سے ہوئی ہے۔ ایک دفعہ شاہ جہاں نے (خدا اس کی تُربت کو ٹھنڈا رکھے) خواب دیکھا کہ ہمارے سرکار حضرت محمد رسول اللہ صلعم اُس حوض کے کنارے بیٹھے وضو فرما رہے ہیں جو مسجد کے صحن میں ہے۔ اس لئے وہ مقام جہاں حضورؐ کو اس حالت میں دیکھا تھا شاہ جہاں نے ایک چھوٹے اور نازک سے کٹہرے سے محفوظ اور محدود کرا دیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ بے شبہ اللہ میاں کی جناب میں اس پاکیزہ، سادہ، صاف ستھری اور بڑی شان دار مسجد بنانے والے کی یہ دینی خدمت قبول ہوئی جس میں روزانہ خدا کے ہزاروں بندے خدا کا نام لیتے ہیں۔

اتنی بڑی اتنی وسیع اور عالی شان عمارت کو دیکھو، پھر ذرا کے ذرا ٹھہرو اور غور کرو تو پوری عمارت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سانچے میں ڈھال کے کھڑی کر دی ہے یعنی کوئی حصہ اور کوئی ٹکڑا بے جوڑ یا بے ڈول اور بے میل نہیں۔ پھر کمال یہ ہے کہ ایک ایک حصے کو اگر ایک ایک کرکے دیکھو تو وہ اپنی جگہ آپ اپنی بہار دکھا رہا ہے۔ دور پرے کسی اونچی جگہ سے دیکھو تو اس کا نظارہ اور بھلا معلوم ہوتا ہے۔ میناروں پر جو ۱۳۰ فیٹ اونچے ہیں چڑھ کے دیکھو تو پورے شہر اور آس پاس کا عجیب نقشہ نظر آتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ایسی ہی تصویر شاہ جہاں نے خواب میں دیکھی تھی پھر اُسی کے نمونے پر اِس کا نقشہ اُس نے خود ہی بنایا تھا۔

پوری عمارت لال پتھر کی ہے سنگ مرمر سے پچی کاری کی گئی ہے۔ تین عالی شان اور بہت ہی خوبصورت گنبد ہیں جو اُجلے اجلے مرمر کے ہیں۔ اسی طرح چاروں کونوں پر برجیاں اور تینوں دروازوں کے اوپر چھوٹی چھوٹی سفید مرمر کی گمزیوں کی قطاریں۔ بڑی ہی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔

۷۔ تاج محل

تاج دُنیا بھر کی اچھی سے اچھی عمارتوں کا سرتاج ہے اور سچ تو یہ ہے۔ یہ اس دنیا کی چیز نہیں معلوم ہوتی اس کے دیکھنے سے دل پر دو اثر ہوتا ہے اور ایسا کچھ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ٹھیک ٹھیک بیان نہیں کر سکتا ہے ہم ہندوستانیوں پر فرنگی لوگوں کا یہ اعتراض ہے کہ ہم عورت کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ اور اسے غلام بنا کے رکھتے ہیں۔ مگر بڑے افسوس کی بات ہے ممتاز محل اور اُس کی بے نظیر یادگار تاج محل کو وہ بھول جاتے ہیں جو ہندی عورت کی عزت اور سربلندی کی وہ اَمِٹ یادگار رہے جسے ساری دنیا لاجواب مانتی ہے۔ ہمارے دیس کی بی بیوں اور دیویوں کے فخر کے لئے تاج وہ چیز ہے کہ اس کے ہوتے ساری دنیا کی عورتوں میں ان کا سر بلند ہی رہے گا۔

تاج سچی محبت اور وفاداری کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے یہ کسی بے حد رس بھرے راگ کی مورتی ہے۔ یا یوں سمجھو کہ راگ دیوی نے یہاں پتھروں میں جنم لیا ہے

اس قسم کی عمارتیں عموماً حاشیے یا کسی تصویر کے فریم کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ یا کسی صندوقچے وغیرہ کی کہ اصل چیز اندر ہوتی ہے۔ مگر یاد رکھو تاج کو اگر تم نے اس

خیال سے دیکھا تو تمھیں مایوسی ہوگی بلکہ تاج خود اپنی جگہ ایک نگینہ ہے ترشا ہوا ، ایک تصویر ہے بے نظیر۔

ہمارے دیس کے بہت مشہور بادشاہ حضرت شاہ جہاں نے اپنی چہیتی ملکہ ارجمند بانو یا ممتاز محل کی یادگار میں اسے تعمیر کرایا اور گویا اسی کے نام سے یہ آج تک مشہور ہے یہ آگرہ چھاؤنی سے اُتر جانب کوئی ایک میل کے فاصلے پر جمنا کے کنارے پر ہے۔

یہ بجے پوری سنگ مرمر کے ایک اونچے سے صاف ستھرے اور بہت نفیس چبوترے پر بیچوں بیچ کھڑا ہے۔ چبوترے کے چاروں کونوں پر بڑے ہی سڈول اور نفیس و نازک مینار ہیں۔ گنبد تلے بے حد خوب صورت و خوش نما جالی دار مرمری پتھر کے جنگلے کے اندر شاہ جہاں سے دولھا اور اور ممتاز سی دُلھن کی قبریں بنی ہیں اللہ اکبر، سچ ہے کہ ع: "ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

تاج کی تعمیر کے لئے ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام ایشیا سے معمار، سنگ تراش وغیرہ بڑے بڑے کاری گر اکٹھا کئے گئے۔ اس کا نقشہ اُستاد عیسیٰ نامی نے بنایا تھا جو کوئی ترک یا شیرازی تھا۔ دس برس کی لگاتار اور زبردست مدد سے سنہ ۱۶۴۸ء میں کام ختم ہوا اور ایک کرور پچاسی لاکھ روپیہ خرچ آیا دیس دیس سے قیمتی پتھر اور دوسرے مسالے اکٹھا کئے گئے۔ اسی طرح دور دور سے قیمتی جواہرات لا لا کے جگہ جگہ بڑی خوب صورتی اور موزونی سے جڑے گئے سونے چاندی کے دروازے لگائے گئے جو ۱۷۶۱ء کی لوٹ مار میں جاٹ اکھاڑے گئے۔

اندرونی حصے میں وہ وہ بیل بوٹے اور پھول پتیاں بنی ہیں کہ دنیا کے پردے پر یہ نمونے کہیں اور نہیں ملتے اور یہ سب کام قیمتی پتھروں اور جواہرات اور سیپ وغیرہ سے کیا گیا ہے۔ باہر سے اس کی سوبھا اور اس کا چھاؤ ایسا کچھ ہے کہ دیکھنے والے کے دل پر ہمیشہ کے لئے اس کا نقشہ جم کے رہ جاتا ہے۔ غرض تاج ہی دنیا کی وہ لاجواب عمارت ہے جس کی پوری پوری تعریف کرنے سے بڑے بڑے ہار مان چکے ہیں۔ تو بھلا ہم کس گنتی شمار میں ہیں۔

جمنا پار سے تاج کو دیکھو تو کچھ اور ہی بات معلوم ہوتی ہے خاص کر چاندنی رات میں اس کی سیر بڑا ہی مزا دیتی ہے ہر سہونی چاندنی رات میں لوگ اسے دیکھنے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں وہاں ایک میلہ سا لگ جاتا ہے باہر کے لوگوں کے لئے مارچ یا اکتوبر کا مہینہ تاج کی سیر کے لئے مناسب ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دریا کے اُس پار تاج ہی کے جواب میں ٹھیک اسی کے نمونے پر شاہ جہاں ایک اور مقبرہ خاص اپنے لئے بنوانا چاہتا تھا اور دونوں کے بیچ دریا پر ایک پل بنوانے کا ارادہ تھا مگر افسوس کہ اس کی نوبت نہیں آئی۔ اور شاہ جہاں بس یہ ایک ارمان لے کر دنیا سے سدھارا

انا للہ و انا الیہ راجعون

جاپانی بچے

(از جناب چمن لال صاحب سیاح - امریکہ و جاپان)

میں ایڈیٹر صاحب پیام تعلیم کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے جاپانی بچوں کے حالات پر مضمونوں کا ایک سلسلہ لکھنے کی دعوت دی مجھے پیام تعلیم کے لئے مضمون لکھنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بچوں کا رسالہ ہے اور مجھے میرے اکثر دوست (BABY) بچہ کہہ کر پکارتے ہیں اور یقین جانو مجھے بچہ کہلانے اور بچہ بننے میں بہت ہی مزا آتا ہے اس لئے کہ بچے ہی دنیا میں سب سے زیادہ محبت کے قابل ہیں۔

میں جاپان میں کوئی ایک سال تک رہا۔ اس عرصے میں جس چیز کا مجھ پر سب سے زیادہ اثر ہوا۔ وہ جاپانی لوگوں کی اپنے بچوں سے محبت اور ان کی نگہداشت ہے دنیا کے کسی دوسرے ملک میں ماں باپ یا عام لوگ بچوں کی اس طرح ناز برداری نہیں کرتے جس طرح جاپان میں کرتے ہیں

جاپان کی کامیابی کی وجہ

جاپان میں۔ میں اکثر جاپانیوں ہی کے گھروں میں رہتا تھا۔ روزانہ بے شمار بچوں کو دیکھتا تھا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کسی جاپانی بچے کو میں نے روتے نہیں دیکھا۔ ایک مثل مشہور ہے کہ "جاپانی بچے روتے نہیں۔ اور پرندے گاتے نہیں"

آج کل دنیا بھر میں جاپان نے تہلکہ مچا رکھا ہے۔ امریکہ، انگلستان، اٹلی اور

چین ، یہ سب بڑے بڑے ملک جاپان کی طاقت سے گھبرا اُٹھے ہیں۔ تم بھی سوچتے ہوگے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک چھوٹے سے جزیرے میں بسنے والے چند کروڑ جاپانی جس کا آج سے کچھ دنوں پہلے نام بھی سننے میں نہ آتا تھا دنیا بھر کے لئے ہوّا بن گئے ہیں اس کے سبب تو بہت سے ہیں۔ جن کا میں نے اپنی کتاب "جاپان کے راز"[1] میں ذکر کیا ہے ان میں سب سے اہم سبب میرے خیال میں جاپانی بچوں کی اچھی تربیت ہے۔

جاپانی بچوں کی خوبیاں

جاپانی بچوں کی کچھ خوبیاں ہم نیچے لکھتے ہیں۔ یہ اس قابل ہیں کہ تم بھی انھیں اختیار کرو ا۔ سادگی۔ ۲۔ استقلال اور ایثار (دوسروں کی خواہش کو اپنی خواہش اور دوسرے کے فائدے کو اپنے فائدے پر ترجیح دینے کی عادت) (۳) ملک اور وطن کی محبت (۴) سچی اور مفید تعلیم (۵) اچھے اخلاق۔ (۶) قدرتی نظاروں سے محبت (۷) آپس میں محبت اور ہمدردی (۸) اپنے بڑوں کا ادب و احترام (۹) حفظانِ صحت کے اصولوں سے واقفیت (۱۰) کام کی محبت اور اپنی مدد آپ کرنے کا جذبہ

جاپانی بچوں کی یہی دس خوبیاں میرے مضمون کی بنیاد ہیں۔ آگے چل کر میں جاپانی بچوں کے بارے میں جو کچھ لکھوں گا وہ اُن ہی خوبیوں کے متعلق یا تو دیکھی ہوئی باتیں ہوں گی یا چند دلچسپ کہانیاں۔

بچوں کی تربیت

جاپان کے لوگ بچوں کو ننھے پن سے استقلال، وطن کی محبت اور دوسری اچھی باتوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ یہ چیزیں اُن کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے۔ جب تم چھوٹے چھوٹے تھے تو تم نے اردو کا قاعدہ اور اردو کی پہلی کتاب پڑھی ہوگی۔ اس میں بس یہی
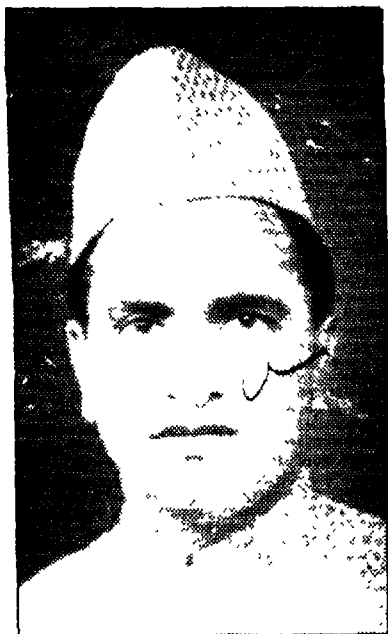
---

[1] یہ کتاب انگریزی میں ہے اور مکتبہ جامعہ کی طرف سے بہت جلد اردو میں شائع ہونے والی ہے

(چمن لال)

ایک جاپانی مدرسہ
میں کھانے کا کمرہ

ہوتا ہے کہ باپ حقہ پی رہا ہے اور ماں لڈو کھا رہی ہے۔ لیکن جاپان میں بچوں کو جواں مردی کے قصے پڑھائے جاتے ہیں (میں اس کے متعلق بچوں کی تعلیم کے عنوان سے علیحدہ مضمون لکھوں گا) بچے ان قصوں کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ان کے گانے کے لئے گیت بھی ایسے ہی تیار کئے جاتے ہیں جن میں بہادری کا ذکر ہو۔ کہانیاں بھی بہادروں کی سنائی جاتی ہیں۔ اب تم ہی سمجھو کہ جن بچوں کی زندگی کو شروع سے اس طرح بنایا جائے وہ کیوں نہ جواں مرد اور بہادر بنیں گے

رونے اور روٹھنے کی عادت جاپان کے بچوں میں بالکل نہیں پائی جاتی۔ اگر کھیل کود میں بچے کے چوٹ لگ بھی جائے تو وہ کبھی روتا نہیں۔ ہمارے ہندوستان میں ماں باپ اپنے بچوں کو خوب مارتے پیٹتے ہیں اور بعض تو ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں رسی سے باندھ کر لٹکا دیتے ہیں (تھیں غلط فہمی نہ ہو۔ بھائی مجھ پر یہ کبھی نہیں بیتی) لیکن جاپانی لوگ اپنے بچوں کو کبھی نہیں مارتے۔ اگر بچہ کوئی سخت قسم کی شرارت یا غلطی کرے تو اس کے لئے یہی کہہ دینا کافی سزا ہے کہ "کیا تم جاپانی نہیں ہو" یہی سب سے بڑی خفگی ہے۔ سنتے ہی بچہ شرمندہ ہو جاتا ہے اور اسے مارنے کی نوبت نہیں آتی۔

اگر بچے کسی تکلیف کی وجہ سے گھبرا جائیں تو ماں باپ یہ کہہ کر ان کی ہمت بڑھاتے ہیں کہ "تم اتنی سی تکلیف سے گھبرا گئے۔ لڑائی کے میدان میں جا کر کیا کروگے (جاپان میں فوجی تعلیم لازمی ہے اور ہر بچہ ملک کا جان نثار سپاہی ہے) یہ الفاظ سن کر بچے کی ساری گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے۔

جاپانی بچوں کی سادگی

جاپان کے بچوں کو شروع سے سادگی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ کوئی بچہ کسی قسم کے بال سر پر نہیں رکھ سکتا۔ سب کا سر قانوناً صفاچٹ ہوتا ہے۔ سب کی وردی ایک سی ہوتی ہے بند گلے کا کوٹ، فوجی ٹوپی اور پاجامہ، سب کالے رنگ کے۔ صرف دو جوڑے ہوتے

ہیں۔ زیادہ کپڑوں کا جھگڑا ہی نہیں رہتا اس سے ایک تو ماں باپ کو خرچ میں بہت کفایت ہو جاتی ہے دوسرے بچوں کو فیشن کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے بدقسمت ملک خصوصاً پنجاب میں ایسے ایسے نوجوان ہیں جو مہینے میں پچاس سے لے کر دو سو روپے تک خرچ کر دیتے ہیں۔ مگر جاپان میں کسی طالب علم کا خرچ بیس روپے (عـ۲۰) سے زیادہ نہیں ہوتا تمام طالب علم اپنی پیٹھ پر بستہ اٹھاتے ہیں اور وہ بھی فوجی طریقے سے۔ تاکہ آگے چل کر فوج میں سامان اُٹھانے کی مشق رہے۔

جاپان میں کیا بچے کیا بوڑھے کیسی ہی گرمی ہو چھتری نہیں لگاتے۔ البتہ بارش میں برساتی کا رواج عام ہے جو سر کو بھی ڈھک لیتی ہے۔ دھوپ سے بچنے کے لئے چھتری کا استعمال ایک قسم کی کم زوری سمجھی جاتی ہے اور اسے صرف عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

پچھلے ستمبر میں جب جاپان میں گرمی زوروں کی پڑ رہی تھی میں راجہ مہندر پرتاب کے یہاں سے ٹوکیو کے بڑے ڈاک خانے کو جا رہا تھا۔ دھوپ کڑاکے کی پڑ رہی تھی میں چھتری لگا کر چلنے لگا تو راجہ صاحب نے کہا کہ لوگ تم پر ہنسیں گے کہ مرد ہو کر چھتری لگاتے ہو۔ صرف بارش کے زمانے میں مرد چھتری استعمال کر سکتے ہیں۔ میں نے فوراً چھتری بند کر دی۔ میں نے امریکہ میں بھی یہی حالت دیکھی۔ مجھے تو اس دن سے ایسا سبق ملا ہے کہ ہندوستان واپس آکر سخت دھوپ میں بھی چھتری نہیں لگاتا۔

جاپانی بچے بالکل فضول خرچی نہیں کرتے۔ ان کے ماں، باپ انھیں جتنی رقم دیتے ہیں اسے وہ کتابیں خریدنے یا پہاڑوں جھیلوں اور سمندروں کی سیر کرنے اور کھیل کود کی چیزوں میں خرچ کرتے ہیں۔ ہمارے ہندوستانی بچوں کی طرح بازار کی گندی اور مضر مٹھائیاں کھا کر اپنا پیٹ خراب نہیں کرتے۔

جاپانی بچوں کی ورزش

جاپانی گھروں میں پلنگ، میز کرسی، تپائیاں وغیرہ کچھ نہیں ہوتیں۔ سب لوگ چٹائی کے فرش پر بیٹھتے اور اسی پر سوتے ہیں یہاں تک کہ جاپان کا وزیر اعظم بھی چٹائی کے فرش پر بیٹھ کر اپنے پوتوں سے کھیلتا ہے بچوں کے پڑھنے کے لئے گھروں میں ڈسک ہوتے ہیں اکثر بچے تو اپنے لئے ڈسک۔ اپنی کتابوں کی جلدیں قلم دان وغیرہ خود ہی بنا لیتے ہیں۔ اپنے جوتوں بلکہ مکانوں تک کی مرمت خود ہی کر لیتے ہیں۔ اور یہ سن کر تمھیں حیرت ہوگی کہ ان کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں ہوتی، بچوں کو مردانہ کاموں، ہمت اور استقلال کا سبق قدم قدم پر پڑھایا جاتا ہے۔ درختوں اور پہاڑوں پر چڑھنا، اپنی ہمت پر بھروسہ رکھنا۔ گرمی اور برسات میں بغیر چھتری کے باہر جانا۔ کبھی کبھی رات بھر جاگتے رہنا۔ پھانسی کا دردناک نظارہ دیکھنا۔ قبرستان یا مرگھٹ میں اندھیری راتوں کو جانا۔ ہولناک اور نفرت پیدا کرنے والی چیزوں کو دیکھنا۔ بچوں کی روز مرہ کی تعلیم میں شامل ہیں بچوں کو صحیح معنوں میں یہ بات بتائی جاتی ہے کہ خدا کے سوا کوئی طاقت تمھیں مار نہیں سکتی ہے۔ ملک اور بادشاہ کے لئے قربانی سے کبھی دریغ نہ کرو۔"

مگر ہمارے ہندوستان میں الٹی گنگا بہتی ہے ہمارے شہری بچوں کو ان کے ماں باپ دن رات ڈراتے رہتے ہیں۔ گرمی سردی میں انھیں باہر جانے سے روکا جاتا ہے کہ کہیں لو نہ لگ جائے کہیں نمونیہ نہ ہو جائے۔ بچے کوئی ہمت کا کام کرنے لگیں تو اماں جان کہتی ہیں بیٹا چوٹ لگ جائے گی غرض انھیں ہر طرح سست، آرام طلب اور کم حوصلہ بنایا جاتا ہے۔ اچھا سچ بتاؤ جاپانی بچوں کی طرح تم کوئی بھی بہادری کا کام کر سکتے ہو۔

مجھے خوشی ہے کہ جامعہ ملیہ میں (جہاں سے تمھارا رسالہ نکلتا ہے) ہونہار طالب علموں کو سادگی، وطن سے محبت سچائی، کام کرنے کا ولولہ اور ایسی ہی اچھی اچھی باتوں کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور میری آرزو ہے کہ گاؤں گاؤں اور محلے محلے میں ہمارے بچوں کو ایسی ہی تعلیم دی جائے۔

مہاتما گوتم بدھ

(ایک "بھکشو" کے قلم سے)

عجب خدا کی شان ہے کہ جہاں جس چیز کا سان گمان نہ ہو وہیں اللہ میاں اپنی قدرت کا تماشا دکھاتے ہیں۔ "بجلی کا خزانہ پانی کے دھارے میں (چھپا ہوتا) ہے" آگ کی چنگاریاں ہری ہری کنج گھاس ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے بُت شکن پیغمبر بت پرستوں میں پیدا ہوئے، حضرت موسیٰ جیسے نبی خاص فرعون کے گھر میں پرورش پاتے ہیں اور فرعون سے مغرور اور ظالم سے اپنا لوہا منواتے اور خدا کے سچے دین کا ڈنکا بجاتے ہیں۔ سری کرشن جی مہاراج راجہ کنس ہی کے گھر میں جنم لیتے ہیں، وہیں پلتے بڑھتے ہیں اور کنس کے زور ظلم سے پرجا کی جان چھڑاتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح ہمارے دیس میں ایک رِشی یا اوتار اور ہوئے ہیں، مہاتما گوتم بُدھ۔ اِس وقت ہم اُن ہی کا تھوڑا سا حال سُنانے کو بیٹھے ہیں *

اب سے کوئی ڈھائی ہزار برس پہلے کا ذکر ہے ہمارے دیس میں برہمنوں کا عام طور پر وہ اثر تھا کہ چھوٹا اور بڑا، فقیر اور امیر، راجا اور پرجا سب ہی تو اُن کے غلام تھے اور بڑے بڑوں کو اُن کے چرنوں پر جھکنا پڑتا تھا کیونکہ ان دِنوں بس وہی گویا خدائی نوجدار بنے ہوئے تھے اور ذات پات کے بندھنوں میں خدا کی خدائی جکڑی ہوئی تھی، اُنھوں نے کچھ ایسے جوڑ توڑ لگائے تھے کہ چاہے کوئی مرے یا جئے پر اُن کا اُلّو سیدھا ہی رہتا، وہ رات اور دِن عیش و عشرت میں گزارتے اور ہر وقت چین کی بنسی بجاتے۔

خدا اور خدا کے بندوں کے درمیان کوئی براہ راست تعلق نہ رہا تھا، کیونکہ برہمنوں نے اُن کی نجات کا ٹھیکہ لے رکھا تھا، یہ بات لوگوں کے لئے بہت بُری تھی اور یوں عام طور سے لوگ نیکیوں یا نیک کاموں سے دور جا پڑے تھے۔ نیچ ذاتوں کے لوگ اپنی ترقی کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے اُن کی نجات اور آخرت کی بھلائی بس اس میں تھی کہ وہ برہمنوں یا اور اونچی ذات والوں کی خدمت اور چاکری میں لگے رہیں اور اس کے عوض

ہیں وہ جو کچھ اپنی مہربانی سے اُنھیں دے دیں اُسے خوشی سے قبول کریں

اُسی زمانہ میں بنارس سے ڈیڑھ سو میل دُور اُتر کی طرف نیپال کی ترائی میں رحم اور انصاف کے اوتار مہاتما گوتم نے جنم لیا۔ اور ہمارے دیس کی مذہبی دُنیا کی کایا پلٹ کر دی۔ پورب سے پچھم اور اُتر سے دکھن سب جگہ بودھ مت پھیل گیا۔ یہ مذہب دنیا کا سب سے بڑا مذہب قرار پایا۔

یوں تو ایک زمانے کے بعد یعنی کوئی سنہء میں خاص ہندوستان میں تو بودھ لوگ نہیں رہے اور برہمنوں نے پھر سے اپنا اثر جما لیا مگر سیلون، برما، چین اور جاپان میں بدھ جی کے ماننے والے اب بھی ہیں۔

مہاتما گوتم نیپال کی ایک ریاست کپل وستو کے مہاراجہ سدھودن کے اِکلوتے بیٹے تھے۔ سدھودن چھتری قوم سے تھا۔ سدھودن کی دُو رانیاں تھیں مگر اولاد کسی سے نہیں تھی، آخر مہاراجہ کی عمر جب (۴۵) برس کی ہوئی تو بڑی رانی کی تقدیر جاگی اور وہ مہاتما گوتم جیسے اوتار کی ماں بنی اور اِسی سے وہ آج تک مہامایا دیوی کے معزز نام سے مشہور ہے۔ پیدائش کا سال بہت چھان بین کے بعد حضرت عیسیٰؑ سے (۵۶۲) برس پہلے کا تحقیق ہوا ہے۔

مہاراجہ سدھودن کو جتنی خوشی ہوئی ہوگی اُس کا اندازہ کون کر سکتا ہے، تمام ریاست میں طرح طرح سے خوشیاں منائی گئیں مگر خدا کی قدرت اسی بیچ میں مہامایا نے دُنیا سے مُنہ موڑا اور ساری خوشی رنج سے بدل گئی۔ پھر سب سے زیادہ فکر کی بات یہ پیدا ہوگئی کہ نجومیوں اور جوتش والوں نے بتایا کہ یہ لڑکا زندگی کی مصیبتیں دیکھ کے دنیا سے بےزار ہوکر اور دنیا چھوڑ کے جنگل میں اپنی زندگی کاٹے گا۔ اِس بات سے سدھودن بہت غمگین رہا کرتا اور اپنے بس بھر اُس نے ایسا بند و بست کیا کہ مہاراج کمار دُنیا کے رنج و غم کو دیکھنے ہی نہ پائے۔

مہاتما گوتم کی عمر ۱۸، ۱۹ سال کی ہوئی تو اُن کی شادی خود اُن کی خوشی اور مرضی کے مطابق اُن کی ماموں جائی جسودھرا نامی ایک بےحد خوب صورت لڑکی سے ہوئی۔ شادی ہوئے کوئی دس برس ہوگئے بر کھا رُت تھی جسودھرا کی طبیعت کچھ سُست تھی، بیٹھے بیٹھے اِن کا دل کچھ گھبرایا اور سیر کے لئے سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔

سوار ہوکے چلے تو راہ میں ایک بہت ہی ضعیف بُڈھے پھونس سے آدمی کو دیکھا کہ غریب اچھی طرح چل بھی نہیں سکتا تھا، آگے بڑھے تو ایک کوڑھی نظر آیا اور مہاراج کمار کے دل پر ایک اور چوٹ پڑی۔ اور آگے بڑھے تو ایک جنازہ نظر آیا اور معلوم ہوا کہ دنیا کی زندگی کی بس یہ حقیقت اور یہ آخری حد ہے۔ مہاراج کمار کے دل پہ یہ چوٹ سب سے

زیادہ کاری پڑی اور وہ ایک گہرے سوچ میں پڑ گئے۔

آخر جب اور آگے بڑھے تو ایک ندی پڑی' مہاراج کُمار نے رتھ سے اتر ندی میں اشنان کیا اور دل میں یہ ٹھانا کہ جب دنیا کی زندگی ناپائدار ہے تو اُس میں رہنا بے کار ہے۔ یہ طے کرکے پھر راج محل کا رُخ کیا تو راستے میں یہ خوش خبری ملی کہ مہاراج کمار کے بیٹا ہوا ہے۔ یہ سُن کے مہاتما گوتم نے اپنے دل میں کہا کہ اِس زنجیر کو بھی کاٹنا ہی پڑے گا۔

شہر میں طرح طرح کی خوشیاں منائی گئیں، خاص راج محل میں آدھی رات گئے تک ناچ رنگ رہا۔ جب نیند کے ماتے راجا اور پرجا، منتری اور سنتری غافل پڑے ہوئے تھے مہاراج کمار نے سوچا بس یہ موقع ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی بیوی اور بچے کی محبت نے زور کیا مگر یہ بس آخری دید کی نیت سے دونوں پر ایک سرسری نظر ڈال کے اور دل کڑا کر راج محل سے نکلے اور جنگل کا رُخ کیا، اُس وقت اِن کی عمر (۲۰) سال تھی۔

سات دن تک ایک باغ میں رہ کے سوچ بچار کرتے رہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے آخر (۷) دن کے بعد مشہور مگدھ راج کی راج دھانی راج گڑھ کا رُخ کیا، وہاں پہنچے اور کوئی (۴۔۵) برس گرد اودرک اور آرا دھ جیسے زبردست پنڈتوں سے بہت کچھ پڑھا۔ مگر اِس علم سے بھی دل کو تسکین نہیں ہوئی اور اُس وقت کی مذہبی جکڑ بندیوں اور بیہودہ رسموں سے دل اور اُچاٹ ہوا۔

آخر راج گڑھ کو بھی خیرباد کہہ کے پھر جنگلوں کی راہ لی، کھانا پینا چھوڑ دیا صرف جنگل کے پتوں سے پیٹ بھرتے تھے، کچھ روز کے بعد یہ بھی چھوڑ دیا۔ چھ برس ایک ہی جگہ رہے اور ایک دن غش کھا کے گر پڑے۔ اِس کے بعد پھر کھانا پینا شروع کیا آخر گیا جی میں نورِ حقیقی مل گیا اور یہ بات ثابت ہوگئی کہ نجات حاصل کرنے کے لئے جوگ رمانا اور فاقے کرنا بیکار ہے بلکہ اِس کے لئے صرف نیک کام کرنا لازم ہے۔

اب گوتم بدھ نے اپنے مت کا پرچار شروع کیا اور بے شمار لوگ اُس کے ماننے والے ہوگئے، برہمنوں کو اب کوئی نہ پوچھتا بلکہ ہر جگہ مہاتما گوتم ہی کا نام لیا جاتا۔

آخر حضرت عیسیٰؑ سے (۴۷۷) برس پہلے اسّی برس کی عمر میں مہاتما گوتم نے وفات پائی۔

مہاتما جی کے مذہبی قانون (شریعت) کے یہ دس حکم خاص ہیں:- (۱) کسی جاندار کی جان نہ لو (۲) چوری نہ کرو (۳) زنا سے بھاگو (۴) جھوٹ سے بچو (۵) کسی کو بُرا نہ کہو (۶) قسم نہ کھاؤ (۷) فضول باتیں نہ کرو (۸) کسی پر غصہ نہ کرو (۹) کوئی نشے کی چیز نہ استعمال کرو (۱۰) دیوی دیوتاؤں یا بھوت پریت کے چکر میں نہ پڑو +

پانچ پیشوں کے کرنے سے منع کیا :-
(۱) ہتھیار بیچنا (۲) لونڈی غلام بیچنا (۳) گوشت بیچنا (۴) شراب بنانا اور بیچنا (۵) زہر بیچنا۔

مہاتما گوتم کی عام اخلاقی یا انسانیت کی تعلیم یہ تھی کہ دانا ؤں کی خدمت کرو اور نادانوں سے دور رہو۔ اُس کی عزت کرو جو عزت کے لائق ہو۔ علم حاصل کرو اور عقل کی روشنی بڑھاؤ۔ ماں باپ کی اطاعت کرو اور بال بچوں اور کُنبے والوں کی مدد کرو۔ ایسا پیشہ کرو جس سے کسی کو دُکھ نہ ہو۔ خیرات کرو۔ ایمانداری ست رہو۔ نیک کاموں سے کبھی نہ ہارو۔ عاجزی اور انکساری اختیار کرو۔ قناعت اختیار کرو اور ہر حال میں شکرگزار رہو۔ مصیبت جھیلنے کی عادت ڈالو۔ اپنی عصمت اور پاک دامنی کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرو۔ دِل کو اتنا قابو میں رکھو کہ غم اور غصّے کا اُس پہ اثر نہ ہو۔ نجات پانے سے مایوس نہ ہو بلکہ یقین رکھو کہ جب تم اپنے آپ کو سُدھار لوگے تو آپ سے آپ نجات مل جائے گی۔ ساری دُنیا سے محبت کرو "

(از جناب محمد احمد صاحب سبزواری)

اگر تم سے سوال کیا جائے کہ ایک آدمی کیسے خوش حال ہو سکتا ہے تو تم یہی کہو گے کہ وہ خوب محنت سے ایسے کام کرے جن سے روپیہ ہاتھ آئے اس طرح تھوڑے عرصے میں وہ کافی دولت پیدا کر کے خوش حال بن جائے گا۔ بالکل ٹھیک مگر آج ہم تمھیں ایک نئی بات بتانا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ایک پورا ملک کا ملک کس طرح خوش حال اور دولت مند بن سکتا ہے۔

دیکھو ہندوستان، انگلستان اور امریکہ سب ملک ہیں۔ مگر ہندوستان ایک غریب ملک ہے، انگلستان اس سے زیادہ مالدار۔ اور امریکہ سب سے زیادہ۔ خوش حالی اور غربت کا اندازہ ملکوں کی آمدنی سے ہوتا ہے۔ نیچے ہم نے چند ملکوں کی آمدنیاں بتائی ہیں۔ ان سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ کون ملک کتنا مالدار ہے اور وہاں ہر شخص کی سالانہ آمدنی کیا ہے۔

نام ملک	سالانہ آمدنی فی شخص (روپیوں میں)
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۱۰۷۰
برطانیہ	۷۵۰
کینیڈا	۷۵۰
فرانس	۵۷۰
جرمنی	۴۵۰

ہندوستان ۵۴

تم نے دیکھا تمھارا ملک اور تمھارا دیس ان سب ملکوں کے مقابلے میں کتنا غریب ہے؟ آخر اس فرق کی وجہ کیا ہے یہ بھی سن لو۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ملک کے خوش حال ہونے کے لئے۔ وہاں مختلف قسم کے قدرتی ذریعے ہونے چاہئیں۔ قدرتی ذریعوں میں۔ پہاڑ، دریا ندیاں، جنگل، کانیں، زمین، آب وہوا سب چیزیں شامل ہیں۔ ان سب چیزوں سے ملک کے رہنے والوں کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں۔ دریاؤں سے آبشار اور ان سے بجلی حاصل کرکے روشنی کی جاتی ہے مختلف قسم کی کانیں اور مشینیں چلائی جاتی ہیں۔ دریاؤں سے نہریں نکالی جاتی ہیں اور ان سے آبپاشی کا کام لیا جاتا ہے اس کے علاوہ دریاؤں اور ندیوں سے سامان اور مسافروں کے لانے لے جانے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ جنگل سے لکڑی، شہد، موم چھال، لاکھ اور دوسری چیزیں حاصل ہوتی ہیں کانوں سے سونا، چاندی، لوہا، کوئلہ، تانبہ پیتل اور دوسری مفید چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔ زمینیں اگر اچھی اور مختلف قسم کی ہوں تو مختلف قسم کی پیداواریں حاصل ہوتی ہیں۔ عمدہ آب وہوا سے وہاں کے رہنے والوں کی تندرستی اور صحت اچھی رہتی ہے اب دیکھو تبت میں جو ہندوستان کے شمال میں ہے۔ بارش کم ہے۔ سارا ملک پہاڑی ہے۔ سردی بہت زیادہ ہوتی ہے کانیں نہیں ہیں۔ زراعت بہت کم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دولت مند اور خوش حال نہیں۔ یہی حال سائبریا کا ہے جو تبت کے بھی شمال میں ہے جنوبی امریکہ اور وسطی افریقہ کے جنگل کے حصے یا عرب اور آسٹریلیا کے ریتیلے علاقے ان باتوں کے نہ ہونے سے پست حالت میں ہیں جس طرح تم اپنی صرف دہی

کتابوں کو خرید لینے سے کامیاب نہیں ہو جاتے بلکہ ان کو پڑھنا بھی پڑتا ہے اسی طرح ایک ملک میں اگر یہ سب قدرتی باتیں موجود ہوں لیکن ان سے کام نہ لیا جا رہا ہو تو وہ بے کار ہیں۔ اس کی مثال خود ہمارا ملک ہے۔ ہندوستان ایک بڑا ملک ہے جس میں ہر قسم کی آب و ہوا، کانیں اور زمینیں موجود ہیں، پہاڑ، دریا، آبشار، جنگل کسی چیز کی کمی نہیں ہے مگر اس کے باوجود امریکہ، فرانس، جرمنی تو خیر بڑے ملک ہیں، بلجیم، ہالینڈ اور برطانیہ جیسے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے بھی ہندوستان بہت پست حالت میں ہے۔ تو اب معلوم ہو گیا کہ دوسرا سبب کسی ملک کی خوش حالی کا یہی ہے کہ ان قدرتی ذریعوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ورنہ ان کا ہونا نہ ہونا سب برابر ہے۔

ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ افریقہ کا وحشی ہو یا فرانس کا متمدن باشندہ قدرت کی طرف سے چند ضرورتیں ایسی لگی ہوئی ہیں۔ جن کے پورا کئے بغیر زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ ہر انسان کو بھوک پیاس لگتی ہے۔ پہننے کے لئے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ رہنے کے لئے مکان چاہئے اور اس میں انسان انسان سب آپس میں برابر ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ افریقہ کا وحشی معمولی کھانا کھاتا اور ناصاف[1] پانی پیتا ہے۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتا ہے۔ ایک جھونپڑے میں رہتا ہے۔ اور اس کی دوسری ضرورتیں بہت ہی کم ہیں۔ فرانس کا باشندہ عمدہ قسم کی غذائیں چینی کے برتنوں کانٹے، چھری، اور چمچوں کی مدد سے میز کرسی پر بیٹھ کر کھاتا ہے۔ پیاس بجھانے کے لئے شراب، سوڈا۔ اور صاف شفاف پانی پیتا ہے

---

[1] وہ پانی جو دواؤں اور دوسرے طریقوں سے صاف نہ کیا گیا ہو۔

عالی شان مکانوں اور محلوں میں رہتا ہے سواری کے لئے موٹر ہوتی ہے ۔ غرض اس کے پاس ہزارہا قسم کی ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جو ایک غریب وحشی کے گمان میں بھی نہیں آسکتیں ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے ۔ کہ خواہ چیزیں تھوڑی ہوں یا بہت یہ آتی کہاں سے ہیں ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے ۔ یہ کام مختلف قسم کے ہوتے ہیں ۔ تجارت ، زراعت ، ملازمت ، کانوں سے معدنیات نکالنا ۔ کارخانوں میں کپڑا تیار کرنا ۔ ڈاکٹری ، وکالت ، جوتے بنانا ، روئی دھننا ۔ مٹی کے برتن تیار کرنا یہ سب کام ہیں اور اس لئے کئے جاتے ہیں کہ ان سے کچھ آمدنی ہو اور اس سے آدمی اپنی ضرورتیں پوری کرے ۔ تو گویا کام اور محنت تو ہر شخص کرتا ہے مگر بعض ملکوں کے لوگ زیادہ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں اور بعض کے کم فرق کے اسباب یہ ہیں ۔

(۱) صحت ہونی چاہئے کیوں کہ طاقت ور اور تندرست آدمی ایک کم زور اور بیمار آدمی کے مقابلے میں زیادہ کام کرسکتا ہے ۔ بعض مقامات پر سب لوگ ہی طاقت ور اور مضبوط ہوتے ہیں مثلاً افغانستان کے باشندوں کو تم نے دیکھا ہوگا کہ ہم سے کتنے طاقتور ہیں ۔ پھر اچھی غذا ، صاف لباس اور ہوادار مکان کا بھی اثر صحت پر پڑتا ہے دیکھو ہمارے یہاں جو آدمی کارخانوں میں کام کرتے ہیں ۔ ان کو یہ تینوں چیزیں میسر نہیں ۔ اسی وجہ سے بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگلستان کا ایک مزدور ہمارے یہاں کے ڈھائی مزدوروں کے برابر ہے ۔

(۲) تعلیم ہونی چاہئے ۔ تاکہ آدمی اچھائی برائی کو سمجھ سکے اور جاہل لوگوں کے مقابلے میں سوچ سمجھ کر اچھا کام کرے

(۳) اخلاقی اچھائیاں بھی ہونی چاہئیں

کام چور، بددیانت، کاہل، شراب خوار
آدمی اگر ماہر بھی ہو۔ تب بھی یہ بُری عادتیں
اس کو تباہ کر دیتی ہیں تمہیں یقیناً ایسا
اتفاق ہوا ہوگا کہ کسی دوکان دار نے تم
سے جھوٹے وعدے کئے ہوں یا کسی چیز
کی قیمت زیادہ لے لی ہو۔ تو تم آئندہ
وہاں جانے سے پرہیز کرتے ہو۔

اب جس ملک کے لوگوں میں یہ تینوں
صفات ہوں گی وہ زیادہ محنتی ہوں گے
اور ان کا ملک خوش حال ہوگا، انسان
کو بہت قدیم زمانے سے اس بات کا
احساس ہوگیا کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے
بہت زیادہ کام نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس
کو چند ایسی چیزوں کی ضرورت ہے جو اس
کو مدد دے سکیں اور یہ امدادی چیز
آلات و اوزار کہی جانے لگی۔ بہت قدیم
زمانے میں یہ پتھر سے بنائے جاتے تھے
پھر لوہے کے بنائے گئے۔ اور اس کے
بعد یہی آلات مشینوں اور کلوں میں تبدیل
ہوگئے۔ ان مشینوں کی ایجاد سے کام میں
بہت زیادہ سہولت پیدا ہوگئی ہے۔
بڑی بڑی مشینیں جو بھاپ اور بجلی کے ذریعے
سے چلتی ہیں۔ ان کا ذکر تو چھوڑو، بال کاٹنے
کی چھوٹی اور معمولی مشین کو دیکھو کہ کتنی جلدی
اور کتنے عمدہ بال کاٹ دیتی ہے۔ اب
جس ملک میں اس قسم کی مشین اور کلیں زیادہ
ہوں گی وہ ضرور خوش حال ہوگا۔ جاپان
آج سے ۵۰، ۶۰ سال پہلے بہت ہی
خراب حالت میں تھا۔ مگر آج ان ہی
چیزوں کی بدولت اس کا شمار دنیا کے
بڑے بڑے ملکوں میں ہونے لگا

اب کام کرنے کے اور طریقے
ہیں۔ بعض جگہ ایک کام کو کئی چھوٹے چھوٹے
حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً پرانے
زمانے میں ایک چمار دو تین دن محنت
کرنے کے بعد ایک جوڑا جوتیاں تیار
کر پاتا تھا۔ مگر اب ایک جوتے کو کئی آدمی

مل کر تیار کرتے ہیں۔ ایک چمڑا چھیلتا ہے دوسرا اسے سیتا ہے تیسرا اس کو فرمے پر چڑھاتا ہے، چوتھا تلا لگاتا ہے، پانچواں ایڑی تیار کرتا ہے۔ چھٹا کیلیں جڑتا ہے اور ساتواں پالش کرتا ہے اور اس طرح یہ ساتوں آدمی مل کر پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ کام کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں جن کے تیار کرنے میں نہ معلوم کتنے ہاتھ لگے ہوں گے۔

اس کا تو تمھیں خود بھی تجربہ ہوگا۔ کہ اگر تم بازار سے ایک گز کپڑا لاؤ تو مہنگا ملتا ہے اور اگر پورا تھان خریدو تو کچھ کفایت ہو جاتی ہے۔ بالکل یہی حال اس آدمی کا ہے۔ جو کپڑے کے تھان تیار کرتا ہے اگر وہ ایک تھان بناتا ہے تو لاگت زیادہ آتی ہے اور اگر ۱۰ تھان بنائے تو کم ہوتی ہے۔ آج سب بڑے بڑے کارخانے کثیر تعداد میں مال تیار کرتے ہیں تاکہ اُن کی لاگت کم ہو جائے اور مال کم قیمت پر زیادہ فروخت ہو۔ تو اب جو ملک خوش حال بننا چاہتا ہے اس میں ان دونوں طریقوں کا رواج بھی ضروری ہے۔

ہمیں یہاں ایک بات کا ذکر اور کرنا چاہیے۔ وہ کسی ملک کا معاشرتی ماحول ہے اس سے یہ مطلب ہے کہ ہر ملک میں خاص رسم و رواج، عقائد اور اصول ہوتے ہیں اور کوئی شخص ان کو توڑ نہیں سکتا۔ اگر کوئی مسلمان شراب کی یا ہندو گوشت کی دکان کھولے تو تم اس کو کتنی بُری نظر سے دیکھتے ہو۔ جین مت کے لوگ مرغیوں، انڈوں اور شہد کی تجارت کو مذہباً ناجائز سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں موچی کا بیٹا پوجا پاٹ نہیں کرا سکتا۔ کمہار کے لڑکے کا یہ فرض ہے کہ وہ عمر بھر برتن ہی بناتے گویا ہمارے یہاں ہر پیشہ ذات بن گیا ہے۔ اور کوئی شخص اپنی ذات چھوڑنے

کے لئے تیار نہیں اگر آج کسی پڑھے لکھے
آدمی سے کہا جائے کہ وہ ایک ڈیری فارم
کھولے تو وہ یہ کام صرف اس وجہ سے
نہیں کرتا کہ لوگ اس کو گوالا کہیں گے اب
بھلا بتاؤ جس ملک میں اس قسم کی باتیں
ہوں وہاں لوگ مجبور ہوں گے کہ ایک ہی کام
کریں۔ خواہ اس کام کو ان کا دل چاہے
یا نہ چاہے۔ اس سے ملک کی خوش حالی
پر برا اثر پڑتا ہے اور جن ملکوں میں یہ باتیں
زیادہ ہوتی ہیں وہ خوش حال نہیں ہوتے
جیسا کہ ہمارا ملک ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ تم بڑے ہو کر اور پڑھ لکھ کر
اپنے ملک کو خوش حال بنانے کی کوشش کروگے
اور لوگوں کے دلوں سے یہ بات نکال دوگے کہ
کوئی پیشہ اختیار کرنے سے چاہے وہ کتنا ہی معمولی
ہو کسی کی ذات یا عزت میں فرق آ سکتا ہے

شمالی بنگال ۔ ایک عجیب و غریب پرندہ

حمید اللہ خان

امپیریل لائبریری کلکتہ

امپیریل لائبریری

(از جناب محمد حمید اللہ صاحب ۔ کلکتہ)

امپیریل لائبریری ہندوستان کی سب سے بڑی لائبریری ہے۔ آج سے کوئی چالیس برس پہلے ہندوستان میں عام لوگوں کے لئے کوئی خاص لائبریری یا کتب خانہ نہ تھا۔ اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان کے وائسرائے تھے انھوں نے عوام کی بھلائی کے لئے بہت سے کام کئے ہیں۔ امپیریل لائبریری بھی ان میں سے ایک ہے۔ لارڈ کرزن کا ارادہ تھا کہ ایک ایسا "شاہی کتب خانہ" قائم کیا جائے۔ جو اپنے نام اور مقام کی حیثیت سے اپنی مثال آپ ہو۔

۲۰ر جنوری سنہ ۱۹۰۲ء کی شام کو کلکتہ کے معزز حضرات و شرفا کے سامنے لارڈ کرزن نے امپیریل لائبریری کا افتتاح کیا۔ اس وقت اس لائبریری میں تقریباً ایک لاکھ کتابیں تھیں۔ پہلے یہ مٹکاف ہال میں تھی۔ بعد میں وہ عمارت ناکافی ثابت ہوئی۔ اس لئے اسے موجودہ عمارت ہی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت لائبریری میں سرکاری کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے علاوہ تقریباً ساڑھے تین لاکھ کتابیں ہیں سنہ ۱۹۳۰ء تک تو صرف گورنمنٹ آف انڈیا لائبریری کا خرچ برداشت کرتی تھی مگر اب لوکل گورنمنٹ یعنی گورنمنٹ بنگال نے بھی ۲۰ ہزار روپے سالانہ منظور کئے ہیں

امپیریل لائبریری میں مطالعے کے تین کمرے ہیں۔ ایک عوام کے لئے، دوسرا خاص لوگوں اور تیسرا عورتوں کے لئے مطالعے کے لئے داخلہ مفت ہے۔ البتہ داخلے کے لئے دفتر سے ٹکٹ لینا پڑتا ہے لائبریری صبح ۱۰ بجے سے شام کے سات بجے تک کھلی رہتی ہے۔ اتوار اور چھٹیوں کے دنوں میں ۲ بجے سے ۵ بجے شام تک۔ دارالمطالعے کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے۔ کہ تقریباً ۴۱ ہزار شخص سالانہ مطالعے کی غرض سے آتے ہیں۔

امپیریل لائبریری کا ایک حصہ "لوہار لائبریری" کے نام سے مشہور ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں لوہار ضلع بردوان کے ایک زمین دار مولوی سید صدرالدین مرحوم نے تقریباً نوسو باون کتابوں کا ایک مجموعہ گورنمنٹ کو تحفتاً نذر کیا۔ اس میں عربی اور فارسی کی قیمتی اور قلمی کتابوں کے علاوہ کچھ اردو کی کتابیں بھی ہیں۔ اسی بنا پر گورنمنٹ نے مولوی صدرالدین مرحوم کی یادگار میں اس شاخ کا نام "لوہار لائبریری" رکھا ہے اس کے علاوہ ہر سال گورنمنٹ کی طرف سے بھی اس لائبریری میں کتابوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

کوئی شخص دنیا کے کسی کونے میں ہو۔ اس لائبریری سے فائدہ اٹھا سکتا ہے صرف کتاب کی قیمت دفتر میں جمع کرنی پڑتی ہے اور کتاب واپس کرنے پر جمع کی ہوئی رقم واپس مل جاتی ہے ایک کتاب ایک مہینے تک رکھی جاتی ہے۔ اگر زیادہ عرصے کے لئے کتابوں کی ضرورت ہو تو لائبریرین یعنی مہتمم لائبریری سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ ہر سال تقریباً ۵۰۰، کتابیں کلکتہ سے باہر بھیجی جاتی ہیں۔ امپیریل لائبریری میں تقریباً ہر زبان کی کتابیں موجود ہیں مثلاً، انگریزی، فرانسیسی، جرمن، جاپانی، چینی، تبتی، روسی، عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی، گورمکھی، گجراتی، تامل،

تلیگو، مرہٹی، پالی وغیرہ، ہر سال تقریباً بیس ہزار روپوں کی کتابیں لائبریری کے لئے خریدی جاتی ہیں۔ ہندوستان و یورپ کی تقریباً تمام سرکاری چھپی ہوئی چیزیں امپیریل لائبریری میں موجود ہیں امپیریل لائبریری کو فخر ہے کہ اس قدر زیادہ ذخیرہ ان چیزوں کا اور کسی ہندوستانی لائبریری میں نہیں ہر ہر سال تقریباً تین چار ہزار کتابیں لائبریری کو مصنفوں کی طرف سے تحفتاً آتی ہیں کوئی ساڑھے تین سو (۳۵۰) رسالے اور اخبارات آتے ہیں۔ جن میں سے تقریباً نصف خریدے جاتے ہیں۔ باقی مفت آتے ہیں۔ اس سال امپیریل لائبریری میں ایک لائبریری ٹرننگ کلاس کھولی گئی ہے۔ اس میں ہندوستان کے ہر مقام کے طالب علم داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم لائبریری کے کام سے واقف ہوں۔

امپیریل لائبریری کے لائبریرین آج کل خان بہادر خلیفہ محمد اسد اللہ صاحب ہیں۔ آپ پہلے مسلمان اور دوسرے ہندوستانی ہیں۔ جنھیں یہ عہدہ ملا ہے آپ ۱۹۲۹ء میں کلکتہ آئے اور لائبریری کے پہلے مہتمم مسٹر چیپ مین کی جگہ دو سال تک کام کرتے رہے۔ اس کے بعد مستقل کردئے گئے۔ آپ نے لائبریری ایسوسی ایشن لندن کی فیلوشپ کا ڈپلوما بھی حاصل کیا ہے۔ آپ ہی پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں یہ ڈپلوما حاصل کرنے کا فخر ہے۔

(از جناب سید محمد ٹونکی صاحب بی اے جامعہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

صادق اور عزیز بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اسحاق آیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ صادق نے پوچھا اسحاق آج تم نے اتنی دیر کہاں لگائی

اسحاق :۔ بھائی صاحب میں پولو کا میچ دیکھنے گیا تھا۔ نواب صاحب بھوپال کی ٹیم آئی تھی۔ نواب صاحب ایسا اچھا کھیلتے ہیں کہ میں تو بیان نہیں کر سکتا۔ ہر شخص اُن کے کھیل کی تعریف کر رہا تھا۔ ہماری جماعت کے لڑکے وہاں تھے کھیل ختم ہونے کے بعد سب لڑکے ان کے کھیل کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ اسی میں دیر ہو گئی۔

صادق :۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو پولو سے دل چسپی ہے۔ بتاؤ تو اس کو پرانے زمانے میں کیا کہتے تھے؟

اسحاق۔ مجھ کو اس سے دل چسپی تو ہے لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ اگلے لوگوں نے اس کا نام کیا رکھا تھا۔

صادق :۔ اس کھیل کا نام چوگان تھا۔ اور پرانے زمانے میں بھی حکام اور رئیس ہی کھیلا کرتے تھے۔

اسحاق :۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ کن کن بادشاہوں کو چوگان سے دل چسپی رہی ہے؟

صادق :۔ ہندوستان کے سب سے مشہور اور بڑے بادشاہ اکبر کو چوگان کا شوق

تھا۔ اس کی تو یہ حالت تھی کہ رات
کی تاریکی بھی اس کو چوگان کھیلنے سے
نہ روک سکی۔ اس نے لکڑی کی گیند
بنوائی جس پر ایسا مصالحہ لگا ہوتا
تھا کہ گیند رات کو چمکتی تھی اور بادشاہ
اندھیرے میں بھی کھیلتا رہتا تھا۔

اسحاق:۔ اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اکبر
کھیل کود کا بڑا شوقین تھا۔ آپ مجھے
بتائیے کہ وہ کس کس طرح تفریح کرتا
اور اپنا دل بہلاتا تھا؟

صادق:۔ اس کو شکار کا شوق تھا۔ خاص طور
سے شیر اور ہاتھیوں کے شکار میں اس
کا دل لگتا تھا۔ ان کے شکار کرنے
اور پکڑنے کے نئے نئے طریقے نکالے
اور ان کو رواج دیا۔
اکبر سے پہلے تو شکاری یہ کرتے تھے
کہ شیر یا ہاتھی کے راستے میں گڑھا کھود
کر اس کو پتوں سے ڈھک دیتے تھے جب
وہ اُدھر آتا تو گر پڑتا اور پکڑا جاتا یا مارا جاتا۔ اکبر

نے ایک طریقہ یہ نکالا کہ کمانی میں زہر آلود تیر
لگا دیا۔ وہ کمانی درخت میں اس طرح لگائی
جاتی کہ ذرا سے اشارے سے تیر چھوٹ جاتا
لوگ شیر کو اس طرف لے جاتے اور جب شور
کرتے تو وہ اچھلتا اور اس طرح تیر سے زخمی ہو کر
گر جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گرمی کے موسم میں
سوار اور پیادے جنگل میں چھوڑے جاتے
وہ نفیریاں بجاتے۔ شیر اِدھر اُدھر گھبرا کر بھاگتا
پھرتا۔ اور آخرکار تھک کر بیٹھ جاتا یا لیٹ جاتا
اس حالت میں اس کی گردن میں پھندا ڈال کر
پکڑ لیا جاتا۔ سب سے نرالی ترکیب یہ نکالی
کہ درخت سے بکری کو باندھ دیا۔ ادھر ادھر
سوکھے پتے ڈال کر ان پر سریش چھڑک دیا۔
شیر کے غار کے پاس شور مچایا۔ وہ سونگھتا ہوا
بکری کی طرف چلا۔ قریب آیا تو پتیاں چپک
گئیں۔ اب ان کو چھڑایا۔ لیکن جتنی چھڑانے
کی کوشش کرتا اتنی ہی پتیاں اور چپک جاتیں
شیر جھنجھلاتا اور کھسیاتا ہو کر پڑ جاتا اور زندہ گرفتار
کر لیا جاتا۔

ہاتھیوں کو اس طرح پکڑوا تا کہ جنگل میں تین طرف سے ہاتھی چھوڑے جاتے جو جنگلی ہاتھیوں کو گھیرتے۔ پھر چوتھی طرف سی ہتنیاں لائی جائیں۔ ہاتھی ان کو دیکھتے تو پیچھے ہو لیتے اس وقت ہتنیوں کو قلعے کی طرف ہانک دیا جاتا۔ اور ایک ہی ہلے میں کئی کئی ہاتھی گرفتار کر لئے جاتے تھے۔

اسحاق:۔ بھائی صاحب اکبر کے شکار کے متعلق تو بہت کچھ آپ نے بتایا مجھے یہ تو بتایئے کہ اس کے علاوہ بھی اس کے دل بہلانے کا سامان تھا یا نہیں

صادق:۔ بادشاہ شکار کے علاوہ سیر سے بھی اپنا دل بہلاتا تھا۔ خاص طور سے کشمیر کی سیر سے۔ پہلے پہل جب اس کو جانے کا خیال ہوا تو مصاحبوں نے منع کیا کہ رستہ خطرناک ہے اور کہیں کہیں تو بالکل نہیں ہے۔ وہ اچھی چیزوں کو پسند کرتا تھا کشمیر جیسے خوب صورت ملک کو بھلا کیسے چھوڑ دیتا۔ حکم دیا کہ تین ہزار سنگ تراش اور دو ہزار بیل دار لگاکر جلد سے جلد سڑک تیار کرائی جائے۔ جب راستہ بن گیا تو خود اپنے لشکر کے ساتھ روانہ ہوا۔

تنگ راستہ کہیں اونچا کہیں ڈھلوان دونوں طرف اونچے اونچے پہاڑ جن میں سے کہیں کہیں چشمے نکلے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن اور چوٹیاں رنگ برنگ کے خوب صورت پھولوں سے ڈھکے ہوئے۔ کبھی بادشاہ پیدل چلتا۔ کبھی گھوڑے پر سوار ہوتا۔ تھک جاتا تو درختوں کے سایے کے نیچے آرام لیتا۔ مناظر کو خود دیکھتا اور دوسروں کو دکھاتا۔ غرض اسی طرح لطف اٹھاتا۔ سری نگر پہنچا وہاں قدرت خدا کی نظر آئی۔ شہر کے بیچوں بیچ صاف شفاف پانی کی جھیل۔ حکم دیا کہ اس میں کشتیاں ڈالی جائیں کئی سو کشتیاں تیار ہوئیں۔ ان میں سے بہت سی دو منزلی تھیں، ان کے آگے تختے لگوائے جن پر پھول دار درختوں اور پودوں کو لگوایا۔ اب جو کشتیاں چلیں تو بہشت کا دھوکا ہونے

لگا معلوم ہوا باغ ارم کی کیاریاں جھیل میں لگا دی گئی ہیں اور وہ خوشی میں اِدھر اُدھر جھومتی پھرتی ہیں

دن کو یہ نقشہ جمایا رات کو اور ہی لطف اُٹھایا۔ حکم دیا کہ تمام شہر میں چراغاں ہو پہاڑی کی چوٹی پر۔ جھیل کے کنارے کنارے کشتیوں کے تختوں پر چراغ رکھے جائیں۔ جب تمام چراغ روشن ہوئے تو دور سے ایسا معلوم ہوا کہ آسمان زمین پر چھا گیا ہے۔ اور تاروں سے پہاڑ۔ وادیوں اور جھیل نے اپنے اپنے دامن بھر لئے ہیں۔

اسحاق:۔ بھائی صاحب اکبر کو تو نئی نئی باتیں سوجھتی تھیں۔ ان باتوں سے خوب تفریح ہوتی ہوگی۔ اور دل بہلتا ہوگا

صادق:۔ اکبر ایجاد کا قائل تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا نے سمجھ دی ہے تاکہ ہم اُس سے کام لے کر اپنے آرام اور دوسروں کی راحت کی تدابیر نکالیں۔ خود بھی خوش ہوں اور دوسروں کو بھی خوش کریں

وہ ذرا ذرا سی باتوں میں ایجاد کی فکر میں رہتا تھا۔ چنانچہ محل اور دربار کی روشنی میں بھی ایجاد سے کام لیا۔

دربار کے سامنے ۴۰ گز اونچا ستون لگوایا اس پر کئی گز لمبا فانوس نصب کرایا اور اس میں ایک گز اونچی شمع جلوائی اس میں ایسی روشنی ہوئی کہ دور دور تک چیزیں نظر آنے لگیں۔

محل کی روشنی کے لئے بارہ چاندی کے لگن بنوائے۔ اُن میں کئی کئی گز اونچے فانوس، ہر فانوس کسی نہ کسی جانور کی شکل کا ہوتا۔ ہر جانور کی چونچ میں کافوری شمع تین تین گز کی لمبی ہوتی پھر روشنی کا یہ دستور کہ پہلی تاریخ سے تین تاریخ تک آٹھ آٹھ شمعیں روشن کی جاتیں۔ ۴ تاریخ سے ۱۰ تاریخ تک ایک ایک شمع کم کی جاتی۔ ۱۰ سے ۱۲ تک ایک ہی جلتی۔ ۱۳ کو چاندنی خوب ہی ہوتی ہے اس لئے ایک بھی شمع نہ جلائی جاتی۔ ۱۶ تک یہی حال رہتا۔ ۱۷ سے پھر جلائی جاتیں۔ اور جتنی اندھیری بڑھتی جاتی اتنی ہی شمعیں

بڑھائی جائیں۔ یہاں تک کہ بالکل آخری تاریخوں میں پوری شمعیں جلئیں اور محل کو منور کریں۔

اسحاق:۔ اکبر نے واقعی ہر موقع پر ایجاد سے کام لیا۔ ہر شخص اگر ایجاد کی طرف مائل ہو تو بہت کچھ ایجاد کرسکتا ہے اور کچھ نہیں تو نئے کھیل ہی جاری کرسکتا ہے۔ ہم سب کو نئی نئی چیزیں بنانے کی کوشش کرنی چاہیے

ریچھ کا آسان شکار

(محمد عمران صاحب فتح گڈھ)

ہردوار اور پہاڑی علاقہ کے لوگ ایک عجیب طریقے سے ریچھ کو مارتے ہیں۔ وہ چار لکڑیاں لے کر چلتے ہیں اور جب جنگل میں انھیں ریچھ ملتا ہے تو خاموش ایک طرف کھڑے ہو جاتے ہیں کیوں کہ آدمی ریچھ کے برابر نہیں دوڑ سکتا۔

ریچھ کی عادت ہے کہ جب دشمن سے دس قدم رہ جاتا ہے تو دونوں پاؤں پر کھڑا ہو کر تھپیڑ مارتا ہے اور اگر اس کے ہاتھ دشمن کی کوئی معمولی سی چیز بھی آجائے تو وہ اس کو نہیں چھوڑتا خواہ دشمن اسے مار ہی کیوں نہ ڈالے۔ چنانچہ جب ریچھ دو پاؤں پر کھڑا ہو کر تھپیڑ مارنے کو اُن کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ ذرا ہٹ کر اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی دے دیتے ہیں ریچھ اُسے مضبوطی سے پکڑ لیتا ہے اس ترکیب سے اس کا ایک ہاتھ بھر جاتا ہے تو وہ دوسرا ہاتھ چلاتا ہے اس میں بھی ایک لکڑی دے دی جاتی ہے تو وہ منھ بڑھاتا ہے جیسے ہی وہ منھ بڑھاتا ہے اس کے منھ میں بھی ایک لکڑی دے دیتے ہیں اور چوتھی لکڑی سے اسے مار مار کر ختم کر ڈالتے ہیں۔

ہمارِی عادتیں

(از جناب محمد اظہر علی صاحب لیکچرار اُردو فارسی اودے پور پرتاب کالج۔ بنارس)

انسان کا اچھا یا بُرا ہونا صرف اچھی یا بُری عادتوں پر موقوف ہے، اور عادت ایسی چیز ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے۔ نیک انسان میں نیک عادتیں ہوتی ہیں اور بُرے انسان میں بُری۔ عادت کی طاقت تمام طاقتوں سے زیادہ خیال کی جاتی ہے۔ انسان کو کسی بات کی عادت ہو جائے تو وہ اس کا غلام ہو جاتا ہے اور یہ عادت اسے جس طرف چاہتی ہے لے جاتی ہے۔ اب یہاں عادت کے چند مشاہدے پیش کرتے ہیں۔ اس سے تم ہماری بات کو جلد سمجھ سکوگے۔

اکثر بچوں نے سادھو دیکھے ہوں گے۔ مئی اور جون کی سخت گرمی میں جلتی آگ کے سامنے بھبھوت ملے بیٹھے رہنا اور جنبش نہ کرنا بعض بعض کا متواتر کئی کئی گھنٹے ایک پیر پر کھڑے رہنا، ہاتھ کو جس جگہ سے چاہنا۔ موڑ دینا وغیرہ وغیرہ۔ کیا یہ ایسی باتیں نہیں ہیں جو دیکھنے والوں کو حیرت میں نہ ڈال دیں لیکن یہ عادت ہی کی طاقت ہے جو ان سے ایسی ایسی صدہا کرامات کا ظہور کراتی ہے۔

انگریزی کا ایک مشہور انشا پرداز ہیزلٹ ہے، اس نے ایک ہندوستانی جادوگر کا تماشا دیکھا تھا، اس کے کرتب کو دیکھ کر حیران رہ گیا اپنے ایک مضمون میں وہ اُن کی تعریف کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ صرف عادت ہی کی طاقت ہے جو ایسے ایسے کام کراتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:-

"ہاں! یہ انسان کی ذہانت کا ادنیٰ کرشمہ ہے جو دیکھنے والوں کو ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے

لیکن دراصل یہ جسم کو بچپن سے اسی کام میں لگانے کا نتیجہ ہے اور مشق و عادت کا کرشمہ" اس موقع پر ایک نہایت پرلطف قصہ یاد آگیا۔ اگرچہ یہ قصہ بہت مشہور ہے اور اکثر بچوں نے سُنا ہوگا۔

ایک مرتبہ ایک فوجی سپاہی اپنا کھانا رکابی میں رکھے چلا آرہا تھا۔ "رائٹ" "لفٹ، لفٹ" رائٹ" تو اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اتفاق کی بات، کسی اسکول کا ایک ماسٹر بچوں کو ڈرل کرا رہا تھا۔ اس نے زور سے چلّا کر کہا "اٹینشن" فوجی سپاہی جلدی سے اپنے ہاتھ نیچے ڈال کر باقاعدہ کھڑا ہوگیا اور رکابی زمین پر گر گئی۔

اس قسم کی اور بہت سی باتیں ہیں جو انسان محض عادت کی وجہ سے کر بیٹھتا ہے، انسان تو انسان وحشی جانوروں میں بھی ہم کو ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً سرکس میں جانوروں کا انسانوں کی طرح کام کرنا صرف عادت اور تعلیم ہی کا نتیجہ ہے یہ عادت کی طاقت ہے جو پولو میں گھوڑوں کی ٹاپوں سے گیند اُچھلوا دیتی ہے۔

اب ہم مختصراً بتانا چاہتے ہیں۔ کہ ہماری عادتیں کس طرح بنتی ہیں۔ یعنی ہم کس طرح بُری عادتوں کا شکار ہوتے ہیں، اور کس طرح ہم نیک عادتیں اختیار کرسکتے ہیں۔

ایک گنجان جنگل میں جہاں سے کوئی انسان نہ گذرا ہو۔ اگر اتفاق سے وہاں سے کوئی انسان گذرے اور اس خودرو گھاس کو اپنے قدموں سے روندے پھر اسی طرح چند دوسرے شخص وہاں سے گذر جائیں تو یقیناً کچھ عرصے کے بعد وہ خودرو، لہلہاتی ہوئی گھاس پامال ہوجائے گی اور وہاں پر ایک راستہ بن جائے گا۔

ہماری عادتیں بعینہ اسی طرح بنتی ہیں۔ ہم ایک بار جب کسی برائی کے مرتکب ہوجاتے ہیں تو پہلی مرتبہ ہمیں کچھ افسوس ہوتا ہے۔ لیکن بار بار کرنے کے بعد ہمیں اس کی برائی نظر نہیں آتی ہے اور ہمارے صاف شفاف دل میں برائیوں کے لئے ایک راستہ بن جاتا ہے۔ اس لئے کسی ایسی بری عادت کو جس کی برائی تمہارے ذہن نشین ہے امتحاناً یا دیکھا دیکھی ہرگز ہرگز نہ کرو۔ اب ہم چند اُصول بتاتے ہیں جن پر کاربند ہونے سے تم اپنے میں نیک خصلتیں پیدا کرسکو گے۔

سب سے ضروری اصول یہ ہے کہ جس نیک بات کرنے کا تم نے مصمم ارادہ کر لیا ہے اس کو فوراً عملی صورت سے کرنا شروع کر دو۔ یہ نہیں کہ کل سے شروع کروں گا یا نیک ساعت دیکھ کر شروع کروں گا۔ مثلاً تم کو جھوٹ بولنے کی عادت ترک کرنا ہے اور تم نے مصمم ارادہ بھی کر لیا لیکن ایسا موقع آگیا کہ اگر تم سچ بولتے ہو تو تم کو نقصان ہوگا یا پٹنے کا اندیشہ ہے تو تم اس کا مطلق خیال نہ کرو اور سچ بولو بلکہ اپنے ماسٹر یا والدین سے ظاہر کر دو۔

" دیکھئے اگر میں جھوٹ بولتا تو اس طرح بات بنا کر بچ سکتا۔ لیکن میں نے عہد کیا ہے کہ جھوٹ نہ بولوں گا، اس لئے اب جھوٹ نہ بولوں گا۔ آپ مجھے جو چاہیں سزا دیں۔" قوی اُمید ہے کہ وہ اس سے خوش ہوں گے اور سزا دینے کے بجائے تم کو انعام دیں گے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ اگر تم نے کسی نیک کام کرنے کا عہد کر لیا۔ اور اُس کو فوراً شروع بھی کر دیا تو اس میں ناغہ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ عادت کو پختہ کرنے کے لئے کم از کم چالیس دن یا اسی طرح کسی اور مدت معینہ تک بلا ناغہ کرنے کی عادت ڈالنا چاہیئے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ جب تک عادت مکمل نہ ہو جائے اس وقت تک ہر روز رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو اُٹھنے کے بعد اس بات پر غور کر لیا کرو کہ تم اپنے ارادے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہو۔ بُری صحبت یا برے کاموں سے بچنے کا بہترین اصول کسی کام میں مشغولیت ہے۔ چنانچہ تھامس کارلائل کا مقولہ ہے:۔

" توہمات، وسوسے، رنج و آلام غصہ، بے کار انسان کے دماغ میں دوزخی کتوں کے مانند چکر لگایا کرتے ہیں۔ اور بھونک بھونک کر اس کو پریشان کرتے ہیں لیکن جونہی وہ کام میں مشغول ہو جاتا ہے۔ یہ کتے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور دُم دبا کر بھاگتے ہیں۔ اور اب وہ انسان ایک کامل انسان ہے۔"

پونا کی پارلیمنٹ

(از جناب ابوطاہر داؤد صاحب۔ بی ایس سی ٹی)

تم نے پونا کا نام سنا ہوگا۔ وہی جہاں سیواجی مرہٹہ سردار شائستہ خاں کی انگلیاں کاٹ کر بھاگ گیا تھا یہ پہاڑوں کے بیچ میں ایک خوب صورت شہر ہے جہاں کی آب و ہوا بے حد لطیف ہے ایسی نہیں جیسی تمھاری دلی کی جس میں جاڑوں میں خون جم جائے اور گرمیوں میں کھولتے ہوئے پانی کی طرح ابل جائے اور بھاپ کی طرح پسینہ کی شکل میں اڑ جائے۔ اپنے نقشے میں دیکھو یہ شہر بمبئی سے ۱۲۰ میل مشرق کی طرف واقع ہے۔ بمبئی سے پونہ کا راستہ پیچ در پیچ پہاڑیوں میں سے گذرتا ہے ریل لہراتی بل کھاتی پہاڑوں کی سرنگوں میں سے ہوتی ہوئی سورج سے آنکھ مچولی کا کھیل کھیلتی ہوئی چلتی ہے۔ برسات کے موسم میں پہاڑوں کی گہری وادیوں میں سے اٹھتے ہوئے بادل جیسے اجمیر شریف کی بڑی دیگوں میں سے دودھ کی بھاپ نکل رہی ہو۔

اس شہر میں زیادہ تر برہمن اور نیچ ذات کے ہندو (دھیڑ) آباد ہیں۔ برہمن بہت تعلیم یافتہ ہیں لیکن ذرا کٹ کھنے ہیں۔ ان کی زبان مرہٹی ہے۔ جو مجھ کو ذرا نہیں بھاتی۔ تم اگر منہ میں کنکری کا بُرادہ بھر لو۔ اس کے بعد جو کچھ بولنے کی کوشش کرو وہ بس مرہٹی ہوگی۔ تم کو یہ سن کر بہت خوشی ہوگی کہ یہاں کے مسلمان تمھاری طرح ہندوستانی بولتے ہیں سنتے ہیں کہ پہلے یہاں کی ہندوستانی زبان بے حد خراب تھی۔ مگر اب کچھ سدھر گئی ہے۔ کیوں کہ یہاں بہت سے اردو مدرسے اور اسکول ہیں۔ خاص مسلمانوں کے لیے سرکار نے ایک انگریزی اسکول کھولا ہے جس کا نام اینگلو اردو ہائی اسکول ہے۔ یہ اسکول تقریباً ۵۰ سال سے ہندوستانی اردو کی پرورش کر رہا ہے۔ یہاں سے ایک اردو رسالہ بھی نکلتا ہے جس میں تمام مضامین بچے ہی لکھتے ہیں۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر خان صاحب ہدایت اللہ ایم اے او کالج علی گڑھ کے گریجویٹ ہیں جنھوں نے اپنی تمام عمر اس اسکول کی خدمت میں گذاری ہے۔

پونا کے تعلیمی کاموں میں جو چیز مجھ کو سب سے زیادہ پسند آئی ہے وہ اس اسکول کی پارلیمنٹ ہے۔ پارلیمنٹ نام سن کر تمھارے کان کھڑے ہوں گے اور تمھارا خیال

لندن کی پارلیمنٹ کی طرف جائے گا۔ جہاں سے ہمارے ہندوستان پر حکومت کی جاتی ہے۔ ہاں یہ پارلیمنٹ بھی اسی کی ہو بہو نقل ہے۔ جہاں اس اسکول کے لڑکے حکومت کرنا سیکھتے ہیں۔ لیکن تم مجھ سے سوال کرو گے کہ یہ کن لوگوں پر حکومت کریں گے اس کے جواب میں میں تم سے کہوں گا کہ یہ خود اپنے اوپر حکومت کریں گے جو دوسروں پر حکومت کرنے سے کہیں بہتر ہے۔ اسی کی وجہ سے یہ اسکول یہاں پر لندن کے علی گڑھ کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اب میں تم کو بتاؤں گا کہ یہ کس طرح حکومت کرتے ہیں۔

ایک دن ہمارے پاس اس اسکول کی طرف سے ایک کارڈ آیا جس پر انگریزی میں اس پارلیمنٹ کا نام چھپا ہوا تھا اور اس کے نیچے تحریر تھا کہ ہم کو تماشائیوں کی گیلری میں بیٹھنے کی اجازت ہے

اب تم یہ تو سمجھ گئے ہو گے کہ یہ دعوتی رقعہ نہیں تھا بلکہ ایک قسم کا پاس تھا جیسے تمھارے صوبے کی کونسل میں تماشائیوں کو دیا جاتا ہے۔ اس پاس لے کر ہم ٹھیک وقت پر پہنچ گئے۔ پارلیمنٹ کے چند مہذب ممبروں نے ہمارا استقبال کیا اور ایک ہال میں ہمیں لے جاکر بٹھا دیا۔ ہال کے دو حصے کئے گئے تھے۔ ایک حصہ اتنا بڑا جیسا کسی بڑے بنگلے کا ہال، اور دوسرا حصہ ایسا جیسا اس کے سامنے کا برآمدہ۔ ان دونوں کے سامنے رسی کی حد کھنچی ہوئی تھی۔ اس چھوٹے حصے کو گیلری کہتے ہیں۔ جس میں بہت سے معزز مہمان کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انھیں میں اس اسکول کے استاد اور ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تھے گویا پارلیمنٹ کے انتظام میں استادوں کا کوئی ہاتھ ہی نہ تھا بلکہ وہ بھی ہماری ہی طرح دور سے بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اسی گیلری کے ایک حصے میں پردے کے پیچھے کچھ عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہال کے بڑے حصے میں ایک پلیٹ فارم تھا جس پر ایک میز اور کرسی رکھی تھی اور باقی حصے میں ڈیسک اور کرسیاں چنی ہوئی تھیں۔

ہم تھوڑی ہی دیر بیٹھے تھے کہ بجلی کی گھنٹی بجنا شروع ہوئی جس کی آواز پر چاروں طرف سے لڑکے آنا شروع ہوئے یہاں تک کہ ہال کی تمام کرسیاں بھر گئیں۔ یہ تمام لڑکے جن میں چھوٹے بڑے، ٹھنگنے، موٹے دبلے، گورے کالے، ہیکڑ، شریر اور سیدھے، سبھی شامل تھے۔ اس وقت سینہ پھلائے گردن کو اکڑائے تن تن کر چل رہے تھے۔ کیوں کہ ان کو احساس تھا کہ گیلری میں بیٹھے ہوئے تمام تماشائی ان کو رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ سب بچے ٹرکش کوٹ پہنے تھے جو یہاں کی یونی فارم ہے سر سب کے کھلے تھے اور ہاتھوں میں چند ورقوں کی ایک ایک کتاب بھی تھی۔

چند لڑکے کرسیوں کے اگلے دائرے میں بیٹھ گئے باقی ان کی پچھلی صف میں۔ آگے بیٹھے ہوئے لڑکے کیبی نٹ کے ممبر تھے یعنی حکومت کا اصلی انتظام ان ہی لوگوں کے قبضے میں تھا ان میں سے ایک لڑکا کتب خانے کا وزیر تھا۔ دوسرا کھیل کا وزیر تھا۔ تیسرا خزانے کا وزیر تھا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی صندوقچی بھی تھی جس میں ایک بڑا سا قفل پڑا ہوا تھا۔ چوتھا لڑکا وزیر اعظم تھا، جو ان تمام وزیروں کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ باقی چار لڑکے

ان وزیروں کے نائب تھے۔

پچھلی صف والے معمولی ممبر تھے جو ان وزیروں کے کاموں کا جائزہ لیتے تھے اُن پر نکتہ چینی کرتے تھے اور اگر یہ لوگ اپنا کام ٹھیک نہیں کرتے تھے تو ان پر ملامت کا ووٹ پاس کر کے وزارت سے علیحدہ کر دیتے تھے۔

جب یہ سب لوگ بیٹھ گئے تو ایک نوعمر لڑکا بغل میں کاغذات کا ایک پلندہ دبائے داخل ہوا اور سب سے اول صف میں پہلی کرسی پر بیٹھ گیا۔ معلوم ہوا کہ آپ اس تمام پارلیمنٹ کے سکریٹری ہیں چند منٹ کے بعد ہی سکریٹری کھڑا ہوا اور اس نے انگریزی میں پکار کر کہا "آنریبل دی اسپیکر"—— تم نے پڑھا ہوگا کہ جب کوئی بادشاہ اپنے دربار میں داخل ہوتا تھا تو نقیب فوراً آواز دیتے تھے کہ "نگاہ روبرو عالم پناہ تشریف لاتے ہیں"۔ اس جملے کے یہی معنی تھے کہ ہوشیار ہو جاؤ آنریبل اسپیکر تشریف لاتے ہیں۔ اتنا سنتے ہی تمام لڑکوں پر سکوت طاری ہو گیا۔ گویا کسی کھلنڈرے کلاس میں بڈھے ہیڈ ماسٹر صاحب مع بید کے تشریف لا رہے تھے تمام لڑکے ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ہم تمام تماشائیوں کی آنکھیں دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ ہم نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا داخل ہوا۔ جس کے چہرے پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دراصل اس میں سرجان سائمن کی روح حلول کر گئی ہے۔ یہ لڑکا پلیٹ فارم پر رکھی ہوئی کرسی پر بڑے ٹھاٹھ سے آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس نے جلسے کی کارروائی شروع کی۔

سب سے اول سکریٹری نے کھڑے ہو کر گزشتہ اجلاس کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جسے سب ممبروں نے منظور کیا اور اس پر صدر نے اپنے دستخط کر دئے۔ اس کے بعد صدر نے اجازت دی کہ انتظامی معاملات پر سوالات پوچھے جا سکتے ہیں۔

اتنا سننا تھا کہ پچھلی صف کے ممبروں میں سے ایک لڑکا کھڑا ہوا اور اس نے کہا کہ اینگلو اردو ہائی اسکول یونیفارم ایکٹ ؁۱۹۲۹ء کی رو سے اسکول کے تمام لڑکوں کو ترکش کوٹ پہننا چاہئے۔ لیکن مجھ کو افسوس ہے کہ موجودہ وزارت اس کے متعلق کوئی کارروائی نہیں کرتی—— مخالف بچوں نے ہیئر ہیئر کے نعرے لگائے۔

صدر نے اس اعتراض کو سن کر وزیر اعظم کو حکم دیا کہ اس کا جواب دے۔

وزیر اعظم نے جواب دیا کہ—— جناب میری وزارت کو قائم ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ عنقریب اس سلسلے میں مناسب کارروائی کی جائے گی

دوسرے ممبر نے خزانچی کو نشانہ بنایا اور کہا کہ بجٹ ابھی تک کیوں نہیں پیش کیا گیا۔

خزانچی نے جواب دیا کہ عنقریب پیش کیا جائے گا۔

تیسرے ممبر نے کتب خانے کے وزیر پر حملہ کیا کہ ریڈنگ روم (دارالمطالعہ) میں نئے رسالے کیوں نہیں رکھے جاتے۔

کتب خانے کا وزیر شاید زنگروٹ معلوم ہوتا تھا کیوں کہ وہ کھڑے ہو کر اپنے گلے سے آواز نکالنے کی

اسلامیہ ہائی اسکول ... انجمن ... جلسہ

ایک پردار مچھلی

کوشش کر رہا تھا لیکن کامیاب نہ ہوتا تھا آخر بہ مشکل تمام اس نے بھرائی ہوئی آواز اور زنانہ لہجے میں کہا —— "آ آ آنریبل ممبر صاحب غلط بولتے ہیں" —— اتنا سنتے ہی وہ شریر لڑکا جو اعتراض کر رہا تھا لہجے کو بدل کر بولا کہ —— "آپ مجھ کو جھوٹا بنا رہے ہیں۔ میں جناب صدر کو اس بات کی طرف توجہ دلاتا ہوں۔ آنریبل وزیر کی زبان پارلیمنٹ کے دستور کے خلاف ہے۔ صدر نے وہیں سے گرج کر کہا کہ کتب خانے کا وزیر اپنے الفاظ واپس لے گا۔

اب بے چارے وزیر کو سوائے اس کے کہ صدر کا حکم مانے اور کوئی چارہ ہی نہ تھا ادھر وہ اپنے الفاظ واپس لے رہا تھا اور ادھر مخالف بنچیں اپنی کامیابی پر قہقہے لگا رہی تھیں۔ چوں کہ شور ذرا زیادہ ہو گیا تھا اس لئے صدر نے "آرڈر، آرڈر" کے تین چار ہنٹر رسید کئے۔ اس وقت اس کا لہجہ ایسا تھا جیسا اس بیل کا جو پانی پی کر ڈکارتا ہے —— نتیجہ یہ ہوا کہ تمام لڑکے ڈری ہوئی بھیڑوں کی طرح خاموش ہو گئے

ابھی یہ خاموشی صرف چند ہی سیکنڈ تک رہی ہو گی کہ ہماری گیلری میں بیٹھے ہوئے تمام تماشائی صدر کے ڈکارنے پر کھل کھلا کر ہنس دئے اس سے ان لوگوں کے کام میں کچھ خلل پڑا۔ فوراً ہی ایک لڑکا کھڑا ہوا اور صدر کو توجہ دلا کر کہنے لگا کہ —— گیلری میں بیٹھے ہوئے لوگ ہمارے کام میں حارج ہو رہے ہیں صدر صاحب نے ہم لوگوں کو ایک بڈھے لاٹ صاحب کی طرح خاموش رہنے کی ہدایت کی مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ یہ لڑکے کتنے دلیر ہیں جو صاف اور سچ بات میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتے اور اپنے ہیڈ ماسٹر استاد اور دوسرے بزرگوں کے سامنے بھیگی بلی کی طرح اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے کر کے نہیں بیٹھتے

اس کے بعد صدر نے گھڑی دیکھ کر سوالات کے سلسلے کو ختم کر دیا۔ اور مباحثے کا پروگرام شروع کیا مباحثے کا مضمون یہ تھا کہ:-

"عورت سوسائٹی کے لئے ایک بوجھ ہے"

چند لڑکوں نے اس مضمون کی موافقت میں تقریریں کیں اور چند لڑکوں نے مخالفت میں۔ تقریریں اردو اور انگریزی دونوں میں ہوئیں۔ بعض لڑکے تقریر کرتے وقت سر سے پیر تک ایک خوب صورت ستار معلوم ہوتے تھے۔ جن کے میٹھے میٹھے بول شہد بن کر ہمارے کانوں کے راستے دل میں داخل ہو رہے تھے۔ بعض لڑکے جوش میں آکر بادل کی طرح گرجتے تھے اور اپنے مخالفوں پر موسلا دھار پانی کی طرح برس پڑتے تھے۔ ان کا رنگ انگارے کی طرح چمکتا تھا۔ اور ان کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں ہمارے دل ہل جاتے تھے۔ سارا ہال گونج اٹھتا تھا ہمارے منہ سے بے ساختہ واہ نکل جاتی تھی۔ اور ہاتھوں سے تالی کی آواز خود بخود پیدا ہو جاتی تھی غرض کہ یہ چھوٹے چھوٹے پٹاخے خوب خوب چھوٹے میں اس وقت اپنی بدقسمتی پر افسوس کر رہا تھا کہ مجھ کو ایسا اسکول کیوں نہ ملا۔ ورنہ میں بھی کچھ بول سکتا۔ دل میں ایک جوش پیدا ہو رہا تھا اور اسی کے ساتھ تمنا۔ کاش میں لوٹ پوٹ کر انھیں جیسا ایک لڑکا

... بن جاؤں۔

وہ عورتیں جو پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں واقعی مبارک باد کے قابل ہیں۔ انھوں نے اس موقع پر صبر کا ایک بڑا اچھا نمونہ پیش کیا۔ باتوں ہی باتوں میں یہ مشر پرلڑکے عورتوں کو بالکل ہی بے کار ثابت کر گئے۔ شاید انھوں نے عمر بھر میں ایسی شان میں لئے ہجو یہ قصیدے کبھی نہ سنے ہوں گے۔

کیا تم اپنے اسکول میں ایسی پارلیمنٹ بناؤ گے ؟ -

"زندگی کا راز"

(از جناب تمنائی)

موجوں والے ساحل کی تمنا کرتے ہیں،
ساحل والے موجوں کی !

دور کی روشنی بڑی پیاری معلوم ہوتی ہے۔
ہم جہاں ہیں وہاں نہ "خوشی" ملتی ہے نہ اطمینان۔
ہماری نگاہیں ہمیشہ دور دور دیکھتی ہیں۔
نزدیک کی چیزوں پر ہماری نظر نہیں پڑتی !
بادل، نیلے نیلے آسمان میں آفتاب کی سنہری شعاعوں میں چمکتے ہوئے بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہیں !
لیکن وہ ہیں کیا ؟
صرف بھاپ یا پانی کا دھواں !!
قوس قزح (دھنک)، کتنی حسین ہے، کتنی رنگین، کتنی دلکش !
لیکن وہ بھی صرف نظر کا دھوکا ہے (اور بس)
یہ سورج کی کرنیں ہیں جو ہوا میں پانی کے بکھرے ہوئے ذروں پر چمکتی اور طرح طرح کے رنگ اختیار کر لیتی ہیں !

اگر تم باغ میں ہو تو پھولوں کی خوشبو سے گھبرا جاؤ گے،
چڑیوں کی چہچہاہٹ سے پریشان ہو جاؤ گے،
اور کسی سنسان جگہ میں بھاگ جانا چاہو گے !
اطمینان کہیں بھی نہیں، کسی جگہ پر نہیں۔
تمہارے دل میں ہے !
تم جہاں چاہو حسن دیکھ سکتے ہو، خوشی پا سکتے ہو، مسرور رہ سکتے ہو !
سکون تمھارے دل میں ہے،
تم جہاں چاہو مطمئن رہ سکتے ہو !
اگر رنج میں ہو تو اسے راحت سے بدل دو !
اگر ویرانے میں ہو تو اسے باغ بنا لو !

ہر جگہ، ہر حالت میں خوش رہنا، ہنسنا سیکھ لو،
کہ یہی کامیاب زندگی کا راز ہے ! ...

ٹکٹ جمع کرنا

(از جناب سید محمد شمیم صاحب جامعی)

مجھے نہایت خوشی ہے کہ پیام بھائیوں نے اس تفریحی مشغلہ میں کافی دلچسپی لی۔ اور ٹکٹ جمع کرنے والوں کی تعداد دن پر دن بڑھ رہی ہے۔ اکثر بچوں کے پاس کافی ذخیرہ جمع ہوگیا ہوگا۔ اس لئے اب ضرورت ہے کہ ٹکٹ جمع کرنے کے کچھ اصول بھی بتائے جائیں۔
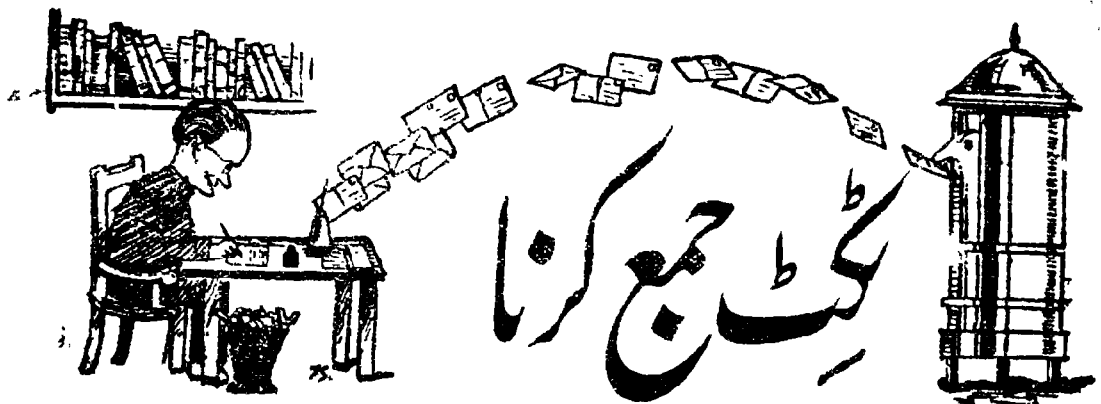
میرے پچھلے مضمون میں مالی فائدے پر زور دیا گیا ہے۔ کہیں بچوں میں یہ غلط فہمی نہ پھیل جائے کہ ٹکٹ جمع کرنے کا اصل مقصد مالی فائدہ ہے۔ ایسا بالکل نہیں ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے کے حقیقی فائدے مالی فائدے سے بہت زیادہ ہیں۔ مالی فائدہ دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ اس میں مالی نقصان نہیں ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے سے حقیقی فائدے حاصل کرنے کے لئے چند کتابوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس مضمون پر اردو میں کوئی اچھی کتاب نہیں لکھی گئی ہے انگریزی میں بہت سی مفید کتابیں موجود ہیں۔

ٹکٹ جمع کرنا اس کو نہیں کہتے کہ کوئی نیا ٹکٹ حاصل کیا جائے اور اس کو مرقع میں چپکا دیا جائے۔ جب تمھیں کوئی نیا ٹکٹ ملے تو اس کے متعلق تمھیں کافی معلومات حاصل

کرنے چاہئیں ۔

آج ہم تمھیں ٹکٹوں کے ملکوں کے متعلق کچھ بتانا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ کس ملک کا ٹکٹ ہے۔ جو لوگ انگریزی جانتے ہیں۔ ان کو زیادہ دقت نہ ہوگی کیوں کہ اکثر ٹکٹوں پر انگریزی میں ملک وغیرہ کا نام لکھا ہوتا ہے۔ لیکن بعض ایسے ملک بھی ہیں مثلاً اگرین (یورپ) وغیرہ جن کا رسم الخط انگریزی سے بھی بہت مختلف ہوتا ہے۔

اکثر البم ایسے فروخت ہوتے ہیں جن میں ہر ملک کے کچھ ٹکٹوں کی تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ تصویروں کو دیکھنے سے ملک کی شناخت (پہچان) ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کے پاس البم نہیں ان کے لئے ذرا دقت ہے

بعض ایسے ملک ہیں۔ جن کا اپنی زبان میں کچھ اور نام ہے اور انگریزی زبان میں کچھ اور۔ مثلاً ہنگری (یورپ) اپنی زبان میں "مگ یر" کہا جاتا ہے۔ جرمنی اپنی زبان میں۔ "ریش" یا "ریچ" کہتے ہیں۔ ٹکٹوں کا پہچاننا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے چند مشہور ملکوں کی فہرست نیچے دی جاتی ہے۔

ٹکٹ پر جو الفاظ ہوتے ہیں ان کے انگریزی نام

بایرن	BAYERN.
بویریا	BAVARIA
سکوسلوونسکا	CESKOSLOVENSKA.
زیکوسلوویکیا	CZECHOSLOVAKIA.
ڈیوٹشس اوسٹریش یا صرف اوسٹریس	DEUTSEH-OSTERRIECH.
آسٹریا	AUSTRIA
ڈیوٹشس ریش یا صرف 'ریش' (جرمنی)	REICH
اسپینیا (اسپین)	ESPANA
ای تھی اوپی	ETHIOPIE
ابی سینیا	ABYSSINIA
فلیپاس (فلپائن)	FILIPAS
ہلوٹیا۔ (سوئیزرلینڈ)	HELVETIA
آئی لینڈ (آئس لینڈ)	ISLAND

مگیر (ہنگری)	MAGYAR
نیڈرلینڈ (ہولینڈ)	NEDERLAND
نورج (ناروے)	NORGE
پوکٹا پولسکا (پولینڈ)	POCZTA-POLSKA
سویرج (سوئڈن)	SVERIGE
ایر (آئرلینڈ)	EIRE

انگلستان کے ٹکٹوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان پر ملک کا نام ہی نہیں رہتا ہے۔ صرف "پوسٹیج" یا "پوسٹیج اینڈ ریونیو" لکھا ہوتا ہے۔ اور وکٹوریہ، ایڈورڈ یا جارج پنجم کی تصویر ہوتی ہے۔

ملک کا نام معلوم ہو جانے کے بعد اس ملک کو نقشے میں دیکھنا چاہیے۔ اس کے بعد جغرافیے کی کسی کتاب میں اس کا رقبہ اور اس کا دارالسلطنت معلوم کرو۔ وہ ملک آزاد ہے یا دوسری حکومت کے ماتحت کس قسم کی حکومت ہے؟ بادشاہ حکومت کرتا ہے۔ تو بادشاہ کا کیا نام ہے یا اس ملک کے منتخب لوگ حکومت کا کام کرتے ہیں۔ (جمہوریت) تو صدر کا کیا نام ہے اس ملک میں کون سا سکہ چلتا ہے اس کا معلوم کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ ٹکٹ کی قیمت اسی سے معلوم ہوگی۔

یورپ اور امریکہ کے اکثر ممالک اور اُن کی نوآبادیات میں حسب ذیل سکّہ جاری ہے

۱۰۰ سینٹ = ایک ڈالر

ایک ڈالر تقریباً تین روپے کا ہوتا ہے جو باتیں تمھیں کتابوں سے نہ معلوم ہو سکیں اُن کو اپنے استاد یا بزرگوں سے دریافت کرو۔

اٹلی اور حبش کی لڑائی

(از جناب محمود علی خاں صاحب جامعی)

تم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہوگا یا شاید خود اخباروں میں پڑھا ہو کہ دنیا میں ایک نئی لڑائی چھڑ گئی ہے۔ یہ لڑائی اٹلی اور حبش کے درمیان ہو رہی ہے۔

اٹلی یورپ کے دکھن میں ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ پہلے یہاں بادشاہ کی حکومت تھی یہ بادشاہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن اب وہ صرف نام کا بادشاہ رہ گیا ہے۔ سارے ملک میں اس کے وزیر کا حکم و اختیار چلتا ہے اس وزیر کا نام مسولینی ہے اسے اٹلی کا ڈکٹیٹر کہتے ہیں ڈکٹیٹر سے مراد ایسا وزیر ہوتا ہے جو سیاہ و سفید کا مالک ہو جائے۔ اور اس کے سامنے بادشاہ یا صدر کچھ نہ کر سکے

حبش افریقہ کے پورب میں ایک ملک ہے تم نے شاید کہیں ایسے کالے آدمی دیکھے ہوں جن کے گھونگروالے بال اور موٹے موٹے ہونٹ ہوتے ہیں

انھیں حبشی کہتے ہیں۔ یہ حبشی ملک حبش کے رہنے والے ہیں۔ افریقہ کے سارے کے سارے ملک یورپ کی کسی نہ کسی سلطنت کے غلام ہیں کوئی انگریزوں کا غلام ہے کوئی فرانس کا کوئی اٹلی کا، کوئی بلجیم کا، بس ایک حبش ایسا ہے جو کسی کا غلام نہیں ہے بالکل آزاد ہے

تم سوچتے ہوگے کہ ایک ملک تو یورپ ہے

ہے اور ایک افریقہ میں پھر یہ دونوں آپس میں کیسے لڑ گئے
اس کی وجہ ہم تمھیں سمجھائیں گے۔ لیکن اس کے سمجھنے کے لئے
پہلے حبش کی اور بہت سی باتیں سمجھ لینا ضروری ہیں۔

حبش میں زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ آدمی بستے
ہوں گے اس کی راجدھانی اڈیس ابابا ہے۔ جہاں
حبش کا بادشاہ رہتا ہے۔ اس کے علاوہ دو بڑے شہر
اور ہیں۔ ایک ہرار اور دوسرا ڈودوا۔

یہاں تین قومیں آباد ہیں۔ قریب قریب آدھے
آدمی غلا قوم کے ہیں یہ سب کے سب مسلمان
ہیں۔ چوتھائی آدمی عمہاری قوم کے ہیں یہ لوگ عیسائی
ہیں۔ اور ان ہی کے ہاتھ میں حکومت ہے۔ اور باقی
چوتھائی آدمی سمالی اور دناکیل ہیں۔ یہ بھی مسلمان
ہیں۔ گویا حبش میں روپے میں بارہ آنے بھر مسلمان
رہتے ہیں۔

اپنے پیارے رسول اللہ کے زمانے میں جب
عرب والے مسلمانوں پر بہت ظلم کرنے لگے۔ اور ان کو
نماز پڑھنا۔ اذان دینا اور اللہ کا نام لینا بھی مشکل
ہو گیا تو رسول اللہ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ تم کچھ
دن کے لئے ہجرت کر کے حبش چلے جاؤ۔ آپ کے فرمانے
کے مطابق بہت سے مسلمان وہاں چلے گئے اس وقت
وہاں نجاشی بادشاہ کی حکومت تھی یہ بادشاہ عیسائی
تھا۔ لیکن اس نے مسلمانوں سے بہت اچھا سلوک کیا
اور انھیں آرام سے اپنے یہاں رکھا۔

پھر کچھ دن بعد رسول اللہ نے اس کو ایک خط
لکھا کہ تم ایک خدا پر ایمان لے آؤ اور مسلمان ہو جاؤ
اس پر نجاشی مسلمان ہو گیا کہتے ہیں کہ رسول اللہ کا وہ
خط اب تک حبش میں موجود ہے۔ اور سب بادشاہ بہت
سنبھال کر اسے رکھتے ہیں۔ نجاشی کے بعد اس کا بیٹا یا
پوتا پھر عیسائی ہو گیا۔

تم نے قصے کہانیوں میں ملکہ سبا کا نام تو سنا
ہوگا۔ حبش کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی ملکہ کی اولاد کر
بتاتے ہیں ان میں سے آخر کے تین بادشاہ خاص طور پر
مشہور گذرے ہیں۔ یعنی یوحنا، مینے لک، اور راس طفاری

حبش کے اکثر حصوں پر سوڈان کے مہدی کی
فوجوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ یوحنا نے ان کو نکال دیا۔ پہلے
وہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے نواب جگہ جگہ حکومت
کرتے تھے۔ وہ سب کے سب قریب قریب خود مختار
تھے۔ مینے لک نے ان سب کو ملا کر ایک مضبوط سلطنت
قائم کی اسی بادشاہ نے اٹلی والوں کو عدووا کے مقام پر
بری طرح ہرایا تھا۔ اس بات کو کوئی چالیس برس ہوئے
ہیں لیکن اٹلی والوں کے دل پر اس کا بڑا صدمہ تھا اور اسی کا
بدلہ لینے کے لئے انھوں نے اس لڑائی میں سب سے پہلے
عدووا پر حملہ کیا۔ اور اسے فتح کر لیا۔

مینے لک کے بعد اس کا پوتا تاملج یاسو بادشاہ
ہوا۔ یہ مسلمان ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد راس طفاری
کی حکومت ہوئی جو عیسائی ہے۔ راس طفاری نے ملک کا
بڑا اچھا انتظام کیا۔ فوجوں کو ترقی دی۔ ریل اور
سڑک بنوائی۔ تجارت کو بڑھایا۔ غرض اس نے رعایا
کی بھلائی کی بہت سی باتیں کیں۔

دو لحاظ سے حبش بڑا امیر ملک ہے۔ آج کل

دنیا کے بہت سے بڑے بڑے ملک کسی کے قرض دار ضرور ہیں۔ حتیٰ کہ انگریز بھی امریکا کے قرض دار ہیں۔ لیکن حبش کسی کا قرض دار نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں بہت سی اچھی اچھی چیزیں خوب افراط سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً کھجور، ربڑ، کیلا۔ اور قہوہ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ دھاتوں کے لحاظ سے حبش دنیا کے سارے ملکوں سے زیادہ امیر ہے۔

یہاں سونے، تانبے، ٹین اور مٹی کے تیل کی کانیں ہیں۔ اسی وجہ سے سب ملک اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور یہ چاہتے ہیں۔ کہ حبش ہمارے قبضے میں آجائے۔

حبش کے دکھن میں کینیا اور یوگنڈا کے ملک ہیں۔ یہ انگریزوں کے ماتحت ہیں۔ اتر اور پچھم میں مصری سوڈان ہے۔ یہ بھی انگریزوں کی نگرانی میں ہے۔ تم نے شاید سنا ہوگا کہ مصر میں ایک بڑا بھاری دریا ہے۔ جسے دریائے نیل کہتے ہیں۔ مصر کی ساری سرسبزی اور شادابی اسی دریا پر منحصر ہے اگر یہ دریا نہ ہو تو مصر ایک ریگستان بن جائے مصر میں بڑی اچھی روئی پیدا ہوتی ہے۔ اور اسی روئی سے انگریز کپڑا تیار کرتے اور خوب روپیہ کماتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اتنی اچھی روئی دریائے نیل کے پانی کے اثر سے پیدا ہوتی ہے اس کے پانی میں ایسی مٹی ملی ہوئی ہے جو روئی کی پیداوار کے لئے بہت مفید ہے۔ یہ دریا تاناجھیل سے نکلتا ہے اور تاناجھیل ہے حبش میں۔ اگر کہیں تاناجھیل پر بند باندھ کر دریائے نیل کے پانی میں سے یہ عمدہ مٹی چھان لی جائے تو حبش میں تو اچھی سے اچھی روئی پیدا ہونے لگے اور مصر میں روئی کی پیداوار خراب ہو جائے جس سے انگریزوں کی ساری تجارت ماری جائے۔ اسی لئے انگریزوں کو حبش کے معاملے میں بڑی فکر لگی رہتی ہے

حبش کے پورب میں پہلے سمندر تھا یعنی حبش کا ملک سمندر تک پھیلا ہوا تھا۔ تم جانتے ہو آج کل ساری تجارت سمندر سے ہوتی ہے اس لئے لوگ سمندر کے کنارے کا ملک بہت پسند کرتے ہیں جس ملک کے پاس سمندر کا کنارہ نہیں اس کے پاس سمجھو کچھ بھی نہیں۔

فرانس، اٹلی اور انگریزوں کا حبش پر پہلے ہی سے دانت تھا۔ انھوں نے موقع پا کر سمندر کے کنارے کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اٹلی نے تو اتر کا ملک اریٹریا اور دکھن کا ملک شمالی لینڈ، لیا اور فرانس اور انگریزوں نے بیچ کا سمالی لینڈ دبایا۔ اس کے بعد سے یہ تینوں اس کوشش میں رہے کہ ہم حبش پر زیادہ سے زیادہ اثر جمالیں۔

ادھر مسولینی پر جو اٹلی کا ڈکٹیٹر ہے ایک یہ مصیبت آئی کہ اس کے ملک کی مالی حالت خراب ہو گئی اور روپے پیسے کی کمی رہنے لگی۔ دوسرے اس نے سوچا کہ اگر میں کوئی بڑا بھاری کام کر کے نہ دکھاؤں گا تو سارا ملک مجھے نکال باہر کرے گا اور میری کوئی حیثیت نہ رہے گی اس لئے اس نے سوچا کہ حبش نرم چارہ ہے اسے فتح کر لینا چاہئے۔

لڑنے کے لئے تو لوگ بہانہ ڈھونڈھا کرتے ہیں۔ حبش کے دکھن میں اٹلی کی سمالی لینڈ سے ملا ہوا

مسعد امنی

ایک مقام ہے جہاں ہوا ، ۔ اس جگہ دونوں ملکوں کی منہ کو آتی ہے ۔ کچھ جھنجھلا کر سر جو کہتے سب یہی ہیں کہ بڑے ٹکڑے اس پر آکر گرے اہ ۔ اٹلی نے پار سال اس بند کر دیا۔ ن کا مقابلہ کیا بس اس

پتھروں کے گرنے کی جگہ

کہیں پڑی سو رہی تھیں جاگیں اور ہے خوب تیاریاں ہونے چاروں طرف گھاس ہی گھاس کی حبش ۔ اٹلی کے پاس پاس پانچ چھ سو ہوائی جہاز ہیں ۔ حبش کے پاس کل بارہ اسی طرح اٹلی کے پاس لڑائی کا اور سامان بھی بہت زیادہ ہے اور حبش کے پاس بہت تھوڑا ہے اس درمیان میں بہت سے لوگ بیچ میں پڑے ، انگریز ، فرانس ، روس سب نے کوشش کی ، مسولینی کو سمجھایا ، بجھایا ۔ لیکن وہ کسی طرح نہ مانا اور ابھی چند دن ہوئے کہ حبش پر حملہ کر دیا اب لڑائی دو جگہ ہو رہی ہے ۔ ایک تو اٹلی نے ارٹریا اریٹریا کی طرف سے حملہ کیا ہے اور دو شہر یعنی عدی غراط اور عدوا فتح کر لئے ہیں ۔ اور دوسرے دکھن میں سمالی لینڈ کی طرف سے ۔ ممکن ہے جب تک یہ مضمون چھپ کر تمھارے پاس پہنچے وہ اور شہر بھی فتح کر لے ۔ کیونکہ اس کی کوشش یہ ہے کہ دونوں طرف کی فوجیں بڑھتے بڑھتے حبش کی راجدھانی ادیس ابابا پر قبضہ کر لیں تو گویا حبش فتح ہو گیا۔

جن ملکوں نے بیچ بچاؤ کی کوشش کی تھی اور جو یہ چاہتے تھے کہ لڑائی نہ ہو وہ اٹلی کی اس حرکت سے بہت خفا ہیں اور اس کوشش میں ہیں کہ اٹلی کے بیچ میں دخل دیا جائے اور اسے لڑائی لڑنے سے روکا جائے ۔ لیکن اٹلی اس کی پرواہ نہیں کرتا ۔ وہ سب سے مقابلہ کرنے کو تیار ہے ۔ اگر کہیں سچ مچ ان ملکوں نے بیچ میں دخل دیا تو ممکن ہے اٹلی ان سے بھڑ جائے اور پھر اٹلی کے بھی کچھ حمایتی پیدا ہو جائیں اس طرح دنیا میں بڑی زبردست لڑائی چھڑ جائے گی۔

لیکن ہماری تو یہی دعا ہے کہ خدا ساری دنیا کو اس آفت سے بچائے رکھے اور بیچارے حبش کی آزادی بھی باقی رہے

عقاب

(از رقیہ ریحانہ)

پہاڑ کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب وادی ہے۔ جدھر دیکھو گھاس کا فرش۔ ننگے پاؤں بھی چلو تو ایسا معلوم ہو کہ پیر میں کسی ہوشیار کاریگر کا بنایا ہوا بہت نرم چمڑے کا جوتا ہے، بالکل ٹھیک، نہ ڈھیلا نہ تنگ، وادی میں چھوٹا سا دریا بہتا ہے۔ یہ پہاڑی چشمہ ہے اس لئے پانی صاف ہے جیسے آئینہ اور ٹھنڈا اولا۔ دریا سے کچھ ہٹ کر ذرا اونچے پر بستی ہے۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک، ادھر ادھر سفید سفید مکان چھتیں ڈھلوان سرخ سرخ۔ بازار بڑے سلیقہ کا، دکانیں خوب سجی ہوئی، چوکھٹوں اور دروازوں پر سبز رنگ، جیسے ابھی کل ہی کسی نے کیا ہو۔ گاؤں کے اردگرد دھان کے لہلہاتے کھیت، کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

کھیتوں سے پرے بھی ہر جگہ سبزہ ہی سبزہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ گھاس کے دن یہاں پھرے ہیں اور یہاں ہوا پانی اسے خوب راس آیا ہے۔ مگر ذرا دیکھو تو اس کی شوخی۔ پیٹ کیا بھرا کہ لگی دور کی سوجھنے۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ لگیں پہاڑ پر بھی چڑھنے۔ پہلے تو اس کی شوخی دیکھ کر یہ پرانی پرانی چٹیل چٹانیں، جنھوں نے بہتیرے نرم گرم سہے ہیں، مسکرائیں، ایک چٹان نے دوسری سے کہا:۔ "اری بہن۔ تم نے دیکھا، یہ ننھے ہرا ہرا سا کیا ہے جو ہر گھڑی میرے پیروں پر سر سر رینگتا ہے؟" دوسری بولی:۔ "ہے کون، بدتمیز ہے، تم نے خواہ مخواہ کو منہ لگا لیا ہے۔ کل میرے تلوے میں بھی تو گدگدی کر رہی تھی۔ بڑی آئی کہیں کی!" چٹانوں میں روز ایسی ہی باتیں ہوتیں مگر بی گھاس اپنا کام کئے گئیں۔ پہاڑ پر چڑھنے میں دم پھول پھول جاتا تھا مگر اس نے جو ٹھان لی تھی وہ کر ہی گذری۔ چٹانوں کی بولی یہ خوب سمجھتی تھی۔ انھیں برا بھلا کہتے سنتی تو جی ہی جی میں کہہ لیتی:۔ "کئے جاؤ بک بک اور ہنسے جاؤ مجھ پر۔ مگر بیگم ہنسنا اسی کا جو آخر میں ہنسے۔ میں نے جو جی میں ٹھانی ہے وہ میں خوب جانتی ہوں۔ اور دیکھنا، اللہ نے چاہا تو ایک دن کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ یونہی چھوٹے چھوٹے قدموں سے بڑی بڑی منزلیں طے ہو جاتی ہیں۔" غرض ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ چڑھتے چڑھتے اس نے کوئی آدھی چٹانو

کو بالکل ڈھک لیا۔ چٹانوں نے سوچا کہ یہ تو ہنسی ہنسی ہیں منہ کو آتی ہے۔ کچھ جھنجھلا کر سر جو ہلایا تو پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے اس پر آکر گرے اور آگے جانے کا راستہ بند کر دیا۔

پتھروں کے گرنے کی جو آواز ہوئی تو بی کائی جو کہیں پڑی سوری تھیں جاگیں اور انگڑائی لے کر جو دیکھا تو چاروں طرف گھاس ہی گھاس کی عملداری ہے۔ اس پر انھیں بھی کچھ طیش آیا۔ آگے بڑھ کر بولیں کہ بس مذاق ہو چکا۔ اب آگے قدم بڑھایا تو اچھا نہ ہوگا۔ یہ میرا علاقہ ہے۔ تیرے لئے تو نیچے سارا میدان چھوڑ دیا ہے، وہاں کیوں نہیں جاتی۔ ہمیشہ پرائی چیز ہی کو تکتی ہے۔ ندیدی۔ خبردار جو ادھر کا رخ کیا۔" تھوڑے دنوں میں کائی نے ان سب اڑتے ہوئے پتھروں کو اپنی کاہی وردی پہنا کر اپنے لشکر میں داخل کر لیا تو ان کے بھی ذرا پر نکلے۔ سوچا کہ گھاس کی طرح ذرا آگے قدم بڑھاؤں اور پہاڑ کی چوٹی پر بھی اپنا قبضہ جماؤں۔ مگر یہ چٹانیں ہیں کہ اللہ کی شان۔ انھیں کسی اور کا لباس نہیں بھاتا۔ ان کی اپنی آن بان کیا کم ہے جو رنگین کپڑوں سے اسے بڑھانے کی کوشش کریں۔ یہ تو جسے اپنے اوپر بھروسہ نہ ہو وہ بزاز اور درزی کے یہاں سے عزت مول لائے۔ بس انھیں تو اپنے چہرے کے سامنے بادلوں کا بھیگا بھیگا پردہ اچھا لگتا ہے، یا دن میں آفتاب کی ہلکی سی چادر اوڑھلی اور شام کو شفق کا سرخ اور سنہرا دوشالہ سر پر ڈال لیا۔

ہاں، تو چٹان کے اس اوپر والے حصہ میں ایک عقاب رہتا تھا، آدمیوں کی بستیوں سے دور اور ان کے جھگڑوں ٹنٹوں سے الگ۔ صبح کی صاف صاف بھینی بھینی خوشبو والی ہوا جب اس کے گھونسلہ پر آکر سلام کرتی تو یہ اپنے پروں کو ذرا ہلاتا، اپنے طاقت ور بازوؤں کو پھیلاتا جیسے کوئی ہوائی جہاز والا سفر سے پہلے دیکھے کہ سب کل پرزے ٹھیک ہیں کہ نہیں۔ جب ذرا دھوپ نکل آتی اور نیچے کی دنیا اپنی روزی کے دھندوں میں لگ جاتی تو یہ بھی پر پھیلا چٹان سے اڑتا اور آہستہ آہستہ ساری وادی پر چکر لگا کر بستی کا، بستی والوں کا، کھیتوں کا اور تیز رو دریا کا معائنہ کرتا۔ کہیں کوئی کام کی چیز نظر پڑ گئی کوئی خرگوش یا چوہا، کوئی کبوتر یا مرغی کا چوزہ، تو یہ بجلی کی طرح جھپٹتا اور آن کی آن میں اسے اٹھا کر گھونسلہ میں پہنچا دیتا۔ وہاں کھا پی کر پھر چٹان سے سنسار کا مطالعہ کرتا۔

یونہی نہ جانے کتنا زمانہ گذر چکا تھا جب ہوا میں ننھے ننھے سفید روئی کے گالے سے ناچتے دیکھتا، یا برف سے ڈھکی ہوئی سفید سفید چھتوں پر اس کے بازوؤں کا کالا کالا سایہ اسے دکھائی دیتا تو یہ سمجھ جاتا تھا کہ اب سردی کا زمانہ آگیا۔ پھر پیڑوں کی کالی کالی ننگی شاخوں پر ہلکا ہلکا ہرا لباس دیکھتا، اور چڑیوں کا چہچہانا اور مست ہو ہو کر گانا سنتا تو جان لیتا کہ بہار آگئی۔ میدان میں ہرنوں کے غول کے غول چوکڑی بھرتے دکھائی دیتے اور چٹان کے پاس سے دریائی پرندوں کے پرے کے پرے گرم ملکوں کے سفر کے قصد سے گذرتے تو یہ تاڑ جاتا کہ خزاں کی سواری آنے کو ہے۔ پر کوئی آئے، کوئی جائے، اس کی زندگی جیسی آج ویسی کل، وہی چٹان، وہی تنہائی، وہی قوت کا احساس، نہ کسی کی مدد کرنے کا موقع، نہ کسی سے مدد لینے

کی ضرورت، بس، اپنی دنیا آپ۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ عقاب اپنے صبح کے چکر پر نکلا تو بستی کے قریب ایک چھوٹا سا سفید جانور کھیلتا دکھائی دیا۔ یہ جھپٹا اور آنکھ کے ایک جھپکے میں اس ننھے سے سفید شکار کو اپنے پنجوں میں اٹھا لایا۔ اسے ادھر سے دیکھا، ادھر سے دیکھا۔ نہ خرگوش، نہ چوہا، نہ گلہری نہ نیولا۔ او ہو بلّی کا بچہ ہے اور میاؤں میاؤں کر رہا ہے۔ عقاب نے اسے آہستہ سے اپنے کشادہ گھونسلے کے ایک کونے میں بٹھا دیا۔ جیسے پہلے بہتیرے جانوروں کو بٹھا چکا تھا۔ مگر اسے مار کر کھانے کی ہمت اسے نہ ہوئی۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ یہ خیال ہی دل میں نہ آیا!

منّو ابھی بہت ننھی سی تھی۔ سمجھ بوجھ بھی نہ تھی، شاید اسی لئے کسی کا ڈر خوف بھی دل میں نہ تھا۔ وہ کیا جانتی تھی کہ یہ عقاب چاہے تو اسے ابھی چٹ کر جائے۔ یہ کچھ دیر تو کونے میں بیٹھی، پھر اٹھ کر سارے گھونسلے میں گھومی، ادھر ادھر جو گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے وہ کھائے اور بس جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ لال لال زبان سے اپنا منہ پوچھا، اپنا سفید سفید بدن چاٹا، اور بن ٹھن کر گھونسلے کے دروازے پر آئیں اور چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔

عقاب منّو کو گھونسلے میں اکیلا چھوڑ کر پاس والی چٹان پر جا بیٹھا تھا۔ پہلے تو وہاں سے سب تماشہ دیکھا کیا، اور دل میں نہ جانے کیا کیا خیال آتے رہے۔ جب منّو چٹان کے سرے پر آئی تو اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے ڈھونڈتی ہے! جھٹ اڑ کر اس کے پاس پہنچا۔ "کیوں کدھر چلیں؟" یہ سن لو بن جانے نہیں دوں گا۔" منّو ذرا پیچھے ہٹی، پیٹھ میں ایک کوبر سا بنایا، گھونسلے کی ایک دیوار سے بدن رگڑا، اور گنڈلی منڈلی ہو کر بیٹھ گئی۔ عقاب بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ اور ذرا پیار سے اپنا سر جو منّو کی طرف بڑھایا تو منّو نے نہایت بے تکلفی سے اپنے مخمل جیسے ہاتھوں میں اس کا سر لے لیا اور لگی اس سے کھیلنے، تھوڑی دیر میں اسے اپنے پنجوں سے کھجانے لگی۔ عقاب صاحب کو بھی یہ اچھا لگا تو حضرت نے آنکھیں بند کر لیں! منّو تھوڑی دیر تو سر سے کھیلی پھر اٹھ عقاب کی پیٹھ پر جا بیٹھی، وہاں سے اتر اس کی چونچ سے اپنا بدن رگڑا، پھر اس کے پروں تلے پہنچی اور سمٹ سمٹا کر اس کے دونوں پیروں کے بیچ میں جا بیٹھی اور لگی فرفر، خرخر کرنے۔

عقاب کے لئے یہ سب نئی باتیں تھیں۔ اس کے قریب بھی بھلا کون پھٹکتا تھا جو اس سے پیار کرتا اور کھیلتا بس، بیٹھے رہے، جیسے دم بخود۔ پھر بولے:۔ "منّو، سچ بتا۔ تو یہاں رہیگی؟ جی لگ گیا؟" منّو بولی "کیوں نہیں، رہونگی کیوں نہیں؟ مجھے تمھاری چونچ اور تمھارے پر اور ہاں تمھاری آنکھیں بہت اچھی لگتی ہیں۔" عقاب اور یہ باتیں! بس، حضرت ریشہ خطمی ہو ہو جاتے تھے۔

رات ہوئی تو منّو اس کے پروں میں گھس کر مزے سے گرم گرم سوگئی۔ عقاب کا یہ حال کہ نہ سوتوں میں نہ جاگتوں میں۔ بس خواب کی سی حالت۔ "اتنے دن تو اکیلے کاٹے۔ نہ ساتھی نہ دوست۔ اب اس منّو کو اٹھا کر یہاں لا بسایا۔ دیکھو کیسی گذرے؟" بہت دیر اسی سوچ میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ جی چاہا کہ ذرا پروں کو
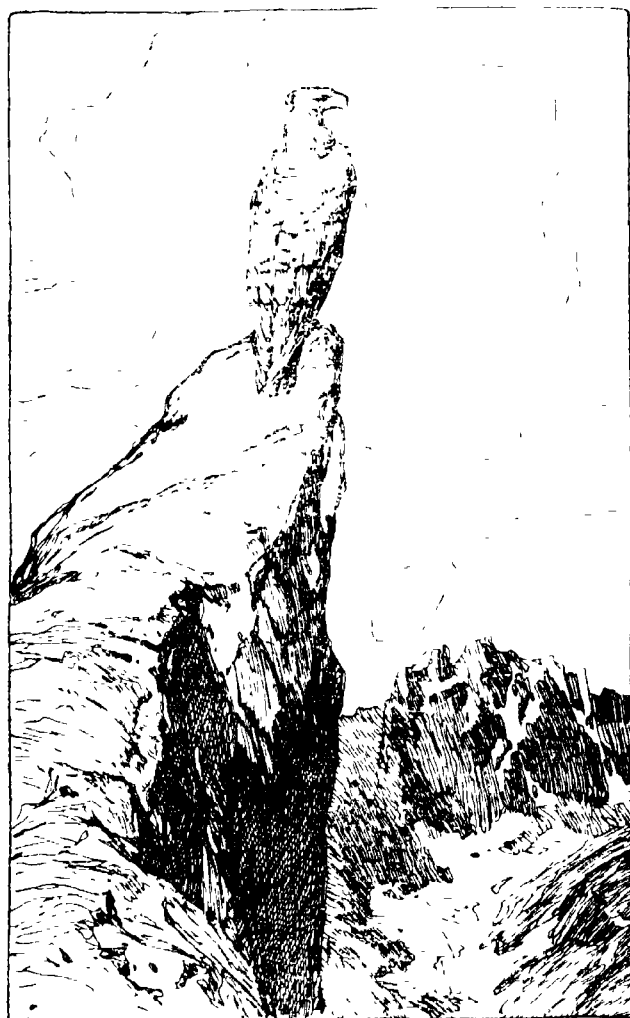
ادھر اودھر کرے، مگر اس خیال سے کہ منو جاگ جائے گی ویسے ہی بیٹھا رہا۔ آخر کو اس نے بھی اپنا سر پروں میں چھپا لیا اور سو گیا۔

غرض زندگی کے دن تو یوں بھی اچھے ہی کٹتے تھے، اب ان میں ایک اور رنگ پیدا ہو گیا۔ کچھ گلابی گلابی سا۔ صبح صبح عقاب چلا جاتا۔ تھوڑی دیر میں شکار مار لاتا۔ گھونسلے میں آکر خود کھاتا اور منو کو کھلاتا۔ دل ہی دل میں اکثر یہ سوچا کرتا کہ میں چلا جاتا ہوں تو یہ میرا انتظار کرتی ہے کہ نہیں.... مجھے یاد بھی کرتی ہے؟ شکار میں سے اچھا اچھا مال ہمیشہ منو کو دیتا اور گھٹیا خود کھاتا۔ ایک زمانہ یوں کٹ گیا۔ مگر اب سنئے، بی منو کا دل لگا گھبرانے! ہر وقت میاؤں میاؤں کی رٹ، نہ عقاب کا سر کھجانا، نہ اس سے کھیلنا، یہ کچھ چھیڑ چھاڑ کرے تو مخمل کے سے گدوں میں سے لوہے کے سے کانٹے باہر نکل آئیں۔ اور خرخر کی جگہ ناک چڑھا کر عجیب کھسیانی سی آواز۔ پہلے تو دو ایک دن منو کی ان باتوں میں بھی عقاب کو بڑا مزا آیا۔ پھر کچھ گھبرایا، مگر سمجھ میں نہ آیا کہ بات کیا ہے۔ اور عقاب بہت ہی اداس رہنے لگا۔ ایک دن نہایت سنجیدگی کے ساتھ منو سے بولا:۔ "کیا تیرا جی اب یہاں نہیں لگتا۔ کیا کھانا پسند نہیں ہے؟ یا یہ گھونسلا اچھا نہیں لگتا؟ منو، دیکھ تو سہی۔ ہماری زندگی کیسی مزے سے کٹتی ہے۔ یہاں اوپر رہتے ہیں۔ آدمیوں اور ان کی ساری گندگیوں سے دور۔ صاف ہوا، اور سورج کی گرمانے والی روشنی۔ میری آنکھیں دیکھ ان میں سورج کی ساری گرمی چھپی ہے۔ میرے پر دیکھ، جی کہتا ہے کہ ایک دفعہ سارے سنسار کو ان پر لے اڑوں۔ آ، ان پہ بیٹھ جا۔ تجھے ساری دنیا کی سیر کرادوں۔ سمندر دکھالاؤں جس کی نہ تھاہ نہ چھور۔ پہاڑوں کے سروں پر برف تاج دکھالاؤں اور کہے تو صحرا کی تپتی ہوئی ریت کا نظارہ کرادوں نہیں تیرا جی چاہے تو ان بازوؤں پہ بٹھا کر تجھے آفتاب تک لے اڑوں۔" منو چپ چاپ سب سنتی رہی اور کچھ نہ بولی۔

عقاب کچھ دیر بعد پھر بولا:۔ "پیاری منو۔ دیکھ تو۔ ہمارا گھر کیسا اچھا ہے؟۔ ایسی جگہ بھلا کس کو ملتی ہے؟ جب نیچے وادی میں اندھیرا گھپ ہوتا ہے تو ہم تم یہاں سے صبح کی پو پھٹتی دیکھتے ہیں۔ طوفان جس سے دنیا والے ڈرتے کانپتے ہیں ہمارے دروازہ پہ کیسے کیسے گیت گاتا ہے، کیا تجھے اس کا گانا اچھا نہیں لگتا؟ وادی والے آزادی کا مزہ کیا جانیں، وہاں تو غلام بستے ہیں غلام، ننھے ننھے سے جی، ہر دم خوف ہر دم ہراس۔ کسی کی ہمت بھی ہے جو یہاں آئے؟" مگر منو کے چہرہ پہ وہی غم اور کھسیانا پن۔ عقاب نے کہا:۔ "آخر بولتی کیوں نہیں؟" تو بولی:۔ "بولوں کیا؟ مجھے اس سارے قصے سے کیا مطلب۔ یہ رام کہانی کسی اور کو سناؤ۔ میں تو یہ جانتی ہوں بس کہ اگر یہاں رہوں گی تو جان سے جاؤں گی۔ اس بلندی پہ نہ زندگی کا مزہ نہ موت کا۔ میرا جی نہیں لگتا۔ مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔ چکر آتا ہے۔ دل دھڑکتا ہے۔ نہ یہاں کوئی ہے جس سے کھیلوں، نہ دودھ کی ہنڈیا، نہ گرم گرم چولھا تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو؟ مجھے نہ صحرا درکار ہے نہ برفستان۔ اور تمھارے اتھاہ سمندر کے نظاروں سے کہیں زیادہ مجھے دودھ کی بالائی کی چکناہٹ اچھی لگتی ہے۔

تمھارے سہارے اُڑ دن تو چکر کھا کر گروں، خود اپنے پر نہیں۔ مجھے تو نیچے وادی میں پہنچا دو ۔ بس وادی میں پہنچا دو ۔"

عقاب کو نہ جانے کیوں ایسا لگا جیسے کسی نے تاک کر ٹھیک دل میں تیر مارا ہو ۔ گھونسلے کی لکڑیوں کو چونچ سے دبایا اور نہ جانے کتنے زور سے دبایا کہ سب چر چر ٹوٹ گئیں ۔ منّو کی طرف دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں یا خون ٹپک رہا ہے ۔ پروں میں کچھ جنبش سی ہوئی اور سانس میں کچھ آواز سی پیدا ہو گئی ۔ نہ جانے دل میں کیا کیا آیا ۔ مگر منہ پھیر کر اُڑ گیا اور دوسری چٹان میں جا کر ایک نہایت تاریک سی درز میں منہ چھپا کر بیٹھ گیا ۔ نہ دن کی خبر نہ رات کی سُدھ ۔ نہ اُڑنے کی نہ شکار کی ۔

دو دن یونہی گذار دیئے ۔ مگر پیٹ بری بلا ہے ۔ اس کا تقاضا مٹیے کے تقاضے سے کم نہیں ہوتا ۔ بھوک نے بیتاب کیا تو اٹھا ۔ لیکن اُڑ کر سیدھا اپنے گھونسلہ میں گیا، بے کہے سنے منّو کو اٹھایا اور بستی میں جس جگہ سے اسے لایا تھا وہیں جا کر چھوڑ دیا ۔ منّو جھٹ پاس والے گھر میں گھس گئی ۔ آنگن میں گھومی، برآمدہ میں گئی، باورچی خانہ میں ذرا ایک ہانڈی چاٹی اور پھر عقاب کی نظر سے جو پاس ہی ایک پیڑ پر بیٹھ گیا تھا اوجھل ہو گئی ۔ عقاب کو بڑا ہی دُکھ ہوا کہ منّو نے ایک مرتبہ بھی تو مڑ کر اس کی طرف نہ دیکھا، نہ رخصت ہوئی، نہ دعا نہ سلام ۔

کچھ غصہ میں، کچھ مایوس، یہ پیڑ پر سے اُڑا اور اسی مکان پر چکر لگا رہا تھا کہ ایک آواز آئی "دھائیں"، اور یہ پر شکستہ نیچے گر پڑا ۔ کسان دوڑا ہوا اس کے پاس آیا اور چلّایا "عقاب ہے، عقاب" اِدھر اُدھر سے بہت سے لڑکے بالے اور چار چھ کسان اور جمع ہو گئے ۔ گاؤں میں خبر ہوئی کہ منسا نے عقاب پکڑا ہے تو اس کو دیکھنے سب ہی آئے ۔ منسا نے اس کے پاؤں میں ایک مضبوط سا حلقہ ڈال کر زنجیر میں اسے اٹکا دیا تھا ۔ منّو اتنی دیر میں باورچی خانہ سے چھت پر جا پہنچی تھی، وہاں بیٹھی اپنا بدن چاٹ رہی تھی اور کنکھیوں سے عقاب کو دیکھتی جاتی تھی ۔ جب سب لوگ عقاب کو دیکھ دیکھ کر چلے گئے تو یہ پاس گئی اور بولی :۔ "کیوں، میں نہ کہتی تھی کہ یہ اُڑنا کسی دن رنگ لائے گا ؟ مگر تم سنتے ہو کسی کی ؟ اب مزہ چکھ لیا نا ۔ اب بھی سمجھ جاؤ تو اچھا ہے ۔ مگر خیر، فکر مت کرو ۔ میں روز موٹے موٹے تازہ تازہ چوہے مار لایا کروں گی ۔ تم آپ دیکھ لوگے کہ یہاں کی قید میں بھی کیا کیا مزے ہیں ۔" یہ کہہ کر گئی اور ایک موٹا سا چوہا اس کے سامنے لا ڈالا ۔ مگر عقاب نے اسے چھوا بھی نہیں ۔ اور ان آگ بھری آنکھوں سے جو سورج تک سے نہ جھپتی تھیں منّو کو کچھ اس طرح دیکھا کہ یہ بھی گھبرا سی گئی اور بولی :۔ "معاف کرنا ۔ مجھے بہت افسوس ہے ۔ کیا درد بہت ہو رہا ہے ؟" عقاب نے جواب دیا : "معلوم نہیں ۔ درد کی تو کچھ ایسی بات نہیں ۔ مگر کاش یہاں سے جا سکوں ۔" منّو بولی : "خدا کا شکر ہے کہ تم نہیں جا سکتے اور جانے کا خیال ہی چھوڑ دو ۔ مجھے تو اُس چٹان کی تنہائی اور بلندی کا خیال آتا ہے تو کلیجا کانپتا ہے ۔ تمھارا بازو ذرا ٹھیک ہو جائے تو میں سب کچھ تمھیں لے جا کر بتاؤں گی ۔ پھر تم خود چوہے پکڑ لیا کرنا ۔ اور دودھ اور بالائی اور دہی دیکھ کر تو سچ کہتی ہوں کہ تمھارا جی خود یہاں سے جانے کو نہ ہوگا ۔ سردیوں میں ہم تم دونوں اسی پاس والے کمرہ میں ساتھ ساتھ سویا کریں گے ۔ گرمیوں کی چاندنی راتوں میں ساتھ ساتھ چھتوں

ٹہلا کریں گے ۔ سچ کہتی ہوں یہاں بڑا لطف ہے ۔ اب یہاں سے نہ جانا ۔ تمھیں میری قسم ہے ۔" عقاب پھر چپ ہی رہا ۔ منو کو یہ بات بہت ہی بری لگی ۔ بگڑ کر بولی ۔ " دماغ ابھی آسمان ہی پر ہے ۔ یہاں بھی رعب جمانا چاہتے ہو ۔ ہم خوشامد کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ مزاج ہی نہیں ملتا ۔ ہاں ان چٹانوں میں رہ کر کسی کو تہذیب تھوڑی آئی ہے ۔ بس معاف کیجئے ۔ بہت دن آپ کے ساتھ مصیبت جھیلی ۔ خدا حافظ ۔" یہ کہہ وہاں سے چلدی اور پھر ادھر کا رخ نہ کیا ۔

جس دن عقاب کے گولی لگی ہے اس دن سے پانی کی ایسی جھڑ لگی کہ ساتویں دن جاکر کھلی ۔ یہ ہفتہ بھر اسی زنجیر میں بندھا بیٹھا رہا ۔ نہ کھانا نہ پینا ۔ دھوپ جو نکلی تو دن بھر اس میں بدن سینکا ۔ شام قریب آئی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی سے پہاڑ کی چوٹیاں آگ کی طرح دہکنے لگیں تو اس کے دل کی کچھ عجیب حالت ہوئی ۔ پہاڑ سے کسی نے اپنی طرف اسے کھینچنا شروع کیا ۔ اس نے پر پھیلائے ۔ تو وہ سیدھا بازو جس میں گولی لگی تھی پورا کھل گیا ۔ زخم بھر چکا تھا ۔ اسے پہلے تو یقین نہ آیا ۔ پھر بازو پھیلا کر دیکھا ۔ ایک بار، دو بار، تین بار، جب یقین ہو گیا کہ ٹھیک ہے تو کچھ نہ پوچھو کہ اس کے دل کی کیا حالت ہوئی ۔ ایک چیخ سی ماری، اس زور سے کہ منو باورچی خانہ میں سہم سی گئی ۔ ایک جھٹکا دیا ایسا کہ زنجیر الگ ٹوٹ کر گری، پیر سے خون کی چند بوندیں زمین پر گریں اور یہ نہایت شاہانہ انداز سے اڑا ۔ یہ جا وہ جا ۔ آن کی آن میں اتنا اونچا پہنچا کہ شام کے دھندلکے میں دکھائی بھی مشکل سے دیتا ۔ بہت اوپر پہنچ کر پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی پر جا بیٹھا ۔ آنکھیں جل رہی تھیں، سانس پھولا ہوا تھا ۔ نیچے وادی تھی، منو کا گھر انسانوں کی بستی ۔ اس نے نیچے دیکھا، کچھ حقارت سے، پھر ایک ٹھنڈا سانس بھر کر اوپر نظر کی ۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر اب بھی آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔ رفتہ رفتہ اندھیرا ہو گیا ۔ اور تھوڑی دیر میں پہاڑ اور جنگل اور ہوائیں سب سو گئیں ۔ سارے سنسار پر خاموشی چھا گئی، عقاب بھی چپ چاپ سناٹے میں بیٹھا تھا ۔ کہ یکایک ایک عجیب دردبھری آواز سنائی دی ۔ یہ آواز خود اسی کے سینہ سے نکلی تھی ۔ اس کے بعد پھر سناٹا ہو گیا ۔ تاریکی سارے آسمان پر چھا گئی اور اس اندھیاری میں ستاروں کے سفید سفید چہرے جھم جھم کرنے لگے ۔ ہر ایک اپنی اپنی راہ پر چپ چاپ چل رہا تھا ۔ نہ چیخ نہ پکار، نہ کسی سے جھگڑا نہ کسی سے ٹنٹا، اپنے کام سے کام، ہر ایک کا اپنا اپنا دھرم اور اپنی اپنی تقدیر ۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کی آنکھوں میں جو ذرا خنکی سی پیدا ہوئی تو اس نے انھیں بند کر لیا ۔ اور نہ جانے کتنی دیر یونہی بیٹھا رہا، اور کیا کیا خیال اس کے سر میں گذرتے رہے ۔ جیسے کوئی خواب دیکھتا ہو ۔ پھر آنکھ کھولی تو بولا ۔ " خدا کا شکر ہے ۔ پھر آ پہنچا اپنے وطن میں، پھر پا لیا اپنا دیس ۔ تو اکیلا ہی رہنے کو بنا ہے، بس اکیلا ہی رہ ۔ تیرے ساتھی اگر ہیں تو یہی ستارے اور یہی چٹانیں، یہی چاند اور یہی سورج ۔ جو سب اپنا اپنا کام کرتے ہیں اور کسی اور کے کام میں دخل نہیں دیتے ۔"

(از جناب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی علیگ۔ صدر اردو ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)

پانچ چھ برس ہوئے میری ملاقات شیخ صاحب سے ہوئی۔ ایسی حالت میں کہ شیخ صاحب کے آنکھیں تھیں لیکن کسی کو پہچان نہیں سکتے تھے۔ کان تھے لیکن کسی کی سنتے نہ تھے۔ زبان تھی لیکن بول نہ سکتے تھے۔ ناک تھی لیکن خوشبو، بدبو میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ ہاتھ پاؤں تھے لیکن چل پھر نہ سکتے۔ باوجود اس کے دوستی ایسی ہوئی کہ ان کے بغیر مجھے چین نہیں۔ گو اب تک یہ نہ معلوم ہو سکا اور نہ اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ خود شیخ صاحب کا خیال میرے بارے میں کیا ہے۔ شیخ صاحب کو کھانے پینے کا بڑا شوق ہے۔ اگر روک تھام نہ کی جائے تو یہ کھانے پر کبھی ترس نہ کھائیں اس لئے اکثر ان کو زبردستی روکنا پڑتا ہے کوئی اور ہو تو اس سلوک سے اتنا ناراض ہو کہ تمام عمر میرا منہ نہ دیکھے۔ لیکن شیخ صاحب کا یہ حال ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کو دھیان میں نہیں لاتے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا میں ہر چیز کھانے پینے ہی کے لئے بنائی گئی ہے خواہ تارپیٹ ہی کیوں نہ ہو۔

شیخ صاحب کی شکل وصورت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بڑا سر دے سا سر۔ ہونٹھ موٹے موٹے۔ تنوری روٹی کے حاشیے جیسے۔ ناک چھوٹی گاجر کی مانند دہانہ اتنا بڑا کہ ہنسیں تو باچھیں کانوں کی لو تک پہنچ

جائیں۔ اور روئیں تو اچھا خاصا ٹنڈا منہ میں آجائے۔ آواز ایسی کہ پہلے ہی نعرے میں محلّے کے سارے شیخ سید صاحبان سوتے سوتے چونک پڑیں۔ لمبے کم چوڑے زیادہ۔ نہ سردی کی خوشی نہ گرمی کی پروا۔ آنکھیں بہت بڑی ایک دن ایک صاحب نے نہایت قریب سے ٹارچ کی پوری روشنی ان کی آنکھوں میں ڈالی۔ شیخ صاحب آنکھ تو کیا جھپکاتے اس طور پر ٹارچ کی طرف دیکھتے رہے۔ گویا وہ بھی کوئی کھانے کی چیز تھی لیکن دور تھی۔ شیخ صاحب کو اچھے کپڑوں کا شوق نہیں۔ اکثر دوسروں کا کپڑا سیدھا الٹا پہنا دیا جاتا ہے۔ لوگ چڑھاتے یا طعنہ دیتے ہیں کہ منگنی کا کپڑا ہے یا فلاں کا اترن ہے تو اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کہتے ہیں۔ فلاں کا کیسے ہے۔ خود اماں بی نے پہنایا ہے۔ جہاں کہیں گرد، غبار، کیچڑ، پانی دیکھا۔ بیٹھ رہے اور اس لطف و اطمینان کے ساتھ گویا قالین اور گدے پر رونق افروز ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ شیخ صاحب جتنے ہی زیادہ میلے کپڑوں میں یا نا صاف مقامات پر نظر آئیں مجھے اتنا ہی زیادہ دلکش اور معقول نظر آتے ہیں۔ دوسروں کا بیان ہے کہ اس حُلیے میں دوسروں پر شیخ جی کا رعب بھی زیادہ پڑتا ہے۔

شیخ جی کی بڑی کمزوری اُن کا کھانے پینے کا شوق ہے۔ اسی شوق کے پیچھے ایک بار ہاضمے کی رفاقت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ اور شیخ صاحب دست میں مبتلا ہو گئے۔ کھانے پینے کی چیزوں پر پہرہ بیٹھ گیا۔ اور شیخ صاحب کی زندگی ذرا تنگی ترشی سے بسر ہونے لگی۔ پہلے تو اُن کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دست آنے کو کھانے پینے سے کیا سروکار لیکن کچھ دنوں بعد بات سمجھ میں آئی۔ ایک دن پاخانے میں سے آواز دی، عذرا، عذرا۔ دیکھو پاخانہ گُھٹّل ہو گیا۔ اب تو گوشت کھانے کو ملے گا!

شیخ صاحب کو ایک بار پہاڑ پر جانے

کا اتفاق ہوا۔ سادھو سنت کو گھر گرہستی کے جھنجھٹ سے کیا سروکار، ایک دن جڑی بوٹی کی تلاش میں

نکل گھڑے بس راہ جنگل کی لی۔

کسی جھاڑی میں خوش رنگ پھل لگے ہوئے تھے۔ دُنیا پھر دُنیا ہے۔ شیخ صاحب نے پھل توڑ کر منہ میں رکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منہ کے اندر آنا پر ماتما کی کھینچ تان شروع ہوگئی۔ ہونٹھ سیاہ ہوگئے۔ زبان کھنچ گئی منہ سے جھاگ نکلنے لگے۔ بہزار دقت گھر پہنچے۔ دوڑ دھوپ ہوئی۔ شیخ صاحب نے بڑی مشکلوں سے آنکھ کھولی۔ چند دنوں تپسیا کرنے کرانے کے بعد پھر دنیا کے دھندوں میں پھنس گئے۔

شیخ صاحب مدتوں قید و بند میں رکھے گئے۔ ایک دن ہر چہار طرف ابر چھایا ہوا تھا۔ روئی کے گالوں کی مانند، شیخ صاحب کی طرف سے لوگ بے خبر ہوگئے اور بند سے دیوانہ رہا ہوگیا

مکان کی پشت پر صحن تھا جس کے کنارے جھاڑی تھی اور جھاڑی سے ملا ہوا۔ ڈھلوان گہرا کھڈ۔ جس پر کنٹیلے درخت اور جھاڑیوں کا سلسلہ زینہ بزینہ دور تک چلا گیا تھا۔ جھاڑیوں میں جنگلی بیر لگے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب نے بیر پر ہاتھ مارا ہی تھا کہ باوا آدم[۵۱] کا بہشتی ڈراما آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ باوا آدم تو اس سلسلے میں آسمان سے براہ راست زمین پر آ رہے تھے۔ شیخ صاحب آسمان[۵۲] سے گرے تو ببول میں اٹکے۔ گلے بازی کام آگئی لوگ دوڑے تو دیکھا شیخ صاحب ایک جھاڑی میں خرگوش بنے لٹکے ہوئے ہیں۔ خیریت یہ تھی کہ جو کچھ کمل کملی جسم پر تھی۔ اس نے اس

۵۱۔ روایت ہے کہ حضرت آدم نے بہشت میں گیہوں کو ہاتھ لگایا تھا اس لئے دنیا میں بھیج دئے گئے۔

۵۲:۔ آسمان سے گرے ببول میں اٹکے ایک محاورہ ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک مصیبت سے نجات ہوئی تو دوسری مصیبت میں پھنس گئے۔

قسم کے سانحے بہت کچھ دیکھے تھے۔ اس لئے شیخ صاحب کو گزند نہیں پہنچی۔ بڑی دقتوں سے نوچ کھسوٹ کر باہر نکالے گئے۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ صرف چند خراش ادھر ادھر لگے ہیں۔ البتہ پوشش ایسی نہیں رہ گئی تھی کہ خود شیخ صاحب کے لئے بھی موزوں ہو سکتی شیخ صاحب کو کھلا پلا کر ہموار کر لیا گیا۔ پوشش اسی جھاڑی پر آویزاں کر دی گئی تاکہ دوسرے شیخ یا سید صاحبان کو معلوم رہے کہ اس وادی کو ان کے پیش رو کہاں تک طے کر چکے ہیں۔ اور اس منزل کے کتنے کانٹے شیخ دحشی کے ساتھ نکل چکے ہیں۔

ف ۵:- غالب اردو فارسی کے بڑے زبردست شاعر گذرے ہیں۔ ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے۔

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے میری ہمراہ منزل سے

اس شعر کو تم کچھ تو شیخ صاحب کے واقعے سے سمجھ گئے ہو گے بقیہ تم کو شیخ الجامعہ صاحب سمجھا دیں گے۔

شیخ صاحب شاعر اور غبی بھی واقع ہوئے ہیں۔ عام طور پر ہمارے شاعر بھوکے اور غبی پیٹ بھرے ہوتے ہیں۔ لیکن شیخ صاحب شعر اسی وقت موزوں کرتے ہیں جب پیٹ بھرا ہو۔ اس قسم کا شاعر اگر مہمل نہ ہو تو نکما ہو گا۔ بہر حال شیخ صاحب کے کارنامے کچھ ان ہی کی زبان سے سنئیے تو معلوم ہو گا کہ ایسے کارنامے نہ تو کبھی وقوع میں آئے اور نہ آج تک ان کو کسی نے گھڑا۔ مثلاً ایک بھیڑیا آیا۔ اور شیخ صاحب اُسے کھا گئے چیونٹی نے ان کے ڈنڈا مارا اور انھوں نے ڈنڈا چھین کر پھینکا تو وہ (امنورا) المونڑا جا گرا ان کے بیوی بچے بھی ہیں۔ جن کے حصے کی یہ مٹھائی اور پھل وغیرہ بھی وصول کرتے ہیں اور خود ہی کھا پی لیتے ہیں۔ اس پر اعتراض کیجئے تو کہتے ہیں وہ سب مجھے کیا دیتی ہیں۔

شیخ صاحب شاعر بھی ہیں اور گوئیے بھی یعنی نثر میں مصرعے کہتے ہیں اور گا کر سب موزوں ہونے کا لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

پانی برسنے کو ہمیشہ "پانی لبرنا" کہتے ہیں ان کا خیال ہے کہ الفاظ میں کچھ نہیں دھرا ہے مفہوم سب کچھ ہے۔ سمجھنے والے موجود ہوں تو الفاظ کی صحت نظر انداز کی جا سکتی ہے۔ بارش ہونے نہ ہونے کا مدار اس پر نہیں ہے کہ پانی برسے یا لبرسے۔ لیکن بجو یہ اپنی اپنی سمجھ کا پھیر ہے۔ شیخ جی کی منطق آخر شیخ صاحب ہی کی منطق ہے۔ ایک بار عذرا سے بولے عذرا ڈپ ڈپو چلو گی۔ عذرا نے کہا۔ بک ڈپو؟ فرمایا، ہاں ہاں وہی ڈپ ڈپو کے منشی جی !!

ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ اور بادل اور کہر سے ساری فضا دھندلی اور نم ناک ہو رہی تھی۔ سامنے بھٹے کا کھیت تھا۔ اس میں شیخ صاحب کھڑے ہو کر جگر صاحب کا مصرعہ پوری طاقت سے الاپ رہے تھے۔

ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

عذرا بولیں "کباب ہے" فوراً شراب سے تائب ہو گئے۔ اور کباب پر زور لگانے لگے۔ ایک طرف سے کڑاکے کی آواز آئی "اچھا بچا پانی میں بھیگو کباب کے ساتھ ذرا جوتے کا بھی خیال رہے" شیخ صاحب فوراً دم بخود ہو گئے اور مکان کے اندر چلے آئے۔ کپڑے اتروائے گئے تو شراب اور کباب کے بجائے صرف ایک بھٹا برآمد ہوا۔ شیخ صاحب کے ساتھ سلوک وہی کیا گیا جو شرابی کبابی کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن بھٹا واپس کر دیا گیا۔ کیوں کہ اسے شیخ صاحب نے اپنی ہی حصے کے کھیت سے توڑا تھا۔ سردی زیادہ پڑ رہی تھی اور شیخ صاحب سر سے پاؤں تک بھیگے ہوئے تھے، اس لئے انگیٹھی لائی گئی۔ یہ اس کے سامنے بٹھائے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گیا تو شیخ صاحب ہی انگیٹھی پر اپنا بھٹا بھون رہے تھے اور عذرا قصہ سنا رہی تھیں۔

شیخ صاحب ایک دن گھومتے پھرتے چلے جا رہے تھے۔ ایک جگہ ایک بہت بڑا

جھاڑی میں مینڈک بیٹھا تھا۔ چلائے۔ عذرا دوڑو، عذرا پہنچیں تو دیکھا آپ مینڈک کے گرد شیولا[۵۲] کا رقص کر رہے ہیں۔ عذرا نے کہا ارے یہ تو مینڈک ہے۔ فرمایا اور کیا دیکھو کیسا بیٹھا ہوا ہے۔ جیسے ٹم ہنبت (آم) ملازم چشمے سے پانی لئے جا رہا تھا۔ شیخ صاحب بھی چلنے پر آمادہ ہو گئے ملازم ان کی طرف سے غافل ہوا چشمے میں ایک جگہ چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں شیخ صاحب کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہو کر پانی میں کود پڑے اور فوراً تہ نشیں ہو چلے۔ نوکر نے دیکھ لیا اور ان کو باہر کھینچ لایا۔ گھر آئے تو عذرا سے بولے۔ عذرا پانی میں بڑا مزا آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آسمان پر چلے جا رہے ہیں۔ اور کیا۔

شیخ صاحب کو ترتیب کے ساتھ صرف پندرہ تک کی گنتی آتی ہے یوں موقع پڑنے پر گننے کو لاکھوں کروڑوں تک گن جاتے ہیں جس زمانے میں اسکول جاتے تھے اس زمانے کا واقعہ ہے اسکول میں بارہ بجے چھٹی ہو جاتی تھی اور یہ واپس آکر براہ راست کھانے پر نازل ہو جاتے۔ عذرا کے اسکول میں تین بجے چھٹی ہوتی تھی۔ وہ آتی تو اس کے لئے ناشتہ کا علیحدہ انتظام ہوتا۔ آپ بھی پہنچ جاتے۔ کھانے پینے میں شریک ہونے کی کوشش کرتے، روک تھام کی جاتی تو لاٹھی چارج پر آمادہ ہوتے ایک دن ان کا مقدمہ میرے سامنے پیش ہوا۔ قہرمن[۵۳] بولیں آپ

۵۲:۔ رسالہ اردو میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں شیو جی کی ایک تصویر دکھائی گئی ہے۔ اور نظم یوں شروع ہوتی ہے ؎

تصویر برنجی میں ہے رقصاں تن شیو جی

۵۳:۔ مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی نے ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام "زلفی" ہے۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔ اس میں قہرمن اور طباقی کا حال پڑھو۔

طباق کو دیکھنا، بارہ بجے آکر سب کچھ چاٹ پونچھ کر برابر کر دیتا ہے۔ عذرا بے چاری تین بجے آتی ہے۔ لیکن یہ اس کو کھانے پینے نہیں دیتا۔ شیخ جی جھک کر بولے دیکھئے عذرا تو تین ہی بجے آتی ہیں۔ میں بارہ بجے آتا ہوں ...... اور کیا!

ایک دن،

بیٹھے بیٹھے نہیں کیا جانے کیا خیال آیا خود بخود اسکول چلے گئے۔ کسی کا کوٹ، کسی کی ٹوپی۔ ایک جوتا اپنا ایک دوسرے کا کچھ دنوں برابر آتے جاتے رہے۔ ایک دن واپس آئے تو کہنے لگے۔ میڈم نے بارہ روپے (۱۲ عـــہ) مانگے ہیں۔ داخلہ ہوگا میں نے کہا:۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

بولے اور کیا! میں نے کہا ایسے اسکول میں داخلے سے کیا فائدہ۔ جہاں میڈم کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شیخ صاحب کے داخلے کی فیس لی نہیں بلکہ دی جاتی ہے۔ فرمایا اور کیا! میں نے کہا شیخ جی صبر کرو بولے صبر کیا! میں نے کہا وہی جس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ بولے اور کیا۔ میں نے کہا۔ پڑھ لکھ کر کیا کرو گے۔ اللہ میاں کو تم سے اور تم کو اللہ میاں سے اور کام لینے ہیں بولے اور کیا!۔

ایک دن عورتوں کی پارٹی ہو رہی تھی۔ اور بچو تم تو جانتے ہو ایسی پارٹیوں میں عورتوں سے زیادہ تعداد بچوں بچیوں کی ہوتی ہے۔ اور دونوں سے کہیں کم کھانے پینے کی چیزیں، شیخ صاحب بھی ایک طرف دم سادھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک بیوی نے کسی بچے کو کچھ دینا چاہا۔ ماں بولیں ارے دیکھئے۔ نقصان کرے گا۔ اسی طرح کئی بچوں کو وہ چیز دی گئی اور ان کی ماؤں نے کہا کہ مت دیجئے، مبادا نقصان کرے شیخ جی نے دیکھا کہ معاملہ رفت گزشت

عـــہ: غم و غصے کے موقع پر بولتے ہیں۔

ہوا جا رہا ہے۔ اک آہ سرد کھینچ کر اور غالباً اللہ میاں کو مخاطب کر کے بولے "مجھے نقصان نہیں کرتا۔"

ایک بار شیخ جی بال بال بچے، ورنہ ان کی خیریت نہ تھی۔ ان کے دو بھائی کسی پارٹی میں مدعو تھے حسب قاعدہ شیخ صاحب کو نوٹس دے دیا گیا تھا کہ پارٹی میں نہ جانا۔ ورنہ خیر نہیں۔ بھائیوں کے چلے جانے کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ صاحب غائب ہیں۔ لوگوں نے تہیہ کر لیا کہ اگر شیخ صاحب پارٹی میں گئے ہوں تو ان کی خوب آؤ بھگت کی جائے۔ کچھ دیر بعد یہ خود آگئے سب لوگ بھرے بیٹھے تھے۔ اور ایک دم برس پڑے۔ شیخ صاحب کچھ ایسے بھوچکے ہوئے کہ ہاں، نہیں کہنے کی بھی قدرت نہ رہی۔ جرم یہ لگایا گیا تھا کہ یہ چھپ کر پارٹی میں شامل ہوئے۔ زبانی جمع خرچ ہوتا رہا۔ شیخ صاحب کا یہ حال کہ ہر ایک کا منہ دیکھتے ہیں اور دنیا کی بے ثباتی اور اعزا کی بد لگامی پر خاموش اور متحیر ہیں۔ قریب تھا کہ شیخ صاحب برے بھاؤ کی پڑنے لگے۔ میں نے کہا کہ اگر تم سچ سچ بتا دو گے کہ پارٹی میں گئے تھے تو چھوڑ دیئے جاؤ گے ورنہ آج تمھاری خیریت نہیں ہے۔ شیخ صاحب بولے ہاں گیا تھا۔ لیکن وعدہ کرنے والوں کی نیت بخیر نہ تھی انھوں نے سنتے ہی چاہا کہ ان کی مرمت شروع کر دیں کہ اتنے میں دونوں بھائی آگئے شیخ جی نے دیکھتے ہی ایک نعرہ لگایا جس میں غصہ گریہ اور فتح یابی سبھی کچھ ملی جلی تھی "کیا ہم پارٹی میں گئے تھے"۔ انھوں نے قطعاً لاعلمی ظاہر کی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ شیخ صاحب اس اثنا میں پاس ہی ایک جامن کے درخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔

بچو کیا تم بتا سکتے ہو کہ اگر تم شیخ صاحب کی جگہ ہوتے اور معاملہ اتنا ہی نازک اور خطرناک ہوتا تو کیا جواب دیتے۔ شیخ صاحب ان دنوں سولن میں مقیم ہیں۔ لاہور میں

شہید گنج کی مسجد کے واقعے کے سلسلے میں
افواہ تھی کہ سولن میں بھی سکھ اور مسلمانوں میں
جھگڑا ہو جائے گا۔ شیخ صاحب نوکروں میں
زیادہ اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ انھیں معلوم تھا
کہ سکھوں کے پاس کرپان ہوتی ہے۔ جسے
وہ ہر وقت پاس رکھتے ہیں۔ ایک دن شیخ
صاحب حسب معمول سب کے ساتھ گھومنے
پھرنے نکلے۔ اتفاق یہ کہ پاجامہ ڈھیلا ہو گیا
میں نے کہا لاؤ کمر بند کس کر باندھ دوں،
پہلے تو انھوں نے تامل کیا۔ لیکن میرے اصرار
پر قمیص اور اچکن اُٹھائی تو نیفے سے لوہے
کی چھچھنی (بولٹ) لٹکی ہوئی نظر آئی۔ میں نے
پوچھا یہ کیا ہے تو خاموش و خفیف، آخر میں
عذرا بلائی گئیں۔ انھوں نے کہا کہ جب آپ
علی گڑھ میں تھے تو بُندو (باورچی) نے
کہا تھا کہ سکھوں کے پاس کرپان ہوتی ہے
اور وہ مسلمانوں سے لڑائی کرنے والے ہیں
اس لئے جب یہ گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ تو
چھچھنی پاجامے میں لٹکا لیتے ہیں۔ اور دیکھئے
ان کی جیب میں بھی چاقو اور نوک دار پتھر
ہوں گے چنانچہ اُن کی جامہ تلاشی لی گئی
تو باورچی خانے سے خارج کی ہوئی چھریاں
جن کو الٹا سیدھا جدھر سے چاہے موڑ
لیجئے۔ اور جہاں تک کاٹ کا تعلق ہے
پھل اور دستے میں کوئی فرق نہیں۔ بسکٹ
کا ڈبہ کھولنے کا نوک دار ٹن اور کچھ نکیلے پتھر
برآمد ہوئے۔

شیخ جی کے سلسلے میں عذرا کا برابر تذکرہ
آیا ہے۔ یہ شیخ صاحب کی بڑی بہن ہیں۔
۱½ ڈیڑھ سال بڑی شیخ صاحب کے
تمام راز اور کمزوریوں سے واقف۔ گھر بھر
میں شیخ صاحب کو صرف عذرا پر اعتماد ہے
ابھی حال میں ان کی یہ عادت چھوٹی
ہے ورنہ جھوٹی سچی ہر بات کے آخر میں "ہاں
عذرا" ضرور کہتے۔ اور عذرا کبھی ان
سے اختلاف نہ کرتیں۔

عذرا ان کے عمر کی تھیں تو ایک
دن مجھے عینک اتارتے ہوئے دیکھ کر بولیں

ابا میاں آپ عینک اتار دیتے ہیں۔ تو دوسرے کے ابا میاں معلوم ہونے لگتے ہیں! مضمون طویل ہو گیا۔ لیکن شیخ جی کے کارناموں کی فہرست اس سے کہیں طویل ہے۔ ایڈیٹر صاحب پیام تعلیم نے شیخ جی کے لئے اتنے ہی اوراق وقف کئے تھے۔ اس لئے بچو! خدا حافظ، خدا کرے "پیام تعلیم" کا آیندہ تاسیس نمبر اور شان دار نکلے۔ اُس وقت تمہاری دلچسپی کے لئے کچھ اور پیش کروں گا۔ اِنشاءَاللہ

لطیفے

جاہل باپ:۔ بیٹا کیا بات ہے اب کے امتحان میں تمہیں صرف چار ہی نمبر ملے۔

شریر لڑکا:۔ ابا جان میرے درجے میں بہت سے لڑکے پڑھتے ہیں بعض لڑکوں کو کافی نمبر ملے جب میری باری آئی تو بہت کم نمبر رہ گئے تھے بعض لڑکوں کو تو صفر ہی ملا۔

باپ کو اس جواب سے اطمینان ہو گیا۔

ایک آدمی کا گھوڑا چوری گیا اُسے پتہ لگا تو فوراً سجدے میں گر گیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ لوگوں نے پوچھا یہ شکر کا کیا موقع ہے۔ اُس نے جواب دیا شکر نہ کروں تو کیا کروں اگر میں گھوڑے پر ہوتا تو وہ مجھے بھی چُرا لے جاتے۔ (صباح الدین احمد گیا)

باپ:۔ بیٹا تم امتحان میں کامیاب ہو گئے۔

بیٹا:۔ نہیں ابا فیل ہو گیا پاس ہو جاتا تو آپ کو نئی کتابیں جو خریدنا پڑتیں۔

نوکر:۔ حضور سرف الدین میاں سرما باد سے تسریف لائے ہیں۔

آقا:۔ ارے کم بخت کبھی شین بھی کہہ دیا کر۔

نوکر:۔ شلام بھی بولے۔ (حیدرآبادی زبان میں)

(اسد بمبئی)

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

(از جناب حضرت ورد کاکوروی)

چمن میں تم اپنے وہی گیت گاؤ یوں ہی جھولو شاخوں پہ تانیں اڑاؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

سحر ہو گئی کیا سماں نور کا ہے چمن سارا پھولوں سے مہکا ہوا ہے

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

یہ سرسبز شاخوں کا ہر دم لچکنا یہ گلشن میں پھولوں کا ہر دم مہکنا

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

کبھی پھڑ پھڑا کر کے بازو ہلاؤ پھدک کر گلستاں کی رونق بڑھاؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

بغل میں یہ شاخوں کے ہاتھوں میں گل کے ہر اک سمت تالی بجاتے ہیں پتے

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

یوں ہی پھول کر رقص اپنا دکھاؤ یوں ہی اور گاؤ یوں ہی گت بجاؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

بڑھی شان گلشن کی اس شور و غل سے ذرا تم لپٹ جاؤ پھر شاخِ گل سے

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

کہ ان چہچہوں سے چمن کھل رہے ہیں چمن میں گل و یاسمن کھل رہے ہیں

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

اڑو اور اڑ کر یوں ہی چہچہاؤ بلندی پہ پیڑوں کی تانیں اڑاؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

یہ وقت سحر اور ٹھنڈی ہوائیں یہ نوری فضائیں یہ رنگیں نوائیں

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

اسی طرح پتوں میں چھپ چھپ کے جھولو یہ گیتیں یہ دھن تم کبھی بھی نہ بھولو

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

گلستاں کی رونق تمہیں سے ہے چڑیو ⁂ خیاباں کی رونق تمہیں سے ہے چڑیو

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

یہ چوں چوں تمھاری عجب جانفزا ہے ⁂ عجب دلربا ہے عجب خوش ادا ہے

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

تمھاری جو معصوم پیاری ادا ہے ⁂ اسی پر تو شاعر کا دل مبتلا ہے

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

یوں ہی مجھ کو معصوم نغمے سناؤ ⁂ اڑو اور شاخوں کو جھولا بناؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

کبھی پاس آؤ کبھی بھاگ جاؤ ⁂ کبھی انگنی پر ذرا گنگناؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

یہ بادِ بہاری یہ رنگیں کیاری ⁂ محبت کے نغمے یہ تانیں تمھاری

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

کرو رقص تم اپنی فطرت نہ بھولو ⁂ یوں ہی دم ہلاؤ یوں ہی پھول سونگھو

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

عجب دلربا ہے تمھارا یہ نقشہ ⁂ کہاں جاکے تم نے ترنم یہ سیکھا

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

بہاریں گلستانِ عالم کی لوٹو ⁂ اسی طرح دل بھر کے شاخوں میں جھولو

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

محبت کے نغموں کی معراج ہو تم ⁂ حقیقت میں پھولوں کی سرتاج ہو تم

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

اڑو اور شاخوں پہ بیٹھو لپک کر ⁂ چہک کر اچک کر جھپک کر پھدک کر

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

ابھی اور گاؤ یوں ہی دل لبھاؤ ⁂ یوں ہی وجد میں درد کے دل کو لاؤ

مری ننھی چڑیو یوں ہی گیت گاؤ

سلطانی کی کہانی

(محترمہ شمسی عبادالرحمٰن صاحبہ)

بہت دنوں کا ذکر ہے، کسی شہر میں ایک رئیس آدمی اور ان کی بیوی رہا کرتے تھے ان کی ایک خوبصورت چھوٹی سی لڑکی تھی اُس کا نام سلطانی تھا، سلطانی کی ماں بڑی نیک دل، اور شریف عورت تھی اپنے پڑوسیوں، رشتہ داروں اور ہر شخص کے ساتھ وہ بڑے ہی خلوص کا برتاؤ کرتی تھی۔ اللہ نے عزت اور دولت سبھی کچھ دیا تھا لیکن اس کی طبیعت میں بہت ہی سادگی اور انکسار تھا وہ خدا کے ہر بندے کو اپنے سے بہت بڑا خیال کرتی تھی اور سب کے ساتھ بڑی عزت سے پیش آتی تھی، دوسرے لوگ بھی اُس سے بہت محبت کرتے تھے اور اس کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا کرتے تھے، سلطانی گو ابھی بہت ننھی سی بچی تھی لیکن ابھی سے اس کا مزاج اور عادتیں بالکل اپنی ماں کی طرح سادہ اور پاکیزہ تھیں اُس کی ماں بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش کرتی اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی آنکھ سے اُسے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔

ابھی سلطانی نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اس کی پیاری ماں کا انتقال ہوگیا غریب بچی اپنی ماں کے لئے بہت روئی اور اس کے غم میں کھانا پینا بھی چھوڑ دیا خیر! رفتہ رفتہ ماں کی یاد کم ہوتی گئی۔ تھوڑے دنوں بعد اس کے باپ نے دوسری شادی کرلی سلطانی سمجھی کہ اُس کی کھوئی ہوئی ماں مل گئی اور بہت خوش ہوئی، لیکن اسے کیا خبر تھی کہ سوتیلی ماں حقیقی ماں نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ یہ بڑی ہی بدمزاج، زباں دراز، اور دوسروں کو دیکھ کر جلنے والی عورت تھی، گھر میں قدم رکھتے ہی اُس نے سلطانی سے جلنا شروع کردیا اور اُسے طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگی اب سلطانی کے باپ بھی پہلی سی محبت نہیں کرتے تھے بلکہ بات بھی نہ پوچھتے تھے اور سوتیلی ماں ہی کے کہنے پر چلا کرتے تھے ننھی سی جان سلطانی نے صبر و شکر کے ساتھ ماں کا ظلم سہا اور کبھی کسی سے شکایت نہ کی۔

کچھ عرصہ کے بعد سوتیلی ماں کے بھی ایک لڑکی پیدا ہوئی اُس کا نام زمانی بیگم رکھا گیا سلطانی اپنی سوتیلی بہن سے بھی بہت اچھی طرح پیش آتی تھی اور اس سے حقیقی بہن کی طرح محبت کرتی تھی۔ جب یہ دونوں لڑکیاں سیانی ہوئیں تو غریب سلطانی کے لئے اور بھی مصیبت کا سامنا ہوا۔ سوتیلی ماں کے علاوہ اب سوتیلی بہن کی بدمزاجیاں اور جھڑکیاں سہنا پڑتی تھیں سلطانی دن بھر گھر والوں کی خدمت اور سارا کام کاج چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے کیا کرتی تھی اس پر بھی اُسے رُوکھی سوکھی روٹی کھانے اور پھٹے پُرانے کپڑے پہننے کو ملتے تھے۔ زمانی ہر وقت ریشم کے قیمتی کپڑے پہنے رہا کرتی کھانا بھی خوب اچھا اچھا کھاتی تھی لیکن جب محلہ پڑوس کے لوگ ان دونوں لڑکیوں کو دیکھتے تو بجائے زمانی کے سلطانی ہی کی تعریف کرتے۔ عورتیں آپس میں کہتی تھیں "اے بہن! سلطانی میلے کچیلے کپڑوں میں بھی کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے اور زمانی پر تو اچھے کپڑے بھی ذرا نہیں سجتے۔" ایسی باتیں سن کر زمانی اور بھی جل جاتی اور اپنی ماں سے رُو رُو کر کہتی "اماں! سلطانی کو کسی دوسری جگہ بھیج دو۔ نہ کوئی اسے دیکھے گا نہ کچھ کہے گا۔" آخرکار ایک روز سوتیلی ماں نے ایک ترکیب سوچی۔ سلطانی کی ماں کے وقت کی ایک بھوری بھینس پلی ہوئی تھی۔ سلطانی اُسے بڑا پیار کرتی تھی اور بھینس بھی سلطانی ہی کو اپنی مالک سمجھتی تھی جب سلطانی اُسے کچھ کھانے کو دیتی تو وہ پیار سے اُس کا منہ چاٹنے لگتی تھی۔ غرض ایک روز سوتیلی ماں نے غریب سلطانی کو یہ حکم دیا کہ دوسرے روز صبح سے وہ بھوری بھینس کو لے جاکر جنگل میں چرایا کرے اور شام کو گھر واپس آیا کرے۔

ماں کے حکم کی تعمیل سلطانی نے خاموشی کے ساتھ کی اور بھینس چرانے کے لئے روزانہ صبح سویرے جنگل کو جانے لگی۔ جَو کی ایک روٹی چلتے وقت اُس کو مل جاتی تھی اسے وہ اوڑھنی میں لپیٹ کر لے جاتی اور جب جنگل کی تیز دھوپ سے پیاس لگنے لگتی تو وہ روٹی کھاکر کسی سرد و صاف پانی کے چشمہ پر پانی پی لیتی۔ ایک روز سلطانی جنگل میں بیٹھی، جَو کی روکھی روٹی چبا رہی تھی کہ اُسے اپنی ماں یاد آگئی اور وہ آسمان کی طرف منہ اُٹھاکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اتنے میں کیا دیکھتی ہے کہ ایک بڑا سا خوان آسمان سے اُترا اور اس کے سامنے ہی زمین پر ٹھہر گیا، خوان پوش بھی خود ہی ہٹ گیا خوان قسم قسم کے لذیذ کھانوں سے بھرا ہوا تھا سلطانی سمجھ گئی کہ خدائے پاک نے جو اپنے بیکس اور مصیبت زدہ بندوں کا مددگار ہے اُس پر ترس فرماکر اس کے لئے کھانا آسمان سے بھیج دیا۔ سلطانی نے جو کی روٹی توڑ کر چڑیوں کو ڈال دی اور خوان کا کھانا کھالیا جو کچھ بچا وہ بھینس کو کھلا دیا اس دن سے یہ معمول ہوگیا کہ خوان آسمان سے اُترتا اور جب سلطانی کھانا کھالیتی تو اسی طرح آسمان کی طرف اُٹھتا ہوا غائب ہو جاتا۔ اچھی خوراک کا اثر سلطانی کی صحت پر بھی اچھا ہوا چند روز میں وہ اور بھی خوبصورت معلوم ہونے لگی اُس کی شکل و صورت دیکھ کر زمانی کو بھی جنگل کو جانے کی فکر ہوئی اس نے اپنی ماں سے کہا "اماں! کل میں بھی سلطانی کے ساتھ جنگل کو جاؤں گی۔" پہلے تو ماں نے منع کیا لیکن جب

زمانی نے بہت ضد کی تو اجازت دے دی۔

دوپہر کو کھانوں کا خوان اُترا سلطانی نے زمانی کو بھی اپنے ساتھ کھانا کھلایا چالاک زمانی نے چپکے سے ہر کھانے میں سے ذرا ذرا سا اپنی آستین میں چھپا لیا اور شام کو جب گھر پہنچی تو سارا حال ماں کو سُنایا اور آستین سے کھانے نکال کر دکھائے ماں جل بھن کر خاک ہی تو ہو گئی اور بولی "ٹھہر تو جا! چڑیل! میں اس بھینس ہی کا خاتمہ کرائے دیتی ہوں نہ یہ ہوگی نہ تو جنگل کو جایا کرے گی" دوسرے ہی روز سوتیلی ماں نے بھوری بھینس کو ذبح کرا دیا اور اُس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرا کر علیحدہ علیحدہ زمین میں دفن کرا دئے سلطانی کو اپنی رفیق بھینس کے ذبح ہو جانے کا بڑا صدمہ ہوا لیکن کیا کر سکتی تھی۔

ایک دن سوتیلی ماں نے جھڑک کر سلطانی سے کہا "اُٹھ ری کام چور! جا محلہ میں سے آگ لے آ" سلطانی کو محلہ بھر میں اتفاق سے آگ نہیں ملی اور وہ آگ کی تلاش میں دور تک چلی گئی جب بہت دور پہنچی تو اُسے ایک جھونپڑی سے دھواں اُٹھتا نظر آیا ایک بڑھیا اُس جھونپڑی کے دروازہ سے راستہ ٹٹول ٹٹول کر باہر نکل رہی تھی سلطانی نے دل میں کہا کہ اس اندھی بڑھیا کے یہاں آگ ضرور ملے گی چنانچہ وہ بڑھیا کے پاس جا کر بولی "بڑی بی! مجھے تھوڑی سی آگ دے دو" بڑھیا نے جواب دیا "بیٹی تو آگ لے لے مگر پہلے ذرا میری چوٹی گوندھ دے اور مجھے وضو کے لئے پانی دے دے" سلطانی نے بڑھیا کی چوٹی گوندھی وضو کرایا اور جب آگ لے کر چلی تو بڑھیا نے دعا دی "خدا کرے بیٹی تیرے ماتھے پر چاند اور ٹھوری پر تارا ہو جائے" جس وقت سلطانی آگ لے کر گھر میں گھسی تو اس کے ماتھے پر چھوٹا سا ہلال اور ٹھوری پر ننھا سا تارا چمک رہے تھے جیسے ہی زمانی کی نظر سلطانی کے چہرے پر پڑی اُس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں اور سلطانی سے پوچھا کہ اُس کے چہرے پر چاند اور تارا کیسے پیدا ہو گئے۔ سلطانی نے سارا قصہ صحیح صحیح سنا دیا دوسرے ہی روز زمانی اکیلی ہی بڑھیا کے یہاں آگ لینے گئی بڑھیا نے اُس سے بھی وہ ہی کہا جو سلطانی سے کہا تھا زمانی کڑک کر بولی "چل دور ہو چڑیل! میں کیا تیری نوکرنی ہوں جو تیری چوٹی گوندھوں اور تجھے وضو کراؤں۔ میں تو چاند اور تارا لینے آئی ہوں۔ تیری خدمت کرنے تھوڑی آئی ہوں" بڑھیا نے جواب دیا "بیٹی تجھے چاند اور تارا نہیں ملے گا" زمانی بڑھیا کی باتیں سن کر بہت غصہ ہوئی اور لپک کر ایک دوہتڑ بڑھیا کی پیٹھ پر مارا بڑھیا درد سے چلا اُٹھی اور یہ بددعا دی "خدا کرے بیٹی تیرے ماتھے پر چٹن اور ٹھوری پر ڈوئی ہو جائے" جب زمانی روتی ہوئی گھر پہنچی تو چٹن اور ڈوئی کے کھڑکھڑ کی آواز دور ہی سے آ رہی تھی ماں یہ حال دیکھ کر دوڑی اور جلدی ہی چٹن اور ڈوئی کو نوچنے لگی مگر وہ تو بہت ہی مضبوطی سے ساتھ چپکے ہوئے تھے ہرگز علیحدہ نہ ہوئے آخر کار دونوں ماں بیٹی رو پیٹ کر بیٹھ رہیں۔

تھوڑے دنوں بعد بادشاہ کے یہاں ایک بہت بڑی تقریب ہوئی اس میں سلطانی کی سوتیلی ماں اور بہن کا بلاوا بھی آیا۔ شام کے وقت دونوں نے خوب اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے اور پالکی میں سوار ہو کر چلی گئیں سلطانی اکیلی بیٹھی ہوئی اپنی قسمت پر رونے لگی۔ روتے روتے سوگئی خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ اس کی ماں اسے پیار کررہی ہے اور کہہ رہی ہے " بیٹی! اٹھ اور بھوری بھینس کے جسم کے ٹکڑے جہاں دفن ہیں وہاں کھود، تجھے کپڑے، زیور، اور جوتہ سب کچھ ملے گا پہن کر تو بھی بادشاہ کے یہاں شادی میں جا" سلطانی چونک پڑی فوراً ایک کدال لے کر کھودنا شروع کیا جس جگہ بھینس کا سر گڑا ہوا تھا وہاں سے جواہرات کا زیور، اور جہاں اُس کا دھڑ دفن تھا اس جگہ سے بہت قیمتی لباس، اور جہاں ٹانگیں دبی ہوئی تھیں وہاں سے ریشمی موزہ اور موتیوں کا جوتہ نکلے۔ سلطانی نے غسل کیا اور سب چیزیں پہن کر پالکی میں بیٹھ بادشاہ کے یہاں پہنچ گئی۔ جیسے ہی محفل میں داخل ہوئی تمام بیویاں حیران ہو کر سلطانی ہی کو تکنے لگیں، ملکہ نے اپنے برابر بٹھایا اور باتیں کرتی رہی۔ اُدھر زمانی نے ماں سے کہنا شروع کیا " اماں! یہ تو سلطانی معلوم ہوتی ہے" ماں نے کہا "بے وقوف ہوئی ہو، اُس کے پاس ایسے جڑاؤ زیور اور قیمتی کپڑے کہاں سے آئے وہ تو گھر میں پڑی ہوگی" ذرا دیر بعد زمانی پھر بولی " اماں! یہ تو ضرور سلطانی ہی ہے کیونکہ چاند اور تارا اور کسی کے چہرے پر ہے ہی نہیں" کچھ دیر یوں ہی حجت ہونے کے بعد آخر زمانی نے کہا " اچھا! گھر چلو اگر وہ گھر پر نہیں ملی تو یہ ضرور وہی ہے" غرض دونوں ماں اور بیٹی فوراً جانے کے لئے تیار ہوگئیں ملکہ نے بہت روکا مگر نہیں رکیں۔ سلطانی نے سوچا گھر پہنچ کر جب سوتیلی ماں اور بہن اسے نہ پائیں گی تو نہ معلوم اس کا کیا حال کریں گی لہٰذا مارے خوف کے وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی ملکہ نے دروازہ تک خود جا کر اسے پہنچایا اور بڑی عزت کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ سلطانی بے چاری ایسی گھبرائی کہ پالکی میں بیٹھتے وقت ایک جوتہ پاؤں سے نکل کر گر گیا مگر اسے خبر نہ ہوئی جب گھر پہنچی تو دیکھا! اب کرتی تو کیا کرتی! جلدی جلدی سب چیزیں اتار کر اسی طرح گاڑ دیں اور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر لیٹ گئی اتنے میں سوتیلی ماں اور بہن بھی آ پہنچیں ماں نے سلطانی کو لیٹا ہوا دیکھ کر زمانی کو خوب برا بھلا کہا کہ اُس نے بادشاہ کے یہاں کا ناچ رنگ بھی نہ دیکھنے دیا۔

صبح کو جب بادشاہ کا چھوٹا شاہزادہ محل کے باہر نکلا تو اس نے سلطانی کا جوتہ پڑا ہوا دیکھا۔ شاہزادے نے ایسا جوتہ بادشاہوں کے یہاں بھی نہ دیکھا تھا وہ جوتہ لے کر ملکہ کے پاس گیا اور کہا " اماں جان! میں اس ہی لڑکی کے ساتھ شادی کروں گا جس کا یہ جوتہ ہے" ملکہ بھی جوتہ دیکھ کر بہت متعجب ہوئی اور ایک بڑی ہوشیار بوڑھی عورت کو بلا کر کہا " دیکھو! تم شہر کے ہر گھر میں یہ جوتہ لے کر جاؤ اور ہر لڑکی کو پہنا کر دیکھو جس کے پاؤں میں ٹھیک آجائے گا

اُس کے ساتھ میں شاہزادہ کی شادی کردوں گی۔" بوڑھی عورت شہر میں گھر گھر گھومی پھری مگر کسی لڑکی کے پاؤں میں بھی وہ جوتہ ٹھیک نہ آیا۔ ایک روز گھومتے گھومتے وہ سلطانی کے یہاں بھی پہنچی چونکہ یہ بات تمام شہر میں مشہور ہوگئی تھی سلطانی کی سوتیلی ماں سمجھ گئی اور فوراً سلطانی کو اس نے کوٹھے کے اوپر چھپا دیا اور اپنی بیٹی کو سامنے لا بٹھایا۔ بوڑھی عورت نے زمانی کے پاؤں میں جوتہ پہنایا لیکن وہ پیر میں گھسا تک ہی نہیں زمانی کی ماں نے خود پہنانا شروع کیا۔ جب بڑی دیر ہوگئی تو بوڑھی عورت بولی " اے بے بیوی جوتہ تو بہت چھوٹا ہے پاؤں میں نہیں آئے گا آپ بے کار کوشش کر رہی ہیں" اور جوتہ لے کر جانے لگی فوراً ہی مرغی خانہ سے مرغے نے اذان دی "ککڑوں کوں ہماری بیوی کوٹھے اوپر" بوڑھی عورت تو بہت ہی ہوشیار تھی سمجھ گئی ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے اور بولی " لے بیوی آپ کا مرغا کیا کہہ رہا ہے" سلطانی کی سوتیلی ماں نے جھنک کر کہا " اذان دے رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے"۔ خیر بوڑھی عورت جانے کے لئے مڑی کہ مرغا پھر بولا "ککڑوں کوں ہماری بیوی کوٹھے اوپر" اس دفعہ بوڑھی عورت نے ایک نہ سنی اور جلدی جلدی زینہ سے اوپر چڑھ گئی۔ کوٹھے پر سلطانی بیٹھی ہوئی تھی ماتھے پہ چاند اور ٹھوڑی پر تارا چمک رہا تھا۔ بوڑھی عورت نے جوں ہی جوتہ سلطانی کے پاؤں میں پہنایا بالکل ٹھیک آگیا۔ بوڑھی خوش خوش ملکہ کے پاس گئی اور سارا حال کہہ سنایا بادشاہ نے شادی کا پیغام سلطانی کے باپ کے پاس بھیجا انھوں نے بہ خوشی منظور کر لیا۔

جس روز بارات آنے والی تھی سلطانی کی سوتیلی ماں نے چوٹی گوندھنے کے بہانہ سے جادو کی سوئی سلطانی کے سر میں چبھو دی۔ سوئی کا چبھونا تھا کہ سلطانی چڑیا بن کر پھر سے اڑ گئی اور اس کی جگہ زمانی کو دلہن بنا کر بٹھا دیا جب زمانی رخصت ہو کر بادشاہ کے محل میں پہنچی تو اس کی بدصورتی کا چرچا سارے محل میں ہونے لگا چونکہ شاہزادے کے کہنے پر شادی ہوئی تھی اس لئے اس نے منہ سے کچھ نہ کہا لیکن بہت رنجیدہ رہنے لگا ایک روز شاہزادہ باغ میں ٹہل رہا تھا کہ ایک بہت خوبصورت سی چڑیا باغ کی دیوار پر آکر بیٹھی اور بڑی سریلی آواز میں گانے لگی۔ گاتے گاتے اس کی چونچ سے پھول گرنے لگے اور جب وہ گانا ختم کر کے اڑی تو پروں سے موتی بکھر گئے شاہزادہ کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا دوسرے روز شام کو پھر شاہزادہ باغ میں گیا اور چڑیا بھی آکر دیوار پر بیٹھی شاہزادے نے جیسے ہی ہاتھ بڑھایا چڑیا اس کے ہاتھ میں آگئی شاہزادہ ایسی عجیب و غریب چڑیا پا کر بہت خوش ہوا اور اسے سونے کے پنجرے میں پال لیا ہر وقت اس کا گانا سنا کرتا اور اپنے ہاتھ سے اُسے دانہ اور پانی دیا کرتا تھا رفتہ رفتہ زمانی کو چڑیا سے بھی جلن پیدا ہوگئی ایک روز خوب زور کی بارش ہوئی شاہزادہ اس وقت محل میں نہ تھا زمانی نے ماماؤں سے کہہ دیا کہ چڑیا کا پنجرہ صحن سے اٹھا کر اندر نہ لائیں چڑیا پانی میں بھیگ کر مر جائے تو اچھا ہے۔ اتنے میں شاہزادہ آگیا اس نے چڑیا کو بھیگا ہوا دیکھ کر بہت افسوس کیا اور جلدی سے پنجرہ کھول کر اُسے باہر نکال لیا اور رومال سے اس کے پر خشک کرنے لگا جب سر پہ ہاتھ پھیرا تو کوئی تیز سی چیز اس کی انگلی میں چبھی شاہزادے نے دیکھا تو سوئی تھی جیسے ہی اس نے سوئی کھینچ کر نکالی سلطانی اپنی اصلی شکل پر آگئی اور چاند تارے والی خوبصورت لڑکی بن گئی۔

(از جناب پروفیسر محمد عطاء اللہ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

یہاں سے بہت دور سمندر پار ملک ہالینڈ کے ایک شہر میں ایک غریب رہتا اور محنت مزدوری سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ خدا نے اس کو ایک بیٹا دیا تھا جس کا نام جان تھا۔ جان اگرچہ کم عمر تھا پھر بھی ماں باپ کی غریبی پر اس کا دل دکھتا تھا۔ وہ اپنا کافی وقت ماں باپ کا ہاتھ بٹانے میں صرف کیا کرتا تھا۔ سڑک پر کے نل سے دونوں وقت چھوٹی چھوٹی بالٹیوں میں پانی بھر کر لاتا۔ جلانے کے لئے لکڑیاں توڑ لاتا۔ غرض ہر ممکن طریقے سے ماں باپ کی خدمت بجا لاتا۔

جب جان کی عمر چھ برس کی ہوئی تو ماں باپ نے اس کو اسکول بھیج دیا۔ اسکول میں زیادہ تر امیروں کے بچے پڑھتے تھے بہت تیز و طرار۔ سبق ان کو ازبر، کھیلوں میں وہ طاق، شوخی و شرارت میں وہ مشاق۔ سیدھا سادھا جان ان کی نظروں میں کیوں کر جچتا۔ لگے اس کو بنانے۔ ایک نے اس سے آن کر کہا۔ جان تم فٹ بال اور ہاکی تو ایسی کھیلتے ہو کہ بھلا کپتان کیا کھیلیں گے۔ کہو تو ان دونوں کو ہٹوا کر تمہیں ہاکی اور فٹ بال دونوں کا کپتان بنوا دیں۔ مگر بھیا ایسا نہ ہو کہ ہیڈ ماسٹر صاحب تو ہاں جائیں اور تم نہ مانو۔ دوسرے نے بڑھ کر کہا۔ بھائی سنو تو تمھاری جماعت کا مانیٹر تو

بالکل ہی نکما ہے نہ لکھائی جانے نہ پڑھائی تم لکھتے ہو تو موتی پروتے ہو۔ پڑھتے ہو تو پھول برساتے ہو۔ کل دیکھا نہیں ساری جماعت کے بستے مہک رہے تھے اور مارے خوشبو کے لڑکے بہک رہے تھے۔ لیکن بھیا ہمیں یہی ڈر ہے کہ تم مانیٹر ہونا قبول نہیں کرو گے جان ان لوگوں کی شرارتوں پر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا مگر دم نہ مارتا تھا۔ جان غریب ضرور تھا۔ کند ذہن اور بے سلیقہ نہیں تھا اس نے ٹھان لی کہ ان شوخ و شریر لڑکوں کو اپنی محنت اور لیاقت سے شرمندہ کروں گا۔ چنانچہ دل لگا کر باقاعدہ محنت کرنے کی بدولت جان دو تین ہی مہینوں میں کھیل اور پڑھائی دونوں میں خوب ہوشیار ہو گیا۔ اب اُستاد اور ہم جماعت سبھی اس کی عزت کرنے لگے۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ جان بڑا عالم فاضل ہو گیا۔ یا اسکول کے بچوں میں جو غفلت پائی جاتی ہے وہ اس کو چھوڑ بیٹھا۔ وہ ایسا ہی تھا جیسے تم آج کل ہو۔

جان صبح سویرے اٹھ کر ضروری کاموں میں ماں کی مدد کرتا اور پھر بستہ بغل میں دبائے بھاگم بھاگ اسکول کا رخ کرتا لیکن بچہ تو تھا ہی راستے میں کبھی پھول توڑنے لگ جاتا۔ کبھی تتریوں کے پیچھے بھاگتا پھرتا۔ کبھی کوئی ننھا مینڈک پھدکتا دیکھتا تو اسی تماشے میں بہت سا وقت کھو دیتا۔ اور جب اسکول کی گھنٹی بجتی تو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا۔ کہ اسکول کا پھاٹک بند ہونے سے پہلے پہنچ جائے۔ ایک دن جان کی نگاہ سڑک کے کنارے ایک جھاڑی پر پڑی۔ اور دیکھا کہ ایک مکڑی جالا تن رہی ہے وہ اس تماشے میں ایسا مشغول ہوا کہ جب اسکول کی گھنٹی بجی تو اس کو ہوش آیا۔ لیکن اسکول تھا بہت دور۔ جان میاں دوڑے۔ اور خوب دوڑے۔ مگر چپراسی نے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی پھاٹک بند کر دیا۔ اب جان صاحب باہر کھڑے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھاٹک کھلا۔ اور ایک ماسٹر صاحب نے پھاٹک سے باہر سر نکال کر پوچھا "جان تم دیر کر کے کیوں آئے ہو"

جان نے نہایت سادگی سے جواب دیا" جناب میں ایک مکڑی کو جالا تنتے دیکھتا رہا۔ اور وقت نکل گیا" ماسٹر صاحب بہت خفا ہوئے اور فرمایا اچھا آج اسکول بند ہونے کے بعد تم کو آدھ گھنٹے یہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ جان سمجھا خیریت گذری، ماسٹر صاحب کو بھلا کب یاد رہے گا کہ مجھے چھٹی کے بعد بیٹھنا ہے۔ وہ تو بھول ہی جائیں گے۔ اور ہم یاد کرانے سے رہے۔ لیکن ماسٹر صاحب ایسے بھولنے والے تھے نہیں۔ اسکول میں چھٹی ہوئی اور جان میاں روک لیے گئے

جان کو ذرا تھوڑی دیر کے لئے غفلت کی سزا بھگت لینے دو۔ اور یہ سنو کہ ہالینڈ کیسا ملک ہے۔ ہالینڈ کا بہت سا حصہ سمندر کی سطح سے نیچا ہے اور سمندر کے کنارے ہی یہ ملک آباد ہے۔ سمندر کے پانی کو روکنے کے لئے اس ملک والوں نے مٹی اور پتھر کے بڑے بڑے چوڑے اور اونچے بند بنا رکھے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کا ملک پانی کے ایک ریلے سے بہ جائے۔ بعض وقت سمندر میں طوفان اٹھتا ہے تو بڑی بڑی لہریں پتھر کی ان دیواروں کو توڑ دیتی ہیں اگر ان دیواروں میں کوئی چھوٹا سا سوراخ ہو جائے تو پانی اس کے اندر گھس کر اس کو بڑا کرتا چلا جاتا ہے اور اگر وقت پر اس سوراخ کو بند نہ کر دیا جائے تو دیوار ٹوٹ جاتی ہے اور سارا علاقہ پانی میں غرق ہو جاتا ہے۔ مکان گر جاتے ہیں جائداد اور جانور تباہ اور بے شمار انسان ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی بند کے ٹوٹ جانے سے ایک مرتبہ ایک سارا شہر تباہ ہو گیا۔ اور صرف ایک خاندان اس مکان کی چھت پر سے کشتی میں اتارا گیا جو پانی میں کھڑا رہ گیا تھا

جان نے آدھ گھنٹہ بڑی ہی کوفت میں گذارا۔ مگر اپنا سبق نہایت توجہ سے یاد کرتا رہا۔ آدھ گھنٹہ گذرنے پر ماسٹر صاحب نے سبق سنا۔ جان کو شاباش کہی۔ اور چھٹی دی

جان چھٹی پاتے ہی کھیل کے میدان

میں پہنچا۔ دیکھا تو سب لڑکے جا چکے تھے اب
جان کو اکیلے ہی گھر جانا تھا۔ اس کے گھر کا
راستہ بند کے اوپر کی سڑک پر سے تھا
جان تیزی سے جا رہا تھا کہ یکایک ایک مقام
پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ بند میں ایک
چھوٹا سا سوراخ ہو گیا ہے اور پانی کی ایک ننھی
سی دھار اس کے اندر چلی جا رہی ہے۔ جان
اس چھوٹے سے سوراخ اور اس ننھے سے
دہانے کے نتیجے سے خوب واقف تھا۔ اب وہ
پڑا ایک گہری سوچ میں۔ پہلے تو اس کے
دل میں خیال آیا کہ بھاگ کر شہر چلنا اور مدد
لانا چاہیئے۔ ابھی کچھ فیصلہ نہیں کرنے پایا تھا
کہ اس نے سوراخ کو پھر دیکھا۔ وہ اتنی سی دیر
میں پہلے سے بڑا ہو گیا تھا۔ اب اس نے سوچا
شہر جانا بے کار ہے۔ اگر اس سوراخ کو بند
نہ کیا گیا تو سمندر کا پانی میرے پہنچنے سے پہلے
شہر میں پہنچ جائے گا یا پھر سوراخ اتنا بڑا ہو جائے
گا کہ پانی کا زور اس کو بند نہیں ہونے دے گا۔
اب میں جو کچھ کر سکتا ہوں مجھے خود ہی کرنا چاہیئے

جان نے قریب سے سوراخ میں ریت
بھرنا شروع کیا۔ کچھ دیر کے بعد دیکھا تو معلوم ہوا
کہ یہ تدبیر بے کار ہے۔ پانی ریت کو فوراً بہا
لے جاتا ہے۔ اب اس ننھی سی جان نے
سوراخ کے آگے اپنا ہاتھ رکھ دیا اور دیکھا کہ ہاتھ
رکھنے سے اس سوراخ کے اندر پانی کا بہاؤ
بند ہو گیا ہے۔ اب جان نے کہا میرا ہاتھ اس
سوراخ کو اس وقت تک ڈھانکے رکھے گا۔
جس وقت تک امداد نہ پہنچ جائے اس نے یہ کہا
اور سوراخ کو ہاتھ سے بند کر کے بیٹھ گیا۔ جان
تھا تو ننھا سا لڑکا لیکن اس کو خوب معلوم تھا کہ
یہ ننھا سا سوراخ ایک غضب ڈھا سکتا ہے۔
جب جان سوراخ کو روک کر بیٹھ گیا
تو اس نے سوچا۔ ابھی کوئی ادھر سے گذرتا ہے
تو سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ لیکن صاحب
یہ ننھا بہادر سوراخ پر اپنے ہاتھ رکھے بیٹھا رہا
اور ادھر سے کسی کو نہ گذرنا تھا نہ گذرا۔ شام
ہوئی۔ اندھیرا چھایا۔ رات ہوئی۔ شہر کی گھڑی
نے دس بجائے تو جان امداد کی طرف سے

مایوس ہوگیا بے چارا مارے سردی کے کانپنے لگا اور اس کے نازک بازو میں درد شروع ہوگیا۔ جب کبھی جان درد سے نڈھال ہوکر ہاتھ ہٹا لینے کی سوچتا تو اس کو فوراً خیال آتا کہ اس ہاتھ کو اٹھانا اپنے شہر کو ڈبو دینا ہے۔ وہ مدد کے لئے چلاتا رہا لیکن رات کو ادھر کون آتا

اب جان کو نیند آنے لگی لیکن بازو کا درد اسے سونے نہیں دیتا تھا۔ خیال کرو ایک ننھا سا لڑکا شہر سے دور سمندر کے کنارے اپنا ہاتھ ایک سوراخ پر رکھے بیٹھا ہے بھوک ستا رہی ہے۔ نیند آرہی ہے۔ بازو میں سخت درد ہو رہا ہے۔ ماں باپ کی بے تابی کا خیال ہے۔ وقت گذرتا چلا جاتا ہے۔ طاقت جواب دے رہی ہے لیکن جان کی ہمت قابلِ تعریف ہے ہمت نہیں ہاری۔ ستاروں کی طرف دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کیا میں ہاتھ اٹھالوں اور ستارے اس کو یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں شاباش ثابت قدم رہو۔ ہاتھ مت ہٹاؤ۔ رات کا اندھیرا کم ہوا۔ پو پھٹنے لگی۔ جان کا دل خوشی

سے بھر گیا۔ اس نے سوچا مصیبت کی رات ختم ہوئی اور مسرت کا دن نمودار ہونے کو ہے۔ سچ مچ ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ ایک شخص ادھر سیر کو آن پہنچا۔ چھوٹے سے لڑکے کو سمندر کے کنارے بیٹھے دیکھ کر تعجب سے پوچھا ارے میاں تم یہاں سویرے ہی سویرے کیا کر رہے ہو۔ جان مارے سردی اور تکلیف کے نڈھال ہوچکا تھا۔ نہایت تھکی ماندی آواز میں اس نے کہا۔ جناب بند میں ایک سوراخ ہوچکا ہے۔ میں رات بھر سے پانی کو روکے بیٹھا ہوں۔ اس شخص نے کچھ مٹی پتھر اکٹھے کئے اور سوراخ کو بھر دیا اور جان کو جو اب بے ہوش ہو رہا تھا اٹھا کر اس کے ماں باپ کے پاس لے گیا۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ ماں باپ کے دل پر جان کی رات بھر کی غیر حاضری کی وجہ سے کیا گذری ہوگی۔ لیکن اس چھوٹے سے بچے کی بہادری۔ تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی کیا کوئی ایسا وقت آن پڑے تو تم بھی اپنے شہر کو بچانے کے لئے اس قدر مصیبت خوشی سے برداشت کرسکتے ہو؟

(از جناب مولوی شفیق الرحمن صاحب قدوائی بی اے جامعہ)

خدا بھلا کرے پادری صاحب کا جب سے اُنھوں نے اس بستی میں اسکول کھولا ہے، بچوں کی تعلیم کا بڑا معقول انتظام ہوگیا ہے، ملاجی سے بچوں کو نجات مل گئی اب وہ بوڑھے بھی زیادہ ہوگئے تھے۔ عمر کے ساتھ غصہ بڑھتا جاتا تھا اور حرص بھی، ہر روز بچوں کو یہی فکر لگی رہتی کہ ملاجی کے لئے کیا لے جائیں۔ خالی ہاتھ گئے تو چاہے سبق یاد ہو یا نہ ہو ملاجی کا غصہ بھڑک اُٹھتا تھا۔ پہلے تو زبان کی مار اور دھمکیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ "ٹھہر جا ابھی تیری ٹانگیں چیر کر پھینک دیتا ہوں" "سر توڑ دوں گا"۔ اس کے بعد گھونسے اور لات کا عمل شروع ہوتا اور زیادہ غصہ بڑھا تو پھر چھتری، لاٹھی، جوتا، اور تختی غرض جو ہاتھ پڑتا استعمال ہوتا۔ پڑھنا لکھنا تو قسمت کی بات ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ ملاجی کے نام سے بچوں کی روح لرزتی تھی، جہاں کسی نے کوئی ضد یا شرارت کی ملاجی کو جھوٹ موٹ آواز دی گئی اور لڑکوں نے چپ چاپ کہا مان لیا۔ ملاجی کا مکتب اب روز بروز اجڑتا جاتا ہے مگر ان کا رعب اب تک قائم ہے اور سچ یہ ہے کہ ملاجی کے اس رعب داب سے جو آرام اور سکون، اطمینان اور چین بستی والوں کو نصیب ہے یہ بھی ایک بڑی نعمت ہے۔

بستی کے اکثر بچے اب اسکول جاتے ہیں، اور بڑے شوق سے جاتے ہیں، کیوں نہ جائیں؟ پادری صاحب بچوں پر بڑی شفقت کرتے ہیں، اور سنا ہے کہ بچے چاہے جتنا شور کریں، دنگا فساد کریں، لڑیں جھگڑیں، استادوں کے سامنے کھیلیں اور شوخی کریں، یہاں تک کہ اگر کوئی شریر بچہ پادری صاحب کی داڑھی بھی نوچے تو کوئی کچھ نہیں کہتا بلکہ پادری صاحب کا حکم ہے کہ بچوں کو مارا نہ جائے محبت اور پیار سے، سمجھا بجھا کر اور چمکار کر پڑھانا چاہئے۔ میں نے بھی اپنے لڑکے مسعود کو اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ اب ماشاء اللہ چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے، پادری

صاحب بھی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ لڑکا بڑا ہونہار اور تیز ہے، میں تو اب اس کی صورت ہی نہیں دیکھتا' صبح کو اسکول جاتا ہے، شام کو آتا ہے! کبھی پڑھنے کا بہانا ہے تو کبھی کھیل کود کا! پہلی بات تو خیر سمجھ میں آتی ہے لیکن آخر کھیل کود میں بچوں کا وقت کیوں ضائع کیا جاتا ہے، کسرت سکھائی جاتی، کشتی اور بنوٹ سکھاتے تو ایک بات تھی، بدن میں قوت آتی جسم بنتا، کسی دشمن سے مقابلہ ہوتا تو نیچا نہ دیکھتے، مگر یہاں تو بس ایک جانگھیا پہنا اوپر سے ایک بنیائن چڑھائی اور ننگے سر ایک ٹیڑھی لکڑی لئے گیند کے پیچھے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔

مسعود مڈل میں فیل ہوگیا تھا مگر اس کو اگلے درجہ میں ترقی دیدی گئی اس لئے کہ کھیل کود میں وہ اسکول کے لئے باعث فخر ہے! میں نے اسکو پڑھنے لکھنے کے لئے اسکول میں داخل کیا تھا، اب معلوم ہوا کہ صاحب زادے کھیل کود کے درجے پاس کرتے ہیں' میری نیت تو یہ تھی کہ وہ مڈل پاس کرلے تو اسکو گھر کے دھندوں میں لگاؤں، مجھ سے تو اب کام سپڑتا نہیں۔ لڑکا جوان ہوا ہے تھوڑی سی جائداد باقی رہ گئی ہے، اگر یہ چاہے محنت مشقت کرکے اب اب بھی دال روٹی کا ٹھیکا کرسکتا ہے، جب سے مڈل میں فیل ہوئے ہیں انٹرنس پاس کرنے کا شوق ہوا' ماں کے پیچھے پڑا ہے کہ "ابا سے کہہ کر مجھے لکھنؤ بھجوا دیجئے وہاں پڑھائی کا انتظام اچھا ہے، اور اگلے سال میں انٹرنس ضرور پاس کرلوں گا" کل پادری صاحب ملے تھے، وہ بھی مسعود کو لکھنؤ بھیجنے کی صلاح دے رہے تھے، سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، زمینداری کا تو اب خاتمہ ہی سمجھنا چاہئے، آمدنی روز بروز کم اور خرچ بڑھتا جاتا ہے۔ مگر پھر سوچتا ہوں کہ ہم سب جاہل رہے، خاندان میں ایک لڑکا تو تعلیم یافتہ ہو جائے، گھر کا نام روشن ہوگا، پڑوسیوں کے کام نکلینگے۔ کوئی عرضی لکھوانا چاہتا ہے کوئی خط، کسی کے پاس تار آئے تو کوئی جواب دینے والا نہیں۔ مسعود نے اگر انٹرنس پاس کرلیا تو سب لوگ اس کے پاس آیا کریں گے۔ بڑے صاحب، کبھی ادھر سے گزرے تو وہ بھی مسعود ہی سے انگریزی میں گٹ پٹ کریں گے۔

مسعود صاحب اب لکھنؤ میں پڑھتے ہیں، شہر کی ہوا بہت جلد لگ گئی ہے اور تعلیم کا اثر بھی صرف ظاہری طور پر ظاہر ہوتا جاتا ہے، فیشن کا زور ہے، خرچ کی کوئی انتہا نہیں، پڑھائی لکھائی کا حال تو خدا ہی کو معلوم، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مہینہ کے مہینہ پچیس تیس روپیہ قرض لیکر بھیجنا پڑتا ہے، اور وہ بھی ان کے لئے بس نہیں ہوتا۔ پھر ماں اور سوتائی کے پاس تقاضے آنے شروع ہوتے ہیں کبھی کتابوں

کی ضرورت ہوتی ہے، کبھی جشن تاجپوشی منایا جاتا ہے، کبھی ڈپٹی کمشنر صاحب کی دعوت کے لئے چندہ مانگا جاتا ہے۔ کبھی زلزلہ اور سیلاب زدہ لوگوں کے لئے روپیہ جمع کیا جاتا ہے، غرض میں تو اب اس کی حرکتوں سے تنگ آگیا ہوں۔ چھٹے چھمائے گھر تشریف لاتے ہیں تو اس طرح جیسے بڑے صاحب دورے پر آتے ہیں، نہ کوئی ڈھنگ ہے نہ قرینہ، صبح دس بجے سو کر اٹھتے ہیں، نہ نماز سے مطلب نہ روزے سے، نہ ہاتھ دھویا نہ منہ ادھر ٹہلے ادھر ٹہلے پھر اٹیچی کھول کر بیٹھ گئے بکس کیا ہے، حجام کی پوری کسبت ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے بناؤ سنگار میں ضائع کئے پھر ٹوپ لگا کر اور منہ میں چرٹ دبائے ہوئے صاحب کوٹھری سے برآمد ہوئے کسی پر رعب جمایا، کسی پر آوازے کسے نہ سیدھے منہ کسی سے بولتے ہیں نہ آدمیت کی بات کرتے ہیں، آسمان سے زمین پر اگر اترے بھی تو ہر شخص کو نصیحتیں شروع کر دیں، بہنوں کو پردہ کی برائیاں بتائی جاتی ہیں، ماں سے اصرار ہے کہ ساڑی باندھے، اور جوتہ پہنے، لالہ کے پیچھے پڑا ہے کہ تخت پر بیٹھ کر کام کیوں کرتے ہو، میز کرسی کیوں نہیں لگاتے، سپاہیوں اور نوکروں کو ہدایت کی جاتی ہے۔ کہ لنگی کی بجائے نکر پہنا کرو، میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ ابھی تک میرا کچھ لحاظ باقی ہے، میرے سامنے تو منہ کھول کے بات اب تک کی نہیں لیکن پیٹھ پیچھے جانے کیا کچھ کہتا ہو گا کل اس کی ماں نے بہت سمجھایا کہ "بیٹا اب گھر آکر رہو، گھر کا کاروبار دیکھو، تمہارے باپ سے تو اب کچھ ہوتا ہواتا نہیں، پھر کون کرے گا،" جواب ملا کہ "میں تو انٹرنس پاس کر کے نوکری کروں گا۔ زمینداری میں اب رکھا کیا ہے۔ اور یہاں دیہات میں میرا جی بھی نہیں لگتا۔"

مسٹر مسعود تین سال انٹرنس میں فیل ہوئے کھیل کود میں ہمیشہ اول رہتے تھے، اس لئے اسکول میں ان کی بڑی قدر تھی، ہیڈ ماسٹر صاحب کا زور چلتا تو ابھی ایک دو سال اسکول میں رکھ کر اور دوڑاتے، مگر اب قاعدہ ہو گیا ہے کہ تین سال مسلسل فیل ہونے کے بعد طالب علم کو پھر اسکول میں نہیں رکھا جاتا۔ میاں مسعود بھی اسی وجہ سے اسکول سے نکالے گئے، بیچارے پادری صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب دونوں نے بہت کوشش کی کہ تھانہ داری میں بھرتی کر لئے جائیں، مگر مقابلہ کا امتحان جب سے ہو گیا ہے کسی کی سفارش سے بھلا کیا کام چلے۔ پہلے نشر انئی کی ملازمت کی تلاش تھی، دو تین مہینہ کی دوڑ دھوپ کے بعد معلوم ہوا کہ پچیس تیس کی نوکری بھی کہیں نہیں ملتی، ہر محکمہ میں درخواستیں بھیجیں، پادری صاحب سے سفارشیں کرائیں، مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، باپ نے خرچ دینا بند کر دیا تھا، ناں کے پاس

اتنا کہاں کہ مہینہ کے مہینہ منی آرڈر بھیجتی رہے، شہر کا
رہنا مشکل ہو گیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ چار و ناچار مسٹر مسعو
نے گھر آنے کا فیصلہ کیا۔ مگر آدمی تعلیم یافتہ ہیں اس لیے
دوست احباب کے مشورے سے 'پولٹری فارمنگ'
(مرغیاں پالنے) کی ایک اسکیم تیار کی۔ سوچا کہ اس
میں بڑا فائدہ ہے ہزاروں روپے کے انڈوں کا
خرچ لکھنؤ کے ہوٹلوں میں ہے، اگر تعلیم یافتہ لوگ
پولٹری فارمنگ کریں تو گھر بیٹھے فائدہ ہی فائدہ
اس میں ہے۔ خاص کر زمینداروں کے لئے اس میں
بڑی آسانیاں ہیں، اگر جدید طریقہ پر اس کام کو
کیا جائے۔ غرض میاں مسعود نے گھر پہنچتے ہی
پہلے تو باپ کو اپنی ساری اسکیم بتائی، لیکن سارا
معاملہ روپیہ کے خرچ کا تھا، سوکھا جواب ملا، پھر
ماں کے پاس پہنچے اور قائل معقول کرنا شروع
کیا "کہ زیور بیکار رہی تو پڑا ہے اس کو کاروبار میں
لگانا چاہیئے، ولایت میں کوئی عورت زیور نہیں پہنتی
سب لوگ اپنا سونا چاندی تجارت میں لگا دیتے
ہیں اور لاکھوں روپیہ کماتے ہیں، مگر ہم لوگ اپنی
جہالت کی وجہ سے اپنی دولت سے فائدہ نہیں
اٹھاتے"۔ ماں بے چاری ان دلیلوں کا کیا جواب
دیتی ماننا سے مجبور تھی، بیٹے کی ضد بہر حال پوری
کرنا تھی، چپکے سے گئی اور صندوقچہ سے زیور لا کر
بیٹے کے حوالہ کیا، میاں مسعود سیدھے مہاجن کے
پاس پہنچے اور زیور گرو رکھا کر ساڑھے چار سو
روپیہ نقد لے آئے، پختہ اینٹوں کا ایک جالی دار
بہت بڑا مرغی خانہ بنوایا، نصف سے زیادہ رقم
یوں صرف ہو گئی' پھر لکھنؤ گئے کچھ اصیل اور لائتی
مرغے اور مرغیاں خرید کر لائے، دیسی مرغیاں بھی
جتنی ملی گئیں۔ بڑھاتے گئے، مگر قسمت خراب تھی معلوم
نہیں کیا ہوا کہ روز آٹھ دس مرغیاں آپ ہی آپ
مرنے لگیں اور مہینہ بھر میں مرغی خانہ کا صفایا ہو گیا
اس تلخ تجربے کے بعد اب کیا کریں، آدمی بہر حال
تعلیم یافتہ تھے۔ سوچا کہ "ایگری کلچر فارم" (زراعتی
فارم) کیوں نہ کھولا جائے، زمین اپنی موجود ہے
اگر جدید طریقہ پہ کاشتکاری کی جائے تو کوئی
وجہ نہیں کہ فائدہ نہ ہو، آخر ولایت میں اور امریکہ
میں اس کی بدولت لوگ لکھ پتی بن گئے ہیں" پھر
ایک اسکیم تیار کی کہ "سو ایکڑ آراضی سے کام شروع
کیا جائے۔ چاروں طرف لوہے کی جالی لگائی جائے
تاکہ جانور نقصان نہ کریں، بیچ میں ایک پھوس کا
بنگلہ ہو، تاکہ خود ہر وقت نگرانی کی جائے، پاس ہی
ایک ٹینس کورٹ بنا دیا جائے، تاکہ شام کو ورزش
کا انتظام ہو جائے، اگری کلچرل ڈپارٹمنٹ (محکمہ
زراعت) سے 'ٹیوب ویل' (انجن کو چلانے والا
پانی کا نل) تقاوی پر لگوایا جائے، ورنہ آب پاشی
کی دقت ہو گی 'ٹریکٹر' (مشین سے چلنے والا ہل)

کی فی الحال ضرورت نہیں لیکن بیلوں کی بجائے اگر اونٹوں سے جوتنے کا کام لیا جائے تو مصارف بہت کم ہوجائیں گے، کھاد بہرحال ولایتی استعمال کی جائے گی۔ اس لئے بیلوں کی اور بھی ضرورت نہ ہوگی۔ فارم کا افتتاح ڈپٹی کمشنر صاحب سے کرایا جائے تاکہ ڈپارٹمنٹ سے امداد ملنے میں آیندہ آسانی ہو" یہ اسکیم زیر غور تھی کہ اسی زمانہ میں یکایک باپ پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ مسعود کو اپنی جائداد اور اس جائداد کے ساتھ تمام قرضوں اور ذمہ داریوں کا وارث چھوڑ کر مر گئے، اب ہر طرف سے مسعود پر تقاضے شروع ہوئے، سرکار کی مال گذاری کا تقاضا مہاجن کے سود کا تقاضا، بنئے اور بقال کا تقاضا، کھاتے دیکھئے، حسابات جانچئے تو معلوم ہو کہ جائداد ساری مقروض ہے، اگر پوری جائداد اور گھر کا اثاثہ بیچ دیا جائے تو بہ مشکل قرض ادا ہوگا، اور شاید پچیس تیس بیگھہ زمین بچ جائے! اب اسی کو غنیمت سمجھ کر میاں مسعود نے فارمنگ کا ارادہ تو ترک کر دیا ہے، فی الحال کھیتی باڑی کر کے جیسے بنتا ہے، دو وقت کی روٹیوں کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

کون سا مضمون پسند ہے؟

تمھارے اس پرچے میں طرح طرح کے مضمون شائع ہو رہے ہیں۔ ہم نے اپنی طرف سے تو اچھے ہی مضمون جمع کئے ہیں۔ لیکن ہم تمھاری رائے بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ تمھیں ان میں سے کون سے مضمون زیادہ پسند ہیں اور کون سا مضمون تمھیں مفید اور دلچسپ نہیں معلوم ہوا۔ علاوہ اس کے یہ بھی بتاؤ کہ پورے پرچے کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے ممکن ہوا تو تمھارا خط پیام تعلیم میں بھی چھاپ دیں گے۔ (ایڈیٹر)

از جناب مرزا مظفر الدین صاحب سیفی دہلوی

آج کل اظہر میاں کی شرارتوں سے سب کا ناک میں دم آگیا ہے۔ ڈھائی برس کی جان نے سارے گھر کو تگنی کا ناچ نچا رکھا ہے۔ جب تک پاؤں نہیں کھلے تھے پھر بھی غنیمت تھا اس وقت اظہر میاں صرف مچھلی کی طرح تیرنا جانتے تھے۔ ایک ٹانگ دم کی طرح اٹھا کر سارے کمرے میں تیرتے پھرتے تھے۔ ذرا موقع لگا اور پاندان کی شامت آئی۔ فرش پر چھالیاں اور زردہ بکھیر رکھا ہے۔ کتھا اور چونا مزاے کر بیٹھے چاٹ رہے ہیں۔ خود پان بنانے کی کوشش میں ہاتھ اور منہ لال کر رکھا ہے کسی نے دیکھ لیا تو جلدی ہاتھ منہ دھلایا۔

اب جب سے آپ کھڑے ہو کر چلنا سیکھ گئے ہیں۔ آپ کی شرارتوں نے بھی ہاتھ پاؤں نکالے ہیں اور روز نئی سے نئی شرارتوں کا بازار گرم رہتا ہے۔ یہ توڑ، وہ پھینک، بندر کی طرح ہر بات کی نقل کرنے کا شوق۔ آپ کو ایک گھڑی چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ ہم یہاں پیامی بچوں کی دلچسپی کے لئے اظہر میاں کی چند معصومانہ شرارتیں درج کرتے ہیں

ایک روز بیٹھے بیٹھے آپ کا کچھ لکھنے پڑھنے کو جی چاہا، چپکے سے میز کے پاس۔ جا پہنچے۔ قلم اٹھا کر کچھ لکھنا ہی چاہتے تھے

کہ اتفاقاً دوات لڑھک گئی۔ روشنائی
سے سفید چادر پر گل بوٹے بن گئے۔ پہلے
تھوڑی دیر تک آپ ان پھول پتیوں کو دیکھ
دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ پھر کچھ سوچ کر اپنی
اس غلطی کو چھپانے کی کوشش کرنے لگے غرض
انگلیوں سے خطِ گلزار کی مشق کرتے کرتے
ہولڈر کی سوجھی۔ بے دھیانی میں وہ بھی چبھ
گیا۔ اس لئے اسے وہیں ٹیک کر چپ چاپ
چلے آئے لیکن پھر بھی ہاتھ اور کپڑوں پر
روشنائی کے دھبوں نے ان کی کارستانی
کی چغلی کھا دی۔ جن کا انھیں بہت افسوس تھا

ایک روز کا ذکر ہے کہ آپ تنہائی میں
کھیل رہے تھے۔ یکایک آپ کے چلّانے
کی آواز کان میں آئی، "اماں۔ اماں"! آپ
کی آواز کے بھیانک پن سے سب چونک پڑے
جا کر دیکھا کہ آپ مسہری پر بیٹھے ہیں۔ آنکھیں
اور منہ پھٹا ہوا ہے اور چہرے پر ہوائیاں
اڑ رہی ہیں۔ گویا کوئی ڈراؤنی صورت دیکھ
کر مبہوت ہو گیا ہو۔ اسی حالت میں آپ اپنے
ہاتھ سے بار بار منہ کی طرف اشارہ کرتے تھے
جیسے کوئی چیز حلق میں اٹکی ہو۔ تحقیق کرنے
سے معلوم ہوا کہ چھوٹی تین پائیاں جو صبح کو
انھیں کھیلنے کے لئے دی گئیں تھیں۔ وہ آپ
خیر سے نگل گئے ہیں۔ تھوڑا سا پانی وغیرہ
پلایا گیا تب آپ کی جان میں جان آئی۔
پائیاں پیٹ میں پہنچ گئیں۔ لیکن منہ اب
بھی کھلا ہوا ہے۔ اور بار بار یہی سوال ہے
کہ اب کیا ہو گا۔ آخر بہت سی تسلی دے
کر ان سے کہا گیا کہ آپ گھبرائیں نہیں کچھ
نہیں ہو گا۔ صرف آپ کے پیٹ میں پائیوں
اور پیسوں کا ایک درخت اُگ آئے گا۔ پھر
اس میں اسے آپ روز پائیاں اور پیسے توڑ
کر چیزیں لے کر کھایا کرنا" یہ سن کر آپ کا پھاڑ
سا منہ فوراً بند ہو گیا۔ اور چہرے پر خوشی
کھیلنے لگی۔

اور سنئے۔ گھر کی بڑھیا ماما جلیل کی

دادی کا قاعدہ تھا کہ وہ اظہر میاں کے اکثر کپڑے کسی برتن میں بھگو دیتی تھیں اور فرصت ملنے پر انھیں صابون سے دھو کر سکھا لیا کرتی تھیں۔ اظہر میاں کو یہ حال معلوم تھا۔ ایک روز اتفاق سے مکان میں سفیدی ہو رہی تھی اور قلعی بکری کی ناند میں لاکر بھگو دی گئی تھی۔ اظہر میاں کو کھیلتے کھیلتے کچھ خیال آیا۔ آپ چپکے سے اُٹھے اور اپنا کنٹوپ، کوٹ، گلو بند غرض گھر میں جو کپڑے آپ کی نظر پڑتے گئے آپ نے لالاکر اس قلعی کی ناند میں بھگونے شروع کر دیے۔ اتفاق سے مزدور کی نگاہ پڑ گئی۔ اس نے جلیل کی دادی کو بلا کر ناند کے پاس کھڑا کیا۔ ورنہ اس دن اظہر میاں نے گھر بھر کے سارے کپڑے قلعی کی نذر چڑھا دینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

گھر میں ایک دنبہ پلا ہوا تھا۔ اظہر میاں کو اس سے بہت الفت تھی۔ اکثر دن بھر اس کے پاس بیٹھے کھیلا کرتے تھے اور وہ بھی آپ کو کچھ نہ کہتا تھا۔ دین محمد نوکر کا قاعدہ تھا کہ وہ روزانہ شام کے وقت دنبے کو نہلانے لے جایا کرتا تھا۔ اظہر میاں کو یہ بات معلوم تھی ایک روز کہیں دین محمد کو کسی کام میں دیر ہو گئی تھوڑی دیر آپ نے انتظار کیا اس کے بعد چپکے سے دنبے کی رسی کھول گلی کا رستہ لیا۔ آگے آگے اظہر میاں اور پیچھے پیچھے ان کا دنبہ۔ دونوں خراماں خراماں چل دیے۔ چلا چل چلا چل۔ گلی کے سرے پر پہنچے۔ نل پر شام کے پانی بھرنے والوں کی بھیڑ تھی۔ آپ بھیڑ چھٹنے کے انتظار میں چپ چاپ ایک طرف کھڑے ہو گئے لوگ سمجھے کہ شاید ان کے پیچھے پیچھے دین محمد آتا ہوگا لیکن جب اُن کو کھڑے کھڑے دیر ہو گئی تو کسی نے پوچھا کہیے اظہر میاں کیسے آنا ہوا آج دین محمد کہاں ہے؟ آپ نے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں فرمایا کہ ہم اپنے دنبے کو نہلانے آئے ہیں اور دین محمد کا آج کہیں پتہ نہیں! بہرحال احمد بھشتی نے دنبے کو ایک مشک پانی

سے نہلا کر اپنا فرض انجام دیا۔ اور میاں اظہر کو بندر کی طرح اسی دُنبہ پر بٹھا مکان پر لاکر چھوڑ گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گھر کے چند لوگ نوچندی جمعرات کو حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ پر فاتحہ پڑھنے گئے اظہر میاں بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ تھوڑی دیر باؤلی کی سیڑھیوں پر کھڑے اوپر سے کودنے والے پیراکوں کا تماشہ دیکھتے رہے پھر جو یکایک جی میں آئی تو آپ بھی چھلانگ مار پانی میں ہاتھ پاؤں چلانے لگے۔ دو ڈبکیاں کھا کر کھڑا ہونا چاہا کہ سیڑھی پر کائی جمی ہونے کی وجہ سے پاؤں پھسل گیا۔ اوندھے منہ پھر پانی میں ایک غوطہ لگایا۔ دو ننھے ننھے پاؤں پانی کی سطح پر صاف دکھائی دے رہے تھے انھیں کھینچ کر الگ ایک خشک سیڑھی پر کھڑا کر دیا گیا۔ منہ اور کانوں میں پانی بھر جانے کی وجہ سے آپ یہی سمجھ رہے تھے کہ اب تک پانی میں ہوں اور تھوڑی دیر تک منہ سے غڑپ غڑپ کرتے رہے آپ کی ان حرکتوں کو دیکھ کر سب کو ہنسی آگئی۔ اوروں کو ہنستے دیکھ کر آپ خود بھی ہنسنے لگے۔

ایک دن اظہر میاں ٹرام پر سیر کرنے گئے۔ بہت خوش ہوئے۔ جامع مسجد پر ٹرام آکر رُکی۔ آپ کے والد اتر پڑے۔ اور اظہر میاں کو گود میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا معلوم ہوا کہ وہ دوسری طرف سے نیچے اُتر چکے تھے۔ ادھر پہنچ کر دیکھا کہ آپ دو ٹراموں کے بیچ میں نہایت بےخوفی سے کھڑے چوراہے کے پہرے والے سپاہی کو بغور تک رہے ہیں۔

غرض اظہر میاں کو دیکھ کر ہر شخص یہی کہتا ہے کہ خدا اس لڑکے کی عمر دراز کرے۔ بڑا ہو کر یہ لڑکا نہایت بہادر نڈر اور بڑا ہمت والا ہوگا۔

(از جناب پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے، استاد جامعہ)

ہمارے ملک کے آدمی بہت غریب ہیں۔ انھیں کھانے کو نہیں ملتا۔ دن میں ایک وقت روکھی سوکھی روٹی یا بھنے ہوئے چنے کھاتے ہیں جن سے اُن کا پیٹ نہیں بھرتا ان کے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے ہوتے ہیں۔ یہ اچھے مکانوں میں نہیں رہتے۔ پھوس کے چھپروں کے نیچے رہتے ہیں جو برسات میں ٹپکتے ہیں۔ اور جن میں گرمیوں میں آگ لگ جاتی ہے۔

دوسرے ملکوں کے آدمیوں کی حالت ایسی نہیں ہے وہاں پیٹ بھر کر خوب اچھا کھانا کھاتے ہیں اچھا کپڑا پہنتے ہیں۔ اچھے مکانوں میں رہتے ہیں اور خوب سیر و تفریح بھی کرتے ہیں بازار جاتے ہیں تو ہر طرح کی چیزیں خریدتے ہیں اور پڑھنا لکھنا بھی جانتے ہیں۔

یہ کیا بات ہے کہ ہمارے ملک کے آدمی غریب اور دوسرے ملکوں کے آدمی امیر ہیں؟

روپیہ کمانے کے کئی طریقے ہیں کوئی کھیتی باڑی کرکے روپیہ کماتا ہے۔ کوئی میز کرسی، پنسل قلم، چاقو چھری، کھیل کھلونے، اور دوسرے سامان بناکر۔ ہمارے ملک کے بہت زیادہ آدمی کھیتی باڑی کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور دوسرے ملکوں کے آدمی زیادہ تر چیزیں بنانے کا کام کرتے ہیں ہم اناج دالیں، ترکاری تو اپنے ملک میں پیدا کر لیتے ہیں لیکن بنی ہوئی چیزیں دوسرے ملکوں سے منگاتے ہیں۔

دوسرے ملکوں سے جو چیزیں ہمارے یہاں آتی ہیں اُن کے نام یہ ہیں ۔ کپڑے موزے ، بنیان ، صابن ، کھیل کھلونے ، ترکی ٹوپیاں ، پنسل قلم ، چاقو چھری ، گھڑی گھنٹے برتن ، لالٹین ، بجلی کا سامان ، سینے کی مشین سائکلیں ، موٹر ، ریلیں اور ایسی ہی بہت سی اور چیزیں ۔ شکر اور دیا سلائی بھی باہر سے آتی تھی لیکن اب یہ دونوں ہمارے ملک میں بننے لگی ہیں ۔

دوسرے ملک والے ہمیں یہ چیزیں مفت نہیں دیتے ۔ انھیں کھانے کے لئے اناج کی ضرورت رہتی ہے وہ ہم سے گیہوں چاول ، چنا لے لیتے ہیں اور ہمیں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں دے دیتے ہیں ۔ ہمارے پاس اگر اناج ہماری ضرورت سے زیادہ ہوتا تو اس میں کوئی ہرج نہیں تھا لیکن جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے ہمارے آدمی بھوکے رہتے ہیں اس لئے اپنے آدمیوں کا پیٹ کاٹ کر دوسرے ملکوں کو اناج بھیجنا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا ۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے آدمیوں کے پاس کرنے کے لئے کام نہیں ہے کھیتی باڑی کے کام کے لئے جتنے آدمیوں کی ضرورت ہے اس سے زیادہ آدمی اس کام کو کر رہے ہیں ۔ جو کام دوسرے ملکوں کا اکیلا کسان کر لیتا ہے یہاں اس کے لئے دس بارہ آدمی لگتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارا کسان کم زور ہوتا ہے بات یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے کسان اوزاروں اور مشینوں سے کام لیتے ہیں اور ہم مشین استعمال نہیں کرتے اگر ہمارا کسان مشینوں کا استعمال کرے تو وہ بھی دس آدمیوں کے برابر کام کرنے لگے اور جب دس آدمیوں کے برابر کام کرے گا تو اسے دس آدمیوں کی مزدوری بھی ملے گی اور مال دار ہو جائے گا ۔

لیکن جب دس آدمیوں کا کام خود کرنے لگے گا تو اس کے گھر کے لو آدمی جو اب اس کے ساتھ کام کرتے ہیں بے کار ہو جائیں گے

ان کے لئے اسے کوئی اور کام ڈھونڈھنا ہوگا۔ یہ کام کیا ہوسکتا ہے؟

تمھیں معلوم ہے کسان صرف کھانے کی چیزیں پیدا کرسکتا ہے۔ لیکن لوگوں کو کھانے کے علاوہ اور چیزوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں کپڑے کی ضرورت ہوتی ہے برتنوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اوزاروں اور مشینوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گاڑیوں اور ریلوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بازار میں جب تم جاتے ہو تو دوکانوں پر ہزاروں چیزیں بکتی ہوئی دیکھتے ہو ان میں سے بہت سی چیزیں تم خریدنا چاہتے ہو۔ ان سب چیزوں کو کوئی نہ کوئی بناتا ہے۔ اور اسے ان کے بنانے کا معاوضہ ملتا ہے۔ اگر یہ سب چیزیں کسان کے بھائی بند بنانے لگیں تو کسان پھر ان ہی کو ان کے بدلے میں اناج اور ترکاری دیا کرے۔ اب یہ اناج ترکاری دوسرے ملکوں کو چلی جاتی ہے۔ پھر اپنے ملک میں ہی رہے گی۔ اور گھر کا کوئی آدمی بے کار نہ رہے گا۔

اس سے یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ ہمیں دوسرے ملکوں سے بنا ہوا مال نہ منگانا چاہئے۔ بلکہ خود اپنے ملک میں پیدا کرنا چاہئے۔ لیکن یہ کام کس طرح کیا جاسکتا ہے؟

اس کام میں ملک کے بچے بہت مدد دے سکتے ہیں۔ جب بچپنے میں انھیں کسی بات کا شوق ہوجاتا ہے تو وہ بڑے ہوکر بھی اس کام کو جاری رکھتے ہیں۔ اگر بچے اپنے ہاتھ سے اپنے کھلونے بنائیں گے تو انھیں دوسرے ملکوں سے کھلونے منگانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مٹی، لکڑی، کاغذ اور کپڑے کے بہت خوب صورت کھلونے بنائے جاسکتے ہیں۔ اگر مٹی کو شکل دینا، لکڑی کو کاٹنا اور برابر کرنا، اور کاغذ یا کپڑے کے پھول اور بیل بوٹے بنانا بچوں کو آجائے اور اُن کو طرح طرح سے رنگنا بھی وہ سیکھ جائیں تو اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کھلونوں کے مقابلے

ہیں وہ کوئی دوسرا کھلونا کبھی پسند نہ کریں روس، جرمنی اور انگلستان میں بچوں کو کھیلنے کے لئے چھوٹے چھوٹے انجن، ریلیں موٹریں، پانی اور ہوائی جہاز دئے جاتے ہیں اور ان کی آسان مشینری انھیں سمجھائی جاتی ہے۔ اس کے نمونے پھر وہ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں اور نئی نئی ایجادیں کرتے ہیں۔ میز، کرسی، باجے سائکلیں، گھڑیاں، بندوقیں، توپیں، مکان مشینیں بھی بچے نمونے سامنے رکھ کر بناتے رہتے ہیں۔ یہ جتنے بڑے ہوتے جاتے ہیں اتنی ہی بڑی چیزیں بناتے ہیں۔ انھیں بچپن سے چیزیں بنانے کا جو شوق پیدا ہو جاتا ہے وہ عمر بھر جاری رہتا ہے اور بڑے ہو کر ملک کے تمام کارخانوں میں یہی بچے کام کرتے ہیں

ہندوستان کے نونہالو! تمھیں بھی دوسرے ملک کے بچوں سے سبق سیکھنا چاہیے اور اپنے کھیلنے کی سب چیزیں خود ہی بنانا چاہئیں۔ جو چیز بھی جہاں کہیں بنی ہوئی دیکھو اس کا نمونہ اپنے ہاتھ سے بنانے کی کوشش کرو۔ کاغذ، مٹی، لکڑی اور لوہے کی پتیوں سے سب چیزوں کے نمونے تیار کئے جا سکتے ہیں۔ تمھیں انھیں ضرور بنانا چاہیے جب ہی تمھارا ملک مالدار ہوگا تمھارے غریبوں کو چیزیں بنانے کا شوق پیدا ہوگا اور وہ اس طرح روپیہ کمائیں گے۔ ان کو پیٹ بھر کر کھانا پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان مل سکے گا اور وہ بازار سے بہت اچھی چیزیں خرید سکیں گے۔

غریب کسان

(از جناب مولانا سید ابو محمد صاحب ثاقب' کانپوری)

اے قدرت کے راج دُلارے ؛ اے فطرت کی آنکھ کے تارے
محنت کا پھل پانے والے ؛ کاندھے پہ ہل لیجانے والے
صدیاں پلٹیں، دُنیا بدلے ؛ یا ملکوں کا نقشا بدلے
کچھ سے کچھ ہوں رنگ فضا کے ؛ چرخ سے برسیں آگ کے شعلے
دھیمی ہو یا تُند ہوا ہو ؛ عالم ہر وادی کا نیا ہو
چرخ ہزاروں پلٹے کھائے ؛ کیا ممکن جو تجھکو ستائے
سارے جہاں میں جنگ چھڑی ہو ؛ دُنیا بھر میں آگ لگی ہو
کیوں ہو شورش تیری صدائیں ؛ امن ہو جب کھیتوں کی فضائیں
گیت ہے تیرا نغمۂ شادی ؛ تجھ پر صدقے ہر آزادی
سب پر حاوی ہمت تیری ؛ سچی ہے یہ شوکت تیری
وقت کو تو غفلت میں نہ کھوئے ؛ کھیت میں تو کانٹوں کو نہ بوئے
گھاس ہے تیرا بسترِ مخمل ؛ اوڑھنے کو بوسیدہ کمّل
جنگل جھاڑی بستی تیری ؛ شاہ سے بہتر ہستی تیری

تو ہے اور زمانہ تیرا
ہم ہیں اور فسانہ تیرا

بادبانی کشتی

(از جناب برکت علی صاحب فراق)

اس تصویر میں دو کشتیاں بنی ہوئی ہیں۔ بتا سکتے ہو کاہے کی ہیں معلوم تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی دریا ہے اسی میں یہ تیر رہی ہیں۔ مگر ایسا ہے نہیں ذرا غور سے دیکھو یہ چھوٹے چھوٹے کھلونے ہیں تمھاری دلچسپی کے لئے بنائے گئے ہیں تم بھی ایسی ننھی منھی خوب صورت کشتیاں بنا سکتے ہو
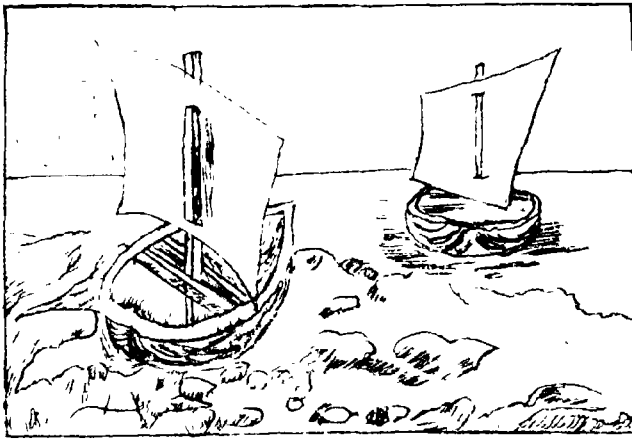
ایک اخروٹ لے لو اور احتیاط کے ساتھ بیچوں بیچ سے اس کے دو ٹکڑے کر لو اس کی گری نکال کر کھا جاؤ اور خول کے آدھے حصے کو ریگ مال سے خوب صاف کر دو اب چھلکے کے عرض یا چوڑائی میں دو دیا سلائیاں سریش سے چپکا دو۔ ان دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ رکھو اور یہاں ایک اور دیا سلائی کھڑی کر دو اب گویا کشتی میں بیٹھنے کی جگہ بھی ہوگئی اور ستون بھی کھڑا ہو گیا۔ بس ایک چیز باقی رہ گئی۔ پال یا بادبان اس کے لئے کاغذ یا ریشم کا ٹکڑا لے کر تصویر کے مطابق کاٹ کر کھڑی دیا سلائی میں لگا دو اور اگر کاغذ کو ہرے، لال، پیلے رنگوں سے رنگ دو گے تو کشتی اور خوبصورت معلوم ہوگی اب کشتی کو پانی بھرے لگن میں ڈال دو بالکل اصلی کشتی کی طرح تیرے گی اور تمھیں خوب لطف آئے گا۔
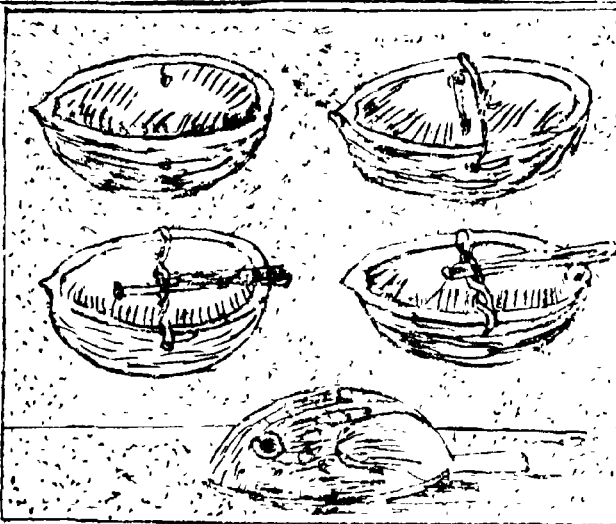
اُچھلنے والا جیک :۔ اخروٹ کے خول سے اور بھی چیزیں بن سکتی ہیں۔ ہم تمھیں ایک بہت ہی دلچسپ چیز بنانے کی ترکیب بتائیں۔ اسی قسم کا آدھا خول لے لو ذرا بڑا ہونا چاہیے پھر اُسے صاف کرو اور خول کی لمبان کے وسط میں کناروں سے ذرا نیچے آمنے سامنے دو سوراخ کرو۔ ان سوراخوں سے ایک پتلا سا دھاگہ گذارو اور بیچ میں لاکر اس کے دونوں سرے باندھ دو اب ایک دیا سلائی کا اتنا بڑا تنکا لو۔ جو چھلکے کی لمبائی سے کم ہو اُسے دھاگے کے حلقے میں ڈال کر دو تین مرتبہ گھماؤ تاکہ دیا سلائی اُس میں مضبوطی سے جکڑ جائے۔ اب ذرا سا موم لو اور اُسے پگھلا کر اُس سرے پر لگا دو جو باریک سرے کے مقابل ہو۔ موم ٹھنڈا ہو جائے تو اس جکڑی ہوئی دیا سلائی کے ایک سرے کو اُس موم پر آہستہ سے لگا دو اب یہ موم ذرا سی آنچ یا سنھی کی بھاپ سے پگھل جائے گا۔ پھر دیکھنا کیا تماشہ ہوتا ہے دیا سلائی موم سے چھوٹ کر جھٹ سے نیچے آجائے گی اور خول زمین پر آتے ہی اُچھل کر دور جا گرے گا۔

ننھی چڑیاں دیکھو درخت کی شاخ پر بیٹھی ہوئی یہ ننھی ننھی چڑیاں کیسی بھلی معلوم ہو رہی ہیں تم انھیں سچ مچ کی چڑیاں نہ سمجھنا یہ تو تمھارے ہی جیسے بچوں نے بنائی ہیں۔

(۱) پہلی چڑیا کا بدن چیڑ کے درخت کی شاخ سے بنایا گیا ہے سر لٹی یا چکنی مٹی سے بنا ہے۔ چھوٹے چھوٹے باز و باجرے کی بالوں کے ایک چوتھائی حصے سے بنائے ہیں دُم پروں کی ہے۔

(۲) اس چڑیا کا بدن سرو کی شاخ کو باندھ کر بنایا ہے۔ انجیر تراش کر اس کا سر بنایا گیا ہے۔ اسی کے نوکیلے حصے سے اس کی چونچ بن جاتی ہے اور ایک پر سے دُم تیار ہو جاتی ہے۔

ٹکٹ جمع کرنے والوں کے لئے چند خاص چیزیں

(از محمد محمود جامعی سین منزل مسلم یونیورسٹی علی گڈھ)

البم :۔ ٹکٹ جمع کرنے کے سلسلہ میں یہ سب سے اہم چیز البم ہے۔ اگر تھوڑے سے ٹکٹ ہوں تو معمولی البم کافی ہوگا۔ عام طور سے معمولی البم کے ہر صفحہ پر ملک کا نام مع اس کی تاریخی و جغرافی حالت کے ہوتا ہے اور اسی صفحہ پر اس ملک کے ایک دو ٹکٹوں کی تصویریں بھی ہوتی ہیں ان ہی کے نیچے ٹکٹ چسپاں کرنے کے لئے خانے بنے ہوتے ہیں تاکہ ٹکٹ ایک ہی

قطار میں ہوں اور بھلے معلوم ہوں۔ عام طور سے ان میں کسی ٹکٹ کے لئے کوئی خاص جگہ مقرر نہیں ہوتی بلکہ جہاں جو ٹکٹ چاہیں لگا سکتے ہیں جب ٹکٹوں کی تعداد ۵۰۰ یا ۶۰۰ سے تجاوز کر جائے تو اس کو کسی بڑے البم میں تبدیل کر دینا مناسب ہوگا۔ جس میں ہر ٹکٹ کے لئے ایک مخصوص جگہ ہوتی ہے یا خود اس ٹکٹ کی تصویر بنی ہوتی

ہے ایسے البم ہرگز استعمال نہ کرنے چاہئیں جن میں ہر صفحہ کے دونوں طرف ٹکٹ لگائے جاتے ہیں تاکہ ٹکٹوں کے آپس میں چپکنے کا اندیشہ نہ رہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ لوز لیف سادی البم ( ) خریدی جائے۔ جس پر وہ اپنی حسب منشا ٹکٹ لگا سکتے ہیں اور جب وہ اس ترتیب کو بدلنا چاہیں تو وقتاً فوقتاً اپنی خواہش کے مطابق بدل سکیں۔

اسٹامپ ہنجز:- ٹکٹوں کو کبھی کاغذ پر چپاں نہ کرنا چاہیئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ البم کی خوب صورتی جاتی رہتی ہے بلکہ اکثر ٹکٹ نکالتے وقت ضائع ہو جاتے ہیں۔ ٹکٹ جمع کرنے والوں کو چاہیئے کہ اسٹامپ ہنجز استعمال کریں جن پر گوند لگا ہوتا ہے۔ یہ چند پیسوں میں ہزاروں کی تعداد میں مل جاتے ہیں اس لئے خود بنا کر استعمال نہ کئے جائیں۔
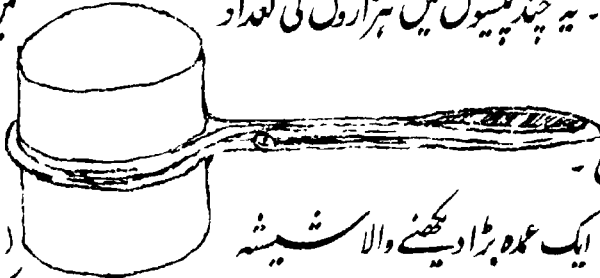
دوسری چیزیں ایک عمدہ بڑا دیکھنے والا شیشہ (Magnifying glass) ٹکٹ کی تفصیل کے لئے زیادہ مناسب ہوگا۔ اور ایک ایسی چمٹی جس پر نمی کی وجہ سے زنگ نہ لگ سکے اور اس کے کنارے ذرا چپٹے ہوں تاکہ ٹکٹ آسانی سے گرفت میں آسکے، اور ایک ٹکٹوں کا سوراخ ناپنے کا پیمانہ Perforation Gauge) جس سے ٹکٹ کے سوراخ ناپے جاتے ہیں۔ اور ایک (Watermark Detector) جس سے ٹکٹ کی اندرونی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ اور ایک ماؤنٹ ڈمپر (Mount Damper) جس سے ٹکٹ کے ہنجز کو بھگویا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے لب لگانے کی ضرورت نہیں۔ اور ٹریسنگ پیپر والے لفافہ (Transparent Envelopes) جن میں عام (Common) ٹکٹ رکھ سکتے ہیں۔ کارڈ اور لفافوں کے لئے گوند لگے ہوئے کنارے (Corners) جن کو البم میں لگا کر ان میں کارڈ اور لفافہ رکھ سکتے ہیں۔ جو ہر دکاندار کے ہاں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک چینی مندر

مکرمی جناب ایڈیٹر صاحب۔ تسلیم

آپ کا خط مجھے ملا۔ شکریہ۔ میں آج کل چین میں ہوں اور خوب سیر کر رہا ہوں۔ واقعی عجیب و غریب ملک ہے۔ یہاں کا کھانا۔ پینا۔ وضع قطع۔ بول چال۔ رہنے سہنے کا طریقہ غرض ہر چیز عجیب ہے۔ اور چینیوں کے مندر یا عبادت گاہیں ان سب سے عجیب ہیں۔ میں نے ہندوستان میں بھی ان کی بہت شہرت سُنی تھی چنانچہ میں وہاں کے ایک مشہور مندر کو دیکھنے گیا۔ مگر اس میں جانے کے لئے وہاں کے لوگوں نے کچھ ایسی بھول بھلیاں بنائی تھی کہ میں گھنٹوں ٹکریں مارتا رہا اور مندر تک نہ پہنچ سکا۔ ہار تھک مار کر ان بھول بھلیوں سے واپس آگیا

اور کر بھی کیا سکتا تھا اس مندر میں جانے کا شوق اب بھی باقی ہے میں وہاں سے مندر اور بھول بھلیوں کا ایک نقشہ بھی لیتا آیا ہوں۔ میری تو خاک سمجھ میں نہ آیا آپ کے پاس بھیجتا ہوں اگر کوئی پیامی بھائی مندر میں جانے کا صحیح راستہ بتا دیں تو میں ان کا بہت بہت شکریہ ادا کروں گا۔ فقط

آپ کا نامہ نگار

اشس

اکسیر پھول کی تلاش

ایک دفعہ ایک بادشاہ سخت بیمار ہوا۔ ڈاکٹر اور حکیم علاج سے عاجز آگئے۔ بادشاہ ناامید ہوگیا اور موت کی راہ دیکھنے لگا۔ آخر ایک دن کوئی بزرگ اس کے پاس آئے۔ اور کہا "بادشاہ سلامت آپ کے ملک سے بہت دور ایک اور ملک ہے۔ اس ملک میں ایک پہاڑ ہے پہاڑ کے بیچوں بیچ ایک میدان ہے۔ جہاں صرف ایک ہی درخت ہے اس میں ایک پھول لگتا ہے جسے اکسیر پھول کہتے ہیں۔ اس پھول کو کوئی سونگھ لے تو وہ کیسا ہی بیمار ہو تندرست ہو جاتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے اس کے پاس کوئی بیماری نہیں پھٹکتی۔ مگر اس پھول تک پہنچنا بڑی ہمت کا کام ہے"

یہ سن کر بادشاہ کا اکلوتا بیٹا اپنی جگہ سے اٹھا اور پھول کی تلاش کے لئے اجازت چاہی بہت دیر تک تکرار رہی۔ آخر بادشاہ کو اسے بھیجنا ہی پڑا۔ چنانچہ شہزادہ بہت سی فوج اپنے ہمراہ لے کر اس جگہ پہنچ گیا۔
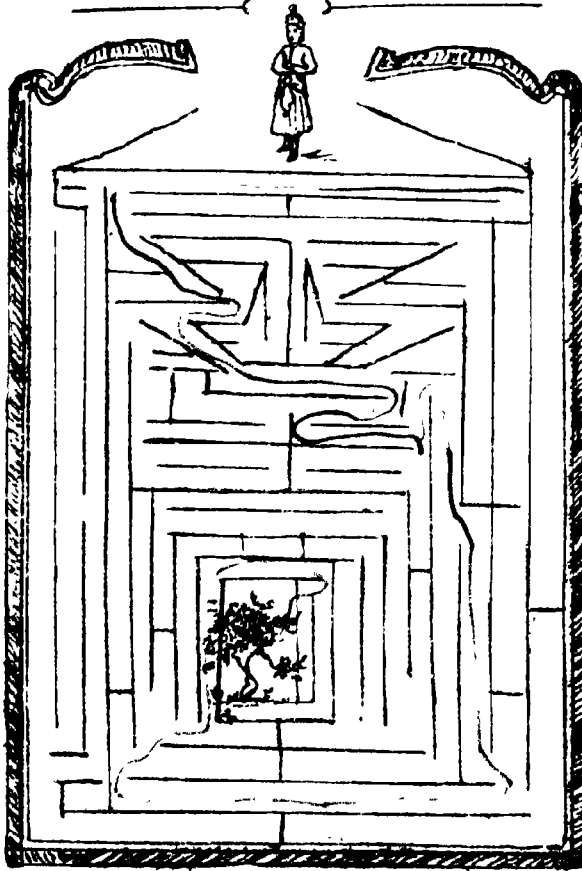
اب وہ اس درخت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اسے ابھی تک کوئی آسان اور صاف راستہ نہیں ملا ہے۔ بے چارا بہت بے چین ہے۔ پیام بھائیوں کو چاہیئے کہ اس دلیر شہزادے کی مدد کریں اور اسے کوئی صاف اور چھوٹا راستہ بتادیں۔ تاکہ وہ اپنا کام جلدی کر سکے۔

از محمد رشید الدین صاحب ۔ صدر منزل ۔ لاہور

تصویروں کی نمائش

جناب ایڈیٹر صاحب ۔ تسلیم ۲ مارچ ۱۹۵۵ء

پرسوں ۳ مارچ کو جامعہ کی چھتیسویں سالگرہ کا بہت شاندار جلسہ اجمل نگر اوکھلا میں ہوا تھا اسی زمانے میں جامعہ کے بچوں نے تعلیمی نمائش بھی کی تھی۔ نمائش گاہ کو انھوں نے بہت ترتیب اور سلیقے سے سجایا تھا۔ بچے تو تھے ہی انھوں نے شرارت سمجھئے یا محض دلچسپی کے لئے داخلہ کی شرط یہ رکھی تھی کہ پوری نمائش کا چکر لگاتے
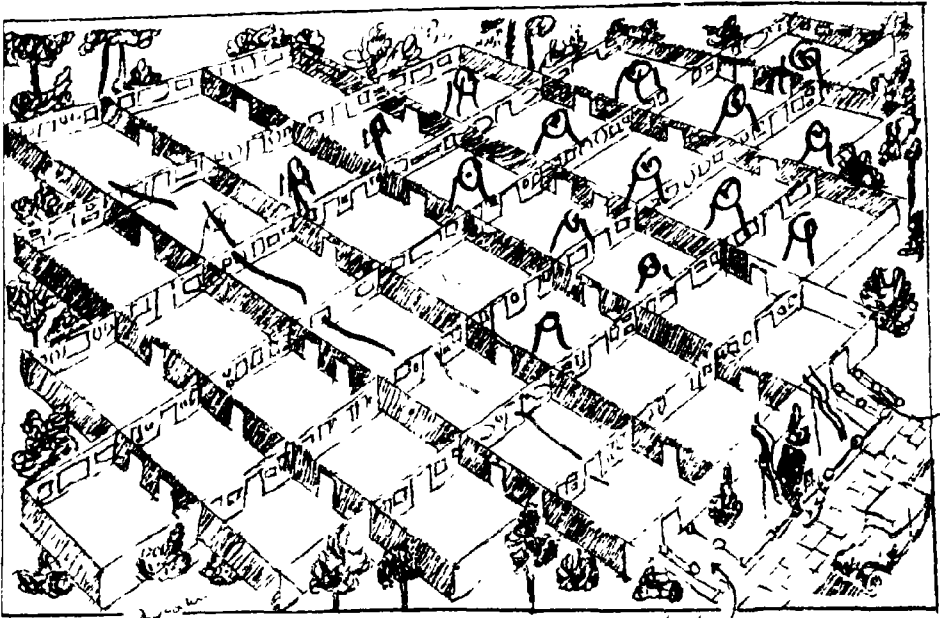
وقت ایک ہی کمرے سے گذرنا پڑے۔ ہم نے جو یہ بات سُنی تو ہم بھی وہاں گئے اور بہت کوشش کی، بہت سر مارا کہ ہر کمرے سے ایک ہی بار گزریں مگر جناب ہماری تو ایک بھی نہ چلی۔ اب ہم اس نمائش گاہ کی تصویر آپ کے پاس بھیجتے ہیں کیا اچھا ہو کہ کوئی بہن یا بھائی اس معاملے میں ہماری مدد کریں۔ فقط (آپکا نامہ نگار، ج۔م)

رنگ بھرو (کوپن پشت پر)

اسلامی تاریخ کی سچّی کہانیاں

مصنفہٗ

مولوی محمد حسین صاحب محوی لکھنوی

حصہ اول میں اسلامی تاریخ کی بہت ہی مختصر کہانیاں چھوٹے بچوں کے لئے جمع کر دی گئی ہیں اور حصہ دوم میں کسی قدر بڑی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں سچے اسلام کے سچے لوگوں کے واقعات ہیں جنھیں پڑھ کر بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے قومی اخلاق کی بنیاد ان ہی جذبات پر رکھی جائے جن کو ان دو چھوٹی سی کتابوں میں تحریر کیا گیا ہے تو آج بھی ہماری آیندہ نسلیں اس قابل ہو سکتی ہیں کہ دنیا کی رہنمائی کا بار اٹھا سکیں۔

یہ دونوں کتابیں اب دوسری بار شائع ہوئی ہیں۔ پہلے حصہ کی ضخامت کچھ بڑھا دی گئی ہے۔ اور اب دونوں کی قیمت چھ۔ چھ آنے فی حصہ ہے۔ فوراً طلب کیجیے ہو

بچوں کی دوسری کتابیں

مسدس حالی ۸ر	زرداد ۵ر	دیانت (ڈراما) ۲ر
خادمات خلق ۱۰ر	شہر شہری شہریت ۵ر	شریر لڑکا " ۴ر
مسلمان بیبیاں ۶ر	سمندر کا عجائب خانہ ۱۲ر	بچوں کا انصاف ۴ر
ترکوں کی کہانیاں ۴ر	تعلیمی کھیل ۴ر	اسکول کی زندگی " ۴ر
تاریخ ہند کی کہانیاں ... ۲ر	نبیوں کے قصے ۵ر	قوم پرست طالبعلم " ۴ر
دنیا کے بسنے والے ۶ر	چالیس حدیثیں ۲ر	محنت " ۴ر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

پیامِ تعلیم

بچوں کی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
بچوں کا قاعدہ	۴ر	چھوٹا انجن	۱ر	خلافت راشدہ	عہ	منتخب الحکایات	۸ر
رہنمائے قاعدہ	۲ر	بے وقوف بھالو	۱ر	دس جنتی	۵ر	چند پند	۸ر
بچوں کی کتاب	۴ر	تین بھالو	۱۰ر	نبیوں کے قصے	۵ر	موتیوں کی مالا	۳ر
آسان خوش خطی (مکمل)	۵ر	سب سے خوبصورت بکری	۳ر	الہامی افسانے (دو حصے)	۱۲ر	نعیم پچیسی	۳ر
ہمارے نبیؐ	۲ر	چھوٹا موہن	۲ر	الاسلام	۱۰ر	لنگڑا ماموں	
آخری نبیؐ	۲ر	جانوروں کی کہانیاں	۱ر	ہمارا دین	۲ر	قیدی شیر	۴ر
مرغی امیر علی	۲ر	ریاض پھول	۳ر	الورد والریحان	۳ر	ملا دو پیازہ	۴ر
خزانہ	۲ر	تاج پھول	۲ر	چالیس حدیثیں	۲ر	مسلمان بچوں کے سبق	۲ر
موتی دلیس	۲ر	دلچسپ کہانیاں	۵ر	اچھی باتیں	۴ر	اردو سبق	۸ر
مکی چوہا	۲ر	پٹو نوجوان کا قصہ	۲ر	تاریخ ہند کی کہانیاں	۳ر	بادشاہوں کی کہانیاں	۸ر
لومڑی اور مینا	۲ر	امتیاز پچیسی	۲ر	اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں		مزے دار کہانیاں	۵ر
ننھی کتاب	۲ر	تانبیل خاں	۲ر	حصہ اول	۶ر	بچوں کی دنیا	۷ر
منی کتاب	۲ر	عقائد اسلام	۱ر	حصہ دوم	۶ر	محمدی لوا	۴ر
پیاری کتاب	۲ر	ارکان اسلام	۲ر	ترکوں کی کہانیاں	۴ر	چھیتا بھائی	۸ر
دلاری کتاب	۲ر	ہمارے رسولؐ	۵ر	مسلمان بیبیاں	۶ر	ولیم ٹیل	۸ر
ہماری کتاب	۲ر	آں حضرتؐ	۴ر	عادات خلق	۱ر	ضروری کہانیاں	۲ر
اردو کا قاعدہ	۱ر	سرکار کا دربار	۸ر	غنچۂ حکمت	۴ر	شہر، شہری، شہریت	۵ر
سائلنٹ ریڈر	۳ر	سرکار دو عالم	۸ر	بازیچہ	۴ر	نصیحت کا کرن پھول	۱۲ر
سونو کا باغ	۲ر	چار یار	۶ر	گدھے کی سرگذشت	۶ر	شہزادہ خداداد	۶ر
چھوٹا موٹا سمبو	۲ر	خلفاء اربعہ	۲ر	آویزۂ گوش	۸ر	نور الدین	۸ر
میری کہانیوں کی پہلی کتاب	۱ر	سیرۃ الرسول	عہ	کیوں اور کس طرح	۵ر	دل پسند کہانیاں	۵ر

سال گرہ نمبر
از عظمت بخش عظمت متعلم درجہ دہم
جھومتے جھامتے کودتے پھاندتے
ننھے بچے آتے ہیں اور خوشی سے گاتے ہیں
سال گرہ کا دن ہے آج
سال گرہ کا دن ہے آج
شور مچاتے گرد اڑاتے
ناچتے ناچتے آتے ہیں اور خوشی سے گاتے ہیں
سال گرہ کا دن ہے آج
سال گرہ کا دن ہے آج

ایڈیٹر محمد حسین حسان ندوی جامعی

قیمت سالانہ عہ/ ، فی پرچہ ۳ر ، سالگرہ نمبر ۱۲ر

جلد ۱۹	نومبر-دسمبر سنہ ۱۹۳۶ء	نمبر ۱۱، ۱۲

فہرست مضامین سالگرہ نمبر

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی - جامعہ پریس

بچوں سے باتیں

(ایڈیٹر)

لو بھئی خدا خدا کرکے تمہارا پرچہ تیار ہو گیا۔ اب کے ہم نے اس کی تیاری میں پچھلے سال سے بھی زیادہ محنت کی ہے۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ بعض باتوں میں یہ پچھلے سالگرہ نمبر سے بڑھ گیا ہے۔ تم اس کا بہت بے چینی سے انتظار کر رہے تھے اور مارے خطوں کے تم نے ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ اب اسے شوق سے پڑھو۔ اور اپنے دوستوں، ہمجولیوں اور اپنی سہیلیوں کو بھی دکھاؤ۔ اگر پڑھنے کے بعد کچھ فرصت ملے تو ہمیں بھی اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کی خبر کرو۔ یہ ضرور بتانا کہ اس مرتبہ اپنے پرچے میں تم کیا کمی محسوس کرتے ہو یہ بھی کہ کون سا مضمون تمہیں زیادہ پسند آیا۔

اس مرتبہ ہم نے کاپیاں اور پروف پڑھنے میں بہت احتیاط سے کام لیا ہے۔ پھر بھی کیا عجب جو غلطیاں رہ گئی ہوں۔ تم پرچے کو اس نظر سے بھی دیکھنا۔ جو بچہ سب سے زیادہ غلطیاں نکالے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

اس مرتبہ مضمون ہمارے پاس بہت کافی اور اچھے اچھے آئے اُن کے چننے میں ہمیں بہت دشواری پیش آئی۔ حالانکہ اس مرتبہ ضخامت بھی بڑھا دی گئی یعنی ۱۴۴ صفحے کر دی گئی۔ پھر بھی کئی اچھے اور دلچسپ مضمون شامل ہونے سے رہ گئے۔ ہمارے محترم دوست شاہ معین الدین احمد صاحب نے کئی سال کے تقاضوں کے بعد مضمون لکھ کر بھیجا تھا، سید محمد ادیا صاحب نے بہت دلچسپ انداز میں ہوائی جہاز کی تاریخ لکھی تھی اور تصویریں بھی بنائی تھیں مرزا سیفی دہلوی نے خاص دلی کی روزمرہ میں بہادر شاہ کے لڑکے شاہزادہ جواں بخت کی شادی کا حال لکھا تھا۔ سید محمد سبزواری صاحب کا پہلا مضمون پیامِ تعلیم کے معیار سے کچھ بلند تھا تو ہم نے اُن سے دوسرا مضمون ہندوستان کے درختوں پر لکھوایا۔ محترمہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے دو تین اچھے اچھے مضمون خود لکھ کر بھیجے اور اپنی دوسری بہنوں اور سہیلیوں سے لکھوائے۔ بشیر صاحب فیروزپوری نے کئی اچھی اچھی کہانیاں اور معلومات لکھ کر بھیجیں۔ ہمارے خاص کرم فرما پروفیسر اظہر فاروقی نے ایک ننھی کہانی، اور دو ڈرامے عابد حسین مرحوم کے بھیجے بعد میں ایک مضمون شمس پر بھیجا۔ مولانا الیاس احمد مجیبی صاحب نے اچھی کہانی کے عنوان سے قرآن پاک کا ایک قصہ اپنے انوکھے انداز میں لکھا تھا محترمہ بیگم عبد الغنی صاحبہ نے ہماری درخواست پر بچوں کے لئے ایک اچھا سا مضمون لکھا تھا۔ رشید الدین صاحب لاہور نے ٹیگور کی ایک کہانی کا ترجمہ کیا تھا۔ ہمیں ان سب بزرگوں بہنوں اور بھائیوں سے بڑی شرمندگی ہے۔ امید ہے کہ ہماری مجبوریوں کو سامنے رکھ کر ہماری معذرت قبول فرمائیں گے[1]

اگر تم پسند کرو تو ہم جنوری میں سالگرہ نمبر کا ضمیمہ نکال دیں اور یہ سب یا ان میں سے اکثر مضمون اس میں شائع کریں۔

اب کی سالگرہ نمبر کے مضمونوں کے انعامی مقابلوں میں کوئی (۵۵) مضمون آئے مضمون لکھنے والے بچوں کے نام یہ ہیں۔

شوکت بخش صاحب جماعت ہشتم خانیوال۔ مریم خاتون علی گڑھ، بشیر احمد صاحب سلطان بازار حیدرآباد۔ میر حسن، فرزند ذاکر حسن۔ حیدرآباد۔ سید عابد حسن عابدی، کانپور۔ مظہر حسین صدیقی آگرہ۔ بشیر احمد فیروزپور شہر۔ حافظ خلیل الرحمٰن بدر، بھوپال۔ تصدق مصطفےٰ شیروانی۔ مرزا محسن علی، المورہ حسنہ بیگم میرٹھ شہر۔ امان اللہ خاں بھوپال۔ محمد معین الدین خاں رانچی۔ اصغر حسین، ہزارہ باغ لکھنؤ۔ ایم یوسف نسیم نوشہری، بہاولپور، محمد عمران۔ فتح گڈھ۔ محمد عثمان الرحمٰن صدیقی فیض عام ہائی اسکول۔ میرٹھ۔ موسیٰ قادری۔ حیدرآباد۔ شیخ سرشار علی، علی گڑھ۔ اقبال احمد اقبال۔ امرد عقلمند بخش، خانیوال۔ ابو الکلام، ادے پور میواڑ۔ محمد یحییٰ انصاری بھوپال بشیر احمد، فیروزپور شہر۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی ندوہ لکھنؤ۔ سید یاد علی فرخ آباد۔ اسد، یہ بھی حیدرآباد۔ زہرا خاتون دہلی۔ میاں خورشید الدین کاکاخیل۔ عبد الوارث درجہ ہفتم الٰہ آباد۔ فرحت علی عرف حسنات طالب علم آنولہ ضلع بریلی۔ ثریا بنت زاہد حسین گلمرگ کشمیر۔ عمر کامل صاحب دہلی۔ سید ولی پیران جیلدرگ میسور۔ سید نقی اشرف۔ اعظم گڈھ۔ صالحہ خاتون۔ صلاح الدین خاں۔ لدھیانہ، پنجاب۔ سید صاحب پیران جیلدرگ۔ نور الدین محمد آباد۔ گوہنہ اعظم گڈھ۔ محمد فخر الدین احمد بیڑ حیدرآباد دکن۔ کافی جیراجپوری ندوہ لکھنؤ۔ اسرار راجہ پوری شبلی ہوسٹل۔ لکھنؤ۔ سعیدہ خانم بنت محمد سلیمان آدمی وکیل بانسی، محمود علی خیریت آباد۔ سید ناصر الدین حیدرآباد دکن۔

---

[1] جناب آل احمد صاحب سرور نے ہماری درخواست پر الورسٹ پر بہترین مضمون لکھا تھا افسوس ہے کہ اس کی تصویریں وقت پر نہ بن سکیں اور یہ چھپنے سے رہ گیا

سید عبدالعلی دسنوی لکھنؤ۔ عبدالرشید خاں رشدی بھوپال۔ سید شاہ بلیغ الدین حسین ورنگل کالج حیدرآباد۔ اعظمی۔ پورہ ہیران سیالکوٹ شہر سید ذکی احمد ہاشمی سندیلہ، ہردوئی۔ محمد اسحاق احقر جالنہ حیدرآباد محمد اشفاق صدیقی مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ جالنہ (دکن)، رام گوپال جیسوال مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ جالنہ (دکن) ملک فضل امام مظفری فطرت عظیم آباد سید حسن محمود خلف سید فاروق اعظم. گوپال گنج سارن۔ زہرا خاتون بنت خواجہ غلام السبطین صاحب پانی پت۔ سید کلیم حامد رضوی۔ محمد اسحاق پشاوری۔ محمد اسلم صدیقی فتح گڈھ یوپی قدیر احمد خاں تبکش فرخ آباد۔ اقبال الدین صدیقی۔ سید آفتاب عالم عاصی بن تبکش دہلی ہمشیرہ سید حامد علی۔ سید ظہیر الدین۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن قمر الحسن عرف فرخ میاں۔ قائم گنج۔ سید ابوالحسن حیدرآباد دکن۔

ان میں محمد عمران فتح گڈھ اول۔ عبدالوارث مجیدیہ اسلامیہ ہائی اسکول الہ آباد۔ دوم اور محمد کامل دہلی سوم آئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان میں سے چند مضمون اس پرچے میں شائع کریں گے مگر گنجائش کی کمی کے سبب اس کی نوبت نہ آئی۔ انشاء اللہ اگلے پرچوں میں شائع کردئے جائیں گے۔

اس سال ہم نے بچیوں کے لئے الگ انعام رکھا تھا۔ بچیوں کے کل ۱۰ مضامین آئے مضمون لکھنے والی بچیوں کے نام یہ ہیں :-
مریم خاتون، علی گڑھ حسنہ بیگم میرٹھ۔ ثریا بنت زاہد حسین گلمرگ امتہ الزہرا بیگم۔ پانی پت۔ درۃ البیضا بیگم۔ پانی پت۔ صالحہ خاتون۔ سعیدہ خانم۔ زہرا خاتون پانی پت۔ ہمشیرہ سید ساجد علی صاحب

ان میں ہمشیرہ سید ساجد علی صاحب کو پہلا انعام اور صالحہ خاتون کو دوسرا انعام دیا جائے گا۔

سال گرہ نمبر کے لطیفوں کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے لطیفے بھیجے :-
سید نقی اشرف دسنوی اعظم گڈھ۔ زہرا خاتون۔ شوکت بخش خانیوال۔ محمود علی حیدرآباد۔ عبدالمالک کلکتہ۔ ط۔ ب، بنت سید یاد علی چھپرا متو۔ قدیر احمد خاں صاحب فرخ آباد۔ محمد افضل بھاولپور ملک لی امام مظفری عظیم آبادی۔ زہرا خاتون۔ پانی پت۔ محمد عمران فتح گڈھ سری نواس آچاری گلبرگہ شریف۔ ہاجرہ خاتون لشکر گوالیار۔ اعزاز حسین بریلی۔ میرزا ذاکر حسن حیدرآباد۔ مجیب الرحمٰن کھگڑیہ۔ سید احمد علی پٹنہ محمد نجیب اشرف تبکش پھلواری۔ رفیق احمد مڈل اسکول، فتح پور بارہ بنکی۔ رادھے شیام نگم پرائمری اسکول فتح پور، بارہ بنکی۔ محمد حسین مدرسہ فتح پور۔ بارہ بنکی۔ شیو برن لال مدرسہ فتح پور۔ بارہ بنکی رام چندر لال مدرسہ فتح پور۔ بارہ بنکی۔ سید محمد ابوالقاسم تمش اورنگ آباد (گیا) سید محمد ثقلین نگینہ۔ بجنور۔ محمد یحییٰ انصاری۔ بھوپال۔ ایم یوسف نسیم نوشہری بھاولپور۔ محمد احمد علی القادری۔ رائچور۔ عبدالاحد خاں مغلسرائے۔ صلاح الدین خاں۔ لدھیانہ۔ فضیل الرحمٰن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ محمد ابراہیم ولد محمد جمال الدین۔ گلبرگہ سید صبغۃ اللہ فاطمی شملہ۔ مریم خاتون۔ علی گڑھ۔ ابن الحسن۔ بلند شہر۔

ان میں سید نقی اشرف اعظم گڈھ کے لطیفے زیادہ پسند کئے گئے اس کے بعد زہرا خاتون کے اور پھر شوکت بخش خانیوال کے۔ ان تینوں کو انعام بھیج دئے جائیں گے۔

"مائٹل" کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے حصہ لیا۔
محمود علی حیدرآباد۔ ابوالکلام۔ رفیق احمد شملہ۔ زہرا خاتون پانی پت۔ احمد علی۔ نذیر محمد نصیر آباد۔ عثمان الرحمٰن خیر نگر خلیل عمر اورئی ضلع جالون۔ اقبال احمد اقبال امروہہ۔ فطرت مظفری پٹنہ سید ابوالحسن ان میں ابوالکلام اول۔ رفیق احمد دوم اور خلیل عمر سوم آئے

رنگ بھرنے کی تصویر کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے حصہ لیا۔ میرزا ذاکر حسن حیدرآباد دکن۔ سید صاحب پیران چیلدرگ۔ غلام یزدانی حیدرآباد۔ محمد عبدالوالی حیدرآباد۔ محمد شعیب قریشی رام پور۔ یوسف علی خاں اسد حیدرآباد۔ ثریا رفعت خانم پشاور سید محمد ثقلین زیدی نگینہ۔ خورشید حسن فتح پور بارہ بنکی، زہرا خاتون پانی پت۔ سید ضیاء الاسلام۔ دہرہ دون۔ ملک علی امام گیا۔

ان میں غلام یزدانی اول۔ زہرا خاتون دوم اور سید صاحب پیران سوم آئے۔

محترمہ آپا جان نے چند تصویریں بھیجی ہیں۔ چڑیا گھر والی

تصویروں کی طرح یہ بھی عکس اتارنے کے بعد بنائی جائیں گی۔ تصویریں کیا ہیں ایک اچھا خاصا عجائب خانہ ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تم بہت شوق اور دلچسپی سے انھیں بناؤ گے۔ ان تصویروں کا سلسلہ جنوری سے شروع ہوگا۔

آپا جان نے خط کتابت کے سلسلے میں ہمیں دو خط بھی بھیجے ہیں۔ انھوں نے عزیزہ شمشاد جہاں کے خط کا جواب دیا ہے اور لکھا ہے کہ تم نے کپڑے پر ہندوستان کا نقشہ بنایا ہے۔ بہت اچھی بات ہے مگر ہمیں ایسی ڈرائنگ کی ضرورت ہے جو کاغذ پر ہو۔ دوسرے خط میں انھوں نے بتایا ہے کہ جرمنی کے ۸ سے ۱۴ سال تک کے بچے ہندوستان کے ایسی عمروں کے بچوں سے مختلف باتوں کے متعلق خط کتابت کرنا چاہتے ہیں۔ جو بچے انھیں خط لکھنا چاہیں۔ وہ پہلے اپنا نام عمر، پتہ، اپنے والد کا نام اور پیشہ لکھیں اور پھر خط چاہے اردو میں لکھیں یا انگریزی میں۔ لیکن اوپر والی چیزیں خانے کھینچ کر انگریزی ہی میں لکھیں یا لکھوالیں۔ یہ دونوں خط جنوری کے پرچے میں شائع ہوں گے

ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے بچوں میں خط کتابت کے لئے پیامی بچوں کی ایک انجمن بنائیں۔ یہ بہت مفید مشغلہ ہے اور بچوں کو اس سے بہت سی باتوں میں مدد ملتی ہے۔ ٹکٹ جمع کرنے کے سلسلے میں پیامی بچوں میں خط کتابت کا سلسلہ عرصے سے جاری ہے اور اس سے بہت مفید نتیجہ نکلا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اسے انجمن کی شکل دے دی جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔ اس کے بارے میں اپنی رائے سے جلد مطلع کرو۔ یہ بھی بتاؤ کہ اس کا نام کیا رکھا جائے۔ کثرت رائے پر فیصلہ ہوگا۔ یہ کام جنوری سے شروع کردینا چاہتے ہیں

انعامی مقابلے کے مضامین میں جو پیام تعلیم میں چھپنے کے قابل ہیں وہ رکھ لئے گئے ہیں باقی اصلاح کے بعد واپس کئے جارہے ہیں۔ ہم نے اس کا خاص انتظام کیا ہے کہ اس قسم کے مضمون اصلاح و مشورے کے بعد واپس کردئے جائیں۔

اس مرتبہ خط کتابت اور معلومات کے لئے بھی گنجائش نہ نکل سکی۔ انشاء اللہ اگلے پرچے سے ان کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہوجائے گا۔

سال گرہ نمبر کی مصروفیت اور مددگار ایڈیٹر صاحب کی بیماری کی وجہ سے بہت سے بچوں کے خطوں کے جواب دیر میں دئے جاسکے ویسے تو ہمیشہ اس کا خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر بچے کے خط کا جواب فوراً دیا جائے۔ مگر اب اس کا خاص انتظام ہوگیا ہے۔ انشاء اللہ اب کسی بچے کو شکایت نہ ہوگی۔

جنوری سے پیام تعلیم کے لئے خاص انتظامات ہورہے ہیں مارچ میں ہمارا ارادہ ہے کہ نظام نمبر شائع کیا جائے حیدرآبادی بچے خاص طور پر اپنے مضمون بھیجیں۔ ہر مضمون پر استاد کی تصدیق اور پورا پتہ ہونا چاہئے۔ بعض بچے تصویروں پر اپنا نام نہیں لکھتے اس سے بڑی دقت ہوتی ہے اور تصویریں یا مضمون مقابلے میں شامل نہیں ہوسکتے۔ بچوں کو اس کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہئے۔

اس پرچے کی تیاری میں مضمون لکھنے والے حضرات کے علاوہ سید محمد اد یا ما صاحب سے بہت مدد ملی اس پرچے کا ٹائٹل اور تقریباً قریب قریب سب تصویریں اُن ہی کی بنائی ہوئی ہیں۔ اس پرچے کے لئے انھوں نے مضمون بھی لکھے اور کئی مضمونوں کی تیاری میں انھوں نے مدد بھی دی۔ ہمارے ایک اور محترم بزرگ ہیں جن کا نام نہ تو ہم خود لینا چاہتے ہیں اور نہ وہ اسے پسند کریں گے۔ مگر اتنا تمھیں بتادیں کہ ان کی رہنمائی اور امداد کے بغیر پرچے کو ہرگز کامیابی نصیب نہ ہوتی ہم خان صاحب عبداللطیف خاں صاحب کے بھی بہت احسان مند ہیں کہ انھوں نے اپنے جامعہ پریس میں ہمیشہ کی طرح اب کے بھی بہت توجہ سے پرچہ اور اس کی تصویریں چھپوائیں۔ اچھا اب رخصت! اللہ نے چاہا تو اب جنوری میں ملاقات ہوگی۔ دسمبر میں پرچے کا انتظار نہ کرنا۔

آ میرے چاند آجا

از جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب جامعی اُستاد ماڈرن ہائی اسکول نئی دہلی

آ میرے چاند! آجا تیری بلائیں لوں میں
تیری بلائیں لوں میں، تجھ کو دعائیں دوں میں

کیا بھولی بھولی صورت، تجھ کو خدا نے دی ہے
کیا پیاری پیاری مورت، پیارے تجھے ملی ہے

ماں باپ کا کھلونا، گھر بھر کا کھیل ہے تو
اس گھر کے باغ میں اک نوخیز بیل ہے تو

ہو کیوں نہ تجھ سے ٹھنڈا ماں باپ کا کلیجا
کیا دلبری سکھا کر تجھ کو خدا نے بھیجا

آنکھوں کی روشنی ہو تو ہے چراغ سب کا
کلکاریوں سے تیری، دل باغ باغ سب کا

یہ آرزو ہے میری، پروان تو چڑھے اب
علم و ہنر کے درجے محنت سے طے کرے سب

دُکھ بھی اگر اُٹھائے، ماتھے پہ بل نہ آئے
ہمت کبھی نہ ہارے کوشش کئے ہی جائے

سائنس میں ادب میں پائے کمال پورا
جو کام بھی کرے تو چھوڑے نہ وہ ادھورا

تن ہو ترا توانا، اور بازوؤں میں بل ہو
اخلاق اور ادب کے وصفوں میں بے بدل ہو

صدیق[1] کی صداقت، فاروق[2] کی عدالت
عثمان[3] کی سخاوت، شیرِ خدا[4] کی جرأت

خلق محمدی کا دنیا میں ہو نمونہ
تو آخری نبی کا دنیا میں ہو نمونہ

مقبول ہو خدایا، نیر کی ہے دعا یہ
پھولے پھلے یہ بچہ، پورا ہو مدعا یہ

---

(۱) حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفۂ اول

(۲) حضرت عمر فاروقؓ خلیفۂ دوم

(۳) حضرت عثمان غنیؓ خلیفۂ سوم

(۴) حضرت علی شیرِ خدا کرم اللہ وجہہ خلیفۂ چہارم

ہمارِی زبان

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب استاد جامعہ

ہم دوسرے سے کوئی بات کہنا چاہتے ہیں یا اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں تو یا تو اشاروں سے کام لیتے ہیں، یا لفظوں سے۔ اشاروں کے ذریعے سے بہت کم باتیں پوچھی اور کہی جا سکتی ہیں ہاتھ کے اشارے سے ہم کسی شخص سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم کہاں جا رہے ہو اور وہ بتا سکتا ہے کہ میں اس طرف جا رہا ہوں لیکن اگر یہ پوچھنا ہو کہ تم جمعے کو کہاں کہاں گئے تھے، کون کون سی چیزیں دیکھی تھیں کن کن لوگوں سے ملے تھے۔ کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ تو ہم یہ سب نہ دوسرے کو اشاروں میں سمجھا سکتے ہیں اور نہ وہ اشاروں میں جواب دے سکتا ہے۔ اس کے لئے لفظوں کی ضرورت ہے۔ جہاں کہیں لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ سب چیزوں کے اور خیالوں کے نام رکھ لیتے ہیں جنھیں لفظ کہتے ہیں اور یہ سب لفظ مل کر زبان کہلاتے ہیں۔ سب ملکوں کی زبانیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زبان کئی ملکوں میں بولی جاتی ہے یا ایک ہی ملک کے لوگ کئی زبانیں بولتے ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں بہت سی زبانیں ہیں۔ مگر ایک زبان تھوڑے تھوڑے فرق سے ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ہندوستانی کہلاتی ہے یہ زبان شمالی ہندوستان کی پرانی زبانوں سے نکلی ہے۔ اور اس میں تھوڑا سا میل فارسی

عربی سنسکرت اور دوسری دیسی اور بدیسی زبانوں کا بھی ہے۔ اب سے ساڑھے پانچ سو سال پہلے دکن میں اور پھر شمالی ہندوستان میں پڑھے لکھے ہندو مسلمان اس زبان میں کتابیں لکھنے لگے۔ انھوں نے اس کو بہت ترقی دی اور آگے چل کر اس کا نام اردو رکھا

ہماری زبان یہی اردو ہے۔ قریب قریب سارے ہندوستان میں مسلمان اور دکن اور شمالی ہند میں بہت سے ہندو اردو لکھتے اور بولتے ہیں۔ اردو اور ہندوستانی میں یہ فرق ہے کہ اردو میں عربی فارسی کے لفظ زیادہ ہیں اور ہندوستانی میں کم اردو صرف فارسی حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اور ہندوستانی فارسی اور ناگری دونوں میں۔ اردو زیادہ تر پڑھے لکھے لوگوں کی زبان ہے ہندوستانی کو ملک کے بہت بڑے حصے میں پڑھے بے پڑھے بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ہندوستانی اور سنسکرت کے میل سے ایک اور زبان بنی ہے جو ہندی کہلاتی ہے اور ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے۔

ہماری اردو زبان کی عمر کوئی ساڑھے پانچ سو سال کی ہے۔ اتنے دنوں میں ہمارے ہندو مسلمان بزرگوں کی کوششوں سے یہ زبان ایشیا کی بڑی زبانوں میں گنی جانے لگی ہے۔ اس میں بڑے بڑے ہندو مسلمانوں کی مذہبی کتابیں اور شعر اور ادب کی بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں۔ علم اور فن کی تصنیفیں اور ترجمے اردو میں جاپانی کے سوا ایشیا کی کسی زبان سے کم نہیں۔ ہاں یورپ کی بڑی زبانوں کا مقابلہ ہماری زبان اب تک نہیں کر سکتی۔ اگر ہمیں اپنی زبان پیاری ہے تو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ برابر ترقی کرتی رہے۔ یہاں تک کہ دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہ رہے۔

شاید کوئی یہ پوچھے کہ ہم اپنی زبان کو ترقی دینے کی کوشش کیوں کریں اور کیسے کریں؟

کیوں کریں؟ اس کا جواب تو یہ ہے کہ زبان ہماری جان ہے۔ ہمارے جسم کی نہیں

بلکہ ہمارے ذہن کی۔ اسی کے بل پر ہمارا ذہن جیتا ہے۔ اس کے پنپنے سے پنپتا ہے اس کے کمھلانے سے کمھلاتا ہے۔ ذہن کسے کہتے ہیں؟ وہ قوت جس سے ہم دنیا کو جانتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیا کو جاننا اور سمجھنا ایک آدمی کا کام نہیں۔ بہت سے آدمی مل کر دنیا کو دیکھتے ہیں دیکھے ہوئے کو سوچتے ہیں اور اپنے خیالات ایک دوسرے کو بول کر یا لکھ کر بتاتے ہیں۔ اس کے لئے لفظوں کی یعنی زبان کی ضرورت ہے۔ اگر کسی زبان میں کافی اور اچھے لفظ موجود نہیں ہیں جن کے ذریعے سے اس کے بولنے والے اپنے خیالات ایک دوسرے پر ظاہر کریں تو ہر شخص کے خیالات اسی تک رہتے ہیں نہ وہ اپنی کہہ سکتا ہے نہ دوسرے کی سن سکتا ہے۔ اس کا علم بہت تھوڑا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی اولاد کو بھی نہیں پہنچتا، سوچنے کی بات ہے کہ جبتک زبان ترقی نہ کرے علم کیوں کر ترقی کر سکتا ہے۔ جن لوگوں کی زبان سب زبانوں سے پیچھے ہوتی ہے وہ علم و

فن میں بھی سب سے پیچھے ہوتے ہیں کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اگر ہماری زبان علم سے خالی ہے تو ہم کوئی دوسری زبان سیکھ کر اس کے ذریعے سے علم حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بات کچھ کچھ تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی مثال ہندوستان میں ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان والے جن کی زبانیں بہت پیچھے ہیں۔ انگریزی کے ذریعے سے علم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دوسری زبان کا سیکھنا اتنا مشکل ہوتا ہے کہ بہت تھوڑے لوگ سیکھ سکتے ہیں۔ جو سیکھتے بھی ہیں ان کا پڑھنے کا زمانہ اسی زبان کے سیکھنے میں گذر جاتا ہے۔ علم حاصل کرنے کا وقت ہی نہیں رہتا اور پھر سارے جتن کرنے کے بعد بھی دوسری زبان اتنی نہیں آتی کہ آدمی اپنے دل کی ہر بات۔ اپنے ذہن کا ہر خیال اس میں اچھی طرح ادا کر سکے اور اس کے بولنے اور لکھنے میں کمال حاصل کر سکے۔ دیکھو نا ہمارے دیس میں کئی لاکھ آدمیوں نے دس دس بیس بیس برس انگریزی سیکھی۔ کئی ہزار آدمی انگلستان میں رہ کر آئے مگر ان میں کتنے ہیں جو

انگریزی میں شعر کہہ سکیں یا نثر میں اچھی اچھی کتابیں لکھ سکیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے بہت علم حاصل کیا ہے مگر ان کا علم گونگے کا خواب ہے کہ آپ ہی آپ اس کا مزہ لیتے ہیں اپنے بھائیوں کو کچھ نہیں بتا سکتے۔ بہت سے لوگوں کا تو یہ حال ہے کہ انگریزی کی دُھن میں انھوں نے اپنی زبان کی طرف بالکل توجہ نہیں کی۔ معمولی بات چیت کر لیتے ہیں۔ مگر جب کسی علمی مسئلے کی یا ملکی معاملے کی بحث ہو تو نہ زبان کھول سکتے ہیں نہ قلم اُٹھا سکتے ہیں کچھ کہتے ہیں یا لکھتے ہیں تو انگریزی میں جسے بس تھوڑے ہی سے آدمی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں اچھے اچھے خیالات آتے ہیں اور اُن کا جی چاہتا ہے کہ اپنے دیس کے لاکھوں کروروں آدمیوں کو یہ باتیں سُنائیں۔ مگر گُھٹ کر رہ جاتے ہیں اگر کبھی گونگوں کی طرح کچھ آوازیں نکالتے بھی ہیں تو کوئی نہیں سمجھتا۔

ایک بات تو معلوم ہوگئی کہ اپنی زبان کو ترقی دینا بہت ضروری ہے۔ اب دوسری بات رہی کہ اسے ترقی کس طرح دی جائے؟ تو بھئی ہم سب لوگوں کو جو مدرسے میں پڑھتے ہیں سب سے پہلے یہ کرنا چاہیے کہ اپنی زبان اچھی طرح سیکھیں۔ اردو کے گھنٹے میں اونگھنا یا کاپی پر اپنی یا اپنے دوستوں کی تصویریں بنانا چھوڑ دیں۔ بلکہ خوب چوکس ہو کر سنیں کہ استاد کیا کہہ رہا ہے اور پڑھیں کہ کتاب میں کیا لکھا ہے۔ گھر پر کرنے کو جو کام دیا جائے اُسے پابندی سے اور محنت سے یہ سمجھ کر کریں کہ یہ زبان کا کام ہے جو ہماری جان ہے۔ اسی سے ہمارے اور ہماری قوم کے علم کی ترقی ہوگی اور علم کی ترقی میں قوم کی بھلائی ہے اسی سے ہماری قوم دوسری قوموں کی برابری کرے گی آزادی، دولت اور عزت حاصل کرے گی مدرسے کی کتاب کے علاوہ ہمیں استاد سے اور اپنے بڑوں سے پوچھ کر اردو کی اچھی اچھی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ بہت سی کتابیں تو ہمیں اپنے گھر میں یا مدرسے کے کتب خانے میں مل جائیں گی، پھر رسالوں میں اخباروں میں

.........کتب فروشوں کی فہرستوں میں۔ بچوں کی کتابوں کے اشتہار نکلتے ہیں انھیں پڑھ کر ماں باپ سے ضد کرنی چاہیئے کہ ہمیں فلاں کتاب منگا کر دو۔ اس کے لئے تو ہم سب مچلتے ہیں کہ ہمیں مٹھائی منگا دو۔ کپڑے بنادو۔ تماشا دکھا دو۔ مگر ایسے ہم میں بہت کم ہیں جو کتاب کے لئے مچلتے ہوں۔ یقین ہے کہ بہت سے ماں باپ ہمیں بڑی خوشی سے کتاب منگا کر دیں گے۔ وہ انکار کریں تو اس کے دو سبب ہوسکتے ہیں یا تو اُن کے پاس پیسہ نہیں یا انھیں کتابوں کا شوق نہیں۔ اگر پیسہ نہیں تو صبر کرنا چاہیئے اور کتب خانے سے یا دوستوں سے مانگ کر کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ اگر شوق نہیں تو اُن کے پیچھے پڑ جانا چاہیئے۔ کبھی نہ کبھی انھیں شوق پیدا ہو ہی جائے گا۔

جب ہم اپنی زبان اچھی طرح سیکھ لیں گے تو پھر اور کام کرنے کا وقت آئے گا۔ پھر ہم اچھی اچھی کتابوں کا دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کریں گے۔ خود اچھے اچھے مضمون اور بڑی بڑی کتابیں لکھیں گے۔ دنیا کے ہر علم وفن کو اردو میں لے آئیں گے اور ایک دن بڑے فخر سے یہ کہیں گے کہ ہماری زبان دنیا کی کسی زبان سے ہیٹی نہیں۔ چاہے وہ جرمن ہو یا فرانسیسی یا انگریزی۔ وہ دن ہمارے لئے اور ہماری قوم کے لئے کیسی خوشی کا دن ہو گا!

بھالو

از ہاجرہ بیگم صاحبہ

محترمہ ہاجرہ بیگم نے ہماری درخواست پر یہ اچھا سا ڈرامہ یا نقل بھیجی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ بچے اس نقل کو ایکٹ کریں گے۔ اور اپنی کامیابی کی ہمیں اطلاع دیں گے۔ (ایڈیٹر)

ہمارے یہاں پہلے محفلوں اور جلسوں میں ایک بڑی دلچسپی کی چیز ہوا کرتی تھی اسے نقل کہتے تھے نقال یعنی نقل کرنے والے کسی روزمرہ کی بات کی مزے دار تصویر کھینچا کرتے تھے۔ رئیس آدمی انھیں بڑی بڑی رقمیں دے کر بلاتے تھے اور غریب لوگ چندہ اکٹھا کرکے دیتے تھے۔ ان نقالوں کی ٹولیاں ہوتی تھیں۔ عورتوں کی الگ، مردوں کی الگ یہ لوگ آپس میں مل کر کھیل کی تھوڑی سی مشق کر لیتے تھے۔ لکھے ہوئے لفظ تو ہوتے نہ تھے، بس کچھ سوال و جواب زبانی یاد کر لیتے تھے اور کچھ باتیں موقع پر جی سے ملاتے جاتے تھے۔ کھیل کرنے کے لئے اسٹیج یعنی کوئی خاص جگہ نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ محفل کے بیچوں بیچ لوگ جگہ چھوڑ دیتے تھے یہ لوگ سوانگ بھی بھرتے تھے یعنی طرح طرح کے مناسب لباس پہنتے تھے۔ نقلی داڑھی، مونچھ اور بال لگاتے تھے۔ منہ پر آٹا سرخی اور کالک بھی ملتے تھے۔ کبھی کبھی بنے ہوئے چہرے لگاتے تھے ان نقلوں میں گانا کم ہوتا تھا اور زبان بھی روزمرہ کی آسان زبان ہوتی تھی۔ اس قسم کی نقلیں ہر ملک میں اور ہر زبان میں ہوتی تھیں اور آج کل کے ڈراما اور تھیٹر کی یہ ابتدا تھیں

بھالو والے کی نقل میں چھوٹے بچوں کے

لئے لکھی ہوں۔ اگر ننھے بچے اس کو یاد کرلیں اور ایکٹ کریں تو بہت مزے دار ہوگی۔ کمرے میں یا کھلے میدان میں کر سکتے ہیں۔ جتنے بچے چاہیں شریک ہوجائیں۔ کم از کم سات بچے ہونے چاہئیں۔ اگر زیادہ ہیں تو تینوں بچوں کا پارٹ بانٹ کر ایک ایک دو دو جملے سب لے سکتے ہیں

بھالو کی نقل

تماشہ کرنے والے:۔

مداری (سب سے ہوشیار لڑکا)۔ گیروا دھوتی لال کرتا۔ سر پر لنگی لپٹی ہوئی، لمبے لمبے پٹھے (بال) لٹکتے ہوئے، ننگے پاؤں کانوں میں بالے، گلے اور ہاتھوں میں کنٹھے، اور مالائیں پڑی ہوئیں۔ ایک ہاتھ میں لوہے کا کڑا، کندھے پر بڑا سا تھیلا۔ ایک ہاتھ میں ڈگڈگی۔ اور ایک میں ڈنڈا۔

بھالو کسی بچے کے اوپر بڑا سا بالوں والا کوٹ ڈال کر بنایا جاسکتا ہے۔ منہ چاہیں ڈھانپ دیں، چاہے کپڑے یا کاغذ کا چہرہ بنا کر لگا دیں۔

ماں۔ (کوئی بڑی لڑکی بن سکتی ہے) رنگین ساڑھی اور کرتا پہنے ہوئے۔ تھوڑا سا زیور اور ایک بڑے سے رومال میں کنجیاں اور پیسے بندھے ہوئے

ماما۔ (موٹی سی لڑکی) تنگ پاجامہ اور سفید کرتا اور دوپٹہ، پھٹی ہوئی جوتیاں، چاندی کی بالیاں اور چوڑیاں، بال بکھرے ہوئے۔

منّی۔ (سب سے چھوٹی لڑکی) گلابی کرتا اور بڑا پاجامہ پہنے ہوئے، بڑی صدری، سر پر گول ٹوپی اور کانوں میں بُندے۔

بچے۔ چھوٹے بڑے لڑکے اور لڑکیاں

سین:۔

اسٹیج کے بیچ میں پلنگ یا کرسی بچھی ہے، "ماں" بیٹھی سی رہی ہے۔ کچھ بچے داہنی طرف بیٹھے گڑیاں کھیل رہے ہیں۔ ایک بڑا بچہ کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ بچوں کے آپس میں

بولنے کی آوازیں آرہی ہیں۔

"لاؤ ہمیں دو"

"واہ یہ ہمارا ہے"

"کیا کرتی ہو"

کی طرف دوڑتے ہیں۔ کچھ باہر نکل جاتے ہیں۔ کتاب پڑھنے والا اپنی کتاب بند کر دیتا ہے.......

بچے (مل کر) "بھالو والا! بھالو والا!"

.... ڈگڈگی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ داہنے ہاتھ پر بیٹھے ہوئے بچوں میں سے ایک دوڑ کر جاتا ہے اور دروازے میں سے جھانک کر دیکھتا ہے.........

پہلا بچہ ۔ بھالو والا! بھالو والا!

.... سب بچے اٹھ کر دروازے

...... چھوٹے بچے بھاگتے ہوئے ماں کے پاس آتے ہیں......

دوسرا بچہ "اماں بھالو والے کا تماشہ کرا دیجئے"

تیسرا بچہ :۔ ہاں اماں۔ بہت دن سے تماشہ نہیں دیکھا۔

ماں اوں، ہوں۔ اب روز تماشے ہونے

لگے۔ جاؤ کھیلو۔ مجھے سینے دو"

دونوں بچے (مچل کر) اوں، اوں، اماں ہم تو تماشہ دیکھیں گے۔

...... اور بچے بھی ماں کو آن کر گھیر لیتے ہیں......

سب بچے۔ "ہم تو تماشہ دیکھیں گے"

"امان کروا دیجئے نا"

"خالہ بی ہم نے کبھی تماشہ نہیں دیکھا ہے"

ماں۔ (ماتھے پر بل ڈال کر) "اچھا خیر آج بلالو۔ مگر پھر کل پرسوں کو ضد نہ کرنا"

...... بچے سب داہنے ہاتھ کو دوڑ کر جاتے ہیں اور پکارتے ہیں۔

بھالو والے۔ او بھالو والے۔ یہاں آؤ"

...... مداری بھالو کو لئے آتا ہے

سب بچے اس سے ڈر کر پیچھے کو ہٹ جاتے ہیں

مداری۔ "سلام حجور کیا کچھ کھیل ہوگا۔ کچھ تماشہ کرتب دکھلاؤں"

بچے۔ ہاں، ہاں، تماشہ دکھاؤ۔

..... بچے سب ماں کے ادھر ادھر بیٹھ جاتے ہیں۔ ماما منّی کی انگلی پکڑے آتی ہے۔ اور داہنی طرف کھڑی ہو جاتی ہے۔ مداری اپنا جھولا زمین پر رکھ دیتا ہے۔ لکڑی اور بھالو کی نکیل کو پاؤں سے دبا کر بائیں طرف بیٹھ جاتا ہے۔ پھر ڈگڈگی بجا کر گا گا کر کہتا ہے۔

مداری۔ چل میاں سلام کر۔ بڑے حجور کو سلام کر۔ جرا بٹیا چال دکھا اپنی......

..... بھالو جا کر سب کے سامنے سر ٹیکتا ہے

مداری " اور بٹیا کیسے بیٹھوگے ، چوکی پر کیسے بیٹھوگے "

...... ڈگڈگی رکھ دیتا ہے ۔ بھالو اس پر بیٹھ جاتا ہے

مداری :۔ "اور چرکھا کیسے کاتے گی ۔ مالک کا چرکھا کاتے گی "

..... بھالو چرخہ کاتتا ہے ۔

مداری ۔ "ساباس بیٹے ۔ تیری عمر ہو ۔ اور جرا میرا چرکھا تو کات دے "

...... بھالو خو خو کرکے پیٹھ موڑ لیتا ہی سب بچے ہنس دیتے ہیں ۔

مداری اری مان جا نراج کیوں ہوگئی میرا چرکھا کات دے ۔ نہیں کاتتی ۔ صاحب اچھا من جا ۔ جرا آٹا گوندھ دے ۔ مالک کا آٹا گوندھ دے ۔

بھالو آٹا گوندھتا ہے ۔

(اسی طرح پنکھا جھلنا ۔ روٹی پکانا وغیرہ جوڑ سکتے ہیں)

مداری "جرا ناچ تو کرے بابا ۔ تاک دھنا دن تاک دھنا "

.... بھالو کندھے پر ڈنڈا رکھ کر ادھر ادھر قدم رکھتا ہے ۔ بچے چلا چلا کر ہنستے ہیں ....

مداری ۔ (منی سے) "جرا بابا اپنا بندہ تو دینا"

.... ماما ایک بندہ اتار کر دیتی ہے ۔ مداری اس کو اپنے کرتے کی جیب میں چھپا لیتا ہے ۔ پھر بھالو سے کہتا ہے ۔

مداری ۔ "اور چور کیسے پکڑے سپاہی ۔ چور پکڑلے بھائی "

بھالو آہستہ آہستہ چکر لگاتا ہے ایک ایک کو غور سے دیکھتا ہے۔ بچے ذرا ڈرتے ہیں۔ پھر بھالو مداری کے پاس آن کر اس کو دیکھتا ہے۔ مداری رسی کا اشارا کرتا ہے۔ اور بھالو خو خو کر کے اس پر دوڑتا ہے۔ مداری جھوٹ موٹ ڈرتا ہے۔

مداری۔ ارے سرکار۔ ارے جمور، مار ڈالا لیو صاحب، لیو جمور، اپنی چیج لو۔

.... بندہ نکال کر سب کو دکھاتا ہے سب بچے ہنستے ہیں۔ مداری بندہ ماما کو دیتا ہے۔ وہ چپکے سے سب کی آنکھ بچا کر اپنے پلّو میں باندھ لیتی ہے۔

مداری۔ جا سلام کر، بابا بڑی سرکار سے کچھ کپڑا کچھ جوڑا لا، پانچ روپے لا

بھالو ماتھا ٹیک کر سلام کرتا ہے ماں رومال کے کونے سے پیسے کھول کر دیتی ہے۔

مداری۔ "ارے جمور یہ تو کچھ بھی نہ ملا۔ بڑا آسرا لگائے تھے۔"

ماں۔ اور کیا لے گا؟ لے دو آنے اور لے لے

مداری سلام کر کے جھولا اُٹھا کر ڈگڈگی بجاتا ہوا چلا جاتا ہے

پہلا بچہ۔ "کیسے مزے کا بھالو تھا!"

دوسرا بچہ۔ "ہاں بھائی جان اور چرخہ کیسے کاتتا تھا"

...... ہاتھ سے بتاتا ہے۔ منی اوں اوں کر کے رونے لگتی ہے۔ سب اس کی طرف دیکھتے ہیں

ماں۔ کیا ہوا منی۔ کیا ڈر گئی؟

منی "ہمالا بندہ"۔

تیسرا بچہ۔ "ارے تمھارا بندہ کہاں گیا؟"

سب بچے:۔ بندہ کیا ہوا؟

"ابھی تو تھا"

"کسی کے پاس ہے"

ماما۔ "میں جانوں وہی کمبخت مداری لے گیا۔ ہوگا"۔

پہلا بچہ:۔ افوہ! کیسا چالاک آدمی تھا"۔

دوسرا بچہ: "اس کی شکل ہی ایسی ڈراونی تھی ڈاکوؤں کی طرح"۔

تیسرا بچہ "ہاں وہی ہوگا چور"
منی۔ اؤں، اوں ہمالا بندہ"
ماں۔ آؤ ہمارے پاس آؤ۔ ہم تمھیں اور دیں گے۔ رو مت"
......ڈگڈگی کی آواز پھر دور سنائی دیتی ہے۔

مداری بھالو کو لئے آتا ہے۔
ماں۔ "واہ جی واہ اچھا تماشہ کرنے آئے تھے۔ میری بچی کا بندہ ہی رکھ لیا۔ خیر اسی میں ہے۔ ابھی دے دو"
مداری:۔ بندہ؟ صاحب بندہ تو میں نے دے دیا تھا" (ماما کی طرف اشارہ کرکے)

پہلا بچہ۔ "بھالو والا! میں بلاتا ہوں۔ اس شیطان کو"
دوسرا بچہ۔ "ہاں اس کو ابھی پکڑو"
.... سب بچے دوڑے ہوئے جاتے ہیں۔ بھالو والے او بھالو والے چلاتے ہیں

ان کو دیا تھا"
ماما "چل جھوٹے مجھے کب دیا تھا؟ چوری اور سینہ زوری"؟
مداری غصے سے اس کی طرف دیکھتا ہے
مداری اچھا چور۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم ڈھونڈیں گے"

...... ڈگڈگی بجاتا ہے اور ڈنڈا بھالو کو دیتا ہے

مداری۔"چل تو بیٹا، ڈھونڈھ دکھا۔ چور کیسے پکڑے سپاہی"

بھالو پہلے کی طرح گھوم گھام کر سب کو دیکھتا ہے۔ جیوں ہی ماما کے پاس آتا ہے مداری رسی کا اشارہ کرتا ہے۔ بھالو خو خو کر کے اس کے پیچھے دوڑتا ہے ماما چیخیں مارتی ماں کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتی ہے۔ سب بچے چیخیں مارتے بھاگتے ہیں۔ ایک گرتا ہے۔

ماما:۔"اوئی، اوئی میں مری۔ ارے چھوڑو ارے بھائی بھالو والے چھڑا لے۔ میں دیتی ہوں بندہ میرے ہی پاس ہے ارے میں مری"

مداری۔ بھالو بٹھا لیتا ہے۔ ماما کرسی کے پیچھے سے بیٹھی بیٹھی ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھا کر بندہ دیتی ہے۔

پہلا بچہ:۔"اچھا چور آپ ہی تھیں۔ واہ واہ!"

دوسرا بچہ"تو اس بے چارے کا نام کیوں لگایا۔؟"

ماں"کیوں ری نامراد یہ تیری حرکت کیا تھی؟"

ماما کرسی کے پیچھے سے ہاتھ جوڑتی ہوئی بیوی مجھ سے قصور ہوا۔ ہاتھ جوڑتی ہوں

ماں (مداری کو پیسے دیتے ہوئے)"لو بھالو کو کچھ کھلا دینا"

.... مداری لے کر سلام کرتا ہے

منی (تالیاں بجا کر) ہمالا بندہ مل گیا، ہمالا بندہ مل گیا۔
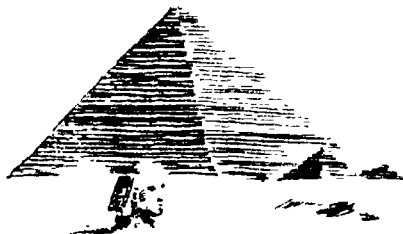
جامعہ ——— میری یاد میں!

عبدالرحمن نذیر از نیہ بلوچستان

بڑوں کے مقابلے میں بچوں کو قصے کہانیاں سننے اور پڑھنے کا زیادہ شوق ہوتا ہے۔ کہانی ذرا دلچسپ ہو۔ بس پھر نہ انھیں کھانے پینے کا شوق رہتا ہے نہ کھیل کود کا خیال آتا ہے۔ قصے میں کوئی حیرانی کی بات ہوئی تو اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے، خوشی کی بات ہوئی تو خوب خوش ہوتے ہیں۔ کہانی ذرا لمبی بھی ہو تب بھی بچے اس کے ختم ہونے تک نہایت فرماں برداری سے بیٹھے رہتے ہیں چاہے گھنٹے لگ جائیں۔ **الغرض** ایک مزے دار کہانی بچوں کے لئے سب سے بہتر تحفہ ہے

میری چھوٹی بہن سلیمہ کو دیکھو۔ کہانی سننے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ کالج سے گھر آتا ہوں تو پہلا سوال یہ ہوتا ہے۔ بھائی جان آج کی کہانی! میں یہ کہہ کر کہ وقت تو آنے دو۔ اپنے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ شام کے وقت کالج ہاکی کھیلنے جاتا ہوں۔ واپسی پر سلیمہ کی بات یاد آتی ہے۔ دل ہی دل میں کہتا ہوں "ہر روز ایک نئی کہانی سُنا سُنا کر میرا تمام ذخیرہ اب ختم ہو چکا۔ کوئی کتاب بھی نہیں ملی کہ سلیمہ کی دلچسپی کی کہانی یاد کر لیتا" ان ہی خیالات میں غرق میرا سفر جلد طے ہو جاتا ہے

کھانے سے فارغ ہوئے، اور باتیں شروع ہو گئیں تھوڑی دیر میں سلیمہ بستر وغیرہ تیار کر کے میرے گرد ہو جاتی ہے۔ بھائی جان! کہانی......"

"سلیمہ! سنو! جب تک کوئی کہانی ختم نہ ہو۔ تم وعدہ کرو کہ اس وقت تک نہ سوؤ گی"

"ہاں بھائی جان میں وعدہ کرتی ہوں کہ

کہانی ختم ہونے تک نہ سوؤں گی۔"

"اچھا، تو تیار ہو جاؤ۔ یہ کہانی نہیں۔ سچا قصہ ہے۔ تم "جگ بیتی" روز سنتی رہی ہو، اب آپ بیتی سنو۔

اگست ۱۹۲۳ء میں میں جامعہ میں داخل ہوا۔ جامعہ اس وقت علی گڑھ میں تھی۔ میں کوئی سات، آٹھ برس کا ہوں گا۔ اداس تو ضرور ہوا لیکن استاد مہربان ملے۔ پھر ہم عمر بھی کئی تھے چند دنوں ہی میں ہم آپس میں گھل مل گئے۔ اور گھر کی یاد آہستہ آہستہ مدھم ہونی شروع ہوگئی۔ مجھے اس وقت کا کوئی خاص واقعہ یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ گرمی کے دن تھے اور ہم اپنے دارالاقامہ (بورڈنگ) کے سامنے کے وسیع میدان (جس میں بہت سے سایہ دار درخت تھے) میں چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ چھوٹے ہم ضرور تھے۔ لیکن شرارتیں بہت کرتے تھے۔ سلیمہ! سن رہی ہو نا۔ درخت کے پھلوں کو توڑنے کے لئے۔ تین چار ہم جماعت چپکے سے اپنی چارپائیوں سے اٹھتے اور اینٹیں مارتے۔ پھل تو ذرا بھی نہ گرتے۔ مگر وہ اینٹ یا کنکر کسی بے چارے سونے والے کے ضرور لگ جاتا۔ وہ نگراں کے پاس شکایت لے جاتا۔ اور اس عرصے میں ہم اپنے اپنے بستروں پر خراٹے بھرتے ہوتے۔ مار نہ کھاتی۔ پھر بھی استاد خفا ضرور ہوتا تھا۔ ایک بات اور یاد ہے ان ہی گرمیوں میں بڑے لڑکے اپنی چارپائی ایک دوسرے کی چارپائی پر بچھاتے تھے۔ چار دوست آپس میں مل کر یہ کام انجام دیتے تھے۔ ہم نے بھی اسی طرح کیا۔ پہلے تو چارپائی گر پڑی، لیکن بعد میں اس طرح سے بچھائی گئی کہ پھر کبھی نہ گری۔

شام کو بڑے لڑکے فٹ بال کھیلتے تھے اور ہم دیکھتے تھے۔ ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے یہ استادوں اور طالب علموں کا "گلی ڈنڈا" کا میچ تھا۔ خوب کھیل ہوا۔ دونوں برابر رہے اور ہم تالیاں بجا بجا کر اپنے جی کو خوش کر رہے تھے۔

"بزم کمال[۵۱]" اپنے جلسے باقاعدہ منعقد کرتی رہی۔ اس کے صدر جناب حافظ فیاض احمد صاحب انصاری تھے۔ ہم بھی شامل ہوتے اور اپنی اپنی

---

۵۱ جامعہ کے اسکول کے بچوں کی انجمن

عقل کے مطابق ہر تقریر کرنے والے کو جانچتے۔

"بزم" کا سالانہ جلسہ آیا، اور انعامی تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے بھی اس میں حصّہ لیا۔ پہلی کوشش تھی۔ انعام ایک بہتر تقریر کرنے والے کو ملا۔ اس کے بعد جامعہ، دہلی آگئی اور اس کے ساتھ میں بھی دہلی آگیا۔ سُن رہی ہو نا سلیمہ!

"جی ہاں"

نئی عمارتوں میں ہماری جماعتیں تھیں۔ کچھ استاد نئے۔ درجہ بھی نیا۔ ایک نئے دل کے ساتھ ہم نے پڑھائی شروع کر دی۔ ہمارا دارالاقامہ وہ لمبی عمارت تھی جو شاید اب بھی جامعہ کے بالکل سامنے ہے۔ تمام لڑکے اسی میں رہتے تھے۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی جامعہ کے پرنسپل بنے تو جامعہ کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ دو اور نہایت ہی قابل اور شفیق و مہربان استاد وہ اپنے ہمراہ لائے۔ یہ جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب۔ ایم اے، پی ایچ ڈی اور جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) ہیں۔ پرانا دارالاقامہ چھوڑ دیا گیا۔ اور طلبا عمر کے لحاظ سے مختلف نگرانوں کے زیرِ نگرانی نئے دارالاقاموں میں جا بسے۔ میں اور میرے ساتھی "پیلی کوٹھی" میں رہنے لگے۔ ہمارے نگراں جناب ارشاد الحق صاحب تھے۔ یہ بہت ہی اچھے اور مہربان استاد تھے۔ ہماری ہر طرح مدد کرتے تھے۔ ہم آپس میں بھائی بھائی تھے اور یہ ہمارے سرپرست کیلاٹ صاحب کھیلوں کے نگراں تھے۔ وہ ہمیں باقاعدہ ورزش اور ڈرل بھی کراتے تھے۔ جامعہ کا کھیلنے کا میدان بہت بڑا تھا لیکن اس میں صرف بڑے لڑکے ہی کھیل سکتے تھے، ان کو کھیلتے دیکھ کر ہمیں بھی شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ یہ شوق پہلے بھی کئی دفعہ پیدا ہو چکا تھا مگر اب ہم اپنے شوق کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ تمام لڑکوں کو جمع کیا گیا، صلاح کی گئی اور بغیر کسی حیل و حجت کے یہ قرار پایا کہ کل سے باقاعدہ کھیل شروع ہو۔ دوسرا دن آیا اور ہم نہایت جوش و خروش سے آپس میں اپنی اپنی "ٹیم" کے متعلق اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ وقت سے بہت پہلے ہم پہنچ گئے۔ ایک دو کے پاس نئی

ہٹسکیں تھیں۔ چند ایک کے پاس پرانی ، اور کچھ "ڈنڈے" لے آتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ دو لڑکے ایسے تھے جن کے پاس مڑی ہوئی لکڑی تھی۔ وہ اسی سے خوش تھے۔ میری ٹیم مکمل تھی دوسرا گروہ آیا اور کھیل فوراً شروع کر دیا گیا۔ ایک پرانی دھرانی گیند سے جو بڑے لڑکوں نے بے کار سمجھ کر پھینک دی تھی ہم کھیل رہے تھے۔ جدھر گیند ہوتا اُدھر ہی ہم سب۔ بعض گیند کو مارتے مگر لگتی کسی کے گھٹنے پر یا پیر پر۔ اور وہ وہیں پیر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ دوسروں کو کھیل میں مشغول دیکھتا تو زخم کو مَل مَلا کر پھر شامل ہو جاتا۔ گیند بچاری کی بُری طرح سے خبر لی گئی وہ اس صدمے کو نہ سہہ سکی اور پھٹ گئی۔ مگر ہمارا کھیل جاری رہا۔ یہاں تک کہ اندھیرا ہو گیا۔ اور گیند بھی کھیلنے کے قابل نہ رہی۔ مجھے سلیمہ اس بات پر فخر ہے کہ میں نے پہلے پہل ہاکی جامعہ میں سیکھی۔

سلیمہ میرے ہم جماعتوں میں ایک تو اشفاق حسین صاحب تھے۔ یہ صاحب مجھے اس لئے یاد ہیں کہ یہ ہماری جماعت میں کافی ہوشیار تھے محنت خوب کرتے تھے اور خوش خطی میں اول نمبر رہتے تھے۔ اسی زمانے میں اُن کا خط اتنا اچھا ہو گیا کہ خوش نویس معلوم ہوتے تھے، دوسرے صاحب جو مجھے یاد ہیں وہ محمد سعید صاحب ہیں۔ یہ ڈرائنگ میں بہت اچھے تھے۔ ہمارے ڈرائنگ ماسٹر جناب اختر حسن صاحب فاروقی تھے۔ انھوں نے آتے ہی نہایت کوشش سے ہر لڑکے کو ڈرائنگ سکھانا شروع کی لیکن میرا دل ڈرائنگ میں نہ لگا۔ وجہ اب تک سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ یہ جانتا ہوں کہ یہ بہت ہی ضروری مضمون ہے۔ سالانہ امتحان ہوا اور میرے خیال کے مطابق جناب فاروقی صاحب نے پیالہ اور پرچ بنانے کو دیا۔ کون کہتا ہے کہ ڈرائنگ میں نقل نہیں ہو سکتی فاروقی صاحب کو چند منٹ کے لئے دفتر جانا پڑا ادھر سعید نے میری غلط سلط ڈرائنگ مٹا کر جلد جلد ایک معمولی قسم کی ڈرائنگ تیار کر دی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے سترہ بٹا پچاس نمبر ملے ہیں عربی ہمیں ارشاد الحق صاحب پڑھاتے تھے۔ اور انگریزی جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

تاریخ اسلام جناب نذیر نیازی صاحب، اور الجبرا و جیومیٹری جناب برکت علی صاحب۔ اور دوسرے استاد بھی تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ثانوی اول میں تھا۔ آج سے دس سال پہلے میں اس وقت گیارہ برس کا تھا اور تم سلیمہ شاید گیارہ دن کی بھی نہ ہو گی! جامعہ میں چرم سازی (چمڑے کا کام) کا درجہ بھی کھلا تھا۔ میں نے بھی کچھ سیکھا۔ لیکن بعد میں چھوڑ دیا۔ اسی زمانے میں کھدر کی تحریک نہایت زور شور سے جاری تھی۔ سلیمہ کھدر تو ہم پہنتے تھے۔ مگر اب کھدر اپنے ہاتھ سے تیار کرنے لگے۔ چرخے کاتنا شروع کیا گیا۔ روئی سے تاگا بنایا جانے لگا۔ اور ہم تمام اس میں شامل تھے۔ خود شیخ الجامعہ صاحب اس میں موجود تھے

"سلیمہ وقت زیادہ ہوا جا رہا ہے۔ اور تمھیں نیند آ رہی ہو گی۔ اس لئے۔۔ ۔۔۔۔۔

"نہیں بھائی صاحب آپ سناتے چلیں میں سن رہی ہوں"

قصہ ابھی کافی لمبا ہے۔ میں اسے نہایت مختصر الفاظ میں ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جامعہ جب دہلی میں آگئی تو اس کی مالی حالت پہلے سے کچھ اچھی ہو گئی۔ مولانا محمد علی صاحب مرحوم، اکثر جامعہ میں تشریف لاتے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے تھے اور اُن کو خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوتے تھے مسیح الملک جناب حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم جامعہ کے سرپرست تھے۔ وہ جامعہ میں نہایت دلچسپی لیتے تھے۔ ہم بچے تھے۔ لیکن ہم دیکھتے تھے کہ مولانا محمد علی صاحب، مولانا شوکت علی صاحب ڈاکٹر انصاری صاحب اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب آپس میں بڑی دیر تک جامعہ کے متعلق باتیں کرتے تھے۔ وہ اپنے ہمراہ اور بھی بہت سے معزز اصحاب کو لاتے تھے اور جامعہ کا معائنہ کراتے تھے سب جامعہ سے خوش تھے۔ یوم تاسیس پر نہایت شاندار مشاعرہ ہوتا تھا۔ ملک کے مشہور شعرا بلائے جاتے تھے۔ رات کو پُر تکلف دعوت ہوتی تھی۔ جامعہ کے طرحے سلیمہ مجھے ابھی تک یاد ہیں تم سے اُس طرح تیار نہ ہو سکے! اسی زمانے میں جناب عبدالغفار صاحب مدہولوی نے اپنے ڈرامے تیار کئے پہلے پہل تو انھوں نے اپنے دارالاقامہ

(جس کے وہ نگران تھے) میں ہی ڈرامہ تیار کیا اور
وہیں دکھایا۔ بچوں کے شوق اور اُن کی قابلیت سے
جناب عبدالغفار صاحب نے پوری طرح فائدہ اُٹھایا
جب جامعہ کے ہال میں "بچوں کا انصاف" دکھایا گیا
تو سب نے پسند کیا۔ قدرتی ایکٹنگ نے کھیل میں
جان ڈال دی تھی۔ وہ تمام نقشہ میرے دماغ میں
اسی طرح موجود ہے۔ اور بھی "کھیل" تیار ہوئے اور
نہایت پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے۔ جب
سالانہ جلسہ ہوا۔ تو رات کی دعوت کے بعد ایک
نیا ڈرامہ عبدالغفار صاحب نے پیش کیا۔ چونکہ مجھے
بھی ڈرامے سے بہت شوق تھا۔ اس لئے میں بھی
وہیں موجود ہوتا۔ جہاں دوسرے ایکٹر ہوتے تھے
جناب مدہولوی صاحب نے دیکھا تو مجھے بھی پہلے
سین میں شامل کرلیا۔ یہ سین اقبالؔ کا ترانہ تھا۔

"چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا"

میں خوش تھا۔ اور جب وقت آیا تو میرے دل میں یہ
خیال پیدا ہوا کہ گانا بند بالکل نہ ہو یعنی جب
لڑکے ایک مصرعے کے بعد ذرا رُک کر دوسرا مصرعہ
شروع کرتے تو میرا خیال تھا کہ اس طرح نہ ہونا
چاہئے۔ بلکہ گاتے ہی رہنا چاہئے۔ میں بالکل
نہ تھا۔ بلکہ آدھ ایک سیکنڈ آگے ہی رہا۔ پردے
کے پیچھے سے جناب عبدالغفار صاحب ہدایت دے
رہے تھے۔ کہ آہستہ آہستہ مگر میری سمجھ میں نہ آیا۔
پر نہ آیا! ڈرامے کا شوق بھی مجھے جامعہ کے طفیل
ہوا۔ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ سلیمہ تمھاری
سہیلیوں کی طرح میرے بھی کئی دوست تھے۔ چند
ایک بہت ہی اچھے دوست تھے۔ شبیر حسین جس
کو اب آنکھیں اس دنیا میں نہیں ڈھونڈ سکتیں، ہر
وقت میرے ساتھ رہتے تھے۔ ہاکی خوب کھیلتے تھے
اور چونکہ وہ پنجابی تھے۔ اس لئے محبت اور بھی گہری
ہوگئی۔ حافظ مزمل بھی میرے اچھے دوست تھے
سلیمہ تم کو معلوم ہے وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں
ہیں۔ نہایت حسرت ناک طور پر (دریا میں ڈوب
کر) وہ جدا ہوئے!! خدائے برتر ان دونوں کی
مغفرت کرے۔ اور بھی کئی دوست تھے۔ مگر
زمانے نے اُن سب کو بھلا دیا ہے۔

"پیامِ تعلیم" اس وقت پندرہ روزہ تھا
سلیمہ جس دلچسپی سے اب تم پیامِ تعلیم پڑھتی ہو

شاید اس سے کہیں زیادہ دلچسپی سے میں پڑھا کرتا تھا۔ "جامعہ" ماہوار شائع ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بڑے طالب علم ایک قلمی رسالہ "جوہر" شائع کرتے تھے۔ اس میں جامعہ کے حالات بھی ہوتے تھے۔ اس بات کو اب دس برس گذر گئے ہیں لیکن وہ باتیں اب تک یاد ہیں۔ میری پہلی درس گاہ! اور اب بھی اگر میں وہاں ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا یہ میری بدنصیبی ہے۔ سلیمہ۔ مجھے وہاں ضرور رہنا چاہئے تھا! سلیمہ تمھاری آنکھوں میں نیند آرہی ہے۔ جاؤ سو رہو۔ پھر کسی اور وقت میں تمھیں دوسری باتیں سناؤں گا۔

گھڑی نے ٹن ٹن کرکے دس بجائے، اور میرے بھائی اعجاز نے کہا:۔

چھوڑو بھی اب جانے دو
کیوں کرتے ہو، ایسی باتیں
کب آتے ہیں ایسے دن
اور کب آتی ہیں ویسی راتیں

"پرندوں میں زرافہ" یعنی گرے ہارن
اس کی گردن کوئی تین فٹ لمبی ہوگی۔

ٹکٹوں پر لڑائی

مسعود حسین خاں صاحب

لڑنے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے جس بات پر چاہیں لڑ جائیں۔ مگر پھر بھی شاید تمھیں یہ سُن کر تعجب ہو کہ کبھی کبھی ٹکٹ جیسی ذرا سی چیز پر بھی لوگ لڑ لڑ گئے ہیں۔ پیام بھائی تو سب سمجھ دار لوگ ہیں، امید ہے کہ یہ ٹکٹوں پر کوئی لڑائی مول نہ لیں گے اور اگر کچھ واقعات ایسے بھی سامنے رہیں جب ٹکٹوں پر لڑائیاں ہو ہو گئی ہیں تو شاید اور بھی احتیاط کرو۔ اچھا سنو۔

۱۸۹۵ء کا ذکر ہے کہ سوڈان میں ایک ٹکٹ نکلا، جس پر ایک شتر سوار کی تصویر تھی جو ڈاک لئے جاتا تھا۔ تصویر سب کو بھائی، مگر جھگڑا ڈھونڈنے والے تو کرید کرید کر بات نکالتے ہیں۔ یہ بھی پتہ لگا لیا کہ یہ ٹکٹ جس کاغذ پر چھپا ہے اس پر ایک کنول کے پھول کا " واٹر مارک " ہے جو کچھ کچھ صلیب سے ملتا ہے۔ واٹر مارک تو شاید تم جانتے ہی ہوگے۔ کاغذ بناتے وقت اس میں کچھ ایسے نشان ڈالے جاتے ہیں کہ یوں تو دکھائی نہیں دیتے روشنی کے مقابلے میں رکھ کر دیکھو تو دکھائی دیتے ہیں۔ ٹکٹوں اور نوٹوں کے کاغذ پر اکثر کوئی نہ کوئی واٹر مارک ہوتا ہے کہ ہر ایک آسانی سے کسی معمولی کاغذ پر چھاپ نہ لے۔ ہاں، تو اس سوڈانی ٹکٹ پر صلیب کا سا واٹر مارک تھا۔ اور صلیب عیسائیوں کا مذہبی نشان ہے۔ اس پر مصر اور سوڈان کے لوگ بہت بگڑے اور ڈاک خانوں پر چڑھ دوڑے۔ ہر جگہ بلوہ کی سی صورت پیدا ہوگئی تو حکومت نے مجبور ہو کر سب ٹکٹ تلف کر دئیے اور نیا ٹکٹ جس کاغذ پر چھاپا اس میں چاند اور تارے کا واٹر مارک رکھا۔ یوں معاملہ رفع دفع ہوا، نہیں تو خون خرابا ہوا ہی چاہتا تھا۔

اب ذرا امریکہ کا نقشہ تو نکالو۔ اس براعظم کے

[illegible]

ایتھوپیا کا ٹکٹ جو پولینڈ والوں کو چھاپا ہے۔
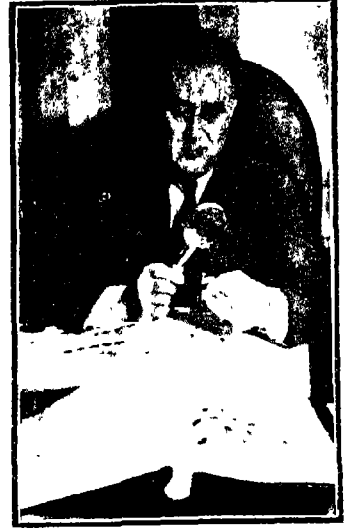
پیراگوئے اور بولیویا کے ٹکٹ جن سے چھ سال کی جنگ کا سلسلہ چلا۔
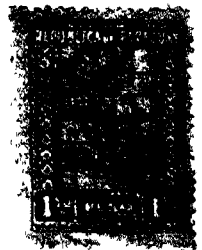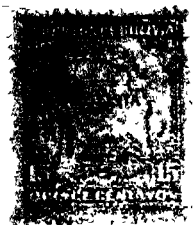
دو بڑے بڑے حصے ہیں، شمالی اور جنوبی۔ جہاں یہ حصے ملے ہیں وہاں دیکھو، مشرق کی طرف سمندر ہیں، جنوبی امریکہ کے اوپر شمال میں بہت سے جزیرے ہیں۔ ان ہی میں ایک جزیرہ ہے جس میں لکھا ہوگا سینٹو ڈومنگو اور ہائیٹی۔ جزیرہ ایک ہی ہے، مگر یہ دونوں الگ الگ جمہوریتیں ہیں ۱۹۰۰ء میں سنتو ڈومنگو کی حکومت نے ایک ٹکٹ جاری کیا جس میں پورے جزیرہ کا نقشہ تھا اور اس میں اپنی اور ہائیٹی کی سرحد کا نشان بھی دیا تھا۔ مگر یہ نشان بنا تھا ہائیٹی کے علاقہ میں بہت اندر کو ہٹا کر۔ یوں تو ہائیٹی ہے جزیرے کا کوئی آدھا، مگر اس ٹکٹ میں بس ذرا سا دُم چھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس ٹکٹ کا نکلنا تھا کہ ہائیٹی کی ننھی سی جمہوریت میں آگ ہی تو لگ گئی۔ فوجیں جمع کی جانے لگیں سرحد پر کسی جگہ بے ضابطہ جھڑپ بھی ہوگئی، اور بس سارا رنگ، جنگ کا سا پیدا ہوگیا۔ آخر کو ٹکٹ کی مہر بنانے والے نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور حکومت نے ٹکٹ کا چلن روکا تب جاکر امن ہوا۔

اس کے قریب کا ایک اور حال سنو۔ امریکہ کے دونوں بڑے بڑے حصوں کو جو پتلی سی زمین کی پٹی ملاتی ہے اس سے امریکہ کے جہازوں کو بڑی دقت ہوتی تھی، مشرق سے مغرب جانا ہو تو سارے براعظم کا چکر کاٹو۔ اس لئے کوئی ساٹھ برس ہوئے امریکہ والوں نے اس کی ٹھانی کہ اس پتلی سی پٹی میں سے ایک نہر نکالیں تاکہ جہازوں کو ادھر سے اُدھر جانے میں آسانی ہو جائے۔ اب اس نہر کا نام نہر پناما ہے۔ بھلا تم یقین کروگے کہ اس نہر کی قسمت کا فیصلہ بھی ایک ٹکٹ ہی نے کرایا؟ قصہ یہ ہوا کہ جب نہر بنانے کا فیصلہ ہو چکا تو طے یہ کرنا تھا کہ ٹھیک کس جگہ سے نہر نکالی جائے۔ اس پتلی سی پٹی میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں۔ ان میں ایک کا نام ہے نکاراگوا اور ایک کا پناما۔ ایک خیال یہ تھا کہ نہر نکاراگوا کے علاقہ میں سے نکلے، ایک یہ کہ پناما میں سے جائے۔ دونوں علاقوں کے لوگ اس کوشش میں تھے کہ نہر ہمارے یہاں سے نکلے۔ یہ کام بہت بڑا تھا اور خیال تھا کہ جس علاقہ میں ہوگا وہ مالا مال ہو جائے گا۔ فیصلہ پہلے نکاراگوا کے حق میں ہونے کو تھا کہ ایک دن صبح امریکن کانگریس کے ہر ممبر کے پاس ایک گمنام خط پہنچا جس کے لفافہ پر نکاراگوا کا سب سے نیا ٹکٹ چپکا ہوا تھا۔ اس ٹکٹ پر کئی آتش فشاں پہاڑ بنے تھے کہ یہ اس علاقہ کی خاص چیز ہیں! خط میں اس بات پر زور تھا کہ اس علاقہ میں سے نہر نکلی تو کیا عجب ہے کہ آتش فشاں پہاڑ اسے تباہ کر ڈالیں۔ بس کیا تھا، یکایک ہوا پلٹی، اور تصفیہ

یہی ہوا کہ ہزا بنا کے علاقہ میں سے نکال جائے۔

اب ذرا یورپ کا نقشہ کھولو۔ اس میں مشرق کی طرف بڑا سا ملک ہے، روس۔ اس کے شمال و مغرب کے کونے میں ایک چھوٹی سی ریاست ہے لتھوینیا۔ یہ علاقہ پہلے روس کا تھا، مگر بڑی جنگ کے بعد اس طرف کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں الگ بن گئیں۔ ان ہی میں ایک لتھوینیا بھی ہے۔ ۱۹۲۰ء میں پولینڈ نے ان کا خاص شہر ولنا اور اس کے قریب کا علاقہ دبا لیا۔ ابھی تک یہ شہر اور اس کے آس پاس کا علاقہ پولینڈ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مگر لتھوینیا والے اسے بھولے نہیں ہیں۔ اور ابھی ایک ٹکٹ نے تو تعلقات بہت ہی کشیدہ کر دیئے ہیں۔ یہ ٹکٹ ہوائی ڈاک کے لئے ۳۲ء میں چھپا ہے۔ اس کے بیچ میں لتھوینیا کا ایک نقشہ ہے۔ ولنا والے علاقہ کو بھی اس نقشہ میں دکھایا ہے، اگرچہ رنگ ذرا بدل کر۔ آس پاس جو پڑوسی ہیں سب کا نشان دیا ہے لٹ لینڈ ہے، جرمنی ہے، روس ہے، مگر نہیں ہے تو پولینڈ نہیں ہے! گویا کہ پولینڈ کا ہونا ہی تسلیم نہیں! اس ٹکٹ سے پولینڈ والے بہت جلتے ہیں اور جب سے چھپا ہے دونوں ملکوں میں اور بھی ٹھن سی گئی ہے۔ اگر کبھی یہ دونوں ریاستیں لڑیں جس کا بہت کچھ امکان ہے تو جنگ کے اسباب میں یہ ننھا سا ٹکٹ بھی ہوگا۔

اچھا اب ذرا جنوبی امریکہ کا نقشہ کھولو۔ اس میں دو ریاستیں نکالو، بولیویا اور پاراگوے۔ ان دونوں میں ۱۹۲۰ء سے جنگ تھی اور کوئی چھ برس رہی۔ ابھی پچھلے سال معاملہ چکا ہے۔ بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ ان دونوں کی سرحد سے ملا ہوا ایک علاقہ ہے "گران چاکو" یا "ہری دوزخ" کہتے ہیں۔ اس کا جنوب مغرب والا حصہ تو ارجن ٹائن کا ہے، شمالی حصہ ۱۸۹۵ء میں پاراگوے اور بولیویا میں آدھا آدھا بٹ گیا تھا۔ پچھلے دنوں دونوں نے اس پر اپنا اپنا قبضہ جمانا چاہا۔ اور چھیڑ پاراگوے کی حکومت کی طرف سے یوں ہوئی کہ ۱۹۲۷ء میں اس نے ایک ٹکٹ چھاپا جس پر پاراگوے کا نقشہ تھا اور اس میں چاکو کے سارے علاقہ کو اپنی مملکت جتایا تھا۔ بس کیا تھا۔ بولیویا والے آپے سے باہر ہوگئے۔ چند ہی دن بعد بولیویا نے بھی ایک ٹکٹ چھاپا اور اس میں اپنا نقشہ دیا اور سارے چاکو کے علاقہ کو اپنی حد میں کرکے دکھایا۔ یوں پہلے تو ٹکٹوں ہی پر یہ جھگڑا ہوتا رہا، مگر ہوتے ہوتے میدان جانے کی نوبت آگئی اور کوئی چھ سال تک یہ جنگ چلتی رہی۔ اور یہ سب کچھ بس ان ذرا سے ڈاک کے ٹکٹوں پر ہوا۔

ہمارے دیس کے پرند

بیے کی جھونجھ

از جناب سالم علی صاحب دہرہ دون
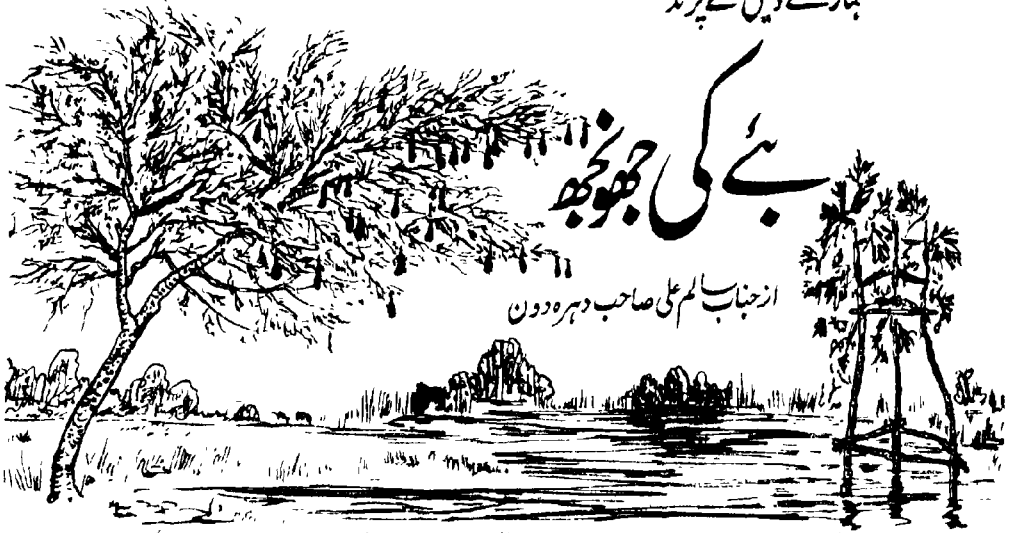
یہ اچھا اور دلچسپ مضمون ہماری درخواست پر جناب سالم علی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے، آپ کو پرندوں کی زندگی کی تحقیق کا خاص شوق ہے اور اس سلسلے میں آپ بہت کچھ کام بھی کر چکے ہیں۔ یہ مضمون آپ کی محنت اور تحقیق کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ مضمون سے متعلق تصویریں بھی سالم علی صاحب نے مرحمت فرمائی ہیں۔ ان میں سے چند کے بلاک چھپ رہے ہیں۔

اصل مضمون انگریزی میں تھا۔ ترجمے پر نظر ثانی جناب صاحبزادہ سعید الظفر صاحب (ام۔ ڈی) نے فرمائی ہے۔ ہم دونوں بزرگوں کی توجہ اور نوازش کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں

ایڈیٹر

ہمارے ملک کی گھٹی میں یہ زہر ملا ہوا ہے کہ ہر چیز جاندار یا بے جان کی قیمت اس طرح لگائی جاتی ہے کہ گویا وہ خرید و فروخت کا مال ہے اور روپے آنے پائی سے اسکا مول تول ہو سکتا ہے۔ مثلاً تعلیم ہی کو لو۔ اس کا اندازہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ جب تک تعلیم (جس کا آخری معیار عام خیال میں یونی ورسٹی کی ڈگری ہے) کلرکی تحصیلداری یا خوش قسمتی سے ڈپٹی کلکٹری کے حاصل کرنے میں مدد نہ دے لاحاصل سمجھی جاتی ہے۔ جب خدا کے فضل سے ایک شخص اپنی کچی گندی اور اندھیری کوٹھری کے سامنے آٹا دال باندھ سوتلی، کاٹ کباڑ رکھ کر پیٹ پال سکتا ہے۔ چاہے وہ الف۔ بے بھی نہ جانتا ہو تو اس کا لڑکا اور اس کے بعد اس کا پوتا کوئی دوسرا (یعنی پڑھنے لکھنے کا) راستہ کیوں اختیار کرے۔

جب ایک طرف تو لازمی ابتدائی تعلیم کا معقول انتظام نہ ہو اور دوسری طرف خود ہمارے خیالات اسقدر پست ہوں تو قدرت کے عجائبات سے واقفیت

حاصل کرنے کا خیال (جو یورپ کے ملکوں میں ابتدائی تعلیم کا ضروری جزو سمجھا جاتا ہے) ہمارے اسکولوں اور گھروں میں اسقدر عنقا ہے تو تعجب کی کیا بات ہے ظاہر ہے کہ نباتات یا جانوروں کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے آمدنی کی بہت کم امید ہوسکتی ہے تو پھر ان کی تحقیق اور چھان بین میں کیوں پسینہ بہایا جائے۔ کیوں وقت کھویا جائے۔ جانور جو کچھ کرتے ہیں ان کا فعل ہے ہمیں اس سے کیا بحث کہ وہ کیا کرتے ہیں اور کس طرح کرتے ہیں۔

پھر بھی اس جہالت اور پست ذہنیت کی تاریکی میں کچھ کچھ کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ سمجھ دار لوگوں میں اس کی ضرورت کا احساس پیدا ہو رہا ہے۔ قدرتی زندگی کی تحقیقات کی طرف ہمارے ماہرین تعلیم کی توجہ بھی ہوتی جاتی ہے اور اسے اسکولوں میں جاری کرنے کی کوشش بھی تھوڑی بہت ہوئی ہے۔

یہ بالکل یقینی بات ہے کہ بچے کی طاقت بڑھانے "کیا اور کیوں" کی سوتی ہوئی قوت کو جگانے اور تحقیق وجستجو کا شوق جاری رکھنے کے لئے کوئی تعلیم مطالعہ قدرت کی برابری نہیں کرسکتی

ہر مبتدی یعنی شروع کرنے والے کے سامنے قدم قدم پر نئے سوال آتے ہیں۔ ان کے حل کرنے کا راستہ بغیر کسی استاد یا کتاب کی مدد کے رفتہ رفتہ اپنے ذاتی مشاہدے سے وہ خود ہی معلوم کرسکتا ہے۔

پرندوں کی زندگی کی تحقیقات ہمارے ملک میں مطالعہ قدرت کی سب سے دلچسپ تحقیقاتوں میں سے ہے۔ ہندوستان کے پرندوں کی افراط اور قسموں کا مقابلہ بہت کم ملک کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک کے اُور چھور میں ہر قسم کا موسم، سماں اور فضا موجود ہے، ایک طرف ہمالیہ کی برفانی چوٹیاں ہیں، اور دوسری طرف ریگستان کے لق ودق میدان یا آسام، کناڈا اور ٹراونکور کے سینکڑوں برس کے پرانے گنجان اور مرطوب جنگل ہیں اس لئے ہر قسم کے پرند ملک کے کسی نہ کسی خطے کو اپنی ضرورت کے مطابق پا سکتے اور اُسے اپنا گھر بنا سکتے ہیں۔

ہندوستانی پرندوں کی تحقیقات کا ابتدائی شکل کا کام بہت کچھ اور عمدہ طریقے پر ہوچکا ہے۔ اور شرم کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا کا سارا یورپ کے لوگوں نے اپنے عارضی قیام کے زمانے میں کیا ہے۔ اور اب بہت سی اچھی اچھی مستند کتابیں مبتدی کی مدد کے لئے موجود ہیں

نر کام کر رہا ہے

بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ ہماری زبان میں
تک کوئی مستند تصویروں والی کتاب نہیں
کتاب جس کی قیمت اوسط درجہ کے
بار نہ ہو۔ ایسی کتابوں کی کمی کی ایک
ہے کہ رنگین تصویروں کی چھپائی بہت
ایک چینی مقولہ ہے کہ ایک تصویر
لفظوں کے برابر ہے۔ پرندوں کے
حق کوئی کتاب بغیر تصویروں کے بالکل ایسی
ہی ہے جیسے ریگستان میں کھاری کنؤاں۔ اس
وقت پرندوں پر سب سے اچھی کتاب

Whistler's
Popular Handbook
of Indian Birds.

ہے۔ یہ مبتدی یا عالم، ہر شخص کے لئے مفید
ہے۔ اس میں بہت سی تصویریں ہیں اور کئی
ایک رنگین ہیں۔ بمبئی کی نیچرل ہسٹری سوسائٹی

Natural History Society.

خیال ہے کہ بہت جلد ایسی ہی ایک کتاب شایع کرے
جس سے یہ کمی بہت کچھ پوری ہو جائے گی۔ اس میں
کوئی ۱۰۰ تصویریں اور اُن پرندوں کا ذکر ہوگا، جو
ہندوستان کے مختلف حصّوں میں دیکھنے میں آتے ہیں
اگرچہ ہندوستان کے مختلف پرندوں پر بہت کچھ مواد
جمع ہو چکا ہے پھر بھی الگ الگ ایک ایک پرندے
کی زندگی کی تحقیقات میں ابھی تک بہت کچھ گنجائش ہے
یہ ایسا کام ہے جس میں ہم سب کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا سکتے ہیں
بس ذرا تحقیقات کا شوق اور اس سے بھی زیادہ ہمت

اور استقلال کی ضرورت ہے۔ وقت کا سوال بھی اہم
ہے۔ مثال کے طور پر ہم نیچے بئے کا حال لکھتے ہیں۔
اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا کہ ہر شخص جس میں شوق
ہمت اور استقلال ہو اس کام میں کسقدر اور کس طرح
مدد دے سکتا ہے۔

اونچے اونچے پہاڑوں کو چھوڑ کر ہندوستان میں ہر
جگہ لوگ بیا اور اس کی عجیب حقہ نما جھونجھ کو پہچانتے
ہیں۔ یہ گھونسلے ایک ہی جگہ دس سے لے کر پچاس
تک عموماً دیہاتی علاقہ کے درختوں کی شاخوں سے

بسا اوقات تالاب، چشموں یا کچے کنوؤں کے قریب لٹکتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

یہ چڑیا چھوٹی اور ہماری گھریلو گرگریا یا گوریا سے مشابہ ہوتی ہے مگر یہ مشابہت سال میں نو مہینے کے لئے ہے اور اس کو کام کاج کی زندگی کا میلا کچیلا لباس سمجھنا چاہئے۔ برسات کا موسم شروع ہونے اور گھر بنانے سے پہلے اس کی ہیئت اسقدر بدل جاتی ہے کہ پہچان مشکل ہے۔ سر پہ زعفرانی کلاہ۔ پشت اور سینہ کی زعفرانی صدری کی چمک گالوں اور گلے کے لاکھی رنگ سے جس کا ٹیکہ آنکھ تک جا ملتا ہے اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے اور اب اس چڑیا کی شان ایک بانکے رنگیلے چھیلا کی سی ہوتی ہے۔ البتہ مادہ کا لباس جیسا کنوارپن میں ہوتا ہے ویسا ہی ہمیشہ رہتا ہے۔

اس تنکے بننے والے کے کرتوت جو گھر گرستی کے سامان مہیا کرنے یا بیوی بچوں کے رکھ رکھاؤ کے متعلق پرانے لکھنے والوں نے اپنی کتابوں میں جمع کئے تھے اور بعد کو ایک کتاب سے دوسری کتاب میں کنبہ نقل ہوتے چلے آتے تھے خیالی پلاؤ ثابت ہوئے میرے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے جو میں نے کئی سال متواتر کئے ان کے مطابق نہیں پائے گئے۔
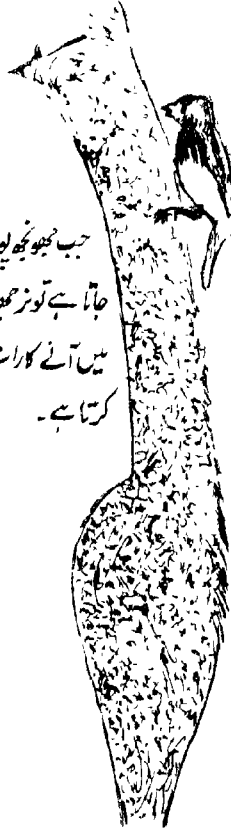
جب جھونجھ پورا بن جاتا ہے تو نر جھونجھ میں آنے کا راستہ لمبا کرتا ہے۔

میں ایک مرتبہ ایسی جگہ ٹھہرا جس کے قریب بیوں نے کئی جگہ گھونسلے بنانا شروع کر دیئے تھے۔ میں نے ارادہ کیا کہ ان بیوں کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ اور ان باتوں کا فیصلہ کروں جن کے متعلق مجھے شک تھا میں نے سیڑھی کی طرح کا ایک مچان تیار کرایا جو تقریباً دس فٹ اونچا تھا۔ اس پر بیٹھ کر تاڑ کے پتوں اور شاخوں کو چاروں طرف لگا کر چھپ سکتا تھا۔ اس طرح ان جانوروں کو بغیر بھڑکائے دیکھ سکتا اور تصویریں لے سکتا تھا۔ اس سیڑھی نما مچان کو تالاب میں ان بیوں کے قریب گاڑ دیا گیا۔ جہاں میری پہچانی ہوئی نئی آبادیاں تھیں اور جہاں ان کے گھونسلے مچان سے صرف پندرہ فٹ پر بنائے جا رہے تھے تین مہینے تک میں یہاں دو تین گھنٹے برابر چھپا رہتا تھا اور جو کچھ ہوتا تھا اُسے نوٹ کرتا جاتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ دو تین اور نئی آبادیاں مختلف مقامات پر میری نظر میں تھیں اور ان کی حرکات کا مقابلہ اس مقررہ نئی آبادی سے کرتا رہتا تھا۔ اس طرح جب انڈے بچوں کا زمانہ ختم ہوا تو تقریباً ستر گھنٹے پہرے پر رہکر ہر حرکت کو جھانک جھانک کر دیکھ کر عکسی تصویریں اور دستی نقش کھینچ کر یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچا کہ جو تفصیلی حالات اس پرندے کے متعلق کتابوں میں درج ہیں صحیح نہیں ہیں۔ ساتھ ہی ایسی باتیں بھی معلوم ہوئیں جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ان معلومات کا مشاہدہ بار بار کیا گیا ہے اور ان میں
ردو بدل کی ضرورت آج تک پیش نہ آئی ۔
وقت اور جگہ کی کمی کے سبب یہ حالات تفصیل
سے تو بیان نہیں ہو سکتے ہاں مختصر طور پر سُن لو
برسات شروع ہوتے ہی جب گھاس
یا دھان کے کھیت دس بارہ انچ بڑھ جاتے ہیں
تو بئے ایک گروہ میں اپنے چہکتے ہوئے شادی کے
جامے میں کوئی درخت معمولاً ببول۔ بیری یا تاڑ پسند
کرتے ہیں اور بڑی شاخوں کے سروں یا ان چھوٹی ڈالیوں
پر جہاں سے کونپلیں پھوٹتی ہیں گھونسلے بنانا شروع کر دیتے
ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کسی خاص درخت کو کیوں پسند
کیا جاتا ہے اور باوجودیکہ بئے کو غنیم جانوروں کا علم ہے
پھر بھی معلوم نہیں کہ یہ گھونسلے زیادہ تر ایسی شاخوں پر کیوں
بنائے جاتے ہیں جو پانی پر لٹکتی رہتی ہیں۔ عموماً دیکھا گیا
ہے کہ ایک ہی جگہ کئی سال گھونسلے بناتے ہیں۔ مگر پرانے
گھونسلوں کی مرمت کے بعد دوبارہ ان کا استعمال بہت
کم دیکھنے میں آیا ہے۔ یہ گھونسلے تیز ہوا کے رُخ کو بچا کر
بنائے جاتے ہیں۔ گھونسلوں کے لئے جگہ پسند کرنے کے
بعد نر بیوں کے جھنڈ اُڑ کر کسی قریب کے دھان کے
کھیت میں بار بار پہنچتے اور وہاں سے گھونسلا
بنانے کا سامان لاتے ہیں۔ ہر نر دھان کی علیحدہ
علیحدہ بالی پر پھنگی سے تقریباً ۱۸ انچ نیچے بیٹھتا ہے اور چونچ
سے اس کی پتی میں اتنا گہرا کھانچا دیتا ہے جتنی موٹی دھجی کی
ضرورت ہو۔ اس کے بعد گردن کے جھٹکے سے کھینچ کر اس دھجی
کو تھوڑی دور تک بڑھاتا ہے پھر اسی طرح دوسرا اور تیسرا
کھانچا پہلے کھانچے کے نیچے دے کر دھجیاں تھوڑی اور
لانبی کھینچ لیتا ہے۔ اب آخری دھجی کے کھانچے
کو چونچ میں دبا کر اپنے اور ساتھیوں کے
ساتھ نئی آبادی کی طرف آتا ہے۔ اُڑنے
سے سب دھجیاں بالی سے کھنچ کر اور علیحدہ
ہو کر پرندے کے ساتھ پنچھلے کی طرح اُڑتی
چلی جاتی ہیں۔ یہ پرند ملنسار ہیں۔ کام اور تفریح دونو
ساتھ کرتے ہیں۔ جتنے پرند دھجیاں کھینچ لائے ہیں وہ اب
اپنی اپنی جھونجھ بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان کی
چونچ اور پنجے گوندھنے میں خوب پھرتی اور کاریگری دکھاتے
ہیں۔ وقتاً فوقتاً ایک نر باز و پھٹ پھٹا کر چٹ چٹ کا
عاشقانہ نغمہ شروع کر دیتا ہے۔ فوراً ہی اور سب بھی اس
نغمے کا ساتھ شدومد سے دیتے ہیں اور یہ چی۔ ی۔ ی
ی پر ایسے زور کے ساتھ ختم ہوتا ہے کہ دور تک سُنائی
دیتا ہے۔ جہاں پر نئی آبادی قایم ہو گئی ہو وہاں جوش و
خروش اور خوشی کے چہچہے بس دیکھنے اور سننے سے
تعلق رکھتے ہیں تم کبھی دیکھ لو تو کبھی دل سے نہ بھلاؤ۔

جب گھونسلا بننا شروع ہوتا ہے تو مادین بیوں
کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ مگر جیسے ہی آدھی کے قریب تیاری
ہو چکتی ہے دلچسپ واقعات دیکھنے میں آتے
ہیں۔ اچانک صبح سویرے ایک مادہ آ دھمکتی
ہے۔ کبھی کبھی مادینوں کا ایک جمگھٹ آ جاتا ہے۔ اب
تک بے غرض علیحدہ علیحدہ پھرتی تھیں مگر اب انڈوں
کی خواہش نے بیتاب کر دیا اور مناسب جگہ ڈھونڈنے
اسطرف آ پہنچیں۔ ان کے نازل ہوتے ہی نروں میں

ایک نئی ہل چل مچ جاتی ہے اور بہت سے نر کام چھوڑ چھاڑ ان خاتونوں کو لبھانے کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھُدکتے پھرتے ہیں۔ اور دلچسپ نغمے بازو پھٹ پھٹا کر سناتے جاتے ہیں۔ مادینوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے آپس میں بڑا مقابلہ رہتا ہے اور کامیابی غالباً چونچوں کی تیزی یا خوش گلوئی (اچھی آواز) پر ہوتی ہے۔ مگر مادینوں پر بظاہر اس جوش و خروش کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ ہر مادین بلاتکلف ایک ایک گھونسلے کو اندر اور باہر سے جانچتی ہے۔ کوئی گھونسلا پسند آ گیا تو بغیر کسی سے پوچھے گچھے قبضہ کر لیتی ہے اور گھونسلے کے ساتھ بنانے والا بھی اس کا ہو جاتا ہے اب میاں بیوی مل کر گھونسلا مکمل کرتے ہیں۔ میاں باہر کام کرتا ہے اور بیوی اندر کا حصّہ سجاتی ہے۔ گھونسلا مکمل ہوتے ہی انڈے دید ئے جاتے ہیں۔ اور مادہ انڈے سینے بیٹھ جاتی ہے۔ نر انڈوں پر نہیں بیٹھتا بلکہ جیسے ہی ایک مادہ کو انڈوں پر بٹھا دیتا ہے دوسرا گھونسلا بنانا شروع کر دیتا ہے اور مکمل ہونے سے پہلے دوسری مادہ کو لبھانے کی فکر کرتا ہے اس طرح ایک نر تین چار ماداؤں کو گھونسلوں میں بٹھا دیتا ہے۔ چنانچہ نئی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ برخلاف پُرانے خیال کے بیا کئی بیویاں کرتا ہے۔ یعنی دو سے چار تک۔ مگر ایک مادہ کا گھر بنا کر اور اُسے آرام سے انڈوں پر بٹھا کر دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جب تک آرام و آسائش کا سامان پورا نہ ہو جائے نئی بیوی نہیں ملتی۔

کبھی کبھی مادینیں دو دو تین تین گھونسلوں میں اندر جاتی اور باہر نکل آتی ہیں اور آخر کسی تیسرے چوتھے گھونسلے میں جا کر بیٹھ جاتی ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے کے گھونسلے انہوں نے ناپسند کر دئے اس ناپسندیدگی کی وجہ گھونسلے میں کوئی نقص یا خرابی ہوتی ہے جسے ہم غور سے دیکھ کر بھی معلوم نہیں کر سکتے۔ نئی آبادیوں میں ایسی بہت سی جھونجھیں نامکمل رہ جاتی ہیں۔ اکثر انھیں توڑ کر نیچے کو پھینک دیتے ہیں اور کبھی یہ اپنی قسمت پر چھوڑ دی جاتی ہیں اور نر انھیں چھوڑ کر نئی جھونجھ بنانے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔ پُرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ جھونجھ اپنے آرام کے لئے بناتے ہیں جہاں وہ رات کو سوتے یا بارش سے پناہ لیتے ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ نر بئے رات کو نئی آبادی میں کبھی بسیرا نہیں لیتے بلکہ اس سے بہت فاصلے پر یہاں تک کہ کبھی کبھی میلوں دُور لانبی گھاس یا نرکل میں ہزاروں کی تعداد میں جا رہتے ہیں مادائیں انڈوں پر بیٹھ جاتی ہیں تو وہ اس نئی آبادی میں تنہا رہنا پسند کرتی ہیں۔

آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ بیّوں کی کہانیوں میں جن پر شاعر یا خیالی پُلاؤ پکانے والے دل دادہ ہیں۔ یہ داستان بھی محض خیال ہی خیال ہے کہ بئے جگنو پکڑ کر اپنے گھروں کو ان سے روشن کرتے ہیں۔ کیونکہ مرے ہوئے جگنوؤں میں روشنی نہیں رہتی اور اگر (جیسا کہ خیال ہے) یہ جگنو گیلی مٹی سے جھونجھ کے اندر چپکائے جائیں تو جلد مر جائیں۔ ان کی حالت تو اس بیٹری کی ہوگی جس کی بجلی ختم ہو چکی ہو۔ مٹی جھونجھ میں ضرور پائی جاتی ہے۔ مگر جو بات اب تک مشاہدے میں نہ آئی اُسے واقعے کے طور پر پیش کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا ✤

میرا بچپن

از حضرت جوشؔ ملیح آبادی مدظلہٗ

ہر چند ہے اب عمر کی چونتیسویں منزل
وہ دن ہیں نہ وہ رات، نہ وہ سن ہے نہ وہ دل
یاد آتا ہے اب بھی مجھے لیکن وہ زمانہ
جس وقت سفر کے لئے ہوتا تھا روانہ
ڈیوڑھی کی طرف سر دہ جھکائے ہوئے چلنا
جاتے ہوئے قرآن کے نیچے سے نکلنا

بچپن کی یاد

دوڑا یوں دیکھ کر مجھے سجّاد[1]	جیسے چھوٹے کڑی کماں سے تیر
آکے زانو پہ میرے بیٹھ گیا	اور کچھ اس طرح سے کی تقریر
بھر گئی جوشؔ میری آنکھوں میں
اپنے مرحوم باپ کی تصویر

[1] سجاد میرے لڑکے کا نام ہے

از جناب ڈاکٹر سعید صاحب بریلوی

کھانے کا نام آتے ہی بہت سے صاحب زادوں کے منہ میں پانی بھر آیا ہوگا۔ بعضوں کو ایسا معلوم ہوا ہوگا کہ منہ میں حلوا سوہن یا بالوشاہی کی ڈلی آگئی۔ بعض کو دہی بڑوں کا یا کچالووں کا ذائقہ محسوس ہونے لگا ہوگا۔ اور بعض کو قورمے بریانی یا پوری کچوری کی خوشبو آنے لگی ہوگی بدقسمتی سے اس کاغذی دسترخوان پر تمھارے لئے میں اس قسم کے کھانے چننے سے تو معذور ہوں البتہ اتنا کرسکتا ہوں کہ تمھیں یہ بتادوں کہ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے اب تک جو تجربے کئے ہیں اُن کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ اور اُن کی رائے میں کس قسم کی غذا اچھی ہے۔ اور کون سی بُری۔

تم یہ ضرور کہوگے کہ ان کمبخت بے وقوف اور بدمذاق ڈاکٹروں کی بات کا کیا اعتبار۔ وہ تو آدمی کو کونین جیسی کڑوی اور ارنڈی کے تیل جیسی بدذائقہ دوائیں کھلایا اور پلایا کرتے ہیں۔ لیکن ہر چیز جو ظاہر میں کسی قدر بُری نظر آتے اُسے بُرا ہی نہ سمجھ لینا چاہئے۔ یہ بے وقوف ڈاکٹر بھی بعض بائیں کام کی بتادیتے ہیں۔ مثلاً اگر وہ تمھیں یہ بتادیں کہ اس قسم کی غذائیں کھانے سے زیادہ تندرست زیادہ موٹے تازے اور زیادہ خوش رہ سکتے ہو اور اپنے ساتھیوں میں سے بہتوں کو اپنی طاقت سے نیچا دکھا سکتے ہو تو یہ تو ضرور ایک کام کی بات ہے اسی طرح اگر وہ یہ بھی بتادیں کہ کون کون سی غذائیں تمھارے لئے فضول ہیں اور کم زور کرتی ہیں اور

تمھارے بدن میں اتنی طاقت نہیں چھوڑتیں۔ کہ تم بیماری کا مقابلہ کر سکو جس کی وجہ سے تم رات دن بیمار رہتے ہو۔ تو یہ بھی ایک اچھی ہی بات ہوگی اس لئے مناسب ہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بد مذاق لوگوں کی بات بھی سُن لی جائے۔ کان میں پڑی ہوئی بات، جیب میں پڑا ہوا پیسا اور پیٹ میں پڑی ہوئی روٹی کبھی نہ کبھی کام آ ہی جاتی ہے۔

تم میں سے اب اکثر کی یہ خواہش ہوئی ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ بعض نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ دُعا مانگنے کے لئے اُٹھا بھی دئے ہوں گے کہ "اللہ کرے ڈاکٹر صاحب مٹھائیوں اور پھلوں، اور چاٹ کو اچھا بتائیں۔ تو پھر ہم روز ابا جان سے ان چیزوں کے لئے پیسے لیا کریں اور خوب کھایا کریں" مگر بھائی بات یہ ہے کہ تم سب میں آپس میں اتفاق نہیں ہے کوئی مٹھائی پسند کرتا ہے، کوئی پھل، کوئی پلاؤ، اور کوئی خستہ کچوریاں۔ اور پھر پھلوں اور مٹھائیوں میں بھی اختلاف موجود ہے۔ کسی کو آم اچھے لگتے ہیں۔ کسی کو انگور پسند ہیں اور اسی طرح کسی کو جلیبیاں بھاتی ہیں اور کسی کو گلاب جامنیں۔ یہ بھی دیکھا ہے کہ امرتیاں ایک شخص کو تو بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں اور دوسرا اُن سے اس قدر چڑتا ہے کہ اس کے سامنے اگر اُن کا نام لے دیا جائے تو مارنے کو دوڑتا ہے۔ ایسی حالت میں کسی پھل یا مٹھائی کے متعلق اگر یہ کہہ بھی دوں کہ وہ بہترین غذا ہے تو اس سے سب لوگ تو خوش نہیں ہو سکتے اس لئے یہ مناسب ہوگا کہ مختلف مقامات کے لوگ جس قسم کی غذائیں کھاتے ہیں۔ ان کے متعلق تمھیں یہ بتا دیا جائے کہ فلاں صوبے یا فلاں مُلک کے آدمی جو غذائیں کھاتے ہیں وہ وہ اچھی ہیں۔ اس میں پھر تمھاری پسند کی بھی ساری چیزیں آ جائیں گی۔

ایک بہت بڑے ڈاکٹر ہیں میجر جنرل مکاریسن، وہ ایک مدت سے یہی تجربے کر رہے ہیں کہ انسان کی پرورش کے لئے کون سی غذائیں زیادہ اچھی ہیں۔ ہزارہا چوہے اور خرگوش انھوں نے پال رکھے ہیں اور بیس بیس چوہوں کی جماعت بنا کر انھیں الگ الگ پنجروں میں رکھا ہے۔ ایک پنجرے کے بیس چوہے گویا ایک ملک یا ایک

صوبے کے انسان ہیں۔ تجربے کے لئے تمام چوہے ایک ہی نسل کے اور ایک سی عمر کے لئے جاتے ہیں۔

اب سارے تجربوں کا حال تو میں کہاں تک سناؤں۔ انھوں نے ایک تجربہ یہ کیا تھا کہ بیس چوہے ایک پنجرے میں رکھے اور انھیں معمولی انگریزی خوراک دینی شروع کی۔ معمولی سے یہ مطلب ہے کہ ایسی خوراک جو انگلستان کے غریب آدمی کھاتے ہیں۔ اس خوراک میں یہ چیزیں شامل تھیں:۔ میدے کی ڈبل روٹیاں مصنوعی مکھن جسے مارگیورین کہتے ہیں۔ تیز میٹھی چاہ جس میں بہت ذراسا دودھ ہو، ابلی ہوئی بندگوبھی، اُبلے ہوئے آلو، ٹین کے ڈبوں میں بند ہوکر جو بکتا ہے وہ گوشت اور سستے قسم کے مربے اسی طرح اسی نسل اور اسی عمر کے بیس چوہے لے کر انھیں دوسرے پنجرے میں رکھا اور انھیں وہ خوراک دی جو شمالی ہندوستان خاص کر پنجاب میں عام طور پر کھائی جاتی ہے۔ اس خوراک میں یہ چیزیں تھیں:۔ چپاتی روٹیاں، دالیں سبز ترکاریاں اور دودھ۔

دیکھنا یہ منظور تھا کہ انگریزی خوراک کھانے والے چوہے زیادہ تندرست رہتے اور موٹے تازے ہوتے ہیں۔ یا ہندوستانی خوراک کھانے والے آپ سب اپنے دل میں یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ انگریزی خوراک والے چوہے زیادہ تندرست اور موٹے ہو گئے ہوں گے کیوں کہ آپ روزمرہ دیکھا کرتے ہیں کہ انگریز عام طور پر موٹے تازے اور تندرست ہوتے ہیں۔ لیکن چوہوں کو وہ غذا نہیں دی گئی تھی جو ہندوستان میں رہنے والے انگریز کھاتے ہیں۔ انھیں تو وہ غذا دی تھی جو انگلستان کے غریب آدمی کھاتے ہیں۔ خیر! اب نتیجہ سنو۔

دیکھا یہ گیا کہ ہندوستانی خوراک والے چوہے شروع ہی سے بہت خوش و خرم۔ بہت تندرست اور بہت کھلاڑ نظر آئے۔ ان کے جسم خوب موٹے ہو گئے۔ قد بھی جلدی سے بڑھ گئے اور بدن کی کھال خوب چمکنے لگی۔ اُن میں آپس میں کبھی لڑائی بھی نہ ہوتی تھی۔ اور نہ ان میں سے

کوئی بیمار ہوتا تھا۔ ان میں سے صرف ایک چوہا تو ایک اتفاقی حادثے سے مرگیا۔ اور دو چوہوں کو سردی کی وجہ سے نیومونیا ہوگیا، کیوں کہ انھیں اوڑھنے بچھانے کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔

انگریزی خوراک والوں میں یہ بات دیکھی گئی کہ ان کا وزن نہیں بڑھتا تھا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ ان کا بدن ویسے کا ویسا ہی رہا اور وہ موٹے نہ ہوئے۔ اُن کے قد بھی چھوٹے چھوٹے رہ گئے اُن کے بدن بھی خوب صورت اور سڈول نہ ہوسکے۔ اُن کی کھال پر ذرا بھی چمک نہ تھی کھال خشک اور کھردری سی ہوکر رہ گئی تھی، چند ہی روز گذرے تھے کہ وہ چڑچڑے اور بدمزاج بھی ہوگئے۔ اور کھانا دینے والے خدمت گاروں کو کاٹنے لگے۔ آپس میں بھی اُن کے تعلقات اچھے نہ رہے۔ روز لڑائیاں رہتی تھیں اور ساٹھویں دن تو یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ جو سب سے کم زور تھا اسے باقی سب نے مل کر مار ڈالا اور کھا گئے اب روز یہی ہونے لگا کہ جو کم زور ہوتا وہ نوش کرلیا جاتا۔ ڈاکٹر مکاریسن نے جب یہ حالت دیکھی اور تین چوہے اس طریقے پر پیٹ میں پہنچ گئے۔ تو مجبوراً باقیوں کو انھوں نے الگ الگ پنجروں میں رکھا۔

ایک سو نوے دن یعنی چھ مہینے سے کچھ زیادہ دنوں تک یہ تجربہ جاری رہا۔ اس کے بعد دونوں جماعتوں کے چوہوں کو مار ڈالا گیا اور اُن کی لاشوں کا بغور معائنہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانی خوراک والے چوہوں میں سے ایک کو بھی اعصاب کی سوزش کا مرض نہیں ہوا تھا اور انگریزی خوراک والوں میں اس کے دو مریض تھے یہ بیماری اس بات کی خاص علامت ہوتی ہے کہ غذا میں ایسی چیزیں کم ہیں جن سے بدن کی پرورش ہوتی ہے۔ پھیپھڑوں کی بیماری میں بھی جتنے ہندوستانی چوہے مبتلا تھے اُن سے دگنے انگریزی چوہے مبتلا تھے۔ پیٹ کی بیماری ہندوستانی چوہوں میں بالکل نہ تھی۔ انگریزی چوہوں میں اس کی بھی کثرت تھی۔

ڈاکٹر مکاریسن نے اس قسم کا تجربہ کرکے

شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کی خوراک کا مقابلہ کیا تھا۔ جنوبی ہندوستان میں مشین کا بنا ہوا چاول کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ اس تجربے میں بھی یہی دیکھا گیا ہے کہ جنوبی ہند کے چوہوں کی قریب قریب وہی حالت ہوئی جو انگریزی چوہوں کی ہوئی تھی۔

مکاریسن نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انگلستان یا جنوبی ہندوستان میں جو غذا عام طور پر کھائی جاتی ہے اس سے بدن کی پرورش نہیں ہوتی۔ اور خاص کر پھیپھڑوں کی اور پیٹ کی بیماریاں ہوجاتی ہیں۔ شمالی ہندوستان میں جو غذا کھائی جاتی ہے۔ اس سے بدن کی پرورش بھی اچھی طرح ہوتی ہے۔ اور بیماریوں سے بھی بہت کچھ حفاظت ہوجاتی ہے۔

ان تجربوں سے ایک نتیجہ میں نے بھی نکالا ہے اور وہ یہ کہ اگر کافی غذا نہ ملے تو انسان چڑچڑا بدمزاج اور جھگڑالو، اور خونخوار ہوجاتا ہے۔ ہمارے ملک میں ہندو مسلمانوں کی آپس کی لڑائی کا اصلی سبب یہی ہے۔ کہ ہم بھوکے مرتے ہیں۔ اگر پیٹ بھر روٹی ملنے لگے تو یہ ساری لڑائیاں بند ہوجائیں

علی کمال زندہ باد

شیخ عطاء اللہ صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

خالدہ خانم کا نام تم نے سنا ہوگا۔ جامعہ ملیہ کی بدولت ہندوستان والوں کو ہمارے زمانے کی اس بے مثال عورت کی زیارت نصیب ہوئی۔ اُن کی زندگی کے حالات اور اُن کے بے شمار کمالات کے ذکر کا تو اس وقت موقع نہیں۔ تمھیں اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ انھوں نے انگریزی زبان میں ترکوں کے متعلق چند کتابیں لکھی ہیں۔ ایک کتاب کا نام ٹرکش آرڈیل ہے۔ میری خواہش ہے کہ ملک کا ہر بچہ اس کتاب کو غور سے پڑھے۔ یہ کتاب حقیقت میں موتیوں میں تولنے کے لائق ہے۔

اس میں خالدہ خانم نے بتایا ہے کہ ترکوں کی مٹھی بھر قوم نے کس طرح زبردست اور ظالم قوموں کے پنجے سے اس وقت رہائی پائی جب وہ ٹرکی پر قبضہ جما چکی تھیں۔ اور اسے فنا کرنے کے سب منصوبے پورے ہو چکے تھے۔

بچے کہانیاں پسند کرتے ہیں۔ دو چار برس پہلے میری دو کہانیاں پیام بھائیوں نے بہت پسند کیں وہ تو محض قصے تھے جو لوگوں نے بچوں کا دل بہلانے کو گھڑ رکھے ہیں آج تمھیں خالدہ خانم کی اس کتاب سے ایک سچا واقعہ سناتا ہوں اور سچ پوچھو تو اس ایک واقعے پر ساری الف لیلہ نثار ہے۔

یونانیوں نے ٹرکی پر زبردست حملہ کیا ٹرکی دم توڑ رہی تھی۔ دشمنوں کے نرغے میں پھنسی تھی۔ لیکن قوم کی غیرت زندہ تھی۔ اور قوم کا ہر شخص غلامی کی زندگی سے موت کو بہتر سمجھتا تھا

یونانی اپنی ایک بھاری بھر کم توپ ایک خاص مقام پر لے جانا چاہتے تھے۔ اتفاق سے راستے میں توپ بے کار ہوگئی اور مرمت کی ضرورت پیش آئی۔ یونانی فوج کے ساتھ اس وقت کوئی آدمی توپ کی مرمت کرنے والا موجود نہ تھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ قریب کے ایک شہر میں علی کمال ایک ترک انجینیر موجود ہے۔ سپاہی علی کمال کے پاس پہنچے اور اس سے کہا چل کر ہماری توپ درست کردو۔ علی کمال ترک تھا۔ یونانی ملک کے دشمن! علی کمال یا شا جانتا تھا کہ توپ کہاں رکھی جائے گی۔ یہ بھی اسے معلوم ہی تھا کہ یہ توپ وہ آگ برسائے گی کہ اس کے بھائی بندوں کو بھون ڈالے گی اور اس کے ملک کو غیروں کا غلام بنانے میں مدد دے گی۔ علی کمال کسی بہانے گھر سے بھاگ گیا۔ لیکن اپنے دوست کو اپنا پتہ بتا تا گیا۔ کہ اگر سپاہی اُس کی بیوی بچوں کو دق کریں تو اس کو اطلاع مل جائے۔ جب علی کمال کو معلوم ہوا کہ اس کے خاندان کو یونانیوں نے قید کر لیا ہے تو وہ جھٹ واپس پہنچا اور سپاہیوں سے کہا میری بیوی اور بچوں کو چھوڑ دو تو تمھاری ایک نہیں دس توپیں درست کر دوں گا۔ صرف اتنا ہی نہیں چلا کر بھی دکھا دوں گا۔ علی کمال پورے اطمینان سے بیوی بچوں سے رخصت ہوا۔ اس نے بیوی سے کہہ دیا کہ بچے کو اپنے باپ کے ہاں لے کر چلی جائے اور اس کا انتظار نہ کرے۔

توپ درست ہوئی، چلائی گئی۔ راستہ خراب تھا۔ یونانیوں نے کہا کہ توپ فلاں مقام پر پہنچ کر چلائی جائے گی اور جب وہاں ٹھیک رہے تو تمھیں جانے کی اجازت ہوگی۔ علی کمال نے کہا مجھے واپسی کی تو کچھ جلدی نہیں۔ میں بھی ذرا اپنی کاری گری کی داد چاہتا ہوں۔ مجھے بھی تو اس توپ کی مار دیکھنا ہے۔ بھاری بھرکم توپ کے آگے گھوڑے جتے تھے۔ علی کمال کو توپ پر بٹھایا گیا۔ مگر اس شان سے کہ یونانی سپاہی پستول لئے دائیں بائیں اور پیچھے بیٹھے تھے۔ راستہ ایک بلند پہاڑ پر سے ہو کر جاتا تھا۔ جب توپ سب سے بڑی بلندی پر پہنچی تو علی کمال نے جو پہلے ہی سمجھا

بیٹھا تھا کہ اس توپ کی مرمت ترکوں کو اپنے ہاتھ سے قبل کرنا ہے۔ بجلی کی تیزی کے ساتھ لپکا گھوڑوں کی باگیں سپاہیوں سے چھین لیں اور قیامت کی پھرتی کے ساتھ گھوڑوں کو سڑک پر سے ہٹا ایک غار کی طرف ڈال دیا اس کا انجام ظاہر تھا نہ گھوڑے بچے، نہ توپ، نہ سپاہی نہ علی کمال۔ دنیا نے ایک گہرے کھڈ میں ایسا قیمہ دیکھا جو زمین کے ساتھ پلستر کی طرح جما ہوا تھا۔ علی کمال نے جان دے کر ترکوں کو زندہ کر دیا۔ ترک بے بس، بیمار دبلے کار، فاقہ کش اور نادار تھے۔ لیکن اُن کے دل وطن اور قوم کی محبّت سے بھرپور تھے

اور ظاہری اسباب کو دیکھنے والی دنیا نے حیرانگی سے دیکھا کہ ان گنتی کے ترکوں نے پوری بے سروسامانی میں دنیا کی بڑی بڑی مغرور اور ہتھیار بند سلطنتوں کو بڑی ہی ذلت کے ساتھ اپنے ملک سے نکال باہر کیا اسی زمانے میں لوگ دعا مانگا کرتے تھے "خدایا مصطفےٰ کمال کی فوج میں اپنی نصرت (مدد) کے فرشتے بھیج دے"۔ مولانا ابوالکلام کہا کرتے ہیں "دنیا کے کام فرشتے نہیں انسان ہی انجام دیا کرتے ہیں اور سچی بات بھی یہی معلوم ہوتی ہے کہ خدا وقت پڑے پر انسانوں ہی سے فرشتوں کے کام لے لیا کرتا ہے"

"علی کمال زندہ باد"

گھڑی

از جناب برکت علی صاحب متعلم جامعہ
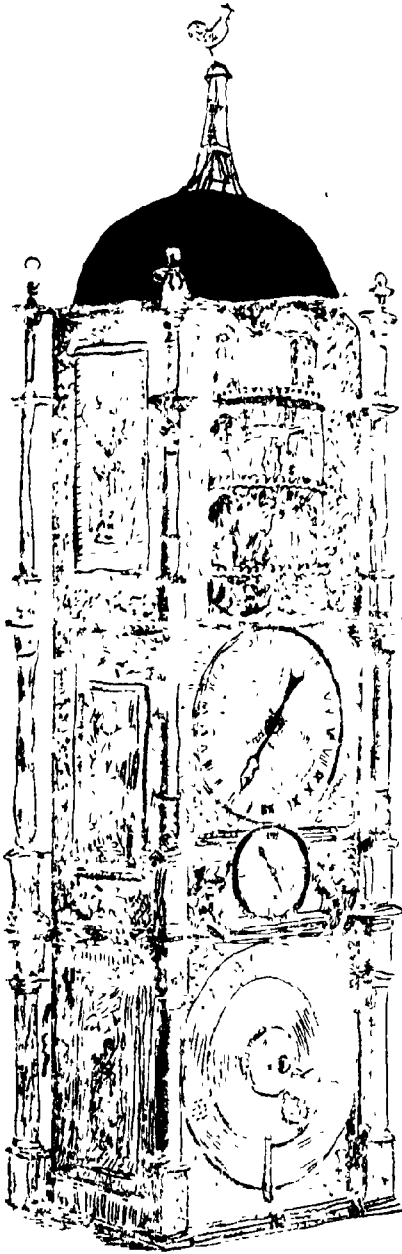
کیوں بھئی تمھارے پاس گھڑی بھی ہے۔ تمھارے پاس نہیں تو تمھارے ابا کے پاس تو ضرور ہوگی۔ نہیں تو تم روزمرہ بہت سے لوگوں کے پاس تو دیکھتے ہی ہوگے۔ اُن کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو پیسے پیسے میں بکتی ہے اور تمھارے بھائی بہن کلائی پر باندھے اکڑتے پھرتے ہیں شاید بچپن میں تمھارا بھی یہی مشغلہ ہو۔ مگر یہ صرف دل بہلاوے اور کھیل کی چیز ہے اصلی گھڑی وہ ہے جس سے تم وقت معلوم کرسکتے ہو۔ اور جسے دیکھ کر تم وقت پر مدرسے پہنچ سکتے ہو۔ اس کی مدد سے تمھارے اور تمھارے کیا ساری دنیا کے کام ٹھیک وقت پر انجام پاتے ہیں۔

یہ گھڑی بھی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو کلائی پر باندھنے کی دوسرے جیب گھڑی، تیسرے ٹائم پیس جو میز پر رکھتے ہیں۔ چوتھے بڑی گھڑی یا کلاک جو دیواروں پر لگاتے ہیں۔ ایک گھڑی اور بھی ہوتی ہے۔ یہ تم نے بڑی عمارتوں یا گھنٹہ گھر پر دیکھی ہوگی۔ غرض قسم قسم کی گھڑیاں ہیں اور نت نئی شکل کی۔ تم سمجھتے ہوگے کہ یہ گھڑیاں ہمیشہ سے ایسی ہی ہوں گی۔ مگر یہ بات نہیں ہے۔ بہت دنوں کی ترقی کے بعد انھوں نے یہ شکل اختیار کی ہے۔ ترقی کی یہ داستان بہت دلچسپ ہے۔

ہمارے دادا اور پردادا سے بھی ہزاروں برس پہلے

اسٹراس برگ کا گھنٹہ گھر

اس وقت کی گھڑیوں کا تو تصور بھی لوگوں کے دماغ میں نہیں آسکتا تھا۔ بلکہ ان بے چاروں کو تو دن اور رات کا بھی ٹھیک سے اندازہ نہیں تھا۔ پھر آہستہ آہستہ نہ جانے کیوں کر اُن کے دل میں خیال آیا کہ دن ایک صبح سے دوسری صبح تک مقرر کیا جائے یا ایک دوپہر سے دوسری دوپہر تک۔ یونان کے لوگوں نے اس میں اور ترقی کی کہ سورج نکلنے سے چھپنے تک دن ہوگا اور سورج چھپنے کے بعد پھر نکلنے تک رات۔ اس دن اور رات کو انھوں نے بارہ بارہ حصوں یا گھنٹوں میں تقسیم کیا۔ اَب اگر دن بڑا ہے تو گھنٹے بھی بڑے ہوں گے، دن چھوٹا ہے تو گھنٹے بھی چھوٹے۔ فرض کرو تم اپنے مدرسے میں تین گھنٹے پڑھتے ہو تو جاڑوں میں تو یہ گھنٹے چھوٹے ہوں گے۔ اور گرمیوں میں بہت لمبے۔ اس دقت کو محسوس کرکے دن اور رات کو چوبیس حصوں یا گھنٹوں میں تقسیم کیا اس طرح حساب ٹھیک ہوگیا۔

جیسے جیسے انسان کے رہنے سہنے کے طریقوں میں ترقی ہوئی اسے یہ خیال بھی پیدا ہوا کہ وہ مختلف وقتوں میں مختلف کام انجام دے۔ لیکن صحیح طور پر وقت کیسے معلوم ہو سوچتے سوچتے اُن کی سمجھ میں یہ آیا کہ یہ کام سورج سے لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ آدمی، سب سے پہلے سورج ہی سے وقت کا اندازہ کیا کرتا تھا۔ بعض جگہ اب تک چرواہے جنگل میں وقت کا اندازہ سورج ہی سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد لکڑی زمین میں گاڑ دیتے تھے۔ اور اس کے سایہ سے وقت معلوم کرتے تھے۔

اس کے بعد سورج کے ذریعے وقت معلوم کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی ایک پلیٹ یا ڈائل پر ۱ سے ۱۲ تک ہندسے لکھے ہوتے تھے۔ ڈائل پر لمبی سی سوئی کی طرح کی ایک چیز ہوتی تھی۔ جیسے جیسے سوئی کا سایہ ڈائل پر کھسکتا تھا۔ اسی اندازسے وقت کا اندازہ لگتا تھا۔ اس کا نام دھوپ گھڑی یا سن ڈائل تھا۔ یہ اب بھی بعض پرانے باغوں گرجوں اور مسجدوں میں پائی جاتی ہے۔
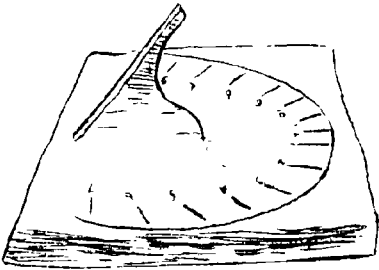
(معمولی دھوپ گھڑی یا سن ڈائل جو مسجدوں اور گرجوں میں لگایا جاتا ہے)

مگر دھوپ گھڑی یا چاند گھڑی اسی وقت کام دے سکتی تھی جب آسمان صاف ہو اور بادل نہ گھرے ہوں اس لئے بعض اور طریقوں کا بھی رواج ہوگیا۔ مثلاً آج سے ہزاروں برس پہلے۔ چین اور جاپان میں رسی کی گانٹھوں سے وقت معلوم کرتے تھے۔ بھلا کچھ بتا سکتے ہو کہ رسی کی گانٹھوں سے وقت کیسے معلوم ہوجاتا تھا۔ کرتے یہ تھے کہ ایک لمبی سی رسی میں برابر برابر فاصلے پر گانٹھیں لگا دیتے تھے۔ اور ایک سرا جلا دیتے تھے جب ایک گرہ سے دوسری گرہ تک جل جاتی تو معلوم ہوجاتا کہ اتنا وقت گذر گیا۔ یہ طریقہ تھا تو آسان اور صحیح مگر اس میں بھی دشواریاں تھیں۔ مثلاً یہ کہ کوئی اسے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔

اس دشواری کو دور کرنے کے لئے دھوپ گھڑی

میں اصلاحیں کی گئیں اور ایسے چھوٹے چھوٹے سن ڈائل بنائے گئے جنھیں انسان اپنے ساتھ بھی رکھ سکتا تھا۔

اس کے علاوہ پانی کی گھڑی بھی ایجاد ہوئی۔ اس کی دو قسمیں تھیں ایک تو یہ کہ پیالے میں سوراخ کر کے اس میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ سوراخ سے پانی قطرے قطرے کر کے دوسرے مرتبان میں گرتا ہے۔ اس نیچے کے مرتبان کی شکل دوا پینے کے گلاس کی سی ہوتی تھی۔ اس میں نشان بنے ہوتے تھے۔

(رسی گھڑی)

پانی جتنے نشان تک پہنچ جاتا تھا سمجھا جاتا تھا کہ دن کے اتنے گھنٹے گذر چکے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ بڑے برتن میں پانی بھر کر ایک چھوٹا برتن جس کے پیندے میں سوراخ تھا۔ اُس میں ڈال دیتے تھے۔ اس برتن میں رفتہ رفتہ پانی بھر جاتا تھا اور یہ ڈوب جاتا تھا۔ اس وقت گویا ایک گھنٹہ پورا ہوگیا۔ اس قسم کی پن گھڑیوں کا رواج ہزاروں برس پہلے مشرق کے ملکوں میں تھا اور ہندوستان میں اب بھی کہیں کہیں ہے۔ یہ گھڑیاں آواز بھی دیتی تھیں۔ آواز کے لفظ سے تمھیں تعجب ہوگا۔ یہ آواز ایسی نہیں ہوتی تھی جیسی آج کل کی دیوار گھڑیوں کی۔ بلکہ آواز دینے والا ایک چھوٹا سا لڑکا ہوتا تھا۔ یہ گھڑیاں بازار میں یا آبادی کے بیچ میں ہوتی تھیں۔ اور لڑکا جب دیکھتا تھا کہ پانی مرتبان کے ایک نشان تک بھر چکا یا پیالہ پانی میں ڈوب گیا تو وہ بڑے نقارے کو بجا دیتا تھا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ اتنا وقت گذر گیا۔

یہ دھوپ گھڑی زمین پر رکھ دی جاتی ہے اور دھوپ سوراخ الف سے گذر کر کسی نمبر پر پڑتی ہے جس سے وقت معلوم ہوتا ہے

ریت گھڑیوں یا وقت معلوم کرنے کے شیشوں کا بھی کافی رواج تھا۔ آج کل بھی یہ گھڑیاں انڈا ابالنے کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ شیشے کے دو چھوٹے چھوٹے قمقمے ہوتے ہیں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے۔ ریت والا قمقمہ اوندھا کر دیا جاتا ہے۔ اس میں سے تھوڑی تھوڑی ریت دوسرے قمقمے میں گرتی رہتی ہے۔ کوئی تین یا ساڑھے تین منٹ میں ساری ریت دوسرے قمقمے میں چلی جاتی ہے اور اس وقت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ انڈا ابل گیا۔ ریت گھڑیاں (جو وقت معلوم کرنے کے لئے بنائی جاتی ہیں) انڈا گھڑی سے بڑی ہوتی تھیں۔ شکل ہوبہو ویسی ہی۔ ریت کی مقدار سے وقت کا اندازہ کر لیتے تھے۔ سورج گھڑی کی طرح بہت پرانے گرجوں

جاپانیوں کا لیمپ کلاک جس میں تیل جلاتے وقت معلوم ہوتا ہے

میں ریت گھڑیاں بھی اب تک موجود ہیں۔ یہ زیادہ تر منبر
کے قریب ہوتی تھیں تاکہ تقریر کرنے والا آسانی سے معلوم کرسکے
کہ اس کا وقت ختم ہوگیا۔ ننھے ننھے بچے اکثر اس گھڑی کے پاس
ہی بیٹھتے تھے اور ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے
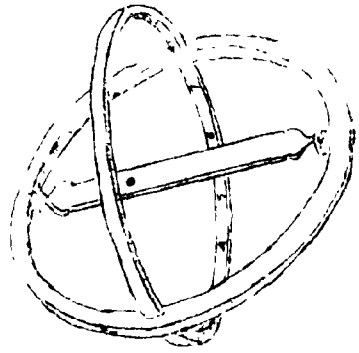
یہ ایک پرانی دھوپ گھڑی ہے وقت دیکھنے
کے لئے اسے کنڈے پکڑ کر لٹکا دیتے تھے اس
میں بھی سوراخ سے دھوپ گذر کر ہندسے
پر پڑتی ہے۔

کنگ الفریڈ نے وقت معلوم کرنے کے لئے موم بتی
میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رنگین حلقے بنائے تھے
موم بتی آہستہ آہستہ جل کر ان حلقوں تک آتی تھی اور
اس سے وقت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں نے بھی گھڑی بنانے میں بہت ترقی کی
تھی۔ پنڈولم بالنگر کا استعمال بھی عربوں ہی نے کیا۔ مشہور
خلیفہ ہارون رشید نے شاہ فرانس، شاہ رچلمان کو تحفے
میں ایک گھڑی بھیجی تھی۔ پیتل کے گولے تانبے کے ایک
دائرے پر گرتے تھے اور اس سے آواز پیدا ہوتی تھی انھوں
نے ایسی پنڈولم والی یا لنگر دار گھڑیاں بنائی تھیں۔ جو
پانی کی گھڑی سے بالکل علیحدہ تھیں۔ دمشق کی مسجد کی ایک
گھڑی کا حال تم دلچسپی سے سنوگے۔

"جس وقت بڑے روم کے دروازے سے نکلو تو سیدھے
ہاتھ کی غلام گردش کی دیوار میں ایک بڑا سا گول طاق نظر آتا
ہے اس طاق میں تانبے کے دو گول دائرے ہیں۔ ان میں اتنے
ہی گول گول روزن کٹے ہیں جتنے دن میں گھنٹے۔ ان کے
سوا تانبے کے دو وزن ہیں۔ یہ دھات کے بنے ہوئے دو
بازوں کی چونچ میں سے تانبے کے پیالوں میں گرتے ہیں۔ ان
پیالوں کے پیندے میں سوراخ ہیں۔ باز اپنی گردنوں کو
بڑھا کر دونوں کو پیالے میں چھوڑ دیتے ہیں اور یہ وہ اس
نزاکت سے کرتے ہیں کہ جادو کا گمان ہوتا ہے۔ جس وقت
وزن پیالے پر گرتے ہیں تو آواز نکلتی ہے۔ اور اس کے بعد
وہ سوراخ میں سے ہوکر دیوار میں چلے جاتے ہیں۔

(ریت گھڑی)

اس کے ساتھ ہی دائرے
کا ایک روزن تانبے کے پترے
سے بند ہوجاتا ہے اور یہ عمل اس
وقت تک جاری رہتا ہے۔
جب تک دن کے سب گھنٹے
گذر جائیں۔ اور سب روزن
بند ہوجائیں۔ رات کے لئے
دوسری کل ہے۔ جس محراب
میں یہ دائرے نصب ہیں۔ اسی میں بارہ چھوٹے چھوٹے
دائرے تانبے ہی کے اور ہیں۔ ان کے بیچ میں سوراخ

ہیں جن میں شیشہ لگا ہوا ہے۔ شیشہ کے پیچھے ایک چراغ ہے جو پانی کی طاقت سے گھومتا ہے۔ اس کی حرکت گھنٹوں کے مطابق ہے۔ جس وقت ایک گھنٹہ پورا ہو گیا تو چراغ شیشے کے مقابل آجاتا ہے اور دائرے کو روشن کر دیتا ہے اور پھر ایک گھنٹے کے بعد یہی ہوتا ہے اور دوسرا دائرہ روشن ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کل گھنٹے رات کے گذر جائیں۔

وقت کا اندازہ کرنے کی موم بتی

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ گھڑیوں میں اصلاح و ترقی ہوتی گئی۔ لوگوں نے سوئیاں ایجاد کیں جو دائرے کے گرد گھومتی تھیں۔ لیکن آج کل طرح اسپرنگ کی ایجاد تو ہوئی نہیں تھی۔ اس لئے ان سوئیوں کو گھمانے کے لئے کوئی وزنی چیز استعمال کی جاتی تھی۔

رفتہ رفتہ گھڑی بنانے والوں نے عجیب و غریب ایجادیں کیں جو یقیناً دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ عام طور پر مشرق یا ایشیا کے لوگ اس قسم کی عجیب و غریب گھڑیاں بنانے میں بہت کاریگری سے کام لیتے تھے۔ ایک گھڑی کا دلچسپ حال تمھیں سنائیں۔ ہمیں تو بھائی یہ داستان ہی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس کا کچھ حصہ صحیح بھی ہو۔ اس گھڑی کے اوپر جنگل کا ایک بہت خوشنما منظر تھا۔ اس جنگل میں چڑیا تھی اور اس کے نیچے۔ جنگل میں دس چھوٹے اور دو بڑے دروازے تھے۔ ایک چھوٹا سا چاند بنایا گیا تھا۔ جو آہستہ آہستہ آسمان کے گرد چکر لگاتا تھا۔ ہر گھنٹے کے بعد دو چھوٹے دروازوں میں سے ایک میں آواز پیدا ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ہی دو بڑے دروازوں میں سے دو عقاب جھپٹ کر باہر نکلتے تھے۔ ہر ایک دھات کا ایک ٹکڑا تانبے کے ایک کٹورے میں گرا دیتا اور غائب ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد سانپ پھنکارتا ہوا نکلتا تھا اور چڑیا کے بچوں پر حملہ کرتا تھا۔ مگر چڑیا اُسے اپنے ڈینوں سے مار کر بھگا دیتی تھی پھر فوراً وہی دروازہ جس سے آواز پیدا ہوئی تھی کھلتا تھا۔ اور اس سے ایک لڑکی نکلتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کتاب ہوتی تھی جس پر وہی گھنٹہ لکھا ہوتا تھا جو اس وقت گھڑی میں ہوتا تھا۔ اسی طرح دوسرے گھنٹے بھی معلوم ہوتے تھے

ایک ہزار قبل مسیح کی ایک دھوپ گھڑی

اسی نمونے کی دوسری گھڑی ۱۵۸۹ء میں اسحاق ہابرشٹ (ISSAC HABRECHT) نے تیار کی تھی

جو اسٹراس برگ کی (STRASBURG CLOCK) گھڑی کے نام سے مشہور ہے۔

پہلے پہل گھڑیاں بہت چھوٹے پیمانے پر بنائی جاتی تھیں۔ ان کی طرح طرح کی شکلیں اور نمونے ہوتے تھے۔ مثلاً بٹوا، کتاب، پسلیاں، کھوپری۔ پھر ان کے ڈبے (کیس) طرح طرح سے سجائے۔ اور قیمتی قیمتی جواہرات سے منڈھے جاتے تھے۔ گھڑی بنانے والوں کا اس زمانے میں مذاق ہی۔

(پن گھڑی)

ایسا تھا کہ وہ انہیں جس قدر ہو سکے خوب صورت بنائیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ گھڑی کے دائرے یا ڈائل پر ایک سورج اور ایک چاند بنا دیے جاتے۔ جن کی گردش سے وقت معلوم ہو۔ اکثر دن میں دو سپاہی بنائے جاتے جو اپنی تلواروں کی نوکوں سے گھنٹہ اور منٹ بتاتے تھے۔ جن سے مہینے اور دن بھی معلوم ہوتے تھے۔ مگر ان سب سے حیرت انگیز شکل یہ تھی کہ گھڑی کے اندر ایک باجا ہوتا تھا اور اس کے دائرے پر چھوٹی چھوٹی تصویریں باجے کے ساتھ ساتھ جو وقت اور گھنٹے کی مناسبت سے بجتا تھا۔ ناچتی ہوتی تھیں۔ یہ طریقہ ترمیم و اصلاح کے بعد کچھ نہ کچھ اب بھی باقی ہے۔

شروع شروع میں تمام گھڑیاں ہاتھ ہی سے بنتی تھیں۔ ایک بنچ اور ایک پیروں والی خراد۔ ایک ہاتھ کا انجن یہی کل سامان تھا جس سے کاری گر دکان میں بیٹھ کر کام کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ گھڑیاں بہت خوب صورت ہوتی تھیں۔ لیکن ان کی قیمت بھی بہت ہوتی تھی۔ ایک لکڑی کی گھڑی ۱۸ سے ۴۰ ڈالر[1] تک بکتی تھی۔ اگر پیتل کا کیس ہو تو قیمت ۴۰ سے ۶۰ ڈالر تک ہوتی۔ اس لئے بہت کم لوگ ان گھڑیوں کو خرید سکتے تھے۔ کاری گر بھی ایک وقت میں چند ہی بنا سکتا تھا اور جب وہ بہت سی گھڑیاں بنا لیتا تھا تو اُن کے خریدار ڈھونڈھنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر سارے ملک میں مارا مارا پھرتا تھا۔ لیکن سنہ [illegible]ء میں ایک شخص ربلی ٹیری نے گھڑی بنانے کے کام میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس نے اپنی مشینیں چلانے کے لیے پانی کی طاقت سے کام لیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ایک وقت میں زیادہ گھڑیاں بننے لگیں اور پہلے کے مقابلے میں ان کی قیمت بھی کم ہوگئی۔ تین چار سال کے عرصے میں اس نے اتنی ترقی کر لی کہ اس کے کارخانے میں سالانہ ہزاروں گھڑیاں بننے لگیں۔ پہلے پہل تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن اس کی کامیابی دیکھ کر آنکھیں کھلیں اور اس کی دیکھا دیکھی اور بھی بہت سے کارخانے کھل گئے۔
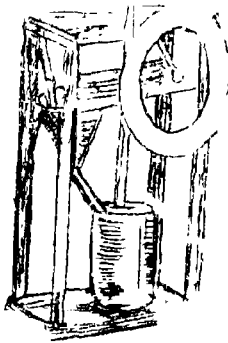
(پن گھڑی)

اور اب تو یہ حال ہے کہ امریکا کے بعض کارخانوں میں سال میں ایک لاکھ گھڑیاں بن جاتی ہیں۔

ابھی تین چار سال ہوئے ایک اور گھڑی ایجاد ہوئی ہے اسے جبنگ فگر کہتے ہیں۔ یہ معمولی گھڑی کے برابر ہوتی؟

---

[1] ایک ڈالر تین روپے دو آنے کا ہوتا ہے۔

جیبی اور کلائی والی۔ اس میں خاص بات یہ ہے کہ سوئیاں نہیں ہوتیں۔ بلکہ بیچ میں ایک چھوٹی سی کھڑکی ہندسے کی اور اس کے نیچے منٹ کی ہوتی ہے۔ بس جو وقت ہوتا ہے اس کے مطابق گھنٹے اور منٹ کے ہندسے ان گھڑیوں میں آجاتے ہیں مثلاً اس وقت ۲ بج کے ۲۷ منٹ ہوئے ہیں۔ تو گھنٹے کی کھڑکی میں دو کا ہندسہ ہوگا اور منٹ والی کھڑکی میں ۲۷ کا۔ بعض گھڑیوں میں ایک چھوٹی سی کھڑکی سیکنڈ دکھانے کے لئے بھی ہوتی ہے۔

دیکھو یہ داستان کیسی دلچسپ تھی۔ بہت سی باتیں جن کے بارے میں خیال تھا کہ تم نہ سمجھ سکو گے یا مشکل سے سمجھو گے چھوڑ دی گئی ہیں۔ پھر بھی تمھیں یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ گھڑی کی ایجاد کس طرح ہوئی۔ کس طرح اس صنعت نے ہزاروں برس سے اب تک آہستہ آہستہ ترقی کی۔ اور کتنے دماغوں نے اس کی اصلاح و ترمیم میں حصہ لیا اور کتنی مدت میں جاکر اس نے موجودہ شکل اختیار کی۔ ترقی کے قدم ابھی رکے نہیں ہیں۔ آگے چل کر معلوم نہیں اس میں کیا کیا نئی اصلاحیں ہوں گی۔

جناب شفیق الدین صاحب نیّر جامعی

میں مدرسے سے گھر آ رہا تھا۔ رستے میں دیکھتا کیا ہوں کہ ایک طرف سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ لگی ہے۔ ذرا قریب گیا تو معلوم ہوا کہ لوگ گھیرا باندھے کھڑے ریچھ کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ لاؤ میں بھی ذرا ٹھیر کر یہ تماشا دیکھ لوں۔ بڑی مشکل سے لوگوں کو چیرتا ہوا اندر گھیرے میں ایسی جگہ پہنچا جہاں کھڑے ہو کر ریچھ کا تماشا بہت اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ لوگوں نے کہا ایسی گھبراہٹ کیا ہے تماشا ابھی شروع ہوا ہے۔

ریچھ والا بائیں ہاتھ میں ایک ڈنڈا اور ریچھ کی رسی پکڑے تھا۔ دائیں ہاتھ سے ڈگڈگی بجا رہا تھا۔ اور سُریلی آواز میں یہ گیت گاتا جاتا تھا۔

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے
ناچ دکھا دے ناچ دکھا دے
بٹیا اپنا ناچ دکھا دے
ناچ ذرا دل کھول کے بٹیا سب کو دکھا دے آج کھروا

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

بیچ کٹہرے میں اُنت نکالے گردن اور کولھے مٹکالے

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

کات لے چرخا کات لے بھائی اس میں نہیں ہے کوئی بُرائی

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

کشتی لڑلے رستم بن جا زور دکھا کچھ دیر کو تن جا

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

بندگی کرے سر کو جھکا کر　　　　مانگے پیسا ہاتھ بڑھا کر

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

ناچ چھما چھم چھمک چھمیا　　　　کود دھما دھم دھمک دھمیا

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

بٹیا اپنا ناچ دکھا دے

ریچھ والا جو کچھ کہتا جاتا تھا۔ ریچھ اسی طرح کرتا جاتا تھا۔ میں حیران تھا کہ ریچھ آدمی کی بولی کیسے سمجھ لیتا ہے۔

تھوڑی دیر میں ناچ ختم ہو گیا۔ تو ریچھ والا ریچھ سے کشتی لڑنے کے لئے تیار ہوا۔ دونوں سامنے آئے اور ذرا سی دیر میں ایک دوسرے سے گتھ گئے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سچ مچ دو پہلوان اکھاڑے میں کھڑے کشتی لڑ رہے ہیں۔ جب کشتی ختم ہو گئی تو لوگوں نے ایک ایک دو دو پیسے ریچھ والے کو دئے۔ وہ سب کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

گھر آیا تو یہ سب حال میں نے اپنی چھوٹی بہن اور چھوٹے بھائی کو سنایا۔ وہ بھی ریچھ کے ناچ کا حال اور چرخا کاتنے اور سلام کرنے کی باتیں سنکر بہت حیران ہوئے۔ اتنے میں ابا جان بھی کچہری سے آگئے۔ میں فوراً ان کے پاس گیا اور سارا حال ان سے کہہ سنایا۔ اور پوچھا یہ ریچھ آدمی کی بولی کیسے سمجھ جاتا ہے۔

انھوں نے کہا۔ بٹیا! ریچھ بولی نہیں سمجھتا بلکہ رسی کے اشارے پر کام کرتا ہے۔

میں نے کہا۔ مگر ابا جان! ریچھ یہ سب کچھ اشاروں ہی سے سیکھ کس طرح جاتا ہے

ابا جان نے کہا۔ میاں! پیٹ بری بلا ہے جب فاقے پر فاقے ہوتے ہیں اور ریچھ والے کے ڈنڈے کا ڈر بھی رہتا ہے تو ریچھ یہ سب کچھ کرنے لگتا ہے۔ ہاں اس سے ایک بات آسانی سے ہم بھی سیکھ سکتے ہیں کہ جب جانور تک کوشش اور محنت سے اتنی باتیں سیکھ جاتے ہیں تو ہم انسان کچھ سیکھنا چاہیں تو کیا کوشش اور محنت سے نہیں سیکھ سکتے۔

ننھے معمار

محمد عُزیر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ

اب سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دنیا میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا۔ زمین کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کے لوگ اپنی جان بچانے کے لئے پریشان نہ ہوں۔ لیکن انھیں سلامتی کی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ اُن کے مکانات سیلاب کی موجوں میں بہہ رہے تھے انھوں نے اپنے بادشاہوں کے اونچے اونچے قلعوں میں پناہ لینی چاہی تھی مگر سیلاب کی موجیں اتنی تیز تھیں کہ قلعوں کی دیواریں بھی ہلنے لگیں۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں تمام قلعے گرنے لگے۔ اب ہر طرف تباہی کا سامنا تھا۔

اُسی زمانے میں عرب کے ملک میں ایک بڑا رحم دل بادشاہ تخت پر بیٹھا تھا۔ عرب میں بھی سیلاب کا زور شور ویسا ہی تھا جیسا دنیا کے اور حصوں میں۔ بلکہ وہاں کی حالت ہر جگہ سے زیادہ خراب تھی۔ اس بادشاہ نے رعایا کی جان و مال بچانے کے لئے فوراً ایک بہت بڑا اور نہایت مضبوط قلعہ بنوایا۔ یہ قلعہ اتنا بڑا تھا کہ عرب ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے آدمی جو سیلاب کی وجہ سے برباد ہو رہے تھے اس میں پناہ لے سکتے تھے جب یہ قلعہ بن کر تیار ہوا۔ اور اس کی شہرت پھیلی تو دنیا کے ہر حصے کے لوگ آکر اس میں پناہ لینے لگے، افریقہ، چین، ایران، توران، یورپ، ہندوستان، شام افغانستان۔ چاروں سماترا غرض ہر ملک کے لوگ آکر اس قلعے میں آباد ہوئے۔ اور سیلاب کے

ے سے محفوظ ہوکر اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

اس درمیان میں بادشاہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ لیکن قلعے کی آبادی بڑھتی ہی گئی۔ کچھ ہی دنوں میں سیلاب کا زور بھی بہت گھٹ گیا اور ہر طرف خوش حالی نظر آنے لگی۔ قلعے کی مضبوطی کا امتحان اس وقت ہو چکا تھا جب سیلاب پورے زور پر تھا۔ اس لئے اس کے باشندے اب بالکل بے فکر ہوگئے۔ لیکن چندروز ایک جگہ مل کر رہنے کے بعد انھوں نے آپس میں لڑنا جھگڑنا شروع کردیا۔ اور ایک حصے کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں پر حملہ کرکے اُن کو برباد کرنے کی کوشش کرنے لگے اِن حملوں میں قلعہ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچنے لگا۔ لڑنے والوں نے اپنی دشمنی کے جوش میں یہ خیال نہیں کیا کہ اگر قلعے کے کسی حصے کو نقصان پہنچا تو اس کا اثر دوسرے حصوں پر بھی پڑے گا۔ کیوں کہ اگر سیلاب پھر کبھی آیا تو کمزور حصوں سے اندر داخل ہوکر قلعہ کی پوری آبادی کو تباہ کردے گا۔

کئی سو برس اسی حال میں گذر گئے۔ اور لوگوں کی آپس کی لڑائی جاری رہی۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ دنیا میں ایک زبردست سیلاب پھر آیا۔ چھوٹی بڑی عمارتیں پھر گرنے لگیں، لوگ پریشان ہوکر ہر طرف دوڑنے لگے پچھلے سیلاب کے زمانے میں اس قلعے کی مضبوطی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ اب کی بار لوگ پھر اسی کی طرف دوڑے۔ لیکن اس کی دیواروں کے بہت سے حصے آپس کی جنگ میں کمزور ہو چکے تھے۔ اور اب سیلاب کا پانی آہستہ آہستہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ جو لوگ اس قلعے میں رہتے تھے انھیں اب تک اپنے خطرے کا اندازہ نہ تھا اور وہ بے فکری کے ساتھ اپنی لڑائیوں میں مصروف تھے۔ دور دور کے ملکوں سے لوگ سیلاب سے بھاگ کر آتے اور اس قلعے میں پناہ لینی چاہتے، مگر ان کو قلعے کی کمزوری اور اس کے باشندوں کی بے فکری دیکھ کر بڑی حیرت اور ناامیدی ہوتی۔ اُن کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کریں کیا نہ کریں جس

قلعے کی مضبوطی کا شہرہ سن کر وہ اپنے ملکوں سے آئے تھے وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ دنوں تک سیلاب کو روک نہیں سکتا تھا۔

ادھر سیلاب کا پانی قلعے کے اندر داخل ہوتا جاتا تھا اور جو دیواریں آپس کے حملوں سے کمزور ہوگئی تھیں وہ اب ہلنے لگیں۔ کچھ لوگوں نے آہ و فریاد کرنی شروع کی۔ لیکن لڑنے والوں کی گرج اتنی اونچی تھی کہ آہ و فریاد کی آواز کون سنتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لڑنے والوں نے سیلاب سے سازش کرلی ہے۔ اور دونوں مل کر قلعے کو برباد کر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اتنے میں قلعے کے اُس حصے سے جہاں ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی کے باشندے آباد تھے۔ کچھ بچّوں کی آواز سُنائی دی۔ معلوم نہیں اس آواز میں کیا بات تھی کہ لڑنے والوں کی گرج اور ڈوبنے والوں کی آہ و فریاد کے شور میں بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ ان بچوں نے جامعہ نام کی ایک چھوٹی سی جماعت بنالی تھی۔ اور وہ اپنے ننھے ننھے کاندھوں پر پتھر کے ٹکڑے اُٹھائے ہوئے قلعے کے ایک حصے کی طرف جو سب سے زیادہ کمزور نظر آتا تھا۔ تیزی کے ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔ وہ اس کام میں کچھ ایسے لگے ہوئے تھے کہ انھیں کھیل کود کا بھی ہوش نہ تھا اُن کی یہ دُھن دیکھ کر کچھ لوگ مسکرائے کہ بھلا اتنے بڑے قلعے کی مرمت ان بچوں سے کیا ہوسکے گی۔ کچھ لوگوں نے انھیں روک کر سمجھانے کی بھی کوشش کی کہ ایسے بیکار کام میں وقت خراب نہ کریں۔ مگر بچوں کے قدم ایک منٹ کے لئے بھی نہ رکے اور دیواروں کی جڑ میں پتھر کا پشتہ برابر اونچا ہوتا ہوگیا۔

علاقہ غیر کا پٹھان

ہندوستان کے نقشے میں تمھیں پنجاب کے بعد ایک اور صوبے کے نشان نظر آئیں گے۔ یہ سرحد کا صوبہ کہلاتا ہے اور اس کا دار السلطنت شہر پشاور ہے۔ اس صوبے کی سرحد پر ہندوستان کی حد ختم اور پھر افغانستان کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ لیکن دونوں سرحدوں کے درمیان کچھ تھوڑا سا ٹکڑا ہے جسے علاقہ غیر کہتے ہیں۔ یہاں پٹھانوں کے بہت سے قبیلے آباد ہیں۔ ان قبیلوں پر نہ تو کابل والوں کی حکومت ہے نہ انگریزوں کی۔ ہاں ان دونوں کا اُن پر اثر ضرور ہے۔ خصوصاً انگریز انھیں قابو میں رکھنے کی برابر کوشش کر رہے ہیں اس لئے نہ تو یہ کسی ملک کی رعیت ہیں اور نہ پورے طور پر آزاد کہے جا سکتے ہیں۔

علاقہ غیر پہاڑی علاقہ ہے جس میں کوہ ہندوکش کوہ سفید اور کوہ سلیمان کی شاخیں بتدریج پھیلی ہوئی ہیں اور کئی تیز بہنے والی ندیاں ان پر سے بہ کر دریائے سندھ میں جا گرتی ہیں۔ یہی ندیاں اصل میں افغانستان جانے کے راستے ہیں جو "درے" کہلاتے ہیں۔ مشہور درے یہ ہیں:۔

(۱) درہ خیبر (۲) درہ کرم (۳) درہ ٹوچی (۴) درہ گومل۔

یوں تو کافی عرصے سے یہ علاقہ انگریزوں کے اثر میں ہے۔ مگر پچھلے دس بارہ سال میں انگریزی حکومت کا اثر یہاں بہت بڑھ گیا ہے۔ انگریزوں نے سرحد کی حفاظت کے لئے جگہ جگہ بڑی بڑی فوجی چھاؤنیاں قائم کر رکھی ہیں جو پکی سڑکوں سے ملا دی گئی ہیں۔ ان رعایتوں کے عوض سرکار ان قبیلوں کے سرداروں کو جو ملک کہلاتے ہیں مستقل وظیفہ دیتی ہے۔ مگر ان کی آپس کی باتوں میں بہت کم دخل دیا جاتا ہے اور یہ لوگ ایک حد تک آزاد ہیں۔ انھیں بندوق خنجر وغیرہ ہتھیار رکھنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں۔ بعض بعض ملکوں کے پاس توپیں ہیں۔ مشین گنیں اور دیسی و انگریزی ساخت کے بم بھی موجود ہیں۔ بندوقیں اور ہتھیار بنانے کے اکثر ماہر کاری گر اس علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت جوشیلے اور بہادر ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں۔ نوبت قتل و خون تک پہنچ جاتی ہے مگر سڑک شاہی اور چھاؤنیوں کی حد میں کوئی واردات نہیں ہونے پاتی۔ ہر قبیلہ اپنے اپنے علاقے میں سڑک کے امن کا ذمے دار ہوتا ہے۔ قبیلے کے چند لوگوں کو انگریزوں کی طرف سے سڑک کا چوکی دار مقرر کیا جاتا ہے۔ تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔ انھیں خاصہ دار کہتے ہیں۔ سڑک پر کوئی واردات ہو جائے تو وہ قوم یا تو مجرم کو سرکار کے حوالے کرتی ہے اور اس کا سرحدی قانون کے

مطابق چالان کیا جاتا ہے یا پھر ساری قوم سرکار کو ناغہ ادا کرتی ہے ۔

ملکی انتظام کے طور پر یہ علاقہ چار حصوں میں تقسیم ہے انھیں ایجنسی کہتے ہیں ۔ ان کے نام یہ ہیں :- (۱) خیبر ایجنسی یا آفریدی قوم کا علاقہ ، صدر مقام لنڈی کوتل یہ ریل کے ذریعے ہندوستان سے ملا ہوا ہے ۔ (۲) کرم ایجنسی یا کزئی قوم کا علاقہ اس کا صدر مقام پارہ چنار ہے ۔ یہ جگہ صحت کے لئے مفید اور میووں کی پیداوار کے لئے مشہور ہے (۳) شمالی وزیرستان جو وزیریوں کا ملک ہے ۔ صدر مقام میران شاہ ہے (۴) جنوبی وزیرستان ۔ جس میں "محسود" یا "مسعود" قوم آباد ہے ۔ صدر مقام وانا ہے ۔ ہر ایجنسی میں انگریزوں کی طرف سے ایک پولیٹیکل ایجنٹ رہتا ہے جو انگریزی حکومت کے حقوق کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔ اور قبیلوں کے ساتھ معاملات طے کرتا ہے اس کی مدد کے لئے ایک مقامی فوج ہوتی ہے جو اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے اسکاؤٹس (Scouts) کہلاتی ہے ۔ مثلاً خیبر اسکاؤٹس ۔

یہ ایک خشک پہاڑی علاقہ ہے ۔ بعض چوٹیاں بہت اونچی ہیں ۔ مثلاً کوہ سفید کا سلسلہ ۔ یہ سال بھر تک برف سے ڈھکا رہتا ہے مگر اکثر پہاڑ نیچے نیچے اور خشک ہیں بعض پر تو گھاس اور جھاڑیوں کے سوا کچھ پیدا نہیں ہوتا ۔ کہیں کہیں عمارتی لکڑی کے جنگل پائے جاتے ہیں ۔ اس لئے یہ لوگ بھیڑیں پالتے ہیں ۔ یا عمارتی یا جلانے کی لکڑی سرحد کے شہروں میں بیچ کر گذر کرتے ہیں ۔ یہاں ایک قسم کا پودا ہوتا ہے جسے خضری کہتے ہیں ۔ اس کا قد دو تین فٹ سے زیادہ نہیں ہوتا ۔ پتے کھجور کے پتوں سے مشابہ ہوتے ہیں اور پتوں سے پلنگ کے بان اور چٹائیاں بُنی جاتی ہیں ۔ یہ لوگ کسی قسم کی صنعت و حرفت نہیں جانتے ۔ البتہ کہیں کہیں ہتھیار بنانے والے کاریگر پائے جاتے ہیں ۔

دریا کے کنارے جہاں کہیں زمین ہموار ہوتی ہے تھوڑی بہت کھیتی باڑی کی جاتی ہے ، گیہوں ، جو ، مکئی وغیرہ کی کاشت ہوتی ہے ۔ پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر سیڑھیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کھیت بنا کر کاشت کی جاتی ہے ۔ مگر یہ لوگ ہل بہت کم استعمال کرتے ہیں ۔ بیلچے کی قسم کا ایک اوزار ہوتا ہے ۔ جسے "یہ سم" کہتے ہیں ۔ پانچ ، چھ فٹ لمبے ڈنڈے کے سرے پر بالشت بھر لوہے کا نکیلا سا پھل لگا ہوتا ہے ۔ ہاتھوں کے زور اور پاؤں کے دباؤ سے اس سے زمین کھودنے کا کام لیا جاتا ہے ۔ بعض بعض جگہ میوہ خوبانی ، سیب ، انگور ، آلو بالو ، آڑو ، توت وغیرہ بکثرت ہوتا ہے ۔ کرم ایجنسی میں بادام اور اخروٹ بھی پیدا ہوتے ہیں ۔

بنجر علاقے اور سرد و خشک آب و ہوا نے ان لوگوں کو خوب محنتی اور جفاکش بنا دیا ہے ۔ مفلس ہونے کے سبب معمولی غذا کھاتے ہیں ۔ گیہوں یا مکئی کی روٹی ۔ چھاچھ دودھ ، گڑ ، پیاز اور گوشت اُن کی خوراک ہو ۔ کچھ عرصے سے چائے بھی پینے لگے ہیں اور اب تو اس کے شیدائی بن گئے ہیں ۔ حقہ بہت پیتے ہیں ۔ چرس ، افیون کا نشہ بھی کرتے ہیں ۔ مگر شراب کو بہت بُرا جانتے ہیں ۔ غریب ہیں مگر مہمان نواز بہت ہیں ۔ مہمان کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں ۔

اُن کے گھر کا سامان بھی معمولی اور مختصر ہوتا ہے بھیڑ کی کھال کے مشکیزے اُن کے بڑے کام کی چیز ہے ۔ اس

دو سرحدی پٹھان

میں اناج، آٹا وغیرہ رکھتے ہیں۔ پانی بھی مشکیزوں میں
رہتا ہے۔ چھاچھ بھی ایک عجیب طریقے سے مشکیزوں میں
بوئی جاتی ہے۔ رات کو اس میں دودھ ڈال دیتے ہیں۔
صبح جب دہی تیار ہو جاتا ہے تو مشکیزے کے دونوں سرے
ہاتھوں سے پکڑ کر اسے زمین کے ساتھ آگے پیچھے کچھ دیر گھماتے
رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ مکھن نکل آتا ہے۔ شاید یہ مکھن
نکالنے کا سب سے پرانا طریقہ ہے جو عربوں نے معلوم کیا
تھا۔ بعض برتن مٹی کے ہوتے ہیں اور اب تانبے اور المونیم
کے برتن بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ سردیوں میں کمرے کے
فرش پر "لُغر" (اون کی بنی ہوئی بڑی بڑی دریاں)
بچھاتے ہیں۔ بعض لوگ قالین بھی استعمال کرتے ہیں۔

ان کا لباس بھی بہت معمولی ہوتا ہے۔ سر پر پگڑی
گلے میں کرتا، اس پر ردی نمونے کی واسکٹ۔ پاجامے کی
جگہ شلوار پہنتے ہیں۔ پاؤں میں چپل جو "خفری" کی رسی سے
بناتے ہیں۔ یہ پہاڑی سفر میں بڑا کام دیتی ہے۔ آج کل موٹر
کے ٹائر اور چمڑے کے چپل کا بھی رواج ہو چلا ہے۔ عورتیں
تنگ پائنچے کی شلوار اور ٹخنوں تک لمبا کرتا پہنتی ہیں۔ جو
کمر تک چُست ہوتا ہے۔ مگر نچلا حصہ بہت کھلا ہوتا ہے۔
سر پر دوپٹہ۔ پردے کے لئے اوپر سے چادر بھی ڈال لیتی
ہیں۔ عورتوں کا لباس اکثر سُرخ یا سیاہ رنگ کا ہوتا ہے
بچے عموماً ایک کرتے میں رہتے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کے
لباس پر ریشم کا کشیدہ نکالتے ہیں اور افغانی سکے، موتی
سنکھے اور چھوٹے چھوٹے گھونگھے ٹانکتے ہیں۔ جو بہت بھلے معلوم
ہوتے ہیں۔ عورتیں گلٹ، چاندی کا زیور۔ مثلاً کانوں کی بڑی
بڑی بالیاں، ہاتھوں کے کڑے۔ اور افغانی سکوں کا گلے
میں ہار پہنتی ہیں۔ یہ لوگ نہاتے کم ہیں۔ کپڑے میل کچیل سے
گل جاتے ہیں مگر انھیں دھوتے نہیں۔

ملک اور موسم کی سختیوں نے انھیں سخت جان
بنا دیا ہے۔ مصیبت اور تکلیف سے نہیں گھبراتے۔ سفر کی
تھکن اُن کے نزدیک بے معنی چیز ہے۔ بیس سال پہلے جب
سرحد پر پورا پورا امن نہیں تھا۔ یہ لوگ راتوں رات بڑی
بڑی منزلیں طے کر کے میدانی علاقوں پر چھاپے مارتے اور لوگوں
کا مال و اسباب لوٹ کر بغیر دم لئے پہاڑوں میں واپس
پہنچ جاتے۔ مگر انگریزوں کی طرف سے وظیفوں اور سڑکوں
اور چھاؤنیوں کے ٹھیکوں کی آمدنی سے یہ لوگ پہلے کی نسبت
بہت خوش حال ہو گئے ہیں۔ اب اپنے میدانی پڑوسیوں
کو نہیں ستاتے۔

ان کے علاقے میں نہ تو کوئی باقاعدہ حکومت
ہے اور نہ کوئی باقاعدہ انتظام ہے۔ اس لئے ہر روز ان
کی آپس میں لڑائیاں رہتی ہیں ہر شخص اپنی حفاظت کے لئے
بندوق اور خنجر رکھتا ہے۔ بچے اور عورتیں بھی اُن کا استعمال
جانتے ہیں۔ اور سب اعلیٰ درجے کے نشانہ باز ہیں۔ بہادری
اور دلیری میں بھی بے مثل۔ شروع شروع میں انگریزوں کے
ساتھ سالہا سال تک لڑائیاں لڑ چکے ہیں۔

بچاؤ کی خاطر ہر گھر کے گرداگرد ایک فصیل سی ہوتی
ہے اور درمیان میں ایک بُرج ہوتا ہے اس پر سے یہ حملہ
کرنے والے دشمن پر گولیاں برساتے ہیں۔ پشتو میں اس
بُرج کو "مونڑی" کہتے ہیں۔ یہ لوگ کینہ ور بہت ہوتے
ہیں۔ کئی کئی پشتوں تک بدلہ یا انتقام میں ایک دوسرے
کے آدمی قتل کرتے رہتے ہیں۔ اس کشت و خون کی وجہ

سے نسل کی بربادی لازمی ہے ۔ اس لئے ہر شخص دو چار شادیاں ضرور کرتا ہے ۔ تاکہ بچے بہت پیدا ہوں ۔ عورتوں کو اندر باہر بہت کام کرنا پڑتا ہے ۔ مال اور مویشی کا انتظام بھی عورت ہی کرتی ہے ۔ جنگل سے جلانے کے لئے لکڑیاں لاتی ہے، پھر بھی کھانا ہمیشہ خاوند اور بچے پہلے کھاتے ہیں اور وہ اُن کے بچے ہوئے ٹکڑوں پر اپنا پیٹ پالتی ہے ۔

یہ لوگ روزہ نماز کے بہت پابند ہوتے ہیں اکثر ڈاڑھی رکھتے ہیں ۔ ملاؤں اور پیروں کی بہت عزت کرتے ہیں مگر شریعت کی پیروی بہت کم کرتے ہیں ۔ آپس کے جھگڑے "جرگہ" یا پنچائت کے سپرد کئے جاتے ہیں جو رواج کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں ۔ شادی بیاہ اور موت کی رسموں پر بہت خرچ کرتے ہیں ۔ ہر دو موقعوں پر برادری کو کئی کئی روز کھانا کھلایا جاتا ہے ۔ بھیڑ کے شوربے میں روٹی گوندھ لیتے ہیں اور اس پر گرم گرم گھی یا چربی ڈال کر کھاتے ہیں ۔ گوشت کا حصہ علیحدہ علیحدہ ہر شخص کو دیا جاتا ہے ۔ لکھنے پڑھنے سے عاری ہیں ۔ اب انگریزوں نے جگہ جگہ مدرسے بنا دئے ہیں جہاں تعلیم مفت دی جاتی ہے ۔ بلکہ کتابیں بھی انگریزی حکومت ہی دیتی ہے ۔ علاج معالجے کے پرانے طریقے پسند کرتے ہیں ۔ نمونیہ کے مریض کی چھاتی پر جلتے گھی کا داغ دیتے ہیں بخار ہو جائے تو دنبے کی تازہ کھال اتار کر مریض کو اس میں لپیٹ دیتے ہیں جس سے اُسے پسینہ آجاتا ہے اور وہ تندرست ہو جاتا ہے ۔ زخموں کی مرہم پٹی کی بہت کم پروا کرتے ہیں انگریزوں نے اب ہسپتال بنا دئے ہیں جن میں ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں زخمیوں کا علاج ہوتا ہے ۔ یہ لوگ دوکانداری کو بہت برا جانتے ہیں ۔ اس لئے اُن کے ہاں تجارت کا کاروبار ہندو ہی کرتے ہیں ۔ گاؤں میں ہندو گاؤں کے ملک کا ہمسایہ ہو کر رہتا ہے ۔ ملک اس کی عزت اور جان و مال کا محافظ ہوتا ہے ۔ کیا مجال کہ کوئی ہندو کا بال بیکا کر سکے ۔ ملک اپنے ہندو ہمسایہ کے معاملے میں مسلمان بھائی کا خون کرنے میں دریغ نہیں کرتا ۔

مردوں میں ناچ نشانہ بازی ۔ نیزہ بازی ، دل بہلانے کے بڑے بڑے مشغلے ہیں ۔ گانے کا بھی انھیں بہت شوق ہے ۔ گانے بجانے میں ڈھول اور ایک سارنگی کی قسم کا مقامی ساز استعمال کرتے ہیں ۔ رباب بجانے میں بھی ماہر ہیں ۔ اُن کا ناچ عجیب قسم کا ہوتا ہے ۔ ڈھول بجانے والے کے آگے بازو پھیلا کر باری باری گھومتے ہیں اور چکر کھاتے وقت ہاتھوں اور سر کو ایک ساتھ جنبش دیتے ہیں ۔ ان لوگوں میں انڈے لڑانے کا ایک عجیب کھیل ہے ۔ یہ صرف عید کے موقع پر کھیلتے ہیں ۔ اول انڈوں کو ابال لیتے ہیں ۔ پھر پانی میں رنگ ڈالتے ہیں ۔ جو انڈے کے چھلکے پر چڑھ جاتا ہے اس قسم کے رنگے ہوئے انڈے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں ایک آدمی اپنا انڈا مٹھی میں پکڑتا ہے اور دوسرا اس کی نوک پر اپنا انڈا مارتا ہے ۔ جس کا انڈا ٹوٹ گیا وہ ہار جاتا ہے ۔ اور اپنا انڈا فاتح کو دے دیتا ہے مگر لڑنے سے پہلے ایک دوسرے کے انڈے بہت دیر تک جانچتے ہیں ۔ کبھی اسے دانتوں پر مارتے ہیں کبھی اسے کان کے پاس لاتے ہیں ۔ کبھی ماتھے پر مارتے ہیں اس جانچ پڑتال میں اتنی دیر لگاتے ہیں کہ ایک اجنبی تماشہ دیکھنے والا اُکتا جاتا ہے

ایک سرحدی قلعہ

درۂ خیبر

شیخ نیازی

از جناب رشید صدیقی صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پیامِ تعلیم کے پچھلے تاسیس نمبر میں شیخ نیازی کی عمر جتنی تھی اُس میں ایک سال کا اور اضافہ ہوگیا ہے۔ اسی اعتبار سے اُن کی عقل اور لمبائی چوڑائی بھی بڑھ گئی ہے۔ آواز بھی ذرا پاٹ دار ہوگئی ہے البتہ ابھی یہ اتنا لکھ پڑھ نہیں پائے ہیں کہ پیامِ تعلیم میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اسے یہ خود پڑھ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں نے جو کچھ ان کے بارے میں لکھا تھا اس کو ان کے بھائی بہن کچھ ایسے رنگ میں پیش کرتے ہیں کہ یہ فوراً فوجداری پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور بچو تمھیں اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا کہ شیخ صاحب جامہ سے باہر ہوتے ہیں تو کیا رنگ لاتے ہیں۔

اول تو تم کو خود معلوم ہے میں نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس پر یہ ناراض ہوں دوسرے یہ کہ جو کچھ لکھا گیا تھا اس کا بارے میں یہ خود اقرار کر چکے ہیں کہ اس میں کوئی نامعقول بات نہ تھی۔ لیکن اُن کی چھوٹی بہن عذرا نے مجھے بتایا کہ شیخ نیازی نہایت رازدارانہ طور پر ایک دن کہتے تھے کہ اَبا میاں نے باتیں تو سب ٹھیک لکھی تھیں صرف وہ گُٹھل والی بات ذرا خراب تھی!

شیخ صاحب کو گھر کے لوگ کبھی کبھی یوں بھی چھیڑ دیا کرتے ہیں۔ اس وقت یہ ایک نعرہ لگاتے ہیں جس سے سارے محلہ میں خبر ہو جاتی ہے کہ شیخ صاحب نے بے تکلفی کا اعلان کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں کوئی شخص قریب نہیں جا سکتا۔ کچھ تو اس سبب سے کہ ان کے نعرے میں وہ خاصیت ہے جو اکسِ ریز کی

شعاعوں میں ہے یعنی ہر چیز کو پار کر جاتی ہے ۔ اس لئے لوگ ان کے نعرے کی سیدھ میں نہیں آتے ۔ دوسرے یہ کہ اگر اپنے جلال کے دوران میں یہ کسی کو پکڑ پائیں تو پھر اسے اناللہ بنا دینے میں کوئی تامل نہیں کرتے ۔ ایک دن میں نے بھی جھنجھلا کر کہہ دیا تھا اور تم یقین مانو اس سے ان کی توہین نہیں بلکہ اپنی جھنجھلاہٹ دور کرنی مقصود تھی کہ پکڑ لاؤ اس گوریلے کو ۔ بات ختم ہو گئی تھی لیکن اس خطاب پر لوگوں نے چپکے چپکے ہنسنا شروع کر دیا تھا ۔ اس پر شیخ صاحب کے کان کھڑے ہوئے اور تم جانتے ہو جب کان کھڑے ہوں تو معمولی سے معمولی بات بھی کان میں داخل ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ گوریلے کے متعلق جو چہ میگوئیاں لوگوں نے کیں وہ شیخ صاحب کے کانوں تک پہنچیں ۔ شیخ صاحب میرے پاس آئے اور نہایت غصہ ناک لہجہ اور تیور سے بولے ، دیکھئے سب لوگ مجھے گوریلا کہتے ہیں ۔ پہلے تو میں خود گھبرایا لیکن مجھے شیخ صاحب کی کمزوریاں معلوم تھیں ، میں نے کہا آؤ بیٹھ جاؤ ، سب لوگ احمق ہیں ۔ آخر تمھیں یہ بھی معلوم ہوا کہ گوریلا کہتے کس کو ہیں ؟ انھوں نے کہا کہ اقبال و احسان کہتے ہیں کہ گوریلا افریقہ کا ڈراؤنا بندر ہوتا ہے اور پیام تعلیم میں اس کی تصویر بھی دکھاتے تھے ۔ میں نے کہا ان کو کیا معلوم گوریلا کسے کہتے ہیں ، گوریلا کے معنی ہیں غوریلا انھوں نے پوچھا غوریلا کیا ؟ میں نے کہا غور کرنے والا ، کہنے لگے (اور آواز میں غور اور غُرّاہٹ دونوں شامل تھی) تو غور کرنے سے کیا ہوتا ہے میں نے کہا غور کرنے کے بڑے فائدے ہیں ۔ ایک تو یہی دیکھو غوریلا بہت اچھے اچھے پھل کھاتا ہے ، پوچھا کون کون سے پھل ، میں نے کہا یہی امرود ، آڑو ، بھٹے ۔ اچھا تمھیں بتاؤ تم کو کون سے پھل پسند ہیں کہنے لگے امرود ۔ میں نے جیب سے اکنی نکالی اور ان کے حوالے کر کے کہا ابکے خوانچہ والا آئے تو امرود خرید لینا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے قہقہہ لگا کر ایک چھلانگ ماری اور میری جان بچ گئی !

شیخ نیازی اب اسکول جانے لگے ہیں ۔ بڑی پابندی سے جاتے ہیں اور نہایت تندہی سے واپس آتے ہیں ۔ بغیر پھندنے کی ٹوپی اور بغیر فیتے کا جوتا پہن کر جاتے ہیں ۔ جو کتاب یا کاپی سامنے مل جائے لے اخلاقاً ساتھ لے جاتے ہیں ۔ واپسی میں سیدھے وہاں پہنچتے ہیں جہاں سے کھانا تقسیم ہوتا ہے ، سب سے اچھی پلیٹ چنتے ہیں اور سب سے زیادہ کھانا لینا چاہتے ہیں اور کوئی مزاحمت کرنے تو اس طرح غراتے ہیں کہ ہاتھ سے پیالے کفگیر چھوٹ پڑیں ۔

ایک دن اسکول سے نہایت جوش و خروش میں واپس آئے جس میں ایک قسم کی تمکنت اور خود اعتمادی بھی پائی جاتی تھی ۔ آتے کے ساتھ ہی بولے عذرا کہاں ہیں ۔ عذرا اسکول سے آکر منہ

ہاتھ دھو رہی تھیں، بولیں کہو کیا ہے، بولے فوراً آؤ، عذرا
بیچاری دوڑی ہوئی آئیں تو بولے، عذرا آج بڑی بیڈھب
بات ہوئی، کھانے پر چلو تو تم کو بتاؤں۔ سب لوگ کھانے
پر جمع ہوئے تو دیکھا کہ شیخ صاحب آج غیر معمولی طور پر نہایت
فاتحانہ انداز سے کھانے پر ہاتھ مار رہے ہیں اور کوئی روکتا
ٹوکتا ہے تو ایسا گھور کر دیکھتے ہیں گویا اسے آنکھوں ہی آنکھوں
میں کھا جائیں گے، عذرا بولیں بھئی آج کیا بیڈھب بات
ہوئی ہے، بولتے تو ہو نہیں اور کھانا کھائے جاتے ہو، بولے
آٹھ ہزار، عذرا نے پوچھا آٹھ ہزار کیا۔ کہنے لگے ارے تم کیا
جانو "آٹھ ہزار۔ اُف" اور یہ کہہ کر خشکے کی پوری پلیٹ
اٹھالی۔ میں نے کہا بھائی آٹھ ہزار سے آگے بھی تو بڑھو ورنہ
کھانا ختم کردو، عذرا بولیں، ارے نیازی تم میری پلیٹ میں
شامل ہو جاؤ، اور ہاں بتاؤ تو کیا ہوا، شیخ صاحب نے ایک دفعہ
پھر للکارا آٹھ ہزار اور ہزار کے ز کو اس طور پر کھینچا کہ معلوم
ہوتا تھا دسترخوان کی ساری پلیٹیں کھڑکھڑانے لگیں گی، پھر
بولے، عذرا تم کو کیا معلوم آج میڈم نے آٹھ ہزار کا جوڑ لگانے کو
دیا تھا۔ سب لوگ دم بخود ہو گئے، اور شیخ صاحب سب کو متحیر
چھوڑ کر قریب ہی چارپائی پر لیٹ گئے اور پکارا شفیعا پانی پلا!
کھانا ختم ہونے پر ان کے بھائی بہنوں نے مجھ سے کہا
ابا میاں نیازی کا حساب بڑا اچھا ہے، ان کا امتحان لیجئے، میں
نے کہا اچھا بلاؤ، شیخ صاحب آئے لیکن تیور سے معلوم ہوتا تھا
کہ ابھی آٹھ ہزار کا نشہ اترا نہیں ہے۔ میں نے کہا شیخ جی تمہارے
حساب جاننے کا سب پر بڑا رعب ہے، ایک آدھ سوال میں
بھی کروں۔ کڑک کر بولے ہاں ہاں۔ میں نے پوچھا تمہاری عمر
کیا ہے بولے چھ برس۔ میں نے کہا تمہاری اماں بی کی عمر کیا
ہے (ماں سے پوچھ کر) بولے اٹھائیس برس۔ میں نے پوچھا
اچھا بتاؤ جب تم پیدا ہوئے تھے تو تمہاری اماں بی کی عمر کیا
تھی۔ پہلے تو خاموش رہے۔ اس کے بعد ہی آنکھوں میں چمک
آگئی، چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ یعنی آنکھ، کان، ناک،
دہانہ، ہونٹھ، ٹھوڑی، رخسار رفتہ رفتہ پھولنے بڑھنے لگے، پھر
جھومے اور ایک زبردست قہقہہ لگا کر فرمایا۔ اچھا، دھوکا دے
رہے ہیں، جب میں پیدا ہوا تھا تو ننھا منا بالکل احمد کے برابر تھا
(احمد ان کے سب سے چھوٹے بھائی کا نام ہے جس کی عمر بمشکل
ایک ماہ کی تھی) مجھے کیا معلوم اس وقت اماں بی کتنی بڑی تھیں!

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ گئے، لیکن عذرا کو خفت
ہوئی انھوں نے اپنے ہیرو کو ایک اور موقع دلانا چاہا اور مجھ سے
کہا ابا جان کچھ اور پوچھئے، میں نے کہا اچھی بات ہے۔ میں نے
پوچھا مسٹر نیازی یہ تو بتاؤ تمہاری عمر کیا ہے۔ کسی قدر ترش ہو کر

بولے بتا تو چکا چھ برس کا ہوں۔ میں نے کہا اس میں خفا ہونے کی کون سی بات ہے۔ عمر پوچھنے پر تو صرف عورتیں خفا ہوتی ہیں، تمھارا کیا بگڑتا ہے۔ اچھا بتاؤ عذرا کی عمر کیا ہے کہنے لگے نو سال کی۔ میں نے کہا ٹھیک۔ اب یہ بتاؤ تم بڑے ہو یا عذرا، ہنس کر بولے ارے یہ کیا بات ہوئی، عذرا مجھ سے تین سال بڑی ہیں۔ میں نے کہا اچھا کے سال میں تم عذرا سے بڑے ہو جاؤ گے نہایت فخر کے ساتھ برجستہ جواب دیا۔ "چار سال میں" !

اب عذرا سے بھی نہیں رہا گیا بولیں ابا میاں ان کا ایک اور واقعہ بھی آپ نے سنا۔ ایک دن میں نے ان سے کہا نیازی اسکول جاؤ، اُنھوں نے میرا کہنا گول کیا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا دیکھو ساڑھے نو بج گئے تم اسکول نہیں گئے، پھر بھی اُنھوں نے نہیں خیال کیا تو میں نے اماں بی سے کہا کہ ساڑھے نو بج گئے ہیں اور نیازی اسکول نہیں جاتے۔ اماں بی نے ڈانٹا تو، بگڑ کر بولے ارے اسکول کا وقت نو بجے کا ہے ابھی تو ساڑھے نو بجے ہیں !

شیخ نیازی نماز کے بڑے پابند ہیں۔ خواہ کسی حال میں ہوں نماز پڑھنے سے باز نہیں آتے۔ نماز کے دوران میں بعض لوگوں نے اعتراض کیا، مثلاً نماز کے لئے یہ قبلہ رو ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے، سر پر ٹوپی نہ ہو تو اس کی بھی پروا نہیں، جب جی چاہتا ہاتھ باندھ لیتے اور جب جی چاہتا دونوں ہاتھ کمر پہ باندھ لیتے۔ چاہا تو قرات شروع کر دی ورنہ قطعاً خاموش رہتے۔ جتنی دیر جی چاہتا رکوع میں رہتے اور سجدہ میں بھی جب تک جی میں آتا قیام فرماتے۔ الحمدللہ کی صرف چند نامکمل آیات یاد ہیں جن کو جب جی چاہتا خواہ قیام ہو رکوع ہو یا سجود صرف مختلف قرات سے ادا کرتے رہتے۔ لوگوں نے شبہ ظاہر کیا کہ یوں نہیں یوں ہونا چاہئے تو حیص بیص میں پڑ گئے اور بالآخر یہ طے کر لیا کہ نماز ہمیشہ عذرا کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ چنانچہ اب یہی کرنے لگے ہیں۔ ایک بار نماز کے دوران میں الحمدللہ کی آیت پڑھتے پڑھتے ریڈیو کا ایک گانا گانے لگے عذرا نے کہنی ماری تو اٹنشن ہو گئے۔

ایک بار سجدے میں تھے وہ بھی اس طور پر کہ صرف رکوع کو ذرا طوالت دیدی تھی یعنی ہتھیلی اور دونوں تلووں کے علاوہ جسم کا کوئی اور حصہ جانماز سے متصل نہیں تھا۔ ایاک نعبد پڑھتے جاتے تھے اور سر کو گھٹنوں کے قریب تر لاتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ ٹانگوں کے درمیان سے اپنی کیاری کے گلاب گننے لگے۔ اتفاق سے میں گذر رہا تھا، بولے ابا میاں میری کیاری میں گلہری آگئی ہے ذرا نکال دیجئے گا۔ ان کی آواز سے میں یہ سمجھا کہ یہ شاید تخت کے نیچے سے بول رہے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو یہ جانماز

پر اس غبارے کی شکل میں نظر آئے جو اُردو ریڈر وں میں چھپا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کیوں بھئی یہ کس قسم کی نماز ہے۔ بولے کیا کروں سب سے پوچھتا ہوں نماز میں منہ پھیر کر سلام کیسے کیا جاتا ہے۔ کوئی بتاتا ہی نہیں۔

ایک دن باہر سے آئے چہرہ تمتمایا ہوا، غصہ اور بے بسی کا یہ عالم تھا جیسے کوئی جوالا مکھی پہاڑ پھٹ پڑے گا۔ لوگوں نے پوچھا شیخ صاحب کیا حال ہے شیخ صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن غصہ کا یہ حال تھا کہ نتھنوں اور آنکھوں سے چنگاریاں اُڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں بولے اب میں نماز نہیں پڑھوں گا۔ عذرا نے سُنا تو بدحواس ہوگئیں، کہنے لگیں ارے توبہ کرو توبہ کیا بات ہوئی، پھر کر بولے اقبال نے مجھے گالی دی ہے۔ ایک طرف سے کسی نے آواز دی تو تم نے بھی کیوں نہیں گالی دی۔ یہ سنا تھا کہ چیخ پڑے اور عذرا پر اس طور پر جھپٹے گویا اسے جھنجھوڑ ڈالیں گے۔ عذرا بیچاری ایک طرف دبک گئیں۔ پھر بولے کیسے گالی دوں نماز جو پڑھتا ہوں۔ ان کے اس جواب پر دنیا داروں کی تو بڑی تفریح رہی لیکن عذرا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر باہر کا راستہ لیا اور تھوڑی دیر بعد انھیں سمجھا بجھا کر شاداں و فرحاں واپس لائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عذرا نے انھیں بتا رکھا تھا کہ جو نماز پڑھتا ہے وہ گالی نہیں بکتا ورنہ نماز کا سارا ثواب زائل ہو جاتا ہے۔

اسکول میں میڈم اور ماسٹر صاحب پر شیخ صاحب کا بڑا رُعب ہے میڈم جب کبھی آتی ہیں تو اُن کی بڑی تعریف کرتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ نیازی کلاس میں بہت باقاعدہ رہتے ہیں کبھی روتے جھگڑتے نہیں۔ محنت سے جی نہیں چُراتے اور ڈرل میں بڑے مستعد رہتے ہیں۔

ایک دن شام کو ان کے کلاس اور اسکول کے کچھ لڑکے ہمارے ہاں آئے۔ شیخ صاحب اپنی کیاری کے پھول سب کو دکھا رہے تھے۔ اور ہنسنے بولنے میں مصروف تھے میں نے لڑکوں سے دریافت کیا کیوں بھئی تم لوگوں میں سے کون کون کلاس میں مار کھاتا ہے اور مار کھانے پر روتا ہے۔ سب نے اقرار کیا کہ مار بھی کھاتے ہیں اور روتے بھی ہیں۔ ایک لڑکے نے کہا نیازی بھی تو مار کھاتے ہیں۔ شیخ صاحب چمک کر بولے لیکن روتا جو نہیں۔ میں نے پوچھا روتے کیوں نہیں بولے جو چلّانے پر مار کھاتا ہوں!

ماں نے پوچھا آخر اس کا کیا سبب ہے کہ گھر پر بغیر مار کھائے روتے ہو اور اسکول میں مار کھانے پر بھی چوں نہیں کرتے، لڑکوں کی طرف اشارہ کرکے بولے یہ جو وہاں ہوتے ہیں!۔

مسٹر نیازی فرمائش کرنے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔ ایک دن میں شہر جارہا تھا کہنے لگے میرے لئے ایک فٹ بال لائے گا۔ میں نے کہا اچھا، اب میری خاطر مدارات شروع ہوئی جوتا موزہ لاکر رکھ دیا گیا، ٹوپی ہاتھ میں لئے ہے اور اس کا پھندنا ہاتھ میں لے کر اس طور پر گھمانا شروع کیا کہ میرے اردگرد ۲-۲ چار چار گز تک مکھیوں کا گذرنا ناممکن ہوگیا اس دوران میں برابر فٹ بال کی صورت شکل، وزن، رنگ، فٹ بال میچ، اپنے کھیل کی تعریف، فٹ بال کے گم ہوجانے کے امکانات یا اس کے محفوظ رکھنے کی تدابیر، اپنے دوستوں کی توصیف، دشمنوں کی مذمت، اماں بی کو دوانہ پینے پر ملامت، غرض کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس پر ایک ہی سانس میں یہ اپنے سارے خیالات نہ ظاہر کرتے جارہے ہوں۔ اتنے میں عذرا میرے قریب آگئیں۔ انھوں نے لپک کر عذرا کو دھکا دیا اور بولے دیکھتی نہیں ابا میاں میرا فٹ بال لینے جارہے ہیں!

میں تانگے پر سوار ہوا۔ تانگے تک یہ بھی ساتھ آئے اور برابر فٹ بال کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔ میں کچھ دور نکل گیا۔ انھوں نے ایک نعرہ لگایا اور دوڑ پڑے میں نے تانگہ رکوایا، نہایت رازدارانہ لہجے میں بولے، دیکھئے فٹ بال کا فیتہ بھی لائے گا۔ کچھ دور آگے بڑھا، اتنے میں انھوں نے ایک بار پھر پکارا، ابا میاں جلد جلد جائے بڑے زور کی بارش آرہی ہے۔ غرض یہ شہر پہنچا اور رات گئے واپس آیا۔ دیکھا تو باہر کے بیرونی دروازے پر اندھیرے میں کھڑے ہیں، تانگا دیکھتے ہی نعرہ لگایا "ابا میاں فٹ بال" میں نے بھرا ہوا فٹ بال ان کے حوالے کیا اور فٹ بال پاتے ہی ان کے چہرے پر جو خوشی کی چمک آگئی ہوگی لہریں دوڑتی ہیں اور شیخ صاحب نے مسرت اور شادمانی کی جیسی کچھ صدائیں بلند کی ہیں ان سے مجھے کچھ ایسا معلوم ہونے لگا گویا ساری دنیا صرف ایک فٹ بال ہے جس کی ہر حرکت اور آواز صرف شیخ نیازی کی حرکت اور آواز ہے!

بچو، یہ آخری بات میں نے کچھ یونہی سی کہہ دی ہے اس کو تم ابھی نہیں سمجھوگے۔ اس کا لطف تم کو اس وقت آئے گا جب تم خود بچے سے باپ ہوگے پھر تم کو معلوم ہوگا کہ تحفہ ملنے پر بچہ کی خوشی سے ماں باپ کو کیسی خوشی ہوتی ہے۔ اس کا معمولی سا تجربہ تم کو یوں بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ تعطیل میں اپنے گھروں کو جاؤ تو اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کے لئے کوئی تحفہ لے جاؤ۔ پھر دیکھو وہ کیسے خوش ہوتے ہیں اور ان کی خوشی سے تمھارے دل میں خوشی اور تمتمندی کی کیسی لہریں

اٹھتی ہیں۔ مجھے ٹھیک یاد نہیں، بہت دن ہوئے میں نے اپنے بزرگوں کو ایک بار یہ بات کرتے سنا تھا کہ ہمارے تمھارے نبی کریم نے (خدا ان کی یاد کو ہمارے لئے بہترین یاد بنائے) فرمایا ہے مسلمانوں کو چاہئے کہ ایک دوسرے کو تحفے تحائف لیا دیا کریں۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔

بچو، معاف کرنا مضمون لکھنے میں میری عادت بیچ بیچ میں بہک جانے کی ہے۔ میرے دل میں جو کچھ آتا ہے اسے لکھتا جاتا ہوں یہی نہیں بلکہ لکھنا چھوڑ کر جھاڑو دینے لگتا ہوں خوانچہ والوں سے دام چکانا شروع کر دیتا ہوں، کپڑا دھونے لگتا ہوں، کسی بچے سے کھیلنے لگتا ہوں یا اسے ڈانٹنے لگتا ہوں یا لیٹ کر گانے لگتا ہوں یہاں تک کہ گھر کے سب لوگ اپنا اپنا کام کاج چھوڑ کر ہنسنا شروع کر دیتے ہیں یا مجھے دھمکانے لگتے ہیں اور میں تمھارے لئے پھر مضمون لکھنے لگتا ہوں یعنی ختم کر دیتا ہوں۔

نیازیو، شیخ نیازی کی داستان ختم نہیں ہو سکتی اب یہ سیانے ہو رہے ہیں اور پسند نہیں کرتے کہ میں ان پر مضمون لکھوں لیکن تم کو معلوم نہیں مضمون لکھنے کی عادت بڑی خراب ہوتی ہے اور میں بڈھا ہو رہا ہوں۔ تمھارے شیخ الجامعہ صاحب نے سچ کہا ہے کہ بری عادتیں بڑھاپے میں جوان ہو جاتی ہیں۔ اس لئے میری عادت تو ترک نہیں ہو سکتی میں صرف یہ البتہ کر سکتا ہوں کہ آئندہ سال شیخ نیازی کو جامعہ میں داخل کرا دوں وہیں وہ تم سے تم ان سے اور تم دونوں اڈیٹر صاحب پیام تعلیم سے نپٹ لینا۔

خدا حافظ

ہوائی سفر کا رواج

امتیاز صاحب

آدمی کا بھی کیا کہنا، جس چیز کی دُھن لگ جائے بس اُسی کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اور اُسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ ہوا میں اُڑنے کی سوجھی تو اُسی کو کمال تک پہنچا دیا۔ ابھی سنہ ۱۹۰۰ء میں اس کے پاس ہوائی جہازوں کا نام نہ تھا۔ اور آج ان میں اُڑتا پھرتا ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ آدمی ان ہوائی جہازوں میں کتنا سفر کرتے ہونگے۔ اچھا ذرا دل میں خیال تو کر لو اور پھر نیچے کی تصویروں کو دیکھو تو حیران رہ جاؤ گے۔

پہلی تصویر میں یہ دکھایا ہے کہ اگر دنیا اتنی بڑی ہو جتنی تصویر میں ہے تو بعض ملکوں کے ہوائی اسٹیشنوں کے درمیان کا فاصلہ ۱۹۳۴ء میں وہ تھا جو تصویر کے حلقوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

دیکھو امریکہ کے ہوائی جہازوں نے تو سنہ ۳۴ء میں کوئی ۸۱۷۳۸ کلومیٹر طے کئے۔ کچھ سمجھے، یہ زمین کے خطِ استویٰ سے دوگنی لمبائی ہوئی! (کلومیٹر ہزار میٹر کو کہتے ہیں، اور میٹر کوئی ۳ ۱/۴ فٹ کا ہوتا ہے) امریکہ کے بعد فرانس کا نمبر ہے۔ اس کے بعد جرمنی کا۔ پھر انگلستان اور آسٹریلیا کا۔

اسی مطلب کو اس دوسری تصویر میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ دیکھو، ایک طرف زمین ہے

جہاں سے جہاز چلے ہیں دوسری طرف سورج ہے، بیچ میں عطارد اور زہرہ ہیں۔ اگر اس فاصلے کو جوڑ لیا جائے جو دنیا کے سارے ہوائی جہازوں نے ۱۹۳۴ء میں طے کیا تھا تو زمین سے سورج تک کا فاصلہ ہو جاتا ہے۔ خالی امریکہ کے جہازوں نے جو فاصلے طے کئے وہ مریخ تک پہنچا دینے کو بس کرتے ہیں۔ اسی نسبت سے بعض دوسرے ملکوں کے ہوائی جہازوں کے سفروں کے فاصلے بھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

تیسری تصویر سے معلوم ہوگا کہ ۱۹۳۴ء میں کتنے آدمیوں نے ہوائی جہاز سے سفر کیا۔

چوتھی تصویر سے معلوم ہوگا کہ مختلف ملکوں نے اپنی ڈاک کے لئے اور باربرداری کے لئے ہوائی جہازوں سے کتنا کام لیا۔ ڈاک کا کام سب سے زیادہ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی نے لیا ہے۔ اور باربرداری کا کینیڈا اور جرمنی نے۔ اس کے بعد اوروں کا نمبر آتا ہے۔

لیکن یوں دور دور اڑنے اور ہوا پر قابو پانے پر بھی یہ آدمی کہاں بس کرتا ہے۔ خالی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ گئے اور اپنا سامان بھیجدیا یا خط بھیجدئے تو کیا ہوا۔ یہ بھی تو پتہ چلانا چاہئے کہ اوپر ہو کیا رہا ہے۔ اس کام کے لئے ہوائی جہاز بہت کام نہیں دیتے۔ ہوائی جہاز تو ابھی کُل ۱۵ ہزار میٹر کی اونچائی کو بھی نہیں پہنچا۔ ابھی حال میں ایک فرانسیسی ۱۴۸۳۶ میٹر یعنی کوئی ۹ ۱/۴ میل کی اونچائی پر اڑا تھا اور آدمی بھلا اس پر کیسے قانع ہو جائے۔ وہ تو اوپر جانا چاہتا ہے اور اوپر۔ اس کام کے لئے وہ غباروں کا استعمال کرتا ہے۔ ابھی حال میں دو امریکن ایک غبارے میں اڑے تھے اور ۲۲ ہزار ۰۰ ۶ میٹر کی اونچائی تک پہنچے۔ غبارے میں طرح طرح کے آلات لگائے گئے تھے جن سے ہوا کی ہر بیت کا حال اچھی طرح معلوم ہوتا جاتا تھا اور چونکہ سردی کی وجہ سے اڑنے والے تو

نوٹ: یہ ہندسے میلوں کے ہیں۔
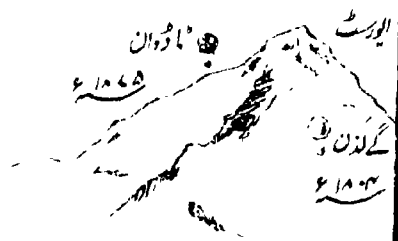
آلات میں سب باتیں بڑھ نہ سکتے تھے
اس لئے ہر آلہ کے ساتھ ایک فوٹو کا کیمرا
لگا تھا۔ سب کچھ چھپتا جاتا تھا۔ ہر بیرٹ کی
رنگین فلمیں بھی اسی کے ساتھ ساتھ بنتی گئیں۔
خیال ہے کہ اگر ہوا کی اوپر کی پرتوں
کا حال اچھی طرح معلوم ہو جائے اور پھر ہوائی
جہاز اس اونچائی سے اُڑ سکیں تو ۳-۴ سو
میل فی گھنٹہ کے حساب سے تو بآسانی
سفر کر سکتے ہیں اور ہزار میل فی گھنٹہ کا خواب
بھی بعض لوگ دیکھ رہے ہیں۔ ساری دنیا
بس ایک چھوٹا سا شہر بن جائیگی۔ ساتھ والی
تصویریں میں یہ دکھایا ہے کہ غباروں میں مختلف
لوگ کتنی اونچائی تک پہنچتے ہیں۔ اونچائی
کے اندازہ کے لئے بیچ میں کوہ ایورسٹ
کو بھی اسی نسبت سے بنا دیا ہے۔ دیکھو آدمی
غباروں میں ایورسٹ سے کس قدر
اوپر پہنچ گیا ہے ٭

اس مضمون میں کئی جگہ 'میٹر' کا لفظ آیا ہے۔ جانتے ہو 'میٹر' کیا ہوتا ہے۔ میٹر لمبائی ناپنے
کا ایک پیمانہ ہے۔ ہزار میٹر کا ایک کلومیٹر ہوتا ہے۔ جیسے ہزار گرام کا ایک
کلوگرام ہوتا ہے۔ یہ فرانسیسی پیمانہ ہے اور سارے یورپ میں اس کا
رواج ہے۔ فرانسیسی پیمانوں میں یہ خوبی ہے کہ بڑھتے ہیں تو دس گنے ہو
جاتے ہیں، گھٹتے ہیں تو دسواں حصّہ ہو جاتا ہے۔ دس سے ضرب دینے
اور تقسیم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ انگریزی پیمانوں میں ۳ اور ۱۲
اور ۲۰ سے ضرب تقسیم کرنی ہوتی ہے۔ اچھا تو ایک کلومیٹر کے میل کتنے
ہوتے ہیں۔ کوئی ۶ر سمجھے یہ ۶ر کیا ہوا۔ یہ ہوا ۶/۱۰ یعنی کسی چیز کے ۱۰ حصّے کئے اور ان میں ۶ لے لئے
تو اُسے ۶/۱۰ یا ۶ر لکھینگے۔ تو کلومیٹر ہوا میل کا ۶/۱۰ تقریباً۔ بس اگر کلومیٹر کے میل بنانا ہو تو ۶ سے ضرب دیکر ۱۰ سے [illegible]

کھیل اور کام

جناب حمدی صاحب فیروزپور

کام کرنے والے

بادشاہ .... تین سارنگی والے
تین طبلچی .... تین شہنائی نواز
دو خادم .... ڈاکٹر سخت دل

ایک مزدور لڑکا

لباس

بادشاہ ۔ گتے کا بنا ہوا تاج جس پر سنہری کاغذ لگا ہو
سُرخ قمیص، نیلے رنگ کا چغہ جس پر چھوٹے سلمے
ستارے کا معمولی کام بنا ہو، سفید نکر، گھٹنوں تک جرابیں
سارنگی والے ۔ لمبی نیلی جرابیں، سُرخ قمیص، نیلی پٹیاں۔
طبلچی ۔ لمبی جرابیں۔ سبز قمیص، سُرخ پٹیاں۔
شہنائی نواز ۔ لمبی سبز جرابیں۔ سُرخ قمیص۔ سبز پٹیاں۔
خادم ۔ لمبی سُرخ جرابیں، سُرخ قمیص۔
ڈاکٹر ۔ سیاہ چغہ، اونچی ٹوپی۔

بادشاہ کا دربار

اس ڈرامے کے کھیلنے کے لئے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں۔ چند پردے پس منظر کا کام دے سکتے ہیں اگر کمرے میں کھیلا جائے تو اس کے داہنی طرف ایک دریچہ اور بائیں جانب دروازہ ہو تو بہتر ہے۔ ورنہ پردوں ہی سے کام چلا لیا جائے۔ بادشاہ کے تخت کے لئے ایک کرسی کافی ہے جس پر رنگین بیل بوٹے کی چادر پڑی ہو۔ جب پردہ اٹھے تو بادشاہ تخت پر بیٹھا ہو چہرے سے پریشانی ظاہر ہو۔ سر کو داہنے ہاتھ کا سہارا دے کر ذرا آگے جھکائے ہو۔ تخت کے دونوں طرف ایک ایک خادم ہو۔ ان کے چہرے بھی مغموم اور پریشان ہوں

پہلا منظر

بادشاہ ۔ (کراہتے ہوئے) ہائے! ہائے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جس سے میں دل بہلا سکوں؟
پہلا خادم (آگے بڑھ کر) بادشاہ سلامت کیا میں سارنگی والوں کو بلاؤں

نوٹ ۔ لباس میں ضرورت کے مطابق ترمیم کی جا سکتی ہے۔

بادشاہ ۔ بہتر بلا دیکھو ۔ شاید وہ کوئی نیا نغمہ سنائیں۔
(خادم دروازے کی طرف جاتا اور پکارتا ہے)
پہلا خادم ۔ سارنگی والو ! بادشاہ سلامت تمھیں یاد فرمارہے ہیں۔
تینوں سارنگی والے اپنا اپنا ساز بغل میں دبائے آہستہ آہستہ داخل ہوتے اور جھک کر بادشاہ کو سلام کرتے ہیں

(فرش پر بیٹھ جاتے ہیں ۔ ہر شخص آہ بھرتا ہے)
دوسرا خادم (آگے بڑھ کر) شاید حضور اپنے طبلچیوں یا شہنائی نوازوں سے کچھ سننا پسند فرمائیں۔
بادشاہ بہتر انھیں بھی بلا دیکھو
دوسرا خادم (دروازے کی طرف جاتا اور پکارتا ہی) طبلچیو اور شہنائی نوازو ۔ بادشاہ سلامت تمھیں یاد فرمارہے

سارنگی والے ۔ (غم ناک آواز میں) کیا حضور سارنگی سننا چاہتے ہیں۔
بادشاہ کیا تمھیں کوئی نیا نغمہ آتا ہے ؟
سارنگی والے ۔ نہیں حضور
بادشاہ تو پھر مجھے تکلیف دینے کی ضرورت نہیں
سارنگی والے (اطمینان کا سانس لے کر) شکریہ حضور

ہیں۔
تینوں طبلچی اور شہنائی نواز داخل ہوتے ہیں اور جھک کر بادشاہ کو تعظیم بجالاتے ہیں۔
شہنائی نواز ۔ کیا حضور کی خواہش ہے کہ ہم اپنے ساز چھیڑیں
بادشاہ کوئی خاص ضرورت نہیں خیر تم اپنا کام شروع کرو

شہنائی نواز شہنائیاں بجانے لگتے ہیں اس قدر مکروہ آواز نکلتی ہے کہ حاضرین کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور ہر ایک کے ماتھے پر بل پڑجاتے ہیں

بادشاہ۔ (چلاکر) رکو، رکو! اپنی اس موسیقی کو اگر تم اچھی طرح نہیں بجا سکتے تو خدا کے لئے چپ رہو۔

تینوں شہنائی نواز۔ شکریہ حضور

بادشاہ۔ (طبلچیوں سے مخاطب ہوکر) میرا خیال ہے تمھارا بھی یہی حال ہے۔

پہلا طبلچی۔ اعلیٰ حضرت! میرا طبلہ ٹوٹ گیا۔

دوسرا طبلچی۔ حضور! مجھے افسوس ہے کہ میری ایک چھڑی گم ہوگئی ہے۔

تیسرا طبلچی۔ حضور میں اکیلا بجانے کے ناقابل ہوں۔

بادشاہ۔ ہاں میں جانتا ہوں (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے) کوئی نئی چیز نہیں جس سے دل بہلایا جاسکے۔ جو میری مصیبت کو کچھ ہلکا کرسکے۔ آہ! یہ دنیا کس قدر بے لطف جگہ ہے۔ میں موسیقی سے بیزار ہوچکا ہوں۔ ناچ کو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔ ہر شخص میرے حال سے واقف ہے۔ پھر بھی کوئی ایسا نہیں جو میرے لئے تسکین کا کچھ سامان بہم پہنچاسکے درباریو! سوچو، خوب غور کرو۔ شاید کوئی نئی چیز مل سکے۔

سب درباری سر کھجانے لگتے ہیں گویا انتہائی غور و فکر کی حالت میں ہیں۔ پہلا خادم آگے بڑھتا ہے۔

پہلا خادم۔ حضور کیا یہ مناسب نہیں کہ ڈاکٹر سخت دل سے مدد لی جائے

بادشاہ۔ ہاں۔ ۔ شاید۔۔۔ اچھا اسے بلاؤ۔

خادم باہر چلا جاتا ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر بشاشت کے آثار نمودار ہوتے ہیں۔ طبلچی شہنائی نواز اور سارنگی والے اپنا اپنا ساز صاف کرتے ہیں۔ بادشاہ تاج سیدھا کرتا اور منتظر بیٹھ جاتا ہے۔

خادم کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر سخت دل ہاتھ میں ایک سیاہ تھیلا پکڑے اور بغل میں ایک موٹی سی کتاب دبائے داخل ہوتا اور جھک کر بادشاہ کو سلام کرتا ہے۔

ڈاکٹر سخت دل ۔ اعلیٰ حضرت اور حاضرین دربار!

صباح بخیر ۔ حضور نے مجھے کس لئے یاد فرمایا ہے

بادشاہ ۔ ڈاکٹر صاحب! بات یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ہر چیز سے اُکتا گیا ہے ۔ موسیقی سے ، ناچ سے کھیلوں سے ، اب ہم کوئی نئی چیز چاہتے ہیں ۔

ڈاکٹر سخت دل ۔ اچھا یہ بات ہے ۔ مجھے ذرا اپنی کتاب کا مطالعہ کر لینے دیجئے ۔

ڈاکٹر کتاب کھولتا ہے ۔ اس کے ماتھے پر کبھی بل پڑتے ہیں ۔ کبھی اُترتے ہیں ۔ ہر شخص مضطرب نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا ہے ۔ اچانک باہر سے گانے کی آواز آتی ہے جو قریب ہوتی جاتی ہے ۔

گانا

کہتے ہیں بادشاہ کو آرام ہے پسند
درباریوں کو اس کے فقط نام ہی پسند
ہم سے جو پوچھو بھائی ہمیں کام ہی پسند
عاشق ہمارا کام تو ہم کام پر فدا
ہمدرد اس سے بڑھ کے نہ کوئی ہمیں ملا
پیدا ہی کام کے لئے ہم کو کیا گیا
آقا ہمارے دیتے ہیں گو رنج بے شمار
اُجرت بھی پوری ملتی نہیں ہم کو زینہار[1] (ہرگز)
جان اور دل سے پھر بھی ہمیں کام سے ہی پیار
دن بھر کے کام کاج سے فارغ جونہی ہوئے
جو مل گیا سو کھا لیا اور کھا کے سو رہے
اُٹھے جو دن کو چل دئے پھر کام ڈھونڈنے

بادشاہ ۔ الٰہی خیر! یہ کیا؟

پہلا سارنگی والا ۔ (دریچے میں سے باہر کی طرف دیکھتا ہے) حضور ایک مزدور لڑکا گا رہا ہے ۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہے لیکن بے حد مسرور نظر آ رہا ہے

ڈاکٹر سخت دل دھماکے کے ساتھ کتاب بند کر دیتا ہے

ڈاکٹر سخت دل ۔ درست ، درست ۔ بالکل درست اعلیٰ حضرت آپ کی تکلیف کا باعث صرف یہ ہے کہ آپ کچھ کام نہیں کرتے ہر وقت کھیلنا بھی انسان کے لئے مضر ہے اور ہر وقت کام کرنا بھی مُضر!

بادشاہ ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو ۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں ۔

ڈاکٹر سخت دل ۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں ۔ براہِ کرم کسی کو بھیج کر اس لڑکے کو بلوائیے

بادشاہ کوئی جا کر اسے بلا لائے ۔

پہلا خادم بہتر ، حضور ۔

خادم باہر جاتا اور تھوڑی دیر میں لڑکے کو ساتھ لئے داخل ہوتا ہے ۔ لڑکے کے ہاتھ میں ایک پھاوڑا ہے وہ جھک کر بادشاہ کو سلام کرتا ہے ۔

بادشاہ ۔ لڑکے مجھے بتاؤ ۔ تم اتنے خوش کیوں ہو؟

مزدور لڑکا ۔ حضور آسمان نکھرا ہوا ہے ۔ سورج چمک رہا ہے راستے برف سے اٹے ہوئے ہیں کیا یہ چیزیں کسی کو خوش کرنے کے لئے کافی نہیں؟ میں تمام دن محنت کروں گا ۔ رستوں پر سے برف ہٹاؤں گا شام کو مجھے مزدوری ملے گی ۔ اسے جس طرح چاہوں گا خرچ کروں گا ۔ کیا یہ سب مجھے خوش کرنے کو کافی نہیں؟

ڈاکٹر سخت دل ۔ ملاحظہ فرمایا حضور نے ۔ وہ محنت کرتا ہے اس لئے خوش ہے

بادشاہ (تخت سے اُٹھتے ہوئے) درست ہے ڈاکٹر صاحب! اُٹھو لوگو! ہم سب باہر جاکر رستوں پر سے برف ہٹائیں

تمام اہل دربار (خوش ہوکر) جو ارشاد حضور

سازندے اپنے ساز پھینک دیتے ہیں اور بادشاہ کے پیچھے پیچھے ہنستے، باتیں کرتے جارہے ہیں

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

منظر وہی پہلا ہے ۔ لیکن دریچے پر پردہ پڑا ہوا ہے ۔ اگر ممکن ہو تو لیمپ روشن کردئے جائیں

تاکہ معلوم ہو کہ اب شام ہے ۔

بادشاہ داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے دونوں خادم ہیں ۔ سب کے ہاتھوں میں پھاوڑے ہیں ۔

بادشاہ ۔ دوستو! آؤ ہم ایک بار پھر خوشی منائیں ۔ سارنگی والو کچھ سناؤ ۔

سارنگی والے اپنا ساز اُٹھاتے ہیں لیکن جب
بجانے کی کوشش کرتے ہیں تو کراہنے لگتے ہیں
کیوں کہ اُن کے ہاتھ سردی سے سن ہو چکے ہیں
بادشاہ:۔ (ہنستا ہے) معلوم ہوتا ہے کہ تم محنت کے عادی
نہیں (کھڑے ہو کر ہاتھ سے سب کو خاموش
رہنے کا اشارہ کرتا ہے) مجھے ایک اعلان

پہلا خادم۔ ڈاکٹر سخت دل حضور سے ملاقات کے
خواہاں ہیں
بادشاہ انھیں بلاؤ۔
ڈاکٹر سخت دل اعلیٰ حضرت میں فیس کے لئے داخل ہوا ہوں
بادشاہ۔ فیس کیسی؟ کیا تم نے مجھے کوئی دوا دی تھی۔
ڈاکٹر سخت دل۔ اعلیٰ حضرت! اور یہ محنت و مشقت دوا

کرتا ہے۔ آیندہ میرے دربار کے ہر شخص کو چار
گھنٹے روزانہ کام کرنا لازم ہے سستی اور کاہلی
نیست و نابود کرنے کا یہی واحد علاج ہے۔ سُن
لیا سب نے؟
سب درباری۔ (سر جھکا کر) جو ارشاد
(پہلا خادم داخل ہوتا ہے)

نہیں تو کیا ہے! کیا آپ اس سے تندرست اور
ہشاش بشاش نہیں ہوگئے؟
بادشاہ۔ درست کہتے ہو۔ میں اپنی پچھلی حالت بھول گیا تھا
خادم! ڈاکٹر صاحب کو میرے خزانے سے اشرفیوں
کی ایک تھیلی دے دو۔
(خادم حکم کی تعمیل کرتا ہے)

ڈاکٹر سخت دل ۔ (آداب بجالاکر) میں حضور کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور اب چونکہ میری خدمات کی ضرورت نہیں رہی اس لئے آپ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ اعلیٰ حضرت اور حاضرینِ دربار ۔ الوداع ۔

حاضرینِ دربار ۔ الوداع ، ڈاکٹر سخت دل ۔ الوداع ۔

بادشاہ خادم ! اس مزدور لڑکے کو بلاؤ تاکہ وہ ہمارے جشنِ مسرت میں شریک ہوسکے ۔

خادم باہر چلا جاتا اور تھوڑی دیر میں مزدور لڑکے کو ساتھ لئے داخل ہوتا ہے ۔ لڑکا آداب بجا لاتا ہے ۔

بادشاہ ۔ لڑکے تم نے ہمیں کام کرنا سکھایا اس کے عوض ہم تمھیں انعام دینا چاہتے ہیں ۔ خادم ! اسے اشرفیوں کی ایک تھیلی دے دو ۔

(خادم تعمیل کرتا ہے)

مزدور لڑکا ۔ شکریہ حضور

بادشاہ ۔ جانے سے پہلے ہمیں اپنا گیت ایک بار پھر سناؤ

(لڑکا گاتا ہے)

کہتے ہیں بادشاہ کو آرام ہے پسند
درباریوں کو اس کے فقط نام ہی پسند
ہم سے جو پوچھو بھائی ہمیں کام ہی پسند
الخ ....

(پھر سب مل کر گاتے ہیں)

کام جہاں میں سب سے نرالا
کام کا ہردم بول ہے بالا
کام کروگے عیش کروگے
بے کاری میں دکھ ہی بھروگے
بے کاری ہے زحمت بھائی
باکاری ہے رحمت بھائی
قول یہ حمدی کا نہ بھلانا
کام سے ہرگز جی نہ چرانا

(گانے کے بعد سب خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں ۔)

بادشاہ ۔ آج مجھے معلوم ہوگیا کہ انسانی زندگی پر کام کا کتنا اثر ہے ۔ وہ لوگ جو کچھ کام نہیں کرتے ۔ ہمیشہ اداس اور مغموم رہتے ہیں ۔ آج سے پہلے میرا جو حال تھا تم سب کو معلوم ہے کیا میں اب وہی پہلا سا انسان ہوں ؟ نہیں ہرگز نہیں ۔ کام نے مجھ میں زندگی اور مسرت کی روح پھونک دی ہے ۔ اب میں ایک ایسا انسان ہوں جس کے حوصلے بلند ۔ خیالات پاکیزہ اور ارادے مضبوط ہیں ۔ اے کام تجھ پر خدا کی رحمت ہو ۔

(دربار برخاست)

پردہ

ہوا کا دباؤ

(از ابو طاہر داؤد صاحب بی ایس سی ، لک)

دیا سلائی کا ایک خالی بکس مع اس کے ڈھکنے کے لے کر تجربہ کرو ۔ خالی بکس اٹھا کر میز پر رکھو اور اس کے اوپر اس کا ڈھکنا کھڑا کر دو
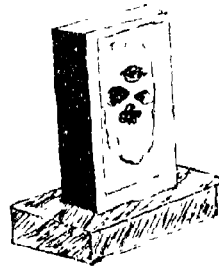
اب ہم یہ چاہتے ہیں کہ بکس اور اس کے ڈھکنے کو اس طرح ترتیب دیں کہ ڈھکنا نیچے رہے اور بکس اس کے اوپر قائم ہو جائے لیکن خبردار ہاتھ نہ لگنے پائے ۔ کیا تم بغیر ہاتھ لگائے ہوئے ایسا کر سکتے ہو ؟

(تصویر نمبر ۱)

لو اپنا منہ ڈھکنے کے کھلے ہوئے منہ پر رکھو اس کے بعد ایک گہری سانس اندر کو کھینچ کر ڈھکنے کی ہوا کھینچ لو اور اس کے بعد اسی حالت میں فوراً ہی سر کو پیچھے کی طرف لے جاؤ

اب بکس اوپر ہے اور اس کا ڈھکنا نیچے ۔ یہی تو ہم چاہتے تھے ۔ دیکھو یہ دونوں اس طرح ایک دوسرے سے چپکے ہوئے ہیں ۔ گویا ہم نے دونوں کے درمیان گوند لگا دیا ۔ آخر اس کا سبب کیا ہے ۔ کونسی چیز ہے جو بکس کو ڈھکنے پر قائم کئے ہوئے ہے ۔ اور اس کو اوپر سے

(تصویر نمبر ۲)

گرنے نہیں دیتی ۔ شاید کوئی چیز اس کو اندر سے پکڑ کر کھینچ رہی ہے ۔ لیکن ہمیں نظر نہیں آتی ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈھکنے کے اندر کی ہوا ہم نے اپنے منہ سے کھینچ لی ہے ۔ مگر بکس کے اوپر کی ہوا میں کوئی فرق نہیں آیا ہے یعنی بکس کے نیچے ہوا کا دباؤ بالکل نہیں ہے اور بکس کے اوپر ہوا کا دباؤ بہت ہے ۔ اس لئے بکس ڈھکنے کے اوپر اس طرح چپک گیا کہ ہل نہیں سکتا ۔ اس لئے

"معلوم ہوا کہ ہوا نیچے کی طرف دباؤ ڈالتی ہے"

اس کے بعد ایک دوسرا تجربہ ہے۔ شیشے کا گلاس لے کر اس میں لبالب پانی بھرو اور اس کے منہ پر ایک پوسٹ کارڈ رکھ دو۔ پھر پوسٹ کارڈ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اپنا ہاتھ اُلٹ دو۔
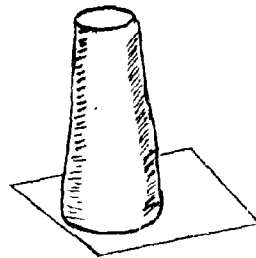
تم نے کیا دیکھا؟... کیا تم نے یہ خیال نہیں کیا تھا کہ گلاس الٹا کرتے ہی پوسٹ کارڈ

(شکل نمبر ۳)

نیچے گر جائے گا اور پانی بھی۔ لیکن یہاں تو معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ پوسٹ کارڈ اسی طرح گلاس کے منہ پر لگا ہوا ہے اور پانی اسی طرح گلاس میں بھرا ہوا ہے۔ اس کی کیا وجہ؟ گلاس کا تمام پانی پوسٹ کارڈ پر زور ڈال کر کیوں نہیں بہہ جاتا۔ شاید اس کا زور یا دباؤ کسی اور چیز کے دباؤ سے کم ہے۔ وہ کون سی چیز ہے؟ یقیناً یہ ہوا ہے کہ جو پوسٹ کارڈ کے نیچے سے دباؤ ڈال رہی ہے یعنی پانی پوسٹ کارڈ کو نیچے دبا رہا ہے اور ہوا اس کو اوپر اٹھا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوا اوپر کی طرف بھی دباؤ ڈالتی ہے۔ ہم نے دیکھ لیا کہ ہوا نیچے کی طرف اور اوپر کی طرف دباؤ ڈالتی ہے۔ کیا دونوں کی طرف بھی دباؤ ڈالتی ہے؟
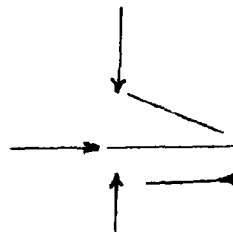
ایک ہی طرح کی دو شیشے کی تختیاں لے کر پانی میں رکھ دو۔ پھر ان کو نکال کر ایک دوسرے کے اوپر رکھو۔ اب تم ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیا محسوس ہوتا ہے؟ جدا نہیں ہوتیں! اچھا اوپر سے زور لگاؤ۔ نیچے سے زور لگاؤ۔ دہنی طرف سے کوشش کرو۔ بائیں طرف سے کھینچو۔ اچھا چھوڑ دو۔ یہ تختیاں کسی طرف سے بھی جدا نہیں ہوتیں۔ آخر اس کی وجہ؟ تختیوں کے بیچ میں پانی ہے۔ ہوا نہیں ہے۔ تختیوں کے اوپر ہوا ہے یعنی اُن کے چاروں طرف ہوا اتنا دباؤ ڈال رہی ہے کہ تختیاں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہوا نہ صرف اوپر کی طرف اور نیچے کی طرف دباؤ ڈالتی ہے بلکہ دونوں طرف بھی دباؤ ڈالتی ہے۔

تم نے ایک نلکی سے صابن کے پانی کے "بلبلے" چھوڑنے کا کھیل کھیلا ہے؟ نہیں کھیلا ہے تو دیکھا ہوگا۔ پانی کے یہ بلبلے بالکل گول کیوں رہتے ہیں۔ اُن کے اندر کیا بھرا ہوتا ہے؟ تم خود سمجھ سکتے ہو کہ اس میں سوائے ہوا کے اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔ یہ ہوا پانی کے قطرے کے اندر ایسا پھیلتی ہے کہ ذرا سا پانی ربڑ کے پھکنے کی طرح پھول جاتا ہے اور چونکہ ہوا کا دباؤ ہر طرف سے برابر ہوتا ہے اس لئے اس بلبلے کی شکل بالکل گول ہوتی ہے۔ اگر کہیں سے کم زیادہ ہوتا تو اس کی شکل بھی ایسی مکمل نہ رہتی۔

اب اس کے بعد ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ ہوا کس قدر دباؤ ڈالتی ہے۔

دوسرے تجربے میں ہم معلوم کر چکے ہیں کہ ہوا

کے دباؤ نے گلاس کے اندر کے پانی اور اس پر لگے ہوئے پوسٹ کارڈ کو کس طرح سہار لیا تھا۔ اب تم ایک بڑی
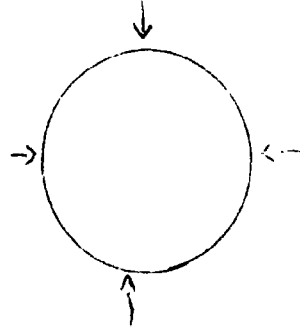
گاجر لو اور اس حصے پر سے جہاں وہ سب سے زیادہ چوڑی ہے اس کو کاٹ لو اور پھر اس کے چکنے حصے کو چینی کی ایک بڑی پلیٹ پر رگڑو۔ تھوڑی دیر میں وہ اس طرح چسپاں ہو جائے گی کہ اگر تم اس کو اوپر اٹھاؤ گے تو اس کے ساتھ وہ وزنی پلیٹ بھی اٹھ آئے گی۔

اسی طرح دوکان دار ربڑ کے گول ٹکڑوں کو پانی سے تر کر کے شیشوں پر لگا کر دبا دیتے ہیں۔ اور ان میں وہ چیزیں ٹانگ دیتے ہیں جن کی انھیں نمائش کرنا مقصود ہوتی ہے۔ ان ٹکڑوں پر ہوا کا دباؤ اس قدر ہوتا ہے۔ کہ وہ ان وزنی چیزوں کا بوجھ سہار لیتے ہیں۔ اسی اصول پر پرانے زمانے میں ایک بڑے سائنس داں نے ہوا کے

دباؤ کا ایک بڑا کرشمہ دکھایا ہے اس کا نام میگ ڈی برگ (MAGDEBURG) تھا۔ اور وہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس نے دھات کے دو بڑے بڑے پیالے خاص طور پر ایسے بنوائے تھے جو بالکل ایک ہی جسامت کے تھے

اور ان کے منہ ایک دوسرے سے ملا کر رکھ دئے جاتے تو بالکل فٹ آجاتے۔ اس کے بعد اس نے ان دونوں کے اندر کی ہوا " ہوا نکالنے کے پمپ " سے خارج کر دی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پیالے ایک دوسرے سے بالکل جڑ گئے۔ اب اس نے اُن کو ایک دوسرے سے جُدا کرنے کے لئے کتنا ہی زور مارا۔ لیکن یہ علیحدہ نہ ہوئے۔ اس کے بعد اس نے گھوڑوں کی طاقت سے اِن کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی جُدا نہ ہوئے یعنی پیالوں کی بیرونی سطح پر ہوا کا دباؤ اس قدر تھا کہ اس کے مقابلے میں گھوڑوں کی طاقت بالکل بے کار ہو گئی۔

ہوا کے دباؤ کے اسی اصول پر بہت سے دلچسپ تجربے کئے جا سکتے ہیں۔ اگر تمھارے پاس شیشے کی امتحانی نلیاں ہوں تو تم ذیل کا تجربہ خود کر سکتے ہو۔

تم ایسی دو نلیاں لو کہ جن میں سے ایک چوڑی ہو اور ایک اتنی پتلی ہو کہ وہ آسانی سے چوڑی نلی میں داخل کی جا سکے، اب تم چوڑی نلی میں پانی بھر دو۔ اور اس کے

بعد پتلی نلی کو چوڑی نلی کے منہ پر رکھ کر آہستہ سے دباؤ
یہاں تک کہ وہ تقریباً آدھ انچ تک اس
میں داخل ہو جائے اب اس کے بعد دونوں
نلیوں کو اُلٹ دو ۔ یعنی اُن کا منہ زمین کی
طرف کرو ۔ پھر چوڑی نلی کو ایک انگوٹھے
اور انگلی سے پکڑے رہو ۔ اور پتلی نلی کو بالکل
چھوڑ دو ۔ ڈرو نہیں ۔ تمھاری پتلی نلی زمین
پر گر کر ٹکنا چور نہیں ہو گی ۔ ہائیں! یہ تو
گرنے کے بجائے چوڑی نلی میں آہستہ آہستہ
داخل ہوتی جارہی ہے ۔ تم اگر اس کی وجہ
پوچھنا چاہتے ہو تو اب میں اس قدر بیان کر چکا ہوں، کہ
زیادہ بتانا مناسب نہیں سمجھتا ۔ تم خود سوچ لو ۔
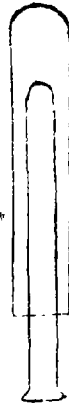
تم اپنے دوستوں سے مذاق کرنے کے عادی
ہو ۔ ذیل کا تجربہ کر کے تم اپنے دل کو خوش کر سکتے ہو ۔ تمھاری
والدہ یا بہن کے پاس عطردان تو ضرور ہو گا اور اس میں عطر
کی شیشیاں بھی ضرور ہوں گی ۔ ایک خالی شیشی ۔ جس کے منہ
پر شیشے کی ڈاٹ لگی ہوئی ہو ۔ اُن کی اجازت سے لے لو
اس کے بعد اُس کے پیندے میں ایک باریک سا سوراخ
یا تو خود کر لو یا کسی دوکان دار سے کرا لو ۔ میرے خیال میں
دوسری ہی صورت بہتر ہو گی کیونکہ تم سوراخ کرنے کی کوشش
میں شیشی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے ۔ جب ایسا سوراخ
ہو جائے تو شیشی میں رنگین پانی بھر کر جلدی سے ڈاٹ لگا دو
اس مقام پر تم اپنے دل سے خود سوال کرو گے کہ "لکھنے
والے بھی عجیب آدمی معلوم ہوتے ہیں ۔ کہ شیشی کے پیندے
میں سوراخ بھی کرا دیا اور اب اس میں پانی بھی بھروا رہے
ہیں ۔ بھلا سوچنے کی بات ہے کہ پانی اس میں کس طرح
باقی رہے گا"؟ ہاں جناب میں کہتا ہوں کہ آپ کیوں گھبراتے
ہیں ۔ پانی بھر کر فوراً ڈاٹ لگا دیجئے ۔ اگر پانی گر جائے تو
میرا ذمہ! اس کے بعد وہ شیشی لئے ہوئے، اپنے کسی دوست کے
پاس جائیے اور ان سے کہئے کہ ۔ ۔ "میں نے لکھنؤ سے
آپ کے لئے بہت اچھا عطر منگایا ہے ۔ ذرا سونگھئے تو سہی"
لیکن یاد رکھئے کہ اس موقعہ پر آپ خود خاموش رہئے
اور اپنی ہنسی کو دبائے رکھئے ۔ نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا
آپ کے دوست اپنے دانت نکال کر شیشی کو لینے کے لئے
اپنا ہاتھ بڑھا دیں گے ۔ آپ اُس کو ان کے ہاتھ میں دے کر
خاموش کھڑے ہو جائیے ۔ وہ جیسے ہی اس کی ڈاٹ کھولیں
گے ۔ تمام شیشی کا پانی ٹپ ٹپ کر کے اُن کے کپڑوں پر گر جائے
گا ۔ اس وقت آپ ایک زوردار قہقہہ مار کر ہنسئے ۔ اور اپنے
دوست کے شرمانے کا لطف اُٹھائیے ۔ بہتر ہو کہ یہ مذاق
اپنی بھابی جان سے کیجئے ۔ کیونکہ بھابیاں عطر کی بہت
شائق ہوتی ہیں ۔ اب خود غور کیجئے کہ پہلی صورت میں شیشی
میں سے پانی کیوں نہ گرا ۔ اور دوسری صورت میں فوراً
ہی کیوں گر پڑا؟

اس طرح آپ اپنی مرغیوں کے لئے ایک بہت ہی
مفید چیز بنا سکتے ہیں ۔ آپ کی مرغیاں نالیوں میں پانی پیتی
پھرتی ہیں ۔ کیوں نہ اپنے صحن میں ایک کونڈا رکھ دیجئے
اور اس میں پانی بھر دیجئے ۔ لیکن یہ کمبخت مرغیاں اکثر
اوقات تمام پانی پی جاتی ہیں یا پانی بخارات بن کر اُڑ جاتا ہے
تو کونڈا خشک پڑا رہتا ہے ۔ اب ہر وقت جا کر دیکھنا کہ
کونڈے میں پانی بھرا ہوا ہے ۔ یا نہیں بہت تکلیف دہ بات

ہے ۔ ہم آپ کو ایک ترکیب بتاتے ہیں ۔ آپ ایک بوتل
لے کر اس میں لبالب پانی بھر دیجئے اور اس کے منہ پر ایک
کاگ لگا دیجئے ۔ اس کے بعد بوتل کا منہ نیچا کر کے اور پیندا
اوپر کر کے آپ ایک دیوار سے لگا کر رکھئے ۔ اور ٹین کی ٹیپوں
سے اسے اس طرح جڑ دیجئے ۔ جیسا ذیل کی شکل میں ظاہر
کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد ایک کونڈے میں پانی بھر کر بوتل
کے نیچے اس طرح رکھئے کہ اس کی گردن پانی میں ڈوبی رہے
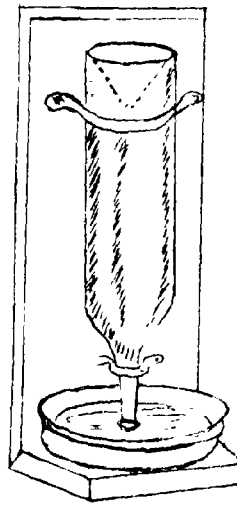
پھر آہستہ سے بوتل کا کاگ
نکال کر کھڑے ہو جائیے
آپ دیکھیں گے کہ بوتل میں سے
ذرا سا پانی نکل کر بند ہو گیا
اور باقی بوتل میں پانی اسی
طرح بھرا ہوا ہے ۔ یعنی
کونڈے کے پانی کی سطح پر
ہوا کا دباؤ پڑ رہا ہے اور
یہی دباؤ بوتل میں پانی کے
ستون کو قائم رکھے ہوئے
ہے ۔ یہ پانی کا ستون اس وقت تک قائم رہے گا جس وقت تک
کہ بوتل کا منہ کونڈے کے پانی میں ڈوبا ہوا رہے گا ۔ لیکن جب
اسی کونڈے میں سے مرغیاں اتنا پانی پی لیں گی کہ اس کی
سطح میں کمی آ جائے اور بوتل کا منہ پانی کی سطح کے اوپر دکھائی
دینے لگے تو بوتل میں سے پانی فوراً باہر آ جائے گا ۔ یہاں تک
کہ اس کا منہ پھر پانی میں ڈوب جائے گا ۔ کونڈے کے
پانی پر ہوا کا دباؤ بوتل میں پانی کے ستون کو پھر قائم رکھے
گا ۔ چنانچہ مرغیاں پانی پیتی رہیں گی ۔ اور بوتل میں سے پانی
آہستہ آہستہ نکلتا رہے گا ۔ یہاں تک کہ تمام بوتل خالی
ہو جائے گی ۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تجربہ ہم
ہر قسم کی بوتل پر کر سکتے ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ ہم کتنی
لمبی بوتل لے سکتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر ہوا کا دباؤ پانی کے کتنے
لمبے ستون کو قائم رکھ سکتا ہے ؟

اس کا جواب دینے کے لئے میں آپ کو ایک پرانا
قصہ یاد دلاؤں گا (........) پرانے زمانے میں
ایک سائنس داں تھا ۔ جس نے تیس فیٹ لمبی شیشے کی
ایک بوتل بنائی تھی ۔ اس کو پانی سے بھر کر ایک ایسے بڑے ٹب میں
جو لبالب تھا اُلٹ دیا تھا ۔ بھلا خیال کیجئے کہ جب تماشائیوں
نے دیکھا ہوگا کہ پانی کا تیس فیٹ لمبا ستون خود بخود معلق ہے
اور ظاہرا طور پر اس کو روکنے کے لئے نہ تو بوتل کے منہ پر کوئی
کاگ ہے اور نہ کوئی واسطہ تو انھوں نے یقیناً اُس سائنس داں
کو جادوگر خیال کیا ہوگا ۔ لیکن حضرت آپ تو پڑھے لکھے انسان
ہیں ۔ اس میں جادو وادو کی کوئی بات نہیں ہے ۔ اگر آپ کے
پاس اتنی لمبی بوتل ہو تو خود تجربہ کر کے دیکھ لیجئے ۔ ہاں اب
سوال یہ ہے کہ پانی کے ستون کی اتنی لمبائی جس کو ہوا
اپنے دباؤ سے قائم رکھے ۔ زیادہ سے زیادہ کتنی ہے ؟ تجربہ
کر کے دیکھا گیا ہے کہ بتیس فیٹ سے زیادہ نہیں ہے ۔ یعنی
اگر آپ چالیس فیٹ لمبی بوتل یا نلی یا پائپ لیں تو
اس میں پانی کی سطح بتیس فٹ پر آ کر ٹھہر جائے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ آپ اپنے کنوئیں سے جو کہ بتیس فٹ
سے زیادہ گہرا ہو معمولی نل کے ذریعے پانی نہیں کھینچ سکتے ۔ اس
مقام پر ہمارا دوسرا اہم سوال پیدا ہو گیا ہے ۔ کیا ہوا

کا دباؤ پانی کے علاوہ کسی اور سیّال[1] مادے کے ستون کو قائم رکھ سکتا ہے؟ آئیے اس تجربے کو کر ڈالیں۔ لیکن اس کے لئے ہم کونسا سیّال مادہ لیں؟ آئیے پارے سے بہتر اور کون سی چمک دار بہنے والی شے ہوسکتی ہے؟ ہم ایک ہاتھ بھر شیشے کی نلی لیتے ہیں۔ جس کا منہ ایک طرف سے کھلا ہوا ہے اور ایک طرف سے بند ہے۔ کھلے ہوئے منہ میں ہم نے پارہ بھرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ساری نلی پارے سے بھر گئی۔ اس کے بعد ہم نے اس نلی کے کھلے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے اس کو ایک ایسے برتن میں الٹ دیا جس میں پارہ بھرا ہوا ہے۔ لیجئے خدا کا شکر ہے کہ ہمارا تجربہ کامیاب رہا۔ جس طرح بوتل میں پانی کا ستون قائم تھا اسی طرح اس نلی میں بھی پارے کا ستون قائم ہے لیکن نلی کے سرے پر کچھ خالی جگہ ہے۔ جہاں سے پارہ نیچے اتر آیا ہے۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ اس بلندی سے زیادہ پارہ نہیں چڑھ سکتا آئیے اس کو ناپ لیں۔ اوہو! یہ تو کل تیس انچ ہے۔ آخر اس کا سبب کیا ہے کہ پانی تو بیس فٹ تک چڑھ جائے اور پارہ صرف تیس ہی انچ چڑھے۔ جناب اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ اگر آپ مسٹر گاندھی اور مولانا شوکت علی کو ایک ریس میں تیز دوڑائیں تو کون آگے نکل جائے گا۔ اور کون جلد تھک جائے گا۔ ہاں ہاں! گاندھی جی ہلکے پھلکے آدمی لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے بہت دور تک بھاگتے رہیں گے اور مولانا شوکت علی تھک کر ٹھہر جائیں گے اسی طرح پارہ بھاری چیز ہے وہ پانی کے مقابلے میں صرف تیس انچ چڑھ سکتا ہے

میں نے یہ تجربہ اپنے کئی دوستوں کو بتایا تھا جنھوں نے اس کو اپنے گھروں پر جاکر کیا ان میں سے ایک صاحب جو شملہ میں رہتے تھے انھوں نے جو اس کو کیا تو پارہ بجائے تیس انچ چڑھنے کے ...... چھبیس ...... ہی انچ چڑھا۔ وہ بڑے پریشان ہوئے اور انھوں نے مجھے خط لکھا۔ میں نے ان کو لکھا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم یہ کس طرح امید کرتے ہو کہ پارہ ہر مقام پر اور ہر موسم میں ایک ہی بلندی تک چڑھے گا؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ہوا کا دباؤ ہر جگہ ایک ہی جیسا ہے؟

یہ قاعدہ ہے کہ ہوا کا دباؤ ساحل سمندر پر زیادہ ہوتا ہے اور پہاڑوں پر کم۔ اس کے علاوہ گرمی کے موسم میں یہ دباؤ کم ہوگا اور جاڑوں کے موسم میں زیادہ۔ اگر تم چاہو خود تجربہ کرکے دیکھ سکتے ہو۔ البتہ اس دباؤ کی کمی زیادتی تم کو پارہ کے گھٹنے بڑھنے سے معلوم ہوتی رہے گی۔ ایسا آلہ جس کے ذریعے ہوا کا دباؤ ناپا جاسکے۔ "آلہ باد پیما" کہا جاسکتا ہے۔"

دنیا میں مختلف مقامات پر ہوا کے دباؤ کی کمی زیادتی سے بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔ ذرا خیال تو کرو کہ ایک مقام پر ہوا کا دباؤ بہت زیادہ ہے اور اس کے قریب ہی دوسرا مقام ہے جہاں ہوا کا دباؤ بہت کم ہے۔ آؤ اس سلسلے میں ہم ایک دلچسپ تجربہ کر ڈالیں۔

شیشے کی ایک بوتل لے لو۔ جس کا منہ تقریباً ایک انچ چوڑا ہو اور اس کا پیٹ پھولا ہوا ہو۔ اس کے بعد ایک کیلا لے کر اس کا چھلکا اس کے چوتھائی حصے تک چھیل ڈالو پھر بوتل کے اندر ذرا سا اسپرٹ ڈال کر اس میں جلتی ہوئی

[1] بہنے والے

دیا سلائی ڈال دو (اسپرٹ زیادہ ہرگز نہ ڈالو ۔ ورنہ بوتل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی) بوتل کے اندر اسپرٹ جلنا شروع ہوگی اور اس کے اندر کی ہوا گرم ہوکر پھیلنا شروع ہوگی ۔ یہ ہوا اب چونکہ بوتل میں سما نہیں سکتی ۔ اس لئے نکلنے کے لئے راستہ تلاش کرے گی اور بوتل کے کھلے ہوئے منہ میں سے تمام کی تمام نکل جائے گی ۔ یہاں تک کہ بوتل تقریباً بالکل خالی رہ جائے گی ۔ اس کے معنی یہ ہوے کہ بوتل کے پیٹ میں ہوا کے کم دباؤ کا خطہ نمودار ہو گیا ہے اب آپ چھلے ہوئے کیلے کا سرا لے کر بوتل کے منہ پر لگاکر قدرت کا تماشہ دیکھیں ۔ آپ دیکھیں گے کہ بوتل کے اندر کیلا خود بخود داخل ہو رہا ہے ۔ اس طرح جیسے کوئی اس کو باہر سے اندر کی طرف ڈھکیل رہا ہو ۔ اور جوں جوں یہ اندر داخل ہوتا ہے ۔ ووں ووں اس کا چھلکا اترتا جاتا ہے ۔ جب تمام کیلا چھلا چھلایا اندر داخل ہو چکتا ہے تو پٹاخ سے آواز بھی آتی ہے ۔ اس کی کچھ وجہ سمجھ میں آتی ہے ؟ میں بتا چکا ہوں کہ بوتل کے اندر ہوا کا دباؤ بہت کم ہے اور بوتل کے باہر ہوا کا دباؤ بدستور ہے درا صل یہ کیلا خود بخود داخل نہیں ہوا ۔ بلکہ باہر کی ہوا نے اپنے دباؤ سے اس کو اندر ڈھکیل دیا اور جب تمام کیلا اندر داخل ہوگیا تو ہوا خود بھی بڑے زور کے ساتھ اندر داخل ہوگئی اس سے ہم کو معلوم ہوا کہ اس مقام سے جہاں زیادہ دباؤ ہو اس مقام کی طرف جہاں کم دباؤ ہو ہوا چلتی ہے ۔ لیکن ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ بوتل کے اندر اور باہر کی ہوا کے دباؤ کا فرق صرف حرارت کی وجہ سے پیدا ہوا تھا ۔ یعنی بوتل کے اندر کی ہوا گرم ہوکر پھیلی، ہلکی ہوئی ، اور اوپر کو اٹھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دباؤ میں کمی آگئی ۔ باہر کی ہوا چونکہ مقابلتہً ٹھنڈی تھی اس لئے وہ نیچے کی طرف دباؤ ڈال رہی تھی ۔ اس لئے باہر سے اندر کی طرف ہوا چلنا شروع ہوئی ۔

یہی بات ہم کو اس وقت بھی نظر آتی ہے ۔ جبکہ ہم دھواں نکلنے کی چمنی کی طرف دیکھتے ہیں ۔ چولھے کے اوپر ہوا گرم ہوکر اوپر اٹھتی ہے اور باہر سے زیادہ دباؤ کی وجہ سے ہوا اندر آتی ہے ۔ اسی طرح اگر ہمارے کمرے میں آگ جلتی ہو اور ہم اس کی طرف منہ کئے ہوئے بیٹھے ہوں تو ہماری پیٹھ کو سردی محسوس ہونے لگے گی ۔ یعنی ٹھنڈی جگہ سے کہ جہاں ہوا کا زیادہ دباؤ ہے ۔ ہوا گرم جگہ پر جہاں کم دباؤ ہے چل رہی ہے ۔ اس طرح کمرے کے اندر ٹھنڈی ہوا بھی ہوئی چلی آ رہی ہے ۔ یہ کیفیت نہ صرف ہمارے کمرے ہی میں ہو رہی ہے بلکہ تمام دنیا میں سال بھر متواتر ہوتی رہتی ہے ۔ ہوا کی لہریں تمام سطح زمین پر چلا کرتی ہیں ۔ انھیں لہروں کو ہم " لو " " جھکڑ " آندھی وغیرہ ناموں سے موسوم کرتے ہیں ۔ لو جس طرف سے چلتی ہے ۔ ہم اسی سمت سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں مثلاً پچھوا ہوا پچھم سے چلتی ہے ۔ شمالی مشرقی تجارتی ہوا شمال مشرق سے چلتی ہے ۔

ہوا کی تیزی اس کے دباؤ پر مبنی ہے ۔ اگر دو مقامات کے درمیان ہوا کے دباؤ میں بہت زیادہ فرق

ہے تو یہ بڑی تیز رفتاری سے چلے گی اور بالکل طوفان معلوم ہوگی۔ اسی طرح اگر سطح ہموار ہے تو پانی آہستہ آہستہ بہے گا اور اگر پانی اونچائی پر سے گر رہا ہے تو آبشار بن جائے گا ۔ یہی وجوہات ہیں کہ نسیم بحری، نسیم بری، مانسون جھکڑ، طوفان وغیرہ مختلف قسم کی ہوائیں چلا کرتی ہیں

لہٰذا ہم نے دیکھ لیا کہ

۱۔ ہوا وزن رکھتی ہے۔

۲۔ ہوا چیزوں پر چاروں طرف سے دباؤ ڈالتی ہے۔

۳۔ ہوا کے دباؤ کی وجہ سے پانی بتیس فٹ تک اوپر چڑھ جاتا ہے۔ اور پارہ تیس انچ تک چڑھتا ہے۔

۴۔ آلہ بارپیما کے ذریعے ہم ہوا کے دباؤ کو ناپ سکتے ہیں۔

۵۔ جب پارہ گرتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہوا کا دباؤ کم ہوگیا۔ اور دوسرے مقامات سے ہماری طرف ہوا چلے گی۔

۶۔ جب پارہ بلند ہوجاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہوا کا دباؤ زیادہ ہوگیا اور دوسرے مقامات کی طرف ہماری طرف سے ہوا چلے گی

(۷) اگر پارہ جلد جلد گھٹتا بڑھتا ہے تو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ آج موسم گڑبڑ ہے یہی وجہ ہے کہ آلہ بارپیما اس قدر کارآمد چیز ہے کہ ہوائی جہاز اس کے بغیر سفر ہی نہیں کرسکتے۔

میں کیا کروں گا

از جناب مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکھنوی از مدراس

(خاص پیام تعلیم کے سال گرہ نمبر کے لئے)

جہاں تک بھی ممکن ہے محنت کروں گا
کبھی پست اپنی نہ ہمت کروں گا

میں سیکھوں گا علم و ہنر اچھے اچھے
نہ سستی کروں گا نہ غفلت کروں گا

غرض اپنی تعلیم سے ہو کے فارغ
وطن اور عزیزوں کی خدمت کروں گا

نہ ہوگی مرے دل میں نفرت کسی سے
بُرے کام سے ہاں میں نفرت کروں گا

مسلمان ہو، ہندو ہو یا ہو مسیحی
ہر ایک دیس بھائی سے الفت کروں گا

مرے دیس کے رہنے والے ہیں جتنے
میں ہر ایک کی دل سے چاہت کروں گا

رہیں ملکے سب جیسے ہوں بھائی بھائی
دلوں میں یہ پیدا محبت کروں گا

جو کمسن ہیں مجھ سے جو ہیں بھولے بھالے
میں اُن ننھے بچوں پہ شفقت کروں گا

جو عمر و لیاقت میں مجھ سے بڑے ہیں
میں ایسے بزرگوں کی عزت کروں گا

نہ چاہوں گا ہرگز بُرا میں کسی کا
بھلائی میں سب کی اعانت کروں گا

بھلے کام سے میں نہ ہاروں گا ہمت
بُرے کام سے میں نہ رغبت کروں گا

جو پیش آئے گی مجھ کو راہِ وطن میں
میں برداشت ہر اک مصیبت کروں گا

جو دُکھ درد میں پاؤں گا میں کسی کو
تو دور اُس کی تکلیف و آفت کروں گا

نہ رکھوں گا میں بیر دل میں کسی سے
نہ ہرگز کسی سے عداوت کروں گا

رہیں مطمئن[1] اور خوش ہند والے
اسی دھن میں صرف اپنی ہمت کروں گا

نہ ننگا رہے گا کوئی اور نہ بھوکا
مہیا[2] وہ اسباب راحت کروں گا

نہ محتاج کوئی رہے گا نہ مفلس
مروج[3] وہ صنعت وہ حرفت کروں گا

نہ کاہل نظر آئیں گے پھر نہ جاہل
فنا اس طرح سے جہالت کروں گا

دبے گا ڈرے گا نہ کوئی کسی سے
جوانوں میں پیدا وہ قوت کروں گا

بڑھاؤں گا میں حوصلے دوستوں کے
نئے سر سے پیدا وہ جرأت کروں گا

جو بیکار ہوں گے، جو ناچار ہوں گے
روا اُن کی ہر ایک حاجت کروں گا

ستم جو کریں گے مٹا دوں گا اُن کو
کرم کرنے والوں کی طاعت[4] کروں گا

میں پیارا وطن کا ہوں یہ مجھ کو پیارا
ہر اک اس کی پوری ضرورت کروں گا

بچاؤں گا برباد ہونے سے اس کو
خدا چاہے تو دور ذلت کروں گا

غلامی سے آزاد کرنا ہے اس کو
جو کچھ مجھ سے ممکن ہے جرأت کروں گا

کروں گا زمانے میں نام اس کا روشن
بلند اس کی دنیا میں عظمت[5] کروں گا

بنوں گا میں زینت اس اجڑے چمن کی
جب اس ہند کو رشکِ جنت کروں گا

---

[1] اطمینان سے۔ خوش اور آرام سے [2] تیار [3] رواج دوں گا۔
[4] فرمانبرداری۔ کہا ماننا [5] بزرگی بڑائی۔

رزائی

حامد حسین صاحب متعلم جامعہ دہلی

(ایک جاپانی کہانی)

سرائے کے کھلے دروازے سے ایک سوداگر کو اندر آتے دیکھ کر جاپانی سرائے والے نے بلند آواز سے کہا:۔

"آئیے جناب، اندر آئیے آپ کا آنا میرے لئے باعث برکت ہے۔"

یہ ایک چھوٹی سی سرائے تھی اور اتفاق سے اسی دن کھلی تھی۔ میزبان یا سرائے کا مالک غریب آدمی تھا۔ اس نے چٹائیاں۔ میزیں، برتن اور دوسری مختلف چیزیں پرانی خرید لی تھیں۔ لیکن یہ سب تھیں صاف ستھری۔ اس لئے سوداگر نے اس جگہ کو پسند کیا اور رات کو مزے دار کھانا کھا کر سونے کے لئے ایک کمرے میں چلا گیا۔ اس نئی سرائے میں یہ پہلا مسافر تھا۔

جاپان میں لوگ بچھونا نہیں بچھاتے چٹائیوں پر لیٹ جاتے ہیں اور اوپر سے کچھ اوڑھ لیتے ہیں۔ ان کی رزائیاں روئی کی ہوتی ہیں۔ امیر آدمی بہت اچھی اچھی رزائیاں اوڑھتا ہے مگر غریب کے پاس زیادہ نہیں ہوتیں۔ بہت بڑے آدمی کے
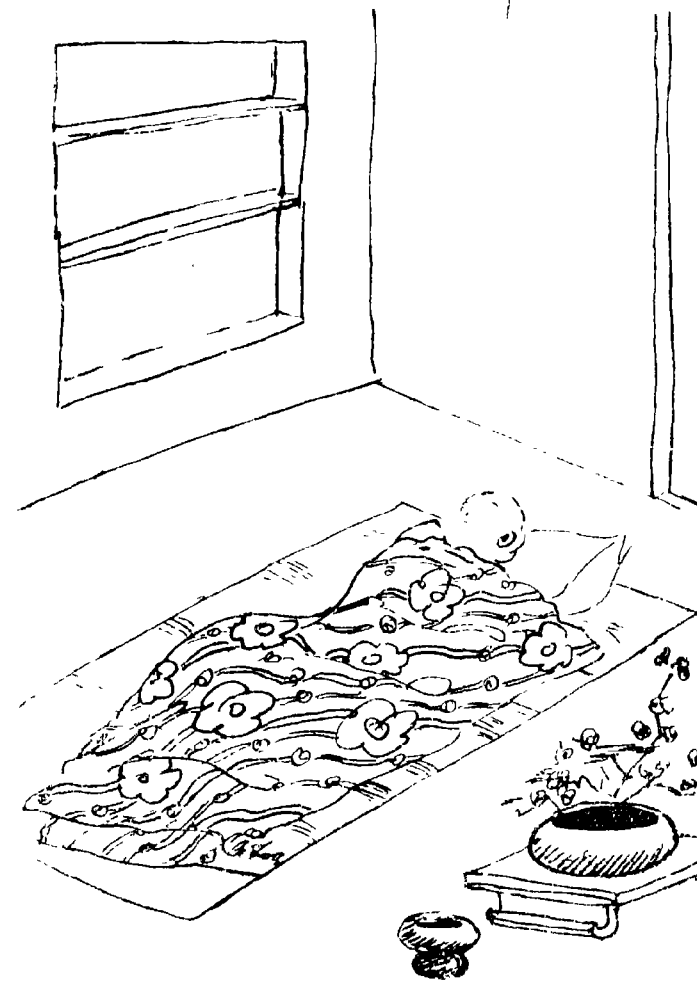
پاس آٹھ فٹ لمبی اور سات فٹ چوڑی رزائیاں ہوتی ہیں۔ دن کو یہ الماریوں میں رکھ دی جاتی ہیں۔ الماریوں پر رنگین پردے پڑے ہوتے ہیں۔ ان میں لکڑی کے تکئے بھی رکھے ہوتے ہیں۔ جن پر جاپانی لوگ سوتے وقت اپنے سر اس طرح رکھتے ہیں کہ کالے کالے بالوں کی لٹیں اور گھونگر نہ بگڑنے پائیں۔ تکیہ زمین پر گر پڑے تو جاپانی اسے اپنے پاؤں سے نہیں چھوتا۔ اگر دھوکے سے تکیے میں پاؤں لگ جائے تو اس کو اٹھاتا ہے اور اپنی پیشانی سے لگاکر کہتا ہے "میں معافی چاہتا ہوں۔"

خیر سوداگر اپنے کمرے میں جاکر تھوڑی ہی دیر سویا تھا کہ اسے آوازوں نے جگا دیا۔ یہ دو لڑکوں کی آوازیں تھیں۔

ایک نے کہا "پیارے بڑے بھائی کیا تمھیں سردی لگتی ہے؟"

دوسرے نے کہا، "اور کیا تمھیں بھی سردی لگتی ہے؟"

سوداگر نے خیال کیا کہ شاید سرائے والے کے لڑکے غلطی سے اس کمرے میں آگئے ہیں اور یہ اُن کے لئے آسان بھی تھا۔ کیوں کہ جاپانیوں کے کمروں کے بیچ میں دروازے نہیں ہوتے جو بند کرلئے جائیں۔ صرف کاغذی دیواریں ہوتی ہیں جو اِدھر اُدھر سرکائی جاسکتی ہیں۔

"ہونھ، ہونھ" سوداگر بولا۔ بچو یہ تمھارا کمرہ نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد پھر وہی آوازیں سننے میں آئیں:۔

"پیارے بھیا کیا..........."

"اور کیا تم کو.........."

مہمان اپنے بستر سے اُٹھا اور ایک موم بتی سلگائی۔ جو جاپانیوں کی کاغذی لالٹین میں لگی ہوتی ہے اس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ کچھ دکھائی نہ دیا الماریوں میں جھانکا۔ وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا۔ آخر موم بتی کو جلتا چھوڑ کر لیٹ گیا۔ پھر دوبارہ آوازیں آئیں۔

"بھائی کیا تم.........."

"اور کیا تم کو.........."

آوازیں ان ہی رزائیوں سے آرہی تھیں۔ اب اُسے یقین آچلا کہ رزائیوں ہی سے آرہی تھیں۔ جلدی جلدی اس نے اپنی سب چیزیں اکٹھا کیں۔ سامان باندھا نیچے اُترا سیدھا سرائے کے مالک کے پاس گیا اور جو کچھ گذرا تھا کہہ سُنایا۔

سرائے والے نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا "جناب عالی آپ نے کھانے کے ساتھ شراب بہت سی پی لی ہے۔ اس سے بُرے بُرے خواب نظر آرہے ہیں میری رزائی بات نہیں کرتی۔"

"اُن میں سے ایک ضرور بولتی ہے" سوداگر نے جواب دیا اور جب تم مجھ سے اس طرح سختی کے ساتھ بات چیت کر رہے ہو تو میں زیادہ یہاں نہیں ٹھہر سکتا لُو اپنا کرایہ میں جاتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

دوسری رات ایک اور مہمان آیا۔ کھانے کے بعد اس نے کچھ زیادہ شراب بھی نہیں پی۔ لیکن سونے کے کمرے میں گئے ہوئے اسے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ وہ بھی

نیچے اُترا اور سرائے والے سے شکایت کی کہ رزائی میں سے دو آوازیں آتی ہیں..................

"پیارے بڑے بھائی کیا تم کو......"

"اور کیا تم کو بھی.............."

"جناب" مالک مکان نے چلا کر کہا" میں نے انتہائی کوشش کی کہ آپ کو آرام ملے۔ اب آپ کو کیا حق ہے کہ مجھے بے کار فضول سے پریشان کریں۔

واقعی عجیب بات ہے۔ مہمان نے جواب دیا" یہ کوئی فضول بات نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے دو بچوں کی آوازیں رزائی سے سُنی ہیں۔ میں اس گھر میں نہیں ٹھہر سکتا۔

جب دوسرا مہمان بھی چلا گیا تو مالک اوپر آیا اور ایک ایک کر کے رزائیاں الٹیں، پلٹیں۔ اس نے بھی کسی ایک رزائی سے یہی آوازیں سُنیں:۔

"بھائی جان کیا........"

"اور کیا تم کو........"

آخر وہ آوازوں والی رزائی لے جاکر خود اس پر لیٹ گیا تمام رات لڑکے ایک دوسرے سے یہی پوچھتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو مالک سیدھا کباڑی کے پاس پہنچا اور اس سے کہا:۔

"تم کو یاد ہے کہ تم نے میرے ہاتھ ایک رزائی بیچی تھی؟"

"ہاں"

"وہ تمھیں کہاں سے ملی تھی"۔

"ایک چھوٹے دُکان دار سے جس کی دُکان شہر کے سرے پر ہے"۔

یہ سنتے ہی سرائے والا سیدھا اس دوکان دار کے پاس دوڑا۔ وہاں سے ایک اور کے پاس۔ اسی طرح چکر کھانے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ رزائی ایک چھوٹے سے مکان کے مالک نے بیچی تھی جو پیچھے کی گلی میں رہتا تھا۔

اس گھر میں ایک مختصر سا خاندان تھا...... باپ ماں اور دو لڑکے...... باپ کی آمدنی بہت کم تھی ماں اپنی بیماری کی وجہ سے اس کو کچھ مدد نہ دے سکتی تھی لڑکوں میں بڑا آٹھ برس کا اور چھوٹا چھ کا تھا۔ سردیوں میں باپ بیمار پڑا۔ ایک ہفتے کی تکلیف کے بعد اس نے انتقال کیا اور دفن کر دیا گیا۔ ماں بھی مر گئی۔ اب دونوں بھائی گھر میں اکیلے رہتے تھے' اُن کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ فاقہ پر فاقہ ہونے لگا۔ انھوں نے کھانا خریدنے کے لئے پہلے ایک چیز بیچی۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ آخرکار ایک رزائی کے سوائے اُن کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ باہر برف نہایت شدت سے پڑ رہی تھی۔ دونوں بھائی ایک ہی رزائی میں لپٹ گئے اور چھوٹے نے کہا۔

پیارے بڑے بھائی کیا تم کو سردی لگتی ہے"

بڑے نے جواب دیا

کیا تم کو بھی سردی لگتی ہے؟

یہ آوازیں قدرت سے اس رزائی میں سمو گئیں اور گونجتی رہیں۔

جس مکان میں یہ بچے رہتے تھے اُن کا مالک ایک روز بڑے غصے میں مکان میں داخل ہوا۔ اس نے لڑکوں کو سوتے سے جگا دیا۔ اور بگڑ کر کہا:۔

"کرایہ کہاں ہے؟"

"جناب ہمارے پاس دام نہیں"

اچھا نکل جاؤ۔ میں اس رزائی کو کرائے کی مد میں رکھتا ہوں"

"جناب برف بہت پڑ رہی ہے"

"نکلو!"

آخرکار دونوں بھائی مجبور ہو کر باہر چلے گئے۔ دونوں صرف ایک ایک نیلی قمیص پہنے ہوئے تھے ان کے اور کپڑے کھانے کی نذر ہو چکے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے مل کر اسی گھر کے پیچھے جہاں سے ان کو بھگا دیا گیا تھا برف میں لیٹ گئے۔ برف کے پرت ان پر گرتے رہے۔ نرم چمکیلے اور صاف، سردی غضب کی تھی اور پھر برف پڑ رہی تھی۔ وہ بے چارے سو گئے۔ ایسے بے خبر کہ اب قیامت ہی کو اٹھیں گے۔ یہ موت کی نیند تھی۔ ایک آدمی ادھر سے گذرا وہ ان معصوموں کے بے روح جسم رحم کی دیوی کے مندر میں گاڑ آیا۔ جس کا نام کوآنن تھا۔

جاپانی مندروں میں تم ایک خوب صورت مہربان عورت کا چہرہ پاؤگے۔ اس کے ہزار ہاتھ ہوں گے یہی کوآنن کی مورتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس عورت نے اپنے عیش و آرام کے لئے جنت کا دروازہ کھلا پایا۔ لیکن وہ داخل نہ ہوئی۔ اس نے دنیا کی سیکڑوں ہزاروں اور کروڑوں، روحوں کا خیال کیا۔ جو دکھ بیماری اور رنج میں مبتلا تھیں۔ اس نے کہا: "میں ان کے ساتھ ٹھہرنا پسند کرتی ہوں جنت میں نہ جاؤں گی اور اپنے بہت سے ہاتھوں سے اُن کی مدد کروں گی۔"

وہ دونوں بھائی اسی رحم کی دیوی کے گھر کے سائے میں دفن کر دیئے گئے۔ ایک دن مالک سرائے نے لوگوں کو مندر میں بلایا۔ اور ان آوازوں کا سب قصہ کہہ سنایا۔ رزائی بچاری کو دے دی۔ سرائے والے کا دل اور اُن سب کے دل جنھوں نے یہ قصہ سُنا مردہ بچوں کے لئے رحم سے بھر گئے۔

رزائی پھر نہ بولی۔ کیوں کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا۔ اپنا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اس نے لوگوں کو شرمندہ کر دیا تھا۔ کہ دیکھو کس طرح چھوٹے چھوٹے بچے اُن کے ملک میں سردی اور بھوک سے مرگئے۔ اور تم نے خبر نہ لی۔

بہت سی محتاج اور بے کس روحیں ایک دوسرے سے کہتی ہیں"

"پیارے بڑے بھائی کیا تم کو سردی لگتی ہے؟"

"اور کیا تم کو سردی لگتی ہے؟"

مسلمان بچہ

بہ رنگ نظم امام منظفر — فطرت عظیم آبادی

میں خدا کے یہاں سے آیا ہوں — زندگی کا پیام لایا ہوں
زندہ وہ ہے سدا جو بڑھتا ہے — زندگی نام ہی نمو[1] کا ہے
مجھ کو بڑھنا ہے مجھ کو بڑھنا ہے — اوج[2] نشو و نما پہ چڑھنا ہے!
پھولنا اور مجھ کو پھلنا ہے — شجر[3] میوہ دار بننا ہے!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

علم کے نور میں بڑھونگا میں — روشنی ہر جگہ کرونگا میں
علم دولت ہے علم دولت ہے! — علم سے زندگی کی زینت ہے
جگمگا جائے یہ جہان خراب — علم کے موتیوں میں ہے وہ آب
موتی یہ جس جگہ بھی پاؤں گا — چین ہو یا فرنگ لاؤں گا!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

راست بازی ہے میری طینت میں — رحم و انصاف میری فطرت میں
کفر و الحاد سے لڑوں گا میں — ظلم و بیداد سے لڑوں گا میں
دل میں اقرار ہے سچائی کا — سر میں انکار ہے بڑائی کا!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

زندہ وہ ہے جو کام کرتا ہے — قوم کا اپنے نام کرتا ہے
قوم کا مجھ کو کام کرنا ہے — اس پہ جینا ہے اس پہ مرنا ہے
قوم کے واسطے جیوں گا میں — قوم کے واسطے مروں گا میں!

میں مسلماں ہوں میں مسلماں ہوں

---

[1] بڑھنا [2] بلندی [3] درخت

میاں مٹھو
"بولو میاں! نبی جی بھیجو"
"بولو میاں مٹھو! نبی جی بھیجو"
"نبی جی بھیجو"!!!
اچھی بات ہے آج کی رات
آپ مرغیوں کے دربے میں
آرام فرمایئے۔
"بولو میاں مٹھو! نبی جی بھیجو"
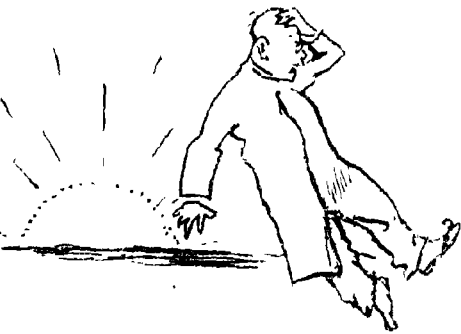
دنیا کی کہانی

تصویروں کی زبانی

از پروفیسر محمد مجیب صاحب اُستاد جامعہ
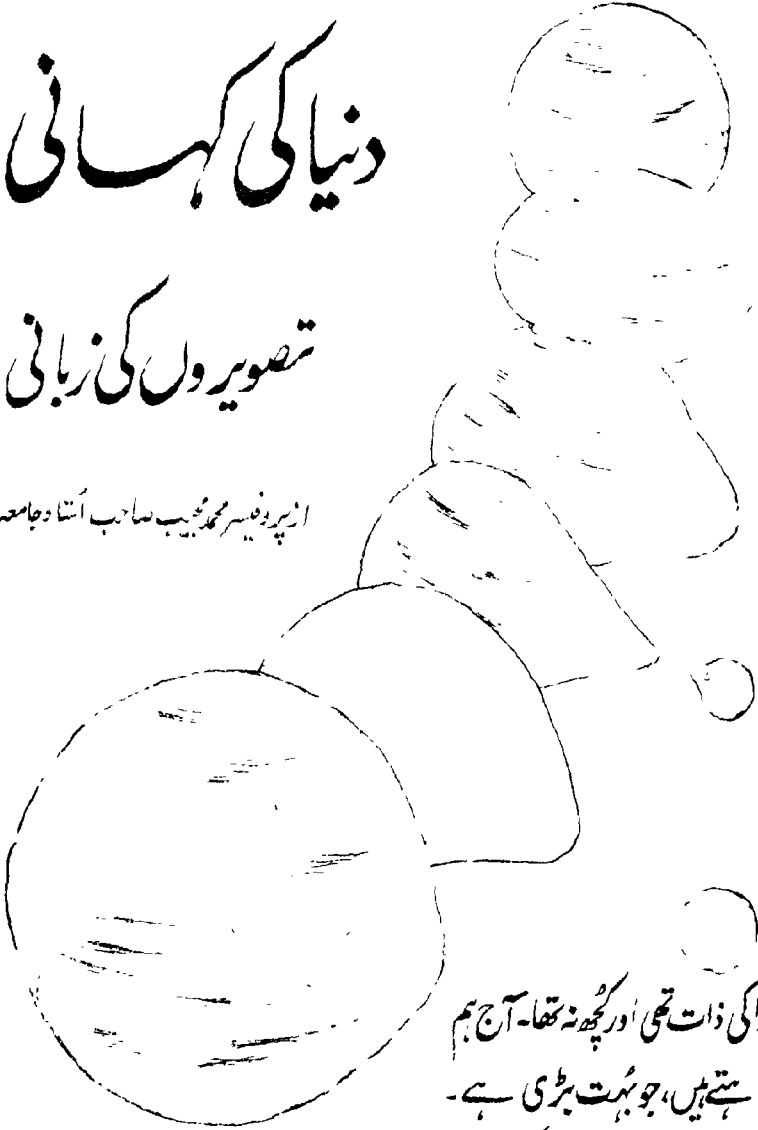
(۱)

پہلے خدا کی ذات تھی اور کچھ نہ تھا۔ آج ہم ایک دنیا میں رہتے ہیں، جو بہت بڑی ہے۔ مگر کائنات کا ایک ذرّہ ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ اُس نے ہماری دنیا اور یہ کائنات کیسے بنائی۔ (تصویر نمبر ۱)

ہماری دنیا ایک گولہ ہے جو اپنے سے

ہم نے ریل بنائی اور سمجھے کہ وہ بہت تیز چلتی ہے۔ پھر ایسے موٹر بنائے جو ۱۳۰ میل فی گھنٹہ چل سکتے ہیں ہوائی جہاز سے ان تیز موٹروں کی دوڑ ہو تو موٹر ایک گھنٹے میں سوا سو میل پیچھے رہ جائیں گے تم سمجھتے ہو کہ توپ کا گولہ بہت تیز جاتا ہوگا۔ ہاں اس میں شک نہیں کہ وہ بہت تیز جاتا ہے، مگر کیا، حساب لگاؤ تو وہ بھی کوئی ڈیڑھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتا ہے۔ اور ادھر دنیا کو دیکھو، کہ اتنی بڑی ہے، اور پھر بھی سورج کے گرد گھومتے ہوئے آٹھ لاکھ میل روزانہ طے کرتی ہے یعنی توپ کے گولے سے اس کی رفتار دوگنی ہے۔ اور اسی طرح لاکھوں کروڑوں برس سے گھوم رہی ہے۔ اور روشنی کا کیا پوچھنا، وہ تو ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل جاتی ہے۔ اس پر اسے سورج سے یہاں تک پہنچنے میں نو منٹ لگتے ہیں، ذرا حساب تو لگاؤ، سورج ہماری دنیا سے کتنی دُور ہے۔ (تصویر ۴)
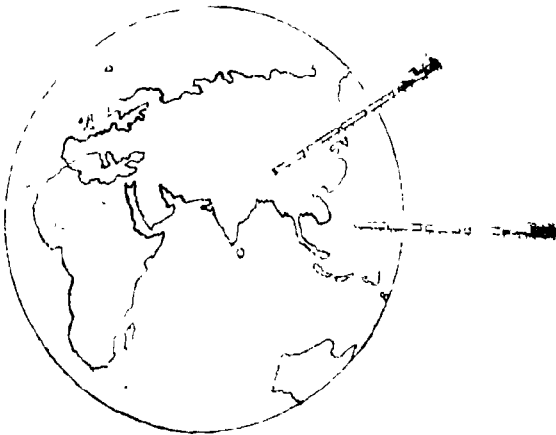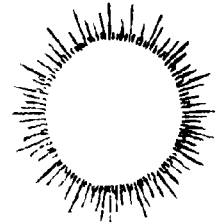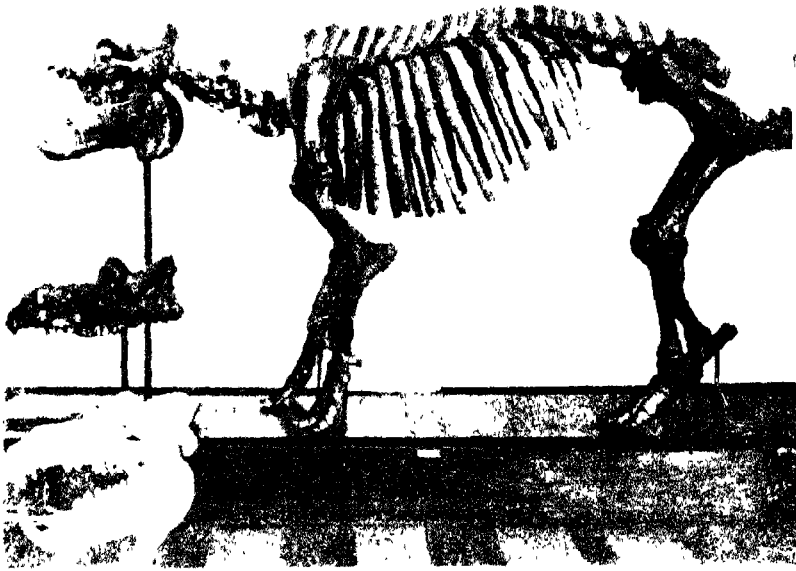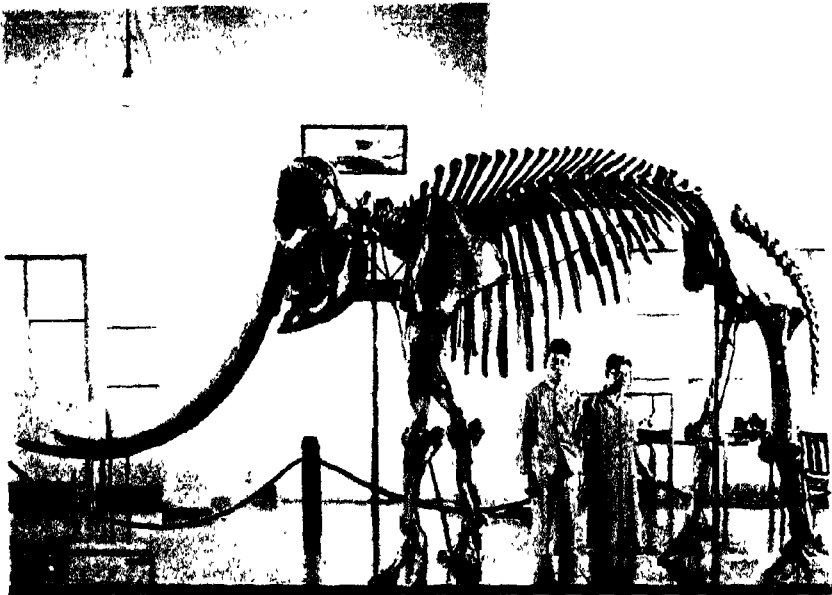
اگر تم ریل سے چاند تک جانا چاہو اور دن رات ۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے سفر کرو تو تمھیں چاند تک پہنچنے میں چھ مہینے لگیں گے۔ سورج تک

(۴)

ہمارے چند مضمون نگار

سید احمد داؤد صاحب

ڈاکٹر سید محمد حسین صاحب
پی ایچ ڈی

امتیاز حسین خان صاحب بی اے جامعہ (لندن)
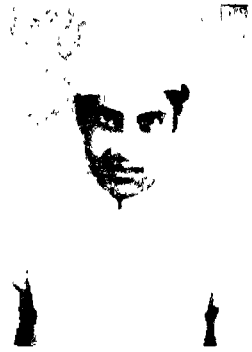
کوئی زندہ پہنچ ہی نہیں سکتا، اس کے لئے پورے دو سو دس برس کی عمر چاہئے۔ (تصویر ۴)

خیر! چاند تاروں کا قصہ چھوڑو۔ اب اپنی دنیا کی کہانی سُنو۔ جب یہ سورج سے پہلے پہل الگ ہوئی تو بیحد گرم تھی، مگر آہستہ آہستہ یہ سورج سے زیادہ دور اور ٹھنڈی ہوتی گئی، اس کی گیسیں جم کر ٹھوس ہو گئیں، گیسوں میں جو بھاپ تھی وہ پانی بن کر برسی اور سمندر بن گئی۔ سرد پڑنے سے اس کی سطح جو سُکڑی تو پہاڑ بن گئے۔ ان پر جو پانی برسا تو جو پتھر ذرا نرم تھے وہ دُھل کر مٹی بن گئے۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا، دوسری طرف پانی میں جاندار چیزیں پیدا ہوئیں۔ یہ قدرت کا نیا کرشمہ تھا۔ جاندار چیزیں پہلے اتنی چھوٹی تھیں کہ تم اُنھیں دیکھ نہ سکتے پھر بڑھتے بڑھتے طرح طرح کے اژدہے اور بھیانک جانور بن گئیں۔ یہ دیکھو دیو[۵] کے برابر ایک چھکو پڑ ہے اور یہ بڑا ڈراونا گینڈا۔[۶]

(۵)

(۶)

(۷)

اس کے بعد کی تصویریں اسی زمانے کے چمگادڑ ہیں۔(۷) جو آدمی سے بھی بڑے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے جانور تھے لیکن ہم نے اُن کی تصویریں نہیں بنائیں کہ تمھیں خواب میں کہیں ان کی ڈراونی صورتیں دکھائی نہ دیں۔ یہ سب جانور پیدا ہوئے اور مر گئے۔ اب ہم

زمین کھودتے ہیں تو ہمیں ان کی ہڈیاں ملتی ہیں، اور وہ جتنی گہرائی پر ہوں اس سے ہم اندازہ لگاتے ہیں کہ وہ کتنا زمانہ ہوا دنیا میں رہتے تھے۔ جب خدا نے انسان کو پیدا کیا تو جانور بہت چھوٹے ہو گئے تھے اور اپنے بچوں کو دودھ پلا کر پالتے تھے۔ (تصویر ۸)

آدمیوں کی پہلی بستیاں دجلہ اور فرات، نیل،

(۸)
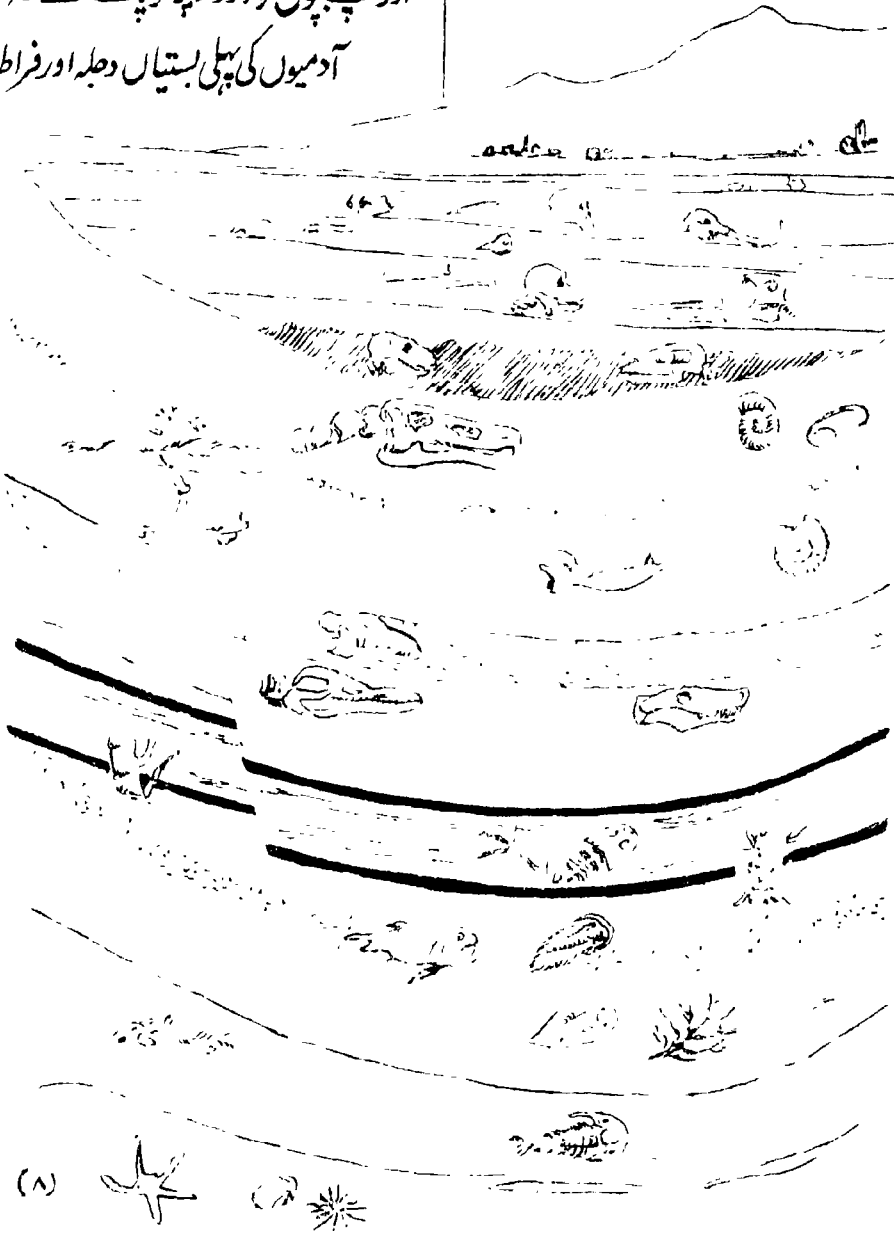
سندھ، ہوآنگ ہو اور یانگ ٹسے کیانگ کی وادیوں میں تھیں تمھیں نہ معلوم ہو کہ دریا کہاں ہیں تو اُنھیں نقشے میں تلاش کرلو ہمیں اس قدیم زمانے کے لوگوں کے حالات تاریخ میں نہیں ملتے اس لئے کہ اس زمانے میں لوگ تاریخیں لکھتے نہیں تھے۔ لیکن یہ لوگ اپنی یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جن سے ہمیں اُن کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ آؤ تمھیں ان کی سیر کرائیں۔

یہ تصویریں مصر کی ہیں۔ تصویر نمبر ۹ میں سامنے ایک عجیب سی شکل کی مورت ہے جس کا سر آدمی کا اور دھڑ شیر کا ہے۔ ہم ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ یہ کیا ہے، مگر خیال ہے کہ یہ کسی دیوتا کی مورت ہے۔ یہ مورت ایک چٹان کو چھیل کر برسوں میں اور بڑی محنت سے بنائی گئی اس کے پیچھے جو مثلث کی شکل کی عمارتیں ہیں وہ اہرام مصر کہلاتی ہیں، یہ کئی سو فٹ اونچی اور بھاری تراشے ہوئے پتھروں کی بنی ہیں۔ ان کے اندر مصری بادشاہوں کے تابوت ملے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مقبرے تھے۔ اس کے بعد کی تصویر میں ایک بہت پرانے

(۹)
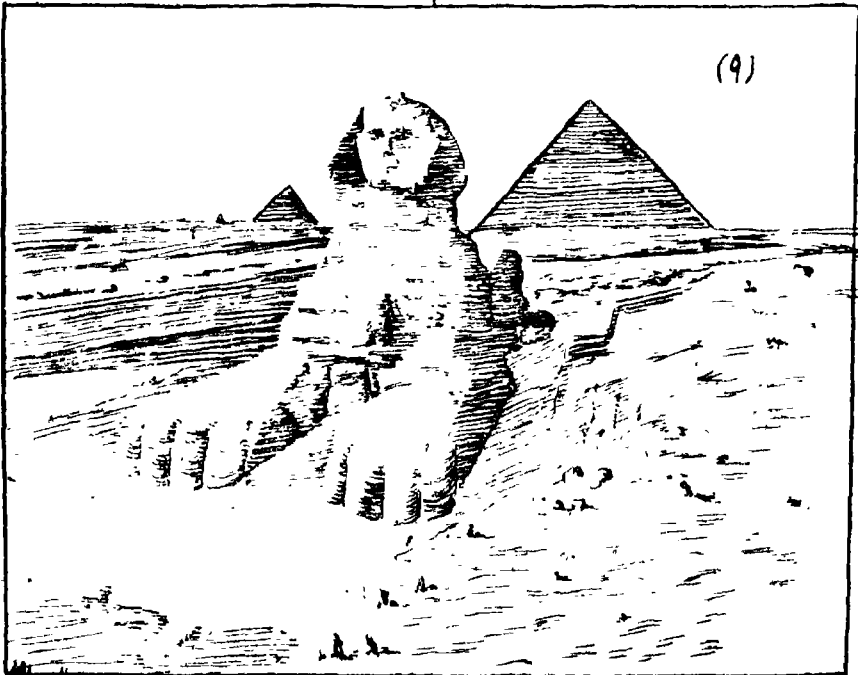
مندر کے ستون ہیں جن پر پہلے رنگ
پھرا تھا اور تصویریں بنی تھیں، اس
زمانے میں لوگ بڑے خوبصورت
مکان اور عبادت خانے بھی بنا سکتے
تھے۔

اب اور آگے بڑھو۔ یہ
تصویر بابل کے ایک بہت مشہور
باغ کی ہے جسے ایک ملکہ نے
اپنے لئے بنوایا۔ اس میں رہ بھی
سکتے تھے اور سیر بھی کر سکتے تھے
بابل میں اور بھی بڑی خوبصورت
عمارتیں تھیں، لیکن افسوس ہے
وہ سب گر گئیں اور زمین میں دفن
ہو گئیں۔ تصویر نمبر ۱۱

تصویر نمبر ۱۲ اور ۱۳

یہ دونوں تصویریں یونان
کی ہیں۔ دائیں طرف یونان کے
سب سے بڑے دیوتا کی مورت
ہے، جو چالیس فٹ اونچی اور سنگِ مرمر اور سونے
کی تھی۔ بائیں طرف ایک نہایت حسین مندر ہے

جس پراسی قسم کے ستون ہیں جو تم نے پہلے مصر کے مندر میں دیکھے تھے۔ مگر یہ ستون زیادہ سڈول ہیں۔ اور پوری عمارت زیادہ خوشنما۔
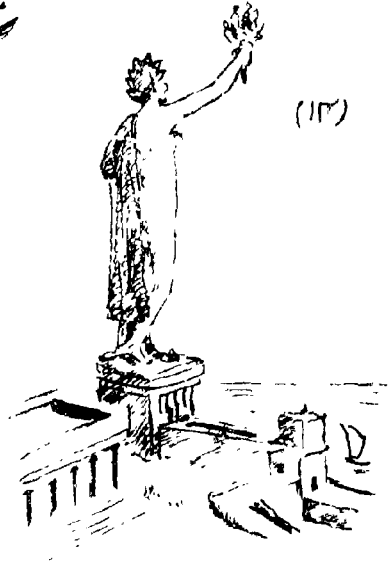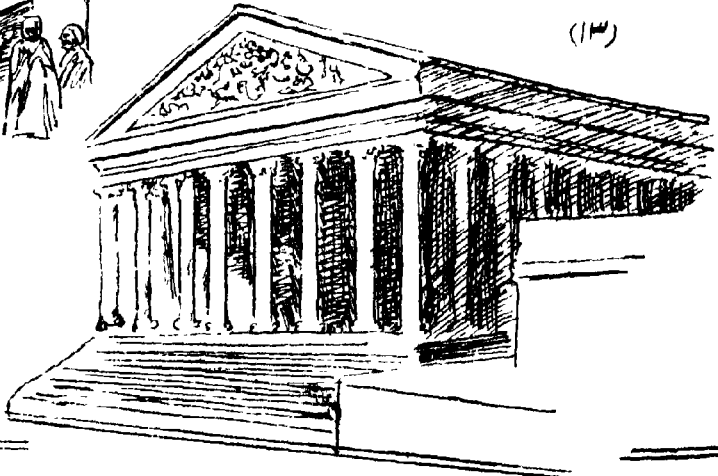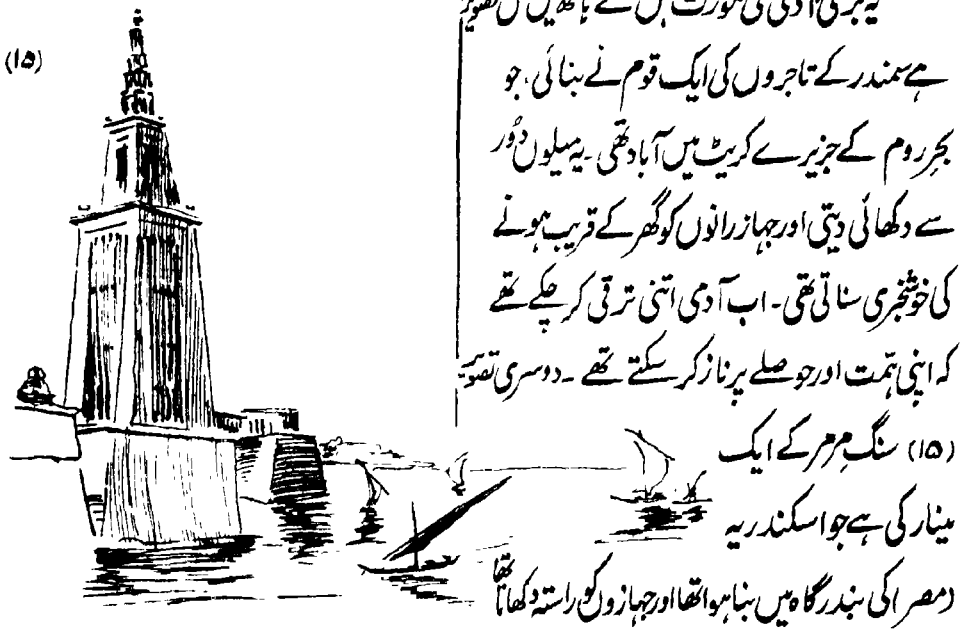
یہ بڑی آدمی کی مورت جس کے ہاتھ میں مشعل (تصویر ۱۴) ہے سمندر کے تاجروں کی ایک قوم نے بنائی، جو بحرِ روم کے جزیرے کریٹ میں آباد تھی۔ یہ میلوں دُور سے دکھائی دیتی اور جہازرانوں کو گھر کے قریب ہونے کی خوشخبری سناتی تھی۔ اب آدمی اتنی ترقی کر چکے تھے کہ اپنی ہمت اور حوصلے پر ناز کر سکتے تھے۔ دوسری تصویر (۱۵) سنگِ مرمر کے ایک مینار کی ہے جو اسکندریہ (مصر) کی بندرگاہ میں بنا ہوا تھا اور جہازوں کو راستہ دکھاتا تھا۔

(۱۵)

اخلاقی پیام

بچے سے گفتگو ہو، بوڑھے سے یا جواں سے
تہذیب اور ادب کے موتی جھڑیں زباں سے

شیریں زبان بن کر مشکل نہیں ہے کچھ بھی
دشمن کو دوست کرنا آسان ہے زباں سے

جو با اثر نہ ہو، یا جس کا اثر بُرا ہو
ایسی نہ بات کوئی نکلے کبھی زباں سے

راضی ہی اُن کو رکھنا۔ ناراض ہو گئے تو
پھر اپنے دوستوں کو لاؤ گے تم کہاں سے

(خاور جیلپوری)

دلچسپ مشغلے

(از حمیدہ اختر صاحبہ حیدر آباد دکن)

سچ کہنا ٹکٹ جمع کرنے کا کیسا دلچسپ مشغلہ تمھیں بتایا گیا ہے۔ تم میں سے بہت سے شوقین بچے سال بھر سے بڑی محنت اور شوق کے ساتھ ٹکٹ جمع کر رہے ہیں۔ اس تھوڑے سے عرصے ہی میں تمھارے پاس اچھی خاصی تعداد میں ٹکٹ جمع بھی ہو گئے۔ پیام تعلیم میں تمھاری خط کتابت پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شوق بچوں میں دن بدن بڑھ رہا ہے۔

اسی طرح کے اور بھی بہت سے کارآمد اور دلچسپ مشغلے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اُن کے متعلق تمھیں کچھ بھی نہیں معلوم، ولایت میں تو ایسے شوق بچوں میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ وہاں تمھیں بہت کم بچے ایسے ملیں گے جن کے پاس ایک دو چیزوں کے ذخیرے نہ ہوں۔ اُن کے والدین جب دیکھتے ہیں کہ اُن کے بچوں کی طبیعت کا لگاؤ اس مشغلے کی طرف زیادہ ہے۔ تو وہ بھی اُن کی خاطر اس میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ہر طرح اُن کی مدد کرتے ہیں۔ ولایت میں جب تمھاری عمر کے بچے اپنے دوستوں کے گھر ملنے جاتے ہیں تو پہلے وہ تھوڑی دیر آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہیں اور پھر میزبان دوست اپنے ساتھی کی خاطر اس طرح کرتے ہیں کہ اپنی جمع کی ہوئی چیزیں اُن کے البم اور ذخیرے دکھانے لگ جاتے ہیں۔ پھر اُن کی باتیں اپنی اپنی دلچسپی کے متعلق ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح سے جن بچوں

کو ایسے شوق نہیں بھی ہوتے۔ ان میں بھی ذخیرے جمع کرنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ والدین بھی اپنے ملاقاتیوں کو اپنے بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں فخریہ دکھاتے ہیں۔ اور پھر وہ گھر جا کر اپنے بچوں سے اُن کا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ آج فلاں صاحب کے یہاں ان کے بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں اور اُن کے البم دیکھے۔ کیا بتائیں کیسے اچھے تھے۔ یہ سنتے ہی بچہ اپنے ابّا سے بڑے اصرار سے کہتا ہے کہ آپ کی اتوار کو ہمیں اُن کے گھر لے چل کر دکھائیے۔ اس طرح سے بچوں کا شوق اور بڑھتا ہے کہ ہمارے ذخیرے بھی ایسے ہی ہو جائیں کہ ابّا دوسروں کو خوش ہو کر دکھائیں اور سب ہماری تعریف کریں۔

اسکولوں میں جیسے ایک چھوٹی سی لائبریری ہونا ضروری ہے اسی طرح ولایت میں ہر اسکول میں ایک چھوٹا سا "میوزیم" یعنی عجائب گھر بھی ضرور ہوتا ہے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں شیشے کی سات آٹھ الماریاں! لو ہو گیا بچوں کا میوزیم۔ اس میں زیادہ تر تو بچوں کی جمع کی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ تم دل میں سوچ رہے ہوگے کہ آخر وہاں کے بچے کیا کیا چیزیں جمع کرتے ہیں۔ لو تھوڑے سے نام میں ہی بتائے دیتی ہوں اگر تم وہاں کسی اسکول کا میوزیم دیکھنے جاؤ تو یہ چیزیں قریب قریب ہر ایک اسکول کے میوزیم میں دیکھو گے۔ مختلف ملکوں کے سکے ٹکٹ۔ مختلف چڑیوں کے چھوٹے بڑے انڈے بڑی خوب صورتی اور نفاست کے ساتھ شیشے کے چھوٹے چھوٹے بکسوں میں رکھے ہوئے۔ ہر قسم کے پیڑوں اور پودوں کی پتیاں، گھونگے اور سیپیاں۔ طرح طرح کی مشہور تاریخی تصویریں اور اس قسم کی بہت سی چیزیں۔ تم کو کیا بتاؤں بعض بچے کیسی انوکھی انوکھی چیزیں جمع کرتے ہیں

جس طرح تمھارے اسکولوں میں ہوتا ہے کہ سالانہ امتحان کے بعد چھوٹے چھوٹے ڈرامے اور کھیل وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس کے بعد انعاموں کی تقسیم اور پھر اسکول بند۔ اسی طرح ولایت میں بھی ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی نمائش بھی ہوتی ہے۔ اس میں لڑکوں اور

بچیوں کی ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔ جیسے نقشے، ڈرائنگ، پینٹنگ، لکڑی کی بنی ہوئی چیزیں وغیرہ، ایسی نمائش تو کبھی کبھی تمھارے اسکولوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر وہاں جو ایک خاص چیز اور دیکھنے میں آتی ہے وہ یہی مختلف قسم کی جمع کی ہوئی چیزیں۔

ایسی نمائشوں میں بچوں کے والدین دوسرے اسکولوں کے بچے اور استاد مدعو کئے جاتے ہیں۔ سب لوگ اور خاص طور پر بچے ایسی نمائشوں کو بے حد شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان چیزوں پر چند انعامات اور تمغے مقرر ہوتے ہیں جو کچھ تو اچھے دستکار بچوں کو دئے جاتے ہیں اور چند ان بچوں کو ملتے ہیں جن کی جمع کی ہوئی چیزیں سب سے اچھی ہوتی ہیں۔

جب بڑی نمائشیں ہوتی ہیں تو استاد اپنے اپنے اسکولوں کے بچوں کی عمدہ عمدہ دستکاریاں اور جمع کئے ہوئے ذخیرے بچوں کی یا اسکول کی طرف سے بھیج دیتے ہیں۔ نیچے ایک کاغذ پر بچے کا نام، عمر سب لکھ کر لگا دیتے ہیں تاکہ انعام دیتے وقت فیصلہ کرنے میں آسانی رہے۔ ایسی بڑی نمائشیں تو ہمارے ملک میں بھی ہوتی ہیں۔ جن میں بچوں کی دستکاریاں تو اچھی اور طرح طرح کی ہوتی ہیں مگر ان کی جمع کی ہوئی چیزیں بہت ہی کم دیکھنے میں آتی ہیں اس میں تم بچوں کا کیا قصور، یہ تو ہم بڑوں اور استادوں کا فرض ہے کہ تمھیں اس قسم کی چیزوں کے متعلق دلچسپی دلائیں۔ اور جمع کرنے کے طریقے بتائیں۔

جن بچوں کو اپنے بچپن میں مختلف چیزیں جمع کرنے کا شوق رہتا ہے۔ ان کی معلومات بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے اور پھر بڑے ہو کر فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ اس قسم کے ذخیرے بڑی بڑی قیمتوں پر بک بھی جاتے ہیں۔ ولایت میں والدین اور وہ لوگ جو خریدتے ہیں ان کو اپنے دیوان خانوں میں رکھتے ہیں۔ اکثر بچے جب اسکول کی تعلیم ختم کر چکتے ہیں تو.... اپنی جمع کی ہوئی چیزیں تحفے کے طور پر اپنے اسکول کے میوزیم کو پیش کر دیتے ہیں اس

سے اُن کے استاد بہت خوش ہوتے ہیں اور اُن کا نام لگا کر اس کو اسکول میوزیم میں بطور یادگار فخریہ رکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں دوسرے ملکوں میں بہت سے نادیدہ دوست بھی بن جاتے ہیں ایسے دوستوں کو انگریزی میں (PEN FRIEND) کہتے ہیں۔ اس طرح سے ایک دوسرے سے اپنی اپنی چیزوں کا مبادلہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور کچھ تھوڑا بہت اس سلسلے میں ایک دوسرے کے ملک کے متعلق معلومات ان کے رہن سہن کے طریقے بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

اب کی انشاء اللہ تم کو کچھ چیزوں اور ان کے جمع کرنے طریقے بتاؤں گی۔ یہ مشغلے اتنے دلچسپ ہیں کہ تم فوراً بڑے شوق کے ساتھ ان میں لگ جاؤگے۔ ہر طرح سے میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں جو چیزیں مجھے دستیاب ہوسکیں گی اور اگر تم کو اُن کی ضرورت پڑی تو بشوق مجھ سے منگا لینا مگر اتنا تم کرو کہ اپنے ایڈیٹر صاحب کو راضی کرو کہ سال کے سال ایک نمائش اس قسم کی کریں جس میں تم اپنے اپنے البم ذخیرے وغیرہ بھیجو اور انعام حاصل کرو۔

ایک عجوبہ

پیام بھائیو! آؤ تمھیں ایک نہایت دلچسپ کھیل دکھائیں۔ دیکھو کتنی معمولی معمولی چیزیں ہیں جن سے ایسا عجیب وغریب تماشا تیار ہوتا ہے ایک صاف ستھری شیشے کی بوتل۔ ایک ننھی سی سوئی اور کافور کا ذرا سا ٹکڑا ......

اور پھر کتنا آسان طریقہ۔ بوتل تو تمھارے گھر میں ہوگی ہی اور اس میں کارگ بھی لگی ہوگی۔ اپنی آپا سے ایک سوئی لے لو اور کوئی ایک پیسہ خرچ ہوگا۔ اس کا ذرا سا کافور بازار سے لاؤ۔

پہلے سوئی کے ناک والے حصے کو کارک میں اور اس کے باریک حصے کو کافور کے ٹکڑے میں چبھو دو اور بوتل کو کارک سے بند کر دو۔ سمجھ گئے نا؟ کافور سوئی میں اٹکا ہوا بوتل کے اندر لٹکا رہے گا۔ اب بوتل کو دھوپ میں لے جاکر رکھ دو بس تمھارا کام ختم ہوگیا۔ اب تماشا دیکھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ارے وہ دیکھو ادھر! چمکیلے چمکیلے تاگے بوتل میں کہاں سے آگئے؟ یہ سب اسی کافور کے اثر سے پیدا ہو رہے ہیں ذرا ٹھہرو۔ ابھی اسی قسم کے تاگوں سے تمام بوتل بھر جائے گی،

اہا ہا! اب دیکھو ذرا! یہ دھاگے سورج کی روشنی میں کیسے چمک رہے ہیں۔ آسمان پر قوس قزح اُگ آئی ہے، واہ وا! کیسے کیسے پیارے رنگ ہیں۔

ننگا پربت

سید احسن صاحب - ایم اے

ننگا پربت پر چڑھنے کی کوشش سب سے پہلے ۱۸۹۵ء میں کی گئی - مگر اس مہم کے لوگ زیادہ بلندی (اونچائی) تک نہ پہنچ سکے اور موسمی خرابی کی وجہ سے راستہ ہی میں ختم ہوگئے - اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں جرمنی اور امریکن پارٹی نے اس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کا ارادہ کیا مگر وہ بھی ۲۳ ہزار فٹ سے آگے نہ بڑھ سکے - موسم کی ناہمواری اور باربرداروں کی ناطاقتی کے سبب اس پارٹی کو بھی منزلِ[1] مقصود تک پہنچنے سے پہلے واپس ہونا پڑا - اس مضمون میں ایک زبردست مہم کا حال بیان کیا گیا ہے جو ۱۹۳۴ء میں ولی مرکل کی سرداری میں گئی تھی - اس پارٹی کے سب ممبر جرمنی تھے - جن کا مقصد صرف اونچائی پر چڑھنا ہی نہ تھا بلکہ سائنٹفک بھی تھا تاکہ بلند مقامات پر پہنچکر وہاں کے موسمی حالات اور اُن کے اثرات کا اندازہ کرسکیں - چنانچہ اپنے ساتھ ان لوگوں نے چند سائنسداں بھی لئے تھے اور ایک بہترین فوٹوگرافر بھی ساتھ تھا جس کے تیار کئے ہوئے فوٹوؤں کو دیکھ کر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ گویا خود ہم اس پہاڑ پر موجود ہیں - قُلی بھی ان لوگوں کو بہت اچھے اور تجربہ کار مل گئے تھے دارجیلنگ سے قلیوں کی ایک بڑی تعداد صرف اسی مقصد کے لئے بلوائی گئی تھی -

مگر انسان سوچتا ہے کچھ، ہوتا ہے کچھ - یہ زبردست پارٹی جس کو جرمنی حکومت کی پوری پوری مدد ملی تھی جس کے ساتھ نہ صرف ریلوے نے ہمدردی کی تھی، بلکہ جہازوں کی کمپنی اور ہندوستانی حکومت نے ہر ممکن آسانی مہیا کی - اپنی منزل کے سامنے سے صرف موسمی خرابی کی وجہ سے واپس ہوئی - اب ان کی کہانی خود ان کے ایک ساتھی (وِلٹر برنشٹولڈ) کی زبانی سُنئے -

روانگی کی تیاری

ہمارے لیڈر مسٹر ولی مرکل نے اپنے پچھلے (۱۹۳۲ء کے) تجربے کی بنا پر اس مرتبہ ایسے لوگوں کو اپنی پارٹی میں شامل کیا جن کو اونچے پہاڑوں پر چڑھنے کا کافی تجربہ تھا - ان لوگوں کے نام یہ تھے :-

(۱) پیٹر اشنبریز (۲) فرٹز برنشٹولڈ (مصنف مضمون ہذا) (۳) ولی برنارڈ (ڈاکٹر) (۴) الفریڈ ڈرکسل - (۵) ہنس ہیر ونمن (کیمپ کمانڈر) (۶) ولی مرکل (لیڈر)

[1] وہ جگہ جہاں جانے کا ارادہ کیا گیا ہو یا جہاں جانا مقصود ہو -

(۷) پیٹر مولریٹر (۸) ارون شنیدر (۹) ولی ولزنباخ (۱۰) الی واٹلینڈ۔

علاوہ اِن کے یہ تین آدمی سائنٹفک مقاصد کے لئے ساتھ تھے

(۱) رچرڈ فنسر ولڈر (۲) والٹر رائکل (ماہر جغرافیہ) اور (۳) پیٹر مسج۔

اِس عظیم الشان مہم کے لئے بے انتہا تیاریوں کی ضرورت پیش آئی۔ جرمنی سے روانگی، ہندوستان کا سفر اور اس کے بعد ان مقامات پر جانا جہاں پہلے انسان کا گذر نہ ہوا ہو۔ برلن سے انگلستان اور ہندوستان تک خطوں کا ایک تانتا لگا ہوا تھا۔

مسٹر مرکل (لیڈر) کے کمرے میں ایک طرف ٹائپ رائٹر کی کھٹا کھٹ ہو رہی تھی اور دوسری طرف ٹیلیفون کی گھنٹی تھی کہ ہر سیکنڈ پر پیغامات سُنا رہی تھی۔ مسٹر مرکل ایک زبردست طاقت اور منتظم طبیعت کے انسان تھے۔ صرف اِس مقصد کے لئے انھوں نے دو سفر انگلستان کے بھی کئے تھے۔ جہاں انھوں نے ایورسٹ پر چڑھائی کرنے والوں سے مشورہ لیا۔ جس مقام پر وہ اپنے سفر کا ذکر کرتے ہر شخص اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیتا اور ان کی کامیابی کی دل سے دعا کرتا۔ خدا خدا کر کے انتظامات مکمل ہوئے۔ مسٹر ڈرکسل کے ذمّے سامان کی دیکھ بھال اور قلیوں کا انتظام ہوا۔ مسٹر ولزنباخ کے سپرد باورچی خانہ ہوا ولزنباخ کی والدہ نے روانگی کے وقت تک اپنے بیٹے کے کام میں بہت مدد دی۔

ہمارے ایک ساتھی کو یونیورسٹی کا امتحان بھی دینا تھا چنانچہ یہ زمانہ ان کے لئے بہت کٹھن تھا۔ اپنے راستے کو اچّھی طرح سمجھنے کے لئے ہم لوگوں نے بے شمار تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔ اور واپسی پر دوسروں کے سامنے اپنی کارگزاری کا ثبوت پیش کرنے کے لئے بہترین کیمرہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا اور اِس مقصد کے لئے تصویر چھاپنے کے جدید ترین طریقوں کا استعمال بھی سیکھا تھا۔ ایک خیمہ 'اندھے کمرے' کا کام دینے کے لئے خاص طور پر بنوایا تھا۔ ۱۹۳۲ء والی مہم کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کافی بلندی پر ہم لوگ آگ نہ جلا سکتے تھے۔ چنانچہ اِس مرتبہ جرمن یونیورسٹیوں کے بہترین سائنسدانوں سے بھی اِس معاملہ میں مشورہ لیا تھا۔

سری نگر تک

سامان کی تیاری شروع ہونے کے وقت سے روانگی کے وقت تک الوداعی پارٹیوں اور دعوتوں کا ایک سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ ہمارے لیڈر مسٹر مرکل اور ساتھی مسٹر ڈرکسل ریلوے میں ملازم تھے۔ ایک دعوت ان کے دوستوں نے بھی روانگی کے وقت دی۔ ۲۵۔ مارچ کو اتوار کے دن چار آدمیوں کی پارٹی بطور پیشبندی روانہ ہوئی تاکہ ہندوستان پہنچکر یہ لوگ شروع کے انتظامات مکمل کریں۔ اِس پارٹی میں علاوہ مسٹر مرکل (لیڈر) کے اشنبرنر۔ شنیدر اور واٹلینڈ تھے۔ اصل پارٹی کی

ننگا پربت کی چوٹیاں

ننگا پربت [illegible] دوسرے

آپ پڑھ چکے ہیں

یہ تصویریں مشہور جرمن اخبار [illegible] سے لی گئی ہیں۔

روانگی سولہ دن کے بعد ہوئی۔ وہ لوگ ۲۷ مارچ
کو «کنٹو» جہاز پر سوار ہوئے ہندوستان پہنچ کر
ان بیچاروں کو ہر طبقہ سے کافی مدد ملی۔ مسٹر مرکل
اور وائلینڈ بمبئی سے نئی دہلی آئے۔ اس کے بعد
کلکتہ جاکر جرمنی قونصل جنرل سے معاملات طے کئے۔
اور روپے کی ضرورت کے وقت فراہمی کے انتظامات
مکمل کئے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے اپنے راستوں
کے نقشے مطالعہ کئے۔ دو ایک جگہ اپنا مقصد سفر بیان
کرنے کے لئے لکچر بھی دئے۔

مسٹر شنیڈر اور راشتنبریز زاولینڈ ہی سے
سری نگر تک سامان لے جانے میں مصروف تھے۔
ان لوگوں نے سامان لانے لے جانے کے لئے
ایک کمپنی سے گفتگو کی۔ بعد میں مسٹر مرکل نے سری نگر
پہنچکر وہاں کے ریزیڈنٹ سے مل کر قلیوں اور خچروں
کا بندوبست کیا۔ مسٹر وائلینڈ اس عرصے میں دارجیلنگ
پہنچ گئے۔ جہاں انہوں نے ہمالیہ کلب کی مدد سے
پہاڑ پر سامان لے کر چڑھنے والے قلیوں کا انتظام
کیا۔ دارجیلنگ میں اس قسم کے لوگ آسانی سے مل
جاتے ہیں۔ بلکہ گزشتہ چند سالوں میں متعدد پہاڑی
پارٹیوں کے روانہ ہونے سے وہاں پر ایسے قلیوں
اور باربرداروں کی اچھی خاصی آبادی ہوگئی ہے۔
جن میں چند قلی ایسے ہیں جن کو تقریباً ہر پارٹی کے
ساتھ پہاڑوں پر چڑھائی کا موقع ملا ہے۔ اپنے
تجربے کی وجہ سے وہ لوگ پہاڑی راستوں اور مشکلات
سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔

۱۹۳۲ء کی پارٹی کی ناکامیابی کی ایک وجہ یہ بھی
تھی کہ قلی دقت کے وقت ساتھ نہ دے سکے تھے۔
چنانچہ اس مرتبہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا تھا
کہ ایسے لوگ بھرتی کئے جائیں جو مشکل سے مشکل وقت
میں بھی دھوکہ نہ دیں۔ اس مسئلہ کی طرف شروع ہی سے
خاص توجہ کی گئی تھی۔ دارجیلنگ کے محکمۂ جنگلات کے
افسروں کی مدد سے ان قلیوں کی مزدوری اور دوسری
شرطیں آسانی سے طے ہوگئی تھیں۔ مسٹر رٹلج (لیڈر
ایورسٹ پارٹی) کی ۱۹۳۳ء کی مہم کے تجربے سے
ان لوگوں کی غذا کا بھی ویسا ہی بندوبست کیا گیا تھا۔
بالآخر قلیوں کی ایک پلٹن معائنہ کے لئے ایک قطار
میں کھڑی ہوئی اور ۳۷ قلیوں کا انتخاب ہوا۔ منتخب
قلیوں میں ایک ایسا تھا جو نو مرتبہ ہمالیہ کی بلند چوٹیوں
کی سیر کر آیا تھا۔ تین چار قلی ایسے تھے جن کو تین چار مرتبہ
چڑھائی کا موقع ملا تھا۔ یہ سب بڑے فخر سے اپنے
گذشتہ کارناموں کے سرٹیفکیٹ دکھاتے تھے۔

دارجیلنگ سے روانگی کے قبل ان سب کا ڈاکٹری
معائنہ ہوا اور سب کے سب بڑی خوشی کے ساتھ
اپنی مہم پر روانہ ہوئے۔ بڑے صاحب (مسٹر مرکل)
کو دیکھنے کا سب کو بیحد اشتیاق تھا۔

برلن سے اصل پارٹی پروگرام کے مطابق سولہ
دن بعد روانہ ہوئی۔ چلتے وقت ایک بدشگونی یہ ہوئی
کہ ہمارے کیمپ کمانڈنٹ مسٹر بومیسٹر عین روانگی کے

دن بیمار پڑ گئے۔ بدرجہ مجبوری اُن کو چھوڑنا پڑا اور ۱۳ار اپریل کو ہم لوگ کو نٹے ورڈی (Conteverde) جہاز سے روانہ ہوئے۔ اور راستے کے پُر لطف مناظر سے محظوظ ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے۔ ہم کو وینس سے بمبئی تک پہنچنے میں گیارہ دن لگے۔ اور تقریباً پانچہزار میل کا راستہ طے کیا۔ جہاز کی رفتار اس عرصے میں اوسطاً بیس میل فی گھنٹہ تھی۔ ہمارے جہاز میں ایک دوسری پارٹی بھی تھی وہ لوگ کوہ قراقرم پر چڑھائی کرنے جارہے تھے۔ ان سے گفتگو میں بہت لطف آتا تھا افسوس کہ اس وقت ہمارے ساتھ کوئی اخباری نمائندہ نہ تھا جو ہم لوگوں کی اس پُر لطف 'رقابت' کا ذکر اخباروں میں کرتا۔

۲۵ر اپریل کو ہم لوگ بمبئی پہنچے۔ یہاں ہم کو مسٹر مرکل کا تار سری نگر سے ملا کہ "فوراً چلے آؤ"۔ چنانچہ شام تک سب سامان مکمل کر کے ہم لوگ سری نگر کے لئے روانہ ہوگئے۔ راولپنڈی کے اسٹیشن پر ۲۷ر اپریل کو مسٹر واٹلینڈ اور شنیدر نے ہمارا استقبال کیا۔ اور ہمیں بتایا کہ صرف ہم لوگوں کا انتظار تھا ورنہ روانگی کا تمام سامان تیار تھا۔ دوسرے دن صبح کو روانگی مقرر ہوئی تھی۔

راولپنڈی سے ۹ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ہم لوگ وادیٔ کشمیر میں داخل ہوئے جہاں کے پُر فضا مناظر اور سبزہ زاروں نے ساری تھکن دور کردی۔ اتنے دنوں تک چلنے کے بعد درحقیقت ہم لوگ جنت میں پہنچ گئے تھے۔ کشمیر میں ہماری ملاقات مسٹر مرکل اور اشنیڈر سے ہوئی اور سب کی یکجائی نے لطف دوبالا کر دیا۔ ان لوگوں نے یہاں پہلے سے پہنچکر تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے اور ۱۹۳۲ء میں جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اس مرتبہ وہ سب آسان تھیں۔ دارجیلنگ سے آئے ہوئے ۳۷ آدمیوں میں سے ہر شخص نے ایک ایک اردلی اپنے لئے منتخب کر لیا۔ اردلی بھی اپنے آقا کی خدمت میں آکر بہت خوش تھے۔ ہمارے سامان کے کل ۵۷۰ عدد تھے جو کشتیوں کے ذریعے باندی پور تک پہنچائے گئے اگرچہ ان دنوں بارش ہونے لگی تھی اور اخبار والوں نے بھی اس بارش کا ذکر کافی اہمیت کے ساتھ کیا تھا۔ مگر ہم لوگ کمربستہ ہوکر دوسرے دن روانہ ہوگئے۔ کیونکہ 'ہمالیہ' ہمارا منتظر تھا۔

ہمالیہ پر

سری نگر سے روانہ ہونے کے بعد ہم لوگ وولر جھیل سے گذرے اور جھیل کو پار کرنے پر ہمارا خیر مقدم ان سوتیلیوں نے کیا جن کو ہمارے سامان کے لیجانے کے لئے پہلے سے وہاں کے ایک افسر نے تیار کر رکھا تھا۔ سامان کو دیکھتے ہی قلی اس پر ٹوٹ پڑے اس وقت لیوانے (جو ہمارے دارجیلنگ کے

قلیوں کا سردار تھا) اس ہنگامے کے رفع کرنے میں بہت مدد دی اور اسی کے انتظام سے ان قلیوں کو سامان تقسیم کیا گیا۔ ہم میں سے چار آدمی یہاں رک گئے باقی مسٹر مرکل کی سرکردگی میں روانہ ہو گئے۔ دو سال قبل والا راستہ پھر ہمارے قدموں کے نیچے تھا اور کشمیر کی سرسبز وادیوں کو تین ماہ کے لئے خیر باد کہہ کر ہم پھر پتھریلی زمین پر روانہ ہو گئے۔ شام کے وقت ہم لوگ ترگبال کے پڑاؤ پر پہنچے۔ اور رات کو وہیں ٹھہر گئے ترگبال تقریباً بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

علی الصباح ہمارے لیڈر نے سب کو اٹھایا اور جو اٹھنے میں ذرا بھی کسمائے اُن کے کمبل شل ان اسکول کے بچوں کے کھینچے جا رہے تھے جن کی ماں اُن کے سرہانے کھڑی ہوئی اٹھا رہی ہو اور وہ مچل مچل کر کروٹ بدل رہے ہوں۔

'لیوا' بھی اپنے فرائض منصبی انجام دے رہا تھا۔ اگر ہمارا لیڈر ہم لوگوں کو اٹھا رہا تھا تو قلیوں کا جمعدار بھی تمام باربرداروں کو خبردار کر رہا تھا۔ جلدی جلدی سب لوگ اُٹھ بیٹھے۔ ہمارے سامنے نیچے کشمیر کی سرسبز وادی تھی۔ اور اوپر برف ہی برف جس کی چمک سے آنکھوں میں چکا چوند ہو رہی تھی۔ کافی عینکیں نہ ہونے کے باعث نگاہ نہ ٹھہرتی تھی اس لئے ڈاکٹر برنارڈ کھڑے ہوئے سب کی آنکھوں میں دوا ڈال رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد روانہ ہو کر ہم لوگ کورگبال پہنچے۔ لیکن اس چڑھائی میں ہمارے سب کپڑے نم ہو گئے تھے۔ قلی بھی آہستہ آہستہ پہنچ رہے تھے اور شام کے وقت جب سب جمع ہو گئے تو اس راستہ کو آسانی سے طے کرنے پر ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہا تھا۔

دو تین روز اسی طرح چڑھائی کرتے ہوئے ہم لوگ وادیٔ سندھ میں داخل ہو گئے۔ اس عرصے میں کئی تجربے ہوئے۔ برف راستے میں گرتی ہوئی کئی جگہ ملی اور بعض اوقات آنکھوں میں گھسی جاتی تھی جس سے اکثر قلیوں کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ ڈاکٹر برنارڈ کی ہمت افزائی اور مدد سے یہ منزل آسانی سے طے ہو گئی۔ اس دوران میں ہم نے ۲۰۰ قلیوں میں سے آدھے قلیوں کو رخصت کر دیا۔ کیونکہ قواعد کے بموجب دوسرے خطے کے قلی یہاں سامان نہیں لے جا سکتے تھے۔

وادیٔ سندھ

اس میدان میں پہلی رات ہم کو آسمان کے نیچے گزارنی پڑی اور خانہ بدوشی کا پورا پورا لطف آیا۔ دوسرے دن صبح کو دو گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم لوگ خیموں میں داخل ہوئے۔ یہاں ہماری چیزیں سلیقے اور قرینے سے لگی ہوئی تھیں۔ ہر ایک اردلی اپنے آقا کی چیزوں کی حفاظت اپنی جان کی طرح کر رہا تھا۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ان کی نگاہوں میں رہتی۔ ایک مرتبہ

میں نے اپنے اردلی پاسنگ سے اپنی ایک نوٹ بک کے متعلق دریافت کیا الفاظ میرے منہ سے نکلے ہی تھے کہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ ایک صاحب کی ٹاکیا پر دو قلی آپس میں تکرار کر رہے تھے اور ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ صابن اُس کے آقا کی ملکیت تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ بالکل سچے تھے کیونکہ بعد میں پتہ چلا کہ صابن ان دونوں کے آقاؤں کے مشترکہ استعمال میں رہا کرتا تھا۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی ان پہاڑیوں کے چہروں پر مسکراہٹ اور خندہ پیشانی کے آثار نمایاں رہتے تھے۔ باوجود زبان کی ناواقفیت کے ہم لوگ اکثر اوقات ان کی باتوں سے دل بہلایا کرتے انہوں نے اپنے آقاؤں کی پہچان کے انوکھے طریقے ایجاد کر رکھے تھے مثلاً مسٹر مرکل کو بڑا صاحب کہتے تھے۔ مسٹر مولر بیٹر کا نام کھانے والا صاحب تھا۔ مسٹر بیچے چھوٹے صاحب تھے

وادیٔ سندھ کو پار کرنے میں بھی تین چار دن لگ گئے۔ یہاں پر ہم لوگوں کو اپنے ریڈیو سٹ کے تجربے کا موقع ملا۔ ایک موقعہ پر ہم لوگوں کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا جب کہ پہاڑی قلیوں نے ریڈیو پر گفتگو شروع کی۔ میرا نوکر پاسنگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا جب وہ ریڈیو کے سامنے بیٹھا ہوا اپنے دوست پالٹن کی گفتگو سن رہا تھا۔ ان لوگوں کو ریڈیو سے ہٹانا بہت ہی مشکل تھا۔

میں نے بھی اس جگہ کے چند ناچ اب فلم تیار کئے تھے۔ افسوس کہ بارش کے سبب وہ سب بہہ گئے اس وادی میں ہم کو اپنا ۱۹۳۲ء والا راستہ چھوڑ دینا پڑا کیونکہ اس مرتبہ میدان کا راستہ ہم کو صاف مل گیا تھا اور ہم

نمبر ۱

نمبر ۲

یہ تصویریں مشہور جرمن اخبار … کی … سے لی گئیں

دریائے سندھ کو پار کر کے دوسری طرف پہنچ گئے پارٹی کے کچھ لوگ موسم خراب ہوجانے کی وجہ سے دوسری طرف سے گھوم کر آئے۔ دریا کو پار کرنے کے بعد ہم نے پہلی مرتبہ ننگا پربت کو دور سے دیکھا اور اس پُرہیبت منظر نے ہمارے دلوں کو عجیب طرح کی کیفیت سے بھر دیا۔ جرمنی سے ہماری روانگی کو پورے چار ہفتے گزر چکے تھے۔ یہ زمانہ ان مشکلات کے سامنے کچھ نہ تھا جن سے ہم کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ مسٹر مرکل کی دور اندیشی برٹش گورنمنٹ، ہندوستانی افسران کی مدد اور ریاست کشمیر کی ہمدردی نے ہم لوگوں کو ہر جگہ فائدہ پہنچایا۔ دریائے سندھ کے دامن سے ننگا پربت کی چوٹی تک تیئیس ہزار فٹ کی بلند دیوار ہے۔ یہ دنیا کی بلند ترین بلندیوں میں سے ہے۔ کاش ہم اس کو فتح کر سکتے۔

رکھیاٹ نالہ

وہم بھی بعض اوقات انسان کو طرح طرح کی مشکلوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔ شکر ہے کہ ہم لوگ اس وبا سے محفوظ رہے اگرچہ ہم لوگوں کی تعداد تیرہ تھی۔ روانگی کی تاریخ بھی تیرہ اور اس پر طرّہ یہ کہ ہمارے جہاز کے کیبن کا نمبر بھی تیرہ تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اس نحس نمبر نے اب تک اپنا کوئی اثر ہم لوگوں پر نہیں کیا تھا کوئی وجہ آئندہ پروگرام میں خلل اندازی کی نظر نہ آئی۔

ننگا پربت کی چڑھائی شروع ہونے سے پہلے ایک بار پھر ہم لوگوں کو دریائے سندھ پار کرنا پڑا اور اس مرتبہ اس پُل کے ذریعہ ہم لوگ پار ہوئے جس کا نام "رکھیاٹ" کا پُل ہے۔ اس مقام پر ایک چشمہ ہے جہاں سے ہر وقت گرم پانی اُبلتا رہتا ہے، اور ٹھنڈا ہونے پر اس پانی سے سڑے ہوئے انڈوں کی بُو آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پانی صحت کے لئے بہت مفید ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگوں کو تجربے کا موقع نہیں ملا۔ اسی چشمے کے کنارے ہم لوگوں کے خیمے لگائے گئے اور ہمارا جھنڈا ان خیموں پر لہرا رہا تھا۔ گویا ننگا پربت کی چوٹی کا سفید برف اس کو خوش آمدید کہہ رہا تھا۔

اس مقام سے کچھ قلیوں کو علیحدہ کر دیا گیا کیونکہ ان کی تعداد ہم لوگوں کے اخراجات کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ دوسرے دن کے پروگرام کے متعلق ہم لوگوں کو یہ احکامات دئیے گئے۔

"کل علی الصباح سب صاحب لوگ برف پر چڑھنا شروع کریں گے۔ مقامی قلیوں کو رخصت کر دیا جائے گا بنیادی کمپ کا راستہ مل جانے پر دارجیلنگ کے قلی باری باری سامان پہنچائیں گے"۔

دوسرے دن صبح کو ہم لوگوں نے برف پر چڑھنا شروع کیا۔ جہاں ہمارا خیمہ آٹھ سو دس فٹ کی بلندی پر نصب کیا جانے والا تھا۔ ایورسٹ اور کنچنجنگا کے تجربہ کار قلیوں نے خیمہ نصب کرنے کے لئے مناسب جگہ کی تلاش شروع کی اور تھوڑی محنت کے

بعد دو میدان ہم لوگوں کو مل گئے۔ شام تک خیموں کا ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا تھا۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر مرتب تھی۔ اپنی کامیابی کا اظہار کرنے کے لئے جھنڈا ابھی لہرا رہا تھا قلیوں کو ان کی اُجرت دے کر رخصت کر دیا گیا۔ ان کے چلے جانے سے ہم لوگوں کی تعداد میں کافی کمی ہو گئی اس لئے حفاظت کے لئے رات بھر خیموں کے چاروں طرف آگ جلائی گئی۔

صبح اُٹھنے کے بعد ہم نے اپنے کو چاروں طرف سے گھرا ہوا پایا۔ دارجیلنگ کے پہاڑی قلیوں نے اپنی مذہبی رسموں کے بموجب بڑی بڑی چادریں بچھا کر اُن پر عبادت..... شروع کی اور پہاڑوں کے دیوتا کی خدمت میں آٹے وغیرہ کی بھینٹ چڑھائی۔

۲۹ مئی کو پہلی پارٹی بنیادی خیمے کے لئے روانہ ہوئی۔ برف اس وقت تازہ گری تھی۔ جمعدار سے لے کر باورچی خانہ کے قلیوں کو اُس دن باربرداری کرنا پڑ رہی تھی۔ صاحب لوگ آگے آگے راستہ بتاتے جاتے تھے اور ان کے پیچھے قلیوں کی لمبی قطار تھی۔ برفستانی پہاڑوں پر چڑھائی آسان کام نہیں ہے۔ صرف ننگا پربت فتح کرنے کا جذبہ تھا جو ہم لوگوں کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ ورنہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر برف کاٹ کر راستہ بنانا بہت مشکل کام تھا۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ہم لوگوں نے کسی نہ کسی طرح راستہ بنا ہی لیا اور ناپتے کانپتے اُس جگہ پر پہنچ گئے جہاں آج سے دو سال پہلے فرطِ مسرت سے بیتاب ہو کر مثل بچوں کے ہم لوگ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے۔ اپنے پُرانے نشانات میں سے اُس وقت سوائے برف کے تودوں کے ہم لوگوں کو کچھ نہ ملا۔ بہت ہی دشواری کے بعد مسٹر مرکل کو برف میں دبے ہوئے دو ڈنڈے ملے کچھ کھدائی کرنے پر پتہ چلا کہ یہ ہمارے باورچیخانے کے خیمے کے بانس تھے۔

یہاں پہنچکر ہمارے ایک ساتھی نے ایک بھیڑیئے کا شکار کیا۔ شام کو جب ہم لوگ راستہ تلاش کر کے واپس ہوئے تو انہوں نے ہم کو دو چھوٹے بچے بھیڑیے دکھائے۔ ایک کا نام ہم نے 'ننگا' رکھا اور دوسرے کا 'پربت'۔ بہت ہی جلد وہ بچے ہم سے مانوس ہو گئے۔ ابتداء میں انہوں نے اپنی وحشیانہ عادات کا اظہار کیا۔ لیکن انسانوں میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ اپنی وحشت کو بھول گئے۔ ہم لوگوں کو بھی ان سے کافی دلچسپی ہو گئی۔ اور جب ننگا پربت کی چڑھائی کا ذکر کر کے ہم لوگ تھک کر لیٹتے تو ہماری گفتگو کا موضوع ننگا۔ اور پربت کی تربیت ہوتا۔ (باقی آئندہ)
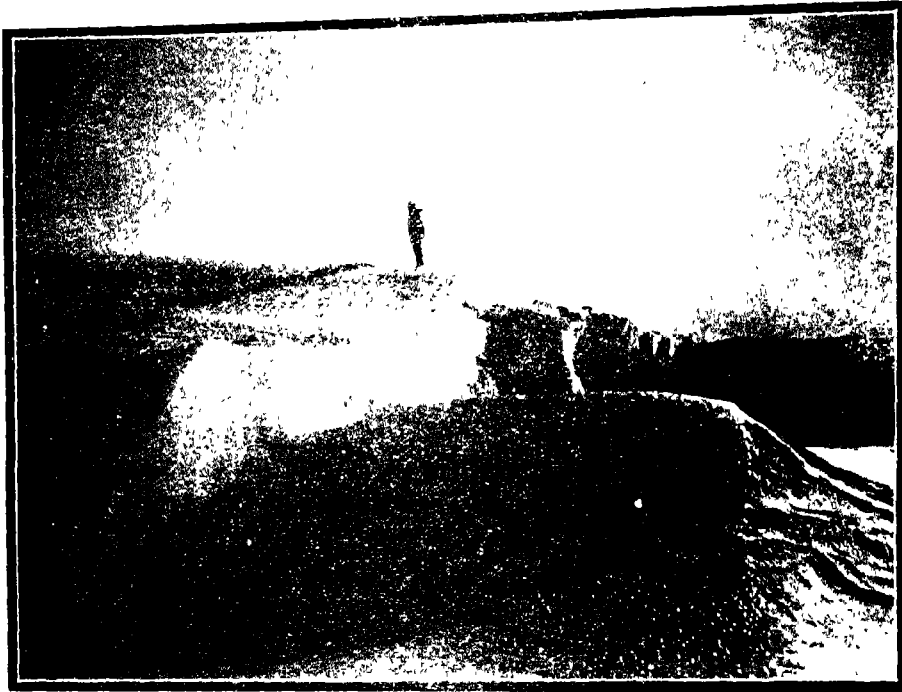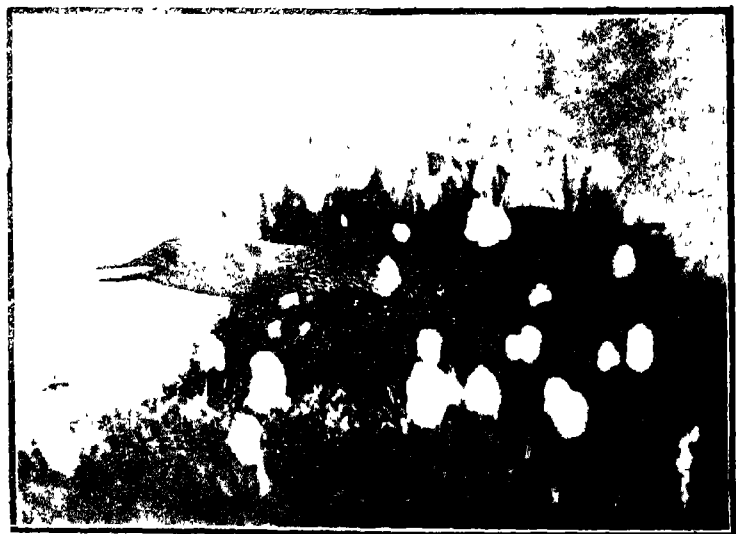
کیڑے جمع کرنا

از محمد طیب صاحب بی اے جامعہ

چیزیں جمع کرنے کے سلسلے میں کیڑے مکوڑے اور عجیب وغریب جانور جمع کرنے کا شوق بھی بہت اہم اور دلچسپ مشغلہ ہے۔ عجائب خانوں میں تم نے بے شمار عجیب وغریب جانور دیکھے ہوں گے بہت سے ننھے ننھے سانپ اور کیڑے مکوڑے بھی شیشوں میں بند! یہ سب چیزیں ایسے ہی شوقین لوگوں نے جمع کی ہیں۔ نیچے ہم ایک ایسے شخص کے واقعات خود اس کی زبانی لکھ رہے ہیں جس نے دُور دُور ملکوں کا سفر کر کے بہت سی عجیب وغریب چیزیں جمع کیں۔ امید ہے کہ اس مضمون کو تم بہت توجہ اور دلچسپی سے پڑھو گے (ایڈیٹر)

دنیا میں طرح طرح کے شوق ہیں، اچھے بھی بُرے بھی بُرے شوقوں سے تو خدا ہمیں تمھیں سب کو بچائے رکھے اچھے شوق بھی کچھ تو ایسے ہیں جن میں بس دلچسپی ہی دلچسپی ہے اور فرصت کا وقت اچھی طرح کٹ جاتا ہے۔ مگر بعض ایسے بھی ہیں جن میں دلچسپی کے ساتھ اپنا اور دوسروں کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ ایسے شوق بہت سے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جنگلوں ساحلوں اور میدانوں سے اپنے عجائب خانے کے لئے تتلیاں، چڑیوں کے انڈے کیڑے مکوڑے اور چھوٹے چھوٹے سمور دار جانور (گلہری وغیرہ) جمع کرو۔ یہ شوق بڑھ گیا تو کیا عجب جو تم اس قسم کی عجیب وغریب چیزیں جمع کرنے کی خاطر گھر سے بہت دور نکل جاؤ اپنے ملک کے باہر! اور ہر طرح کی نئی نئی معلومات حاصل کرو۔

کھیتوں اور باغوں کے جانور تو ہم رات دن دیکھتے ہی ہیں ان کے بارے میں ہم سے پہلے لوگوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور جگہ جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ جی تو یہ چاہتا ہے کہ کہیں باہر کا سفر کریں بڑے بڑے ہیبت ناک جانوروں سے مقابلہ ہو۔ پہاڑی ریچھ ملیں اور تیس تیس فٹ لمبے اژدھے ایسے ایسے جنگلوں سے گذریں جہاں ہم سے پہلے کسی کے

قدم نہ گئے ہوں۔

چھٹی کے دن شکار کے شوقین لڑکے بندوق لے کر نکل جاتے ہیں اور بے تحاشا جانوروں کو گولی کا نشانہ بناتے ہیں انھیں یہ خیال نہیں آتا کہ ان میں کوئی خاص اور دلچسپی کی بات تو نہیں۔ مگر جنہیں اچھے اچھے اور نئی نئی قسم کے جانور جمع کرنے کا شوق ہے۔ وہ چھُریاں، ملمنچے، اور بندوقیں لیکر گھنے جنگلوں اور باغوں میں نکل جاتے ہیں۔ اور اب تو بندوق وغیرہ بھی بہت کم موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے اس لئے کہ اس سے چھوٹے جانور تو بالکل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے عجائب خانوں میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں جو جالیوں اور چند شیشے کی نلکیوں سے پکڑی گئی ہیں۔ بندوق تو بڑے جانوروں کے شکار کے لئے مناسب ہے۔ چھوٹی چیزوں کے لئے جالی اور نلکیوں سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ آج کل ان کا رواج روز بروز بڑھ رہا ہے اور ننھے مُنھے نئے نئے جانور برابر پکڑے جا رہے ہیں۔

ایشیا کے بعض شمالی جنگلوں، جنوبی امریکہ، افریقہ اور شمالی مغربی آسٹریلیا کے بڑے بڑے سانپ تو مشہور ہی ہیں لیکن چھوٹی قسم کے سانپ بھی ملتے جا رہے ہیں۔ ان چھوٹے سانپوں اور چھپکلیوں کے لئے بندوق کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے پاس ایک لمبی چھڑ ہو جس کے سرے پر جالی لگی رہتی ہے تو اس سے چھوٹی مچھلیاں اور کیڑے مکوڑے سب کچھ پکڑ سکتے ہو۔

جنگل اور باغوں میں پروانوں اور پتنگوں کے ساتھ ساتھ مکھیاں۔ شہد کی مکھیاں۔ بھڑیں، تتیئے، بچھو (یہ بہت ضروری ہیں) ڈنک والی مکھیاں۔ کھٹمل اور مکڑیاں اور اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے جانور پکڑو۔ کسی پھول والی جھاڑی میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے جانوروں کا جھُنڈ کا جھُنڈ ملے گا۔ ایسی جگہوں پر تھوڑی دیر میں تمہیں اتنے جانور مل جائیں گے کہ اور کہیں شاید صبح سے شام تک نہ مل سکیں۔

ایک دیوار، ٹیلے یا درخت کا تنہ جس پر ہلکی ہلکی دھوپ بھی آتی ہو۔ اور پاس ہی کوئی نالہ، جنگل یا پہاڑ کا کنارہ ہو تو پھر وہاں کیڑے مکوڑوں کی افراط ہوگی بس دھوپ کی طرح پھیلے پڑے ہونگے۔ ایسی جگہوں پر اس کا خیال رکھنا کہ تمہارا سایہ تم سے پہلے ان پر نہ جا پہنچے ورنہ یہ ننھے ننھے جانور اس طرح اُڑ جائیں گے کہ تمہیں پتہ بھی نہ چلیگا۔

کبھی کبھی ایسی ایسی جگہ جانور مل جاتے ہیں جہاں اُن کے وجود کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ گھنے جنگلوں میں جہاں دھوپ کا گذر نہیں، بے شمار جانور کسی ایسے درخت پر جمع ہو جاتے ہیں جس پر ذرا ذرا سی دھوپ آتی ہو۔ جن پہاڑیوں پر دھوپ پھیلی ہو۔ وہاں تمہارے لئے شکار کی بہتات ہوگی۔ ایسی جگہوں پر یہ بھی ضروری نہیں کہ تم جالی کے شکار میں مہارت رکھتے ہو۔ بس ذرا پھُرتی کی ضرورت ہے۔ ہاتھ سے بھی بیسیوں پکڑ سکتے ہو۔ کبھی کبھی ایک سادہ شیشے کی نلکی جس پر ڈاٹ لگی ہو جالی سے بھی زیادہ کارآمد ثابت ہوتی ہے۔

بعض لوگ کائی اور درخت کی چھال میں کیڑے تلاش کرتے ہیں، مگر اس کا دار مدار زیادہ تر وہاں کی خشکی پر ہے اس کے بھی کہ کن کیڑوں کی تلاش ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی جگہوں پر زیادہ کامیابی نہیں ہوتی البتہ کسی شہتیر یا درخت کے تنے کے نیچے جو زمین پر پڑا ہو۔ کیڑوں کے شہر کے شہر آباد ملیں گے خشک موسم میں پتھروں کے نیچے بہت سے کیڑے مل سکتے ہیں

چینی تعجب سے دیکھ رہے ہیں اور مذاق اُڑا رہے ہیں

چندسال ہوئے جاڑوں کے موسم میں میں چین میں کچھ جانور جمع کرنے گیا تھا وہاں کی زمین بالکل خشک تھی اس لئے زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن پہاڑوں کے دامن میں پتھروں کے نیچے اور ان نالوں کے پاس جو اب خشک ہو گئے تھے، زمین میں کافی تری تھی اور مجھے طرح طرح کے کیڑے ملے۔ ایسے موقع پر دیہاتی بلکہ شہری بھی تمہیں تعجب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ تمہارے پاس بندوق ہو تب تو خیر سمجھیں گے کہ شکار کو جا رہے ہو لیکن اگر تم قدم قدم پر جُھک رہے ہو۔ لکڑی سے زمین کُرید رہے ہو، یا پتھر کے نیچے سے کیڑے نکال کر شیشی میں بند کر رہے ہو تو کوئی عجب نہیں کہ وہ تمہیں خبطی اور پاگل سمجھیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انہیں بڑی جستجو ہو جائے گی کہ آخر یہ بات کیا ہے حقیقت معلوم کرنے کو تمہارے پیچھے لگ جائیں گے۔ یہ بات تو اُن کی سمجھ میں کیا خاک آئے گی کہ تم یہ چیزیں عجائب خانے کے لئے جمع کر رہے ہو یا اپنی دلچسپی اور شوق کے لئے۔ وہ تمہیں ڈاکٹر سمجھیں گے اور یہ خیال کرینگے کہ یہ سانپ بچھو، کیڑے مکوڑے تم دواؤں کے لئے جمع کر رہے ہو۔ تم انہیں سمجھانا بھی چاہو تو انہیں یقین نہیں آئیگا۔ اور سمجھیں گے کہ تم ان کے ساتھ مذاق کر رہے ہو۔ اور ٹالنا چاہتے ہو کہ کہیں دواؤں کی ترکیبوں سے واقف نہ ہو جائیں کبھی کبھی کوئی چینی زمین سے کیڑا اٹھا کر کُترنے بھی لگے گا۔ اور تم ہائیں ہائیں کرتے رہجاؤ گے۔

اگر کہیں کئی ایک چینی مل جاتے تو خوب مذاق اُڑاتے اور اپنی زبان میں مجھ پر فقرے کستے۔ لیکن اکیلے دُکیلے چینی سے مجھے بڑی مدد ملتی چینی بچے بھی ہر موقع پر کام آتے تھے۔

بڑی مکڑی جس کا جسم مونگ پھلی یا گولف کی چھوٹی سی گیند کی برابر ہو۔ کچھ عجیب ڈراونی سی ہوتی ہے۔ مجھے اس سے بہت ڈر لگتا ہے۔ بھاگتی بھی بہت تیز ہے۔ سب سے بڑی

مکڑی میں نے جزائر فلپائن کے ایک ہوٹل میں دیوار پر سے پکڑی۔ میں نے پانی پینے کا گلاس چپکے سے اس پر رکھ دیا۔ پھر ایک کاغذ گلاس پر ڈھانک کر اسے دیوار سے الگ کیا اور اسے کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کر دیا۔

ایک روز میں شام کے وقت فلپائن کے جنگل میں کیڑے جمع کر رہا تھا جگہ بڑی بھیانک تھی۔ ہوا نام کو نہ تھی۔ سخت گرمی تھی اور سناٹا! آسمان پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ یکایک میری نظر سامنے کی جھاڑیوں پر پڑی کئی ایک کے درمیان بہت بڑا جالا سا تنا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر زرد رنگ کا سفوف کسی نے چھڑک دیا ہو۔ اس جالے میں چھوٹی بڑی ہزاروں مکڑیاں تھیں اور مجھ سے صرف دو گز کے فاصلے پر! اس روز واقعی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ چند قدم آگے چل کر مجھے اس طرح کے بہت سے جالے ملے۔ دوسرے روز دن کے وقت میں اسی جگہ پھر آیا ان کا پکڑنا بھی آسان نہ تھا ان کے قریب جاؤ تو یہ جالے سے گھاس میں بڑی تیزی سے کود کر چاروں طرف جمع ہو جاتی تھیں اور اس سے بہت ڈر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے انہیں ایسے پکڑا کہ جہاں دو چار بیٹھی ہوئی ملیں۔ میں نے چھپا کے ہاتھ گھما کر اسی بھڑ والے جال میں لے لیا اور دس بارہ گز پیچھے بھاگا۔ جلدی سے انہیں ٹین کے بکس میں بند کر کلوروفارم سنگھا دیا کلوروفارم سنگھانا بھی ایک مصیبت کا کام تھا۔

بھڑوں کا پکڑنا بھی بہت مشکل ہے۔ یہ اکثر تتلیوں کے ساتھ کسی پھول کے پودے کے پاس ملتی ہیں۔ شہد کی خاطر نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے کیڑے پکڑنے کے لئے بھڑیں غصے کی حالت میں بہت خطرناک ہوتی ہیں شنوان (چین) میں تین چینوں پر بُری بیتی۔ میں کچھ بھڑیں پکڑ چکا تھا، پاس ہی ایک درخت پر سفید سی کوئی چیز لٹک رہی تھی۔ میں یوں ہی تفریحاً اس پر ڈھیلے پھینکنے لگا۔ وہ بھڑوں کا چھتہ تھا۔ اچانک اس میں سے بھڑوں کی فوج کی فوج نکل پڑی۔ ایک سیکنڈ تک تو وہ وہیں چھتے کے چاروں طرف گھومتی رہی۔ مگر جونہی ہمیں دیکھا بڑی تیزی سے ہماری طرف آئی۔ ہم لوگ اپنی جان لے کر بُری طرح بھاگے اور ڈھلان پر بڑی تیزی سے بھاگے ہوئے چلے گئے۔ ایک موڑ پر ہم چینی قلیوں سے ٹکرا گئے۔ یہ قلی دھیرے دھیرے اسی طرف جا رہے تھے ہم تو رُکے نہیں اور نہ بدحواسی میں انہیں منع کر سکے یہ تینوں اسی طرف چلتے ہی رہے نہ معلوم بیچاروں پر کیا

مکڑی چوہے کے پیچھے

آفت آئی ہو گی۔

گرم ملکوں کی تتلیاں غالباً بہت پیاسی رہتی ہیں یہ جنگلوں میں اکثر چشموں اور دریاؤں کے قریب کثرت سے ملتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آہستہ سے وہ کسی پانی کے پودے کے قریب پانی پینے اُتر آتی ہیں۔ اُن پہاڑیوں پر جہاں دھوپ تیز ہوتی ہے اگر کوئی چشمہ آبشار کی طرح بہتا ہے تو وہ اُن پتھروں پر بیٹھ کر جو پانی کے چھینٹوں سے بھیگے رہتے ہیں، اپنی پیاس بُجھالیتی ہیں ایسی جگھوں پر یہ آسانی سے پکڑی جاتی ہیں۔ بعض تالابوں میں جہاں مگر مچھ بھی ہوں بڑی ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ ذرا پیر پھسلا اور مگر مچھ کے مُنہ میں!

بعض تتلیاں بہت اونچی ہوا میں اڑتی ہیں انہیں بڑی ترکیبوں سے نیچے لانا پڑتا ہے۔ گریٹ ہانگ کانگ آریخ ٹپ بڑی خوبصورت تتلی ہے۔ یہ بھی بہت اونچی اُڑتی ہے۔ اِسے پکڑنے کے لئے میں نے یہ ترکیب کی کہ ایک کاغذ کی تتلی بنائی اُس کے پر تقریباً اسی طرح کے رنگ دئے اور اُسے ایک درخت کی نچلی شاخ پر باندھ دیا پھر جب اُسی قسم کی کوئی تتلی گذری تو میں نے اپنی تتلی کے تاگے سے اِس طرح ہلا دئے کہ اصلی تتلی اس کے پاس اُتر آئی اور میں نے فوراً جال سے پکڑ لیا۔

ایک دن میں نے ایسی جگہ سے بہت سی چیزیں پکڑیں جو بہت عجیب و غریب تھی۔ ہانگ کانگ کے قریب ساحل پر ایک طرف گھنا جنگل تھا اور ساحل کے قریب آکر بہت کم گنجان رہ گیا تھا۔ سمندر کا پانی اُتر رہا تھا اور بڑی خوبصورت تتلیاں پانی پینے کنارے کے پتھروں پر بیٹھی تھیں۔ کچھ اونچائی پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں اور بانس کے درخت تھے جہاں بہت سے کیڑے مکوڑے زمین پر رینگ رہے تھے اور اُڑ رہے تھے۔ یہاں میں نے بہت سے نئے نئے کیڑے جمع کئے۔

وہ پیر پھسلا!

گھر آیا تو ایک نقشہ دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس جگہ خاص طور سے
طاعون کے مریض دفن کئے جاتے تھے۔ ایسے موقع پر تم
کیا کرتے!

کبھی کبھی خلاف امید جگہوں پر مجھے اچھی اچھی چیزیں
ملی ہیں چین کے بے انتہا خشک پہاڑوں میں ایک چشمے پر
مجھے پانی کے کئی کیڑے ملے، اسی طرح ایک چھوٹے سے
تالاب میں جو پانی سے میلوں دور نہایت خشک جگہ
پر تھا بہت سے کیڑوں کا پتہ چلا۔ مشرقی بالٹک کے علاقے
میں عجیب متضاد چیزیں ملتی ہیں۔ خلیج فن لینڈ یعنی استھونیا کے
علاقے میں جتنے گھونگے، کنکولے اور سیپیاں پائی جاتی ہیں وہ بہت
موٹی اور سخت ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں کی زمین میں چونا
بہت ہے لیکن چالیس میل کے فاصلے پر شمال میں فن لینڈ
کی طرف یہی چیزیں بہت
نازک اور پتلی ہوتی ہیں۔

بات یہ ہے کہ ادھر کی زمین
پتھریلی ہے اور چونا کم ہے۔ یہیں مجھے اسقدر چھوٹے
گھونگے ملے جو دس بارہ مل کر ایک مٹر کی
برابر ہوتے ہیں۔ دھوپ میں اپنے سایہ
کی وجہ سے وہ نظر بھی آگئے۔ کم روشنی
میں یا شام کے وقت ان کا ملنا
محال تھا لیکن اگر تمہیں میمتھ (پرانے ہاتھی)
کی ہڈیوں کی تلاش ہو تو یہ دقت نہ ہوگی۔
ایک بار ڈاکٹر ہرز ناکولیما کے علاقے سے
ایک میمتھ لائے تھے۔ کیسے لائے تھے؟
یہ بھی سنو! اس جگہ سے ریل کا اسٹیشن کوئی
چار ہزار میل دور تھا اتنے بڑے
جانور کا ایسی جگہ سے لانا
جہاں ریل تو ریل سڑک
کا بھی ہزاروں میل پتہ نہ ہو
ناممکن تھا۔ اس لئے کیا یہ کہ اس کے ٹکڑے کر کے کئی
سلیجوں (کتّے کی گاڑیوں) پر لادا اور ان سلیجوں میں کئی
کئی کتے جوڑ کر یہ دور دراز فاصلہ طے کیا۔ جب میں خود
شمالی سائبیریا میں میمتھ کے دانتوں کی تلاش میں گیا تھا تو
میں ان کے وزن سے عاجز آگیا۔ ایک دانت کا وزن
دو آدمیوں کے وزن کے برابر تھا اور لمبائی بارہ بارہ فٹ
مجھے ایک پرانی قسم کے گینڈے کے سر کے اوپر کا حصہ
بھی ملا تھا اور ایک میمتھ کا نیچے کا جبڑا۔ وہ شیشے کی نلکیاں
اور جال جن کے رکھنے کی میں نے تمہیں ہدایت کی تھی، یہاں
کچھ بیکار ہی ثابت ہوئے۔

وہاں کے لوگوں کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ
میمتھ پرانے قسم کا ایک بہت بڑا ہاتھی ہے۔ وہ سمجھتے

کولیما کے باشندے میمتھ کو پرند سمجھتے تھے

لیکن اصل میں یہ ہاتھی کی ایک قسم ہے

تھے کہ یہ ایک بہت بڑا پرند ہوگا۔ یعنی اس قسم کا جس کا ذکر الف لیلہ میں ہے۔ ان کے دانتوں کو وہ اس پرند کے مڑے ہوئے پنجے سمجھتے تھے جن سے وہ بڑے جانوروں کو اٹھا لے جاتا تھا۔ ایک نیا خیال یہ ہے کہ وہ چھچھوندر کی قسم کا زمین کا بہت بڑا جانور تھا اور اس کا گلہ کا گلہ زمین کے اندر ہی اندر زمین کھودتا تھا۔ زلزلے اسی کی وجہ سے آتے تھے۔ جیسے ہی وہ زمین پر آتا تھا اور اس پر دھوپ پڑتی تھی تو مر جاتا تھا میمتھ اکثر زمین میں آدھے دبے ہوتے ہیں اور اس وقت نظر آتے ہیں جب مٹی میں برف پگھلنے سے سیلاب آتا ہے اور دریا کے کنارے کٹ جاتے ہیں۔

ایک بار جاپانی منچوریا کے علاقے میں عجیب دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں ساحل پر گھونگے جمع کر رہا تھا میرا کتا جیک بھی ساتھ تھا۔ جب میں جھک کر کچھ اٹھاتا یا پتھر اٹھا کر کیڑے مکوڑے تلاش کرتا تو میرے بعد جیک بھی خوب زمین کھود کر گویا تحقیقات کرتا کہ میں نے کوئی ہڈی وغیرہ تو نہیں گاڑ دی۔ وہاں کے ماہی گیر اور ان کے بچے اپنے جھونپڑوں کے دروازے پر کھڑے ہوئے ہم کو دیکھا کرتے اور جب ہم آگے بڑھ جاتے تو وہ اپنی کدالیں لے کر آتے اور جہاں میں جھکا تھا وہاں خوب کھود کر دیکھتے۔ معلوم نہیں ان کا کیا خیال تھا۔ میں نے خزانہ دفن کیا ہے یا کسی کو مار کر دبا دیا ہے۔

تمہیں کسی جگہ سانپ پکڑنے کا خیال ہو تو اُس جگہ کے لوگوں سے معلومات حاصل کرتے وقت یہ تو کرو کہ لوگوں کی باتیں خوب غور اور توجہ سے سُنو مگر اُن پر یقین نہ کرو جب تک تمہیں خود تجربہ نہ ہوجائے اس لئے کہ ان میں مبالغہ بہت ہوتا ہے۔ ایک بار سائبیریا میں بہت

قابل اعتبار لوگوں سے ملا انھوں نے مجھے بتایا کہ یہاں کے سانپ بہت زہریلے ہوتے ہیں میں نے دریافت کیا اُنہوں نے کسی آدمی یا گائے یا گھوڑے کو کاٹا ہے۔ جواب ملا نہیں میں نے پوچھا پھر کیسے معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح کہ وہ آدمی یا جانور کو دیکھ کر اپنی دُم پر کھڑے ہوجاتے ہیں اور خوب پھنکارتے ہیں

چڑیا

جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی

چوں چوں کرتی آئی چڑیا — چونچ میں تنکا لائی چڑیا
پیچھے پیچھے چڑا بھی آیا — وہ بھی نیم کا تنکا لایا
چونچ سے اپنا اپنا تنکا — دونوں نے اک طاق میں رکھا
اب دونوں کا کام یہی ہے — صبح یہی ہے شام یہی ہے
اُڑ کر جانا تنکا لانا — گھونسلے میں اُس کو رکھ جاتا
کھانا پینا شوق میں چھوٹا — گھر بن جائے چھوٹا موٹا
دیکھتے تھے ہر روز یہ ہم سب — گھر بن کر طیار ہوا جب
چڑیا انڈے دینے بیٹھی — انڈے دے کر سینے بیٹھی
چیں چیں چیں چیں، چیں چیں، چیں چیں کرتے — ننھے ننھے بچے نکلے
کوّا اِن کو کھانے آیا — چڑیا نے غل شور مچایا
آیا لے کر دوڑیں پڑا — ڈر کے مارے بھاگا کوّا
بچوں نے پھر اُڑنا سیکھا — چاروں طرف کو مُڑنا سیکھا
پھر پھر پھر پھر اُڑتے ہیں وہ — ڈال پہ دور سے گرتے ہیں وہ

بلّی

بلی کیسا پیارا مسکین جانور ہے۔ اس کی موہنی صورت رسیلی آنکھوں میں عجیب کشش ہے۔ اس کو دیکھ کر بے اختیار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ بہت سی پیاری بچیوں کے ہاں بلّی بلی ہوگی اور وہ اُسے بہت چاہتی ہوں گی لیکن وہ کبھی کبھی کھسوٹ بھی لیتی ہوگی اور بعض ایسی حرکتیں کرتی ہوگی جو ناگوار معلوم ہوتی ہوں گی اور دل یہی چاہتا ہوگا کہ اُٹھا کر جنگل میں پھینک آئیں۔ ہم تمھیں ایک ایسی بلّی بنانے کی ترکیب بتاتے ہیں جو نہ نوچے گی نہ کھسوٹے گی۔ اگر تم اس کو ہدایات پر عمل کرکے محنت اور صفائی سے بناؤ گی تو اس میں ایسی ہی کشش ہوگی جیسی سچ مچ کی بلی میں جب دل چاہا کھیلے۔ نہیں تو اس کو کارنس پر یا میز پر کہیں رکھ دیا۔ کمرے کی آرائش ہوگی۔ کام لینا چاہو تو پن کشن بنالو۔ گرنے سے اس کی ٹانگ نہیں ٹوٹے گی۔ مارنے سے زخمی نہ ہوگی۔ البتہ دھواں دھوں لاٹھیوں سے نہ پیٹنا۔ کیوں کہ بے چاری بے قصور ہے۔ اس نے تمھارا دودھ بھی تو چرا کر نہیں پیا ہے۔

ضروری سامان

کھدر کریپ یا لٹھا پانچ گرہ۔ روئی دھنکی ہوئی آدھ پاؤ۔ ربن نصف انچ چوڑا آدھ گز۔ گھنگرو ایک عدد سوئی اور دھاگے۔

خاکے کو کپڑے پر ٹریس کرو۔ آنکھیں، منہ، کان، ناخن وغیرہ رنگین دھاگے سے کاڑھ لو۔ پھر آدھے انچ سلائی کا حق رکھ کر کاٹ لو اب نمونے کے تین ٹکڑے ہوں گے۔ سامنے کا اور پچھلا حصہ برابر رکھ کر (الٹی طرف) ہوشیاری سے کچا کر دو۔ پھر مضبوط دھاگے سے بخیہ کر لو۔ اگر سلائی موٹی ہوگی تو روئی بھرنے پر چر جائے گی اور بدنما معلوم ہوگی۔ اب نچلا حصہ جوڑ لو۔ دو ڈھائی انچ بھرائی کے لئے چھوڑ دو۔ گولائی پر جہاں × ایسے نشان ہیں ذرا ذرا سا ترچھا کاٹ دو۔ تاکہ الٹنے پر گوشے صاف آئیں۔ سیدھا کرنے کے بعد خوب صفائی سے ٹھونک ٹھونک کر روئی بھر دو۔ ایک گتے کا ٹکڑا نچلے حصے کے برابر کاٹ کر تلی میں رکھ کر شگاف کر دو۔ ربن میں گھنگرو ڈال کر گردن میں خوب صورت بو سے باندھ دو۔ لو بی بی! بلّی طیار ہے۔

(از امۃ الزہرا بیگم)

بلّی
(از امتہ الزہرا بیگم)
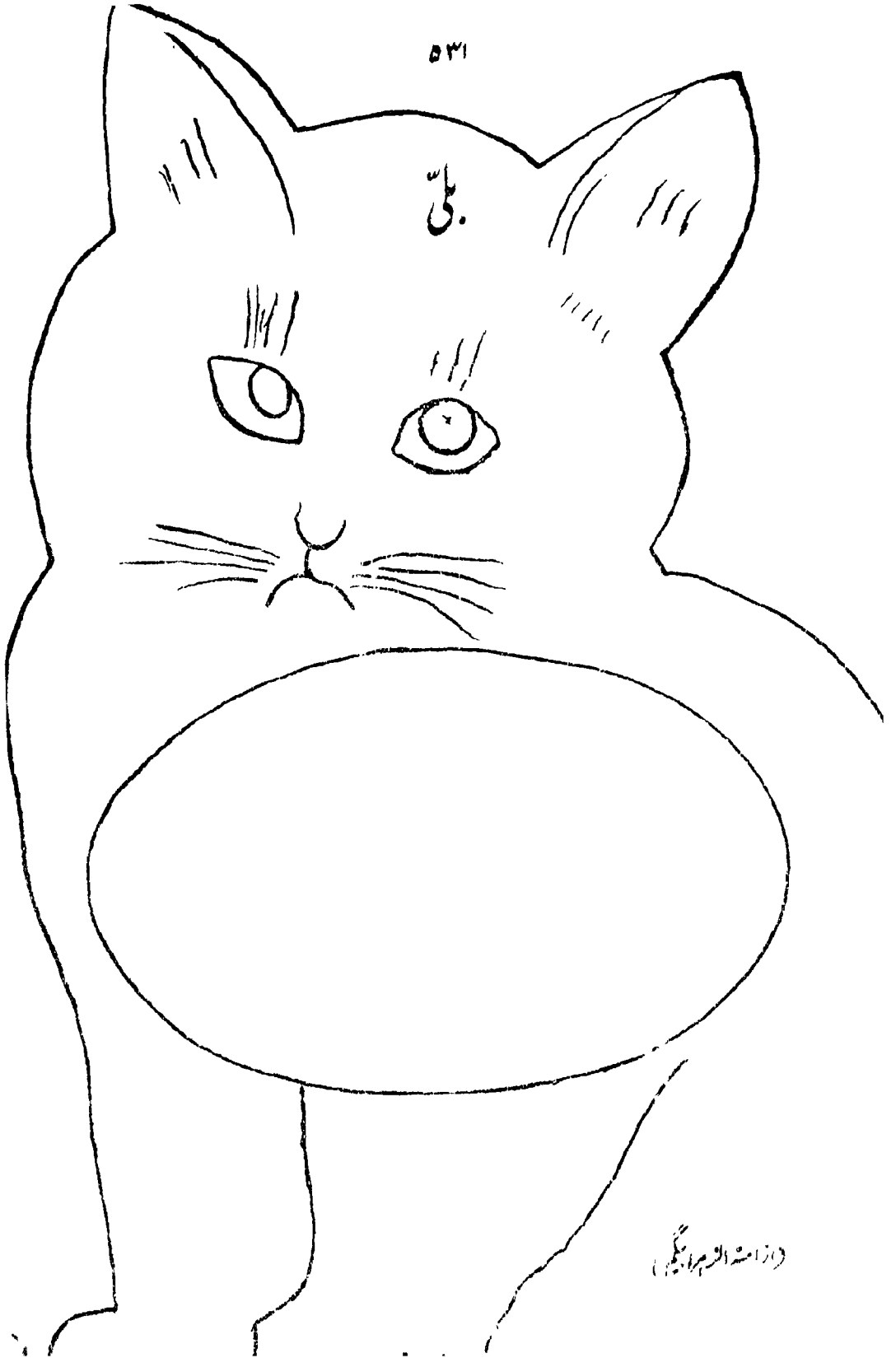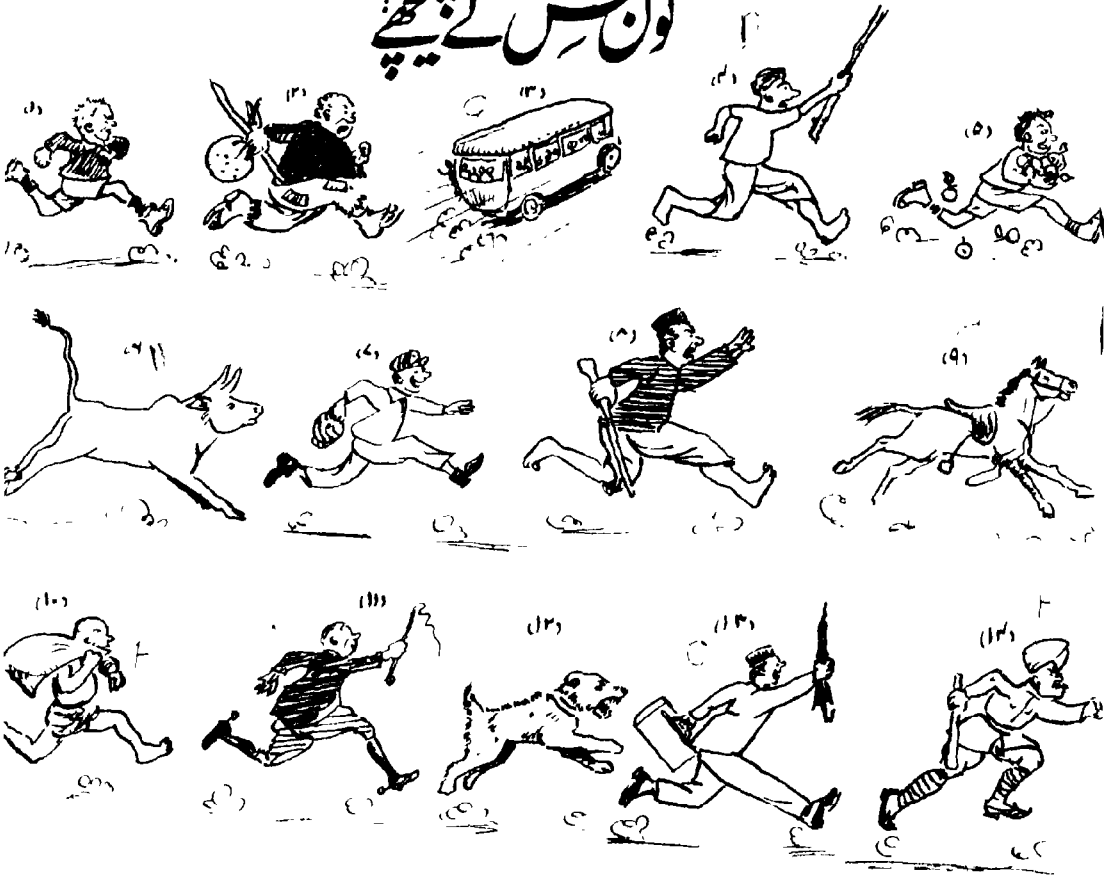
کون کس کے پیچھے؟

اس تصویر میں مختلف آدمی اور جانور بے تحاشا بھاگ رہے ہیں مگر کون کس کے پیچھے؟ اس کا تو پتہ لگانا ہے۔ یہ کام تم ہی کو کرنا ہے ان تصویروں کا پہلے کاغذ پر عکس اتار لو پھر تصویروں کو الگ الگ کاٹ لو۔ اور تمھارے خیال میں جو جس کے پیچھے بھاگ رہا ہو اسے آگے پیچھے کر کے ایک کاغذ پر چپکا دو۔ پہلا انعام اُسے ملے گا جس نے سب تصویریں ٹھیک لگائی ہوں۔ دوسرا انعام سب سے کم غلطی کرنے والے کو ملے گا۔

اس حل کے ساتھ یہ کوپن بھی بھر دینا۔ اگر یہ کاغذ نہ پھاڑنا چاہو تو کوپن کی نقل کر دینا۔

کوپن

نام .... عمر .... درجہ .... تصدیق ....

پورا پتہ ....

اپنی بچیوں سے کچھ کام کی باتیں

محترمہ شمسی عباد الرحمٰن صاحبہ

عرصے سے پیام بچیوں کو شکایت تھی کہ پیام تعلیم میں اُن کے کام کی باتیں کم ہوتی ہیں لہذا یہ چھوٹا سا مضمون اُن ہی کے لئے ہے اور امید ہے کہ وہ اسے پڑھ کر بہت سی مفید باتیں معلوم کر سکیں گی۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب سے ہمارے ملک کی لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے لگی ہیں انھیں گھر کے کام کاج کرنے یا سیکھنے کا کچھ تو وقت ہی کم ملتا ہے اور کچھ وہ خود بھی ایسے کاموں کو ہاتھ لگانا پسند نہیں کرتیں۔ شاید وہ خیال کرتی ہیں کہ گھر کے کام دھندے کرنا آج کل کی پڑھنے لکھنے والی لڑکیوں کے لئے موزوں نہیں۔ یہ تو پرانے زمانے کی جاہل اور غیر مہذب عورتوں کا کام تھا لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو گھر کا کام عورت کے لئے ہر وقت اور ہر حالت میں ضروری ہے۔

لڑکی پڑھ لکھ کر چاہے سیّاح بنے یا ہوا باز، قوم کی خادم بنے یا اخباروں کی مضمون نگار لیکن گھر اور گھر کے کاموں سے اس کا کچھ ایسا تعلق ہے کہ اُن کی دیکھ بھال اسے ضرور ہی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر لڑکی ان کاموں میں سُگھڑ اور ہُنر مند ہے تو وہ بہت تھوڑے وقت اور کم روپے میں بھی اپنے گھر اور گرہستی کا سارا انتظام ایسی خوب صورتی سے کر سکتی ہے کہ اس کے سلیقے سے دیکھنے والوں کا جی خوش ہو۔ اور اس کی اور اس کے گھر والوں کی زندگی آرام و آسائش سے گذرے۔ اگر کوئی پھوہڑ یا گھر داری سے

سے لاپرواہے تو یہ بات خود اس کے لئے بہت
نقصان پہنچانے والی ثابت ہوتی ہے جس کا
تجربہ اُسے رفتہ رفتہ ہوتا ہے۔ اس لئے جس
طرح لکھنا پڑھنا بچپن سے سیکھنا ضروری ہے
اسی طرح گھربار کا انتظام، سینا پرونا، کھانا پکانا
بھی چھوٹی عمر ہی سے سیکھنے پڑتا ہے۔ لیکن اس
کام کے لئے بہت زیادہ محنت یا تکلیف اٹھانے
کی ضرورت نہیں۔ تھوڑی سی توجہ سے بہت کچھ
سیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً پڑھنے لکھنے یا اور کاموں
سے جو وقت بچے تو گھر کے کاموں میں بڑوں
کا ہاتھ بٹایا کرو۔ جب کوئی کام سمجھ میں نہ آئے
تو امی جان یا باجی سے پوچھ کر اُسے بہتر طریقے
پر کرنے کی کوشش کرو۔ یہ نہیں کہ اکتا کر چھوڑ دو
مکان کی صفائی اور چیزوں کو قرینے سے
رکھنے میں مدد دینا۔ اپنی کتابوں کو صفائی اور
ترتیب سے رکھنا۔ اپنے کمرے کو سجانا۔ گل دانوں
میں خوب صورتی سے پھول لگا کر رکھنا۔ کبھی اپنی
سہیلیوں کو چائے یا کھانے پر بلایا۔ تو دو ایک
مٹھائیاں یا پکوان اپنے ہاتھوں سے بنا لینا
اپنے گرم اور ٹھنڈے کپڑوں کی دیکھ بھال،
چھوٹے بہن بھائیوں کے لئے ننھے ننھے موزے
بنیان وغیرہ بننا۔ گھر کے حساب کتاب میں
امی جان کو مدد دینا۔ یہ سب ایسے چھوٹے چھوٹے
کام ہیں جنھیں کرنے میں خاص دلچسپی بھی رہتی
ہے۔ اور باتوں باتوں میں بہت کچھ سیکھ لیا
جاتا ہے۔ پھر بڑے ہونے پر اس کا فائدہ معلوم
ہوتا ہے۔ اپنے گھر کے کام کاج اپنے ہاتھوں
کرنا کوئی بری بات نہیں۔ آرام اور فائدے کے
علاوہ سمجھدار لوگوں کی نظر میں عزت اور زیادہ
ہوتی ہے۔ کتنی خوبی کی بات ہے کہ نوکر چاکر ہوتے
ہوئے بھی اپنے ہاتھوں کام کرنا آتا ہو۔ نہ کہ
ذرا ذرا سے کام کے لئے خدمت گاروں کا محتاج
رہنا بہت برا ہے ایک تو اس طرح آرام طلبی
کی عادت پڑ جاتی ہے دوسرے گھر کے سینکڑوں
ایسے چھوٹے چھوٹے کام ہیں جنھیں ایک سلیقہ مند
عورت اچھی طرح کر سکتی ہے نوکر خواہ کتنا ہی
ہوشیار کیوں نہ ہو نہیں کر سکتا۔
گھر بار کے کام میں کفایت شعاری

بھی ضروری چیز ہے۔ اور کفایت سے
کام کرنا لڑکیوں کو شروع ہی سے سیکھنا
چاہئے۔ کیوں کہ اگر بچپن میں لڑکی فضول خرچ
ہے اور بڑے ہونے پر خدانخواستہ اسے اتنی
وسعت نہیں کہ جتنا روپیہ وہ پہلے خرچ کیا کرتی
تھی اتنا ہی اب بھی کرے تو یہ بات اس کے لئے
نہایت تکلیف دہ ہوگی او[illegible] سے طرح طرح کی
دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اسی لئے یہ بہتر ہے
کہ بچیاں پہلے ہی سے ہر کام کو کفایت سے کرنے
کی عادت ڈالیں۔ عید، بقرعید یا اور موقعوں
پر جو روپیہ انھیں اُن کے خرچ کے لئے ملے اُسے
والدین کی اجازت سے مناسب طریقے پر خرچ
کرنا چاہئے۔ یعنی ایسی چیزیں خریدیں جو کارآمد
ہوں [illegible] ایسے کاموں میں لگائیں جس سے کچھ
فائدہ حاصل ہو۔ یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ
روپیہ تو ہمارا ہے جو جی چاہے کریں۔ امی جان
یا ابا جان سے اب کیا مطلب؟ جو کام
کریں بڑوں سے پوچھ کر کریں۔ اس طرح
مشورے سے کام کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے
اور دوسروں کی رائے معلوم کرنے سے بڑا تجربہ
حاصل ہوتا ہے۔

آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں میں اکثر
یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ انھیں اپنی تعلیم پر کچھ غرور
ہو جاتا ہے۔ اور اپنی سیدھی سادھی اَن پڑھ
بہنوں سے ملنے جلنے میں اپنی توہین سمجھتی ہیں
یہ بھی بہت بُری بات ہے۔ غرور خواہ
کسی چیز کا ہو اچھا نہیں ہوتا۔ مغرور
آدمی کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ غرور اللہ
کو بھلا نہیں معلوم ہوتا۔ انسان اگر کچھ سیکھے تو اس کا
فرض ہے کہ وہ دوسروں کو سکھائے اپنے علم و ہنر
سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے یہ نہیں کہ اپنے ہی اوپر
نازاں ہو کر بیٹھ رہے۔ انکساری آدمی کے لئے بڑا جوہر ہے
اس سے آپس کا میل جول، عزت محبت اور ہمدردی
قائم رہتی ہے۔ اور ایک اچھی لڑکی بننے کے لئے
ان چیزوں کا ہونا بھی ضروری ہے

منشی پریم چند

محمد حسین حسان

منشی پریم چند آں جہانی اردو زبان کے بہت اچھے لکھنے والے تھے پچھلے سال کے سال گرہ نمبر میں ہماری درخواست پر انھوں نے تمھارے پیام تعلیم میں مضمون بھی لکھا تھا۔ ایک نئی دنیا بسائی تھی اور بتایا تھا کہ اس نئی دنیا میں کیا ہوگا یا کیا ہونا چاہئے۔ اصل میں ان کا دل تمھاری طرف سے امیدوں سے بھرا ہوا تھا، وہ سمجھتے تھے اور ہمارے خیال میں ٹھیک سمجھتے تھے کہ جوان ہوکر تم اپنے وطن کے سپوت بنوگے۔ اپنے ہم وطنوں کے لئے ملک کو جنت کا نمونہ بنا دوگے۔

ویسے تو ہم سے اُن سے سال میں کئی بار خط کتابت ہوئی وہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ مگر جب اس سال گرہ نمبر کی ترتیب کا زمانہ آیا تو پہلے کی طرح ہم نے اُن سے پھر مضمون کی درخواست کی جواب نہ آنے پر دوسرا خط لکھا پھر تیسرا پھر چوتھا۔ اسی طرح کوئی سات آٹھ خط لکھ ڈالے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ منشی صاحب سخت بیمار ہیں۔ سخت شرمندگی اور رنج ہوا کہ کیوں ایسی حالت میں انھیں تکلیف دی گئی۔ ہم انھیں معذرت کا خط لکھنے ہی والے تھے کہ دو چار روز بعد اخبار میں ان کے مرنے کی خبر آگئی، مرنا، جینا تو سب کے ساتھ لگا ہوا ہے مگر بعض موتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن سے اپنے پرائے سبھی کو دُکھ پہنچتا ہے منشی صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے

تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ منشی صاحب کا اصل نام دھنپت رائے ہے مگر اپنے افسانے، ناول اور مضمون ہمیشہ نواب رائے یا پریم چند ہی کے نام سے لکھتے رہے یہ آخری نام تو اتنا مشہور ہوا کہ لوگ یہی اُن کا اصلی نام سمجھنے لگے۔ منشی صاحب ۱۸۸۰ء (۱۹۳۷ سمت) میں ایک کائستھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ اُن کا وطن بنارس کے پاس ایک گاؤں پانڈے پور ہے ان کے والد منشی عجائب لال ڈاک خانے کے محکمے میں ملازم تھے منشی صاحب نے اس زمانے کے دستور کے مطابق ۸ برس کی عمر میں فارسی پھر انگریزی پڑھنی شروع کی اور بنارس کالجیٹ اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اپنی مجبوریوں کی وجہ سے وہ آگے تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور تعلیم کے محکمے میں نوکری کرلی۔ پڑھنے کا شوق تھا اس لئے نجی طور پر مطالعہ جاری رکھا کوئی بیس سال تک اس ملازمت کا سلسلہ رہا ۱۹۲۰ء میں اِس غلام ملک کو آزاد کرانے کی تحریک بڑے زور شور سے شروع ہوئی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ موجودہ حکومت کا بائکاٹ کیا جائے اور اُسے اس کے کاموں میں مدد نہ دی جائے تاکہ وہ مجبور ہوکر ملک کو آزاد کردے۔ بہت سے لوگوں نے نوکریاں چھوڑ دیں۔ منشی صاحب نے بھی بیس سال کی ملازمت پر لات ماردی

اور پھر کبھی اس طرف رُخ نہ کیا۔

اب سے کوئی پچیس سال ہوئے انھوں نے مضمون ناول اور افسانے لکھنے شروع کئے اُن کا پہلا ناول پریم کے نام سے آج سے ۲۴ سال پہلے شائع ہوا تھا اس کے بعد جلوۂ ایثار کے نام سے ایک اور ناول نکلا۔ اُن کی قابلیت کی دھاک اسی وقت سے بیٹھ گئی پھر تو انھوں نے اچھے اچھے افسانے اور ناول لکھے اور وہ ہماری اردو زبان کے سب سے بہتر افسانہ نگار سمجھے جانے لگے۔ یہ افسانے اور ناول انھوں نے محض دلچسپی کے لئے نہیں لکھے ہیں۔ اُن کے سامنے ایک خاص مقصد تھا۔ ہمارے ملک کے لوگ رسم و رواج کی بہت سی خرابیوں میں مبتلا ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ ترقی نہیں کر سکتے اور دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ ملک کی یہ حالت دیکھ کر منشی صاحب کا دل دُکھتا تھا۔ اور اپنے افسانوں کے ذریعے وہ لوگوں کو اُن کی بُرائیوں سے خبردار اور اُن سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ بڑے ہو کر تم اُن کے ناول اور افسانے پڑھوگے تو تمھیں اُن کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔

منشی صاحب بڑے سیدھے سچے اور مخلص بزرگ تھے۔ اپنے وطن کی محبت سے ان کا دل بھرپور تھا، اُن کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ ان کا دیس ترقی کرے ہندو مسلمانوں کی لڑائی سے انھیں بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے کہ ہندو مسلمان دونوں بھائیوں کی طرح مل جل کر رہیں۔ جامعہ ملیہ سے انھیں اسی لئے محبت تھی کہ وہ ایک آزاد قومی یونیورسٹی ہے۔ اور اس قسم کے تعصب سے پاک دہلی آنا ہوتا تھا تو جامعہ میں ضرور تشریف لاتے تھے۔ اسی سال مارچ میں تشریف لائے تھے تو جامعہ ہی کے اہتمام میں انھوں نے ہندوستانی سبھا کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندی اور اردو زبانوں کے لکھنے والے ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہیں۔ تاکہ ایک دوسرے کے خیالات سے خبردار ہوں اور جو غلط فہمی دونوں کے درمیان آج کل پیدا ہوگئی ہے دور ہو جائے اور دونوں زبانیں ایک دوسرے کے قریب آ جائیں۔ یہ انجمن بہت اچھا کام کر رہی ہے ابھی اکتوبر میں منشی صاحب کی تعزیت میں ایک جلسہ انجمن نے کیا تھا۔ اس میں یہ طے کیا گیا ہے کہ منشی صاحب کی یادگار میں مضمون اور افسانوں کا ایک انعامی مقابلہ ہر سال رکھا جائے یہ بہت اچھی یادگار ہے مگر بھائی ہمارا تو خیال ہے کہ منشی صاحب نے "نئی دنیا" والے مضمون میں جو اُمیدیں تم سے قائم کی ہیں اگر اُن امیدوں کو تم پورا کر سکے تو منشی صاحب کی اصلی یادگار تم ہو۔

پیام تعلیم کا اگلا پرچہ جنوری میں شائع ہوگا۔ اس پرچے کے لئے خاص انتظامات کئے جا رہے ہیں۔ اس میں ایورسٹ کی داستان۔ کنچن جنگا کی مہم کا باقی حصہ۔ ہوائی جہاز۔ لینن۔ ہمارے دیس کے درخت۔ سچ کا جادو (ڈراما) اور اچھے اچھے مضمون شائع ہوں گے۔ ہمارے ایک بزرگ ۱۹۳۶ء کے اہم واقعات پر ایک خاص مضمون لکھ رہے ہیں۔ یہ بھی اسی پرچے میں تصویروں کے ساتھ شائع ہوگا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی نئی اور دلچسپ خبریں ہوں گی۔

(ایڈیٹر)

جمپر کا آسان گریبان

پہلے قمیص سی کر تیار کر لو اس کے بعد اس نقشے کو قمیص کے گریبان کے پاس اُتار لو۔ اگر کپڑا باریک ہے تو نیچے نقشہ رکھو اور اوپر کپڑا رکھ کر پنسل سے اتار لو۔ ورنہ کاربن پیپر جو ایک ایک پیسے کو بازار میں بکتے ہیں۔ منگا لو۔ اور جس جگہ گریبان اتارنا ہے۔ اس کے اوپر کاربن پیپر رکھ کر پھر یہ نقشہ اس پر رکھو۔ اور نقشے پر پنسل پھیرتی جاؤ۔ جب تمام پر پنسل پھیر چکو تو کاغذ ہٹا لو۔ نقشہ گریبان پر اُتر آئے گا۔ یہ واضح رہے کہ کاربن پیپر کا چکنا حصہ کپڑے کی طرف رہے

پھول۔ گلابی دھاگے سے

ڈنڈی اور پتی۔ سبز دھاگے سے

پھول کے بیچ میں جو ایسا ⬭ حصہ ہے اُسے زرد دھاگے سے کاڑھو اب تمھارا گریبان تیار ہو گیا۔ کیسا اچھا ہے

مسز صالحہ عابد حسین
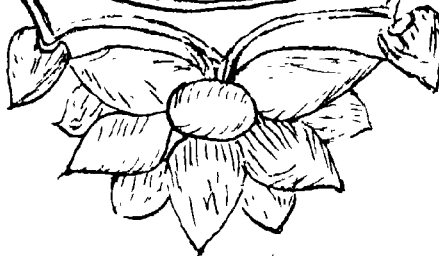
نانی امّاں

جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید بریلوی

بڑھی پھونس پرانی امّاں　　میری اچھی نانی اماں
چٹے چٹے بال تمہارے　　پچکے پچکے گال تمہارے
سر میں روپہلے تار لگے ہیں　　کہیں کہیں دو چار لگے ہیں
لٹھیا ٹیکے اٹھ کر آئیں　　میرے لئے کچھ میوہ لائیں
لیچی کے کچھ دانے چھلے　　جیسے انڈے گیلے گیلے
خوب کھلایا خوب پلایا　　پیار کیا چھاتی سے لگایا
پھر دو چار دعائیں دے دیں　　چٹ چٹ خوب بلائیں لے لیں

سب سے اماں جانی اچھی
اور ان سے بھی نانی اچھی

اِس سال کی اچھی کتابیں

ایڈیٹر

اس سال بچوں کی کئی اچھی اچھی کتابیں نکلی ہیں۔ آج ان میں سے چند پر تبصرہ (رائے) لکھتے ہیں۔ باقی پر آئندہ پرچے میں لکھا جائیگا

ہماری بادشاہی

از مولوی عبدالسلام صاحب ندوی جامعی

مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے بہت اچھے انداز میں اختصار کے ساتھ مسلمانوں کی حکومت کی تاریخ لکھی ہے، اس میں شروع سے لے کر اب تک کی تمام اہم باتیں آگئی ہیں۔ زبان بہت صاف اور سادہ۔ بچوں کے لئے مناسب۔ اگر مختلف عہدوں کے نقشے بھی کتاب میں شامل ہوجاتے تو بچوں کے لئے کتاب اور بھی مفید ہوجاتی۔ کتاب کی لکھائی چھپائی اچھی ہے۔ ضخامت کوئی ایک سو چودہ صفحوں کی ہوگی۔ ایک روپیہ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی

نصابِ شہریت

یہ کتاب پروفیسر عطاءاللہ صاحب ایم اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے مڈل اسکول کے بچوں کے لئے لکھی ہے اس میں تیرہ باب ہیں، پہلے باب میں بتایا ہے کہ شہریت کیا چیز ہے۔ دوسرے میں اسکاؤٹنگ کی تفصیل ہے تیسرے میں حکومت اور اس کی قسمیں بتائی ہیں۔ چوتھے میں بتایا ہے کہ شہریت کے حق کیا ہیں اور کیا فرائض ہیں۔ پانچویں میں ہندوستان کے انتظامی معاملات سے بحث کی ہے۔ مثلاً وزیر ہند وائسرائے گورنروں وغیرہ کے اختیارات کونسل آف اسٹیٹ، اسمبلی، لیجسلیٹو کونسل پھر یہ کہ کس حیثیت کے لوگ کن کن مجلسوں کی ممبری کے امیدواروں کے انتخاب میں رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ غرض اسی طرح پنچایت، حفاظت، عدالت، صحت، آبپاشی، قحط، صنعت و تجارت، ترقی تعلیم وغیرہ کے متعلق تفصیل سے معلومات ہیں۔ آخر میں لیگ آف نیشنز یا مجلس اقوام کا حال ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بہت ضروری اور مفید باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ پروفیسر عطاءاللہ صاحب کوشش کرتے تو اِس کی زبان بچوں کے لئے اور بھی آسان اور دلچسپ ہوسکتی تھی۔ کتاب کوئی دو سو چھیالیس صفحے کی ہے اور قیمت صرف ۱۲؎ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے مل سکتی۔

برف کی بیٹی اور دوسری کہانیاں

جناب غلام عباس صاحب نے چند روسی کہانیوں کا ترجمہ کیا ہے۔ جو بچوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ کہانیاں ہر قسم کی ہیں۔ اخلاقی بھی، مذاقیہ بھی، بہادری کے قصے بھی ہیں۔ غلام عباس صاحب کو بچوں کی زبان لکھنے کا خاص سلیقہ ہے۔ ان کی کہانیوں کی زبان بہت پیاری ہے، اور لکھنے کا انداز دلچسپ۔ البتہ نالشائی والی کہانی ذرا بڑی عمر کے بچوں کے لئے مناسب تھی۔ کتاب کی لکھائی چھپائی بھی بہت اچھی ہے۔ کاغذ چکنا۔ سرورق پر برف کی بیٹی کی تصویر تین رنگوں میں۔ قیمت ۶؎

دارالاشاعت پنجاب لاہور سے مل سکتی ہے۔

چار چھوٹے ناٹک یہ کتاب بھی دارالاشاعت پنجاب سے شائع ہوئی ہے اس میں ایک ایکٹ کے چار ناٹک ہیں اور ملک کے مشہور لوگوں سے لکھوائے گئے ہیں ننھی کی گڑیا۔ غلام عباس صاحب نے لکھا ہے۔ بورکا لڈو۔ محمد عمر، نورالٰہی صاحبان نے۔ میاں ظفر نکالے گئے حسرت کشمیری صاحب نے۔ اور انوکھا دربار۔ نو دا متیاز صاحب نے یہ ناٹک بڑے مزے کے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آسانی سے کھیلے بھی جا سکتے ہیں۔ زیادہ ساز و سامان کی ضرورت نہیں۔ ہر کھیل کے آخر میں کھیلنے والوں کے لئے ہدایتیں بھی ہیں قیمت ۱۲ر اوپر کے پتے پر مل سکتی ہے۔

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لئے کہانیوں کا ایک سیٹ تیار کیا ہے۔ یہ چھ کتابیں ہیں **شیدُلا - نیت کا پھل - بیکاری مرغی - اچھی چیلی - تانبیل خاں** اور **شہزادی گلنار** - ان میں پہلی چار کتابیں پہلے اور دوسرے درجے کے لڑکوں کے لئے لکھی گئی ہیں۔ تانبیل خاں تیسرے، اور شہزادی گلنار چوتھے درجے کے لئے۔

یہ کہانیاں کچھ تو ترجمہ ہیں اور کچھ لوگوں نے خود لکھی ہیں۔ ان کی زبان بہت ہی سادہ اور آسان ہے۔ لکھنے کے طریقے میں بھی ایک خاص رس اور البیلا پن ہے۔ ہر کہانی کے سرورق پر کہانی سے متعلق اچھی اچھی تصویریں بھی ہیں۔ کہانیوں کی لکھائی چھپائی میں بھی بہت نفاست اور سلیقے سے کام لیا گیا ہے۔ (مکتبہ جامعہ دہلی سے منگائیے)

جامعہ کیمیکل انڈسٹریز کی بنائی ہوئی چند چیزیں

جامعہ میں سائنس کے شعبے کے اہتمام میں کیمیکل انڈسٹریز کا کام ایک عرصے سے ہو رہا ہے سائنس کے ایک قابل استاد اس کی نگرانی کرتے ہیں مقصد یہ ہے کہ سائنس کی نظری تعلیم کے ساتھ ساتھ بچوں کو عملی تعلیم بھی دی جائے۔ کام میں صفائی اور سلیقے کا خاص اہتمام ہے۔ جناب علی احمد صاحب نگران عمل طبیعات نے جو چیزیں ہمارے پاس اظہار رائے کے لئے بھیجی تھیں ہم نے انھیں خود بھی استعمال کیا، دوسروں سے بھی کرایا اور بہت قابلِ اطمینان پایا۔

مفید منجن یہ منجن دانتوں کی صفائی ہی نہیں کرتا بلکہ مسوڑوں کے متعلق امراض اور پائیوریا کے لئے بھی مفید ہے (اگر ابتدائی حالت میں ہو) اس میں اس قسم کی چیزیں ہیں جو دانتوں کو مضبوط بنائیں اور خراب جراثیم کو ہلاک کر دیں۔ بہت صاف خوشبودار خوشنما شیشیوں میں بند **قیمت** ۳۰ر

ویسلین - یہ ویسلین سائنٹفک طریقوں سے صاف کر کے اور بہترین قسم کی خوشبو ملا کر تیار کی گئی ہے، رنگ بھی بہت خوشنما بازاری ویسلین سے تو لاکھ درجہ بہتر ہے چہرے اور بالوں میں ہمیشہ استعمال کرنے کی چیز ہے۔ **قیمت فی شیشی** ۳ر

مچھر بچاؤ تیل یہ تیل ایسے مرکبات سے تیار کیا ہے جن کی بو سے مچھر نفرت کرتے ہیں مگر یہ بو انسان کے لئے ناگوار نہیں اس میں بعض ایسی چیزیں بھی شامل کی گئی ہیں جو جراثیم کو خون میں داخل ہونے سے روکتی ہیں۔ مچھروں اور ملیریا سے محفوظ رہنے کا آسان نسخہ ہے تیل میں چکناہٹ برائے نام ہے **قیمت** فی شیشی ۱۲ر

جامعہ انک یہ روشنائی فاؤنٹین پن کے لئے ہے اس کے استعمال سے فاؤنٹین پن ہمیشہ نیا رہتا ہے۔ روانی بھی خوب ہے، رنگ بھی پختہ ہم آج کل یہی روشنائی استعمال کر رہے ہیں قیمت فی شیشی ۳ر

یہ چیزیں کیمیکل انڈسٹریز جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہیں۔

محمد علی رننگ کپ

(د۔ سلہ جناب چودھری اکبر علی صاحب نگراں مدرسہ ابتدائی۔ جامعہ نگر (اوکھلا)

۱۔ محمد علی رننگ کپ کو جاری ہوئے پانچ سال ہوچکے ہیں اس عرصہ میں کافی مدرسوں نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ہے پچھلے پانچ سال کے جلسوں پر غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہم کو تعلیمی اور تربیتی نقطہ نظر سے اس میں چند تبدیلیاں کرنی چاہئیں جن کی تشریح یہ ہے۔

۲۔ ہمارے خیال میں تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طالب علم کو اپنی خداداد قابلیتوں کے اظہار کا پورا پورا موقع دیا جائے اور ہمیشہ ایسے ذرائع اور وسائل مہیا کئے جائیں جن کی بدولت وہ تندرست خوش اور بامعنی زندگی گذار سکے اس لئے ضروری ہے کہ وہ تمام مواقع اور محرکات پیدا کئے جائیں جن سے طالب علم کی تمام امکانی خوبیوں کو ابھارنے اور چمکانے کی ضرورت پیدا ہو امید ہے کہ اس مقصد میں آپ ہماری ہمنوائی کریں گے اور اپنے تعاون کو حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

۳۔ اس مقصد کے پیش نظر محمد علی رننگ کپ کے سلسلہ میں اس سال بعض جسمانی مقابلوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

یہ ایک ضروری چیز ہے اس لئے میں جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس مقابلے میں بھی اپنے نمایندے ضرور بھیجئے۔

تعلیمی مقابلے کے لئے ہم نے مندرجہ ذیل تین چیزیں منتخب کی ہیں

(۱) مشاہدہ - تیسری جماعت تک کے لئے۔

(۲) تقریر و تحریر - چوتھی سے آٹھویں جماعت تک

ذیل میں اساتذہ صاحبان اور مقابلہ میں شرکت کرنے والوں کی سہولت کے لئے، - اس کی مختصر سی تشریح کرتے ہیں

ابتدائی سوم تک کے بچوں کے لئے :-

پہلے بچے کو کوئی زندہ پرندہ یا جانور دکھایا جائے گا۔
اور اس کے متعلق سوچنے کے لئے مناسب موقع دیا جائے گا۔
اس کے بعد بچے کے سامنے اسی جانور یا پرندے کی تصویر مناسب ماحول اور منظر کے ساتھ پیش کی جائے گی۔
جس پر بچے سے بولنے کے لئے کہا جائے گا

مشاہدہ	نمبر ۲۵
بولنے کی صلاحیت	نمبر ۱۵
جدت طبع	نمبر ۱۰

اس سال چوتھی سے آٹھویں جماعت تک کے لڑکوں کا تقریری مقابلہ مناظرہ کی شکل میں نہ ہوگا کیونکہ ہم اس عمر میں بناوٹی لسانی اور زور خطابت مناسب نہیں سمجھتے۔ اس تصنع کو مٹانے اور بچے کے اصلی رجحانات کے اظہار کے لئے ہم نے تقریر کی ایک دوسری شکل سوچی ہے۔ مثلاً اسی سال ہم بچے کو دلی کے کسی حصے کی سیر کرائیں گے۔ اور اس پر اس کے ذاتی تاثرات بصورت تقریر سنیں گے۔ ذیل کی خوبیوں کے بہ تفصیل ذیل نمبر دئے جائیں گے:-

۱۔	قوت مشاہدہ	۴۰
۲۔	قوت گویائی	۳۰
۳۔	رجحانات	۳۰

مقابلہ کرنے والے کے رجحانات سے مراد وہ نفسی تاثرات و

میلانات ہیں جن کو وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے وقت پیش نظر رکھتا ہے۔ یعنی جب مقابلہ کرنے والے سے کسی خاص مسئلہ پر بولنے کے لئے کہا جائے گا۔ تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ اس کو قومی، اخلاقی، جمالیاتی، تاریخی، ادبی وغیرہ کس نقطہ نظر سے دیکھتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو۔ کہ مسئلہ زیر بحث کے متعلق مقابلہ کرنے والے کے ذاتی تاثرات کیا ہیں۔ اور وہ کس پہلو سے اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہے۔

تحریری مقابلہ میں بھی ہمارے پیش نظر اول الذکر مقابلہ کی طرح یہی ہے۔ کہ بجائے بچوں کے حافظہ کا امتحان لینے کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے۔ کہ بچے میں قوت تحریر کس درجہ تک موجود ہے۔ اسی خیال کے ماتحت ہم نے یہ طے کیا ہے۔ کہ بچے کو کسی چیز کے متعلق معلومات دے جائیں گے اور اس سے یہ کہدیا جائے گا۔ کہ اس کے متعلق کچھ لکھو۔ یا کئی چیزیں دکھلائی جائیں گی اور ان میں سے کسی ایک پر لکھنے کو کہا جائے گا۔

تحریری مقابلے کے نمبر :-

۱۔ صحت زبان ۳۰

۲۔ خیالات و تاثرات ۳۰

۳۔ معلومات ۴۰

جسمانی مقابلہ :-

اس مقابلہ کے لئے سردست حسب ذیل کھیل رکھے گئے ہیں۔ اس مرتبہ حصہ لینے والے مدرسوں کے اساتذہ صاحبان سے مشورہ کرکے آیندہ کے لئے اس میں کچھ اضافہ کیا جائے گا۔

۱۔ سو گز کی دوڑ ۲۵ نمبر

۲۔ لمبی چھلانگ ۲۵ نمبر

۳۔ کراس کنٹری ریس (۳ میل کی دوڑ) ۳۰ ،،

(۴) امدادی دوڑ (ریلے ریس) ۲۰ نمبر

ٹرافی حاصل کرنے کے لئے جسمانی مقابلہ بھی لازمی ہے۔ تعلیمی اور جسمانی ہر دو مقابلوں کے مجموعی نمبروں کے حاصل کرنے پر ٹرافی کا دارومدار ہوگا۔

حصہ لینے والوں کی تعداد :-

تعلیمی مقابلہ کے تین حصے ہیں ہر ایک حصے میں ایک ایک علیحدہ طالب علم کا شریک ہونا لازمی ہے جن مدرسوں میں تیسری جماعت کی تعلیم کا انتظام نہیں وہ آٹھویں جماعت تک کے طلبہ میں تحریر و تقریر کے لئے دو طالب علم بھیج سکتے ہیں جسمانی مقابلہ میں ایک طالب علم زیادہ سے زیادہ دو چیزوں میں حصہ لے سکتا ہے۔ یہ طالب علم خواہ تعلیمی مقابلہ میں حصہ لینے والے ہوں یا علیحدہ سے۔

نوٹ :- شہر دہلی کے باہر کے حصہ لینے والوں کے قیام و طعام کا انتظام مدرسہ ابتدائی کی طرف سے ہوگا۔

نیازمند

اکبر علی نگراں مدرسہ ابتدائی جامعہ نگر اوکھلا دہلی۔

محمد علی رننگ کا پروگرام حسب ذیل ہے :-

۱۴ر نومبر ۳۶ء سنیچر ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے تک بڑے لڑکوں کا تقریری مقابلہ۔

۲۔ ۳ بجے سے ۵ بجے شام تک ورزش کا مقابلہ

۱۵ر نومبر ۳۶ء اتوار (۱) ۹ بجے صبح سے ۱۲ بجے تک چھوٹوں کا تقریری مقابلہ و تقسیم انعامات۔

(۲) ۳ سے ۵ تک ہاکی اور والی بال کے نمائشی مقابلے ہوں۔

نام .... عمر .... درجہ .... تصدیق ....

پورا پتہ: ....

نوٹ :۔ اس تصویر کے پیچھے قصداً ایسا مضمون رکھا گیا ہے۔ جسے الگ کرنے سے کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اس لئے تم بلاتکلف اس ورق کو علیحدہ کرلو۔

بچوں کی کتابیں

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
تغ ملا	۸ر	تاج گیت	[illegible]	ثریا کی گڑیا	۵ر	توت عنخ آموں	عہ
بگلا بھگت	۵ر	راکھ بیگم	ار	جادو کا لفظ	۵ر	پرندے اور اُن کی زندگی	عہ
گڑیا کا گھر	عہ	تل کا لڈو	ار	پر پرواز	۵ر	نباتات اور نباتی خوراک	[illegible]
اسی دن میں دنیا کا سفر	۱۰ر	چوہے نامہ	ار	دیارِ عجیب	۸ر	کیڑے مکوڑے	عہ
پانچ ہفتے غبارے میں	۱۳ر	سپاہی زادہ	۲ر	عجائب خانۂ سمندر	۱۲ر	مشق خوشنویسی	۲ر
بحر جنوبی کا سفر	۷ر	سنہری گیت	۸ر	کائنات	۵ر	بچوں کا حساب	
صبح ملال شام غم	عہ	بچوں کے گیت	۳ر	آسمانی دولہا	۱۲ر	حصہ چہارم	۹ر
الحمرا کے افسانے	[illegible]	پھولوں کی ڈالی	۴ر	دنیا کے بسنے والے	۶ر	" پنجم	۱۰ر
مرغی اجمیر حلی	۳ر	بیاض گل	۸ر	تعلیمی کھیل	۶ر	" ششم	۹ر
تانبیل خاں	۲ر	جون پور کا قاضی	۵ر	علمی کہانیاں	عہ	باغبانی پروجکٹ	۸ر
نیت کا پھل	۲ر	سدا بہار	عہ	علمی پہیلیاں	۸ر	میلا دلہنی پروجکٹ	۶ر
شیدلا	۳ر	پیام ہند	۳ر	ہندوستانی پہیلیاں	۲ر	ستارے کی گڑیا	۳ر
چھدو	۳ر	نغمۂ وطن	۳ر	آئین حکومت ہند	عما	شہزادہ عزیز	۴ر
ماں	۲ر	بھارت کے گیت	۳ر	سیاحوں کی کہانیاں	۸ر ۴ پائی	پہاڑی ماں	۳ر
شہزادی گلنار	۴ر	چڑیا گھر	۴ر	ایجادات	۱ر ۵ پائی	دکھ کے بعد سکھ	۳ر
عقاب	۴ر	دیانت	۲ر	کاری گر [illegible]	۶ر	تقدیر اور تدبیر	۳ر
بچوں کی نظمیں	۵ر	شریر لڑکا	۴ر	دانا یا [illegible]	۱۵ر پائی	پادری کا قصہ	۳ر
بچوں کے اسماعیل	۶ر	قوم پرست طالب علم	۴ر	امداد باہمی	عہ	چالاک چور	۳ر
جواہر ملیت	۳	بچوں کا انصاف	۴ر	قدیم تہذیبیں	عہ	سمندر کی سنہری پری	۳ر
بہار کے پھول	ار	اسکول کی زندگی	۴ر	سمندر کی کہانیاں	ار ۵ پائی	بقراط اور جالینوس	۳ر
ہندوستان ہمارا	عہ	محنت	۴ر	ایورسٹ کی کہانی	عہ	ایک سست لڑکا	۳ر

بچوں کا رسالہ "پیامِ تعلیم" جس دفتر سے نکلتا ہے ۔ اس کا نام مکتبہ جامعہ ہے مکتبہ جامعہ میں بچوں کی سب سے اچھی کتابیں ہر وقت بغرض فروخت موجود رہتی ہیں ۔ قصے کہانیوں کی کتابیں ، سفرنامے ، نظمیں ڈرامے غرض جو کتابیں بچوں کے لئے چھپتی ہیں ہم فوراً منگا لیتے ہیں اور سب شہروں اور سب مشہور لکھنے والوں کی تمام کتابیں اپنے یہاں جمع رکھتے ہیں ۔ تاکہ جب کبھی کسی بچے کو یا کسی اسکول کے کتب خانے کو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو فوراً مکتبے سے مل جائے ۔

دہلی ، لاہور ، لکھنؤ ، الہ آباد ، حیدرآباد وغیرہ شہروں میں بچوں کے لئے بڑی اچھی اچھی کتابیں چھپی ہیں ، اگر ان مقامات سے علیحدہ علیحدہ پارسل منگائے جائیں تو کتابوں سے زیادہ پارسلوں پر خرچ ہو جاتا ہے ۔ اس لئے اب ہمیشہ یاد رکھئے کہ جب کسی کتاب کی ضرورت ہو تو ہم کو لکھئے ۔ فرمائش بھیجنے سے پہلے ہماری فہرست بھی منگوا کر دیکھ لیجئے

کتابیں منگانے کا آسان طریقہ

کتابیں منگانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اگر آپ کی فرمائش ایک روپے سے زیادہ کی ہو تو منی آرڈر سے رقم بھیج دیجئے ۔ یا وی پی منگوا لیجئے ۔ اگر آپ کوئی ایسی کتاب منگانا چاہیں جو ایک روپے سے کم کی ہے ۔ تو کتاب کی قیمت کے علاوہ دو آنے کے ٹکٹ لفافے میں رکھ کر ہمارا پتہ بہت خوش خط لکھ کر ڈاک میں ڈال دیجئے ۔ کتاب آپ کو ان رجسٹرڈ پیکٹ سے بھیج دی جائے گی ۔

کوئی کتاب ہماری فہرست میں درج نہ ہو ۔ اور وہ آپ منگوانا چاہیں تو دام نہ بھیجئے ۔ یا تو وی پی سے منگوائیے یا دام بھیجنے سے پہلے خط لکھ کر دریافت کر لیجئے کہ ہم مہیا کر سکتے ہیں یا نہیں ۔

سب کتابیں ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جاگو اور جگاؤ
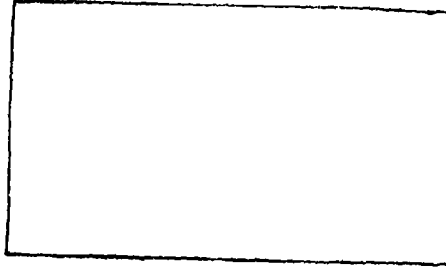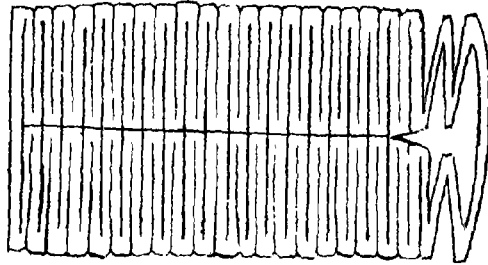
کاغذ کے ٹکڑے میں سے گذر سکتے ہو؟

ہے یہ واقعی مشکل کام تم اپنے کسی دوست سے کہوگے تو نہ جانے تمھیں کیا سمجھے گا۔ مگر تمھیں ایسی ترکیب بتاتے ہیں کہ یہ مشکل آسانی سے حل ہوسکتی ہے۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا لو بس اتنا ہی بڑا جتنا تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ اب اس پر دوسری تصویر کے مطابق پنسل سے نشان کرلو اور تیز چاقو سے ان نشانوں پر کاٹتے چلے جاؤ۔ بہت احتیاط کے ساتھ۔ ذرا سی غلطی سے گڑبڑ ہو جائے گی۔ سب کاٹ چکوگے تو یہ اتنا بڑا حلقہ بن جائے گا کہ تم اس میں سے آسانی کے ساتھ گذر سکوگے۔ ذرا کرکے تو دیکھو کیسا دلچسپ مشغلہ ہے؟

کرسچین ہنکن لوبک (جرمنی) کا یہ بچہ آٹھ ہفتے کی عمر میں باتیں کرتا تھا اور تیرہ مہینے کی عمر میں اس نے بائبل پڑھنا شروع کردی تھی۔

Calcutta Art Press Delhi

۱۹ مجر

بس اتنا ہی بڑا . ب تصویر میں دکھایا گ

ا کے ساتھ ۔

ایڈیٹر محمد حسین حسان ندوی جامعی

قیمت سالانہ عہ ۔ فی پرچہ ۳ر ۔ سالگرہ نمبر ۱۲ر

جلد ۲۰	نومبر، دسمبر ۱۹۳۷ء	نمبر ۱۱-۱۲

فہرست مضامین

سالگرہ نمبر

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی، مکتبہ المطالعہ پریس، دہلی

سالگرہ نمبر تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ اب کی یہ وقت پر نکل گیا۔ تمھیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ اب اس کا فیصلہ تم خود کرو کہ کیسا نکلا ہے۔ ہم نے تو اسے مفید اور دلچسپ بنانے کے لئے رات دن ایک کر دیا ہے۔ اچھا تم اتنا کرو کہ اسے پڑھ چکو تو اپنی رائے ہمیں بھیج دو۔ جو کچھ لکھنا پوری آزادی سے لکھنا! کون کون سے مضمون تمھیں پسند آئے۔ کون سے اچھے نہیں لگے۔ کسی چیز کی کمی تو نہیں رہ گئی؟ جس کی رائے سب سے زیادہ بے لاگ سمجھی جائے گی اسے اچھا سا انعام دیا جائے گا۔ بس، ۳۰ نومبر تک اپنی رائیں بھیج دو۔

کچھ تو گنجائش اور کچھ وقت کی کمی کے سبب اچھے اچھے مضمون شائع نہ ہوسکے۔ خط باریک کر دیا گیا پھر بھی یہ مشکل حل نہ ہوئی۔ ہمیں اس کا افسوس ہے اور اپنے مضمون نگاروں سے شرمندگی بھی۔ اسی مجبوری سے دو دلچسپ مضمونوں کا صرف ایک ہی ایک حصہ شائع کرنا پڑا۔ امید ہے کہ مضمون نگار حضرات ہماری معذرت قبول فرمائیں گے۔ اُن کے مضمون آئندہ پرچوں میں شائع ہوں گے۔

اس مرتبہ مضمون نگاری کے انعامی مقابلے میں ان بچوں اور بچیوں نے حصہ لیا:

ضیاء الرحمٰن، کلکتہ۔ اقبال احمد، بھوپال۔ عزیز الرحمٰن، کلکتہ۔ محمد اکرم خاں، بھوپال۔ خواجہ اشرف الدین احمد ملکاپور (برار)۔ مسعود الرحمٰن خاں بھوپال۔ ط، ب ہمیر۔ سید رضا عسکری پاشا چھپرہ مئو۔ تنویر حسن لبشیر مالیر کوٹلہ۔ فدا حسین ابن فدا حسین، ناگپور۔ ایچ۔ این قریشی بیہورا۔ ایچ اسلم عظیم آبادی۔ ابوالکلام، کلکتہ۔ ملک علی امام، مظفری انیس الرحمٰن، حیدرآباد دکن۔ راما نند شرما۔ جمیلہ عبداللہ لاہور۔ طلیعہ جمال آرا بیگم، بہاری۔ احمد عبدالحمید، علی گڑھ۔ منور حسین حیدرآباد دکن۔ کبری بیگم۔ رشید مرزا، جامعہ دہلی۔ ابو یوسف امیر عزیز خاں کرلا بمبئی۔ طاہر حسین غازی آباد۔ محمد عمران فتح گڑھ۔ محبوب علی نیم۔ قطب الدین۔ حیدرآباد دکن۔ طلعت آرا بیگم بلند شہر۔ کبریٰ بیگم۔ احمد حسن، لکھنؤ۔ ابن الحسن، سکندر آباد (بلند شہر)۔ ضامن حسین۔ فدا حسین، برہان پور۔ حسن محمود شہزادہ برکت اللہ سرشار، بریلوی۔ ابوالحسن صدیقی، حیدرآباد دکن۔ بنت احمد سعید خاں، گورکھپور۔ غلام یزدانی حیدرآباد دکن مبارک الدین، آگرہ۔ زہرا خاتون، پانی پت۔ نظام الدین میرٹھ

ع، ف، چھپرا منو۔ سید اقبال حسن، حیدرآباد دکن۔ بشیر اعظمی سیالکوٹ۔ آمنہ عمر، میرٹھ۔ ابو یوسف، اودے پور

ان میں ڈرامے کے مقابلے میں زہرا خاتون بانی پت اول اور منور حسین دوم آئے۔

"تنک کام" میں عزیز الرحمٰن اول آئے۔

"دلچسپیوں" میں ضیاء الرحمٰن اول آئے۔

"تاریخی اشخاص" میں طلبہ جہاں آرا بیگم اول آئیں۔

"متفرق مضامین" میں زاہد حسین ناگپور اول آئے۔

"کہانیوں" میں مریم شفقی اول اور بنت احمد سعید خاں دوم آئیں۔

"تاریخی مضامین" میں غلام یزدانی اول آئے۔ خواجہ اشرف الدین دوم۔

ٹائٹل پیج کے انعامی مقابلے میں ان بچوں اور بچیوں نے حصہ لیا۔

احمد حسن لکھنؤ، عبد الحق، جامعہ دہلی۔ محمد اکرم خاں چچا وطنی۔ شمیم اعظمی دہلی۔ ابو الکلام، شانتی نکیتن۔ رضا عنبری چھپرا منو۔ حمیرا خاتون اعظم گڈھ۔ ایچ۔ ابن قریشی سہوارا۔ ایوب عبد اللہ، جامعہ دہلی۔ خلیل عمر، ہردوئی۔ احمد حسن مہندرو (پٹنہ)، اقبال احمد، بھوپال۔ لعل محمد، سہسرام، ابو یوسف، اودے پور۔ جمیلہ عبد اللہ، لاہور۔ رام آنند نیر سیالکوٹ۔ ان میں شمیم اعظمی اول، احمد حسن دوم، اور عبد الحق سوم آئے۔

ابو الکلام صاحب شانتی نکیتن نے بھی مقابلے میں اپنا ٹائٹل بھیجا تھا اور یہی سب سے اچھا تھا۔ لیکن ابو الکلام کی عمر زیادہ ہے۔ اس لئے اُن کا ٹائٹل مقابلے میں شامل نہیں کیا گیا۔ غالباً وہ خود بھی اب بچوں میں شامل ہونا پسند نہ کریں گے۔

اب کی رنگ بھرنے کے مقابلے میں پچھلے مہینے کی بہ نسبت بہت کم بچوں نے حصہ لیا۔ نام یہ ہیں:۔

ظہیر الدین ہاشمی حیدرآباد دکن۔

منظفر الدین احمد ٹیکسلا۔

عبد الحق، جامعہ ملیہ، دہلی۔

معین الدین احمد انصاری حیدرآباد دکن

خلیل عمر علی گڑھ

ابن الحسن۔ سکندرآباد

محمد احمد زبیری۔ مارہرہ

سید منیر الدین قادری۔ جامعہ نگر اوکھلا۔

انیس الرحمٰن۔ حیدرآباد دکن۔

احمد عبد العزیز۔ حیدرآباد دکن

افتخار الدین۔ جامعہ نگر اوکھلا

شمیمہ بیگم۔ دیوانگر۔

حُمیرا خاتون۔ اعظم گڈھ

محمد حسین دریا بھون۔ اودے پور

رشیدہ۔ حیدرآباد دکن

اقبال احمد بھوپال۔

دتاتری راؤ۔ حیدرآباد دکن

قطب الدین احمد۔ حیدرآباد دکن

ان میں سید منیر الدین قادری اول۔ رشیدہ دوم۔ اور عبد الحق سوم آئے ہیں

اس سلسلے میں چند ایسے حضرات نے بھی مضمون بھیجے جو یا تو طالب علمی کی حد سے گذر چکے ہیں یا کالج میں داخل ہوگئے ہیں۔ ان کے مضمون بہت اچھے ہیں لیکن یہ مقابلہ محض بچوں کے لئے تھا۔ اس لئے مقابلے میں شامل نہیں کئے گئے

فوٹو کے انعامی مقابلے میں ان بچوں نے حصہ لیا

عتیق فاطمہ ۔ بھوپال

جمیلہ بیگم ۔ لاہور

ازیر احمد ۔ گیا۔

خلیل عمر ۔ مہرزدی

عبدالاحد خاں

محمد جعفر ۔ حیدرآباد دکن

ح ، ف ۔ بھوپال

سید منیرالدین جامعہ نگر او کھلا۔

ابوالکلام ۔ کلکتہ

ان سب میں ابوالکلام اول ۔ ح ، ف ۔ دوم اور سید منیرالدین سوم آئے۔

پیامی بچوں اور بچیوں نے مضمون لکھنے، تصویریں رنگ بھرنے اور ٹائٹل بنانے میں پچھلے سال کے مقابلے میں بہت کچھ ترقی کی ہے ۔ اور یہ بہت اطمینان اور خوشی کی بات ہے ۔ امید ہے کہ آیندہ بچے زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان مقابلوں میں حصہ لیں گے۔

اس پرچے کی تیاری اور ترتیب میں ہمیں بہت حضرات سے بہت قیمتی مدد ملی ۔ ان میں جناب برکت علی صاحب فراق ۔ بی اے جامعہ ۔ جناب مولوی حفیظ الدین صاحب ندوی ۔ جناب الیاس احمد خاں صاحب ۔ جناب سید محمد ادیبا صاحب جناب مولوی بدرالحسن صاحب بی اے جامعہ اور جناب عبدالملک صاحب خاص طور سے ذکر کے قابل ہیں ۔ ان سب کا دلی شکریہ ادا کیا جاتا ہے ۔

پیام تعلیم کا یہ نمبر نومبر اور دسمبر کا ہے۔ دسمبر کے پرچے کا انتظار نہ کرنا ۔ اب اللہ نے چاہا تو اگلا نمبر نئی شان اور آب و تاب سے جنوری میں نکلے گا ۔

محترمہ آپاجان نے اس پرچے میں کسی جگہ انعامی مقابلے کے سلسلے میں کچھ نئے عنوانوں کا اعلان کیا ہے ۔ ہمیں امید ہے کہ اس اعلان کے مطابق سب پیامی مقررہ تاریخ تک اپنے مضمون بھیج دیں گے ۔

جوں جوں پیام تعلیم کی مقبولیت بچوں میں زیادہ ہورہی ہے ۔ ہمارا کام بڑھتا جارہا ہے ۔ اس بوجھ کو ہلکا کرنے اور پھر تمھاری سہولت کے لئے یہ طے ہوا ہے کہ انعامی مقابلوں کا کام محترمہ آپاجان آیندہ سے اپنے ہاتھ میں لے لیں گی ۔ اس لئے اس سلسلے میں انعامی مقابلے کے مضمون، تصویریں وغیرہ بھیجنا ہوں یا خط کتابت کرنا ہو تو آپاجان سے کرو ۔

اگلے سال سے پیام تعلیم کی ترقی کے لئے بہت اچھی تجویزیں سوچی گئی ہیں اللہ نے چاہا تو جنوری سے ان پر عمل ہوگا ۔

بدر الدین صاحب حسینی (بی اے جامعہ) کا ذکر کئی مرتبہ پیام تعلیم میں آچکا ہے۔ یہ پیام تعلیم کے پرانے مضمون نگار ہیں۔ جامعہ ملیہ سے بی اے کرنے کے بعد یہ عربی پڑھنے کے لئے مصر تشریف لے گئے تھے۔ وہاں وہ مشہور عربی مدرسے ازہر میں داخل ہوگئے۔ اب کئی مصری اخباروں اور خود اُن کے خط سے معلوم ہوا کہ جامعہ ازہر سے وہ نہایت امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے ہیں۔ ہم اس کامیابی پر انھیں اپنی جامعہ اور پیامی بچوں کی طرف سے مبارک باد دیتے ہیں۔

مولانا سعد الدین صاحب انصاری (ندوی جامعی)

جامعہ میں عربی اور اسلامیات کے استاد ہیں۔ مولانا اعلیٰ تعلیم کے لئے بہت دنوں سے مصر جانا چاہتے تھے بارے اب اس کا موقع آیا اور آپ اس مہینے (اکتوبر) مصر تشریف لے گئے۔ مولانا بھی جامعہ ازہر میں داخل ہوں گے۔

مولانا جامعہ میں بہت ہر دل عزیز تھے اسی لئے جامعہ والوں کو آپ کی جدائی کا دکھ ہوا۔ رخصت کے وقت جامعہ قرول باغ اور جامعہ نگر اوکھلا کی مختلف انجمنوں۔ جناب شیخ الجامعہ اور مولانا کے دوستوں کی طرف سے ان کے اعزاز میں دعوتیں کی گئیں۔ اور ان کو اسی طرح رخصت کیا گیا جس طرح ایک عزیز بھائی اور مخلص دوست کو رخصت کیا جاتا ہے۔

باغ کی تقسیم

ایک چھوٹا سا معمّا ہے۔ حل کروگے؟ یہ کچھ ایسا آسان تو نہیں پر کوشش کرو تو حل کر ہی لوگے۔ ایک شخص کے چار بیٹے تھے۔ ایک مکان تھا اور ایک باغ۔ وہ مرگیا۔ مکان میں تو وہ چاروں کے چاروں رہتے ہی تھے ہاں باغ انھوں نے برابر برابر تقسیم کرلیا۔ بائیں ہاتھ کی تصویر میں کالا حصہ تو مکان ہے اور سفید حصہ باغ ہے۔ اب بتاؤ اس باغ میں چار برابر برابر حصے کیسے تقسیم ہوں گے۔ سمجھ میں نہیں آیا؟ اچھا سیدھے ہاتھ کی تصویر دیکھو کس آسانی سے بٹ گیا؟ اب تم اپنے دوست کے سامنے اسے پیش کروگے تو جب تک اس کا حل نہیں بتادوگے وہ پریشان ہی رہے گا۔
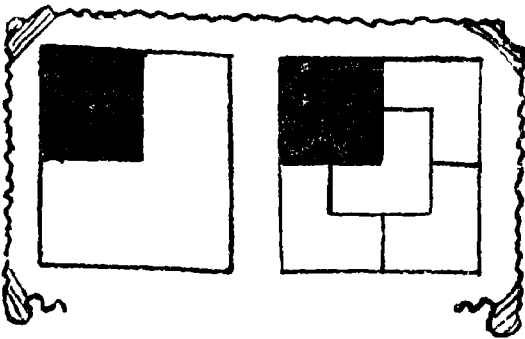
کوئی ایک سال ہوا برادرِ مکرم مولوی شفیع الدین صاحب نیرؔ جامعی سے سال گرہ نمبر کے لئے نظمیں لکھنے کی درخواست کی گئی۔ نیرؔ صاحب نے ہماری درخواست منظور فرمالی تھی اور نظمیں لکھنا شروع کردی تھیں لیکن وقت پر مکمل نہ ہو پائیں۔ اب اس نمبر کے لئے انھوں نے ہمیں مرحمت فرمائی ہیں۔ ان نظموں پر انھوں نے ایک سال تک محنت کی ہے جبھی تو یہ اتنی اچھی ہیں۔ امید ہے کہ بچے بھی انھیں بہت پسند کریں گے اور زبانی یاد کرلیں گے۔ اور بڑے بھی اپنے بچوں کو یہ پیاری نظمیں زبانی یاد کرنے کی ترغیب دیں گے دوسری نظم کہیں آگے شائع ہورہی ہے۔ (ایڈیٹر)

اللہُ اکبر

اللہُ اکبر — اللہُ اکبر
اللہُ اکبر — اللہُ اکبر
اللہ اپنا سب سے بڑا ہے — اُس کے ہی آگے جھکنا روا ہے
جو کچھ کیا ہے، اُس نے کیا ہے — جو کچھ دیا ہے، اُس نے دیا ہے
اللہُ اکبر — اللہُ اکبر
اللہُ اکبر — اللہُ اکبر
چاند اور تارے اُس نے بنائے — پھولوں سے گلشن اُس نے سجائے
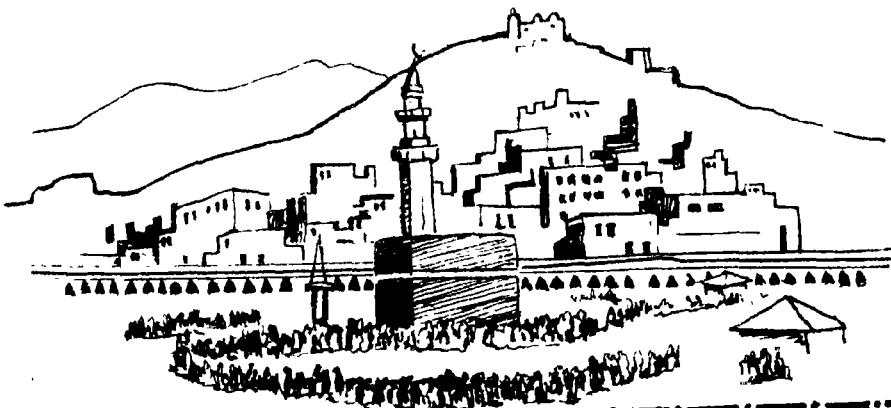
چشمے نکالے ، دریا بہائے — کیا کیا سہانے جلوے دکھائے
اللہ اکبر — اللہ اکبر
اللہ اکبر — اللہ اکبر

سب سے انوکھی ، ہے ذات اُس کی — سب سے نرالی ، ہے بات اُس کی
رحمت سب پر دن رات اُس کی — ہے عام گھر گھر خیرات اُس کی
اللہ اکبر — اللہ اکبر
اللہ اکبر — اللہ اکبر

بھائی بہن اور ماں باپ بخشے — جنت بنا گھر ان کے سبب سے
دوزخ تھی دنیا جو یہ نہ ہوتے — ہیں عیش سارے دم سے انہی کے
اللہ اکبر — اللہ اکبر
اللہ اکبر — اللہ اکبر

عقل اور خرد کی نعمت عطا کی — علم اور ہنر کی دولت عطا کی
محنت کی ہم کو عادت عطا کی — لا تقنطوا کی آیت عطا کی
اللہ اکبر — اللہ اکبر
اللہ اکبر — اللہ اکبر

اسلام بخشا ، ایمان بخشا — فرمان اپنا ، قرآن بخشا
احمد سا مرسل ، ذی شان بخشا — بخشش کا پورا سامان بخشا
اللہ اکبر — اللہ اکبر
اللہ اکبر — اللہ اکبر

اللہ اوّل[۱۸] — اللہ آخر[۱۹] — اللہ باطن[۲۰] ، اللہ ظاہر[۲۱]

اللہ حاضر[۲۲] — اللہ ناظر[۲۳] — اللہ حافظ[۲۴] ، اللہ ناصر[۲۵]

اللہ اکبر — اللہ اکبر

اللہ اکبر — اللہ اکبر

(۱) اللہ اکبر۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔

(۲) خیرات۔ بھلائی

(۳) جنّت۔ بہشت۔ جنّت بننا۔ آرام اور خوشی حاصل ہونا۔

(۴) دوزخ۔ جہنّم۔ دوزخ ہونا۔ دُکھ کی جگہ ہونا۔

(۵) عیش۔ آرام

(۶) عقل۔ سمجھ

(۷) خرد۔ سمجھ

(۸) عطائی۔ بخشی۔ دی

(۹) لاتقنطوا۔ قرآن شریف کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو۔

(۱۰) آیت۔ قرآن شریف کا ایک جملہ

(۱۱) اسلام۔ مذہب اسلام

(۱۲) ایمان۔ اللہ اور اس کے رسول کو دل سے ماننا

(۱۳) فرمان۔ حکم

(۱۴) قرآن۔ قرآن شریف۔ ہم مسلمانوں کی مذہبی کتاب۔ جس میں بھلائی کے کام کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور برائی کے کاموں سے روکا گیا ہے۔

(۱۵) احمدؐ۔ محمدؐ۔ ہمارے رسول کا دوسرا نام۔

(۱۶) مُرسل۔ پیغمبر۔ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا۔ ہم مسلمان اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے ہم کو سیدھے راستے پر چلانے کے لئے دنیا میں تشریف لائے تھے۔

(۱۷) ذی شان۔ شان والے

(۱۸) اوّل۔ سب سے پہلا۔ یعنی جب کوئی چیز بھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ تب بھی خدا موجود تھا۔

(۱۹) آخر۔ یعنی جب ہر چیز مٹ جائے گی تب بھی خدا رہے گا۔

(۲۰) باطن۔ چھپا ہوا۔

(۲۱) ظاہر۔ ہر چیز میں نظر آنے والا۔

(۲۲) حاضر۔ موجود

(۲۳) ناظر۔ دیکھنے والا۔

(۲۴) حافظ۔ حفاظت کرنے والا

(۲۵) ناصر۔ مدد کرنے والا۔ اوّل سے لے کر آخر تک سب خدا کے نام ہیں۔

جگ بیتی

از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

پیام بھائیوں کو یہ سال نامہ مبارک ہو۔ پچھلے سال نامے کو نکلے پورا ایک برس ہوتا ہے۔ تم نے اس سال میں بہت کچھ دیکھا، سُنا، سیکھا ہوگا۔ وہ زمانہ جب تم جوان ہوکر دنیا کا کام سنبھالوگے ایک برس اور قریب آگیا۔ شاید اسی لئے پیامِ تعلیم کے اڈیٹر صاحب مجھ سے کہتے ہیں کہ تمھیں بتاؤں کہ ایک سال میں اس دنیا پر کیا گذری جس کی باگ کچھ دنوں بعد تمھارے ہاتھ میں آئے گی۔

یوں تو دنیا خاصی بڑی جگہ ہے، نہ جانے اس پر اس زمانے میں کیا کیا گذری ہوگی۔ اس سب کا ذکر تو مشکل ہوگا، اور سچ یہ ہے نہ مجھے اس سب کی خبر ہے نہ کسی اور کو۔ ہاں تھوڑی سی ایسی باتیں جو دنیا کو یاد رہیں گی اور تمھیں معلوم ہونی چاہئیں، لکھتا ہوں۔

نہ جانے تمھارے استادوں نے تمھیں یہ بات بھی بتائی ہے کہ نہیں کہ تمھارے پیدا ہونے سے پہلے آج سے کوئی ۲۳ برس ہوئے اس دنیا کے بسنے والوں کو کچھ جنون سا ہوگیا تھا۔ اور یہ چار برس تک ایک دوسرے کا گلا کاٹتے رہے تھے۔ قوموں کی قومیں ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اپنا سارا زور لگا رہی تھیں۔ اور اس دنیا میں، جس میں تم پیدا ہونے والے تھے، خون کے دریا بہا رہی تھیں اور اس سے نفرت کے پودوں کو سینچ رہی تھیں۔ لڑتے لڑتے جب تھک گئیں تو صلح ہوئی۔ کروڑوں نوجوانوں کا خون بہنے کے بعد صلح ہوئی تھی، مگر اس میں بھی دل صاف نہ ہوئے۔

تم کو ٹھیک معلوم نہ ہوکہ اس زمانے میں کتنے لوگ اس جنوں میں گرفتار ہوکر میل جول سے رہنے سہنے کی بجائے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے تھے اور کتنے تندرست جوان، اپنی ماؤوں کی آنکھ کے تارے اپنے خاندانوں کے سہارے، دنیا کا کام چلانے والے موت کے گھاٹ اُتر گئے اور کتنے زخمی اپاہج ہوگئے۔ ہاں اگر تمھیں یہ معلوم نہ ہو تو ذرا یہ تصویریں دیکھو۔

پہلی تصویر میں ہر ملک کے وہ آدمی دکھائے ہیں جو فوجوں میں بھرتی ہوکر دوسرے ملکوں کے لوگوں

جن سے اُن کا اپنا کوئی ٹنٹا نہ تھا، جن میں سے کسی کو یہ نہ جانتے تھے نہ پہچانتے، بس قتل کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ تصویر کا ایک ایک آدمی پس سمجھو کہ دس لاکھ کے برابر ہے۔ دوسری تصویر میں دکھایا ہے کہ ان دیوانوں میں سے کتنے مارے گئے اور کتنے زخمی ہوئے۔ اس تصویر میں بھی ایک ایک آدمی دس دس لاکھ کے برابر ہے۔

ذرا دھیان تو کرو کیسی دیوانگی تھی! ایک خدا کے بندے، ایک دنیا کے باشندے اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ مگر خیر وہ تو جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اس پر اب کیا روئیے۔ خیال تھا کہ اس مصیبت کے بعد دنیا والوں کی سمجھ کچھ ٹھیک ہو گئی ہوگی اور یہ امن چین سے مل جل کر رہنے کے طریقے سوچیں گے اور اپنے جھگڑوں ٹنٹوں کو بھلے مانسوں کی طرح صلح صفائی سے طے کر لیا کریں گے۔

مگر بھائی صلح صفائی سے جھگڑے تب ہی چکتے ہیں کہ دل صاف ہوں۔ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، کوئی کسی کا حق نہ مارے۔ مگر کیا کیجئے انسان کی بدنصیبی کو کہ اس خون کے غسل کے بعد بھی اس نے اپنے گناہوں سے توبہ نہ کی۔ اب بھی بس یہی فکر ہے کہ کسی غریب کو دبا لوں، کمزور کو ابھرنے نہ دوں، دوسرے کا حق چھین لوں، اور جب اپنے سیدھے سادے ساتھیوں کو مذہب کا، وطن کا، نسل کا، واسطہ دے دے کر دیوانوں کی طرح لڑا سکوں اور اپنا اُلّو سیدھا کر سکوں لڑاؤں اور اپنا کام بناؤں۔

یہی بات تو ہے کہ اس بڑی جنگ کو ختم ہوکر (۱۵) برس ہوتے ہیں مگر یہ سال سب جو گذرا اس میں دنیا کا کلیجہ بس دھڑکتا ہی رہا کہ جنگ بس اب چھڑی اور تب چھڑی۔ اور اس کا ڈر ہی نہیں رہا۔ واقعی دنیا میں جنگ ہوئی بھی اور خون بھی بہا۔ ہاں، پچھلی لڑائی کی تھکاوٹ کی وجہ سے ابھی اس لڑائی کی نوبت نہیں آئی جس میں ساری دنیا بس خون کی ایک جھیل بن جائے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ پچھلی جنگ میں جن کا پیٹ کچھ بھر گیا ہے اور جنھوں نے اِدھر اُدھر سے کچھ دبا لیا ہے وہ تو اس وقت بگلا بھگت بنے ہوئے امن کی مالا جپتے ہیں۔ اور جن کا کچھ چھن گیا یا جنھیں چوروں کی بانٹ میں اتنا نہیں ملا جتنا وہ چاہتے تھے وہ اپنا
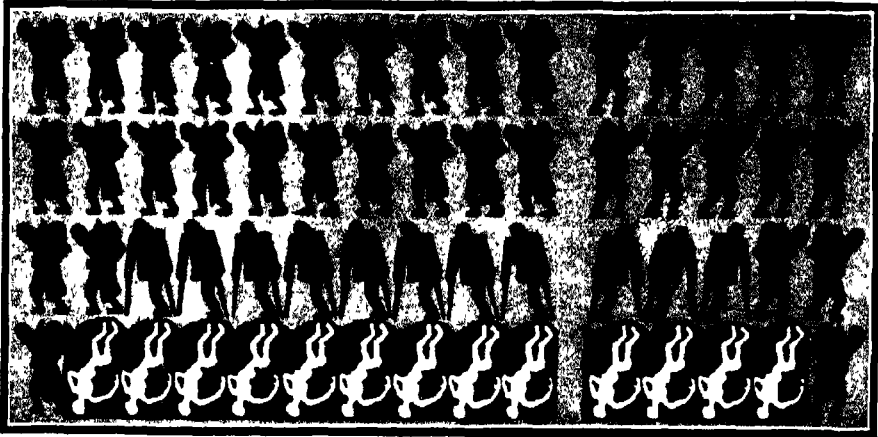
دوسری تصویر جس کا ذکر صفحہ ۴۱۲ پر آیا ہے مردوں کی ھڈیاں ھیں - زخمی بیساکھیاں
لگائے ھیں اور باقی تھکے ماندے گھروں کو واپس آنے والے ھیں- ایک ایک
تصویر دس دس لاکھ کی ھے

Calcutta Art Press Delhi
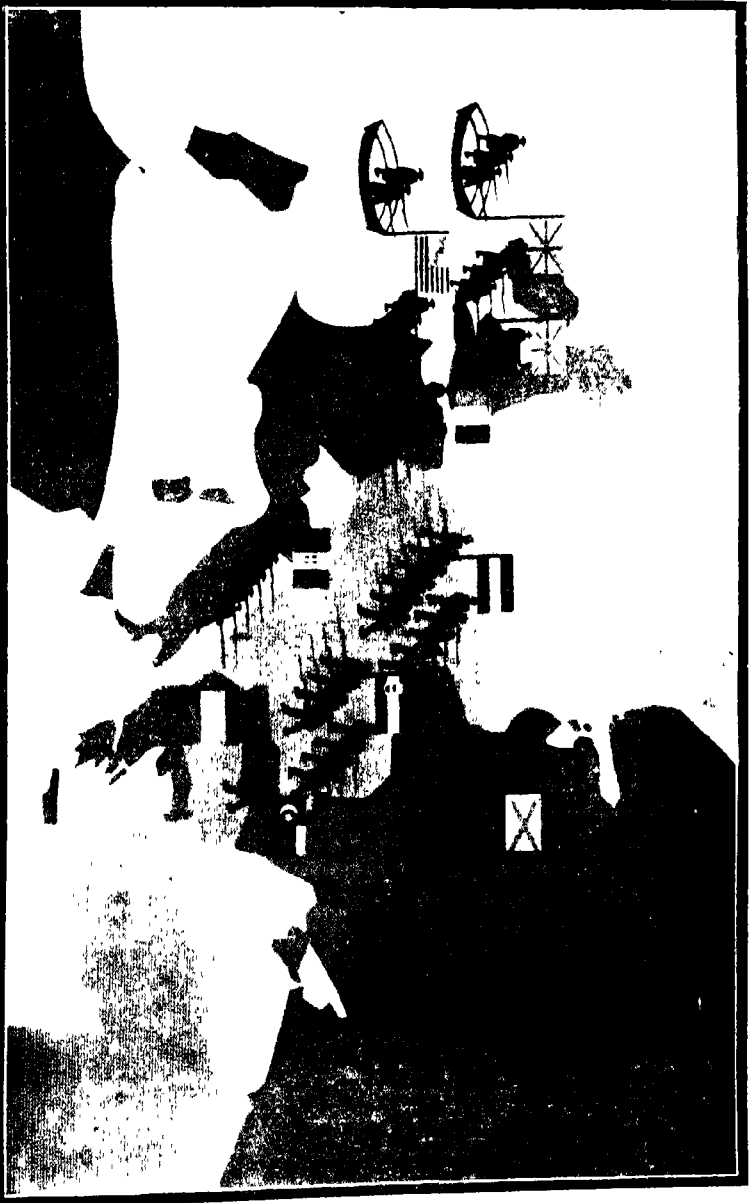
پہلی تصویر جس کا ذکر صفحہ ۴۱۱ پر ہے۔ ہر ملک سے جو فوج اس لڑائی میں شریک ہوئی تھی وہ اس سے معلوم ہوتی ہے۔

گھر بڑھانے کے لئے دوسروں کے گھر دبانے کی فکر میں ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ غیر مطمئن تو جرمنی ہے۔ اور اس کی بے اطمینانی نے یورپ کے امن کو خطرے میں ڈال رکھا ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا پچھلی بڑی جنگ میں ایک طرف یہی جرمنی تھا اور اس کے ساتھی۔ دوسری طرف فرانس تھا اور اس کے حمایتی۔ فرانس کی حمایت میں انگلستان اور انگلستان ہی کیا یوں سمجھو ساری دنیا قوموں کی آزادی کا واسطہ دے دے کر اپنی حریف سلطنت آسٹریا ہنگری کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ جرمنی کا جنگی بیڑا ختم کر دیا، فوج اتنی گھٹا دی کہ نہ ہونے کے برابر، نوآبادیاں سب چھین لیں، تاوان اتنا باندھ دیا کہ ادا ہی نہ ہونے پائے۔ اور یہ سب کچھ آزادی اور امن اور جمہوریت کو دنیا میں محفوظ کرنے کے نام پر۔ مگر دل میں کپٹ تھا، خود غرضی تھی؛ نیت بری ہو تو کام کیسے اچھا ہو۔ وہی ہوا جو ایسے

تھی۔ جرمنی ہارا - ہار تو بُری ہوتی ہی ہے، پر جیت بھی سب کو نہیں پچتی۔ اُسی کو راس آتی ہے جو اس کے نشے میں آپے سے باہر نہ ہو جائے۔ مگر اس جنگ میں جیتنے والوں نے جیت کے نشے میں یہ چاہا کہ ہارے ہوؤں کو ایسا دبائیں کہ یہ پھر سر ہی نہ اُٹھا پائیں۔ حال میں ہو سکتا تھا۔ آج نہ آزادی ہے، نہ جمہوریت نہ امن۔ اس صلح کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی میں بے کاری بڑھی، کوئی دس لاکھ آدمی بے کار ہو گئے، کوئی ے لاکھ لڑکے جوان ہوئے اور کام کاج کے لائق تو کام نہ رہا۔ کالجوں سے جو نوجوان سندے لے کر نکلتے اُن

میں سے سو میں ساٹھ کو کہیں کام نہ ملتا۔ ۱۶ سے ۳۰ سال تک کی عمر کے جتنے نوجوان تھے اُن میں سے آدھے بالکل بے کار رہنے لگے۔ اسی بے اطمینانی میں انھیں ایک آدمی ملا جس نے انھیں بتایا کہ تم بے قصور ہو، تم پر مصیبت اوروں کی بے ایمانی کی وجہ سے ہے، میرا ساتھ دو، میں سب کچھ کر دوں گا۔ مگر میرا کہا ماننا، میری سی سوچنا میری سی کہنا، جس نے خلاف زبان کھولی اُسے ختم کر دوں گا۔ یہ شخص ہٹلر

تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انھوں نے اسے اگوا بنا دیا۔ اسے طاقت ملی تو اس نے اپنے مخالفوں کو ایک ایک کر کے ختم کیا، معاہدوں کو توڑا، ۶ لاکھ کی فوج بنائی، بیڑہ بنایا، ہوائی جہاز بڑھائے

غلامی کے امن کی ہنسی اُڑائی، جنگ پر سب کو تیار کیا۔ ملک اور نسل کو خدا بنا دیا۔ اب یہ کبھی اپنی نوآبادیاں واپس مانگتا ہے، کبھی پولینڈ پر غراتا ہے کہ میرا بندرگاہ ڈانزگ تمھارے پاس ہے اسے واپس لوں گا۔ کبھی لتھوینیا کو دھمکاتا ہے کہ میمل میرا ہے تم کیسے دبائے بیٹھے ہو۔ روس کو صلواتیں سناتا ہے اور اس فکر میں ہے کہ بلقان کے ملکوں میں اپنا اثر جمالے اور رومانیہ کو اپنی طرف ملالے تو روس پر

مُکّے کی پرستش!

دھاوا ہی بول دے۔ غرض سارا یورپ اس سے عذاب میں ہے۔ جیسے شیشے والے کی دوکان میں کوئی باؤلا گھس آئے!

یورپ میں دوسرے مارتے خاں اٹلی

جاپانی ہوا باز چینی فوجوں پر بم گرا رہے ہیں

Calcutta Art Press Delhi

جبنی ' جاپانی ہوائی جہازوں پر بم پھینک رہے ہیں

نکلے ہیں۔ جس سے دیکھو بھڑے جاتے ہیں۔ ان کا سردار مسولینی بھی نرالا آدمی ہے۔ پہلے مزدوروں کا ساتھی تھا، موقع دیکھا تو مال داروں سے مل گیا۔ اپنے مخالفوں کو چن چن کر ختم کر دیا اور ساری طاقت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اب اس قوت کو ہاتھ میں رکھنے کے لئے برابر جنگ کا قصیدہ پڑھتا ہے، امن پسندوں کو بھنڈی بتاتا ہے، نوجوانوں کو جوش دلا دلا کر قربانی پر تیار کرتا ہے اور انھیں ایک بڑی سلطنت کا خواب

کر دی اور فتح کر لیا۔ انگریز اور کوئی ۵۰ قومیں اس کی مخالفت کرتی رہیں مگر اسے جو کرنا تھا وہ اس نے کر لیا۔ اب یہ اپنی فوجی قوت بڑھا رہا ہے، بڑے کو طاقت ور بنا رہا ہے۔ جس سے انگریز بھی پریشان ہیں۔ اور اور لوگ بھی۔

ان دونوں میں ہٹلر اور مسولینی میں آج کل خوب گاڑھی چھنتی ہے۔ دونوں نے مل کر اسپین میں عجیب فتنہ بپا کر رکھا ہے۔ وہاں کی حکومت

دکھاتا ہے۔ یہ پچھلی لڑائی میں جیتنے والوں کے ساتھ تھا، پر بانٹ میں اسے پورا حصہ نہ ملا۔ اس پر بھپرا ہوا تھا۔ غراتے غراتے آخر کو منہ مارا۔ افریقہ میں ایک پرانی حکومت تھی حبش کی۔ اس سے خواہ مخواہ جھوٹ موٹ کا جھگڑا مول لے کر اس پر چڑھائی

مزدوروں اور عام لوگوں کی حکومت تھی۔ انھیں ڈر ہوا کہ ان کا میل کچھ روس سے ہوگا، کچھ فرانس سے ہوگا، شاید انگریزوں سے بھی ہو۔ چلو اسے ختم کرو۔ وہاں کے فوجیوں اور مال داروں اور پادریوں کو روپیہ دے کر اور فوجی مدد کا وعدہ کر کے حکومت

کے خلاف کھڑا کر دیا، بغاوت کرادی اور باغیوں کی مدد کے لئے اپنے ہزاروں سپاہی بھیج دئے۔ سینکڑوں ہوائی جہاز پہنچا دئے۔ اور وہاں بھائیوں بھائیوں کو ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا اور وہ جھگڑا شروع کرایا جو ختم ہی ہونے میں نہیں آتا

ادھر ایشیا میں انھیں کے کچھ بھائی بند سے جاپان صاحب ہیں۔ ان کا دانت چین پر ہے۔ کچھ دن پہلے چین کا ایک بڑا سا صوبہ منچوریا اس نے دبالیا تھا۔ اب شمالی چین کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے آج کل اس کی لاکھوں فوج چین میں خون بہا رہی ہے اور سینکڑوں جنگی جہاز چین کے بندرگاہوں پر گولہ باری کر رہے ہیں۔ منگولیا کے صوبے پر بھی اس کی نظر ہے۔ ان سب علاقوں پر قبضہ ہوگیا تو اپنے کارخانوں کے لئے یہاں سے سستا کچا مال خرید سکے گا، پھر اپنے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں یہاں بھیج سکے گا، اس کے علاوہ جب روس سے جھڑپ کی نوبت آئے گی، اور یہ ضرور آئے گی، تو اس کی فوج کو ان علاقوں سے روس پر حملہ کرنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ (صفحہ ۱۱۴ پر نقشہ دیکھو تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی)

یورپ والے جاپان کی اس ترقی سے بہت پریشان ہیں۔ مگر کیا کریں۔ اخلاقی وعظ تو بے کار ہے، یہ خود کون بڑے پرہیزگار ہیں جو دوسروں کو نصیحت کریں۔ طاقت ہوتی روکتے اور خود چین کا شکار کرتے۔ مگر آپس کے جھگڑوں نے بے دم کر رکھا ہے، ٹک ٹک دیکھتے ہیں اور دم نہیں مارتے۔ چین کمزور ہے۔ مگر اس کے نوجوانوں کو جوش آگیا ہے، قومی عزت نے انھیں اُٹھایا ہے، وہ سمجھنے لگے ہیں کہ غلامی بڑی لعنت ہے۔ اس لئے ساز و سامان کی کمی کے باوجود، جاپان سے لڑنے کو کھڑے ہوگئے ہیں۔ مانا کہ کمزور ہیں، مانا کہ ہار جائیں۔ مگر آزادی کو بچانے میں موت آئے تو وہ بے غیرتی کی زندگی سے ہزار درجہ اچھی۔ آج ہاریں گے تو کل جیتیں گے۔ اللہ میاں کے یہاں دیر ہے، اندھیر نہیں۔

اسی دنیا میں جو آج لڑائی جھگڑے کا گھر بنی ہوئی ہے تمھارا دیس بھی ہے۔ یہ چونکہ دوسروں کے ہاتھ میں ہے اس لئے لڑائی جھگڑا بھی نہیں کرسکتا مگر اس کے دل میں بھی اپنی آزادی کی لگن لگی ہے، یہ چاہتا ہے کہ اپنی آزادی ایک نرالے طریقے سے

واپس لے، لیعنی کسی غیر کے خون کا ایک قطرہ نہ گرائے، مگر اپنی ہمت اور مضبوطی سے ظالموں کا دل بھی بدل دے۔ اسے بھی اس سال کچھ حق خود اپنی حکومت کے ملے ہیں۔ اور کئی صوبوں میں ایسی حکومتیں بنی ہیں جن کا کچھ دن پہلے ذکر بھی کرتے تو لعض لوگ ہنستے۔ مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ کاش وہ دن جلد آئے کہ ہمارا دیس اپنی حکومت کا کام اپنے ہاتھ میں لے اور ایسی حکومت کرے کہ غریب بر امیر کا اور کم زور پر طاقت ور کا زور نہ چلے، سب خوش خوش بھائی بھائی کی طرح رہیں، اور اپنی مثال سے دنیا میں بھی امن چین کی زندگی قائم کرنے میں مدد دیں۔ اس آزاد دیس کی باگ تمہارے ہاتھ میں آئے گی۔ اپنے کو اس قابل بناؤ کہ اسے تھام سکو۔

بس، خدا حافظ۔
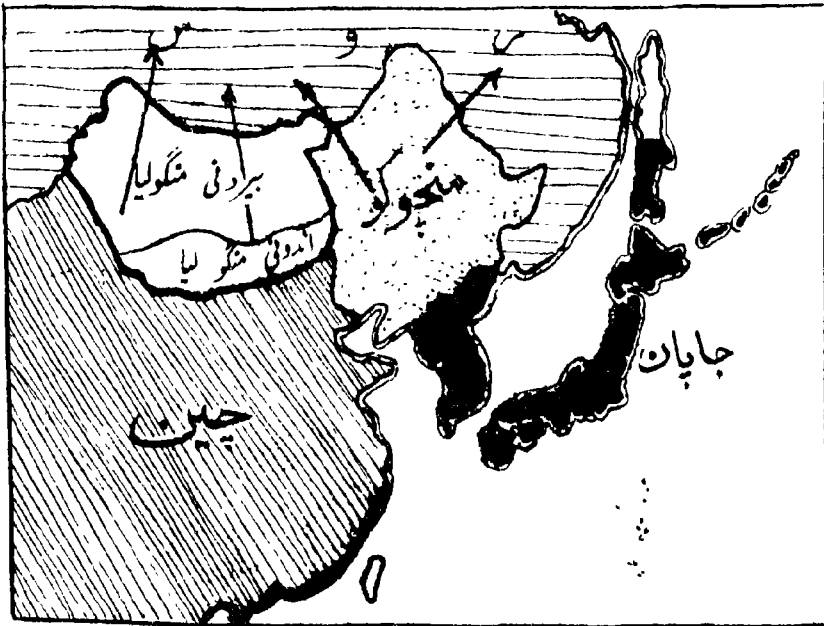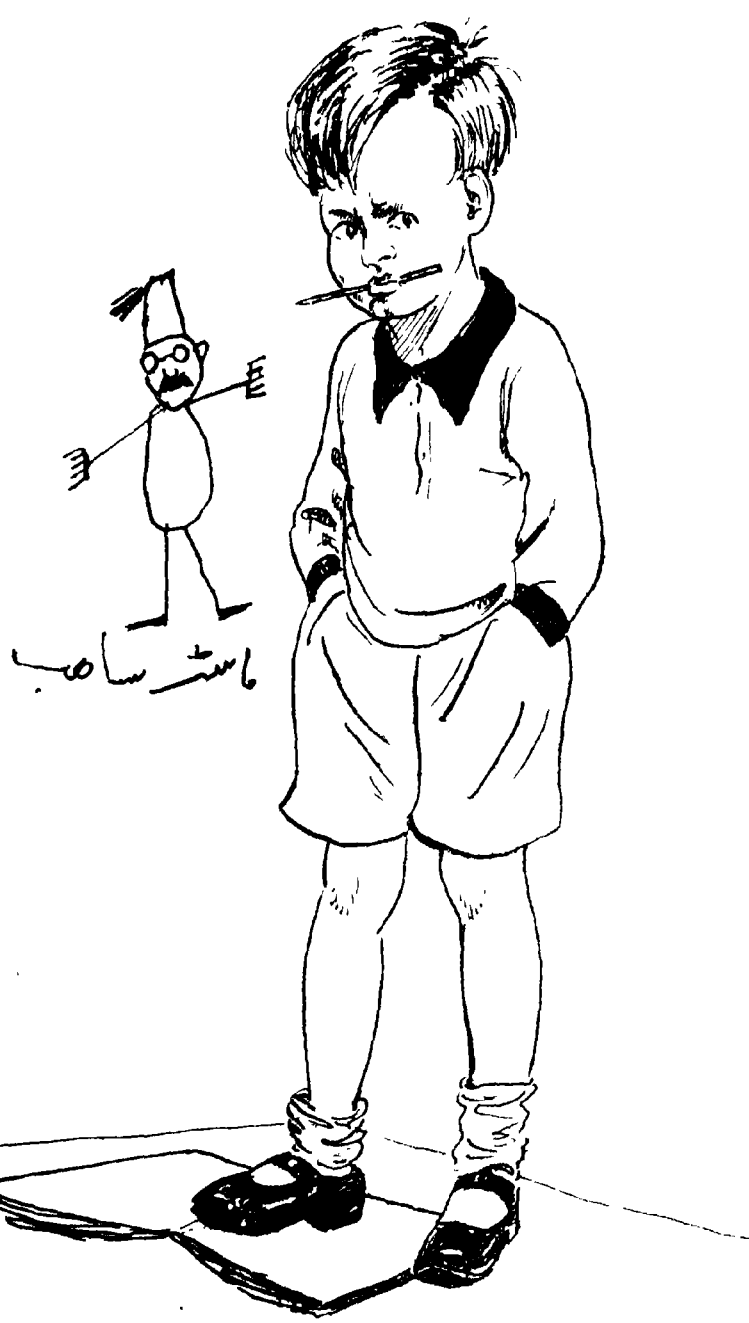
نہیں پڑھتے!!

مختلف ملکوں کے سلام

ریڈ انڈین پائپ بدلتے ہیں۔

فرانسیسی گلے ملتے ہیں۔
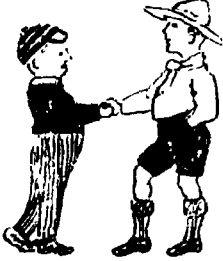
انگریز مصافحہ کرتے ہیں۔

مراکشی کندھا چومتے ہیں۔

عرب سینے پر ہاتھ رکھتے ہیں۔

لیپ لینڈ کے لوگ ناک رگڑتے ہیں

چینی ہاتھ جوڑکر نیچے جھکتے ہیں۔

فلپائن کے لوگ پاؤں اٹھاتے ہیں۔

سنگالی (سلونی) کھجور کی شاخ سے سلام کرتے ہیں

جزیرہ سوسائٹی کے لوگ ناک چھوتے ہیں

برمی چہرہ چھوتے ہیں
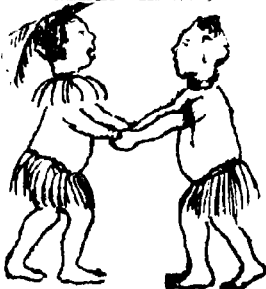
جزیرہ ہوائی کے لوگ انگلیاں چھوتے ہیں
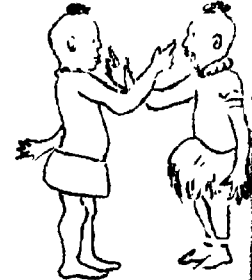
غزالہ

(از جناب غلام عباس صاحب)

لڑکوں کے لئے ایک ایکٹ کا ایک کھیل

(سمندر کے کنارے ایک جھونپڑی۔ جس میں بہت معمولی سامان۔ ایک طرف ایک چھوٹی کوٹھری۔ جس کا صرف دروازہ نظر آتا ہے۔ زمین پر چٹائی بچھی ہے۔ ایک کونے میں مچھلیاں پکڑنے کے جال ٹنگے ہیں۔ پیچھے جھونپڑی کے کھلے دروازے میں سے دور سمندر کا منظر دکھائی دے رہا ہے۔ لہریں ہلکورے لے رہی ہیں اور سورج دھیرے دھیرے ان میں ڈوب رہا ہے

غزالہ چٹائی پر بیٹھی چرخا کات رہی ہے۔ اچانک وہ چرخا چھوڑ دیتی ہے۔ اور سمندر کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

غزالہ۔ اللہ جانے آج سمندر مجھے بار بار کیوں بلا رہا ہے؟۔

(پھر چرخا کاتنے لگتی ہے۔ شمسہ ایک ہاتھ سے سر کو پکڑے داخل ہوتی ہے)

شمسہ۔ امی مجھے لینا۔ درد کے مارے میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

غزالہ (گود میں لینے کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے)۔ میری آنکھ کی پتلی۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک۔ میں نہ کہتی تھی دھوپ میں نہ پھر۔ تیرا پھول سا چہرہ کمھلا جائے گا۔

شمسہ (غزالہ کی گود میں بیٹھ کر) امی نہ جانے کیا بات ہے تمھاری گود میں بیٹھتے ہی میرے سر کا درد کم ہو گیا اب اگر کوئی کہانی سنا دو۔ تو درد بالکل ہی جاتا رہے گا۔

کھیل میں کام کرنے والے:۔

شہاب ۔۔۔ ایک ماہی گیر
غزالہ ۔۔۔ شہاب کی بیوی
قمر ۔۔۔ ان کا بیٹا (عمر ۱۱ سال)
شمسہ ۔۔۔ ان کی بیٹی (عمر ۹ سال)

کھیل کی جگہ:۔
سمندر کا کنارہ

غزالہ۔ (مسکرا کر) اب سمجھی۔ کہانی سننے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا ہے تو نے! شریر کہیں کی۔

شمسہ۔ نہیں امی نہیں سچ مچ بہت درد ہو رہا ہے (سر پکڑ کر) سر پھٹا جا رہا ہے۔ اچھی امی، اب سنا بھی دو کہانی۔

غزالہ۔ (چرخا ہٹا کر) کس کی سناؤں؟

شمسہ۔ اچھی۔ سمندری ہرنیوں کی۔

غزالہ۔ (آہ بھر کر) تم بار بار یہی کہانی کیوں سنتی ہو بیٹی؟۔

شمسہ۔ جتنا مزا مجھے اس کہانی کے سننے میں آتا ہے۔ اور کسی میں نہیں آتا۔ اور پھر اور کہانیوں میں جب میں تم سے کوئی بات پوچھتی ہوں۔ تو تم کہہ دیتی ہو "اللہ جانے یوں ہی ہوگا"۔ لیکن اس کے بارے میں جو کچھ پوچھتی ہوں۔ جھٹ بتا دیتی ہو۔ اس سے کہانی سچی معلوم ہونے لگتی ہے .... امی دیکھو وقت بیتا جا رہا ہے۔ اب سناؤ بھی

غزالہ۔ اچھا تو سنو۔ سمندر میں ہزاروں قسم کی مخلوق بستی ہے۔ ان ہی میں سمندری ہرنیاں بھی ہیں یہ ہرنیاں ہماری زمین کی ہرنیوں سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ ہماری ہرنیوں کے تو سینگ

ہوتے ہیں ۔ اور اُن کے بہن بھی ہوتے اور پھر وہ تیرنا بھی جانتی ہیں۔ ایک مرتبہ سمندر کی تہ میں بہت سی ہرنیاں رہا کرتی تھیں ۔ ان میں ایک ہرنی تھی سب سے خوب صورت اور بھولی بھالی ۔ وہ بہت خوش رہا کرتی ۔ سمندر کے گرم نیلے پانی میں تیرتی اٹکھیلیاں کرتی ۔۔۔۔۔۔۔۔

شمسہ ۔ امی اس کی شکل صورت کیسی تھی ؟

غزالہ ۔ آنکھیں بڑی بڑی اور زمرد کی طرح سبز۔۔۔۔۔

شمسہ جیسی تمھاری ہیں ؟

غزالہ ۔ ہاں ۔ بال. کالے بھونرالے ۔

شمسہ جیسے تمھارے ہیں۔

غزالہ ۔ ہاں ۔ رے بیٹی ۔ وہ ہرنی سارا سارا دن دوسری ہرنیوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ۔ رات ہوتی ۔ تو لہروں کی گود میں لیٹ جاتی ۔ جو اسے تھپک تھپک کر سلا دیتیں ۔ کہتے ہیں ۔ کسی زمانے میں یہ ہرنیاں سمندری پریاں تھیں ۔ مگر سمندر کے بادشاہ نے کسی بات پر ناراض ہو کر انھیں ہرنیاں بنا دیا تھا ۔ اب انھیں سال میں صرف ایک رات کے لئے اپنی پہلی صورت میں آنے اور سمندر کے کنارے ناچنے کی اجازت تھی ۔ یہ ہرنیاں سال بھر بڑی بے چینی سے اس رات کا انتظار کیا کرتیں ۔ اور جب وہ رات آتی ۔ تو خوشی خوشی سمندر کے کنارے جاتیں اور ہرنی کی کھال اُتار کر پریاں بن جاتیں اور رات بھر ناچتی رہتیں ۔

شمسہ آہاہاہا ! وہ سماں بھی کیسا سہانا ہو گا ۔ کیوں امی تم نے اُن پریوں کا ناچ دیکھا ہے ؟

غزالہ ۔ ہاں ! بیٹی یاد تو پڑتا ہے ۔

شمسہ ۔ پھر کیا ہوا امی جان !

غزالہ ۔ ایک دفعہ جب وہ رات آئی ۔ تو وہ خوب صورت بھولی بھالی ہرنی بھی دوسری ہرنیوں کے ساتھ ناچنے گئی ۔ چودھویں کا پورا اور گول چاند نکلا ہوا تھا ۔ سمندر کی ٹھنڈی ٹھنڈی مندی مندی ہوائیں چل رہی تھیں ۔ اور چاندنی میں سمندر کا پانی پارے کی طرح معلوم ہوتا تھا ۔ وہ ہرنی رات بھر خوش خوش سمندر کے کنارے ناچتی رہی ۔ آخر جب چاندنی پھیکی پڑ گئی ۔ ستارے غائب ہو گئے ۔ اور صبح کا سفیدہ نمودار ہونے لگا ۔ تو سب پریاں ہرنی کی کھال اوڑھ سمندر میں جانے لگیں ۔ کیونکہ سمندر کے قانون کے مطابق انھیں سورج نکلنے سے پہلے سمندر کی تہہ میں پہنچ جانا ضروری تھا ۔ بے بیٹی وہ خوبصورت ہرنی اس جگہ گئی ۔ جہاں اس نے اپنی کھال اتار کر رکھی تھی اب جو دیکھتی ہے تو کھال غائب !

شمسہ ۔ لے ہے بچاری ہرنی ! پھر اس نے کیا کیا امی؟

غزالہ اس نے اور اس کی سہیلیوں اور بہنوں نے آس پاس کے تمام غار ، چٹانیں اور گڑھے دیکھ ڈالے مگر کھال نہ ملنی تھی ۔ اور نہ ملی ۔ ناچار وہ سب اسے وہیں کنارے پر چھوڑ سمندر میں چلی گئیں ۔ وہ بچاری اکیلی رہ گئی ۔

شمسہ پھر کیا ہوا امی جان ؟

غزالہ وہ سارا دن اِدھر اُدھر غاروں میں پھرتی رہی

سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ بس چاہتی
تھی کسی طرح اپنے کو مار ڈالے۔

شمسہ ہے ہے!

غزالہ دن جوں توں کرکے کاٹا۔ شام ہوئی تو ایک
ماہی گیر ادھر سے گذرا۔ وہ نوجوان تھا اور حسین۔
اس کے بال گھنگریالے تھے۔

شمسہ جیسے ہمارے ابا کے ہیں؟

غزالہ ۔ ہاں جیسے تمہارے اباکے ہیں۔ وہ اُسے بیاہ
لگا۔ اور اُسے اپنے ساتھ گھر لے گیا۔ اور پھر اس
سے شادی کرلی۔ تھوڑے دنوں میں اللہ نے
انھیں ایک بیٹا دیا.........

شمسہ بھائی قمر جیسا؟

غزالہ ۔ ہاں تمہارے بھائی جیسا۔ اس کے دو سال بعد
ایک بیٹی بھی دی۔....

شمسہ میرے جیسی؟

غزالہ ۔ (پیشانی چوم کر) ہاں میرے دل کا چین۔ تیرے
جیسی۔

شمسہ کیوں امی اب تو وہ سمندری پری اپنا غم بھول
گئی ہوگی؟

غزالہ ۔ ننھی تم ابھی بچہ ہو۔ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتیں
وہ اپنے وطن، ماں باپ اور سہیلیوں کو کیسے بھول
سکتی ہے؟ اگر اسے اب بھی اپنی کھوئی ہوئی کھال
مل جائے تو وہ فوراً ہرنی بن کر سمندر میں چلی جائے
(بے چینی سے دروازے کی طرف جاتی اور باہر جھانکتی
ہے)

شمسہ ۔ اللہ کرے اسے کھال کبھی نہ ملے۔

غزالہ (شمسہ کی طرف مڑکر) ہیں ہیں بیٹی یہ نہ کہو

شمسہ ۔ امی تم یہ بھی تو سوچو کہ اس کے چلے جانے کے بعد
اس کے بچوں کے ابا اور اس کے بچوں کے دل پر کیا
گذرے گی!

غزالہ (بات ٹالتے ہوئے) لے پیاری کہانی تو ہوگئی ختم۔
اب تو پڑکے سورہ

شمسہ امی مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہے۔

غزالہ کس بات کی بیٹی؟

شمسہ کہ یہ کہانی سچی نہیں ہے۔

(غزالہ پیار سے اُسے گلے سے لگا لیتی ہے)

(قمر بھاگا بھاگا آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھال ہے)

قمر ۔ دیکھو اماں جان ہم نے کیا پایا؟

غزالہ کیا ہے میرے چاند؟

قمر (کھال دکھاکر) یہ ایک چٹان کے نیچے پڑی تھی
معلوم ہوتا ہے کسی نے چھپا رکھی تھی۔

(غزالہ غور سے کھال کو دیکھتی۔ اور پھر یک بارگی
اس کی طرف جھپٹتی ہے۔)

شمسہ (چلاکر) بھیا بھاگ جاؤ۔ خدا کے لئے بھاگ
جاؤ۔ کھال امی کے ہاتھ نہ آنے پائے۔ ورنہ کہانی
سچی ہوجائے گی۔

قمر یہ تو کیسی باتیں کررہی ہے شمسہ! دیوانی تو نہیں
ہوئی۔ اماں جان آپ کھال دیکھنا چاہتی ہیں؟
لیجئے دیکھئے۔

(کھال غزالہ کو دیتا ہے!)

غزالہ (خوشی سے چلاکر) آہ میری کھال ۔ میری برسوں کی کھوئی ہوئی کھال !!

قمر (حیران ہوکر) آپ کی کھال؟ یہ آپ کی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ تو کسی سمندری جانور کی ہے

غزالہ اب میں جاسکتی ہوں ۔ سمندر میں ۔ اپنے پیارے گھر میں ۔

شمسہ (روتے ہوئے) امّی! امّی!!

غزالہ سال بھر کے بعد آج وہ رات آئی ہے ۔ جب سمندری ہرنیاں پریاں بن کر ناچیں گی ۔ آج میں بھی اُن کے ساتھ ناچوں گی ۔ اور پھر اُن کے ساتھ ہی چلی جاؤں گی ۔ اپنی سمندری دنیا کو ۔ اپنے پیارے وطن کو ۔

(اب سورج غروب ہوچکا ہے ۔ اور رات کا اندھیرا پھیل رہا ہے)

لے لو وہ آج جلد ہی آگئیں ۔ مجھے بلا رہی ہیں غزالہ آجا ۔ غزالہ آجا ! (سمندر کی طرف منہ کرکے اونچی آواز سے) آتی ہوں ، آتی ہوں ۔

(کھال شانے پر ڈال جانا چاہتی ہے ۔ شمسہ اس کا دامن پکڑلیتی ہے)

غزالہ امّی میں نہیں جانے دوں گی

(شمسہ سے آنکھ نہ ملاتے ہوئے اوپری آواز میں) لڑکی ہٹ جا مجھے جانے دے

(جھٹک کر دامن چھڑا لیتی ہے اور دروازے سے باہر نکل جاتی ہے)

شمسہ پچھاڑیں کھاتے ہوئے امّی ۔ امّی ۔

قمر (پریشانی کی حالت میں) یہ آج تم لوگوں کو ہو کیا گیا ہے ۔ اماں جان کدھر چل دیں؟

شمسہ بھیا ۔ اب وہ کبھی نہ آئیں گی ۔

قمر ۔ تم جھوٹ کہتی ہو ۔

شمسہ ۔ نہیں میں سچ کہتی ہوں ۔ وہ سمندری مخلوق ہیں ۔ وہ بڑی مجبوریوں سے ہمارے گھر میں رہتی تھیں ۔ آہ نہ تم وہ کھال لاتے ۔ اور نہ وہ جاتیں

قمر میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں ۔ تم کہہ کیا رہی ہو ۔

(شہاب مچھلیاں پکڑنے کا جال کندھے پر ڈالے داخل ہوتا ہے)

شہاب ۔ غزالہ ، غزالہ کہاں ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ (بچوں سے) تمھاری اماں کہاں ہیں؟

شمسہ (سسکیاں لے کر) چ.... گئیں

شہاب گاؤں کو؟ (شمسہ سر سے نہیں کا اشارہ کرتی ہے) منڈی کو؟ ۔

شمسہ نہیں ۔

شہاب تو پھر کہاں چل دیں؟

(کبھی شمسہ کا تو کبھی قمر کا منہ تکتا ہے)

قمر ابا جان میں چٹانوں میں سیپیاں تلاش کر رہا تھا تو ایک چٹان کے نیچے سے مجھے ایک پرانی کھال ملی ۔

شہاب (گھبرا کر) چٹان سرخ رنگ کی تھی نا؟

قمر جی ہاں ۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟

شہاب پہلے یہ بتاؤ ۔ وہ کھال کہاں ہے؟

شمسہ امّی لے گئیں ۔

شہاب کب؟

قمر ابھی ، ابھی ۔

شہاب (دوڑ کر دروازے سے نکل جاتا ہے ۔ غزالہ! غزالہ !!

قمر (روتی ہوئی بہن کے پاس جاکر اس کے آنسو پونچھتے ہوئے)۔ شمسہ۔ تو کیوں رو رہی ہے؟ ابا اور امی میں کچھ جھگڑا ہوگیا تھا کیا؟

شمسہ - آہ نہیں!

قمر پھر کیا بات ہوئی؟

(شہاب غم سے سر جھکائے داخل ہوتا ہے)

شہاب افسوس میں دیر میں پہنچا۔ وہ سمندر میں اتر چکی تھی۔

(چودھویں کا پورا اور گول چاند سمندر کی لہروں میں سے ابھرتا ہے اور اس کی کرنیں دروازے کی راہ سے جھونپڑی میں داخل ہوتی ہیں۔)

قمر (باپ کے پاس جاکر) ابا جان خدا کے لئے بتائیے یہ ماجرا کیا ہے؟

شہاب (ٹھنڈا سانس لے کر) بیٹا بارہ برس ہوئے ایک دفعہ رات کو میں سمندر کے کنارے مچھلیاں پکڑنے گیا۔ جب چاند نکلا تو میں نے دیکھا کہ سمندر سے بہت سی ہرنیاں نکلیں۔ اور اپنی اپنی کھال اتار پریاں بن گئیں۔

قمر جیسی کھال مجھے ملی تھی ویسی کھال؟

شہاب ہاں۔ پھر وہ سب پریاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال ناچنے لگیں۔ میں ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور ان کا عجیب وغریب ناچ دیکھنے لگا۔ وہ تھیں تو سب کی سب بڑی حسین۔ مگر ایک کی صورت مجھے بڑی پیاری اور بھولی معلوم ہوئی۔

شمسہ امی کی صورت؟

شہاب ہاں میرا جی بے اختیار چاہا کہ اس کو اپنی بیوی بنالوں۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ آخر ایک تجویز میرے ذہن میں آئی۔ میں گھٹنوں کے بل چلتا۔ اور اپنے کو اُن کی نظروں سے بچاتا۔ اس جگہ پہنچا۔ جہاں اس بھولی بھالی پری نے اپنی کھال رکھی تھی میں چپکے سے اُسے اٹھا لایا اور دور لے جاکر ایک چٹان کے نیچے چھپا دیا۔

قمر اچھا تو یہ کھال آپ نے چھپائی تھی

شہاب ہاں۔ میں نے۔ جب صبح ہونے آئی تو اور سب پریاں تو اپنی اپنی کھال اوڑھ پھر ہرنیاں بن گئیں مگر اس پری کو اپنی کھال نہ ملی اور وہ رونے پیٹنے لگی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل بہت کڑھا۔ ایک دفعہ جی میں آیا بھی کہ اس کی کھال اس کے حوالے کر دوں لیکن پھر خیال آیا کہ نادان کیا تو سمجھتا ہے کہ اس کے بغیر زندہ رہ سکے گا؟ اور میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں کہ اس کی حالت نہ دیکھ سکوں۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں کہ اس کی فریاد نہ سن سکوں۔

شمسہ - آہ بچاری امی!

شہاب - وہ دن بھر ادھر اُدھر ماری ماری پھرتی رہی اور میں بھی دُور دُور رہ کر اس کا پیچھا کرتا رہا۔ جب شام ہوئی تو میں انجان بن کر اس کے پاس سے گذرا۔ اور اس کا حال پوچھا۔ وہ ڈر گئی۔ رونے لگی۔ میں نے اُسے تسلی دی۔ وہ دن بھر کی بھوکی پیاسی تھی میرے کہنے پر ساتھ چلی آئی۔ چند روز کے بعد میں نے اس سے شادی کرلی۔ اس واقعہ کو بارہ برس گذر چکے ہیں

Calcutta Art Press Delhi

جنگل کی سیر

لیکن میں نے اسے آج تک نہیں بتایا۔ کہ تمھاری کھال کا چور میں ہی ہوں ۔ وہ خوشی خوشی گھر کا کام کاج کرتی۔ اور ہم سب سے محبت سے پیش آتی۔ لیکن وطن کی یاد اس کے دل سے نہ مٹی وہ دل ہی دل میں بھاگنے کی تجویزیں سوچا کرتی تھی۔

قمر آپ ناامید نہ ہوں۔ اماں واپس آجائیں گی۔

شہاب وہ اب نہیں آسکتی۔

شمسہ ہماری محبت انھیں کھینچ لائے گی۔

شہاب اُسے ہم سے محبت نہیں ہے۔ وطن سے ہے

(قمر اور شمسہ دروازے کے قریب جاتے ہیں)

قمر (سمندر کی طرف منہ کرکے) اماں جان لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ۔

شمسہ پیاری امی۔ آجاؤ۔ آجاؤ۔

شہاب یوں بلانے سے وہ تھوڑا ہی جائے گی ایک دفعہ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں اب اس نے اپنے کان بند کرلئے ہیں (ٹھنڈا سانس لے کر) آؤ سب سو رہیں۔ قمر بیٹے تم کوٹھری میں جاکر پڑ رہو۔ شمسہ تو میرے پاس آجا۔

(قمر کوٹھری میں چلا جاتا ہے۔ شمسہ باپ کے پاس آکر لیٹ جاتی ہے

شمسہ (سسکیاں لے کر) امی مجھے ہر روز تھپک تھپک کر سلاتی تھیں۔

شہاب (تھپک کر) یوں۔ لے اب سو جاؤ۔

شمسہ ہائے امی۔ (باپ کی گود میں سر رکھ دیتی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے)

شہاب (گود سے سر اُٹھاتے ہوئے۔ بے قراری سے) ننھی

مجھے جانے دو۔ میں اُسے ڈھونڈھنے کی پھر کوشش کرتا ہوں۔

(دروازے کو چوپٹ کھول تیزی سے نکل جاتا ہے)

شمسہ امی.... امی .... امی ......امی (سو جاتی ہے)

(اب چاند آسمان پر بلند ہوچکا ہے اس کی کرنوں سے سمندر کی لہریں جگمگا اُٹھتی ہیں۔ جھونپڑی میں بھی تیز روشنی پھیل جاتی ہے۔ غزالہ دبے پاؤں آتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے کھال کندھے پر ڈال رکھی ہے۔ بار بار پیچھے مڑکر دیکھتی ہے)

غزالہ (جھونپڑی میں داخل ہوکر) میرے پاؤں بھاری ہوگئے ہیں۔ میں ناچ نہیں سکتی۔ آواز بیٹھ گئی ہے۔ گا نہیں سکتی۔ اس بارہ سال کے عرصے میں کیا سے کیا ہوگئی۔ لیکن اب میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ نہیں خود نہیں آئی۔ میرے پاؤں مجھے کھینچ لائے ہیں۔

شمسہ (سوتے میں کروٹ بدلتی اور بڑبڑاتی ہے) امی آجاؤ۔ آجاؤ۔

غزالہ آہ میری بچی!

(لپک کر اس کے پاس جاتی ہے اور اس سے لپٹ جاتی ہے)

شمسہ (جاگ کر) امی تم نے میری آواز سن لی؟ تم آگئیں؟

غزالہ بیٹی میں تمھیں لے چلنے آئی ہوں۔

شمسہ کہاں؟

غزالہ باہر۔ دیکھو وہاں پریاں ناچ رہی ہیں۔

شمسہ مجھے اُن کا ناچ اچھا نہیں لگتا۔

غزالہ سمندر میں چاند بھی اُن کے ساتھ ساتھ ناچ رہا تھا

شمسہ امی دروازہ بند کر دو ۔ سردی سے میرے دانت بج رہے ہیں ۔

(غزالہ دروازہ بند کرنے جاتی ہے شہاب آتا ہے)

شہاب (سخت لہجے میں) تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ تم جانا چاہتی تھیں ۔ بس چلی جاؤ ۔

غزالہ کاش میں جاسکتی ۔ آہ میرے بچے !

شہاب تمھارے بچے ! پھر؟

غزالہ تم ماماکو نہیں سمجھ سکتے ۔

شہاب میرے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی کہ تم ہمیں چھوڑکر چلی جاؤگی ۔

غزالہ میں اپنے وطن کو کیسے بھول سکتی ہوں تمھیں یاد ہیں وہ دن ۔ جب تم مجھے اداس دیکھ کر پہروں میری کھال ڈھونڈھتے رہتے تھے ۔

شہاب تمھاری کھال جسے میں نے خود چھپا دیا تھا ۔

غزالہ آہ تو یہ تم تھے ، تم ! ایسے شریف ....

شہاب تم میرے لئے شرافت سے بڑھ کر تھیں

غزالہ اگر ہماری قوم کو معلوم ہو جاتا ۔ تو تمھیں کبھی جیتا نہ چھوڑتی ....

شہاب تم زندگی سے زیادہ عزیز تھیں !

غزالہ مگر ۔ اب ......

شہاب اب میرے گھر میں تمھارا ٹھکانا نہیں ۔ بس چلی جاؤ ۔

غزالہ (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) سمندری دنیا ... . پانی ... میری قوم ۔ (ٹھہر جاتی اور کچھ سوچ کر پلٹ آتی ہے) نہیں میں اب ان کے پاس نہیں جاسکتی ۔ میری یاد ان کے دل سے مٹ چکی ہے میری بہنیں سمندر کے کنارے کیسی خوش خوش ناچ رہی تھیں ۔ وہ تو سب وہی ہیں ۔ مگر میں بدل چکی ہوں ۔ میں اس گھر کو نہیں چھوڑ سکتی ۔ یہ میرا گھر ہے

شہاب نہیں اب تمھارا اعتبار نہیں رہا کسی دن پھر ایسا ہوگا کہ جب صبح ہماری آنکھ کھلے گی تو تم غائب ہوگی ۔

غزالہ ۔ نہیں اب ایسا کبھی نہ ہوگا ۔ جانتے ہو ۔ میں اب کس لئے یہاں آئی ہوں ؟

شہاب ۔ کس لئے آئی ہو ؟

غزالہ (کھال دیتے ہوئے) اپنی مرضی سے یہ کھال تمھیں دینے ۔ تم اسے ابھی ضائع کر دو ۔ نہ یہ ہوگی ۔ نہ سمندر میں جانے کا خیال مجھے آئے گا ۔

شہاب (خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو کر) آہ تو کیا آخرکار تم میری ہوگئیں؟

(شمسہ اور قمر بھی آجاتے ہیں ۔ چاروں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں)

(پردہ) (ماخوذ)
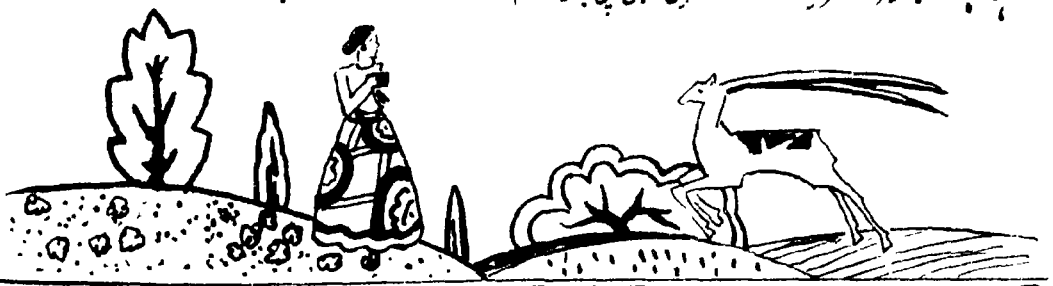
ہم مسلمان ہیں، مذہب ہے ہمارا اسلام

از جناب محمد شفیع الدین صاحب نیرؔ

بندگی ایک ہی آقا کی سدا کرتے ہیں　　　اُس کے فرمان پہ ہم جان فدا کرتے ہیں
اُس کے قرآن میں جو کچھ ہے لکھا کرتے ہیں　　　اُس کے احسان کا ہم شکر ادا کرتے ہیں

ہم مسلمان ہیں، مذہب ہے ہمارا اسلام

پیشوا اپنے محمدؐ ہیں رسولِ عربی　　　نیک اخلاق میں اِن کا نہیں ثانی کوئی
ان کی تعلیم سے دُنیا میں بھلائی پھیلی　　　ان کے صدقے میں ہمیں دولتِ ایمان ملی

ہم مسلمان ہیں، مذہب ہے ہمارا اسلام

ہم میں کچھ فرق نہیں، شاہ کوئی ہو کہ گدا　　　سب برابر ہیں، غلام اس میں ہوں یا ہوں آقا
ہم میں اللہ کے نزدیک فقط ہے وہ بڑا　　　جو ہر اک بات میں اللہ سے ڈرتا ہو سوا

ہم مسلمان ہیں، مذہب ہے ہمارا اسلام

ہم رہیں، رہتا ہے اس بات کا ہر دم ہمیں پاس　　　پاک دل، پاک زباں، پاک بدن، پاک لباس
جانتے ہی نہیں ہم چیز ہے کیا خوف و ہراس　　　کامیابی کی سدا رکھتے ہیں ہر کام میں آس

ہم مسلمان ہیں، مذہب ہے ہمارا اسلام

کسی انسان کو بھی دکھ میں اگر پاتے ہیں　　　چوٹ لگتی ہے وہ دل پر کہ تڑپ جاتے ہیں
اپنا سکھ چھوڑ کے ہم سکھ اُسے پہنچاتے ہیں　　　بے غرض سب کی مدد کرتے ہیں کام آتے ہیں

ہم مسلمان ہیں، مذہب ہے ہمارا اسلام

رہیں پنجاب میں ہم، یا رہیں بنگال میں ہم　　　حیدرآباد میں بستے ہوں کہ بھوپال میں ہم

ہوں جدا رنگ میں یا وضع میں یا چال میں ہم ایک ہی جانتے ہیں آپ کو ہر حال میں ہم

ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام

سب کے سب شوق سے ہم سیکھتے ہیں علم و ہنر خواہ کچھ حال ہو رہتی ہے ترقی پہ نظر

کام کرتے ہیں تو کرتے ہیں بس اپنے بل پر زندگی ہوتی ہے محنت میں مشقت میں بسر

ہم مسلمان ہیں مذہب ہے ہمارا اسلام

(۱) اس بند میں اسلام کی اس تعلیم کی طرف اشارہ ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ نہ عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ دوسرے شعر میں قرآن شریف کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے کہ تم میں سب سے زیادہ بزرگ وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ہو۔

(۲) اسلام نے طہارت یعنی صفائی اور پاکیزگی پر بہت زور دیا ہے۔ مسلمان ہونے کے لئے ظاہری اور باطنی صفائی ضروری ہے۔

(۳) اس بند میں اسلام کی اس تعلیم کی طرف اشارہ ہے کہ تمام بنی آدم ایک کنبہ ہیں۔ ایک کی تکلیف سے دوسرے کو درد محسوس ہوتا ہے۔ اور حاجتمندوں اور دردرسیدوں کی مدد ہم پر فرض ہے۔

(۴) اس بند میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسلمان برطانوی ہندوستان کے باشندے ہوں یا ریاستی ہندوستان کے۔ اور خواہ اُن کا رنگ، اُن کی زبان، اُن کی وضع قطع کتنی ہی جدا ہو۔ بحیثیت مسلمان سب ایک ہیں۔

(۵) اس بند میں اس حدیث کی طرف اشارہ ہے کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے۔
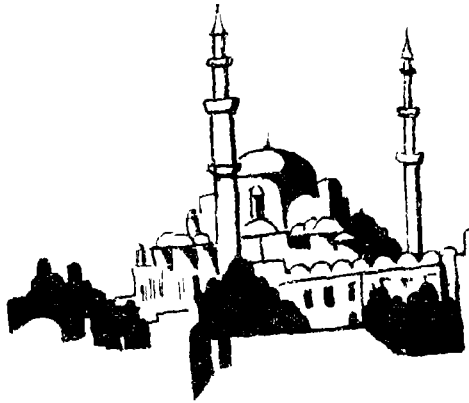
ہوٹل کا ریڈیو

از جناب سید ابو طاہر داؤد صاحب بی ایس سی، لک

(۱)

آہا ریڈیو ـــــ اس کا تو میں دیوانہ تھا۔ لیکن ہماری اماں نہ تو سینما دیکھتی ہیں، نہ ریڈیو سنتی ہیں۔ اور نہ ہوائی جہاز پر چڑھنا پسند کرتی ہیں، اس لئے جب کبھی میں ریڈیو کا ذکر کرتا تھا تو وہ یا تو سروتے سے چھالیاں کترنے لگتی تھیں۔ اور یا عشی بھائی کے لڑکے "شُدری" سے مٹھائی اور دودھ کے عنوان پر گفتگو کرنے لگتی تھیں۔ اُن کے اس برتاؤ سے میں اس قدر مایوس ہو جاتا تھا کہ اللہ میاں سے دعا مانگنے لگتا تھا کہ "خدایا! شکری میاں لوٹ پوٹ کر ایسے ریڈیو بن جائیں کہ جب اماں ان کو گود میں لیں اسی وقت اُن میں سے گیت نکلنا شروع ہو جائیں"۔ خیر یہ تو ناممکن تھا کہ اللہ میاں اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں تبدیلی کریں۔ اس لئے میں نے خود ارادہ کیا کہ کچھ ہو مگر ریڈیو ضرور آنا چاہیے۔ اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ریڈیو آ گیا　　اب آپ سنئے کہ کس طرح :-

پونا میں ہماری ایک دو منزلہ عمارت ہے جس کے اوپر کے حصے میں ہم خود رہتے ہیں۔ اور نیچے بہت سی دوکانیں ہیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ "دگڑو بھائی" جو ہمارا کرایہ وصول کرتے ہیں، ایک دوکاندار سے ناراض ہو گئے اور انھوں نے اقرارنامے کی مدت ختم ہونے کے بعد دوکان کو کھڑے کھڑے خالی کرا لیا۔ اس کے بعد لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ ان میں ایک ایرانی بھی آیا جو وہاں ایک ہوٹل کھولنا چاہتا تھا۔ اور چونکہ "دگڑو بھائی" جاڑے، گرمی برسات تمام موسموں میں ایک درجن پیالی چائے روزانہ کے حساب سے پیتے ہیں اس لئے انھوں نے اس خیال سے کہ اب انھیں ہر پیالی کے لئے چار فرلانگ کا سفر طے کرنا نہیں پڑے گا، اماں کے سامنے ہوٹل کی ضرورت پر ایک لکچر دینا شروع کیا۔ اس ہوٹل والے معاملے میں مجھے بھی دلچسپی تھی، کیونکہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ دنیا بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے اور ماسٹر صاحب کے خیال کے مطابق کچھ دنوں میں تمام ہوٹل "ریڈیو خانے" بن جائیں گے اس لئے دگڑو بھائی کے ساتھ ہی ساتھ میں نے بھی ہوٹل کی تعریف میں قصیدے پڑھنا شروع کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اماں راضی ہو گئیں۔ چنانچہ ہوٹل کھل گیا۔ اور چند دن کے انتظار کے بعد وہ دن بھی آیا کہ اس ایرانی نے مجھے ریڈیو لگنے کی خوش خبری دی۔ وہ دیکھئے ہماری چھت کے اوپر دو لمبے لمبے بانس لگا دئے اور ان کے سروں کو ایک تار کے ذریعے جوڑ دیا گیا۔ پھر وہی تار لاکر ریڈیو کی مشین کے ساتھ لگا دیا گیا۔ لیجئے ریڈیو شروع ہو گیا۔

بمبئی سے بولتے ہیں۔ اور دہلی سے خبر دیتے ہیں مہین، موٹی، نازک، شیریں، جھرجھری، ہموار اور اونچی نیچی آوازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کبھی سریلے گیت ہیں تو کبھی دہلی سے گاؤں والوں کا پروگرام۔ کبھی دھواں دھار تقریریں تو کبھی میٹھی میٹھی خبریں۔

غرض چھٹیوں کا زمانہ اسی مشغلے میں گذرا۔ دن اور رات یہی کام کرتا تھا کہ بس ریڈیو سنا کرتا تھا اور وہ ایرانی بھی عجیب شوقین آدمی تھا کہ صبح سے رات کے گیارہ بجے تک

مشین چلائے ہی جاتا تھا۔ ہوتے ہوتے اس کا ہوٹل اس قدر مشہور ہوگیا کہ لوگ ریڈیو سننے کے شوق میں دن بھر چائے کی پیالیاں اڑایا کرتے تھے اور اس طرح اس کی بڑی بکری ہوتی تھی۔

اب سنئے کہ دو مہینے کے بعد مجھے ریڈیو ایک پرانی چیز معلوم ہونے لگا۔ اس کی وہی آواز جو چند روز پہلے میٹھی معلوم ہوتی تھی اب کانوں کے پردے پر ہتوڑے بن کر لگنے لگی۔ چونکہ ہمارے مکان کے بالکل ہی نیچے بجا کرتا تھا۔ اس لئے دن رات سوائے اس کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی ہی نہیں دیتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ میں اس کی وجہ سے ذرا دیر بھی پڑھ نہیں سکتا تھا۔ اسی عرصے میں بھابی رباب بیمار ہوگئیں اور اس غل شور کی وجہ سے اُن کے سر میں درد رہنے لگا۔ اماں جان بھی عاجز آگئیں اور انھوں نے مجھے اور دگڑو میاں کو نشانہ بنالیا۔ اب ہم مجبور ہوکر ایسا گوشہ تلاش کر رہے تھے جہاں چاروں طرف خاموشی ہی خاموشی ہو اور جس میں ریڈیو کی آواز کو کوئی دخل نہ ہو۔ ایک روز اماں نے اس ایرانی سے کہلوایا کہ تم اپنی مشین دن رات مت بجایا کرو۔ تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ آخر اماں نے ناراض ہوکر اس سے دوکان خالی کرنے کے لئے کہا تو اس نے اقرار نامہ دکھلا کر کہا کہ سال بھر تک آپ مجھے ہٹا ہی نہیں سکتیں۔ یہ سن کر اماں دانت پیس کر رہ گئیں۔ اور جب دگڑو میاں آئے تو اُن پر اس قدر ناراض ہوئیں کہ انھوں نے نوکری چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ اب ہمارے لئے کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کر کرایہ کے مکان میں کیسے جاتے۔ اس لئے ہم دن رات ریڈیو اور ایرانی ہوٹل والے کو کوسا کرتے تھے۔

خدا خدا کرکے عرشی بھائی ستمبر کے مہینے میں علی گڑھ سے آئے اور جب انھوں نے یہ نقشہ دیکھا تو وہ بہت پریشان ہوئے ان کے سامنے اماں نے کہا کہ "ریڈیو کا رسیا یہ کھڑا ہوا ہے۔ یہ سب اسی کی ضد کا نتیجہ ہے۔" عرشی بھائی نے یہ سن کر مجھ سے کہا کہ "آپ کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کیجئے۔ کیوں آپ اس شوق میں اتنے دیوانے ہوگئے تھے کہ گھر کے نیچے ایک ہوٹل کھلوایا اور اس کے نتیجوں پر غور نہیں کیا۔" عرشی بھائی سے میں ڈرتا تو ہوں نہیں۔ اس لئے میں نے انھیں ہنس کر جواب دیا کہ "اگر آپ ریڈیو بند کرادیں تو البتہ میں بہت سی بیٹھکیں لگا سکتا ہوں۔"

"میں کیسے بند کرا سکتا ہوں" انھوں نے غصے کا چہرہ بنا کر کہا۔

"پھر آپ نے سائنس بے کار پڑھی۔" بھابی رباب نے مسکرا کر کہا۔

"ایک ترکیب ہے" بھائی عرشی نے مسکرا کر کہا "آپ اس کو سینڈور کھلا دیجئے۔"

"ریڈیو کو یا ایرانی ہوٹل والے کو۔" بھابی رباب نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"آپ اس بات کو مذاق میں کیوں ٹال رہے ہیں۔" میں نے بے تاب ہوکر کہا۔

"تو پھر کیا کروں" عرشی بھائی نے جواب دیا "بیوقوفیاں تم کرو۔ اور اس کا علاج میں۔ بس اس ایرانی کو بلا کر زہر دے دو۔"

اس وقت تو یہ بات ٹل گئی۔ لیکن اس دن سے عرشی بھائی اکثر اوقات باہر ہی رہنے لگے اور جب کبھی اندر آتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ میں جب ان سے پوچھتا تھا تو مجھے ڈانٹ کر خاموش کر دیتے تھے۔ ان پر جب کبھی

ایسی حالت طاری ہوتی تھی تو میں سمجھ جاتا تھا کہ اب کام بن جائے گا۔ اس لئے میں بھی چپ ہو جاتا تھا۔ ایک دن وہ اپنے ساتھ مزدوروں کے سروں پر کچھ بکس رکھوا کر لائے اور ان کو تیسری منزل پر رکھوا گئے۔ پھر دوسرے روز وہ تمام دن اوپر ہی رہے اور ہم کو سخت تاکید کر دی کہ ان کے پاس نہ جائیں۔ شام کو جب اماں نے نیچے سے بہت آوازیں دیں تو تھوڑی دیر کے لئے آگئے اور چائے پی کر پھر اوپر جانے لگے اتنے میں بھائی رباب نے پوچھا کہ ——
"آپ کون سا عمل پڑھ رہے ہیں۔ علوی یا سفلی"۔

"اس حقیقت کو تم کیا جانو" انھوں نے ہنس کر جواب دیا۔

"کچھ ثبوت دیجئے پھر" بھائی رباب نے کہا۔

"اچھا آج ۸ بجے ریڈیو خود بخود بند ہو جائے گا۔ تب تو مانوگی۔ انھوں نے کہا اور فوراً کھٹ کھٹ کرتے اوپر چلے گئے۔ یہ سنتے ہی میں اچھل پڑا کیونکہ بھائی عرشی کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

---

(۲)

میری نظر دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی طرف تھی۔ سوئیاں آہستہ آہستہ چکر کاٹتی ہوئی جا رہی تھیں۔ جب سات بج چکے تو میں نے ہر پانچ منٹ کے بعد امتحان کے نگران کی طرح وقت کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ ہوٹل میں حسبِ دستور ریڈیو چل رہا تھا۔ دہلی سے درگا بائی ایک غزل گا رہی تھی۔ آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے ہی بیٹھی مجرا کر رہی ہے۔ ادھر منٹ کی سوئی بارہ پر پہنچی۔ گھڑی نے ٹن ٹن آٹھ بجائے اور ادھر یکبارگی ایسا معلوم ہوا کہ درگا بائی کو گاتے گاتے اُچھو لگ گیا ہے چھینکیں آ رہی ہیں اور مرگی کا دورہ شروع ہو گیا ہے۔ لے لیجئے ذرا سی دیر میں دادرا کے اس طرح چیتھڑے بکھر گئے جیسے ہوا کا جھکڑ، پھوس کے چھپر کو ریزہ ریزہ کر ڈالتا ہے۔ دور سے تھوڑی ہلکی آواز سنائی دیتی تھی اور پھر بلند ہوتی تھی کہ یکایک طوفان کا سا دھڑاکا ہوا اور آواز کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"وہ مارا ——" یہ کہتا ہوا میں کھٹ کھٹ کرتا ہوا اوپر پہنچ ہی گیا۔ اور "بھائی جان ریڈیو بند ہو گیا" کہہ کر اندر داخل ہی ہونا چاہتا تھا کہ عرشی بھائی نے کان پکڑ کر ایسی کوک گھمائی کہ مجھے عمر بھر یاد ہی رہے گا۔ کہنے لگے "بے وقوف! کیا اب مجھے پولیس کے حوالے کرے گا۔ خبردار جو بولا" چونکہ بات مناسب تھی اس لئے میں خاموش ہو کر آنسوؤں کو پی گیا۔ اور آہستہ آہستہ زینے سے اترنا شروع کیا کہ بھائی عرشی نے اندر سے آواز دی اور میں منہ لٹکا کر اُن کے سامنے پہنچ گیا۔

میں نے دیکھا کہ اُن کے سامنے بڑی میز پر ایک مشین رکھی ہوئی ہے۔ جس کا ایک حصہ بڑے پہیے کی طرح تھا جس پر بجلی کا تار، پتنگ اُڑانے کی ڈور کی طرح اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ اگر کھولا جاتا تو کئی میل تک پہنچ جاتا۔ اس پہیے کے اوپر ایک سلاخ لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف کسی دھات کی ایک تھالی سی لگی ہوئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تقریباً دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ بھائی عرشی مشین کا بٹن دبا رہے تھے اور سلاخ کے منہ سے بجلی کی ایک بہت بڑی لہر تڑپتی ہوئی نکل رہی تھی ایسا دکھائی دیتا تھا کہ یہ مشین الف لیلہ کے زمانے کا کوئی اژدہا ہے۔ جس کے منہ سے بجلی کے فوارے چھوٹ رہے ہیں اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھیں خوف کی وجہ سے ابل پڑیں

میرا سر چکرانے لگا اور یکایک میرے دماغ میں ایسا خیال آیا کہ ہم اس دنیا میں نہیں ہیں بلکہ آسمان پر کھڑے ہوئے اندرد یوتا کی طرح بجلی کے کوڑے مار رہے ہیں۔

اتنے میں بھائی عرشی کی آواز سنائی دی کہنے لگے۔ "ذرا ہٹ کر کھڑے ہو نہیں تو ایک منٹ میں کام تمام ہو جائے گا۔

دیکھو بجلی کی اتنی لہر ساری دنیا کے آدمیوں کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں۔"

"کیا اسی بجلی کی لہر نے ریڈیو میں گڑبڑی پیدا کردی ہے" میں نے عرشی بھائی سے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔ کہنے لگے "ہاں۔"

"لیکن یہ بجلی، ریڈیو تک کیسے پہنچی۔ کیا آپ نے کوئی تار لگایا ہے؟"

"دیکھ لو —— کیا کوئی تار وہاں تک جاتا ہوا نظر آتا ہے۔"

میں نے دیکھا تو ایسا تار کوئی نظر نہ آیا جس پر مجھے اور بھی تعجب ہوا۔ آخر میں اپنی پرانی عادت کے موافق اُن سے پوچھ ہی بیٹھا —— "ہوٹل کا ریڈیو کس طرح بند ہو گیا۔"

عرشی بھائی نے ایک سگریٹ سلگائی اور اس کا لمبا کش لے کر کہنے لگے —— "تم یہ جانتے ہو کہ ریڈیو کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا "جی ہاں ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے آواز ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے، ٹیلیفون اور ٹیلیگراف میں بھی تو یہی بات ہوتی ہے۔

لیکن ان میں آواز بجلی کے تاروں کے ذریعے پہنچ جاتی ہے اور ریڈیو میں بغیر تار کے۔"

"ٹھیک کہتے ہو —— لیکن یہ تو بتاؤ کہ یہ آواز بغیر کسی ذریعے کے دنیا میں ایک سرے سے دوسرے تک کس طرح پہنچ جاتی ہے۔"

میں نے کہا" اللہ میاں کی قدرت ہے" —— غصہ ہو کر کہنے لگے کہ "ناستانی جی کی طرح اللہ میاں کی قدرت کے پردے میں اپنی جہالت مت چھپاؤ۔ غور کیوں نہیں کرتے۔"

تھوڑی دیر انتظار کر کے کہنے لگے —— "کبھی طبلہ بجتے دیکھا ہے؟"

"جی ہاں"

"بتاؤ اس میں سے آواز کس طرح پیدا ہوتی ہے۔"

"ہم اس کی جھلی پر ہاتھ مارتے ہیں۔"

"تمھارے ہاتھ مارنے سے طبلے کی جھلی میں کیا بات پیدا ہو جاتی ہے؟"

"وہ جھلی تھرتھرانے لگتی ہے۔"

"کیا تم اس تھرتھراہٹ کا ثبوت دے سکتے ہو۔"

میں خاموش ہو گیا۔

کہنے لگے —— "طبلے کی جھلی پر ہاتھ مار کر فوراً اس پر ذرا سا آٹا ڈال دو۔ تم دیکھو گے کہ آٹے کے ذرے فوراً اچھلنے کودنے اور ناچنے لگتے ہیں۔"

میں ہنسنے لگا

کہنے لگے —— "دیکھو طبلہ ہندوستان کا بڑا اچھا ساز ہے۔ اس لئے ہر گانے کی محفل اس کے بغیر سونی رہتی

ہے۔ جس وقت طبلچی اس پر تھاپ مارتا ہے تو ایسی سریلی "تا دھن نا، تا دھن نا" کی آواز پیدا ہوتی ہے کہ لطف آجاتا ہے۔ عرب میں اس کے بجائے دف استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس میں یہ بات کہاں؟ ان دونوں میں فرق جانتے ہو ——؟"
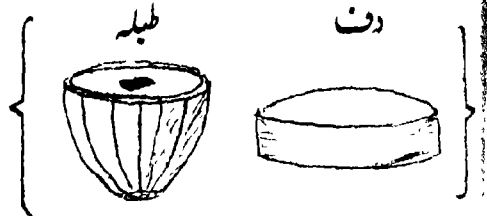
میں نے کہا معلوم ہے۔ طبلے میں جھلی ایک برتن کے منہ پر منڈھی ہوتی ہے۔ اس برتن میں ہوا ہوتی ہے۔ اور جب ہم طبلے پر تھاپ مارتے ہیں تو برتن کی ہوا میں گونج پیدا ہو جاتی ہے۔"

"شاباش" —— "ہم اس بات کو دوسری طرح بھی بیان کرسکتے ہیں کہ جھلی میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے برتن کی ہوا میں بھی اسی طرح تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے جس کا اثر خود برتن پر بھی پڑتا ہے اور آخر میں اس برتن کی تھرتھراہٹ سے باہر کی ہوا میں بھی تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تھرتھراہٹ لہروں کے ذریعے ہمارے کان کے پردے پر ٹکراتی ہے اور جیسی تھرتھراہٹ طبلے کی جھلی پر ہوئی تھی اسی طرح کی تھرتھراہٹ ہمارے کان کی جھلی میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضکہ ادھر طبلہ "تا دھن نا۔ تا دھن نا" کرتا ہے اور اُدھر ہمارے کان —— اب بتاؤ چیزوں میں آواز کس طرح پیدا ہوتی ہے؟"

"جب وہ تھرتھرانے لگتی ہے۔"

"یہ تھرتھراہٹ ہمارے کانوں میں کس طرح پہنچتی ہے؟"

"ہوا کی لہروں کے ذریعے۔"

"اب اگر اللہ میاں تمام دنیا کی ہوا کو بالکل ہی نیست نابود کردیں تو کیا ہوگا؟"

"ہم سب مر جائیں گے!"

میرے اس جواب پر عرشی بھائی جھنجھلا کر کہنے لگے۔ "تمھیں مرنے کی بڑی فکر ہے۔ فرض کرلو کہ ہم زندہ بھی رہے لیکن دنیا میں مکمل خاموشی رہے گی۔ نہ تو اسکول کی جھنکار سنائی دے گی۔ نہ لڑکوں کی چیخ پکار —— نہ ہیڈ ماسٹر صاحب کی پھنکار اور نہ ہاتھیوں کی چنگھاڑ ——"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "خیر اس کا تو ہمیں اندیشہ ہی نہیں ہے لیکن یہ تو بتائیے کہ ہوا کی یہ لہریں کس شکل کی ہوتی ہیں ——"

عرشی بھائی کہنے لگے —— "میں جب چھوٹا سا تھا تو تالاب کے کنارے جاکر پتھر جمع کرلیتا تھا اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر پانی میں ایک ایک پتھر پھینکا کرتا تھا۔ اس سے جو گول گول لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے بڑا لطف ملتا تھا۔ پانی کے تھرتھراتے ہوئے دائرے ایک کے بعد ایک اس طرح بنتے تھے کہ سارے تالاب کو حلقہ کرلیتے تھے لیکن جوں جوں یہ حلقے بڑے ہوتے جاتے تھے ووں ووں مدھم بھی پڑتے جاتے تھے

یہی حال ہوا کے سمندر کا بھی ہے۔ جس وقت ہم باتیں
کرتے ہیں تو گویا ہوا کے سمندر میں ڈھیلے پھینک رہے ہیں
جن کی وجہ سے ان میں گول گول لہریں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب
بتاؤ کیا میری آواز کی لہریں اس وقت لندن تک پہنچ
رہی ہیں؟"

"ضرور پہنچ رہی ہیں لیکن ذرا مدھم ہوں گی۔"

"جی نہیں ہوا کے سمندر میں ایک سرے سے دوسرے
سرے تک آواز پہنچانے کے لئے ہم کو ایسی لہریں پیدا کرنی
ہوں گی جو بڑی طاقت ور ہوں اور راستے میں ایک دوسرے
سے ٹکرا کر اس طرح نہ ٹوٹ جائیں جیسے تالاب میں کئی پتھر
ایک ساتھ پھینکنے سے اس کے حلقے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کیا ہم
ایسی لہریں پیدا کر سکتے ہیں؟ ــــ میرے دوست اگر تم ایسی
لہریں پیدا کرنے کی کوئی ترکیب بتا دو تو میں تمہاری تصویر
"پیام تعلیم" کے سالنامے میں بھجوا دوں گا۔ نہیں بتا سکتے۔
سنو:-"

"تم نے دیکھا تھا کہ طبلے کی جھلی کی تھرتھراہٹ
سے طبلے کے اندر کی ہوا میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس
کی وجہ سے اس کے برتن میں بھی تھرتھراہٹ ہونے لگی
اور آخر میں باہر کی ہوا میں تھرتھراہٹ پیدا ہو گئی۔ کیا اس سے
ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایک جسم کی تھرتھراہٹ کو دوسرے
جسم کی تھرتھراہٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔"

میں نے سر ہلا دیا۔

"کیوں نہ ہم ہوا کی تھرتھراہٹ کو بجلی کی تھرتھراہٹ
میں تبدیل کر لیں۔ اس طرح ہوا کی لہروں کے بجائے ہم بجلی
کی لہریں پیدا کر سکیں گے۔ جو اتنی طاقت ور ہوں گی کہ کرہ زمین
کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لاکھ اسی ہزار
میل فی سکنڈ کی رفتار سے چل سکیں گی اور سفر کے دوران
میں ایک دوسرے سے ٹکرا کر ٹوٹیں گی بھی نہیں۔"

"لیکن میں نے سنا ہے کہ بجلی کی لہریں بغیر تار کے سفر
نہیں کر سکتیں۔"

کہنے لگے "بجلی کی لہریں بالکل ایسی ہی ہوتی ہیں جیسی
کہ روشنی کی لہریں ــــ کیا سورج سے ہماری زمین تک
روشنی پہنچانے کے لئے اللہ میاں نے تار لگائے ہیں۔ نہیں تو
نظر نہیں آتے۔ اگر تم کہیں دیکھ سکتے ہو تو بتاؤ۔"

میں سمجھ گیا۔

"اچھا اب ہم دو اسٹیشن بناتے ہیں۔ ایک بمبئی جہاں
گانے اور لکچر دینے والے بولتے ہیں اور دوسرا یہ ہوٹل جہاں
ریڈیو کی مشین رکھی ہوئی ہے۔ اب ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ بمبئی
سے لوگ کس طرح بولتے ہیں اور ہم ریڈیو کے ذریعے ان کی
آوازوں کو کس طرح سن لیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے تم کو
اس شکل پر غور کرنا چاہئے جو میں اس کاغذ پر کھینچتا ہوں۔

(۱) گانے والوں کی آواز سے ہوا میں لہریں پیدا ہوتی
ہیں۔ یہ لہریں ایک ایسے باریک سے پردے پر جا کر ٹکرا
رہی ہیں جو تمہارے کان کے پردے جیسا ہے۔ یہ بہت
زور سے تھرتھرانے لگتا ہے۔ اسی مقام پر بجلی کا خزانہ بھی
ہے جس میں سے بجلی کی لہریں نکل رہی ہیں۔ اس باریک سے
پردے کے تھرتھرانے کی وجہ سے بجلی کی لہروں میں بھی تھرتھراہٹ
پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) یہ تھرتھراتی ہوئی لہریں ایک تار کے ذریعے
ایک ایسی جگہ جاتی ہیں جہاں ان کو بہت زیادہ طاقت ور

بنا دیا جاتا ہے

(۳) یہاں یہ تھرتھراتی ہوئی لہریں اس قابل بن جاتی ہیں کہ آزاد کر دی جائیں۔ ان کی مثال بالکل ان کبوتروں کی سی ہے جو اپنے پیروں میں خطوط باندھے ہوئے ایک ملک سے دوسرے ملک کو خبریں پہنچایا کرتے ہیں اب ہم ان تھرتھراتی ہوئی لہروں کو "برقی کبوتر" کہیں گے۔

روک نہیں۔ روشنی رُک جاتی ہے لیکن یہ نہیں رُکتے۔ ان میں کا ہر ایک کبوتر ایک پیام لئے جا رہا ہے تمہارے کانوں کے لئے۔

(۵) تم نے کبوتروں کی چھتری دیکھی ہوگی — لمبی سی جس میں کبوتر پکڑ لئے جاتے ہیں ایسی ہی چھتری ہماری چھت پر لگی ہوئی ہے جس میں برقی کبوتر پکڑے جاتے ہیں۔ بس دو چھوٹے چھوٹے بانس اور ایک تار
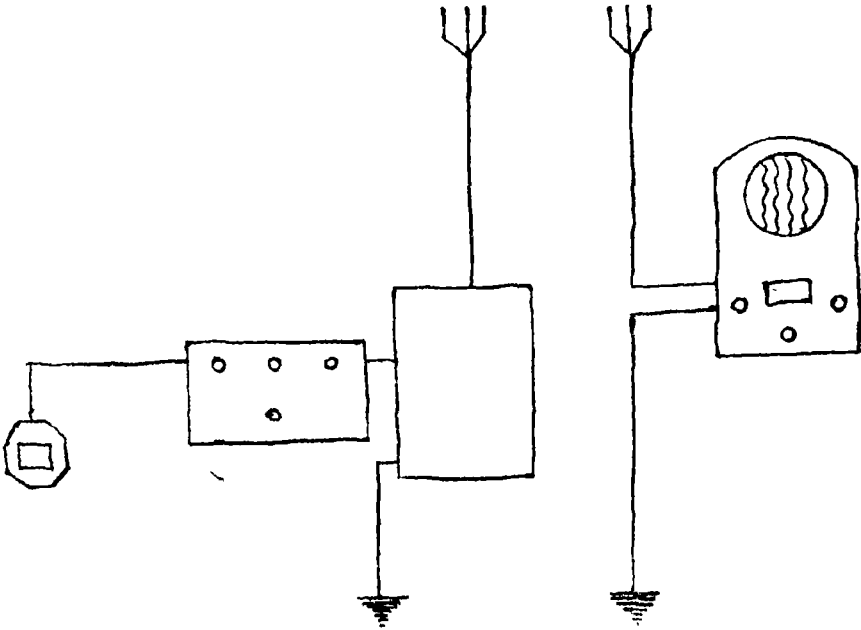
(۴) اسٹیشن پر بڑے اونچے اونچے لوہے کے ستون لگے ہوئے ہیں ان کے سروں پر لوہے کے تار ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اونچی کابکیں ہیں جن سے برقی کبوتر اڑنے کے واسطے کھول دئے جاتے ہیں اور تمام دنیا میں ایسی تیز رفتاری سے اڑنے لگتے ہیں کہ تم خیال بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے سامنے اگر دیوار، مکان اور قلعے بھی آ جائیں تب بھی ان کے لئے کوئی

(۶) ریڈیو کی مشین۔ اب یہ برقی کبوتر ریڈیو کی کابک میں بند ہو گئے یہاں یہ ...... ایک پتلے سے پردے پر آہستہ آہستہ ٹھونگیں جاتے ہیں جس سے اس میں تھرتھراہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تھرتھراہٹ پھر ہوا کی تھرتھراہٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ وہیں ایک بلند آواز ہے۔ جو اس ہلکی تھرتھراہٹ کو اتنی بلند آواز میں تبدیل کر دیتا ہے

کہ سارا ہوٹل گونجنے لگتا ہے۔"

اتنا کہہ چکنے کے بعد عرشی بھائی پسینہ پوچھنے کے لئے رک گئے۔

"ان تمام تبدیلیوں میں کتنی دیر لگتی ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"تم میری آواز کتنی دیر میں سن لیتے ہو۔" انھوں نے کہا۔

"فوراً" میں نے جواب دیا۔

"بس اسی طرح ادھر بمبئی کے اسٹیشن پر گانے والے منہ کھولتے ہیں اور ادھر ہم ان کو یہاں سن لیتے ہیں۔"

"ہم ریڈیو بجانے سے پہلے۔ اس پر جو ایک سوئی لگی ہوئی ہے اس کو گھما کر ایک خاص نمبر پر لے آتے ہیں تو وہ بجنے لگتا ہے۔ اس سے کیا مطلب ہے ؟" میں نے سوال کیا۔

کہنے لگے —— "دیکھو ہندوستان میں بمبئی، کلکتہ دہلی اور بیشاور ایسے اسٹیشن ہیں جہاں سے پروگرام کئے جاتے ہیں۔ اگر ہمارے ریڈیو میں ان تمام اسٹیشنوں کی آوازیں ایک ہی ساتھ آنے لگیں تو ہم کچھ بھی نہ سن سکیں گے اس لئے ان سب نے مل کر ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر اسٹیشن کی برقی لہریں مختلف لمبائیوں کی ہوتی ہیں۔ یعنی جس طرح شاہ جہاں پوری گرہ باز، دوباز اور غفور کبوتروں کی شکل صورت میں فرق ہے اسی طرح ان برقی کبوتروں میں بھی فرق ہے۔ ہم جب اپنے ریڈیو کی سوئی کو گھما کر دہلی کے نشان پر رکھ دیتے ہیں تو گویا ہم وہاں کے کبوتروں کی کابک کو کھول دیتے ہیں۔ اور وہ بھرا اٹا مار کر ہمارے ریڈیو میں داخل ہو کر غٹر غوں۔ غٹر غوں کرنے لگتے ہیں۔"

"اچھا اب یہ بتائیے کہ آپ نے ہوٹل کا ریڈیو کس طرح بند کر دیا ؟"

کہنے لگے —— "ریڈیو کی آواز تم کو گرمی اور جاڑے کے موسموں میں بہت صاف سنائی دیتی ہے۔ لیکن برسات کے موسم میں صاف آواز نہیں آتی۔ کبھی کبھی ایسی آواز آتی ہے جیسے کوئی دیو غصے میں گرج رہا ہو۔ یہ دیو دراصل بادلوں کی گرج بجلی کی کڑک اور ہوا کے طوفان ہیں، جن کے دنگلوں میں ریڈیو کی آوازیں کھو جاتی ہیں۔ اور برقی کبوتر برباد ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی مشین سے بجلی کی ایک ایسی طاقت ور لہر پیدا کی ہے جس نے ان چھوٹے چھوٹے برقی کبوتروں کو برباد کر دیا۔ اگرچہ میں ویسا طوفان پیدا نہیں کر سکا جیسا کہ قدرت خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کر دیتی ہے لیکن چونکہ میں اپنی برقی لہر ہوٹل کے ریڈیو کے بالکل ہی قریب پیدا کر رہا ہوں اس لئے اس کا اثر میری امید سے بھی زیادہ ہوا۔"

میں عرشی بھائی کا منہ تکنے لگا۔
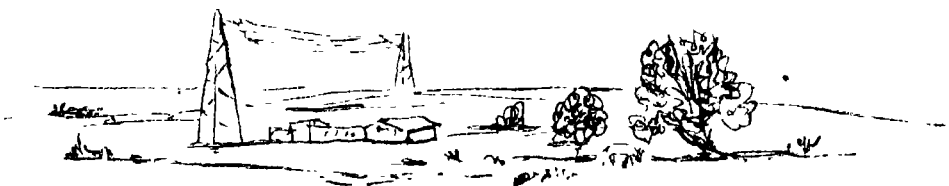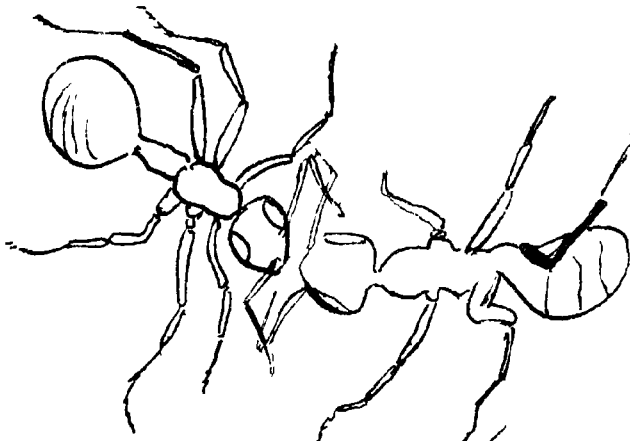
چیونٹی کی باتیں

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن، استاد جامعہ

صفدر تھا تو کوئی چار پانچ برس کا ننھا منا۔ مگر بڑا شیطان تھا۔ اماں جب باورچی خانے دال بگھارنے یا کھانا اتارنے جاتیں تو فوراً وہاں پہنچا اور پتیلیوں کو الٹنے کی کوشش کرتا یا چمچہ یا کفگیر اٹھا کر باجا بجانے لگتا، ابا کبھی گھر پر حساب لکھنے یا اور کوئی کام کرنے بیٹھتے تو جھٹ سے ان کی گودی میں چڑھ کر ہاتھ سے قلم چھین لیتا یا ادھر ادھر کی باتیں کرکے اُن کی طبیعت کام سے ہٹا دیتا۔ ماں باپ دلار میں کچھ کہتے نہ تھے، لیکن ایک دفعہ جب صفدر نے ایک چیونٹی کو اس کے کام سے روکا تو اس نے خوب لے دے کی۔ صفدر کو اس طرح ایک سبق بھی مل گیا اور چیونٹیوں کا اُسے بہت کچھ حال معلوم ہوگیا۔

ہوا یہ کہ صفدر تخت پر بیٹھا مٹھائی کھا رہا تھا کہ شکر کے کچھ دانے نیچے گر گئے۔ تھوڑی دیر میں اس نے دیکھا کہ ایک چیونٹی آئی اور شکر کے ایک دانے کو منہ میں اٹھا کر روانہ ہوئی۔ صفدر نے یوں ہی چھیڑنے کیلئے اس کے سامنے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دوسری طرف مڑگئی اور کچھ دور چلی تھی کہ صفدر نے پھر اس کا رستہ روک لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح چیونٹی کو دق کرتا رہا۔ تب چیونٹی نے شکر کا دانہ رکھ دیا اور جھلا کر کہا:-

"ہٹو جی، تم آخر میرا رستہ کیوں روکتے

رہتے ہو، میں کھیل کود میں نہیں پڑتی !"

صفدر نے کہا :۔

"بی چیونٹی تم تو بڑی جلدی بگڑ گئیں "۔

"میں مزدور ہوں ، کوئی عورت نہیں ہوں کہ تم مجھے بی، بی کہہ کر پکارتے ہو۔ ہمارے یہاں عورتیں الگ ہوتی ہیں ، مزدور الگ ، اور ہم اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لئے دائیاں رکھتے ہیں، انھیں اس طرح شرارت کرنے کو نہیں چھوڑ دیتے جیسے تمھارے ماں باپ نے تم کو چھوڑ رکھا ہے "۔

"یہ کیسے ؟ ہمارے یہاں تو مزدور بھی ہوتے ہیں اور مزدورنیاں بھی ، اور دونوں محنت کرتے اور کماتے ہیں۔ بچے جب چھوٹے ہوتے ہیں تو اُن کی دیکھ بھال کے لئے دائیاں ہوتی ہیں ، جب وہ میری طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو اُن کے ماں باپ خود دیکھ بھال کرتے ہیں ۔ تمھارے یہاں کا قاعدہ تو کچھ عجیب ہی سا معلوم ہوتا ہے "۔

"ہمارے یہاں کا قاعدہ بہت ٹھیک ہے ، عجیب تو تمھارے قاعدے ہیں۔ سنو ہم لوگوں کی پانچ قسمیں ہیں ۔ ہماری ہر بستی میں تھوڑے سے مرد ہوتے ہیں ، تھوڑی سی عورتیں ۔ انھیں ہم خوب کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اور آرام سے رکھتے ہیں ، اُن کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ اور چیونٹیاں پیدا کریں ۔ عورت جب انڈے دینے والی ہوتی ہے تو اس کے پر نکل آتے ہیں اور وہ بستی سے ہماری اجازت لے کر سوراخ کے باہر آتی ہے ، خوب اِدھر اُدھر اُڑتی ہے ، اور پھر انڈے دینے کے لئے بستی میں واپس چلی جاتی ہے ۔ جیسے ہی وہ پہنچی ، دائیاں آکر اس کے پر کاٹ دیتی ہیں ، اور جب وہ انڈے دے چکتی ہے تو دائیاں انھیں سنبھال کر ایسے کمروں میں لے جاکر رکھ دیتی ہیں جو خاص اسی لئے بنے ہوتے ہیں ۔ دائیاں ان انڈوں کی بہت حفاظت کرتی ہیں ، گرمی ، سردی ، خشکی ، تری ، ہر چیز سے اُن کو بچاتی ہیں اور تم جانو صبح سے شام تک انڈوں کو اِدھر سے اُدھر اور اوپر سے نیچے لے جاتی ہیں ، تاکہ انھیں جتنی گرمی اور تری کی ضرورت ہے بس

یہ چیونٹیاں ابھی جھلی سے نکلی ہیں اب ان کی مالش ہوگی

(مقابل صفحہ ۲۳۸)

دائی انڈے کی کروٹیں بدل رہی ہے
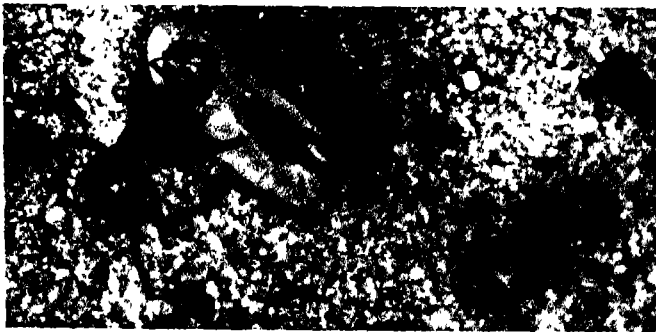
باپ کی وراثت　پہلا انعام
ابوالکلام شانتی نکیتن
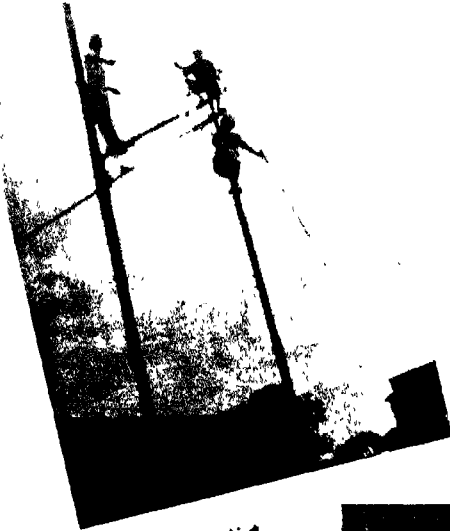
مزدور　دوسرا انعام
ح۔ف۔ بھوپال

چاے کی مالش (پسند کیا گیا)
ح۔ف۔ بھوپال

گڑیا　تیسرا انعام

اتنی ہی پہنچے۔ یہ ہم پہلے سے طے کر لیتے ہیں۔ کہ ہمیں ان انڈوں سے مرد نکالنے ہیں یا عورتیں، دائیاں یا سپاہی یا مزدور، اور اسی کے لحاظ سے انڈوں کو سیتے ہیں۔ جب مدت پوری ہو گئی تو انڈا پھٹ جاتا ہے۔ اور اس میں سے ایک جھلی میں لپٹا ہوا بچہ نکلتا ہے۔ اس جھلی کی دیکھ بھال میں بھی بڑی احتیاط درکار ہوتی ہے۔ وہ ایک طرح سے پڑی رہے تو بچہ خراب جاتا ہے۔ اسے دائیاں اُٹھاتی اور کروٹ بدل بدل کر لٹاتی رہتی ہیں۔ جھلی پک کر سوکھ جاتی ہے تو بچہ اسے پھاڑ کر نکل آتا ہے۔ دائیاں اسے اپنے لعاب سے دھوتی اور مل مل کر گرماتی ہیں۔ اسے خوب کھلاتی پلاتی ہیں اور پھر جب اس میں طاقت آجاتی ہے تو وہ جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اسی میں لگا دیا جاتا ہے مگر ہم تمھیں بات کیا سمجھائیں، تم نے ہماری بستیاں تو دیکھی ہی نہیں۔"

"تمھاری بستیوں میں کیا ہوتا ہے؟ ہم نے بس چیونٹیوں کو ذرا ذرا سے سوراخوں میں گھستے دیکھا ہے"

"یہ ذرا ذرا سے سوراخ تو اس لئے ہوتے ہیں کہ تمھارے جیسے شریر بچے اندر گھس کر سب کچھ تباہ نہ کر دیں۔ تم اندر جاؤ تو ہزاروں لاکھوں چھوٹے بڑے کمرے، دالان، برآمدے اور انبار خانے دیکھو گے اور ان کے درمیان گلیاں اور سڑکیں۔ ہمارے انبار خانے ہمیشہ کھانے کی چیزوں سے بھرے رہتے ہیں، اس لئے کہ ہمارے مزدور ہر وقت کھانے کی چیزیں جمع کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، اور جاڑا ہو یا گرمی یا برسات ہمارے یہاں کبھی کمی نہیں ہوتی۔ ہماری بستی کا خاصا حصہ انڈوں اور بچوں کے لئے ہوتا ہے ہماری دائیاں ان کی ہر ضرورت کی فکر رکھتی ہیں اور جب ہمارے اوپر کوئی مصیبت آتی ہے تو ہم سب سے پہلے انھیں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں نہ کوئی اپاہج ہوتا ہے نہ خود غرض، نہ کسی کی عادتیں بگڑتی ہیں اور نہ کسی کو سزا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم کو کوئی حکم دینے والا نہیں ہوتا۔ لیکن سارا کام وقت پہ اور سلیقے سے ہو جاتا ہے، ہم ہر حالت میں ایک

دوسرے کا خیال رکھتے ہیں، اور کوئی مدد کے لئے چلانے پکارنے پر مجبور نہیں ہوتا، اس لئے کہ ہم خود ہی ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ جاتے ہیں۔"

"صفدر یہ باتیں منہ پھیلائے سن رہا تھا کہ اتنے میں ایک چیونٹی نے بڑی زور سے اس کے ہاتھ میں کاٹا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس دوسری چیونٹی کو ہاتھ سے مسل دے۔ لیکن پہلی چیونٹی نے چلاکر کہا:۔

"ہائیں، ہائیں، خبردار اسے مت مارنا۔ یہ وہ پانچویں قسم کی چیونٹی ہے جس کا ذکر کرنا میں بھول گئی، یعنی ہمارے سپاہی۔ ان کا کام باقی چار قسموں کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ جب دوسرے کیڑے ہماری بستی کے اندر گھس آتے ہیں یا ہم میں سے کوئی خطرے میں ہوتا ہے تو یہ پہنچ کر دشمن پر ایک زہر کا فوارا چھوڑتے ہیں۔ یہ زہر اُن کے پیٹ میں بھرا رہتا ہے، اور معمولی کیڑے اس کے اثر سے مرجاتے ہیں جس دشمن کو یہ اپنے زہر سے نہیں مار سکتے اس کو یہ کاٹ کھاتے ہیں۔ اس وقت جس سپاہی نے تمھیں کاٹا وہ سمجھا ہوگا کہ تم مجھے کچھ نقصان پہنچانا چاہتے ہو یا مجھے کام سے روک رہے ہو اور میں سمجھتی ہوں اس نے ٹھیک کیا اچھا لو اب میں جاتی ہوں تم نے میرا بہت وقت ضائع کیا آیندہ جب کسی چیونٹی کو دیکھو تو اسے ستانا نہیں اور اسے کام سے کبھی نہ روکنا۔ ہم آدمیوں کی طرح نہیں ہیں۔ جب اپنا کام ٹھیک سے نہیں کرپاتے تو ہماری طبیعت خراب ہوجاتی ہے اور بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

کام کی باتیں

(۱) سنگ مرمر کی میز صاف کرنا ہو تو گرم پانی میں چند قطرے امیونیا ملاکر دھو ڈالو۔ دودھ کی طرح سفید ہو جائیگی

(۲) جس برتن میں مچھلی یا پیاز کی بو آ گئی ہو تو پانی میں سرکہ ملاکر اسے دھولو۔

(۳) تالا سخت ہو جائے تو چابی کے سوراخ میں سرسوں کا تیل یا مٹی کا اور سرسوں کا تیل ملاکر ڈالو اور چابی پھراؤ۔

(۴) کیک بناتے وقت اس میں تھوڑا سا لیمو کا چھلکا بہت باریک تراش کر ڈالو کیک خوشبودار ہو جائے گا اور جلد باسی نہیں ہوگا۔

ع۔ ف۔ چھپرا مئو

بلّو اور فیلو
(۱)
بلّو۔ "چاروں طرف پانی ہی پانی۔ پیڑ پر جی اکتا گیا۔ وہ جزیرہ ہے، چلو اس پر چلیں"
(۲)
"دوپہر کاٹنے کو تو اچھی جگہ ہے"
(۳)
"کیا ہوا ہے۔ ذرا سستا لیں"
(۴)
فیلو۔ "واہ صاحب یہ ایک رہی۔ میں کوئی آپ کا پلنگ ہوں؟"
جان پیاری ہوتی ہے۔ دُم کا سہارا!
(٦)
کنارے پر: فیلو: "معاف کرنا، میاں بلّو"
بلّو: اجی کیا مضائقہ ہے۔ آپ سے ملاقات ہی ہو گئی۔

نباتات کی زندگی

محمد عبد القدیر اعظم صاحب - میڈیکل اسٹوڈنٹ

کبھی کبھی سیر کے لئے تم باغیچوں میں جاتے ہو، کیاریوں کے گرد گھومتے ہو، کبھی کوئی پھول توڑ لیتے ہو، کبھی کوئی پتا۔ کبھی کسی شاخ کو مروڑ ڈالتے ہو تو کبھی کسی تنے پر حملہ کر بیٹھتے ہو۔ لیکن کبھی تم نے یہ بھی غور کیا کہ ان بے چارے درختوں میں بھی جان ہے۔ تم نے تو گرامر میں درخت کو بے جان شے (NEUTER GENDER) پڑھا ہے اور اُسے بے جان سمجھے بیٹھے ہو۔ ورنہ تم جو ایک انسان یا جانور کی انگلی مروڑتے ڈرتے ہو! ان غریب درختوں کے ڈال کے ڈال اس طرح بے تامل کبھی نہ توڑتے یہ بھی معلوم ہے کہ جان دار کہتے کسے ہیں اور جان دار میں کیا باتیں پائی جاتی ہیں؟ لو سنو۔ (۱) پہلے تو اس میں غذا کو کھا کر اسے اپنے جسم کا جزو بنانے کی طاقت موجود ہونی چاہیئے۔ (۲) دوسرے جسم کی غیر ضروری اور فاضل چیزوں کو خارج کرنے کی قوت۔ (۳) تیسرے نشو و نما۔ یعنی بڑھنے اور پھولنے کی قوت (۴) اولاد پیدا کرنے نسل بڑھانے کی طاقت ہونی چاہیئے۔ یہ سب قوتیں ہر انسان اور حیوان میں موجود ہیں۔ اور یہی طاقتیں نباتات یعنی پودوں میں بھی پائی جاتی ہیں پھر؟ تم بتاؤ کہ پودے جان دار ہیں یا نہیں؟ ہمارے خیال میں تو یقیناً ہیں۔

اب آؤ ہم تم مل کر دیکھیں کہ ایک پودا کن کن چیزوں (مادوں) سے بنا ہے۔ وہ دیکھو سامنے ایک پودا ہے۔ دوڑ کے لے تو آؤ۔ نہیں بھئی جڑ سے اُکھاڑ دو۔ اب دوا تولنے والے ترازو پر اسے تول ڈالو۔ دیکھو کتنا وزن ہوا؟ لکھ لو۔ اب اینٹوں کا ایک چولھا بناؤ۔ ٹین کے چراغ میں اسپرٹ ڈال کر جلا دو اور چولھے کے نیچے رکھ دو۔ اب چولھے پر توا رکھ کر اس پودے کو خشک کر لو۔ دیکھتے رہنا جلنے نہ پائے۔ پھر وزن کرو دیکھو وزن کم ہو گیا نا؟ کیوں؟ یہ تو کھلی ہوئی بات ہے

کہ پودے کے جسم میں پانی کا بھی حصہ تھا جو بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ اب اسے ایک دم جلا ڈالو۔ دیکھو اس کے گیس اُڑ گئے اور اب صرف راکھ رہ گئی جس کا وزن اور بھی کم ہو گیا۔ اگر تم اس گیس کو جمع کرو اور چونے کا پانی اس میں ڈالو تو پانی گدلا ہو جائے گا اور تم سمجھ جاؤ گے کہ یہ کاربن ڈائکسائڈ ہے۔ جس سے تمہارا سوڈا واٹر بنتا ہے۔ راکھ میں چونے اور پٹاس کے متفرق نمک ہیں۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے تجربوں سے پتہ چلا ہے کہ پودے میں آکسیجن۔ ہیڈروجن اور لوہے کا جزو بھی ہے۔ اب تمہیں ر ہو گی کہ آخر یہ چیزیں درخت میں کہاں سے او دل کر آئیں۔ کاربن ڈائکسائڈ گیس اور آکسیجن کے رے میں تو تمہیں معلوم ہے کہ ہوا میں موجود ہی ر پودے اسے ہوا سے لے لیتے ہیں۔ پھر اپنی نہ دار بال بھری جڑوں کے ذریعے زمین سے کھینچتے ہیں۔

کہانیاں تو سن چکے۔ دوسروں کی باتوں ہاں تک یقین آئے۔ آؤ خود بھی تو کچھ کر کے ں اور معلوم کریں کہ یہ کھاتے کیا ہیں۔ اِن کی غذا کے لئے کون کون سی چیزیں ضروری ہیں۔ چلو کچھ پیسے لے کر کسی دوا خانے میں چلیں اور کیلسیم نائٹریٹ ۳۱ گرین، پوٹاشیم نائٹریٹ، میگنیشیم سلفیٹ اور پوٹاشیم فاسفیٹ ہر ایک ۱۰ گرین۔ آئرن فاسفیٹ چوتھائی گرین بلکہ اس سے بھی کم لے آئیں۔ اب تم ان سبھوں کو ۳۰ اونس صاف پانی میں ملا لو اور شیشے کی بڑی سی بوتل میں رکھ کر منہ ڈھانک دو۔ مگر اس کے ایک ہفتے پہلے لکڑی کے برادے میں دھان کے بیج بو دو۔ اس میں جلد ہی کونپلیں نکل
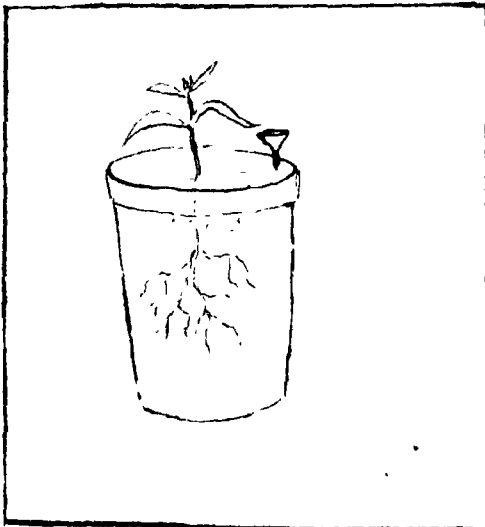
آئیں گی اور بڑھ کر پودا ہو جائے گا۔ اس پودے کو یا کسی گھاس کے پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر

اس بوتل میں تصویر نمبر ۱ کی طرح لگا دو۔ یہ دیکھ کر تمھیں حیرت ہوگی کہ پودا روزانہ نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اگر پھول کا پودا ہے تو اس میں پھول بھی لگے گا پھل بھی ہوگا۔ اب تو تمھیں یقین ہو گیا کہ درخت کی بھی ایک خاص غذا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ پودے کی اصلی غذا کاربن ڈائکسائڈ کہاں سے مل رہی ہے؟ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ پودا یہ چیز ہوا سے حاصل کرتا ہے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ آؤ لگے ہاتھ اسے بھی دیکھ لیں۔ پہلے بوتل کو تم تصویر نمبر ۲ کے مطابق ایک چھچھلی (اُتھلی) قاب میں جس میں پوٹاس کا پانی ہو رکھ دو۔ اس کے بعد ایک بڑے برتن سے ڈھانک دو۔ چند روز بعد تمھیں پودا زرد کمھلایا ہوا اور مردہ ملے گا۔ کیوں؟ ساری غذائیں تو اس کو مل رہی تھیں پھر یہ مر کیوں گیا؟ بات یہ ہے کہ پوٹاس نے برتن کے اندر والی ہوا کا کل کاربن جذب کر لیا اور پودا کاربن کو ترس ترس کر مر گیا۔ اب تو تم سمجھ گئے ہوگے کہ کاربن پودے کی غذا کا خاص جزو ہے۔ اسی طرح تم غذائی جزوں سے اگر لوہا گھٹا دو تو پودا زرد ہو کر مرجائے گا۔ پوٹاسیم سالٹ گھٹا دو تو پودا ٹھنگنا ہو کر رہ جائے گا کیلسیم نکال دو تو زندگی کم ہو جائے گی۔

کیوں میاں اب تمھیں یہ معلوم کرنے کا بھی شوق ہوگا کہ پودے کا کون سا حصہ پانی پیتا ہے
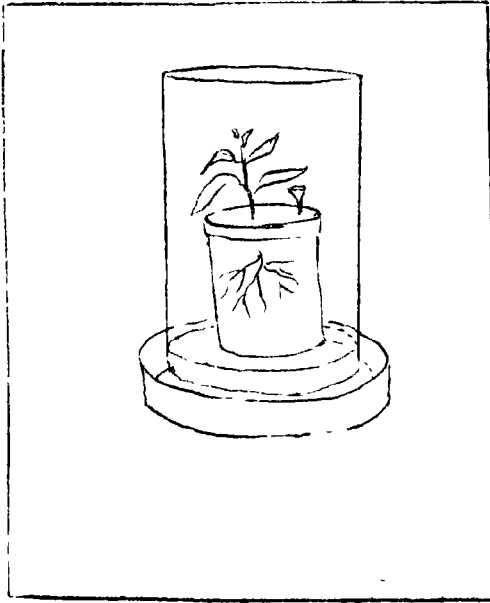
اور غذاؤں کو کس شکل میں کھاتا ہے۔ اچھا تو یوں کرو اس پودے کو اس پانی میں ڈال دو۔ جسے (EOSIN) ملا کر سرخ کر چکے ہو۔ پھر بیٹھ کر ذرا غور سے دیکھو۔ دیکھو پانی آہستہ آہستہ درخت میں چڑھ رہا ہے۔ اس کی جڑیں سرخ ہو گئیں۔

اگر تم بجائے جڑ کے پتوں کو ڈبو دو تو رنگ نہیں چڑھنے کا۔ کیونکہ پودے صرف جڑ کے باریک بالوں کے ذریعے پانی پیتے ہیں۔ اب تم پانی میں بازار سے CARMINES کارمن لاکر سفوف کرکے ڈال دو اور پودے کو اس میں لگا دو۔ اگرچہ کارمن سرخ رنگ ہے مگر پودے پر رنگ نہیں چڑھتا۔ چڑھے تو کیوں کر، کارمن پانی میں حل نہیں ہوتا۔ یہی تو ثبوت ہے کہ پودا صرف اُن چیزوں کو کھاتا ہے جو پانی میں گھل جائیں۔

مضمون ذرا لمبا ہو گیا اور باتیں ابھی بہت سی ہیں۔ پھر بھی جہاں تم نے انسان کی طرح پودے کے کھانے پینے کی کہانی سنی ہے۔ لگے ہاتھوں اس کا سانس لینا بھی دیکھ لو۔ کیا تمھیں مزا نہیں مل رہا ہے؟ کہو تو ختم کر دوں! اگر تم بڑے شوق اور دھیان سے سننے کے لئے تیار ہو۔ میرے ننھے دوستو سانس لینے کے معنی یہ ہیں کہ انسان، حیوان یا نباتات اپنی زندگی کے لئے ہوا کے آکسیجن گیس کو جذب کرتے یا اپنے اندر کھینچتے اور کاربن گیس چھوڑ دیتے ہیں۔ موقع ملا تو بتاؤں گا کہ انسان کیوں کر سانس لیتا ہے۔

ابھی تو تم پودے کو سانس لیتے دیکھ لو۔ ایک صاف بوتل کے اندر چند چھوٹے چھوٹے پودے یا اکھوے پھوٹے ہوئے چنے ڈال دو، اور منہ بند کر دو۔ اندھیری کوٹھری میں رکھ دو۔ چوبیس گھنٹے بعد ایک جلتی لکڑی بوتل میں ڈالو وہ بجھ جائے گی۔ چونے کا پانی ڈالو یہ دہی جیسا گدلا بن جائے گا۔ ان دونوں...... تجربوں سے ثابت ہو گیا کہ بوتل کے اندر صرف کاربن ہے آکسیجن کا نام تک نہیں۔ آخر بوتل کے ہوا کا آکسیجن کیا ہوا۔ اور کاربن اس قدر کہاں سے آگیا ہو نہ ہو ضرور اس پودے نے آکسیجن لے لیا۔ اور کاربن چھوڑ دیا اہا یہ تو بالکل انسان کی طرح سانس لیتا ہے۔ اب تو تمھیں اندازہ ہوا ہو گا کہ پودے کی زندگی بھی انسان کی زندگی کی طرح کتنی دلچسپ ہے۔ تمھارا تو دل چاہتا ہو گا کہ بس پڑھتے ہی چلے جائیں اور تجربے پر تجربہ کرتے رہیں مگر کیا کیا جائے فرصت بالکل نہیں، پرچے میں جگہ بھی کم ہے پر اتنی باتیں بھی کم نہیں ہیں ذرا گھر میں تجربہ کرکے تو دیکھو۔ کیسا مزا آتا ہے۔ اپنے تجربے کی باتیں ایڈیٹر صاحب کو ضرور لکھنا۔ اگر تمھیں یہ مضمون پسند آیا تو آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

"میراویس"

از جناب محمد حسن صاحب

علی گڑھ کی نمائش کا شوق بڑوں سے زیادہ بچوں میں ہے۔ تم میں سے جو علی گڑھ یا اس پاس رہتے ہیں اس کا لطف اٹھا چکے ہوں گے اور بہت سے ہر سال جیب میں کچھ پیسے دبائے اس کا لطف اٹھاتے ہوں گے۔ بعض ایسے بھی ہوں گے جن کی خواہش ابھی پوری نہ ہوئی ہو گی اور وہ بے چینی سے ۲۶ جنوری کا انتظار کر رہے ہوں گے یعنی اس دن کا جب سے نمائش شروع ہوتی ہے۔

چنانچہ میراویس صاحب بھی انھیں میں سے ہیں جن کی خواہش پوری نہیں ہوتی ہے۔ گو ایک بار دیکھ بھی چکے ہیں۔ چار سال کی عمر میں۔ اسی نمائش والے دورے میں بیچارے کے ساتھ دو ایک حادثے بھی پیش آئے یہ اب انھیں سنائے جاتے ہیں تو یقین نہیں آتا۔

ایک دن گھر کے سب لوگ بائیسکوپ دیکھنے چلے میر صاحب کو بھی لے لیا گیا تھا۔ اس شرط پر کہ نہ وہ سوئیں گے نہ شرارت کریں گے۔ بے چارے پہلے تو میرے ساتھ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ پھر اپنی اماں کے پاس چلے گئے۔ اس تماشے میں کھانا پکنے کا منظر تھا۔ لوگ جمے ہوئے تھے۔ بھری ہوئی قابیں دنادن لوگوں کے آگے بڑھائی جا رہی تھیں انگریزی باجے بھی خوب بج رہے تھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر میر صاحب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ بے چارے چپ نہ رہ سکے۔ اور اپنی اماں سے پلاؤ کی فرمائش کر ہی دی۔ کہ "ہم بھی کھائیں گے" وہ بہتیرا انھیں منع کیا گیا پر نہ مانے۔ اور رو رو کر کہنے لگے "ہوں۔ ہم بھی کھائیں گے۔ اماں! دو نا۔ اجی"۔ اب اماں کے ساتھ ساتھ دوسری عورتوں کا بھی تماشا دیکھنا مشکل ہو گیا۔ اماں جی نے دو چار چپتیں لگا کر نوکر کے حوالے کیا کہ باہر لے جائے۔

گرمی کے موسم میں جو ظلم میر صاحب پر کیا جاتا ہے شاید تم لوگوں پر بھی بیتی ہو گی۔ یعنی دوپہر کے وقت کمرے میں بند کیا جانا۔ میر صاحب روزانہ کمرے میں بند کر دیئے جاتے تھے، یہ ان کے لئے بہت تکلیف اور پریشانی کی بات تھی اکثر پانی پینے کے بہانے باہر چلے جاتے تھے۔ آخر پانی پینے کا انتظام بھی اندر ہی کر دیا گیا۔ لیکن اس پر بھی پیشاب کے بہانے باہر نکل ہی جاتے تھے۔ اور ان کاموں کو جلدی جلدی پورا کر لیتے تھے۔ جن کا پورا ہونا گھر کے لوگوں کے سامنے ناممکن تھا۔ مثلاً کتابیں الٹ پلٹ کر دینا۔ بجلی کا سوئچ دبا کر کمرہ روشن کر دینا۔ بلی کو اٹھا کر دور پھینک دینا، وغیرہ وغیرہ، اسی لئے ادھر کچھ دنوں سے ان کو کمرے میں بند ہونے سے پہلے پیشاب کر لینا پڑتا تھا۔

ایک دن موقع پا کر میر صاحب نکل پڑے اور سیدھے کراسن تیل کے کنستر کے پاس پہنچے۔ جلدی جلدی تیل اپنے سر پر انڈیل لیا۔ اور بھاگے ہوئے اپنی اماں کے پاس گئے اور کنگھی طلب کی کہ مانگ نکالیں گے۔

میر صاحب نے اپنے بھائی عمیس صاحب کو کئی بار اپنے جوتے میں پالش لگاتے دیکھا تھا۔ میر صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ پالش لگانے سے جوتا چمکنے لگتا ہے۔ ایک دن عمیس صاحب اسکول سے جو واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میر صاحب آئینے کے آگے کھڑے ہیں بائیں ہاتھ میں جوتے کی پالش ہے۔ دائیں میں کپڑا۔ چہرہ پالش سے رنگا ہوا ہے۔ اور میر صاحب کپڑے سے رگڑ کر چہرے کو چمکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

میر صاحب کچھ کچھ بخیل بھی واقع ہوئے ہیں ایک دن آپ کو کہیں سے چند ٹافیاں ہاتھ لگ گئیں۔ یہ انھیں بہت مزے لے لے کر کھا رہے تھے۔ اور ہر دیکھنے والے کی طرف دیکھ کر بڑے مزے میں چٹخارے لیتے تھے۔ مگر کیا مجال جو کسی کی طرف ایک بڑھا بھی دیتے۔ بڑی ہمت کرتے تو ایک بڑھاتے لیکن جب دوسرا ہاتھ بڑھا۔ تو فوراً اپنے منہ میں ڈال لیتے۔ عمیس صاحب نے بڑی خوشامد کی طرح طرح کی اُمیدیں دلائیں جب جاکر اُن کو ایک ٹافی ملی عمیس صاحب نے اُسے ہڑپ کرنے کے بعد دوسری اس بہانے طلب کی: "میر صاحب آپ نے تو ایسی ٹافی دی کہ دانت میں پھنس گئی۔ ایک اور ملے جب جاکر نکلے گی۔" یہ کہتے ہوئے دوسری لینے کو ہاتھ بڑھایا۔ اور ساتھ ساتھ کراہنے لگے "آہ، آہ جلدی دو بہت تکلیف ہے۔ دانت ٹوٹے جاتے ہیں"۔ میر صاحب نے ان کو بہت گھور کر دیکھا پیچھے ہٹے اور ہمدردی کے لہجے میں بولے "دیکھیے بھیا اسی لئے تو منع کر رہے تھے کہ مت کھائیے۔ بڑی بدمعاش ہے" یہ کہہ کر اپنے ہاتھ والی ٹافی کو دوسرے ہاتھ سے مارتے ہوئے بولے "ٹھہرئے بھیا ابھی ایک تنکا دانت صاف کرنے کو لا دیتا ہوں" یہ کہتے ہوئے چل دیے۔

آپ کو چند ریکارڈ بہت پسند ہیں اُن کے گانے از بر کرتے ہیں۔ مگر سب کو ایک سُر سے لگاتار گا کر ختم کر دیتے ہیں۔ اکثر اس کوشش میں رہتے ہیں کہ گھر کے باجے پر دست درازی کا موقع مل جائے۔ کبھی اگر موقع مل بھی جائے تو جلدی جلدی باجہ کھول کر الٹ پلٹ کر دیتے ہیں۔ ابھی بجانے کی نوبت نہیں آتی کہ گھر میں شور مچ جاتا ہے "دوڑو، دیکھو میر صاحب کمرے میں گھس گئے ضرور کوئی چیز بگاڑیں گے، کوئی بھاگ کر جاتا۔ میر صاحب کو کرسی سے جھٹک کر اتارتا اور کچھ دور دھکا دے دیتا۔ بے چارے میر صاحب سے کچھ نہیں بنتا تو گھور کر دیکھتے۔ منہ پھلا کر کچھ بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل جاتے۔

جب انھوں نے دیکھا کہ باجا ہاتھ ہی نہیں لگتا تو خود ہی ایک باجہ ایجاد کیا۔ یہ ایک جوتے کا ڈبا ہے جس میں چند گول گول کٹے ہوئے کاغذ پڑے ہیں۔ کوئی بہت بڑا، کوئی درمیانی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ سب سے بڑا کاغذ وہ رکارڈ ہے جس میں "یا محمد سعید نا تم کردو بیڑا پار" گایا گیا ہے۔ اور سب سے چھوٹا جس میں "دادا دوڑ دبلا دال کھا گئی" یہ گایا گیا ہے۔ باقی میں ہر قسم کے گانے موجود ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ باجہ بجتا کس طرح ہے تو آپ نے نہایت ہی اطمینان سے ڈبے کو کھولا۔ اور ڈھکنے کو ڈبے سے لگا کر کھڑا کر دیا۔ ڈبے سے ایک لکڑی سی نمودار ہوئی جو سوراخ میں داخل کی گئی۔ پھر میر صاحب چابی دینے لگے جیسے جیسے ہاتھ گھومتا تھا منہ سے سُر سُر

کی آواز نکلتی جاتی تھی۔ جب چابی دے چکے تو آپ نے پوچھا "کون سا رکارڈ چڑھایا جائے" کہا گیا۔ سب سے بڑا والا۔ تو میر صاحب بولے "یا محمد ......" جواب ملا جی ہاں" بولے۔ اچھا۔ اور اس بڑے کاغذ کو ڈبے پر رکھ دیا۔ اور خود ٹھیک اس طرح بیٹھ گئے۔ جیسے باجے میں کتا بیٹھا ہوتا ہے۔ پھر نہایت ہی اطمینان سے آپ نے خود گانا شروع کیا۔ "یا محمد سید نا تم کر دو بیڑا پار .... کوئیں .... کو ... کوئیں کوئیں کوئیں ..... کوئیں کوئیں۔ کوئیں۔ کر دو کوئیں کار" پوچھنے پر پتہ چلا کہ۔ یہ کوئیں کوئیں باجہ کرتا ہے۔

ضد تو سب بچے کرتے ہیں لیکن بے موقع نہیں۔

ایک دن ایک تاجر کچھ پیتل کچھ تانبے کے برتن گدھے پر لاد کر بیچنے آیا تھا۔ میر صاحب گدھے کو چرتا دیکھ کر مچل گئے کہ چڑھا دو۔ بہت منع کیا گیا لیکن نہ ملنے، آخر اُن کے نوکر گھاسو نے اُن کو گدھے کی پیٹھ پر بٹھا دیا۔ پھر بھی یہ اینٹھے ہی گئے۔ کہ نہیں اس تھیلے میں بیٹھوں گا۔ اس تھیلے میں بیٹھوں گا" آخر تھیلے ہی میں بٹھایا گیا۔ اور دونوں طرف کا وزن برابر کرنے کے لئے گھاسو نے دوسری طرف اُن کی چھوٹی بہن نزہت کو بٹھا دیا۔ پھر گدھے کو ایک چھڑی لگائی چھڑی پڑتے ہی گدھے نے بڑے زور کی دولتی چلائی۔ اور بی نزہت لگیں رونے۔ گھاسو نے گھبرا کر اُن کو اتار لیا۔ نزہت کا تھیلے سے اُٹھنا تھا کہ میر صاحب کی طرف کا تھیلا بھاری پڑا اور بھد سے تھیلے میں لپٹے لپٹائے نیچے گرے۔ گرنا تھا کہ گدھے نے بدستور دولتی چلائی اور بے چارے میر صاحب کے چوٹ لگی۔ کچھ دن تک پلنگ پہ سوار رہے لیکن اس پر بھی اُن کا باجہ ہر وقت بجتا رہتا تھا۔

یہ تو میر صاحب کے چند کارنامے ہیں۔ اسی طرح بہت سے اور بھی ہیں۔ لیکن گھبراتا ہوں کہ اسی کو پڑھ کر میر صاحب نہ جانے کیسے آگ بگولا ہو جائیں گے۔ اور پھر مجھ سے کبھی نہ بولیں گے پہلے تو یہ تھا کہ جہاں خفا ہوئے اور میں نے ایک ٹافی دکھائی۔ دیکھئے غصہ چھوئی موئی ہو جاتا تھا لیکن اب نہ جانے کس طرح منایا جائے گا اب میر صاحب علی گڑھ جا رہے ہیں۔ والسلام

ستاروں کی بیل

گول ستارے سرخ اور سبز۔ ریشم یا لوتھیں سبز۔

پھول پر سرخ پتوں پر سبز ستارے ہم رنگ ٹانک لو۔ کلی کے اِدھر اُدھر سبز اور بیچ میں سرخ ستارے ٹانک لو۔ شاخیں سبز لوتھ یا ریشم سے بنا لو۔ یہ بیل قمیص کے گھیر آستین، گریبان پر اچھی معلوم ہو گی۔ میز پوش کشتی پوش کے چاروں طرف بھی بنا سکتے ہیں۔
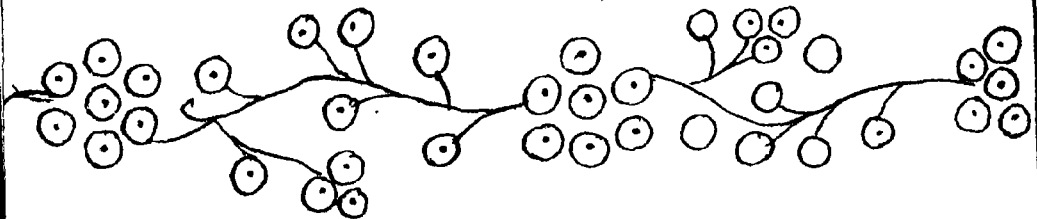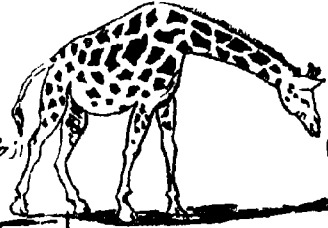
زراف

(از جناب برکت علی صاحب فراق بی اے (جامعہ)

چڑیا گھر بھی کیسی عجیب و غریب جگہ ہے ۔ بھانت بھانت کے جانور، طرح طرح کے پرندے، قسم قسم کے کیڑے مکوڑے۔ کہیں شیر دھاڑ رہا ہے ، کہیں ہاتھی چنگھاڑ رہا ہے، کہیں ننھی ننھی اور پیاری پیاری چڑیاں چہچہا رہی ہیں ۔ کہیں بھالو بیٹھا گڑ گڑ حقہ پی رہا ہے ۔ کہیں مور اپنا ناچ دکھا رہا ہے ۔ بس کچھ نہ پوچھو کیسی کیسی آوازیں سنائی دیتی ہیں ۔ چڑیا گھر کیا اچھا خاصا جنگل معلوم ہوتا ہے ۔ فرق یہ ہے کہ چڑیا گھر میں یہ جانور اور چرندے اور پرندے بند رہتے ہیں ۔ اس لئے بچے جوان بڈھے سبھی دیکھنے جاتے ہیں ۔ اور جنگل میں یہ سب آزاد گھومتے رہتے ہیں ، اس لئے وہاں ڈر کے مارے کوئی قدم نہیں رکھتا ۔

چڑیا گھر میں بہت سے ایسے جانور ہوتے ہیں جو ہمارے ملک کے ہوتے ہیں اور ہم ان کو جانتے پہچانتے ہیں ۔ لیکن بہت سے دوسرے ملکوں کے بھی ہوتے ہیں اور ہم انھیں بالکل نہیں جانتے ۔ بس دیکھتے ہیں اور دیکھے چلے جاتے ہیں ۔ لیکن اس سے فائدہ ؟ چاہیئے تو یہ کہ جس سے ملاقات کریں اس کا تھوڑا بہت حال بھی جانیں ۔ آج ہم تمھیں ایک دوسرے ملک کے جانور کا حال سناتے ہیں ۔

ارے بھئی واہ ! یہ تو بالکل ہی نئے جانور ہیں ۔ ہم نے تو پہلے کبھی دیکھے نہیں تھے ! کتنی لمبی لمبی ٹانگیں ہیں گردن تو دیکھو جیسے اونٹ کی ۔ میاں اونٹ کی گردن بھی تو اتنی لمبی نہیں ہوتی ۔ بدن ایسے جیسے چھینٹ کے کرتے پہن رکھے ہوں ۔ اللہ میاں بھی کیسے اچھے کاریگر ہیں ۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ ایک مزے کا قصہ سنو ۔ پہلے جب اس جانور کو ایک دیہاتی نے چڑیا گھر میں دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا ۔ تھوڑی دیر بعد بولا " نا بھائی نا ! ہم کبھی مانیں گے؟ ...... آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں " یہ لمبوترا افریقہ کے جنگلوں میں رہتا ہے ۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ افریقہ کے جنگلوں میں آدمی کا گذر نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت تک ان لمبوتروں کو بھی کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ بے چارے امن چین سے زندگی گذارتے تھے ۔ ذرا سوچو تو سہی کہ جو آدمی سب سے پہلے افریقہ کے جنگلوں کی سیر کر کے اپنے ملک کے لوگوں سے کہتا ہوگا کہ میں نے ایسا ایسا جانور دیکھا ہے تو لوگ بس یہی کہتے ہوں گے ۔ " بھائی یہ تو تم کوئی کہانی سنا رہے ہو ۔ ایسے جانور بھی بھلا کہیں ہوتے ہیں "!

کسی زمانے میں ایک آدمی نے اپنے سفر کا حال ایک کتاب میں لکھا ۔ یہ بہت دور دور کے ملک دیکھ آیا تھا ۔ اس کتاب میں اس نے اس جانور کا بھی حال لکھا تھا کہ " میں نے ایک ایسا جانور دیکھا ہے جو اتنا لمبا ہوتا ہے کہ اونچے اونچے مکانوں کی چھتوں تک اس کی گردن پہنچ جاتی ہے ، اس کے بدن پر چیتے کی طرح کے چتے ...... اور سر پر ہرن کے ایسے بڑے بڑے دو سینگ ہوتے ہیں ۔ وہ ہوا کی طرح تیز

دوڑتا ہے۔ مگر ڈرپوک اتنا ہوتا ہے کہ بچے کو دیکھ کر بھی بھاگ جاتا ہے۔

جس جس نے یہ کتاب پڑھی ہوگی وہ کہتا ہوگا۔ "یہ سب جھوٹی اور من گھڑت باتیں ہیں" مگر اصل میں تھا یہ جانور ایسا ہی، بس اتنا تو ضرور فرق ہے کہ اس کے سینگ ہرن کے برابر نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اور لمبا بھی اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ لکھا ہے۔ وہ اتنا لمبا ہوتا ہے کہ اوسط درجے کے مکانوں کی چھت تک اس کی گردن پہنچ جائے۔

زرافوں سے چڑیا گھر میں بڑا لطف رہتا ہے۔ یہ بے چارے بڑے نازک اور نیک ہوتے ہیں۔ ان کے کھلانے پلانے میں بڑی احتیاط رکھی جاتی ہے۔ پیٹو یہ اتنے ہوتے ہیں کہ جو کچھ دے دو، کھالیں گے۔ اگر چڑیا گھر کے سیر کرنے والوں کو اجازت ہو کہ وہ انھیں کھانے کو دے دیا کریں تو بڑا ہی غضب ہو جائے۔ بدہضمی، پیٹ کا درد پچیس طرح طرح کے مرض ہو جائیں۔ کبھی کبھی ان ہی بیماریوں سے بے چارا لمبوترا مر جاتا ہے۔ اسی لئے .... دیکھو یہاں ایک بورڈ لگا دیا گیا ہے کہ "کوئی صاحب اس جانور کو کوئی چیز نہ کھلائیں"

لیکن بھئی ایسا پیارا جانور! کون اسے کھانے کو نہ دے گا۔ بعض چیزیں جو زراف کو نقصان نہیں کرتیں تم انھیں کھلا سکتے ہو۔ ننھے ننھے بچوں کے ہاتھ اس لمبوترے کے منہ تک تو پہنچ نہیں سکتے۔ وہ بے چارا خود ہی اپنی گردن جھکا کر بچے کے ہاتھ سے لے کر کھا لیتا ہے۔ جب بچے کے ہاتھ سے کھانے کے لئے وہ گردن جھکاتا ہے تو کچھ عجیب ہی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن بھئی دیکھو، اسے پیار کرنے کے لئے اس کے اوپر کبھی ہاتھ نہ پھیر دینا۔ یہ چیز اسے بہت بری لگتی ہے۔ بہت سے جانوروں کے سر پہ یا کان کے پاس ہاتھوں کو سہلاؤ تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں لیکن یہ لمبوترا اس بات پر بگڑ جاتا ہے۔ اپنا سر اِدھر اُدھر جھٹکتا ہے اور بدمزاج گھوڑے کی طرح چکر کاٹنے لگتا ہے۔ غرض بہت بگڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی اس بگڑنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جانیں چلی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ دو چار زراف کٹہرے میں کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرف سے کچھ بچے شور مچاتے آپہنچے۔ پھر کیا تھا شور سن کر زراف ایسے چونکے کہ لگے اِدھر اُدھر کودنے پھاندنے بچے بھی تھے بڑے شریر، شور مچاتے ہی چلے گئے۔ زراف جوں جوں بچوں کو شور مچاتے اور چلتے پھرتے دیکھتے تھے اور زیادہ بھڑکتے تھے۔ اُف، معلوم ہوتا تھا کہ سارے چڑیا گھر کو سر پر اٹھالیں گے۔ سارے کٹہرے میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ جیسے سچ مچ کی دوڑ ہو رہی ہو۔ لیکن تماشا تھا بڑا عجیب جیسے چھینٹ کا لباس پہنے لمبے لمبے دیو ناچ رہے ہوں۔ دم مروڑے ہوئے، گردنیں ڈگ مگ، ڈگ مگ کرتی ہوئی جیسے سمندر میں کسی کشتی کے مستول ڈگمگا رہے ہوں۔ مگر اس تماشے میں خطرہ بھی بہت تھا۔ جب جانور بگڑ جاتے ہیں تو وہ جو کچھ بھی کر ڈالیں کم ہے۔ خدا خدا کرکے چڑیا گھر کے ملازم آئے۔ انھوں نے بچوں کو ڈانٹا۔ وہ بھاگے تب کہیں جاکر یہ خاموش ہوئے۔ ایسے خاموش جیسے اس سے پہلے یہ غصے میں تھے ہی نہیں۔

زراف ہندوستان میں بڑے مزے میں ہیں۔ ہندوستان گرم ملک ہے اور گرم آب و ہوا ان

دوستی (مضمون صفحہ ۴۴۹ پر)

محبت

چاتر سے شکار

(تفصیل ۴۹۳ پر دیکھو)

بہت بھاتی ہے۔ ایک گاؤں میں کسی نے زراف پالا تھا۔ یہ اتنا
ل گیا تھا کہ اسے آزادی سے ٹہلنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا تھا۔

اسی گاؤں کا ایک قصہ بڑا مزے دار ہے :-

ایک مرتبہ اس گاؤں میں ایک حاکم آیا۔ یہ گھوڑے
سواری بہت اچھی جانتا تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ اس
دوستوں نے اس سے کہا "آج یار اس لمبو ترے کی سواری
کے تو دیکھو" کسی طرح ہنکاتے ہنکاتے لوگ اسے حاکم
مکان کی چھت کے نیچے لے گئے۔ جب زراف چھت کے
آگیا تھا کم جھٹ اس کی پیٹھ پر کود کر بیٹھ گیا اور قابو میں
نے کے لئے اپنی ٹانگوں سے اُسے جکڑ دیا۔

بے چارا زراف تلملا اُٹھا اور سر پر پیر رکھ کر ایک
کو بھاگا۔ نہ لاتیں چلائیں نہ پچھاڑا کاٹا اور نہ چکر دیے
جس طرف رخ کیا تھا اسی کی سیدھ میں ہو لیا۔ بس بھاگا
یا۔ سوار بار بار اس کی ڈھلوان پیٹھ سے نیچے پھسل پھسل
مگر ہر مرتبہ کوشش کر کے بچ جاتا۔

یہ حاکم سوار تو اچھا تھا مگر تفریح کا بھی ایک وقت
ہے۔ اس کے بعد تفریح کی جگہ تکلیف ہونے لگتی ہے۔
ال سوار کا بھی ہوا۔ زراف تھا کہ ایک رفتار سے
دوڑ رہا تھا، دم بھی تو نہیں لیا۔ سوار بھی آخر تنگ
اس کی طبیعت ایسی خراب ہوئی کہ دیر تک اس کی پیٹھ
ا نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ زراف کی دم کی طرف کھسک
س کے سہارے زمین پر کود پڑا۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ
یادہ نہ لگی اور صحیح سلامت نیچے آگیا۔ مگر پھر کان
کہ اب ایسا خطرناک تجربہ کبھی نہ کروں گا۔

تم پہلے سن چکے ہو کہ زراف بہت لمبا ہوتا ہے

بڑے سے بڑے زراف کی اونچائی ۲۰ فیٹ سے زیادہ
یعنی کوئی ۷ گز کے قریب قریب ہوتی ہے۔ ہمارے مکانوں
کی اونچائی ۱۵ فیٹ سے زیادہ کیا ہوتی ہوگی۔ اب ذرا
زراف کی اونچائی کا خیال کرو۔ ایک منزل کے مکانوں میں
تو وہ سماہی نہیں سکتا۔ البتہ اگر دو منزل کا مکان ہو اور
پہلی منزل کی چھت میں چھید کر دیا جائے تب کہیں دونوں
منزل کی اونچائی ملا کر اس کے لئے کافی ہو۔ بلکہ اس میں بھی
اسے اپنے سینگوں کی وجہ سے بھنچا بھنچا رہنا پڑے گا،
بالکل سیدھا اب بھی کھڑا نہ ہو سکے گا۔ مگر کبھی یہ بہت بری
بات ہے اور اسے سن کر دل کو تکلیف ہوتی ہے کہ زراف جیسے
نیک اور خوب صورت جانور کو بھی بندوق کا نشانہ بنایا جائے
اس لئے کہ بہت سے شکاری جو جنگل میں شکار کھیلنے جاتے ہیں
دوسرے جانوروں کے ساتھ ان کا بھی شکار کر لاتے ہیں شکر
ہے کہ آج کل شکار کا فیشن بدل گیا ہے۔ اب لوگ جنگلوں میں
جا کر بندوق کی جگہ تصویر کھینچنے کی مشین وکیمرا استعمال کرنے
لگے ہیں۔ پہلے شکار سے لوٹ کر خون سے تر بتر کھال لاتے
تھے اور اس سے سوٹ کیس اور جوتے وغیرہ بنواتے تھے۔ اب
اچھی اچھی تصویریں کھینچ لاتے ہیں۔ مگر یہ جانور اتنا چوکنا
اور ڈرپوک ہے کہ کیمرے سے اس کی تصویر کھینچنا مشکل ہے

زراف کا حال تو اب تم نے سن لیا۔ اب آؤ ذرا
سوچیں کہ یہ جانور اتنا لمبا کیوں ہوتا ہے۔ جانوروں کا حال
جاننے والے بہت سے عالم تو یہ کہتے ہیں کہ اس کی پسند کی
غذا بہت اونچے درخت کی چوٹیوں پر پیدا ہوتی ہے۔ اس
لئے اس کی پیدائش ایسی کی گئی ہے۔ تاکہ یہ اپنی خوراک آسانی
سے حاصل کر سکے۔ اور یہ صحیح بھی ہے کہ زراف درختوں کی نرم

نرم کونپلوں کو کترنا بہت پسند کرتا ہے۔

ایک خیال اس کے لمبے ہونے کے بارے میں اور ہے وہ یہ کہ اس کو اللہ میاں کی طرف سے لمبی گردن اس لئے دی گئی ہے کہ یہ دور ہی سے خوں خوار جانوروں کی آمدورفت دیکھ سکے اور اُن کے حملوں سے بچ نکلے جو اسے ایک ہی نوالے میں ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔

زراف کے پاس اپنی جان بچانے کے لئے صرف ایک ہی ترکیب ہے وہ پچھلی ٹانگوں سے بڑے زور سے لات مارتا ہے۔ افریقہ کے لوگ کہتے ہیں کہ صرف اپنی ٹانگوں سے حملہ کر کے زراف شیر تک کو مار ڈالتا ہے یا کم سے کم اسے لنگڑا تو ضرور کر دیتا ہے۔ اس طرح کے حملے زیادہ تر زراف کی مادہ اپنے بچوں کی حفاظت کے لئے کرتی ہے لیکن بھئی شیر تو پھر شیر ہی ہے وہ تو اپنے سے بڑے بڑے اور مضبوط جانوروں کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ زراف پر چپکے سے جھپٹتا ہے اور اس کی پیٹھ پر سوار ہو لیتا ہے۔ بے چارا زراف گھبرایا ہوا ادھر اُدھر جھاڑیوں سے ٹکراتا پھرتا ہے اور آخرکار بے ہوش ہو کر گر پڑتا ہے۔ اور مر جاتا ہے۔ شیر اسی موقع کے انتظار میں رہتا ہے۔ جہاں وہ گرا کہ شیر نے اس کا تکا بوٹی کر ڈالا۔
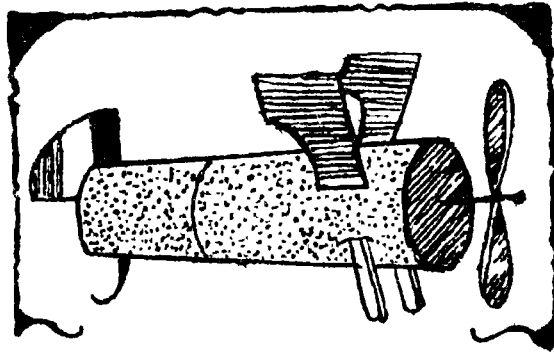
ہوائی جہاز

یہ ننھا منا ہوائی جہاز تم بہت آسانی سے بنا سکتے ہو، سب سے پہلے تمہیں ایک بڑے اور ایک چھوٹے کارک کی ضرورت ہوگی۔ کارک کے دونوں سروں کو سریش سے چپکا دو (تصویریں دیکھکر) پھر دو دیا سلائیاں کارک کے سب سے موٹے حصہ میں نیچے کی طرف لگا دو، (یہ آگے دوڑنے والے کے لئے) اور ایک ٹیڑھی پن (پیچھے دوڑنے والے کے لئے) دم پر، اچھا اب کارک کے دو بازو اور ایک دم کاٹ لو اور ان کو لگا دو لیکن بازوؤں کو پن سے لگانا ہوگا۔ یہ لو تمہارا چھوٹا سا ہوائی جہاز تیار ہو گیا۔ اب اس کو بہت ہی ہلکے رنگ سے رنگ ڈالو۔ پھر یہ بہت اچھا معلوم ہوگا۔

ملو اور فیلو
(۱)
ملو: کیا پڑے خرّاٹے لیتے ہو ہر وقت
آؤ بھی ذرا سیر کو چلیں۔
(۲)
فیلو: چلو بھائی چلو .... یہ بھی عجیب ہے یار مرا، جدھر
سر پھرا ادھر چل دئے
(۳)
ملو: فیلو بھیّا، بھرا پڑا ہے شہد سے، قسم ہے۔
(۴)
لو: مار دیا کمبختوں نے۔
(۵)
فیلو: کیوں میاں ملو، ذرا بات تو سنتے
جاؤ، اتنی بھی تیزی کیا!
(۶)
ایک شہد کی مکھی دوسری سے: چلو بہن
یہ تو کس سے مس نہیں ہوتا

لینن کی ایک کہانی

پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

روس کے دیہات میں، شہروں کی چہل پہل سے، شہروں کے مدرسوں اور اخباروں سے، پڑھے لکھوں سے اور کتابوں سے بہت دور کسی گاؤں کے سرے پر ایک بڑھیا اپنے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں رہتی تھی۔ اس دکھیا کا ——— ——— معلوم ہوتا تھا دنیا میں کوئی نہ رہ گیا ہے، وہ اپنے جھونپڑے میں پڑی رہتی کھانے کو کبھی ملتا کبھی نہ ملتا، تاپنے کو وہ ادھر ادھر سے سوکھی گھاس یا قسمت اچھی ہوئی تو ذرا سی لکڑی بین لاتی۔ جب تک آگ جلتی تو اس کے پاس بیٹھی اونگھا کرتی، جب وہ بجھ جاتی تو وہیں زمین پر گٹھری بن کر پڑ رہتی۔ بڑھیا باتیں خوب کرتی تھی، اور گاؤں میں جس کا جی گھبراتا وہ تھوڑی دیر کے لئے اس کے پاس چلا جاتا اسے سوکھی روٹی یا کچھ اور کھانے کو دیتا اور کوئی بات پوچھ کر گفتگو کا سلسلہ چھیڑ دیتا۔ بڑھیا جب ایک مرتبہ بولنا شروع کرتی تو پھر تھمتی نہ تھی سننے والے چاہے اٹھ کر چلے بھی جاتے، وہ اپنی بات کہتی رہتی، یہاں تک کہ نیند میں آنکھیں بند ہو جائیں اور وہ اونگھ کر زمین پر گر پڑے۔ بڑھیا کی کہانیوں میں سے ایک لینن کی کہانی تھی، اور اسے وہ ایسے شوق سے سنایا کرتی تھی کہ گویا اس کی زندگی کا سہارا یہی کہانی ہے۔

لینن پیدا ایسے وقت میں ہوا جب زار، یعنی روسی بادشاہ کی حکومت ایک درندے کی طرح (جو اتفاق سے کسی بستی میں گھس جائے) ہر طرف ستم ڈھائے ہوئے تھی لینن کا بڑا بھائی عین جوانی میں پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ صرف اس لئے کہ وہ طالب علموں کی ایک انجمن کا ممبر تھا، جو زار کی مخالف تھی۔ لینن کے دل کو اس سزا نے سہمایا نہیں بلکہ اس نے یہ عہد کر لیا کہ زار کی حکومت کو تباہ کر کے چھوڑ دوں گا اور اس کی جگہ غریب کسانوں اور مزدوروں کو ملک کی حکومت دوں گا۔ وہ کئی برس تک انقلاب کی تعلیم دیتا اور حکومت کے خلاف سازشیں کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں ایک انقلاب بھی ہوا مگر اسے تھوڑے ہی دنوں میں زار کی پولیس اور فوج نے ختم کر دیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں، جب زار نے جنگ عظیم میں جرمن فوجوں سے شکست کھائی سارا ملک اس کی حکومت سے بیزار ہو گیا اور روس کی طاقت بالکل گھٹ گئی تو لینن نے موقع کو غنیمت جانا اور انقلاب کا جھنڈا پھر لہرایا۔ اس مرتبہ اسے کامیابی ہوئی، زار کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا گیا اور ایک نئی حکومت قائم ہوئی جو غریب کسانوں اور مزدوروں کی حکومت کہلاتی تھی۔ لیکن پرانی حکومت کے وفادار، جن کا اس میں بڑا فائدہ تھا کہ وہ قائم رہے، جلدی سے ہاری نہیں مان گئے۔ انھوں نے دوسرے ملکوں سے روپیہ لے کر فوجیں تیار کیں اور کئی برس تک اپنے وطن کو خانہ جنگی کی مصیبتوں میں مبتلا رکھا۔

اس کہانی کو بڑھیا یوں بیان کرتی تھی کہ زار نے اپنی

لینن

یہ کشتی ریت پر چلتی ہے

طاقت جمع کی اور لینن نے اپنی، مگر جب زار نے دیکھا کہ لینن کے ساتھ بہت سے آدمی ہیں اور سب جان دینے کو تیار ہیں تو اس نے سوچا کہ آؤ سمجھوتہ کر لیں، اور اسے مال دولت زمین اور حکومت دے کر ملا لیں۔ زار کے مشیروں نے بھی کہا کہ حضور نے بڑی اچھی تدبیر سوچی۔ تو پھر زار نے لینن کے پاس کہلا بھیجا کہ بھائی لڑنے سے کیا فائدہ؟ روس کا ملک بہت بڑا ہے، کچھ تم لے لو، کچھ ہمارے پاس رہنے دو، پھر دونوں خوش رہیں گے۔ لینن بھی بڑا ہوشیار تھا، اس نے کہا اچھا، مجھے منظور ہے۔ پر بٹوارہ اس طرح سے کریں گے کہ کالا کالا میرا، سفید سفید تمھارا۔ کسان میرے اور کسان کی محنت میری۔ مزدور میرے اور مزدور کی محنت میری، سیٹھ سوداگر تمھارے اور اُن کی دھن دولت تمھاری، زمیندار تمھارے اور زمینداروں کی آن بان تمھاری، زمین میری اور وہ پسینہ میرا جس سے زمین سنچتی ہے۔ سنگ مرمر کے فرش اور ریشمی قالین تمھارے اور رئیسانہ زندگی کا سامان تمھارا اندھیرے جھونپڑے اور دھواں دار کارخانے میرے۔ صاف ستھرے گھر اور جگمگاتے محلات تمھارے۔ زار نے جب یہ سنا تو مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ اس نے بڑے جشن منائے اور ناچ گانے کی محفلیں کیں۔ سیٹھ سوداگروں نے جیبوں میں روپیہ کھنکھنایا، زمینداروں نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ اور اُن کی بی بیاں سنہری روپہلی زرق برق پوشاک پہن کر چھما چھم ناچ گانوں کی محفلوں میں گئیں، شام سے صبح سویرے تک کھانا پینا، ہنسی مذاق، چہل اور ٹھٹے بازی ہوتی رہی۔ پھر زار نے لینن کے پاس کہلا بھیجا کہ ہم کو تمھاری بات منظور ہے تم جس طرح چاہتے ہو اسی طرح کا بٹوارہ کرنے پر ہم تیار ہیں۔ زار کے مشیروں نے اور سوداگروں اور زمینداروں نے جھک جھک کر سلام کیا اور کہا کہ بادشاہ سلامت کے اقبال سے ہماری دولت اور ہماری عزت بچ گئی اور زندگی کی تمام نعمتیں ہمیں میسر ہوئیں۔ ادھر لینن نے زار کا پیغام سنتے ہی ڈنکے کی چوٹ پر کہلوا دیا کہ ہر کسان اور مزدور اور محنت کرنے والا جس کی کمر جھک کر ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ جس کے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے ہیں۔ پاؤں میں چھالے ہیں اور دل میں اُداسی، جو کوئی بھوکا اور ننگا ہے اور جس کسی نے بھوکے بچے کو بہلا کر سلایا ہے وہ آجائے میرے جھنڈے کے نیچے۔ میں اُسے کام دوں گا، کھانے کو تازی روٹی دوں گا اور پہننے کو موٹا مضبوط کپڑا۔ کسانوں اور مزدوروں کے ٹڈی دل لینن کے گرد جمع ہو گئے۔ لینن نے کسانوں کو زمین دی، جانور اور مرغیاں دیں اور ان سے کہا کہ لو۔ محنت کرو اور کھاؤ پیو اب تمھیں کسی کا ڈر نہ ہونا چاہیے۔ تمھاری محنت کی کمائی اکر لوٹ لے جانے والا کوئی نہیں۔ اس نے مزدوروں کو اوزار دئے اور کارخانے اور ان سے کہا کہ لو، اب محنت کرو اور چیزیں بناؤ۔ اب تمھاری محنت کی کمائی تمھیں ملے گی کسی سیٹھ سوداگر کی مجال نہ ہوگی کہ تمھاری گاڑھی کمائی سے اپنا پیٹ اور اپنا خزانہ بھرے۔

ادھر زار اور اس کے زمینداروں اور سیٹھ سوداگروں نے کچھ دنوں خوب مزے کئے۔ پھر اُن کی دولت سب لٹ گئی۔ اس کی نوبت آ گئی کہ اُن کے بڑے بڑے اور اونچے مکان اور محل بکنے لگے، اُن کی بی بیوں کے قیمتی زیور گرو رکھے جانے لگے تب وہ سارے کے سارے زار کے پاس پہنچے اور فریاد کرنے لگے۔ زار کا اپنا خزانہ بھی خالی ہو گیا تھا۔ اس کے وزیر ہاتھ

مل رہے تھے۔ اور کہتے تھے کہ حضور اس لینن نے ہم کو بڑا دھوکا دیا۔ اب ہمیں ایک پھوٹی کوڑی کی بھی آمدنی نہیں ہوتی اور خرچ ڈھیروں ہوتا چلا جاتا ہے۔ زار نے پوچھا کہ بتاؤ اب کیا کریں تو سب نے کہا حضور، اس لینن سے کہئے کہ ہمیں ایسا بٹوارہ منظور نہیں، تم نے دولت تو ہم کو دے دی، دولت پیدا کرنے والے سب آپ لے لئے۔ اب نئے سرے سے بٹوارہ کرو۔ لینن نے جب یہ سنا تو وہ غصے سے کانپ اُٹھا اور اس نے کہا کہ بس، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، میرے کسان اور مزدور مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں، میں تمھیں ان میں سے ایک بھی نہ دوں گا۔ زار اور اس کے وزیروں اس کے زمینداروں اور سیٹھ سوداگروں نے یہ جواب سُنا تو وہ بغلیں جھانکنے لگے، مگر تھوڑے سے اُن میں ایسے بھی تھے جو بڑے من چلے تھے۔ انھوں نے اپنی تلواریں میان سے نکالیں اور زار سے کہا کہ حضور، آپ حکم دیں تو ہم اس لینن سے لڑنے کو تیار ہیں۔ زار یہ سُن کر بہت خوش ہوا، اور اُن سے کہا کہ ہاں، تم ضرور لڑو۔ اور میری وفادار رعایا سے کہو کہ وہ بھی ہتھیار باندھ کر لڑنے کو آجائے۔ لیکن کسان اور مزدور جنھیں پکڑ پکڑ کر لوگ فوج میں بھرتی کرتے تھے وہ سب تھے لینن کے ساتھ، زار کے سپہ سالاروں اور کپتانوں کو ڈھونڈھے سے بھی ایک سپاہی نہ ملا۔ اُن کے چہرے اُتر گئے جی بیٹھ گئے، وہ زار کے پاس گئے اور انھوں نے کہا کہ حضور کسان اور مزدور تو سب لینن کے ساتھ ہیں ہم کسے پکڑ کر فوج میں بھرتی کریں۔ زار کا یہ سن کر منہ پیلا پڑ گیا۔ تب سپہ سالاروں اور کپتانوں نے کہا کہ حضور حکم دیں تو ہم پردیس جاکر روپیہ اُدھار لیں اور سپاہی نوکر رکھیں۔ تب ہم اس لینن کا مزاج ٹھیک کر دیں گے۔ زار نے کہا اچھا یہی کرو۔

لینن کو معلوم ہوا کہ پردیس سے سپاہی کرائے پر لڑنے کو بلائے گئے ہیں۔ تو وہ لال پیلا ہو گیا۔ اور اس نے زار کے پاس کہلا بھیجا کہ تم نے میرے ساتھ بدعہدی کی ہے۔ لیکن تم لڑنا چاہتے ہو تو میرے کسان اور مزدور بھی لڑنے کو تیار ہیں آؤ مقابلہ کرو۔

اس کے بعد زار کے سپہ سالاروں اور کپتانوں کی لینن سے بڑی سخت لڑائیاں ہوئیں۔ ملک سارا تباہ ہوا۔ وبائیں پھیلیں، قحط پڑے۔ آخر میں جیت لینن کی ہوئی اور اس کے کسانوں اور مزدوروں کی۔ تب اس نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور یہ حکم دیا کہ جو کسان یا مزدور نہیں ہے جو کسانوں اور مزدوروں کی بھلائی نہیں چاہتا اور جو اُن کی سیوا نہیں کرنا چاہتا وہ اس دیس سے نکل جائے۔ ہمارا روس کسانوں اور مزدوروں کا دیس ہے۔ وہی اس کے راجہ ہیں۔ وہی اس کے پرجا۔ اور میں ان کا کمترین خادم ہوں۔

لینن اور زار کی لڑائی اس طرح سے نہیں ہوئی جیسے کہ بڑھیا نے اپنے دل میں سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۱۷ء میں انقلاب ہونے دار السلطنت پر قبضہ کرتے ہی زار اور اس کے خاندان کو غائب کردیا اور حکومت اور ملک پر قبضہ کرلیا لیکن دنیا دیکھو تو اس میں ہر جگہ سفید اور کالے امیر غریب کی تقسیم ملتی ہے، ہر جگہ ایک طرف محنت کرنے والے ہیں اور دوسری طرف اس محنت سے فائدہ اٹھانے والے۔ دنیا کے سچے خادم اور خدا کے سب سے نیک بندے وہ ہیں جو لینن کی طرح سفید کو چھوڑ کر کالے کو اپنا لیتے ہیں۔ جنھیں دنیا کی فلاح اور اپنی زندگی کا صحیح مقصد اس میں نظر آتا ہے کہ محنت کرنے والے کو اس کی محنت کا پھل ملے، مفت خوری اور اونچ نیچ کے داغ مٹا دئے جائیں اور خدمت اور ایثار کا شوق شرافت کا پیمانہ ہو۔

عجیب عجیب سکّے

محمد اختر خاں یوسف زئی

جب تمھیں کتاب، قلم، پنسل، یا اسی قسم کی کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو تم اپنے "ابا جان" سے پیسے لے کر بازار جاتے اور دوکان دار سے خرید لیتے ہو۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ دنیا میں روپے پیسے موجود ہی نہ ہوں تو چیز کیسے ملے۔ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تم دوکان دار کو کوئی چیز دو اور وہ اس کے بدلے میں تم کو کتاب یا قلم دوات دے۔ لیکن اگر تمھاری چیز دکان دار کے مطلب کی نہیں تو وہ اپنی چیز سے کیوں بدلنے لگا پھر؟ پھر کیا۔ ماسٹر صاحب ناراض ہوں گے اور تمھیں درجے سے نکال دیں گے۔

دیکھو دو چیزوں کے ایک دوسرے سے بدلنے میں کتنی دشواری ہوتی ہے، لیکن ہزاروں سال پہلے دنیا میں چیزوں کے لین دین کا یہی چلن تھا۔ وہ لوگ چیزوں کے مبادلے سے ہی کام چلاتے تھے، مثلاً اگر ایک کے پاس گائے ہوتی اور اس کو خیمہ درکار ہوتا اور اسے گائے کی ضرورت ہوتی تو وہ دونوں آپس میں گائے اور خیمہ بدل لیتے۔ ہندوستان کے بعض دیہاتوں میں چیزوں کے مبادلے کا یہ طریقہ ابھی تک ہے۔ لوگ اناج دے کر نمک، ترکاری اور مٹی کے برتن لیتے ہیں۔ اس کے بعد جب لوگوں میں سوجھ بوجھ اور تہذیب اور شائستگی ہو گئی تو اس وقت کے عقل مندوں نے سوچا کوئی ایسی تدبیر کرنا چاہئے کہ تمام چیزیں آسانی سے مل سکیں۔ بس جبھی سے سکّوں کا رواج شروع ہوا۔

سب سے پہلے لوگوں نے غلّہ اور مویشیوں کو لین دین کا ذریعہ بنایا اور اس طرح غلّہ یا جانور دے کر دوسری چیزیں لے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ دنیا کے مختلف حصوں میں نمک، کھجور، ناریل، چائے، کوئلہ، زیتون کا تیل، چینی مٹی، چمڑا، ربر......... وغیرہ۔ بیچ کھوچ کے لئے گویا سکے قرار پائے۔ اسی طرح ہندوستان اور افریقہ میں کوڑیاں، جزیرہ سائپرس میں تانبے کے برتن، امریکہ میں تمباکو لین دین اور تجارت کے کاموں میں استعمال ہوتا تھا۔ جزیرہ فیجی میں وھیل مچھلی کے دانت سکے کے طور پر کام میں لائے جاتے تھے۔ اور ایک دانت کی قیمت ہمارے ہندوستان کے روپیوں کے مطابق ۱۰۰ روپے ہوتی تھی۔ اقبال نامہ جہاں گیری میں ہے کہ کشمیر میں نمک نہیں ہوتا۔ اس لئے وہاں کے لوگ زعفران کے بدلے ہندوستان سے نمک لیتے تھے۔ "وسط افریقہ میں ہاتھی کی دم کے سیاہ باریک چھلے دار بال آزادانہ طور پر استعمال ہوتے تھے

ہاتھی کی دم کے سیاہ باریک چھلے۔

مگر جب یورپ کے لوگ یہاں پہنچے ، اور کانگو کے سینکڑوں ہاتھیوں کا شکار کر ڈالا تو اُن کے بالوں کی قیمت گرتی گئی اور رفتہ رفتہ کچھ دنوں کے بعد ان کا رواج بند ہوگیا۔ کردستان میں سونے چاندی کے کڑے سکوں کی صورت میں چلتے تھے جب ڈاکو باشندوں پر حملہ کرتے تھے تو وہ لوگ جھٹ انھیں پہن لیتے تھے۔ اور اس طرح ان کی دولت اُن کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ کڑے اپنے مالکوں

عام طور پر دھات کے (خاص خاص شکلوں کے) ایک ہی وزن کے ٹکڑے جن پر بادشاہ یا حاکم کا نام ہو سکے کہلاتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اُن کا رواج کب سے ہوا۔ مگر جہاں تک لوگوں کا خیال ہے دنیا کا سب سے پہلا "دھات کا سکہ" چین میں بنایا گیا۔ یہ سکہ پھاوڑے کی شکل کا ہے۔ اور ایسے بنے ہوئے تیس ہزار برس سے زیادہ ہو چکے ہیں اس وقت یہ سکہ امریکہ کے ایک شخص کے
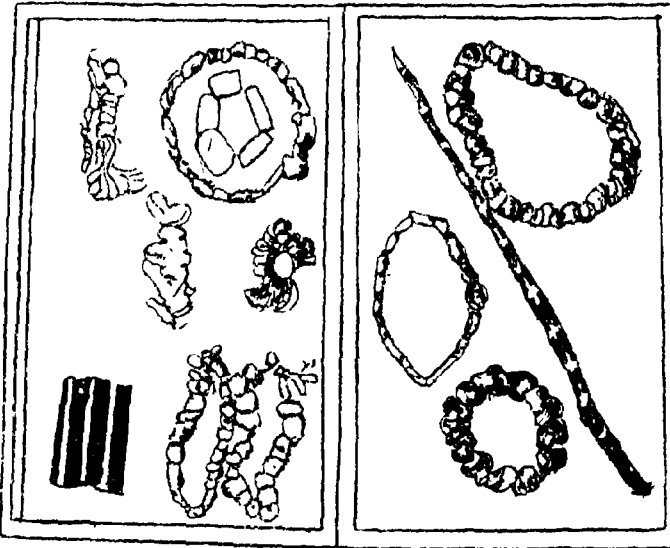
موتی، کوڑیاں اور خالی کارتوس۔ حبش میں اب تک سکے کے طور پر استعمال ہوتے تھے

کو تلوار اور چھرے کی زد سے بچا لیتے تھے۔ اور تو اور الاسکا (شمالی امریکہ کا انتہائی شمالی مغربی خطہ) میں "گوند" کے گول گول ٹکڑے سکوں کی طرح استعمال ہوتے تھے۔ جب وہاں کی نوآبادیاں تجارت میں ترقی کر گئیں تو باشندوں نے "مصری" کی ڈلیوں سے سکے کا کام لیا۔ چمڑے کے سکے ہمایوں کے زمانے میں نظام سقے نے اپنی آدھے دن کی بادشاہت میں چلائے تھے۔

پاس موجود ہے۔

اگر سکے کی تاریخ پر غور کیا جائے تو یقیناً ہم اسے دنیا کے عجائبات میں شامل کر سکتے ہیں۔ دنیا کا سب سے چھوٹا چھوٹا سکہ بندوق کے چھرے کے برابر، اور سب سے بڑا آدمی کے آدھے قد کے برابر۔ یہ سکہ آج سے ایک سو سال پہلے الاسکا میں استعمال ہوتا تھا۔ یہ خالص الاسکا کے تانبے کا بنا ہوتا تھا اور اس کا وزن ۹۰ پونڈ (ایک من پانچ سیر

ہوتا تھا۔ اس کی قیمت ۲۵۰۰ ڈالر یعنی تقریباً ۷۵۰۰ روپیہ کے برابر ہوتی تھی۔ دنیا کے عجیب سکوں میں سے ایک قسم
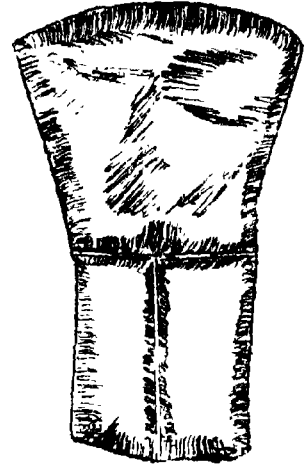
دنیا کا سب سے بڑا دھات کا سکہ

سکہ جزیرۂ یاپ" (جزائر جنوبی) میں رائج تھا۔ اچھا ہی ہوا وہاں پیدا نہیں ہوئے۔ ورنہ وہاں کے سکے ہمارے لئے کا جنجال بن جاتے۔ مگر سکے جمع کرنے والے تو وہاں جانا پسند کریں گے۔ اس جزیرہ میں پتھر کے سکے کام میں لائے جاتے تھے۔ ان کی شکل بیل گاڑی کے چھوٹے پہیوں کی طرح ہوتی تھی۔ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا طریقہ بھی عجیب تھا۔ ان سکوں کے درمیان ایک سوراخ ہوتا تھا۔ اس سوراخ (○) میں ایک لکڑی ڈال کر اس کو دھکا دے کر لے جاتے تھے۔ ان کو لے جانے کا طریقہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے ہندوستان میں پتھر کے بیلن لے جایا کرتے تھے۔ ان سکوں کو بنانے کے لئے پتھر ایک خاص جزیرے سے آتا تھا۔ یہ مقام جزیرہ یاپ سے ۳۰۰ میل کے فاصلے پر سمندر کے درمیان واقع تھا۔ پتھر کے ایسے ایک سکے کی قیمت جس کا قطر ۳۰ انچ اور وزن ۱۷۰ پونڈ ہو ایک کشتی یا ایک عورت یا ۱۰۰۰ ناریل کے برابر ہوتی تھی۔

سکوں یعنی روپیوں اور پیسوں کو جمع کرنے اور رکھنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ کوئی صندوق میں چھپا کر رکھتا ہے اور اکثر بنک میں جمع کر دیتے ہیں۔ بہت سے زمین میں دفن کرکے رکھتے ہیں۔ اسی طرح جب کہیں بازار وغیرہ جانا ہوتا ہے تو روپے پیسوں کو جیب میں رکھ کر یا کپڑے میں باندھ کر یا بٹوے میں رکھ کر (بٹوہ کپڑے کا یا چمڑے کا) لے جاتے ہیں۔ برما کی عورتیں اپنے کانوں میں بڑے بڑے سوراخ کرکے اس میں ڈبیا جیسی کوئی چیز رکھ لیتی ہیں اور پھر ان ڈبیوں میں پیسے رکھتی ہیں۔ افریقہ اور چین وغیرہ میں ان سب باتوں کا بالکل جھگڑا نہیں۔ وہاں کے سکوں میں سوراخ ہوتا ہے (ایسا ایک سکہ میرے پاس ہے) لوگ تمام سکوں کو رسی میں گوندھ لیتے ہیں اور کندھے پر ڈال لیتے ہیں۔ یا کمر میں باندھ لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح "ملکا" میں سکے "درخت کی صورت" میں ڈھالے جاتے تھے۔ ایک ایک تنے میں بارہ بارہ سکے لگے ہوتے تھے۔ جب کسی کو کوئی چیز خریدنی ہوتی تھی تو وہ اس میں سے ایک یا دو سکہ توڑ کر دوکان دار کو دے دیتا تھا۔ جب تمام سکے ختم ہو جاتے تھے تو تنے کو پھینک دیا کرتے تھے۔

امید ہے کہ ہماری طرح بہت سے دوسرے پیامی بھائیوں کو بھی سکے جمع کرنے کا شوق ہوگا۔ دنیا میں بہت سے لوگ اس پر لطف مرض میں گرفتار ہیں۔ چنانچہ

صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ۵۰۰۰ سے زیادہ آدمی سکے جمع کرتے ہیں۔ اور روز بروز یہ شوق ترقی کرتا جا رہا ہے۔ ان میں ایک صاحب ہو ورڈ ڈی گبس نامی ایک امریکن بھی ہیں۔ گبس کے ذاتی میوزیم میں اس وقت ۱۳۰۰ طرح کے مختلف سکے موجود ہیں۔ گبس کو سکے جمع کرنے کا شوق ایک ننھے فرانسیسی سکے نے دلایا۔ جس وقت گبس کی عمر ۸ سال کی تھی ان کے ایک رشتہ دار ان لوگوں سے ملنے آئے اور انھوں نے گبس کو ایک سکہ دیا جس کا سن ۱۵۵۶ عیسوی تھا
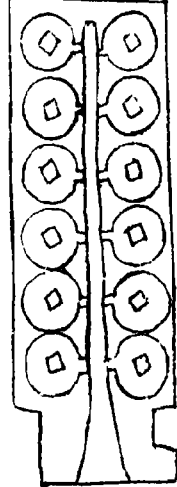
درخت نما سانچہ: جس میں ملکا کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔

چنانچہ آج بھی یہ سکہ گبس کے اس بیش بہا خزانے میں موجود ہے جو اس وقت بڑی بڑی الماریوں، صندوقوں اور درازوں میں بھرا پڑا ہے۔ گبس کے میوزیم کی ایک دن کی سیر میں تمام دنیا کا لطف آجاتا ہے۔

گبس کے اس میوزیم میں خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے کے بلکہ اس سے بہت پہلے حضرت عیسیٰ کے وقت کے سکے پائے جاتے ہیں اور ہیٹ اور چیتے کی زبان کے شکل کے سکے بھی ہیں۔ وہاں پر پھاوڑے کی شکل کا چین کا سکہ، چوڑنما بلجیم کانگو، برہما کے چائے کے سکے، روس کے روٹی کے سکے،

چوڑنما بلجیم کانگو کا سکہ یہ آج سے دو سو سال قبل کانگو میں استعمال ہوتا تھا۔ گڑھا کھود کر اور اس میں پگھلا ہوا تانبا ڈال کر بنایا جاتا تھا۔

چین کے پنیر کے سکے ...... سب ملیں گے۔ دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا سکہ بھی گبس کے پاس ہے اس کے علاوہ ابی سینا کے نمک کے سکے، جزائر جنوبی اور میکسیکو کے پروں کے سکے بھی موجود ہیں۔ گبس نے زمانہ قدیم سے لے کر

ابی سینا کا نمک کا سکہ

موجودہ زمانے کے تمام سکے بل، نوٹ تک جمع کر رکھے ہیں۔

روزانہ طرح طرح کے سکے ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں۔ مگر عام لوگوں کو ذرا بھی خیال نہیں ہوتا۔ لیکن ایک سکے جمع کرنے والے کی آنکھ فوراً نئے سکے پر جا پڑے گی۔ وہ ہر وقت اسی دھن میں لگا رہتا ہے کہ کوئی نیا سکہ ملے اور اس کا خزانہ بڑھے۔ اور اس مثل کے مطابق کہ جو یندہ یابندہ (جو ڈھونڈھتا ہے وہ پاتا ہے) نئے نئے سکے بھی مل جاتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مغربی انگلینڈ میں ایک کلرک شام کے وقت دن بھر کے تمام داموں کا حساب لگا رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر ایک میلے زنگ خوردہ "سنیٹ" پر جا پڑی، غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۶۹۳ء میں ڈھالا گیا تھا۔ اور اس کی موجودہ قیمت ۳۰۰ ڈالر یعنی اس کی اصل قیمت سے ۳۰۰۰۰ گنی تھی۔ اسی طرح امریکہ کے ایک بنک میں ایک شخص روپیہ جمع کرنے آیا۔ اس نے کلرک کو دوسرے ڈالروں کے ساتھ ایک ڈالر دیا جو امریکہ میں سب سے پہلے ڈھالا گیا تھا۔ اس شخص نے اس سکے کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ مگر کلرک کو جو سکے

چین کا سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا سکہ

ع کرنے کا شوقین تھا، ایک قیمتی چیز مل گئی، یہ کوئی ضروری بات

نہیں کہ ایسی باتیں صرف مغربی ممالک ہی میں ہوا کریں۔ بلکہ یہاں بھی ایسی باتیں ظہور میں آیا کرتی ہیں۔ ایک دفعہ میں نے ایک دوکان سے چند چیزیں خریدیں اور دوکان دار کو ایک روپیہ دیا۔ وہ مجھے پیسے دے رہا تھا کہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ چیز دے دو مجھے دور جانا ہے دوکان دار نے اس کو مطلوبہ شئے دے دی۔ اس شخص نے جلدی سے دوکان دار کو تین پیسے دئے اور بھاگ گیا۔ دوکان دار نے پیسے دیکھ کر کہا کہ دیکھئے اس شخص نے دھوکا دیا اور ایک کھوٹا پیسہ دے گیا اور مجھے وہ پیسہ دکھایا۔ وہ سکہ ہانگ کانگ کا ایک سینٹ کا سکہ تھا۔ میں نے اس کے بدلے میں دوکان دار کو ایک پیسہ دے دیا۔ اور پیسہ (سنیٹ) اپنے قبضے میں کر لیا اس واقعے سے سب خوش ہوئے۔ اس شخص کو چیز مل گئی دوکان دار کو پیسہ مل گیا۔ اور مجھے عجیب چیز۔

قیمتی دھاتوں کے جتنے عجیب سکے ہندوستان میں بنائے گئے ویسے دنیا میں کہیں نہیں ملتے ہندوستان کے ان عجیب سکوں میں سب سے عجیب اور مزے دار سکے جہاں گیر کے عہد میں بنائے گئے۔ ان میں سے بعض بعض سوا سوا سیر کے تھے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ان سکوں کے نام لکھ دئے جائیں:۔

نام سکہ (چاندی)	نام سکہ (سونا)	وزن
کوکب طالع	نور شاہی	۱۰۰ تولہ
کوکب اقبال	نور سلطانی	۵۰ "
کوکب مراد	نور دولت	۲۰ "
کوکب بخت	نور کرم	۱۰ "

نام سکہ (چاندی)	نام سکہ (سونا)	وزن
کوکب سعد	نور مہر	۵ تولہ
جہان گیری	نور جہانی	۱ ؍؍
سلطانی	نورانی	۶ ماشہ
نثاری	رواجی	۳ ؍؍
خیر قبول	×	۱/۲ تولہ

(تزک جہاں گیری)

اسی طرح تانبے کے بھی سکے بنائے گئے اور ان کے خاص خاص نام رکھے گئے۔ ۱۰۰ اور ۵۰ تولوں کے سکوں کے ایک طرف یہ شعر لکھا ہوتا تھا ؎

بخط نور برزد کلک تقدیر
رقم زد شاہ نورالدین جہاں گیر

اور دونوں مصرعوں کے بیچ میں کلمہ۔ دوسری طرف یہ شعر ہوتا تھا ؎

شد چوں خور زیں سکہ نورانی جہاں
آفتاب مملکت　تاریخ　آں

اور دونوں مصرعوں کے درمیان مقام ضرب (ٹکسال گھر) سنہ ہجری اور سنہ جلوس لکھا ہوتا تھا۔ نورجہانی عام طور پر رائج تھا۔ اس کا وزن دوسرے گذشتہ بادشاہوں کی اشرفیوں سے زیادہ ہوتا تھا۔

نئے قسم کا پتنگ
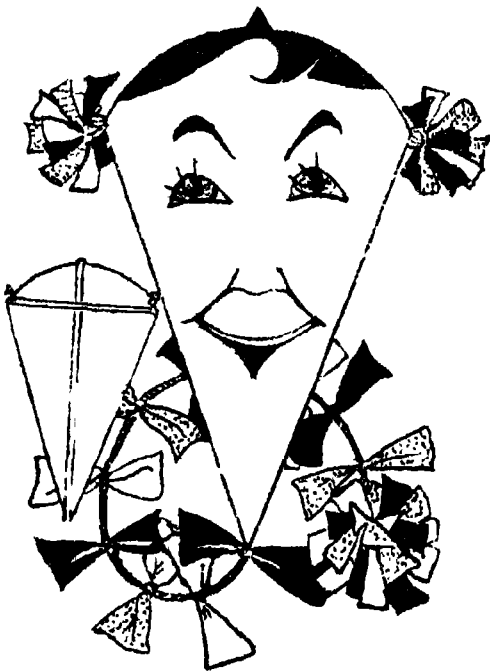
پتنگ اُڑانے کا تو تمہیں ضرور شوق ہوگا مگر یہ پتنگ نئی وضع کا ہے۔ تم اسے گھر پر بھی آسانی سے بنا سکتے ہو اس کا ڈھانچہ لکڑی کی دو پتلی چھڑیوں کا ہے۔ ایک لکڑی دوسری لکڑی پر رکھ کر کیلیں ٹھوک دی گئی ہے، بعد میں ایک سخت بھورے کاغذ کو پتنگ کی شکل کا کاٹ لو اور اس کاغذ کو ان چھڑیوں کے ڈھانچہ پر رکھ کر چپکا دو۔ **الف** اور ب پر کاغذ کے بنے ہوئے پھندنے پتلی رسی سے باندھ دو۔ لیکن پتنگ کی دم ایک مضبوط رسی کے ٹکڑے کی ہونی چاہئے اور پتنگ کا چہرہ تو بعد میں تم خود اپنے رنگ کے ڈبے سے رنگ سکتے ہو۔ اگر تم اسے آسانی سے بنا سکے تو یہ بالکل انوکھی چیز ہوگی اپنے ہاں کی پتنگوں سے بالکل جدا، تمہارے دوست اسے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

سورج جب چھپ جاتا ہے   چاند نکل کر آتا ہے
شبنم پڑنے لگتی ہے   موتی جڑنے لگتی ہے
تارے گیت سناتے ہیں   نور کا مینہ برساتے ہیں
ہم بھی ناچا کرتی ہیں

دو، دو پریاں مل مل کر   ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر
آگے پیچھے گا گا کر   دائیں بائیں آ جا کر
چھوٹے چھوٹے قدموں سے   ہلکے پھلکے قدموں سے
ہم سب ناچا کرتی ہیں

اندرجیت شرما
ماچھرہ ضلع میرٹھ

قطب شمالی کا ہوائی سفر

از آفتاب حسن صاحب

ابھی حال میں تم نے خبر سنی ہوگی کہ جون کے مہینے چار روسی ہوا باز ماسکو سے اُڑ کر، قطب شمالی پر سے گذر کر، بغیر رُکے، شمالی امریکہ پہنچ گئے۔ کیسا ہنگامہ ہوا ہر طرف، اور کتنا شور کیا لوگوں نے، تم نے اخباروں میں پڑھا ہی ہوگا۔ صرف تعریفوں ہی سے اخباروں کے صفحے کے صفحے سیاہ ہوگئے۔ روس والے خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے اور پھر کیوں نہ خوش ہوتے۔ ہمارے ملک والے کوئی ایسا کام کرتے تو کیا ہمیں رنج ہوتا؟ کیا فخر سے ہم بھی اپنا سر اونچا نہ کئے رہتے۔ غور کرو تو روسیوں نے واقعی بڑا کمال کیا ہے قطب شمالی کو کون نہیں جانتا، وہی جگہ تو ہماری زمین کے محور (دھرے) کا شمالی کنارہ ہے۔ اسی محور پر تو زمین چکر کھاتی ہے۔ اسی قطب شمالی پر تو چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے۔ وہاں ہر طرف برف ہی برف ہے۔ جدھر دیکھو سفیدی اور جدھر جاؤ خاموشی۔ اس سنسان مقام میں قطبی ریچھ ادھر ادھر سیر کیا کرتے ہیں اور انسانوں میں گنے چنے اسکیمو۔ سیل مچھلی کا شکار کرکے اپنا پیٹ بھرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ پھر معمولی انسان کا وہاں گذر نہیں تم کہو گے کہ معمولی کا نہیں تو خاص کا ہوگا۔ تمھارا یہ کہنا ٹھیک ہے۔ ہماری دنیا بہت دلچسپ جگہ ہے۔ طرح طرح کے لوگ یہاں بستے ہیں۔ کچھ نیک لوگ تو ایسے ہیں کہ کام ہی کرنے سے گھبراتے ہیں۔ آسان سے آسان کام ان سے پار نہیں لگ پاتا دنیا میں زیادہ تعداد اُن ہی کی ہے۔ ہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے نزدیک مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہوتا ہے یہی لوگ ہمارے لئے نئے نئے ملک ڈھونڈھ نکالتے ہیں اور نئی نئی باتیں دریافت کرتے ہیں۔ تو صاحب کچھ ایسے ہی لوگ تھے جنھوں نے بڑی مصیبتیں جھیلیں اور قطب شمالی کی سیر کی۔ اس کی کہانی تو اتنی لمبی ہے کہ میں کہتے کہتے تھک جاؤں اور اتنی دلچسپ کہ تم سنتے سنتے نہ تھکو۔

ساری باتیں کہنے کا موقع اور گنجائش نہیں مختصر طور پر یہ سنو کہ سب سے پہلے ۱۹۰۹ء میں ایک امریکی انجینیر کمانڈر پیری نامی قطب شمالی پر پہنچا، یہ سب سے پہلا شخص تھا جو ایسی جگہ پہنچ گیا۔ جہاں اب تک انسان کا قدم تک نہیں

پہنچا تھا۔ اور جہاں سے سارے رستے جنوب ہی کو جاتے ہیں
ان بھی سمجھ لو کہ قطب شمالی کا پتہ تو صرف مقناطیسی آلے ہی کی مدد
سے چلتا ہے وہاں پر زمین میں کوئی خاص فرق تو ہے نہیں
نانچہ غلطی سے پیری قطب سے چار میل آگے نکل گیا۔ آلے
دیکھا تو غلطی محسوس ہوئی اور پھر واپس لوٹا۔ اس نے بعد
۱۹۲۵ء میں مئی کے مہینے امنڈسن جزیرہ اسپٹزبرگن سے ہوائی
از پر بیٹھ کر اور قطب کا چکر لگا کر واپس آیا۔ اسپٹزبرگن
رے کی حکومت میں ہے اور قطب سے ...۶ میل دور
سی میں اس کا جہاز سمندر میں گر پڑا اور وہ ڈوبتے ڈوبتے بچا
اس نے اطلاع دی کہ ہوائی جہاز سے قطب شمالی کو
سکتے ہیں۔ مگر ہے یہ مشکل کام۔ جب کسی بات کی دھن
جائے تو پھر مشکلوں سے کون ڈرتا ہے۔ لوگوں کا شوق کم
ہوا اور ۱۹۲۶ء میں امریکی کمانڈر بائرڈ اسپٹزبرگن سے
ہ گھنٹے میں قطب کا چکر لگا کر واپس آگیا۔ اور ثابت
یا کہ یہ ایسا مشکل کام نہ تھا۔ پھر اس کے بعد امنڈسن
الوی طیارچی (ہواباز) اور سیاح نوبائل کے ساتھ
ب شمالی دوبارہ گیا۔ نوبائل بھی بہت خوش نصیب تھا
نے اپنی زندگی میں قطب شمالی اور قطب جنوبی دونوں
ھے اس کے بعد نوبائل ایک اطالیہ نامی ہوائی جہاز پر
یہ غائب ہوگیا۔ امنڈسن اسے ڈھونڈھنے گیا اور
میں جان دے دی۔ کچھ دنوں بعد نوبائل کا پتہ چل
اور وہ بچا لیا گیا۔

اب سنو، کہ اطالیہ کے واقعے کے بعد لوگوں
طب شمالی سے زیادہ دلچسپی نہ رہی۔ وہاں تک لوگ
ہی چکے تھے۔ اب بار بار جانے سے حاصل؟ لیکن

روس والوں کا یہ خیال نہ تھا وہ دل میں کہا کرتے تھے۔ کہ صرف قطب پر ایک دو بار جانے سے کیا فائدہ۔ تعریف تو جب ہے کہ ہمیں وہاں کا حال ذرا ... اور زیادہ معلوم ہو وہاں ہر موسم میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اس کا علم رہے اور جہاں جہاں سمندر اور جہاں جہاں زمین ہے اس سے ہم واقف ہوں۔ اور پھر؟ ...... جانتے ہو انھوں نے کیا سوچا؟ تمھیں یقین نہ آئے گا! انھوں نے یہ سوچا کہ پھر اُن کے (روسی) ہوائی جہاز قطب کے رستے سے امریکہ جایا کریں۔

ممکن ہے تمھیں تعجب ہوا ہو اور بھی شروع میں ہمیں بھی تعجب ہوا تھا۔ لیکن پھر جب ہم نے غور کیا کہ دنیا گول ہے، اور اس کے نقشے کو اور کرّے کو اچھی طرح دیکھا تو بے اختیار روسیوں کے خیال کی تعریف کرنی پڑی اور دل سے واہ واہ نکل گئی۔ یقین کرو کہ یورپ سے امریکہ کا سب سے قریب رستہ قطب شمالی ہو کر ہی ہے۔ یہ فاصلہ صرف ساڑھے چھ ہزار میل کے قریب ہے ویسے کوئی معمولی رستے یعنی بحر اوقیانوس ہو کر جائے تو اس سے بہت زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑے گا اور سنو دلچسپ کی بات کہ ہندوستان سے شمالی امریکہ کا قریب ترین رستہ بھی قطب شمالی ہو کر ہی ہے۔ یقین نہ ہو۔ تو نقشہ دیکھ لو۔

تو صاحب یوں ہوا کہ روسیوں نے طے کر لیا کہ یہ ہے کام کی چیز۔ اس کے پیچھے پڑ جانا چاہیے اور اس کو کامیاب بنانا چاہیے۔ ہمارے قومی شاعر اقبال نے کہا ہے

"اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے"

روسیوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا سچ پوچھو تو اس نئے رستے پر فتح پا کر یہ ثابت کر دیا کہ یقیناً وہ زندوں میں ہیں۔

اب یہ فتح انھوں نے کس طرح حاصل کی اس کا بھی حال سنو۔ قطب شمالی کا علاقہ ابھی گم نام ہی تھا کہاں پر کھسکتی رہتی ہے۔ اور ان چیزوں کی، تم جانتے ہو کہ ہوائی جہاز کو سخت ضرورت رہتی ہے ان باتوں کو معلوم کئے بغیر اس کا اڑنا مشکل ہے۔

روسیوں نے سب سے پہلے قطب شمالی علاقے
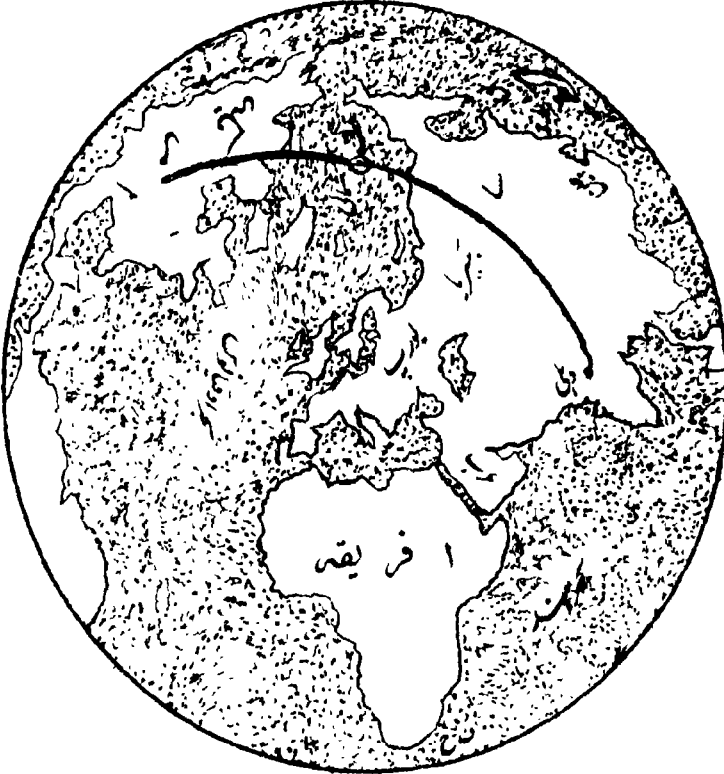
ہندوستان سے امریکہ شمالی کا قریب ترین رستہ قطب شمالی ہو کر ہے

یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ ہو آئے تھے مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے یہ پتہ تو چلایا ہی نہیں کہ اس طرف موسم کس طرح بدلتا ہے، کب آندھی آتی ہے کب طوفان آتا ہے۔ زمین کیسی ہے، کہاں کہاں سمندر میں برف جمی اور قائم رہتی ہے اور کے متعلق معلومات حاصل کرنے کا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لئے انھوں نے اپنے ملک کے شمالی ساحل پر ستر ریڈیو اسٹیشن قائم کئے اور خوب اہتمام کیا۔ قطب شمالی سے چھ سو میل روس کی طرف ایک جگہ ہے۔ فرانز جوزف لینڈ۔ ایک روسی

ہوا باز ماسکو سے اُڑکر ۲۴ گھنٹے میں فرانز جوزف لینڈ سے
واپس چلا آیا۔اسی طرح روسی آہستہ آہستہ اُس طرف بڑھتے
رہے۔ انھوں نے طے کرلیا کہ جب تک قطب شمالی پر پوری
طرح قبضہ نہ کرلیں گے اس کا ذکر کسی سے نہ کریں گے۔اس لئے
ناکامی پر جگ ہنسائی نہ ہو۔ فرانز جوزف لینڈ کے نزدیک
یک چھوٹا سا جزیرہ روڈولف نامی ہے انھوں نے یہاں
یک رصدگاہ قائم کی رصدگاہ اس عمارت کو کہتے
ی جہاں سائنس کے آلات کے ذریعے آسمان اور موسم کی
یکھ بھال ہوتی ہے۔ وہاں انھوں نے برف میں ہوائی جہازوں
ایک اسٹیشن بنالیا۔ تین چار ہوائی جہاز لاکر رکھے گئے اور
ہوا باز وہاں رہنے لگے۔ قطب چونکہ یہاں سے ساڑھے
نچ سو میل دور واقع ہے اس لئے وہاں تک کی موسمی حالت
م کرنا بہت مشکل تھا۔ اس لئے خاص قطب شمالی ہی کے
یب ایک رصدگاہ قائم کرنا ضروری تھا

اس بات کو یاد رکھو کہ جب انسان کسی کام کا ارادہ
تا ہے تو خدا بھی اس کی مدد کرتا ہے۔ چنانچہ روسیوں
خدا نے مدد کی..... روڈولف پر رصدگاہ بنانے کے
سال بعد یعنی اس سال، قطبی مہم کے صدر پروفیسر
ٹ ایک خاص قسم کے ہوائی جہاز پر جو قطبی پانیوں ہی
ے بنا تھا، روڈولف پہنچے وہاں سے ایک ماہر طیارچی
از) ان کو اور چار دوسرے پروفیسروں کو لے کر شمال
نب اُڑا۔ اور قطب کا ایک چکر لگا کر چند میل مغرب کی
ب ایک تیرتے تودے پر بخیریت تمام اُتر پڑا۔

لو صاحب! جس چیز کی لوگوں کو مدت سے خواہش
وہ حاصل ہو گئی۔ روسی حکومت نے قطب شمالی کو اپنی
سلطنت میں شامل کرلیا۔ وہاں سے چند میل ہٹ کر روس
کا سُرخ جھنڈا گاڑ دیا۔ اور ایک رصدگاہ قائم کر ڈالی۔
وہاں چار آدمی ہمیشہ رہیں گے تاکہ موسم کی دیکھ بھال اور علمی
مشاہدے کرتے رہیں۔ پروفیسر اشمٹ نے ایک لاسلکی پیام
میں بتایا کہ پانچ خیمے نصب کرلئے گئے ہیں ان کا خیال ہے
کہ رصدگاہ امریکہ کی طرف کھسک جائے گی کیونکہ قطب پر
بہت گہرا سمندر ہے۔ حالانکہ برف کی ایک بہت موٹی تہ
جمی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے یہ
تہ کچھ ہل جاتی ہے اور کھسک جاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ
لاسلکی کے ذریعے وہ جزیرہ روڈولف اور ماسکو سے بات چیت کرتے رہینگے
جزیرہ روڈولف میں چار ہوائی جہاز ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ جس وقت
قطب نما والے پکاریں گے۔ وہ فوراً ضروری سامان لے کر پہونچ جائیں گے
اگر قطب پر موسم اچھا نہ رہا تو چھتریوں کے ذریعے گرا دیں گے

قطبی کیمپ کے لئے دو سال کی خوراک تیار کی گئی
ہے۔ غذا کو پکا کر خشک کرلیا گیا ہے اور دباؤ کے ذریعے اس
طرح کا بنالیا گیا ہے کہ اس میں پوری غذائیت بھی موجود ہو
جگہ بھی کم لے اور خراب بھی نہ ہو۔ قطبین پر سردی کے سبب
غذائیں بھی خراب نہیں ہوتی۔ تمھیں یہ سن کر دلچسپی ہوگی کہ
اس کی تیاری میں مکھن، مچھلی، پنیر اور چاکلیٹ کے علاوہ
پچاس مویشی۔ پانچ ہزار پانچ سو مرغیاں اور چوراسی من
ترکاریاں خرچ ہوئی تھیں۔ کیا خیال ہے، کھانا کچھ ایسا بُرا
تو نہ ہوگا!

اب تک تو روسی حکومت خاموش تھی لیکن قطب پر
رصدگاہ بننے کے ساتھ اس کے صبر کا پیمانہ بھر گیا، خوشی کی
کوئی انتہا نہ رہی اور اُس نے دنیا میں اعلان کردیا کہ

قطب ہمارا اور ہم قطب کے۔ ماسکو والے ایسے خوش ہوئے کہ بس پوچھو نہیں۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر سڑک پر ناچنے لگیں

اب قطب پرسے گذرنے کی تیاری ہونے لگی لمبے سفر کرنے والے ہوائی جہاز کو ٹھیک کیا گیا اس پر ضرورتاً اُترنے کے لئے آلے لگائے گئے۔ بہت کافی پٹرول بھرا گیا اور چار طیارچی روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں بہت دقتیں ہیں سردی کے مارے آلات جم جاتے ہیں اور کام کرنے سے انکار کر دیتے ہیں مگر روسیوں نے اس علاقے میں کافی پرواز کی ہے اور ان کو تجربہ ہوگیا ہے۔ چنانچہ اپنے تجربے کے بھروسے وہ برف کی دنیا میں گھس گئے اور پار نکل گئے۔ تم نے تو اخبار میں پڑھا ہی ہوگا کہ یہ چاروں بغیر رُکے قطب شمالی پرسے ہوتے ہوئے ۲۰ جون کو شمالی امریکہ میں کلیفورنیا جاکر اُترے اور ناممکن بات ہمت اور ارادے کے آگے ممکن ہوکر رہی

امریکہ والوں نے روس کو بہت بہت مبارک باد دی اور وہاں کے مشہور قطبی سیاح اسٹفن سن نے حسرت سے کہا "روسیوں نے دنیا پر بڑا احسان کیا ہے اور جس کام کو ہم بیس سال سے کرنا چاہتے تھے انھوں نے پورا کر دیا ہے۔"

۲۶ جون کو پروفیسر اشمٹ جب واپس آئے تو ماسکو میں اُن کا نہایت شان دار استقبال ہوا۔ اسٹیلن اور دوسرے روسی حاکم ان کو خوش آمدید کہنے آئے۔

اب قطبی کیمپ میں ریڈیو ٹیلیفون بھی پہنچا دیا گیا ہے جس کا جی چاہے گا ماسکو میں بیٹھا بیٹھا قطب سے باتیں کرے گا۔ وہاں رہنے والے پروفیسروں کی زندگی کی ایک فلم تیار کی جارہی ہے جو ہر جگہ دکھائی جائے گی۔ جو طیارے رسد لے جاتے ہیں۔ اُن کے ذریعے اس فلم کو ماسکو لے جایا جائے گا۔ ان طیاروں کو پانچ سو میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے اور قطبی علاقہ ہندوستان تو ہے نہیں کہ کسی ندی یا پہاڑی سلسلے کو دیکھتے رہو۔ اور مزے سے جہاز اُڑاتے چلے جاؤ وہاں تو نیچے برف کے سفید تودوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ صرف جہاز کے آلات ہی پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے اس ڈر سے کہ رستہ نہ بھول جائیں۔ یہ طیارچی رنگ دار بم گراتے جاتے ہیں۔ برف جگہ جگہ پر رنگین ہوجاتی ہے اور واپسی میں آسانی ہوتی ہے۔

یہ نہ سمجھ لینا روسی غلطی سے ایک بار پہنچ گئے، کیونکہ جولائی میں اسی رستے سے دلیری پادلو وِیچ شِکلود، نامی ہوا باز دوسرے سائنس والوں کے ساتھ ماسکو سے بغیر رکے ہوئے ۱۴ جولائی کو کلیفورنیا پہنچ گیا۔ اور ۶۰ گھنٹے میں چھ ہزار سات سو پچاس میل طے کیا۔ آج تک کوئی بغیر رکے ہوئے اتنی دور تک نہیں اُڑا ہے۔

لو بھئی! اب قطب شمالی ہوکر راستہ تو بن ہی گیا ہے۔ اب وہ دن بھی دور نہیں ہے۔ جب مسلسل آمدورفت شروع ہو جائے گی۔ قطبی علاقے کی خاموش اور سنسان وادی میں ہوائی جہازوں کے غول۔ غوں غوں غناتے ہوئے گذرا کریں گے اور اتنا ہنگامہ ہوا کرے گا کہ کبھی کبھی بی بی اسکیمو، میاں اسکیمو سے شکایت کریں گی کہ "ان موؤں نے ان کے کان کے پردے پھاڑ ڈالے۔"

کیوں کیا تمھارا جی نہیں چاہتا کہ چھ مہینے والی رات اور چھ مہینے والے دن کی سیر کرو۔ (ہندی)

اسکیمو بی بی اپنے میاں سے:- اے ہے ان موئے ہوائی جہازوں کے شور سے تو کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔

"تمھارے بارہ حکم"
(۱) دھوپ
(۲) تازہ ہوا
(۳) سیر
(۴) کھیل
(۵) آرام
(۶) ہوادار مکان
(۷) کام
(۸) نیند
(۹) سیدھا کھڑا ہونا
(۱۰) ناک سے سانس لینا
(۱۱) نہانا
(۱۲) چبا کر کھانا

بچیوں سے باتیں

محترمہ شمسی عبادالرحمٰن

پچھلے سال کے سال گرہ نمبر میں ہم نے
بس کچھ کام کی باتیں بتائی تھیں۔ ارادہ تھا۔ کہ
ہینے ایسی ہی باتیں بتایا کریں گے۔ مگر کچھ ایسے
ڑے نکلتے چلے آئے کہ وہ ارادہ پورا نہ ہوا۔
لو! ایک سال اتنی جلدی بیت گیا کہ معلوم
نہ ہوا۔ اور تمھارے دوسرے سال گرہ نمبر
یاری شروع ہو گئی۔ اگر اس دفعہ پھر ان
کو کچھ نئی باتوں کے ساتھ دُہرا دیں تو یقین
تم ضرور پسند کرو گی اور ان پر عمل بھی۔

سُنو! ابھی تو تم چھوٹی ہو، مگر کبھی تم نے
ات پر بھی غور کیا کہ جب بڑی ہو گی تو اس
خوشی اور اطمینان کی زندگی گذارنے کے لئے
ن کن باتوں کی ضرورت ہو گی۔ دیکھو! بچپن
بڑے مزے سے گذر جاتا ہے کیونکہ دنیا
ی باتوں اور تمام کاموں کی فکر و ذمہ داری
ں پر ہوتی ہے۔ تمھارے لئے سوائے
لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کے اور کوئی کام نہیں
ہے۔ مگر جب تم خود بڑی ہو جاؤ گی تو اس وقت
ان تمام کاموں کا بوجھ جو اب تمھارے بڑوں
پر ہے، تمھارے کاندھوں پر آ جائے گا۔ دنیا کا
دستور یہی ہے۔ اگر تم پڑھی لکھی مہذب اور
سلیقہ مند لڑکی ہو تو اس وقت تمھیں ذرا بھی دقت
کا سامنا نہ ہو گا۔ اور سارے کام بڑی خوبی سے
کر لو گی۔ اس لئے بچپن ہی سے اس کی عادت ڈالو
اور اپنے میں قابلیت پیدا کرو۔

پڑھنے لکھنے کا تو تمھیں خود ہی شوق ہو گا
مگر اس کے ساتھ ساتھ تہذیب و اخلاق سیکھنا
ضروری ہے۔ اچھے اخلاق کے بغیر اعلیٰ تعلیم بھی
کسی کام کی نہیں۔ علم پر مغرور ہو کر جاہل بڑی
بوڑھیوں کا مذاق اُڑانا، کمینے رشتے والوں
کو برا کہنا۔ اپنے سے کم پڑھی لڑکیوں کو حقارت

سے دیکھنا یہ سب بُرے اخلاق، بدتہذیبی کی پہچان ہے۔ اور اس سے اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ ایسا آدمی تھوڑے ہی دنوں میں خود ذلیل ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس کے غرور اور کج خلقی کا حال سب پر کھل جاتا ہے اور لوگ اس کے پاس جانا اور بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔ اس لئے دوسروں کے ساتھ چاہے وہ تم سے ہر بات میں کم ہوں اچھا سلوک کرو۔ عزیزوں سے محبت اور بڑوں کا احترام کرو۔ ہمجولیوں میں میل ملاپ سے رہو اور ہمیشہ ایک سی طبیعت رکھو۔ مثلاً اول تو کسی ایسی لڑکی سے دوستی مت کرو جو اس قابل نہ ہو۔ اور جب کسی کو ایک دفعہ سہیلی بنا لو تو جہاں تک بنے اُسے نبھانے کی کوشش کرو۔ اچھے اخلاق کا جادو سب پر چل جاتا ہے اور سب کو اپنا بنا لیتا ہے۔

گھر داری کا انتظام کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ کہنے کو تو یہ گھر کا چھوٹا سا انتظام ہے لیکن اس میں سلیقہ پیدا کر لیا جائے تو اس کی مدد سے بڑے بڑے انتظام بہت خوبی سے کئے جا سکتے ہیں۔ اسی لئے گڑیوں کا کھیل اور ہنڈکلیا پکانا بہت اچھا ہے۔ لڑکیاں کھیل ہی کھیل میں کھانا پکانا، سینا پرونا اور بہت سے چھوٹے چھوٹے کام سیکھ جاتی ہیں۔ اور بڑی عمر میں گھرداری کے کام اُن کی سمجھ میں آسانی سے آجاتے ہیں۔ ہنڈکلیا کے روز اپنی سہیلوں کو بھی بلا لیا کرو تو اچھا ہے سب مل جل کر پکائیں۔ پہلے چھوٹی اور سہل چیزیں پکانا سیکھ لو۔ بڑے بڑے کھانے پکانے میں آسانی ہو جائے۔ گڑیا گڈے کے بیاہ کے بہانے مہمانوں کی خاطر مدارات، بات چیت کرنے کا ڈھنگ اور بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں جن سے آئندہ زندگی کے لئے بہت سے سبق ملتے ہیں۔ اس لئے اپنی ہمجولیوں کو شریک کر کے کبھی گڑیا کا بیاہ رچا لیا کبھی کھانے یا چار پر سہیلیوں کو بلا لیا۔ لیکن ایسے کھیلوں میں ضرورت سے زیادہ روپیہ پیسہ خرچ کرنا فضول ہے۔ ہر کام کفایت سے کرنا چاہیئے اور امّی کی اجازت سے۔ یہ نہیں کہ کسی وجہ سے امّی تو تمھیں آج پارٹی کرنے کو منع کر رہی ہیں اور تم ہو کہ ضد کئے جاتی ہو

ہم تو آج ہی کریں گے۔ اس میں کوئی تعریف نہیں
بلکہ بہت بُری بات ہے۔

جب تم اتنی بڑی ہو جاؤ کہ گھر کے کام
ج میں اُمی کا ہاتھ بٹا سکو تو پڑھنے لکھنے سے
وقت بچے اس میں ضرور گرہستی کا کام دیکھا
و۔ گھر میں ایسے بہت سے ہلکے پھلکے کام ہوتے
جنھیں تم بڑی آسانی سے کر سکتی ہو۔ مثلاً صفائی
ہتمس۔ باورچی خانے اور جنس کے گودام
نتظام اپنے اور چھوٹے بھائی بہنوں کے کپڑے
تے حفاظت سے رکھنا۔ پرانے کپڑوں کی مرمت
کا حساب کہ کتنے کپڑے دھلنے کو گئے اور جب
ں کر آئیں تو اپنے حساب سے ملا کر لینا۔ یہ
سے کام ہیں جنھیں تم بہت کم محنت اور تھوڑے
وقت میں بھی خوب کر سکتی ہو۔ اگر یہ تمام کام
تھ ساتھ کرنے کی فرصت نہ ملے تو ان میں سے
سند کرو پہلے وہ چن لو اور باری باری سے کیا
۔ یعنی کچھ روز ایک کام اور کچھ روز دوسرا کام
طرح سے سارے کام کر لوگی اور گھبراؤگی
بھی نہیں۔

اگر گھر کی صفائی کا انتظام تمھارے ذمے
ہے تو سب سے زیادہ توجہ کھانے پینے کی چیزوں
کی صفائی پر کرنا چاہیے۔ کیونکہ غذا ایسی چیز ہے
جس پر بڑی حد تک تندرستی کا دار مدار ہے۔
نوکروں پر تنبیہ رکھو کہ باورچی خانے میں کوئی چیز
میلی یا گندی نہ رہنے پائے۔ برتن گرم پانی سے
خوب صاف کر کے دھوئیں۔ اور قرینے سے رکھیں
سبزی وغیرہ کئی بار بہت سے گرم پانی میں دھو کر
پکائیں۔ اپنے کپڑے اور ہاتھ بھی صاف رکھا
کریں۔ پکی ہوئی چیزوں کو کبھی ہاتھ سے نہ چھوئیں
چمچہ استعمال کریں۔ اگر کپڑوں کے رکھ رکھاؤ
کا انتظام کرو تو اس میں بھی سلیقہ اور احتیاط کی
ضرورت ہے۔ ریشمی اور گرم کپڑوں کو بہت حفاظت
سے رکھنا چاہیے۔ ٹھنڈے اور گرم کپڑے علیحدہ
علیحدہ بکسوں میں یا الماریوں میں سنبھال کر رکھو
برسات کے موسم میں گرم کپڑوں کو قریب قریب
ہر پندرہ روز بعد دھوپ دکھا لینا چاہیے کیونکہ

ان میں بہت جلد کیڑا لگ جاتا ہے۔ دھوپ سے اُٹھا کر فوراً ہی تہ نہیں کر دینا چاہئے بلکہ تھوڑی دیر سایہ میں پھیلا دو۔ جب دھوپ کی بھڑک نکل جائے تو تہ کرکے قرینے سے رکھ لو۔ اس کا حساب بھی رکھنا چاہئے کہ تمھارے اور گھر میں سب لوگوں کے پاس ٹھنڈے اور گرم کتنے کتنے کپڑے ہیں۔ کتنے پرانے ہوئے اور کتنے نئے بنے جوڑے کے کپڑوں میں اگر کسی کا جوڑا خراب ہو جائے تو اس کی جگہ دوسرا تیار کرکے رکھ لو۔ تاکہ ضرورت کے وقت تکلیف نہ ہو اسی طرح جوتوں کو بھی عرصے تک ایک جگہ نہ پڑا رہنے دو۔ سیل سے چمڑا خراب ہو کر جوتا بدوضع ہو جاتا ہے جو جوتے پالش والے ہوں اُن پر تیسرے چوتھے روز ضرور پالش کر لینی چاہئے اس سے جوتے ملائم اور مضبوط بھی رہتے ہیں۔ بس اسی طرح گھرداری کے تمام کام اگر شروع ہی سے سلیقہ کے ساتھ کیا کرو۔ اور بچپن ہی سے اخلاق اچھا رکھنے کی کوشش کرو تو ہمیشہ کے لئے ویسی ہی عادت پڑ جائے گی اور تعلیم کے ساتھ اچھا اخلاق اور سلیقہ گویا سونے پر سہاگہ۔ ایسی لڑکی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

دلچسپ گلائڈر

اسے بنانے کے لئے تمہیں صرف بید کا ایک لمبا ٹکڑا دو کارک دو بڑے پر اور دو چھوٹے پروں کی ضرورت ہوگی۔ کارک کے ایک سرے میں سوراخ کر لو اور بید کے ٹکڑے میں لگا دو۔ اس کے دونوں طرف بڑے پر لگا دو، جیسے تصویر میں لگے ہیں۔ اب دوسرا کارک لو اور اس کو کاٹ کر دو حصے کر دو ایک ٹکڑے کو بید کے دوسرے سرے میں لگا دو۔ اور ان چھوٹے پروں کو بھی اسی طرح اس کارک میں لگا دو جیسا کہ تم نے بڑے پروں کو لگایا۔

اب تمہارا چھوٹا سا گلائڈر تیار ہو گیا یہ بہت اچھی طرح اُڑ سکتا ہے اگر کسی طرح پیچھے کی طرف اُڑنے لگے تو ایک ڈرائنگ پن اگلے کارک میں لگا دو تاکہ وہ سرا بھاری ہو جائے۔

انڈے جمع کرنا

از خلیل عمر صاحب

ہم سب کو پیام تعلیم کی بدولت ٹکٹ جمع کرنے کا ایسا شوق پیدا ہوا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصے میں پیامی بھائیوں اور بہنوں کے پاس البم کے البم بن گئے اور پیامیوں نے کافی تعداد میں ٹکٹ جمع کر لیے۔ دلچسپ مشغلوں کے سلسلے میں دو ایک مضمون اور بھی نکلے تھے۔ سب اپنی اپنی جگہ کافی دلچسپ تھے۔ ایسے مضمون بچوں کے لئے بڑے کارآمد ثابت ہو رہے ہیں ہمیں جو وقت پڑھنے کے بعد ملتا ہے اکثر کھیل کود ہی میں صرف ہوتا ہے۔ جب سب پیامیوں کو ایسے مشغلوں کا شوق ہو جائے گا تو اُن کا وقت بے کار نہ جائے گا۔ بے کار وقت میں اکثر ہم بہت سی شرارتیں ایسی کرتے ہیں جو ہمارے بڑوں کو تکلیف پہنچاتی ہیں اور کبھی کبھی ہم پر مار بھی پڑتی ہے۔ اگر ہم کسی نہ کسی مشغلے میں لگے رہیں گے تو ہم نہ تو شرارت ہی کریں گے اور نہ پٹیں گے۔ ہمیں نئی نئی باتیں بھی معلوم ہوں گی۔ جو ہماری جمع کی ہوئی چیزیں دیکھے گا تو اپنے جی میں ضرور کہے گا کہ جب سے پیام تعلیم جاری ہوا ہے بچوں کو کیسے اچھے اچھے شوق ہو گئے ہیں۔ پیامی بچے اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اور خوش بھی ہوگا۔ اس طرح ہماری جمع کی ہوئی چیزیں پیام تعلیم کے اشتہار کا کام دیں گی اور اس کی مقبولیت عام ہو جائے گی ہمارا فرض ہے کہ پیام بھائی بہنیں دوسروں کے لئے نمونہ بنیں تاکہ پیام تعلیم ہم پر فخر کر سکے۔ پیام تعلیم ہمارا ایک ننھا سا استاد ہے جو ہمیں مارتا نہیں اور ایسا چھوٹا دوست ہے جو کبھی روٹھتا نہیں۔

آج میں اپنے پیامی بھائیوں کے لئے "انڈے جمع کرنے" کے بارے میں کچھ باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ مجھے انڈے جمع کرنے کا بہت دنوں سے شوق ہے۔ اس سلسلے میں مجھے بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔ امید ہے کہ یہ مضمون سب پیامی بھائیوں کو پسند آئے گا اور ان کی معلومات کو بڑھائے گا۔ انڈے جمع کرنے کے لئے سب سے پہلے

تمھیں ایک لکڑی کے بکس کی ضرورت ہوگی ۔ یہ کم سے کم ڈھائی انچ گہرا ہونا چاہئے تاکہ انڈوں کے ٹوٹنے کا احتمال نہ رہے ۔ پھر اس میں چھوٹے بڑے خانے بنوالو (شکل نمبر ۱) چھوٹے خانے زیادہ ہونے چاہئیں ۔ کیونکہ بڑے انڈے تعداد میں کم ملتے ہیں ۔
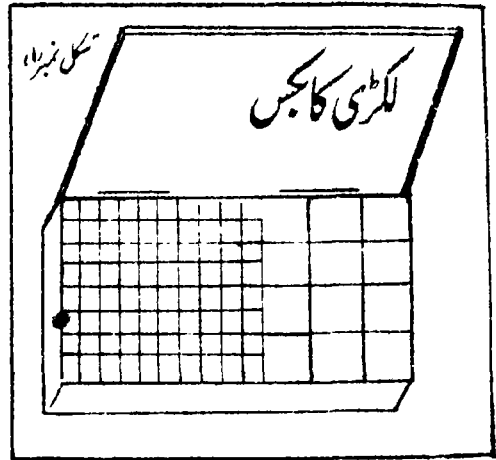
اگر تم شیشے کا ڈھکن لگوالو تو اور بھی اچھا ہے کیونکہ جب تم کسی کو اپنے جمع کئے ہوئے انڈے دکھاؤ گے تو وہ ان کو چھوئے گا ضرور اور انڈے ٹوٹ جانے کا ڈر رہے گا ۔ شیشہ لگا ہوگا تو دیکھنے والا باہر سے ہی دیکھ سکے گا ۔ پھر خوب صورت بھی لگے گا ۔ اب تم ان خانوں میں روئی کے چھوٹے چھوٹے گھونسلے سے بنادو تاکہ انڈے ٹوٹنے نہ پائیں اوپر سے خوبصورتی کے واسطے مور یا کسی اور چڑیا کا خوب صورت سا پر باریک باریک قینچی سے کتر کر ڈال دو ۔

اب تم کسی چیز کا انڈا لو اور اس کی نوک پر ایک سوراخ (ا) کرو ۔ دوسرا سوراخ (ب) اس کی تلی میں سوئی سے کرو ۔ (شکل نمبر ۲) پھر سوئی کو سوراخ (ب) میں ڈال کر خوب پھراؤ
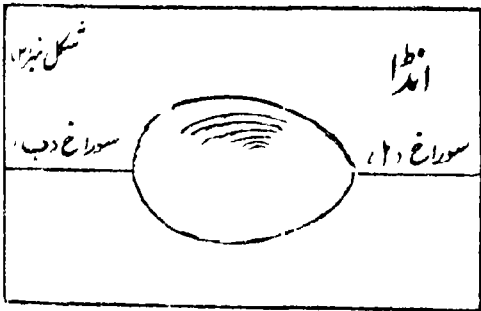
تاکہ زردی ٹوٹ جائے ۔ پھر سوراخ (ب) پر اپنا منہ رکھ کر آہستہ آہستہ پھونکو تاکہ زردی سفیدی نکل جائے ۔ اب انڈے کے اندر سوراخ کے ذریعے پانی بھرو ۔ اور خوب ہلاکر نکال دو اسی طرح کئی مرتبہ کرو ۔ پھر اس میں تھوڑا سا اسپرٹ ڈالو اور ہلاکر نکال دو ۔ ایسا کرنے سے انڈے میں بدبو نہ رہے گی ۔ پھر تھوڑی دیر دھوپ میں رکھ کر سکھالو ۔ اس کے بعد سوراخوں پر تھوڑا سا موم پگھلا کر لگا دو

اسی طرح تم اور چڑیوں کے انڈوں کی زردی نکال سکتے ہو۔ مگر چھوٹے انڈوں کی زردی نکالنے کے لئے باریک سوئی سے چھید کرنا چاہئے۔ بہت احتیاط کے ساتھ۔

ایک بات کا خیال رہے۔ پیڑ پر چڑھتے وقت گرنا نہیں۔ اگر پیڑ اونچا ہو تو کسی نوکر کو چڑھا کر انڈا اتروا لینا۔ انڈے کے خانے میں چڑیا کا نام جس موسم اور جس آب و ہوا اور جس جگہ ملا ہو ایک پرچے پر لکھ کر رکھ دینا چاہئے۔

تم انڈوں کا ٹکٹوں کی طرح مبادلہ بھی کرسکتے ہو۔ تمھارے ابا سگرٹ ضرور پیتے ہوں گے ان سے خالی ٹین لے لو اور اپنے پاس رکھ لینا۔ جب کہیں انڈا بھیجنا ہو تو تھوڑی سی روئی ڈبے کے نیچے رکھو اور پھر انڈا رکھ کر اوپر سے اور چاروں طرف سے اور روئی رکھ دو اور اُسے کپڑے میں سی کر بھیج دو۔

اس مشغلے سے تمھیں نئی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ تم کو معلوم ہوگا کہ چڑیاں کس جگہ اور کس موسم میں اپنے گھونسلے بناتی ہیں۔ کس موسم میں انڈے دیتی ہیں اور کس موسم میں گرم جگہ جاتی ہیں۔ اور کس موسم میں سرد جگہ۔ کس جگہ بیٹھنا پسند کرتی ہیں۔ کس قسم کا گھونسلا بناتی ہیں۔ تمھیں چڑیوں کی بابت اور بھی باتیں معلوم ہوں گی جو تم کو بہت فائدہ پہنچائیں گی۔ مجھے امید ہے کہ سب پیامی اس مشغلے میں دلچسپی لیں گے ؂

چاندی

عبد المجید صاحب بھٹی - ایڈیٹر ہونہار

زمین کی گود میں سوئی ہوئی تھی ۔ خوشی کی نیند میں کھوئی ہوئی تھی
یونہی گذریں بہت صدیوں پہ صدیاں ۔ مرے دم سے رہے ناواقف انساں
مگر جس دم مجھے شامت نے گھیرا ۔ تب انسانوں نے پایا کھوج میرا
نکالا کھود کر مجھ کو زمیں سے ۔ کہیں پہنچا دیا ۔ کھودا کہیں سے
دہکتی بھٹیوں میں مجھ کو ڈالا ۔ گلا کر مختلف سانچوں میں ڈھالا
جلا دے کر بنایا خوب صورت ۔ بنی مجھ پر شہنشاہوں کی مورت
دونّی ہوں کبھی میں ہوں چونّی ۔ کبھی ہوتا ہے میرا نام اٹھنّی
کبھی میں نام پاتی ہوں روپے کا ۔ کبھی برتن کبھی بنتی ہوں گہنا
کبھی کٹتی ہوں جلتی ہوں کبھی میں ۔ کبھی گلتی ہوں ڈھلتی ہوں کبھی میں
ملاتے ہیں کبھی کچھ کھوٹ مجھ میں ۔ کچھ دیتے ہیں بے چوٹ مجھ میں
جہاں جاتی ہوں ملتے ہیں خوشی سے ۔ ہر اک ہوتا ہے صدقے مجھ پہ جی سے
زمانے میں مری ہوتی ہے عزّت ۔ حقیقت میں نہیں ہے اچھی قسمت
مجھے انساں لئے پھرتا ہے ہر جا ۔ نہیں اک دم کہیں بھی چین ملتا
کہیں آنا نہیں اپنی خوشی سے ۔ کہیں جانا نہیں اپنی خوشی سے

وہ اپنی نیند سونا ہی بھلا تھا
کسی کے بس میں رہنا زندگی کیا

دیہات کی صنعت

پیاری پیام بہنو۔ ننھی بہنو اور بڑی بہنو!
م سب سے ایک کام میں مدد چاہتی ہوں کہ ہندوستان
ں جگہ جگہ گاؤں میں کسان عورتیں کپڑوں پر جو
ل بوٹے بنانے کا کام اپنے اپنے طرز میں کرتی
یا اس کے نمونے جمع کروں۔ تم میں بہت سی
ہروں کی رہنے والیاں ہوں گی اور شاید تم ان
ب کسان عورتوں کے کام کو کچھ اچھا نہ سمجھتی ہو۔
ارے خیال میں یہ سیدھی سادھی دہقان عورتیں
کیا بنائیں گی۔ مگر بہنو، سیدھا سادہ ہونا بڑی
ہے۔ جس طرح وہ خود سیدھی سادی ہوتی
ی طرح جو چیزیں وہ بناتی ہیں وہ سادی
ی ہوتی ہیں۔ مگر سادگی میں جو حسن ہوتا ہے
ں اور چیز میں نہیں ہوتا۔ میں ان کی بنائی ہوئی
ں کو دیکھ کر کبھی کبھی حیرت میں رہ جاتی ہوں۔
مجھے اُن کے نمونے نقل کر کے بھیجو تو ایسی حسین
ں کا ایک مجموعہ ہو جائے کہ کیا کہنا۔ میں اس

محترمہ آپا جان

میں سے کوئی کوئی پیام تعلیم میں چھپوا بھی دیا کروں گی
پیام تعلیم سارے ہندوستان میں جاتا ہے۔ کوئی
نمونہ شمال سے آئے گا کوئی جنوب سے۔ اور جب
یہ نمونے چھپیں گے تو ایک کو دوسرے کی خبر ہو گی
کہ ہماری ہی بہنیں دوسری جگہ کیا کیا پیاری چیزیں
بناتی اور اپنے گھروں کو اُن سے سجاتی ہیں۔ مجھے تو
یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بازاروں
میں اب ان پیارے نمونوں کی جگہ دوسرے ملکوں کے
سڑے نمونوں کی اور بھی سڑی نقلیں بکتی ہیں۔ اور شہر
والے خوب صورت بد صورت کی تمیز بھی نہیں کر سکتے
اور ان ہی خراب نمونوں پر گرتے ہیں۔ کہاں ان پرانے
نمونوں کی سادگی، اُن کے رنگوں کا میل۔ اور
کہاں یہ نئی گچ پچ۔ اچھا تو جب تم مجھے اپنے اپنے
صوبے کے کسانوں کے کام کے نمونے بھیجو گی تو میں
پیام تعلیم میں ایک طرف انھیں چھپواؤں گی۔ اور
دوسری طرف آج کل کے مشین کے بنے ہوئے نمونے۔

پھر تم خود فیصلہ کرو گی کہ کون خوب صورت ہیں اور کون بد صورت ۔ آج میں پنجاب کے بنے ہوئے ایک پردے کا نمونہ دیتی ہوں ۔ اس نمونے کو تم میز پوش پر بنا سکتی ہو ، یا پردے پر ۔ یا پلنگ پوش پر ۔ میرے پاس جو پردہ ہے وہ لال موٹے کھدر پر بنا ہے ۔ کڑھائی پیلے اور سفید ریشم سے ہے سیدھے سیدھے پڑے ٹانکے ، جنھیں تو سکھیا بھی آسانی سے بنا لے ۔

اگر میز پوش بنانا ہو تو میں سمجھتی ہوں کہ صرف حاشیہ بنانا کافی ہوگا ۔ میز پوش کے چاروں طرف ۔ موٹا سا کپڑا لو ، چاروں طرف کوئی پاؤ انچ کی گوٹ لگا دو ۔ گوٹ سے پاؤ انچ جگہ چھوڑ کر پہلی لائن شروع کرو ۔ اس لائن سے کوئی سوا انچ دائیں پھولوں کے لئے ہے ۔ اس کے بعد پھر ایک لائن ہے پھر سوا دو انچ (۲ ¼) کلیوں کے لئے ہے ۔ اور ان کے بعد پھر ایک لائن ہے ۔ پھر ایک دو انچ (۲) کی پٹی ہے ۔ جس کے بیچ میں ایک لائن ہے ۔ اور اس کے دونوں طرف پھول ہیں ۔ ہر پھول ایک ایک انچ (۱) کا ہے ۔ پھر ایک لہریا خط ہے اور اس پر حاشیہ ختم ہوتا ہے ۔ کل حاشیہ کوئی سوا چھ انچ (۶ ¼) ہے ۔ بس حاشیہ حاشیہ کاڑھو ، بیچ میں خالی چھوڑ

اس میں لائنیں جو ہیں وہ سب سفید تاگے ۔ بنانا ۔ پہلی دو لائنوں کے بیچ میں جو پھول ہیں ان ایک سفید ہوگا ۔ ایک پیلا ۔ پھر ایک سفید ایک پھر جن تاگوں پر کلیاں لگی ہیں وہ سب پیلی ر کلیاں تین پیلی بنانا ۔ تین سفید ۔ پھر تین پیلی تین اس کے بعد کی دو لائنوں کے بیچ میں جو پھول ہیں انھیں بھی تین پیلے بنانا تین سفید ۔ پھر جو لہریا لا ہے اسے سب کو پیلا بنانا ۔

پردہ یا پلنگ پوش بنانا ہو تو میں سمجھتی ہو ۲ ½ ۲ " چوڑا کپڑا لینا ۔ لمبائی اتنی رکھنا جتنی پلنگ کے لئے یا دروازے کے لئے مناسب ہو ۔ چوڑائی لئے بتائی کہ اس میں نمونہ پورا پورا آ جائے ۔ یہ نہ ہو بیچ میں سے کاٹنا پڑے ۔ پردہ یا پلنگ پوش کے د طرف حاشیہ بنانا ، ایک طرف اچھا نہیں معلوم ہو ہر حاشیہ ۶ ¼ " کا ہوگا ۔ بیچ میں جو پھولوں کا نمونہ وہ ۵ ، ۵ انچ چوڑا ہے اور آدھ ، آدھ انچ کا لہ ان کے بیچ میں ہے ۔ یوں گویا حاشیے کے ۱۲ ½ " ہوئے

پھول نو دفعہ بنائے تو اُن کے ۴۵ انچ ، اِن نو کے بیچ میں ۸ لہرے آ ئے۔ اُن کے ۴ انچ ہوئے ۔ یہ سب کتنے ہوئے ۔ ۲۲½ انچ۔ اور دونوں طرف آدھ ۔ آدھ انچ (½) کی گوٹ ہوئی تو کل پردہ یا پلنگ پوش ۲۲½ چوڑا ہوگیا ۔ یہی میں نے لکھا ہے۔

پھولوں کے نمونے چو خانوں سے ڈنڈی بنائی ہے ۔ انھیں سادے سادے ٹانکوں سے بناؤ اور بیچ میں خالی رہنے دو ۔ پھول بڑے ٹانکوں سے بناؤ تاکہ بھرے بھرے معلوم ہوں ۔ رنگ وہی تین کا پیلا، تین کا سفید۔ سفید پھولوں کی ڈنڈیاں سفید اور پیلے پھولوں کی پیلی ۔ نمونوں کے بیچ بیچ میں جو لہریا خط ہیں وہ سب پیلے بنانا۔

ہاں ذرا کرو تو ہمت اور بنا ڈالو ایک میز پوش اور ایک پردہ ۔ مگر مجھے دوسرے نمونوں کے نقشے اُتار کر ضرور بھیجنا ۔ جی تو چاہتا تھا کہ یہ کہوں کہ اصل بنی ہوئی چیزیں بھیجنا تو جامعہ کے بچوں کے کمروں میں اس سے سجاوٹ کی جائے ۔ مگر اس میں تم پر خواہ مخواہ کا بار ہوگا ۔ تم نقشے ہی بھیج دو ۔ اچھے ہوں گے تو میں خود بنالوں گی ؛

شیخ نیازی

از پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

:(۳):

اس سال جنگ حبش کا خاتمہ اور شیخ نیازی کا ختنہ ہوا۔ اور جیسا کہ ہر بڑے واقعے کا حال ہوتا ہے کہ اس کی آمد کی تیاریاں بڑے زور شور سے کی جاتی ہیں لیکن پیش وہ اچانک ہی آجاتا ہے۔ شیخ نیازی کے ختنہ کے بھی بڑے بڑے منصوبے باندھے جا رہے تھے مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک دن بوڑھے نائی اور تیز استرے نے وہ سب کر دکھایا جس کے لئے شیخ صاحب کے والدین اور جمعیت اقوام دونوں ایک عرصہ سے مذبذب اور متردد تھے۔ بزرگوں نے ٹھیک کہا ہے۔

نائی از غیب بروں آید ختنہ بکند!

ایک چیز کا آج کل بڑا دور دورہ ہے جس کو کہتے ہیں MASS CONTACT (ماس کنٹیکٹ) یعنی عوام سے میل جول یا عوام کو ہاتھ میں لینا۔ ہم لوگ یعنی شیخ نیازی کے خاندان والے اس پر پورے طور پر عامل ہیں۔ چنانچہ ہم نے سب سے پہلے ختنہ کے باب میں شیخ صاحب کی رائے لی۔ ہم کو یہ تو نہیں معلوم کہ شیخ نیازی ختنہ کے مفہوم یا اونچ نیچ سے واقف تھے یا نہیں لیکن اس کے معاوضہ میں انھیں جو سبز باغ دکھایا گیا اس میں پھلوں اور نعمتوں کی اقسام اور مقدار اتنی زیادہ رکھی گئی تھی کہ شیخ صاحب ختنہ فروشی پر آمادہ ہی ہو گئے۔ چنانچہ

ایک ختنہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ہم سب بھی ایک دن یوم ختنہ منانے کے لئے آمادہ ہی ہو گئے!

اس دن شیخ صاحب نے جتنی شرارتیں چاہیں کر ڈالیں جس کی چیز پر چاہا قبضہ کر لیا اور جس کو جو جی چاہا کہہ ڈالا۔ سارے گھر آنگن کو اس طور پر روندتے پھرے جیسے کسی ملک پر سے خدا کا سایہ اور پولیس کا پہرہ اٹھا لیا جائے۔ گھر کی پولیس۔ انسپکٹر جنرل سے لے کر چوکیدار تک

ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم

میں مبتلا رہی۔ یہاں تک کہ ختنہ کرنے والا نائی ایک گندی لنگی، سفید پگڑی اور چڑھی ہوئی ڈاڑھی لئے گھر کے دروازہ پر نمودار ہوا۔ اس نائی کی سج دھج اور تیور دیکھ کر شیخ نیازی تو کیا شیخ صاحب کے بزرگوں کو بھی کچھ وہم سا ہونے لگا۔ اس کے بعد جو پکڑ دھکڑ اور چیخ پکار مچی ہے اس سے بیالی بچے ہی نہیں ان کی سات پشت تک واقف ہے۔ شیخ نیازی نے اس وقت جو مسلسل نعرے لگائے ہیں اور نائی کو جیسا کچھ برا بھلا کہا اس کا تذکرہ بیکار ہے۔ بس یہ سمجھ لو گویا شہر کی گنجان آبادی میں مسلسل بم پھٹ رہے ہیں۔ اور بھگدڑ مچی ہوئی ہے، جب فضا صاف ہوئی اور انجمن ختنہ احمر کے رضا کار انھیں میدان جنگ سے اٹھا کر بستر پر لائے تو انھوں نے دیکھا کہ وہ تمام وعدے وعید جو ان سے اس موقع کے لئے کئے گئے تھے پورے کئے گئے ہیں اور ہر چہار طرف کھانے پینے اور تفریح تفنن کے سامان موجود ہیں۔ انھوں نے لیٹے لیٹے ہر ایک کا جائزہ لیا وہ بھی اس طور پر نہیں کہ دیکھ لیا اور خوش ہوئے بلکہ جسے اٹھا لیا اسے کھا لیا اور جسے کھا لیا اسے ختم کر دیا!

ایک ڈاکٹر دوست نے کہا رات کے لئے ایک نیند لانے والی دوا لکھ دیتا ہوں سوتے وقت دیدیجئے گا۔ میں نے کہا نیند لانے والی دوا کی ایسی ضرورت نہیں ہے جیسی کسی بھوجن بھسم قسم چورن کی۔ آپ کل صبح تشریف لائیں گے تو دیکھنے والے دیکھیں گے کہ آپ مرہم پٹی کے لئے اتنے فکرمند نہیں ہیں جتنے ہم لوگ دھونے بگھارنے میں مصروف ہیں۔ شیخ صاحب کا یہ اصول نہیں ہے کہ مشکل کو آسان بنایا جائے بلکہ آسانی کے راستہ میں روڑے اٹکائے جائیں۔ ان کے اس طریقہ کار سے ان کا شکمی پڑوسی (پیٹ) سردو معدہ یا بقول ریڈیو والوں کے گھکھر کے خیال میں مبتلا رہتا ہے۔

شیخ صاحب کھاتے رہے اور ختنہ اچھا ہوتا رہا۔ انکے ساتھ ہمہ وقت کے لئے ایک ملازم لڑکا مامور تھا جس سے یہ بے سر پیر قصے سنتے رہتے۔ ان کی بہن عذرا جو ان سے دو تین سال بڑی ہیں بطور نرس کے ہمہ وقت ہمہ وار پر مقرر ہوئیں اور شیخ صاحب کے گرد و پیش جن نعمتوں کا انبار رہتا اس کی شریک بنائی گئیں۔ اس دوران میں شیخ جی کا سلوک عذرا سے ایسا نہ تھا جس کا پیمانہ بوجہ سہ رکی حقیر سی رقم اٹھا لیتی لیکن اس کی تلخی اور گرانی اُن نوازشات سے بہت کچھ دور ہو جاتی جن کی وہ شیخ جی کے ساتھ شریک بنائی گئی تھیں۔

عذرا کا معمول تھا کہ وہ اسکول جانے لگتیں تو شیخ جی دیکھ ہدایات دے جاتیں جن میں زیادہ زور اس پر ہوتا کہ خبردار بردار ہاتھ پاؤں نہ پھینکنا، نہ اٹھنا بیٹھنا جس کو عذرا کے بعض معقول بھائی بہن اس پر محمول کرتے کہ عذرا کا مطلب یہ تھا کہ بنارزی عذرا کی عدم موجودگی میں پھل مٹھائی وغیرہ پر ہاتھ صاف کر سکیں۔ اس کی تصدیق بقول انھیں نا معقول لوگوں کے اس سے ہوتی تھی کہ جب عذرا اسکول سے آتی تھیں تو سب سے پہلے شیخ صاحب کے ہاں پہنچتیں اور معمولی مزاج پرسی کے بعد اور اکثر اس کے بجائے پھلوں کے واہ جا سٹریا جمع غائب ہونے پر بحث ہونے لگتی!

بہرحال یہ باتیں غیر متعلق ہیں۔ عذرا نے اس تیمارداری سے کیا فائدہ اٹھایا۔ یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا لیکن یہ ضرور ہے کہ عذرا نے سہ رکبھی طلب نہیں کئے جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عذرا کی شکمی آمدنی یا اہلکاروں کی اصطلاح میں بالائی کافی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ ضرور ہے کہ عذرا نے اس تیمارداری کے دوران میں شیخ صاحب کو لکھنے پڑھنے کے چکر میں ڈال دیا۔ چنانچہ جب یہ غسل صحت کرکے آپے میں آئے ہیں تو ان کی نوشت خواند "ہندوستانی اتھوا ہندی" "یا" "ہندی اتھوا ہندوستانی" سے لگ بھگ ہو گئی تھی یعنی نہ ہندی نہ ہندوستانی بلکہ صرف "اتھوا"!

بچو، تم کو معلوم ہوگا کہ جب ہمارے ملک کے بڑے بڑے رہنما جیل خانہ بھیجے گئے تو وہاں بھی انھوں نے بیکار رہنا پسند نہ کیا بلکہ کتابوں کا مطالعہ کرتے رہے اور اس طرح جب وہ قید کی مدت کاٹ کر نکلے تو ان کے علم و فضل میں اور اضافہ ہو گیا اور وہ بہت اچھے مصنف قرار دئے گئے۔ چنانچہ شیخ بینائی نے بھی جتنے دن ختنہ کے سلسلہ میں چارپائی پر گزارے اس میں بے سر و پا قصہ سنتے سنتے، عذرا کی کوشش سے لکھنے پڑھنے کی تھوڑی بہت مشق کر ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ غسل صحت سے فارغ ہو کر دنیا کی چھین جھپٹ میں آئے تو پہلا خط انھوں نے اپنے چچا کے نام تصنیف کیا۔ مجھے اندیشہ ہے وہ خط کہیں تلف ہو گیا ہوگا ورنہ اس قابل تھا کہ اس کا

عکس پیامِ تعلیم میں شائع ہوتا۔

اس خط میں انھوں نے جھگڑے اور فساد کی بہت ساری باتیں دور کرنے کی کوشش کی تھی جو ہم ایسے پڑھے لکھے جاہلوں نے پھیلا رکھی ہیں۔ یہ خط پنسل سے کاغذ کے ایسے پُرزے پر لکھا گیا تھا جو سوا تحریر کے ہر مصرف میں آچکا تھا۔ جس واقعہ کو ہم لوگ یوں لکھتے "جواب دو"، اس کو انھوں نے یوں لکھا تھا۔ "ج واب، ۲"۔

اس حادثہ کے خلاف ان کو ہموار کرنے میں جب انکے تمام بھائی بہنوں کا ہنسنا، سمجھانا اور غرّانا بے کار ثابت ہوا تو یہ مسئلہ میرے سامنے لایا گیا۔ میں نے عرض کیا، شیخ صاحب تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح ہو یا نہ ہو اس کے معقول ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ لوگ اس کو سمجھیں یا مانیں کیونکہ اس دنیا کا جس میں ہم تم آ پھنسے ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ وہ یک بیک نتو ہزاروں لاکھوں سال پیچھے ڈھکیل دی جا سکتی ہے اور نہ ہزاروں لاکھوں سال آگے لُڑھکا دی جا سکتی ہے۔ تم نے جس قسم کی حرکت شروع کی ہے اس کا تحمل نہ مجھ میں ہے اور نہ کسی مسلمان کمونسٹ میں۔ اُردو لکھنے کا جو طریقہ تم نے پیش کیا ہے وہ اُردو املا کے پورن راج کا طریقہ ہے۔ فرمایا پورن راج کیا؟ میں نے کہا بات تو یہ بھی سمجھنے کی نہیں ہے لیکن آج کل کا دستور یہ ہے کہ جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہی معقول سمجھی جاتی ہے۔ لیکن ہم دو معقول آدمیوں کو معقول نامعقول کی بحث میں نہ پڑنا چاہیے۔ آپ نے جس طرح "جواب دو" کی تکا بوٹی فرمائی ہے، اس پر میرے خیالات حسب ذیل ہیں۔ اگر آپ بحیثیت ایک روشن خیال نوجوان کے اسے صبر و تحمل کے ساتھ سن لیں گے تو بوڑھوں کی مٹی ٹھکانے لگ جائیگی۔ ورنہ ظاہر ہے آپ حضرات کے خیالات اور آپ کا سلوک دونوں ایسے ہیں جن سے نہ آج کل کے کوئی منشی جی اتفاق کر سکتے ہیں اور نہ کوئی شریمتی رضامند رہ سکتی ہیں اور آپ سے کیا چھپانا آپ ہی کے سایہ عاطفت میں دونوں قسم کی مخلوق بستی ہے!

اچھا سنو، تم جو چائے پیتے ہو اس میں کیا کیا چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ کہنے لگے شکر، دودھ، چائے کی پتی، پانی۔ میں نے کہا اگر یہ چیزیں دسترخوان پر علیحدہ علیحدہ رکھ کر تمہارے سامنے پیش کی جائیں تو تم کتنے جز بز ہوگے۔ نوکر سے کہوگے کہ چائے کہاں ہے، اگر وہ کہے کہ سامان رکھا ہے چائے بنا لیجیے تو پھر ظاہر ہے تم ایک ایسا نعرہ لگاؤگے کہ یہ ملازم تو جاں بحق ہو ہی جائے گا آس پاس کے دوسرے غریب نوکر چاکر بھی اپنا اپنا حق بخشوانے لگیں گے۔ اس کے بعد جب تمھاری شریمتی اماں بی نمودار ہونگی تو تم اس طور پر لسورنے لگوگے جیسے آج کل کے مسلمان جو کبھی اقبال کا ترانہ گاتے تھے اور اب مرثیہ "مسلی" فرماتے رہتے ہیں حکومت سے اپنے حقوق مانگتے ہیں۔ چائے کا یہ نسخہ جب شیخ صاحب کے حلق سے نیچے اُتر گیا تو میں نے کہا، اسی طرح ہر حرف کو موقع موقع سے ملا کر لکھتے ہیں تو مطلب صاف ہو جاتا ہے اور آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ جیسے ہر چیز کو ٹھیک طور سے ملانے سے گوشت کباب ترکاری تیار ہوتی ہے ورنہ علیحدہ علیحدہ رکھنے سے نہ تو کھانا تیار ہوتا ہے، نہ بھوک رفع ہوتی ہے اور نہ جی بھرتا ہے۔ اسی طور سے ۲ اور دو کا مطلب سمجھایا گیا۔ ان سے بعد میں یہ تو پوچھا نہیں گیا کہ یہ کچھ سمجھے بھی یا نہیں لیکن جس طرح پر انھوں نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سمجھے ہوں یا نہ ہوں کھانے کا لطیفہ انھیں پسند ضرور آیا۔ یعنی آنکھوں میں چمک اور کشادگی پیدا ہوئی۔ اور "ہاں" کو بہت کچھ قرأت اور تھوڑی بہت موسیقیت کے ساتھ ادا کر کے تخت پر

لوٹ لی، اور دونوں پاؤں کو چھت کی سمت اس طور پر کر دیا کہ اگر چھت فرش پر آ رہی ہو تو پہلے ان کے پیروں پر ٹک جائے!

شیخ صاحب کے منجھلے بھائی احسان نے اپنے چچا کو کوئی خط لکھا تھا جس کے صلہ میں ان کو پانچ روپیہ کا ایک منی آرڈر موصول ہوا تھا۔ اس واقعہ سے شیخ صاحب کی مٹھیاں بند اور باچھیں کھل گئیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ میں نے تو ختنہ کرایا، احسان نے کیا کرایا۔ اس دوران میں میں نے یہ طے کیا کہ احسان کے صدر میں سے چچا احسان کو اور چچا شیخ نیازی کو بلیں۔ احسان آمادہ ہو گئے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ آئندہ جو کچھ شیخ صاحب کو وصول ہو اس میں سے بقدر نصف یہ احسان کو شریک کر لیں۔ اتفاق سے ان کے نام بھی پانچ روپے آئے۔ تقسیم کرنے کا وقت آیا تو یہ بکھر گئے، کہنے لگے میں تو نہیں دیتا۔ پوچھا گیا کیوں تو کہنے لگے میں نے تو ختنہ کرایا احسان نے کیا کرایا۔ کہا گیا آخر احسان کے روپے میں کیوں شریک ہو گئے تھے۔ کہا "جو میں نے ختنہ کرایا"[ط] کہا گیا یہ صحیح ہے لیکن تمہارے ختنہ کرانے سے دوسرے کیوں گھاٹے میں رہیں کہنے لگے "جو میں نے ختنہ کرایا" لوگوں نے جب دیکھا کہ یہ "ختنہ کلام" تکیہ کلام بن چکا ہے تو مجھ سے رجوع کیا گیا۔ اور میرے سامنے بھی جب انھوں نے ہر بات پر ختنہ کی آڑ پکڑی تو میں نے کہا جناب شیخ صاحب آپ کا آشوب ختنہ تو کچھ "رومن تہذیب" سے لگا کھا رہا ہے جس کی آڑ میں آپ ہمارے مختصر سے مرنجا مرنج خاندان کو "ختنا" ڈالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی نیت یہی ہے تو آپ کو معلوم رہنا چاہئے کہ میں کچھ انجمن اقوام یا دیہات کے روشن چوکی والوں میں سے تو ہوں نہیں کہ برات کے ساتھ بھی ہے اور میت کے پیچھے بھی۔ مجھے یہ خرافات پسند نہیں۔ سیدھے سیدھے چچا رکھ دیجئے۔ کہنے لگے اور وہ بھی اس استغنا سے جیسے

نہ باسی بچے نہ کتا کھائے

روپے کس کے پاس ہیں؟ میں نے بھی بے صبری میں دُہرایا کس کے پاس ہیں، کہنے لگے اماں بی کے پاس۔ ڈرتے ڈرتے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ احسان اور شیخ صاحب دونوں کی رقمیں پیپلس بنک[1] میں "ڈوبی ہوئی اسامی" بن چکی ہیں۔ تحقیقات کرنے پر شیخ صاحب کے دوسرے بھائی بہنوں کی رقمیں بھی اسی مد میں پائی گئیں۔ میں نے غصہ نہایت احتیاط کے ساتھ تھوک دیا اس لئے اور بھی کہ تھوکنے میں یوں بھی احتیاط رکھنی چاہئے اور تمام قرضخواہوں کو بلا کر سب کی رقمیں متعین کرائیں اور بحیثیت قبلہ گاہ بنک کے جس کا ٹوٹا پھوٹا مفہوم بیٹر و بنک ہو سکتا ہے میں نے سب کو ایک ایک اقرارنامہ لکھ کر دیا کہ اتنی اتنی رقمیں ان کی جمع ہیں، عندالطلب ادا کی جائیں گی۔ یہ شیخ صاحب کی کم سمجھی یا تنک ظرفی تھی کہ انھوں نے اس اقرارنامہ کو دوست دشمن سبھی کو اس طور پر اور اس نیت سے دکھانا شروع کیا جیسے کوئی خطاب یافتہ اپنے تمغے یا سند اپنے دوسرے کم قسمت یا بدنصیب بھائیوں کو دکھاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دشمنوں نے سازش کر کے اس "عندالطلب نامہ" کو اڑا دیا اور شیخ صاحب نے ایک نعرہ فلک شگاف اور ایک عدد شامی کباب۔ اس قسم کے سخت مشتبہ اور قابل نفریں لین دین کا دروازہ ہمیشہ کے لئے اپنے اوپر بالکل بند کر لیا اور ——— صرف مجھ پر کھلا رہنے دیا!

شیخ صاحب نے متذکرہ صدر خط لکھنے کے بعد عذرا کو دکھایا تو انھوں نے اعتراض کیا کہ اس پر اپنا نام بھی تو لکھو۔

---

[1] پیوپلس بنک PEOPLES BANK. جب ٹوٹا تو اردو اخبارات میں غیر انگریزی داں بزرگوں نے اسے پیوپلس کے بجائے پیپلس ہی پڑھا۔

انھوں نے کہا نام لکھنے کی کیا ضرورت ہے لکھا تو میں نے ہی ہے۔ عذرا نے بہت کچھ سمجھایا لیکن یہ یہی کہتے رہے کہ جب میں نے ہی لکھا ہے تو پھر نام لکھنے کی ضرورت کیا ہے حسب معمول یہ لطیفہ بھی میرے ہی سامنے پیش کیا گیا۔ میں نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ خط تمہیں نے لکھا ہے لیکن تم کو تو معلوم ہے تمھارا نام منّا بھی ہے اور یہی نام جلیل صاحب کے چھوٹے لڑکے کا بھی ہے۔ اگر تمھارے چچا نے یہ سمجھ لیا کہ تمھارا نہیں بلکہ جلیل صاحب کے منّا کا ختنہ ہوا ہے اور انھوں نے روپے جلیل صاحب کے منّا کو بھیجدیا تو کیا ہوگا۔ یہ بات انھوں نے فوراً سمجھ لی اور پھر جس طور پر یہ مسکرا تے ہیں سر کو جنبش دی ہے اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو نقصان سے بچا لیا بلکہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ جلیل صاحب کے منّا کو زک پہنچادی۔

ہمارے صحن میں پھولوں کی کیاریاں ہیں اور ہر کیاری ہر بچے کے قبضے میں دیدی گئی ہے لیکن شرط یہ عائد کردی گئی ہے کہ درختوں کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ شیخ صاحب کو اس قسم کا قبضہ اور اس قسم کی بیدخلی کچھ قابل اطمینان نہیں معلوم ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کیاری میں خودروگھاس پات کو اپنی پسند کے پھل پھول اور ترکاریوں کے نام دینے شروع کردئے مثلاً گوکھرو کو رس بھری کہنے لگے اور پتھر چٹے کو سلاد سے تعبیر کرنا شروع کیا۔ یہاں تک تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ ہندوستان میں بے روزگاری انقلاب اور ٹوٹیا پاجامہ کو تمدن کے نام سے یاد کرتے ہیں لیکن جب شیخ صاحب نے اس امر کی کوشش شروع کردی یعنی مارنے مرجانے پر آمادگی ظاہر کی کہ دوسرے بھی ان کے گھاس پات کا اتنا ہی احترام کریں جیسا کہ یہ خود کرتے ہیں تو جیسا کہ عام قاعدہ ہے لوگوں نے ان کی کیاری کے اچھے بھلے درختوں کو بھی بھلا برا کہنا شروع کردیا یعنی ان کے گلاب کو اکوآ قرار دیدیا۔ اب یہ بڑے زچ ہوئے۔

چنانچہ شیخ صاحب نے یہ ترکیب نکالی کہ آس پاس کے باغوں میں جاکر کسی درخت کی ٹہنی توڑلی اور اسے نہایت فخر و اعتماد کے ساتھ گھر لاکر اپنی کیاری میں گاڑ کر پانی دیدیا۔ اس کے بعد رات کے وقت اس کی ترقی کے امکانات پر عذرا سے اس طور پر گفتگو کرتے جیسے یہ دونوں ٹہنیاں اُگیں گے تو سارا ہندوستان آزاد ہوگا اور سارے گھر پے قلم تراش۔ جب ٹہنی سوکھ جاتی تو یہ دوسری ٹہنی لاکر نصب کردیتے۔ ایک دن شیخ صاحب سے میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ جناب والا، میں نے جو یہ گلاب کے درخت لگا رکھے ہیں اور یہ اس لئے بیٹھا ہوں کہ کچھ دنوں بعد ان میں نہایت اعلےٰ درجہ کے پھول اور کلیاں نظر آئیں گی، آپ کی حرکت سے اس میں ایک مستقل میونسپلٹی کے آثار پیدا ہوچلے ہیں۔ اب آپ بتائیے کہ یہ خاکسار کیا کرے۔ فرمایا آپ تو درخت ہونے ہی نہیں دیتے۔ دو ہی چار دن میں ان کو اکھاڑ کر پھینکدیتے ہیں۔ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا، لیکن میں انھیں اسی وقت علیٰحدہ کرتا ہوں جب وہ بالکل سوکھ جاتے ہیں۔ سوکھی ٹہنی لے کر کیا کروگے۔ کہنے لگے میں نے خود دیکھا ہے۔ تھوڑی تھوڑی جڑ نکل رہی تھی کچھ دنوں میں سارا درخت ہرا ہوجاتا۔ میں نے کہا یہ تم کو کیسے معلوم ہوا کہ جڑ نکل رہی تھی۔ فرمایا وہ ہر روز صبح کو تھوڑا سا اکھیڑ کر میں دیکھ لیتا تھا کہ جڑ کا کیا حال ہے اسپر میں جس زور سے ہنسنا چاہتا تھا اتنی ہی عجلت کے ساتھ دم بخود ہوجانا پڑا کیونکہ دوسری بات انھوں نے اس سے بھی عجیب سنائی کہنے لگے ایک دن میں نے ٹہنی کے آس پاس کھودنا شروع کیا تو خوب بڑی بڑی جڑیں نکلیں۔ میں نے نہایت حزیں لہجہ میں عرض کیا، یہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ وہ جڑیں آپ کی سوکھی ٹہنی کی تھیں۔ وہ تو اُن بدقسمت گلابوں کی تھیں جن کے آس پاس

آپ نے باغبانی پروجیکٹ کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ خدارا اپنے اس اصول و عقیدہ سے باز آئیے کہ میرے گلاب کی جڑیں آپ کی سوکھی ٹہنی کے لئے کبھی بھی مفید ہو سکتی ہیں۔ یہ آپ نے میرے باغ کو مسلم لیگ کیوں بنا رکھا ہے۔ فرمایا یہ مسلم لیگ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا بس بخشئے۔ میں مسلم لیگ کا مفہوم سمجھانے سے یہ کہیں بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ ہر روز کسی درخت کی ٹہنی توڑ لایا کریں اور اسے کیاری میں نصب کر دیا کریں اور جب وہ سوکھ جایا کرے تو اسے پھینک کر کوئی دوسری ٹہنی لا کر نصب کر دیا کیجئے لیکن آپ کو اللہ رسول کا واسطہ میرے گلابوں پر رحم کیجئے۔ شیخ صاحب میری رقت پر غور ہی کر رہے تھے کہ عذرا نے ان کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف کو لے چلیں۔ شیخ صاحب نے پوچھا، یہ ابا میاں کیا باتیں کر رہے تھے۔ عذرا نے کہا کوئی بات نہیں ہے۔ اخباروں میں کہیں پڑھا ہوگا!

آج کل مکان بننے والا ہے۔ زمین کی صفائی ہو رہی ہے۔ گدھے اور خچر مٹی اور اینٹیں لا لا کر ڈال جاتے ہیں۔ بچوں کی عید ہے۔ اس لئے نہیں کہ نیا مکان بننے والا ہے بلکہ والدین بنائیں اب گدھے اور خچروں سے واسطہ ہے۔ تمام دن مٹی پر رہتے ہیں اور خچر اور گدھے پر سواری کرتے رہیں۔ ہر بچے نے اپنا خچر اور گدھا متعین کر لیا ہے۔ شیخ نیازی نے اپنے لئے جو گدھا منتخب کیا ہے وہ سب سے زیادہ مسکین لیکن سب سے زیادہ دولتیاں چلاتا ہے۔ یہ گدھا جو ہی لدا پھندا آیا شیخ صاحب نے بڑھ کر پذیرائی کی اور خود جلد سے جلد بوجھ اتارنے میں گدھے والے کی مدد کی اور فوراً گدھے پر مسلط ہو گئے۔

شیخ صاحب کو گدھوں کا تجربہ نہ تھا اور انصاف کو ہاتھ سے نہ جانا چاہئے۔ گدھوں کو بھی شیخ صاحب کا تجربہ نہ تھا پھر شیخ صاحب کی سواری کی ترکیب استعمال سے بھی واقف نہ تھے۔ سب سے پہلے دُم کی طرف سے چڑھے۔ گدھے نے دولتی جھاڑ دی اور یہ زمین پر ڈھیر ہو گئے۔ ادھر اُدھر دیکھا اٹھ بیٹھے اور گدھے کے منہ کی طرف سے چڑھنا شروع کیا۔ اس نے منہ مارا اور وہاں سے ناکام پھرے تو پہلو سے حملہ کیا اور بیٹھ گئے۔ دو ہی قدم چلے تھے کہ پھر زمین پر آ رہے۔ شام کو مکان واپس آئے۔ بیک نظر معلوم ہو سکتا تھا کہ تمام دن ان کا گدھوں سے اور گدھوں سے ان کا کیسا سابقہ رہا ہے۔ خلاف معمول چُپ چُپ سے رہے اور کھا پی کر سو رہے۔ صبح اٹھے تو چہرہ پر ایک خاص قسم کے عزم کے آثار پیدا تھے۔ ناشتہ وغیرہ کے مراحل سے بھی خاموش اور جلد جلد گزر گئے۔ چلتے وقت عذرا کو بھی اپنا پروگرام نہ بتایا، عذرا کو کچھ شبہ ہوا اور انھوں نے پوچھا کیوں مُنّا کیا بات ہے اور یہ بغل میں کیا دبائے ہو۔ شیخ صاحب نے ادھر اُدھر دیکھا کوئی نہ تھا، بغل سے بقچی نکالی اس میں ماں کا موباف اور عذرا کا دوپٹہ تھا۔ عذرا ہکا بکا رہ گئیں۔ پوچھا یہ کیا کرو گے بولے کل گدھے نے بڑی بدمعاشی کی کچھ دور تو دوڑا پھر مجھے گرا دیا اور گرنے پر دولاتیں بھی ماریں۔ آج میں (موباف دکھا کر) اس سے تو اس کی ٹانگیں باندھوں گا اور دوپٹہ منہ پر لپیٹ لوں گا کہ لاتیں نہ لگیں۔ عذرا نے گھبرا کر کہا تم بھی کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو۔ گدھے کی ٹانگ باندھ دو گے تو وہ چلے گا کیسے اور اپنا منہ لپیٹ لو گے تو دیکھو گے کیسے کہ گدھا کہاں جا رہا ہے۔

اتفاق سے اُدھر میاں کا گذر ہوا جہاں یہ دونوں گدھے کے خلاف مشورہ جنگ میں مصروف تھے۔ مشورہ میں تیسرے فریق کے شامل ہو جانے سے نقشۂ جنگ ہی بدل گیا جیسا کہ تفریقی شوریٰ (TRIPARTITE CONFERENCES.) کا اکثر انجام ہوا کرتا ہے۔ یہ تفریقی تباہی کے وزن پر ہے۔ پھر تفریقی میں یہ معنوی خوبی بھی ہے کہ اس کی ابتدا اور اس کا انجام دونوں تلفظ

کے ادبی تبحر سے نظر کے سامنے آجاتے ہیں۔ تفریقی (سہ فریقی)
یعنی تگڈم اور تفریقی یعنی اُن بَن ڈالنے والا (اور اس کا شمار بھی
تگڈم ہی کے بھائی بندوں میں ہوتا ہے)

ماں نے موباف کے مصرف کا حال سُنا تو شیخ صاحب کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہا جو گدھا اُن سے پہلے شیخ صاحب سے کرچکا تھا۔ یہ واقعہ بلاؤ کاسٹ ہوتے ہوتے فضائی خلفشار کی سورت میں مجھ تک پہنچا۔ میں نے نیک بخت ماں کو سمجھایا کہ اس میں بگڑنے کی کون سی بات ہے۔ مُنّا بیچارا گدھے کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو بعض میاں بیوی ایک دوسرے کے ساتھ کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا ہندوستان کا ہر مسلمان لیڈر اپنی قوم سے کررہا ہے۔ نیک بخت نے تڑپ کر کہا تم تو ہو ہولے خبطی، بچوں کے معاملہ کو کہاں کہاں گھسیٹتے پھرتے ہو۔ تمہارا ہندوستان، تمہاری قوم اور تمہارے لیڈر گئے بھاڑ چولھے میں، میں بچوں کو بے راہ نہ ہونے دونگی۔ موباف سے گدھے کی ٹانگ باندھی جائے گی۔ واہ واہ وا، پھر گدھے پر سے جو گرے اسے گدھے کی دولتی ضرور کھانی چاہئے۔ اس کے بعد کچھ اور باتیں ہوئیں جن کے سننے سے پیامی بچوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی۔ ان سے والدین کو البتہ عبرت ہوسکتی ہے۔ لیکن یہاں مطلب اول الذکر کی دلچسپی سے ہے مؤخرالذکر کی عبرت سے نہیں اس لئے ان باتوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے۔

کارکنان پیام تعلیم کو میرا شکرگزار ہونا چاہئے کہ باوجود شیخ نیازی کی سخت ممانعت کے میں یہ مضمون پیام تعلیم کے لئے لکھ رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اب شیخ صاحب پیام تعلیم پڑھ لیا کرتے ہیں۔ نیم حکیم کی طرح نیم خواندہ بھی خطرہ جان ہوتا ہے۔ شیخ صاحب ایک دن میرے پاس آئے اور بگڑ کر بولے۔ ابا میاں اب پیام تعلیم کے لئے کوئی مضمون نہ لکھئے گا۔ میں نے کہا یہ کیوں؟ کہنے لگے پیام تعلیم والے بڑے بڑے لوگ ہیں۔ میں نے کہا یہ کیونکر۔ کہا دیکھئے لکھتے ہیں "بے نیازی"۔ میں نے کہا بے نیازی سے تم کیا سمجھے، کہنے لگے "یہی کیوں بے نیازی"! میں نے کہا یہ بات نہیں ہے۔ اس بے نیازی کو تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ "بے نیازی" کے معنی ہیں کسی کا محتاج نہ ہونا، کوئی فکر نہ ہونا، کسی کی پروا نکرنا، بالکل جہنم ہونا بولے یہ جہنم کیا۔ میں نے کہا مجھے جو کچھ آتا تھا وہ میں نے بتادیا۔ اس دفعہ ذاکر صاحب آئیں تو ان سے پوچھنا جہنم کسے کہتے ہیں۔ شیخ صاحب کچھ مسکرائے۔ میں نے کہا اس میں مسکرانے کی کون سی بات ہے۔ بولے اور اس طور پر جھومے جیسے کوئی شرابی تصوف کے مفہوم سے وجد میں آگے۔ بولے۔ سمجھ گیا۔ میں نے پوچھا آخر کیا سمجھے؟ بولے، مٹھے[1]!!

عذرا کے کمرہ کے دروازہ کی چٹخنی اندر سے گرگئی جس کی وجہ سے کواڑ بند ہوگئے۔ سب نے بہت کچھ کوشش کی لیکن دروازہ نہ کھلا۔ عذرا کی پریشانی بہت بڑھی تو شیخ نیازی نے اپنے ذہن میں ایک اسکیم مرتب کی اور دوپہر میں جب گھر کے اُن لوگوں نے جن کو شیخ صاحب کے خلاف پولیس کے بے پناہ اختیارات حاصل ہیں کمر کھول دی تو شیخ صاحب معلوم نہیں کدھر سے گھر کی چھت پر چڑھ کر ہمسایہ کی چھت پر کود پڑے جہاں عذرا کے کمرہ کا روشن دان کھلتا تھا۔ روشندان کی کنڈی میں رسی باندھی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کس طرح روشندان سے گذر کر رسی کے سہارے پندرہ ۱۵ فٹ دیوار طے کرتے ہوئے کمرہ میں اُترے اور چٹخنی کھول دی۔ پولیس

---

[1] علالت و معالجہ کے سلسلہ میں شیخ الجامعہ صاحب کا قیام ایک بار دہرہ دون رہا۔ اس سلسلہ میں موصوف کے وطن قائم گنج سے وقتاً فوقتاً لمزن شربتی لیموآئے۔ ظاہر ہے ان میں شیخ نیازی کا کیا حصہ رہا ہوگا۔

ملّو اور فیلو

(۱)

فیلو کو بچّوں سے بڑی محبت ہے۔ ایک انڈا سارس کا ملا تو مارے خوشی کے باغ باغ ہیں۔ ملّو بھی دیکھتے ہیں!

فیلو نے اسے دھوپ میں رکھا۔ کیا حفاظت ہے۔ ذرا ہوا کُھٹ سے!

(۳)
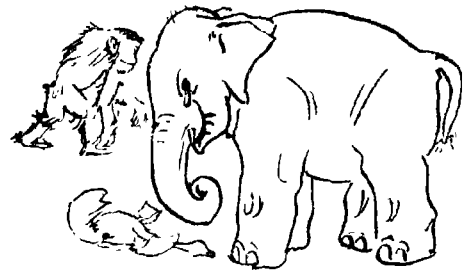
کھٹ۔ کھٹ۔ پھٹ
مارے خوشی کے فیلو کے آنسو نکل آئے۔

(۴)
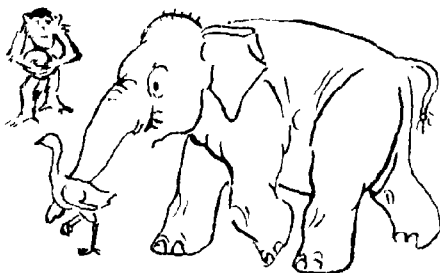
فیلو میاں ننھے سارس کو ٹہلاتے ہیں۔ چال سکھاتے ہیں۔ ملّو بھی تلاش میں تھے۔ یہ بھی ایک انڈا ڈھونڈھ لائے۔

(۵)

فیلو اپنے بچے کو کھلاتے ہیں اور ملّو روز دعا مانگتے ہیں کہ کچھ نکلے۔ پر کھٹ نہیں ہوتا۔ انڈا لمبا ہوتا چلا جاتا ہے۔

(۶)

ایک دن دُعا مانگ رہے تھے کہ انڈا پھٹا۔ دھڑام سے۔ اور اس میں سے نکلا مگر مچھ کا بچہ۔ ملّو کے صدمے کا کیا پوچھنا۔ اور فیلو تو یہ جا وہ جا۔

دلچسپ مشغلے

گھونگے اور سیپیاں

از حاجی صاحب

کسی پچھلے پرچے میں تم تتلیاں جمع کرنے کے بارے میں حاجی صاحب کا —— مضمون پڑھ چکے ہو۔ آج جی چاہتا ہے کہ تمھیں گھونگے اور سیپیاں جمع کرنے کے بارے میں کچھ بتائیں مگر بھئی پڑھنا غور سے! سمندر کی کوڑیاں تم نے دیکھی ہیں؟ کیسی خوب صورت ہوتی ہیں۔ اُن کے اوپری جسم جنھیں انگریزی میں (SHELL) کہتے ہیں کتنے پیارے پیارے معلوم ہوتے ہیں اور جو کسی اچھے سے نفیس بکس میں باقاعدہ رکھے ہوں تب تو سبحان اللہ! خشکی اور تازہ پانی کے گھونگے اتنے خوب صورت نہیں ہوتے چھوٹے بھی ہوتے ہیں۔ اچھا پہلے اُن کے جمع کرنے کے طریقے سن لو۔

ضروری سامان

مضبوط ٹین کی ایک چھلنی۔ جس میں بہت باریک چھید ہوں۔ چوڑائی چھ انچ کافی ہے اس میں ایک کھوکھلا ہینڈل یا دستہ بھی ٹین ہی کا لگا ہو تاکہ اس میں لکڑی کا بڑا دستہ آسانی اور مضبوطی سے لگ جائے۔ دستے کے لئے تمھارے ابّا کی پرانی چھڑی خوب کام دے گی وہ نہ لے تو ایک ٹھوس لمبا بانس ہی کافی ہوگا۔ ایک چھوٹا سا مددر
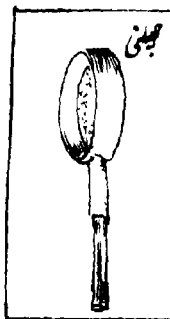
چھلنی

شیشہ یعنی (POCKET LENS) بازار میں ۲ر کو مل جاتا ہے مختلف قسم کے چھوٹے بڑے دفتی یا لکڑی کے بکس ۴ انچ اونچے اور دس بارہ انچ چوڑے۔ ایک تھیلا اور بس کوڑیوں اور گھونگوں کی تلاش! سب سے آسان تو یہ ہے کہ سمندر کے کنارے چلے جاؤ۔ جہاں ساحل پر تمھیں بہت سے پڑے ہوئے یا چٹانوں کی درزوں میں گھسے ہوئے مل جائیں گے۔ اکثر سیپیاں بالو میں آدھی گڑھی ہوئی ہیں۔ پانی کے قریب بالو میں ذرا سا گڑھا کھودنے سے بھی بہت سی مل سکتی ہیں۔ لیکن خشکی پر یا دریاؤں اور تالابوں میں ٹین کی چھلنی کی ضرورت پڑتی ہے۔ قریب کے تالاب اور دریا میں ٹین کی چھلنی کو پانی میں ڈالو اور لکڑی کی مدد سے تہ کو کھرچو۔ کیونکہ چھوٹی چھوٹی سیپیاں گاؤدم گھونگے وغیرہ زیادہ تر تہ میں چھپے ہوتے ہیں جب چھلنی تہ کی بالو سے بھر جائے تو پانی سے باہر نکال کر سب بالو بہا دو چھلنی پانی میں ڈوبی رکھو۔ بس ذرا سا کنارا اوپر نکلا رہے ورنہ کچھ سیپیاں بھاگ جائیں گی۔ جب بالو دھل جائے گی تو چھلنی میں سپید اور مٹیلے رنگ کی سیپیاں اور گھونگے رہ جائیں گے۔ ان کو نکال کر تھیلے میں ڈال لو۔

اس کام میں محنت اور صبر کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے پہلی مرتبہ کچھ بھی نہ ملے۔ لیکن اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا

کہ کبھی پانی کے اندر نہ اترنا۔ جب تک کہ تم خوب تیرنا نہ جانتے ہو۔ اور دریا یا تالاب، دریائی جانوروں سے محفوظ ہو۔

گاؤدم گھونگے جنھیں انگریزی میں (SNAIL) کہتے ہیں اکثر ان تالابوں میں زیادہ ملتے ہیں جن میں کثرت سے گھاس اُگی ہو۔ کیونکہ یہ ان ہی سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں اور ان کے ڈنٹھلوں اور پتوں سے چمٹے رہتے ہیں لیکن جہاں کسی نے گھاس کو ہلایا اور نہ جانے یہ ڈر جاتے ہیں یا کیا بات ہے کہ ایک دم سے اپنی گرفت ڈھیلی کر دیتے ہیں اور زمین پر گر جاتے ہیں۔

گھاس میں چھلنی کے چلانے سے بہت سے گھونگے بڑی آسانی سے مل جائیں گے۔ کچھ گھونگے دریا کے کنارے ٹیلے کے کناروں کی درزوں میں رہتے ہیں۔ یہاں کچھ خودرو گھاس اُگی ہوتی ہے۔ اکثر ان کی جڑوں میں چمٹے رہتے ہیں اُنھیں اکٹھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس مٹی کو جمع کرکے پانی میں دھو ڈالو۔ کچھ گاؤدم گھونگے پانی میں نہیں رہتے بلکہ اکثر درختوں کی چھالوں پر رہتے ہیں۔ یہ چڑھنے والے گھونگے کہلاتے ہیں۔ جو اکثر پیڑوں ہی پر رہتے ہیں انھیں پکڑنے کا سب سے اچھا وقت پانی برس جانے کے بعد صبح تڑکے ہوتا ہے۔

جب بہت سے گھونگے جمع ہو جائیں تو ان کے کیڑے مارنے کی تدبیر کرو۔ چھوٹے چھوٹے گاؤدم گھونگے تو سخت دھوپ میں رکھ دینے سے مر جاتے ہیں۔ بڑے بڑے زندہ گھونگے اور کوڑیاں پانی میں ابالنے سے مر جاتی ہیں البتہ سیپیاں کھول کر کیڑا علیحدہ کرنا پڑتا ہے۔ گرم پانی میں ابالنے کے بعد گھونگوں اور کوڑیوں کو ٹھنڈے پانی میں ڈال دینا چاہئے تاکہ اُن کے کیڑے سکڑ کر اوپر کی سخت جلد سے علیحدہ ہو جائیں۔ پھر انھیں چمٹی یا پن کی مدد سے نکالا جا سکتا ہے۔ سیپ یا خول میں بو آتی ہو تو اسے بینزین یا پٹرول میں ڈال کر ہلاؤ۔ بدبو جاتی رہے گی۔ کیڑوں کے خول کو کہیں زور سے نہ رگڑ دینا۔ اُن کا رنگ خراب ہو جائے گا۔ اگر گھاس وغیرہ لگی ہو تو اس کو برش سے ہٹا دو۔ چھوٹے گھونگوں کو گرم بالو پر رکھ کر مار ڈالنا چاہئے۔

خشکی کی (SNAILS) کو ایک برتن میں رکھ کر رفتہ رفتہ گرم پانی ڈالنا چاہئے اس طرح وہ مر جائیں گے۔ مرے ہوئے کیڑوں کے جسم یا خول کے اندر باریک صاف روئی بھر دینا چاہئے۔ تاکہ اندر کا حصہ خراب نہ ہو جائے اور دب جانے سے نقصان نہ پہنچے۔ چھوٹی چھوٹی سیپیاں معمولی کارڈ پر خوب صورتی کے ساتھ گوند سے چپکا دو۔ بہت بھلی معلوم ہوں گی۔

ان چیزوں کو صرف خوب صورتی ہی کے خیال سے جمع نہ کرو۔ ان کے اندر کے کیڑوں کو بھی غور سے دیکھو۔ جیسے جیسے انھیں پکڑتے جاؤ۔ ان کے رہنے سہنے کے طریقوں پر بھی غور کرو۔ کیسے اُن کا اوپر کا خول بڑھتا ہے۔ کس طرح وہ اپنی زندگی پانی میں گذارتے ہیں۔ ان کی نسل کیسے بڑھتی ہے؟ وغیرہ، وغیرہ۔

ان کیڑوں کے جسم بہت نرم اور کم زور ہوتے ہیں۔ بہت سوں کے تو ہڈی ہی نہیں ہوتی اس لئے اپنی حفاظت کے لئے انھیں اوپر کا سخت خول بنانا پڑتا ہے۔ یہ جسم پانی میں گھلے ہوئے چونے سے بنتا ہے۔ چونے کا یہی خوب صورت خول ان کا گھر ہے۔ جسے وہ اپنی پیٹھ پر لادے لادے پھرتے ہیں ان کے سر نہیں ہوتا اس کی جگہ ڈنک

جیسی دو چیزیں ہوتی ہیں جنھیں انگریزی میں (TENTACLES) کہتے ہیں۔ اس سے وہ اپنا راستہ معلوم کر لیتے ہیں کیڑوں کے آنکھیں ہوتی ہیں اور کچھ کے بالکل نہیں جو گھونگا دریا کے کنارے ملتا ہے۔ اس کے دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ لیکن دو ڈنک جیسے زرد گوشت کے سینگ۔ سینگوں کے سرے پر جس سے اس کا "سر" بالکل گائے کا سا معلوم ہوتا ہے جس کے اوپر دو سینگ لگے ہوں۔ اُن کے جسم کا کوئی حصہ زخمی ہو جائے یا الگ ہو جائے تو پھر بڑھ جاتا ہے۔ ان کے پیر صرف گوشت کا لوتھڑا سے ہوتے ہیں۔ لیکن گوشت کا یہ لوتھڑا بہت ہی لچکدار ہوتا ہے۔ ان کے دل، رگیں پٹھے غرض سبھی کچھ ہوتا ہے اور خون کا رنگ سفید اور سفیدی مائل۔ سانس لینے کے لئے نلکیاں سی ہوتی ہیں۔ پانی میں کئی گھونگے پڑے ہوں اور کوئی رنگ ڈال دیا جائے تو بلبلے اُٹھتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ گھونگے دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن تازے پانی کے گھونگے سمندر کے کھاری پانی میں نہیں رہ سکتے۔ اور ایسا ہی سمندری گھونگے تازے پانی میں۔

کچھ گھونگے چٹانوں، سمندری درختوں سے ہمیشہ چمٹے رہتے ہیں۔ کبھی نہیں ہلتے اور کچھ بہت تیز چست اور چالاک ہوتے ہیں۔ دور دور کی سیر کرتے ہوئے پکڑے جاتے ہیں!

کہیں اوپر ذیل مختلف قسم کے گھونگوں اور سیپیوں وغیرہ کی تصویریں دی ہوئی ہیں جن سے تمھاری سمجھ میں بخوبی آ جائے گا۔

چاتر سے شکار (محمد معظم جامی جیراج پوری) چاتر ایک قسم کا دیہاتی جال ہے جو بڑی مچھلیوں کے شکار میں بہت کار آمد ہے۔ کوئی ۵۰ فٹ لمبا اور ۳۰ فٹ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کے کنارے کنارے دو دو گز کے فاصلے سے شکاری اپنے لٹھ باندھتے ہیں اور کم بڑھ ۲۴ - ۲۵ آدمی اس میں لگتے ہیں۔ وہ اس کو ندی یا جھیل کے گہرے پانی میں لے جا کر زمین پر بچھاتے اور اپنے لٹھوں سے کھینچ کر اس کو پھیلاتے ہیں۔ پھر لٹھوں کو زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ اور چاروں طرف سے پانی میں ہنکال کر مچھلیوں کو گھیر کر اس کی طرف لاتے ہیں۔ پھر ایک ساتھ سب کے سب اپنے لٹھ پکڑ کر اٹھاتے ہیں اور اس کو پانی کے اوپر لا کر سروں کو ملا دیتے ہیں تا کہ مچھلیاں جال میں سے کود کر باہر نہ نکل سکیں جیسا کہ تصویر سے ظاہر ہے۔ یہ تصویر ٹھیک اس وقت لی گئی ہے جب کہ کم سے کم بارہ فٹ گہرے پانی کے اندر شکاریوں نے چاتر کو پرا ٹھا رکھا ہے۔ اب اس کو کھینچ کر کنارے پر لائیں گے تا کہ اس میں جس قدر مچھلیاں ہوں وہ پکڑ لی جائیں۔

(تصویر کسی دوسری جگہ دیکھو)

گڑیا بنانا

ایک ٹکڑا دفتی کا لے کر اس کی ایک ایک انچ چوڑی دو تین پٹیاں کاٹ لو پھر قینچی سے ان پٹیوں کے چوکور ٹکڑے کاٹ کر ہر ٹکڑے میں سے ایک گول ٹکیا نکال لو۔ ٹکیا کا ناپ تصویر کے اس خاکے کی ایک ٹکیا کے برابر ہونا چاہیے۔ یہ بھی ٹریس کر کے کاٹ لو اور اٹھارہ ٹکیاں بالکل خاکے کی ٹکیوں کے برابر بنا لو۔ اب ایک ٹکڑا ٹریسنگ پیپر کا لے کر اسی تصویر پر رکھ کر چہرا ٹوپی اور پر سمیت ٹریس کر لو اور پھر اسی طرح کاربن پیپر سے دفتی کے ٹکڑے پر اتار لو۔ اور احتیاط سے تراش کر چہرا نکال لو

پھر آٹھ ٹکیاں سفید اور دس ٹکیاں سیاہ گہرے رنگ سے رنگ لو۔ چہرہ بھی سیاہ رنگ اور باریک برش سے صفائی کے ساتھ رنگ لو۔ ٹوپی، سرخ۔ پر، کالا۔ رنگ لو۔ اب تصویر میں دیکھ کر اس طرح سب ٹکیوں کو موٹی سوئی اور مضبوط تاگے سے ٹانکو نیچے والی ٹکیا کا کنارہ اوپر والی ٹکیا کے کنارے پر رہے اس طرح خوب صورتی بھی آجائے گی اور مضبوطی بھی۔ ایک سیاہ اور ایک سفید ٹکیا جوڑتی چلی جاؤ۔ دونوں ہاتھوں کے درمیان والی سفید ٹکیا کے کنارے پر چہرا ذرا خم دے کر ٹانک دو جیسے تصویر میں ہے چھڑی پتلی دفتی کی اسی طرح بنا کر بائیں ہاتھ کے سرے پر ٹانک دو تو تمھاری گڑیا تیار ہوگئی اس کے ٹوپے کے اوپر والے سرے میں ریشمی تاگہ پرو کر اگر گڑیوں کے مکان کی بڑی کھڑکی میں لٹکا دو تو بہت اچھی معلوم ہوگی

شمسی عباد الرحمٰن

آواز

رشید مرزا، متعلم جامعہ ملیہ، دہلی۔
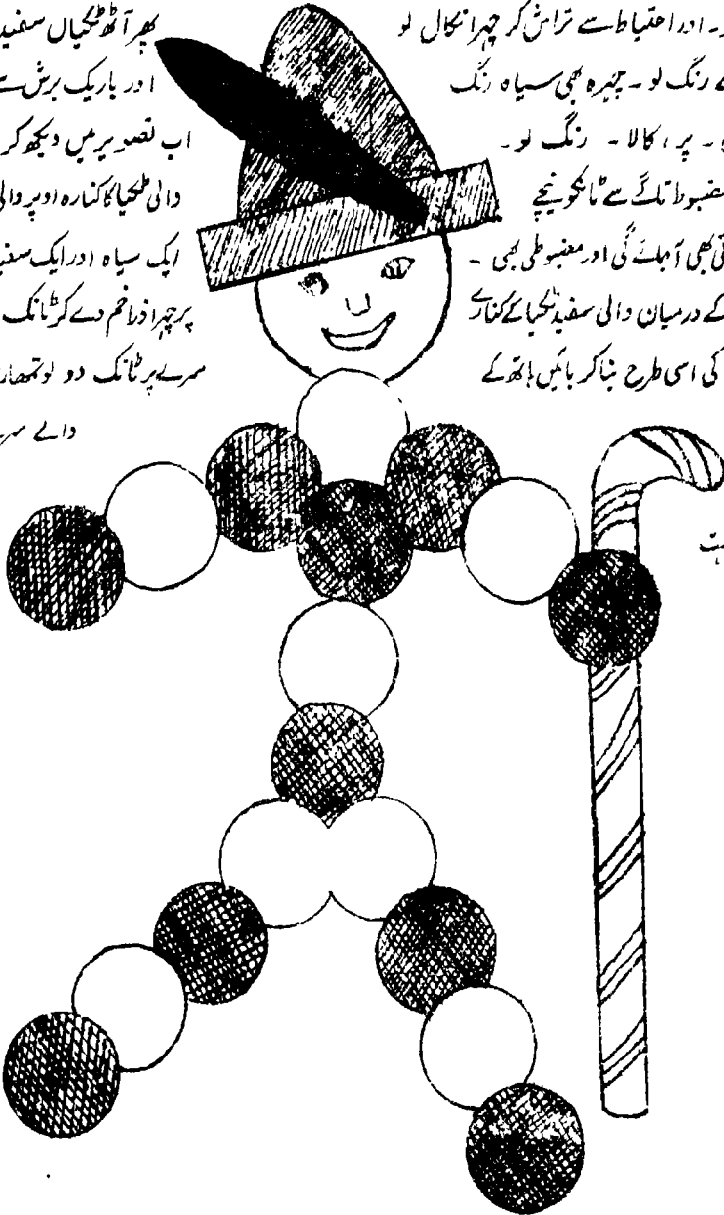
گھر میں اور گھر سے باہر صبح سے شام تک تم بہت سی
وازیں سنتے ہو۔ اگر کبھی کسی سنسان جگہ چلے جاؤ تو جانوروں
ی آوازیں سنائی دیں گی۔ جنگل یا کسی برف کے پہاڑ پر
ا کے جھونکوں کی سرسراہٹ، بادل کی گرج اور برف کے
دوں کے پھسلنے کی آوازیں آئیں گی۔ کارخانے میں مشینوں
ڑگڑاہٹ سے واسطہ پڑے گا۔ بازار میں موٹر، ٹرام
غیرہ کا شور و غل ہوگا۔ تمھارے گھر میں ریڈیو سٹ
و ریڈیو اسٹیشن سے بھانت بھانت کی آوازیں آئیں گی
چھی تقریریں، مزے مزے کے گانے، خبریں اور ڈرامے۔
بھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ آواز ہے کیا چیز؟ ہم تمام
وازیں جو ہم سنتے ہیں۔ ہوا کی حرکت سے پیدا ہوتی ہیں
ہو تو پھر کوئی آواز ہی نہ ہو۔ ایسی حالت میں ہم زندہ بھی
ں تو کان تو بالکل بیٹ ہوں گے۔ کچھ سنائی نہ دے گا۔
بکس یا مٹکے میں سے ہوا نکال کر ایک بجتی ہوئی گھنٹی اس میں
آواز بالکل نہ سنائی دے گی جب تک کہ ہوا اس میں
ہنچ جائے۔ ہاں مٹکے میں پانی بھرا ہو تو ہم آواز سن سکتے
س لئے کہ اس میں ہوا کا گذر ہے۔ اچھا تم تالاب میں ایک
ل کر دیکھو کیسی لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ اپنی آواز کو بھی
ایسی سمجھو۔ جب تم بولتے ہو تو تمھاری آواز سے ہوا میں
لہریں پیدا ہوتی ہیں جیسے پانی میں پتھر ڈالنے سے۔ اب
یزی کے ساتھ ہوا میں سے گذر کر کان کے پردوں
سے ٹکراتی ہیں۔ کان اور دماغ کے درمیان ایک رگ ہے۔
سننے والی رگ۔ یہ رگ لہروں کو دماغ تک پہنچاتی ہے اور
ہم سنتے ہیں۔

دماغ اور کان کے اندر کی چیزیں معلوم کرنے سے
پہلے یہ پتہ لگانا چاہئے کہ آوازیں تیز اور دھیمی کیوں ہوتی ہیں؟
ہم پیانو سے بہت سی مختلف قسم کی آوازیں سنتے ہیں۔ یہی حال
باتیں کرتے یا گاتے وقت ہوتا ہے۔ آواز کا تیز یا دھیما ہونا
لہروں پر موقوف ہے۔ تیز سُر مختصر اور جلد تھرتھراہٹ سے
پیدا ہوتے ہیں۔ باریک یا دھیمے سر لمبی اور دھیمی سرسراہٹ سے
ابھی بتا آئے ہیں کہ لہروں کی تھرتھراہٹ کانوں سے
ٹکراتی ہے۔ اور وہاں ایک گنگناہٹ سی پیدا ہوتی ہے۔ کان
خاص طور سے اسی لئے بنایا گیا ہے۔ اس کے باہر کا حصہ جو
گراموفون کے بھونپو کی شکل کا ہوتا ہے۔ ہوا میں سے تھرتھراہٹ
کو آسانی سے پکڑ لیتا ہے۔ یہ چپٹی شکل کا ہوتا تو آواز تو ضرور
سنائی دیتی پر اتنی صاف نہ ہوتی۔ پھر یہاں سے آگے ایک انچ
سے کچھ لمبا راستہ ہوتا ہے۔ اسے سننے والی نالی کہتے ہیں۔
اس نالی کے اندر کے حصے کے پاس ایک پتلی جھلی ہوتی ہے۔
جیسے ڈھول پر کھال مڑھ دی ہو۔ آواز کان کی نالی سے ہو کر
اس جھلی سے ٹکراتی ہے تو یہاں بھی تھرتھراہٹ پیدا ہوتی ہے
جیسے ڈھول پر تھاپ سے۔ اس جھلی سے تین ہڈیاں ملی ہوتی ہیں۔
جھلی میں تھرتھراہٹ پیدا ہوتے ہی یہ تینوں آگے بڑھتی اور

پیچھے ہٹتی ہیں۔ اور اس طرح یہ تھرتھراہٹ یا حرکت کو کان کے اندر کے حصے میں پہنچاتی ہیں۔

کان کے اندر کا حصہ عجیب شکل کا ہوتا ہے۔ بالکل گول، گنبد جیسا۔ لیکن ہے اصل میں سب سے ہی نازک اور ضروری حصہ۔ اندر ایک اور جھلی بھی ہوتی ہے۔ یہ اس حصے کو اس رگ سے ملاتی ہے جو آواز کو دماغ تک پہنچاتی ہے اور سننے والی رگ کہلاتی ہے

تمام آوازیں ان سب راستوں سے گذرتی ہیں۔ سچ سچ بڑا تعجب ہوتا ہے کہ آواز کیسے ان تمام راستوں سے گذر کر اتنی جلدی ہمیں سنائی دیتی ہے۔ کوئی بہرا ہو جائے یا کم سننے لگے تو ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کان کے راستوں میں کوئی خرابی ضرور پیدا ہو گئی جس سے تھرتھراہٹ سننے والی رگ تک نہیں پہنچ پاتی۔

کان کی مشین کے ان پرزوں کو تیل بھی دیا جاتا ہے جس سے وہ ہر وقت کام کے لئے تیار رہتے ہیں۔ یہ تیل موٹا اور نرم ہوتا ہے اسے تم کان کا میل کہتے ہو۔ کان کا موم بھی اسی کو کہتے ہیں۔ بعض بیماریوں میں موم زیادہ تیار ہونے لگتا ہے یا اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ سننے کے راستوں کو بند کر دیتا ہے اور اس سے آدمی بہرا ہو جاتا ہے۔ یہ موم کان کے اندر کے نازک حصوں کی حفاظت بھی کرتا ہے۔

آواز کی رفتار (دوڑ) مختلف ہوتی ہے۔ ہوا میں سے گذرتے وقت اس کی رفتار ۱۱۰۰ فٹ فی سیکنڈ ہوتی ہے کسی معمولی ریل گاڑی سے بارہ گنی تیز۔ لیکن تیز ہوا اسے روکتی ہے۔ تیز ہوا میں آواز مشکل سے سنائی دیتی ہے۔ خصوصاً جب مخالف طرف سے آواز دی جائے۔

کبھی کبھی کسی خالی کمرے میں، بڑے ہال میں یا پہاڑ کے پاس تم زور سے چیختے ہو اور ویسی ہی آواز تمھیں دوبارہ سنائی دیتی ہے جیسے تمھاری کوئی نقل کر رہا ہو۔ بعض وقت اس میں بڑا مزا آتا ہے۔ اور تم خوب چیختے چلاتے ہو۔ آواز بازگشت اسی کو کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ آواز دیوار یا چٹان یا کسی اور چیز سے ٹکرا کر لوٹ آتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب ہوا ساکن ہو اور راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ کمرے میں آدمی ہوں تب بھی آواز سنائی دے گی۔ بلکہ لوگوں کے کانوں میں جذب ہو جائے گی۔

ہاں ایک بات اور رہ گئی۔ جب کسی آدمی کو دور سے آواز دیتے ہو۔ تو وہ آواز کو اتنے زور سے نہیں سنتا جتنے زور سے تم بول رہے ہو۔ بات یہ ہے کہ تمھارے منہ سے نکلتے ہی آواز چاروں طرف پھیل جاتی ہے اور اس میں وہ طاقت باقی نہیں رہتی جو تمھارے منہ سے نکلتے وقت تھی۔ البتہ اگر تم اسپیکنگ ٹیوبس (SPEAKING TUBES) میں بولو تو آواز دور تک ایک ہی سی سنائی دے گی۔ اس لئے کہ اس میں آواز پھیلنے نہیں پاتی۔ بلکہ ایک تنگ جگہ میں دور تک چلی جاتی ہے ٭

جناب حمدی صاحب نے یہ ڈراما سالگرہ نمبر کے لئے بہت محنت اور اہتمام سے لکھا ہے۔ افسوس ہے کہ رسالہ میں اتنی گنجایش نہیں ہے کہ اسے پورا شائع کیا جاسکے۔ اسلئے مجبوراً صرف ایک حصہ شائع کیا جاتا ہے۔ ایڈیٹر

منظر

پرستان میں ایک بڑا سا غار، یہ غار بالشتیوں کا کارخانہ بھی ہے اور رہنے کا مکان بھی۔ مناسب سازو سامان سے آراستہ ہے دیواروں پر مختلف درختوں اور جھاڑیوں کی شاخیں لٹک رہی ہیں۔ کچھ کھونٹیاں ہیں جن پر بالشتیوں کی مختلف رنگ کی ٹوپیاں وغیرہ ٹنگی ہیں۔ ایک نمایاں مقام پر سلیٹ اور پنسل لٹک رہی ہے۔ ایک طرف اسٹول پر ڈھول رکھا ہے، اس کے پاس ہی ایک گھنٹی ہے۔

غار کے دائیں بائیں دو دروازے ہیں۔ داہنے دروازے سے باہر جاتے ہیں، بائیں سے باورچی خانے میں پردہ اُٹھنے پر بالشتیے کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کچھ

کھیل میں کام کرنے والے

بالشتیوں کا سردار
نذرو (سب سے چھوٹا بالشتیہ) دربان
ٹیکو۔ میکو۔ ٹینی۔ بینی۔ ٹانکا وغیرہ بالشتیے۔
چینو۔ جادوگرنی۔
شمسی۔ بلی۔
پریوں کی ملکہ۔
نرگس اور سوسن۔ لالہ فام اور گلفام۔ زرینہ اور عنبر۔ جمیلہ اور نفیسہ۔ حوری اور نوری۔ تیز پرواز، ماہ رو اور خندہ رو، سات جوڑے پریوں کے۔
زرد دیو کا قاصد۔
خیال۔
سبز پوش بونا۔

چٹان سے بنے ہوئے سٹولوں، کچھ فرش، کچھ درختوں کے تنوں پر بیٹھے ہیں۔ کوئی ہتھوڑا چلا رہا ہے۔ کوئی آرا

...لی کپڑے سی رہا ہے۔ کوئی رنگ رہا ہے۔ غرض سب
...طرح مختلف کاموں میں لگے ہیں۔ عام منظر بڑی
...ونیت کا ہے۔ غار کے وسط میں ایک موٹے سے
...ی تنا تنے پر بالشتیوں کا سردار بیٹھا ہے۔ گلے میں
...نکٹا اور سر پر ٹوپی ہے جس میں دو سفید پر لگے ہوئے
...ہتھوڑے سے کچھ کوٹ رہا ہے۔ داہنی طرف دروازے
...پاس سب سے چھوٹا بالشتیا نذرو ایک چھوٹے سے
...ل پر بیٹھا ہے۔ سر جھکا ہوا ہے۔ کبھی اونگھتا ہے کبھی
...ٹ پڑتا ہے۔ باہر سے آنے والوں کی اطلاع دینا اس کا
...ہے۔ ایک بڑی سی کالی بلی غار کے ایک کونے میں
...ی سو رہی ہے۔

...یتوں کا سردار۔ کرتا ہوں لاکھ شکر میں ربِ قدیر کا
حامی ہے جو غریب کا ناصر امیر کا
بالشتیوں کی بخشی مجھے جس نے سروری
سارے جہاں میں دھوم ہے جن کی مچی ہوئی
مصروف ان سے بڑھ کے کوئی دوسرا نہیں
تھکنے کا نام تک بھی انہوں نے سنا نہیں
(بالشتیے بڑی سرگرمی سے کام کرنے لگتے اور ساتھ
ساتھ گاتے جاتے ہیں)۔
...لشتیے۔ جب تک دم میں دم ہے تیرے
کام کئے جا بھائی میرے
کام ہی سے ہے عزت سب کی
کام ہی سے ہے عظمت سب کی
کام نہ ہو تو جینا کیسا

اس جینے سے مرنا اچھا
کام کئے جا بھائی میرے
جب تک دم میں دم ہے تیرے

بالشتیوں کا سردار۔ خاموش! کسی کے قدموں
کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ نذرو! دیکھو تو کون ہے؟
نذرو۔ (چونک کر داہنی طرف دیکھتا ہے) آقا! سبز پوش
بونا ہے۔
(سبز پوش بونا داخل ہوتا ہے۔ سفید داڑھی جھکی
ہوئی کمر۔ ہاتھ میں سونٹا۔ سبز لباس سر پر اونچی ٹوپی جس
میں درختوں کے پتے اڑسے ہوئے ہیں)
سبز پوش بونا۔ آقا! سلام۔
بالشتیوں کا سردار۔ کہو کیا کام ہے؟ جلد بتاؤ کیونکہ
ہم بے حد مصروف ہیں۔
تمام بالشتیے۔ فضول باتوں کے لئے ہمارے پاس ایک
منٹ بھی نہیں۔
سبز پوش بونا۔ آقا! مجھے کچھ کہنے کی جرأت نہیں پڑتی لیکن
معاملہ چونکہ اہم ہے، اس لئے عرض کئے
بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ بات یہ ہے کہ میرے
سیب کے درخت کے پتوں نے آپس میں
سازش کی ہے کہ وہ اس سال نہیں جھڑیں گے۔
بالشتیے۔ انہیں ایسا کرنے کا کیا حق حاصل ہے؟
سردار۔ خاموش! (سبز پوش بونے سے مخاطب ہو کر) بس
یہی بات ہے؟
سبز پوش بونا۔ ہاں آقا! لیکن میرا سیب کا درخت کہتا ہے
کہ اگر پتے نہ گرے تو وہ سیبوں کے پکنے...

پہلے ہی تھک جائیگا۔
سردار۔ بے شک وہ تھک جائے گا۔ سنو بونے! ابھی پتوں کے جھڑنے کا وقت نہیں آیا۔ جب آئے گا تو اُنہیں جھڑنا پڑے گا۔ جس طرح ہر شخص کو آرام کی ضرورت ہے۔ اُنہیں بھی ہے۔
سبز پوش بونا۔ کیا آپ براہِ کرم اسے نوٹ کریں گے؟
سردار۔ بہتر۔ (ایک بالشتیے کو اشارہ کرتا ہے۔ وہ سلیٹ پر کچھ لکھتا ہے) اب تم جاؤ۔
{ بونا شکریہ ادا کرتا ہوا دا ہنے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے }
نذرو۔ (بونے کے جانے کے چند لمحے بعد) آقا! پریوں کی ملکہ بڑی تیزی سے اُڑی آرہی ہے۔
سردار۔ اُسے ہم سے کیا کام آپڑا؟
{ پریوں کی ملکہ سفید لباس پہنے داخل ہوتی ہے۔ اُس کے پر چمک رہے ہیں۔ غار میں اِدھر اُدھر گھومتی ہے۔ کبھی اِس چیز کو دیکھتی ہے کبھی اُس چیز کو }
سردار۔ ملکۂ معظمہ کے تشریف فرما ہونے کا باعث؟ ہم حسب معمول بے حد مصروف ہیں۔
بالشتیے۔ کھیل کود کی باتوں میں گنوانے کے لئے ہمارے پاس ایک منٹ بھی نہیں۔
پریوں کی ملکہ۔ میرا خطاب تمہارے آقا سے ہے۔ تمہیں دخل دینے کا کیا حق ہے؟ (سردار سے) صاحب! بات یہ ہے کہ اس جمعہ کو شام کے بعد پرستان میں مَیں نے ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا ہے۔ مجھے اس کے لئے کم از کم سو لالٹینوں کی ضرورت ہے اور وہ بھی بہترین قسم کی۔
سردار۔ آپ کی فرمائش بہت بڑی ہے ملکۂ معظمہ! ہمارے پاس پہلے ہی حد سے زیادہ کام ہے۔ مجھے اُمید نہیں کہ ہم وقت پر اس کی تعمیل کر سکیں۔
پریوں کی ملکہ۔ نہیں نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اسے سرانجام دے سکو گے۔ میں تمہیں منہ مانگے دام دونگی۔ اس کے علاوہ تمہیں اور تمہارے سب آدمیوں کو مدعو بھی کردوں گی۔ گو میں جانتی ہوں کہ تم لوگ ناچ نہیں سکتے۔
سردار۔ ہم ناچ نہیں سکتے۔
بالشتیے۔ ہم ناچ نہیں سکتے! (سب ہنس پڑتے ہیں)۔
سردار۔ اِدھر آؤ بالشتیو! ملکۂ معظمہ کو دکھا دو کہ ہم ناچ سکتے ہیں یا نہیں۔
{ بالشتیے کام چھوڑ کر سردار کی سرکردگی میں ناچنے لگتے ہیں۔ شمسی بھی اُن کے ساتھ ناچتی ہے }
ملکہ۔ (خوشی سے تالیاں بجاتی ہے) بہت خوب! بہت خوب!! ٹھہرو میں اپنی پریوں کو بھی بلاتی ہوں۔
{ داہنے دروازے کے پاس جا کر اشارہ کرتی ہے پریاں داخل ہوتی ہیں۔ اُن کی تعداد بالشتیوں کی تعداد کے قریب قریب ہے۔ وہ بھی اپنی ملکہ کی سرکردگی میں ناچتی ہیں۔ غار کے ایک طرف بالشتیے ناچ رہے ہیں۔ دوسری طرف پریاں۔ کبھی کبھی آپس میں مل بھی جاتے ہیں۔ ناچ چند

منٹ جاری رہتا ہے۔ پھر باشتیے ایک ایک کرکے کام میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ پریاں ناچتی ہوئی باہر چلی جاتی ہیں۔ غار کے وسط میں صرف ملکہ اور سردار کھڑے رہ جاتے ہیں}

ملکہ- مجھے معلوم نہ تھا کہ تمھارے باشتیے ایسا اچھا ناچ سکتے ہیں۔

سردار- میرے باشتیے ہر فن میں طاق ہیں۔

ملکہ- (ہنستے ہوئے) پھر تو وہ جمعہ تک لالٹینیں بھی تیار کرلیں گے۔ میں تمھیں اور تمھارے آدمیوں کو ضیافت میں شامل ہونے کی دعوت دیتی ہوں جلسہ واقعی بہت پُر لطف ہوگا۔

شمسی- میاؤں۔

ملکہ- (ارد گرد دیکھتے ہوئے) اور تمھاری بلّی بھی شامل ہوگی۔

سردار- میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

{ملکہ چلی جاتی ہے}

سردار- (باشتیوں سے) ظاہر ہے کہ ہمیں اوقات مقررہ سے زیادہ کام کرنا پڑے گا۔

باشتیے- ہم پریوں کے لئے لالٹینیں ضرور بنائیں گے۔ جب وہ درختوں کی شاخوں کے ساتھ لٹکائی جائیں گی تو ننھے ننھے پیارے پیارے تاروں کی طرح دکھائی دیں گی۔

سردار- اگر اسی طرح خوشدلی سے کام کئے جاؤ تو بہت جلد ختم ہوجائے گا ـــــ شاباش میرے بہادرو! ـــــ میں حساب لگاتا ہوں کہ لالٹینوں کے لئے ستاروں کی روشنی کے کتنے بنڈل درکار ہوں گے۔

{سلیٹ اُٹھا لیتا ہے۔ کبھی جمع کرتا ہے۔ کبھی تفریق۔ پریشان نظر آرہا ہے}

نذرو- (اونگھتے اونگھتے چونک کر دائیں طرف دیکھتا ہے) چمنو جادوگرنی آرہی ہے آقا!

سردار- (ذرا ناراض ہوکر) کیا چاہتی ہے وہ؟ (اور سلیٹ پر کچھ لکھنے لگتا ہے۔

نذرو- اُس کے کپڑے پہلے سے بھی زیادہ پھٹے ہوئے ہیں۔ بے چین بھی بہت نظر آرہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دن بدن غریب ہوتی جارہی ہے۔

سردار- اللہ اُس پر رحم کرے۔ اب بے چاری بڑی نیک جادوگرنی ہے۔

{چمنو جادوگرنی داخل ہوتی ہے۔ خاکی اور سبز رنگ کے چیتھڑے پہنے ہوئے ہے۔ سر پر ایک کاؤ دم ٹوپی ہے}

چمنو جادوگرنی- (ہاتھ ملتے ہوئے) محترم پڑوسی! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ خدا کے لئے میری مدد کرو۔

سردار- جہاں تک ہوسکے گا ہم تمھاری مدد کریں گے۔ لیکن جلد بتاؤ کیا کام ہے کیونکہ ہم بے حد مصروف ہیں۔

باشتیے- فضول باتوں میں ضائع کرنے کے لئے ہمارے پاس ایک لمحہ بھی نہیں۔

(باقی آئندہ)

اچھی لڑکی

محترمہ صالحہ عابد حسین

ساجدہ کی عمر ۱۱ سال کی ہے۔ مدرسے جاتی ہے۔ پانچویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ بہت تیز لڑکی ہے۔ جو پڑھتی ہے اسے خوب یاد کرتی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اچھی بات سنتی ہے اسے گرہ میں باندھ لیتی ہے اور اس پر عمل کرتی ہے۔

ایک دن اس کی استانی نے جماعت کی سب لڑکیوں کو جمع کرکے کہا۔ دیکھو آج میں تمھیں وہ باتیں بتاتی ہوں جن کو کرنے سے لڑکی اچھی لڑکی بنتی ہے۔ میری باتیں غور سے سنو۔ اچھی لڑکی کے لئے پہلی بات تو صاف ستھرا رہنا ہے تمھیں چاہئے کہ سویرے اُٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ دانت خوب مانجھو جو لڑکیاں دانت نہیں صاف کرتیں ان کے منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔ اور پاس بیٹھنے والوں کو گھن آتی ہے پھر بڑے ہوکر پائیریا ہو جاتا ہے یہ بہت بُرا مرض ہے دانتوں سے خون اور پیپ نکلتا ہے اور وہ پیٹ میں جاکر بہت سی بیماریاں پیدا کرتا ہے۔ اور اکثر اس مرض کے لوگوں کو جوانی میں دانت نکلوا دینے پڑتے ہیں۔ اپنے کپڑوں کو بھی صاف ستھرا رکھو۔ روز کپڑے نہیں بدل سکتیں تو تیسرے دن ضرور بدلو۔ جو جوڑا اتارو اُسے دھوکر پھیلا دو تاکہ اگلی دفعہ کپڑے بدلو تو دھلا دھلایا جوڑا تیار مل جائے۔ جاڑوں میں چوتھے دن اور گرمیوں میں روز نہانا چاہئے ہاں سر، گرمی میں تیسرے چوتھے اور جاڑے میں آٹھویں دن دھویا کرو۔ نہانے کے بعد ناخون ضرور کاٹ لیا کرو۔ بڑھے ہوئے ناخون بہت بُرے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن میں میل گھس کر کھانے کے ساتھ منہ میں چلا جاتا ہے۔ جو صحت کے لئے بُرا ہوتا ہے۔ سر میں روز کنگھی کرنی چاہئے۔ ایک تو بال صاف رہتے ہیں دوسرے روز سر میں کنگھی کرنے سے بال بڑھتے بھی ہیں۔ آنکھوں کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔ منہ دھوتے وقت آنکھوں

کو بھی خوب دھولو۔ اور روز رات کو سرمہ لگا یا کرو اپنا بستر بھی صاف رکھو۔ اگر چادر یا غلاف پر میل آجائے تو اس کا انتظار نہ کرو کہ دھوبی آئے گا تو جب بدلیں گے اپنے ہاتھ سے دھو کر سکھا لو۔ یاد رکھو اپنا کام کرنے میں عیب نہیں ہے۔

اب صفائی کے بعد تمھیں ورزش کی بابت کچھ باتیں بتائی ہوں۔ پہلے زمانے میں ہماری دادی نانی اپنے ہاتھ سے آٹا پیستی تھیں۔ کھانا پکاتی تھیں جھاڑو دیتی تھیں۔ غرض گھر کا سب کام کرتی تھیں۔ اس وجہ سے اُن کی خوب ورزش ہو جاتی تھی۔ اب بیویوں نے اِن کاموں کو چھوڑ دیا ہے۔ کسی اور قسم کی ورزش بھی نہیں کرتیں۔ اس لئے صحت خراب رہنے لگی ہے۔ سب سے اچھی ورزش گھر کا کام کاج ہے۔ تم اس کا خیال نہ کرو کہ ہمارے ہاں نوکر ہیں۔ تو ہم کام کیوں کریں۔ اول تو کام اچھا وہی ہوتا ہے جو انسان خود کرے۔ دوسرے صحت ٹھیک رکھنا بہت ضروری بات ہے۔ جس کی تندرستی اچھی نہیں اس کی زندگی بے کار ہے۔ بیمار آدمی اپنے لئے بھی مصیبت اور دوسروں کے لئے بھی وبالِ جان ہوتا ہے۔ تمھیں چاہئے کہ صبح اُٹھ کر سارے گھر کی صفائی جھاڑ پونچھ اور دیکھ بھال کرو۔ باورچی خانے میں جا کر دیکھ لو۔ برتن خراب دُھلے ہوں تو انھیں صاف کر دو۔ جالے لگے ہوں تو انھیں لے لو۔ غسل خانے کو فنائل سے دھو لو۔ غرض گھر میں جس کام کی ضرورت ہے سب سے پہلے اس کے لئے تیار ہو جاؤ۔ ایک تو گھر کا کام ہو جائے گا۔ دوسرے تمھاری ورزش ہو جائے گی ہاں صبح کو اُٹھ کر دس بیس بیٹھکیں لگا لیا کرو اور رسی لے کر اس پر کودا بھی کرو۔ یہ بڑی اچھی ورزش ہے۔

اچھی لڑکی بننا چاہتی ہو تو سب کے ساتھ محبت اور پیار سے رہو۔ دوسروں کی خدمت کرو اپنے چھوٹے بھائی بہنوں سے ہرگز نہ لڑو۔ وہ کوئی چیز مانگیں اور تمھارے پاس ہو تو دینے میں کنجوسی نہ کرو۔ بڑوں سے عزت اور ادب کے ساتھ بات کرو۔ جھڑک کر بولنا اور ماتھے پر بل ڈال کر بات کرنا بدمزاجی کی نشانی ہے۔ اللہ میاں نے ماں باپ کی عزت اور خدمت کی بہت تاکید کی ہے۔

محتاجوں اور غریبوں کی خدمت کرنے کا بھی بہت ثواب ہے۔ جہاں تک تم سے ہوسکے ہر ضرورت والے کی ضرورت پوری کرو۔ اگر ہاتھ پاؤں سے کرنے کا کام ہے تو کردو۔ اگر پیسے کپڑے سے مدد کرسکتی ہو تو بھی ضرور کرو۔

لڑکیوں کے لئے کھانا پکانا اور سینا پرونا سیکھنا بھی بہت ضروری بات ہے یاد رکھو جو آج لڑکی ہے وہی کل عورت بنے گی جسے ایک پورے گھر کی مالکہ بننا ہے۔ لڑکیوں کو چاہیئے کہ ابھی سے کھانا پکانا، سینا پرونا اور گھر کا انتظام کرنے کی مشق کرلیں۔ ورنہ بعد میں انھیں سخت دقتیں پیش آئیں گی۔ اور وہ کبھی کامیاب عورت نہ بن سکیں گی۔

اب سب سے ضروری بات بتاتی ہوں انسان کا سب سے پہلا فرض خدا کے حکموں کو ماننا ہے۔ اللہ میاں نے اپنی پاک کتاب میں ہزاروں جگہ نماز پڑھنے کی تاکید کی ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو نماز پڑھتا ہے اسے صاف و پاک رہنا بھی ضروری ہے۔ اور یہ تمھیں بتا چکی ہوں کہ صحت کے لئے صاف رہنا کتنا ضروری ہے پھر کم سے کم پانچ دفعہ دن میں خدا کے حضور میں سر جھکا کر کھڑا ہونے سے انسان کو اس کا خیال آتا ہے کہ میں اس بزرگ خدا کے سامنے بالکل ناچیز ہوں۔ اور جب خدا کا خیال آئے گا تو اس کی بتائی ہوئی سب اچھی اچھی باتیں بھی یاد آجائیں گی۔ روزے رکھنے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ان لوگوں کی تکلیف کا اندازہ ہوتا ہے جو بچارے بھوکے رہتے ہیں۔ کئی کئی دن کھانے کو نہیں ملتا۔ اس سے محتاجوں، غریبوں کی مدد کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ پھر صحت کے لئے بھی کبھی کبھی بھوکا رہنا ضروری ہے۔

اگر تم ان سب باتوں کا خیال رکھوگی تو پھر تم بے شک اچھی لڑکی کہلاؤ گی۔ ساتھ کے ساتھ پڑھنا لکھنا اور تعلیم بھی حاصل کرنا چاہیے آج کل کے زمانے میں جاہل لڑکیوں کو سب ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

ساجدہ نے ان سب باتوں کو بہت غور سے سنا اور ہمیشہ اُن پر عمل کرنے کی کوشش

کی۔ اب ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ وہ صاف ستھری رہتی ہے۔ ماں کے ساتھ سارے گھر کا کام کاج کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی صحت اچھی رہتی ہے۔ نماز روزے کی بہت پابند ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کے کپڑے سیتی ہے۔ ہر جمعہ کو ہنڈ کلیا پکاتی ہے۔

اور خوب اچھا کھانا پکانے لگی ہے۔ غریبوں محتاجوں کا کام بڑے شوق سے کرتی ہے۔ ایک سے محبت اور اخلاق سے بولتی ہے سب کہتے ہیں :۔

"کیسی اچھی لڑکی ہے"

میز پوش کے کونے کا پھول

نوٹ :۔ پتیاں سبز۔ پانچوں پھول گلابی۔ کلیاں جو کونوں پر ہیں۔ ہلکی سرخ۔ پھولوں کے گول نشان جو درمیان میں ہیں ستاروں سے بھریں۔ اس طرح یہ نمونہ بے حد خوش نما معلوم ہوتا ہے

"ن، خ" نصیر آباد
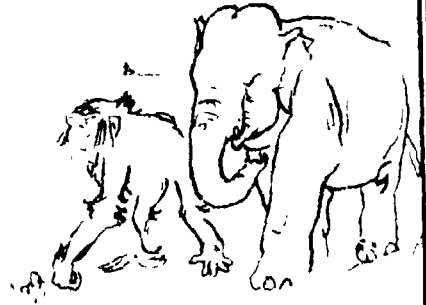
ملّو اور فیلو
(۱)
فیلو: کیسا ریگستان ہے یار۔ کوئی پھل کا پیڑ بھی تو نہیں۔
ملّو:۔ اور پانی کا پتہ نہیں۔ مجھے تو بڑی پیاس لگی ہے۔
(۲)
ملّو: بھیا فیلو۔ ہم تو چلے
(۳)
ملّو: وہ دیکھو۔ میری تو جان میں جان آگئی۔ وہ دیکھو کیلے کا پیڑ، کیلے کا
فیلو: سراب تو نہیں، سراب!
(۴)
ملّو: تو دوست کیا بڑھیا کیلے ہیں۔
(۵)
ملّو: بھیا فیلو، کیا کوئی خزانہ گاڑ گئے تھے، کیا اشرفیاں ڈھونڈ رہے ہو۔ گن رہے ہو؟
فیلو: شش شش
(۶)
فیلو: نہیں بھاگو پانی ہے پانی۔ لو پیو۔
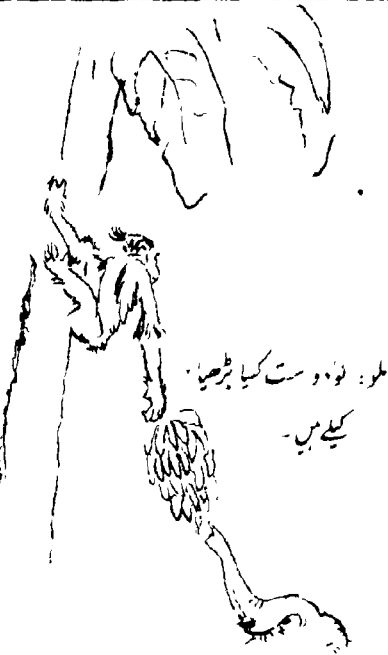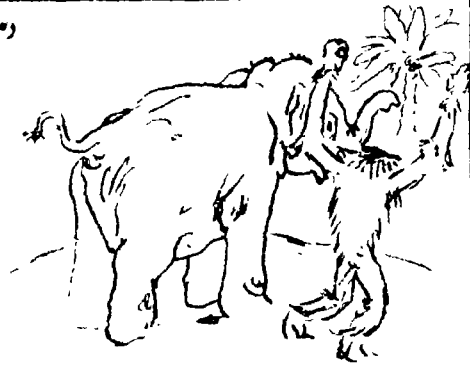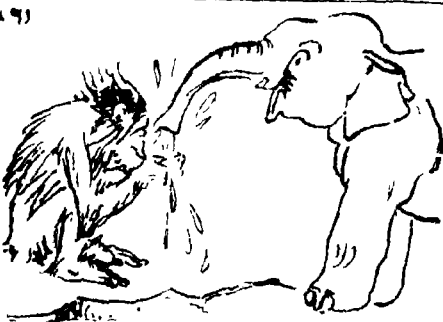
دہرادون کا سفر

ابوتمیم صاحب نے اپنے سفر کا حال بہت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ اس پرچہ میں اس کا صرف ایک حصہ شائع کیا جاتا ہے۔ دوسرے حصے جو اس سے بھی دلچسپ ہیں اگلے نمبروں میں چھپیں گے۔ انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں میں ایسے قصے یعنی ADVENTUROUS STORIES بہت مقبول ہیں۔ بڑوں میں بھی اور بچوں میں بھی مگر اُردو زبان میں اس کی طرف اب تک کوئی توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اُردو جاننے والے بچوں کے لئے یہ ایک نئی چیز ہے۔ اُمید ہے کہ سب بچے اسے دلچسپی سے پڑھیں گے۔ (ایڈیٹر)

ہمارے انوری صاحب جنگلات میں نوکر کیا ہوئے ہماری شامت آگئی۔ جب ان کا جی چاہتا ہے گھسیٹ لے جاتے ہیں ہمارے دل کی رائے ذرا نہیں پوچھتے اب کی دسمبر کی چھٹیوں کے بعد وہ ہمیں دہرادون لے گئے۔

صبح کڑکڑاتے جاڑوں میں، دہرادون کے اُجاڑ سے اسٹیشن پر اُترے دانت سے دانت بج رہے تھے (میرے۔ انوری کے نہیں)۔

وہ کہنے لگے کہ "جلدی سے ناشتہ کرلو"

میں۔ — "اس سردی میں اگر منہ ہاتھ دھویا تو نمونیا ہو جائے گا"

"تو یہ کون بے وقوف کہتا ہے کہ منہ ہاتھ دھونا ہی"

میں ان کا مطلب سمجھ گیا۔ جواب دیا "خیر۔ میں بغیر ہاتھ منہ دھوئے ناشتہ نہیں کروں گا"

انوری نے بگڑ کر کہا "وہ کیوں؟"

میں نے کہا "وہ یوں کہ ہماری بی اماں کہا کرتی ہیں کہ رات کو ہاتھ زہر میں رہتے ہیں۔ اور منہ میں شیطان"

اتنے میں ٹھیرنے کا کمرہ (WAITING ROOM) آگیا۔ میز پر ناشتا تیار تھا۔ انوری صاحب نے بڑی لاپرواہی سے کہا "اگر مگر کروگے تو پچھتاؤ گے۔ میں دو آدمیوں کا ناشتا اکثر کھا لیتا ہوں"

یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ مجھے اس کا تجربہ تھا۔ پہ نہ میں نے منہ ہاتھ دھویا نہ ناشتا کیا۔ مگر میز کی پلیٹیں ایسی صاف ہوگئیں کہ دھونے والے کو ذرا بھی تکلیف نہ ہوئی ہوگی اس کے بعد ہم اسٹیشن سے باہر نکلے۔ انوری صاحب نے اپنا سامان دو بیل گاڑیوں میں بھروا اور بندو باورچی کو ان میں بٹھا، چلتا کیا۔

فارغ ہو کر کہنے لگے "اب تم کو سیر کراتے ہیں"

"سیر اور اس وقت؟ بھائی تم گھر چلو"

پہلے تو وہ اپنا چھوٹا سا منہ چوڑا کر کے ہنستے رہے۔ اچھو ہونے لگا تو بولے "بھائی میرا گھر یہاں تھوڑی ہے۔ آگے جنگل میں جانا ہے"

میں نے کہا "اگر یہ بات تھی تو تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتا دی؟"

"اگر بتا دیتا تو تم آتے ہی کیوں"

دوپہر کا کھانا کھا پی کر کوئی تین بجے ہم نکلے۔ انوری صاحب نے کہا "موٹر تو ہمارے گھر تک جا نہیں سکتی۔ کہو تو کرائے کے گھوڑے یا سائیکل لے لیں"

میں نے یہ سوچ کر کہ گھوڑا دولتی مارنے والا اور ہٹ کرنے والا جانور ہے سائیکل لینے کی فرمائش کر دی۔

کرائے کی سائیکل بھی کیسی بری ہوتی ہے۔ ایک بھدی سی بھاری سی سائیکل انھوں نے مجھے دے دی جس کا آگے کا ٹائر دو جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اور ایک جگہ سے ٹیوب پھول کر رسولی نما معلوم ہوتا تھا۔

اب ہم دونوں شتم پشتم چلے۔ جب تک شہر کی حدود میں چلتے رہے سڑک اچھی رہی۔ اب آگے آگے سڑک خراب ہوتی جا رہی تھی کوئی دو میل چل کر میں نے پوچھا "اب تمھارا گھر کتنی دور ہوگا؟"

کہنے لگے "بس کوئی چار میل"

سڑک اب اور بھی خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کہیں گڑھے اور کہیں ریت۔ کہیں برساتی نالوں نے سڑک پر باریک باریک کنکروں کا ڈھیر لگا رکھا تھا۔ کوئی تین میل اور چل کر ایک بڑا سا پل ملا۔ اب میرا سانس پھول گیا تھا۔ رانیں شل ہو گئی تھیں۔ اپنا بوجھ خود ہی برا لگ رہا تھا۔

انوری صاحب نے میری حالت دیکھ کر ہمدردی کے لہجے میں فرمایا "بھائی تمھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ اور مجھ سے بھی غلطی ہو گئی"

"یہاں سے تمھارا گھر دکھائی دیتا ہے یا نہیں؟"

"یار خفا نہ ہونا۔ یہاں سے ٹھیک چار میل آگے ہے"

پہلے تو میرا سر سن بھر کا ہوا۔ پھر زمین پھٹتی نظر آئی۔ پھر مجھے انوری صاحب ایسے نظر آئے جیسے موت کا فرشتہ۔ جب ذرا ہوش آیا تو میں بیچ سڑک پر بیٹھ گیا۔ سائیکل دی پٹخ۔

انوری صاحب لگے خوشامد کرنے۔

میں۔ "یہ تو بتاؤ کہ تم نے ایسا صاف جھوٹ کیوں بولا؟"

وہ۔ "کہہ تو دیا کہ بھائی غلطی ہو گئی معاف کرو"

میں۔ "نہیں ہم معاف نہیں کرتے"

وہ۔ "تو پھر بیٹھے رہو اس پل پر"

میں۔ "ہاں ہاں بیٹھے رہیں گے ہم"

وہ۔ "رات کو یہاں سے شیر گذرا کرتے ہیں"

میں۔ "ایں۔ کیا کہا؟ شیر؟ سچ مچ کے شیر؟ اللہ اللہ"

اب ہم دونوں کافی تیز جا رہے تھے۔ آخر جنگل والی سڑک پر مڑے۔ یہ سڑک بھی کیا مزے کی سڑک تھی۔ یوں سمجھو کہ بڑے بڑے درخت کاٹ کر راستہ بنا لیا تھا۔ باقی نہ اس پر روڑی تھی نہ ہموار تھی، نہ پکی تھی۔ لمبی لمبی گھاس۔ چھوٹی موٹی بیلیں۔ اڑنگ بڑنگ پتھر۔ اب ہماری سائیکل گھاس سے اڑ اڑ کر چل رہی تھی۔ اور رانوں کا یہ حال تھا کہ

پھولی جارہی تھیں۔ جیسے پانچ منٹ بیٹھکیں لگائی ہوں، میں ایک ایک فرلانگ پر گھر کا اتا پتا اور فاصلہ پوچھ رہا تھا۔ خدا معلوم یہ جنگل کا میل ہی لمبا ہوتا ہے یا انوری صاحب کا بیان غلط تھا اور وہ بڑے سُرخرُو ہو کر کہہ رہے تھے کہ "بھائی تم تھک گئے ہو اس وجہ سے راستہ لمبا معلوم ہو رہا ہے" اور میں اس کا جواب دے رہا تھا کہ" صاحب اگر راستہ لمبا نہ ہوتا تو میں تھکتا ہی کیوں"

سورج نیچے اترا جارہا تھا۔ شام قریب آرہی تھی۔

یہ مصیبت کا راستہ آدھے سے زیادہ چلے ہوں گے کہ پھر پورا جنگل شروع ہو گیا اتنا گھنا کہ دو گز کے آگے کچھ نظر ہی نہ آئے۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے درختوں کے بیچ میں سڑک تھی۔ دائیں اور بائیں دونو طرف جنگل خاصا ڈراؤنا۔ اور رانوں کی یہ حالت کہ گویا پیپ پڑگئی تھی۔ اب سائیکل سے اتر کر پیدل چل رہے تھے۔ ایسے جیسے کوئی شرابی۔ ایک پاؤں اٹھا تو دوسرا ہونگا۔ گردن اور ہاتھ بھی بے قابو تھے۔ ایسے نازک اور مصیبت کے وقت میں انوری صاحب کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جس کا ان کو بھی افسوس ہوا۔ کہنے لگے۔

"یار دیکھنا وہ سامنے جو نالہ بہہ رہا ہے نا.....؟"

میں:" ہاں ہاں۔ بھئی بڑا خوب صورت معلوم ہو رہا ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں سو جاؤں۔"

وہ۔ "یہاں روزانہ رات کو شیر آتے ہیں"

میں نے دل میں آہستہ سے "شیر" کہا اور جھٹ سے سائیکل پر بیٹھ کر کوئی ایک فرلانگ تو ایسا لپکا چلا گیا جیسے شیروں سے دوڑ ہو رہی ہو۔ مگر دم کہاں تھا۔ پھر اترنا پڑا۔

سورج کی لال ٹکیا ایسی جلی لگ رہی تھی کہ کیا کہوں۔

انوری صاحب نے اپنی واقفیت بگھارنی شروع کی۔ کہنے لگے "اس جگہ تیندوے بہت مل سکتے ہیں۔ مگر آج کل ان کا شکار بند ہے وہ سامنے کے جنگل میں جنگلی سُور بہت ہوتے ہیں۔ یہ سُور دیکھا بڑا طاقتور ہوتا ہے۔ درخت کی جڑ میں غصہ سے تھوتھنی مارتا ہے تو درخت ٹوٹ جاتا ہے"

میں نے پوچھا" اور یہاں سے گھر کتنی دور ہے"

"بھائی اس کی تھوتھنی لوہے جیسی ہوتی ہے۔ ہاں گھر کوئی سوا میل ہوگا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ سُور اور تیندوا کبھی آپس میں لڑتے نہیں"

"ہندو مسلمانوں سے تو یہ جانور اچھے"

وہ "جو کبھی لڑیں تو سُور ایک وار میں دو ٹکڑے کر دے۔ ..... ذرا تیز چلو۔ اندھیرا ہوتا جارہا ہے" اتنے میں ایک سُور کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے سے راستہ کاٹ کر گذرا۔ انوری صاحب بولے

"نہ ہوئی بندوق"

میں "گھر کتنی دور ہوگا اب ؟"

"تم ناحق ڈرتے ہو۔ سوائے سُور کے کوئی جانور انسان پر حملہ نہیں کرتا ہے۔ ہاں یہ بات اور ہے کہ تم ان کو ستاؤ"

اتنے میں ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی درخت ٹوٹ رہا ہو۔ انوری صاحب بڑے فخر سے بولے "سنی تم نے یہ آوازیں ؟ یہاں سے کوئی پون میل کے فاصلہ پر ایک ندی بہتی ہے۔ اس کے کنارے ہاتھی آئے ہوئے ہیں۔ درختوں

سے کھیل رہے ہیں ..... ۔"

"گھر کتنی دور ہے ....؟"

وہ ۔ "یہ ہاتھی بھی بڑے موجی ہوتے ہیں ۔ بڑے بڑے درخت توڑنا ان کے لئے دل لگی ہے ۔ جنگلات کے بنگلوں کے چاروں طرف تار لگے ہوتے ہیں ان کو تو یہ تاگا سمجھتے ہیں تاگا ۔ ایک اور مزے دار بات سنو ۔ شیر اور ہاتھی کبھی آپس میں نہیں لڑتے ۔ یہ عموماً الگ الگ علاقوں میں رہتے ہیں۔"

میں ۔ "ہاتھی طاقت ور ہوتا ہے یا شیر ؟"

"اگر ہاتھی صاحب اپنا ایک پاؤں بھی شیر پر رکھ دیں تو شیر خاں چیں بول جائیں ۔ ایک سیکنڈ میں ختم سمجھو ۔ مگر ایسا ہونے کیوں لگا ؟ شیر جب ہاتھی کے تھپڑ مارتا ہے تو "اتنے" بڑے بڑے بوٹے نوچ لیتا ہے ۔ ایک دفعہ تنا سے سر پہ تھپڑ مارا تھا تو سر اندر کو گھس گیا تھا ۔ اور ایک دفعہ شکار میں ایسا بھی ہوا کہ شیر صاحب ہاتھی کی سونڈ میں آ گئے ۔ ایسا بل دے کر مروڑا کہ آنکھیں باہر نکل پڑیں"

یہ سن کر میں نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا ۔ اب کافی اندھیرا ہو گیا تھا ۔ دراصل ابھی سورج ڈوبا نہ ہوگا مگر درختوں کے سبب رات معلوم ہو رہی تھی ۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑا سا جانور جس کے سینگوں میں شاخیں سی لگی تھیں سامنے سے پھدکتا ہوا گزرا ۔ انوری صاحب نے اپنا نیکر اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہا "یہ چیتل ہے" ۔ میں نے کہا "نہیں یہ سانبھر ہے۔"

وہ بولے "تم کو اس جنگل کی کیا خبر ۔ یہاں سانبھر ملتا ہی نہیں ، ہوتا ہی نہیں" میں نے کہا "تو پھر بارہ سنگھا ہوگا۔"

"اناڑیوں کی طرح اٹکل پچو تیر لگانا چاہتے ہو ۔ بارہ سنگھے کی تو تقریباً دس بارہ شاخیں سینگوں کی ہوتی ہیں ۔ اور اس کے بیا ۔ پانچ ہی تھیں ۔ دوسرے اس کی کھال اس سے ذرا گہری سُرمئی ہوتی ہے۔"

میں "ہوتی ہوگی ۔ یہ بتاؤ گھر کہاں ہے ؟"

ادھر ادھر دیکھ کر اور درخت پر نمبر پڑھ کر کہنے لگے

"کوئی پون میل ہوگا"

"آئیں ۔ کیا کہا ؟"

وہ "نہیں نہیں ۔ پون ۔ ایک میل"

"اچھا ! تو یہ آپ کے میل ربڑ کے ہیں ۔ بڑھتے ہی جاتے ہیں"

وہ ۔ "ایمان کی بات یہ ہے کہ .... اچھا خیر جانے دو"

میں ۔ "کہو کہو ۔ یہ کیا بے ہودگی ہے ؟"

وہ ۔ "ہم دہرادون سے بارہ میل آ گئے ہیں۔"

"جبھی تو ہماری ٹانگوں کا اچار نکلا جا رہا ہے ۔ اور یہ منحوس سائیکل آنتوں کی طرح گلے پڑ رہی ہے۔"

(باقی اگلے مہینے)

قانون کیسے بنتا ہے

از:- محمد احمد سبزواری بی۔ اے (عثمانیہ)

شروع شروع میں جب اس دنیا کے بسنے والوں کی گذربسر شکار پر تھی وہ کسی ایک جگہ پر تو رہتے نہ تھے۔ بلکہ خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے۔ اسی سیروشکار کی تلاش میں بعض خاندانوں کو ایسی جگہیں ملیں جہاں مختلف قسم کی قدرتی نعمتیں موجود تھیں۔ مثلاً کوئی جنگل کے قریب اس وجہ سے رہ پڑا کہ وہاں شکار کی کثرت تھی، کوئی ایسے مقام پر جا رہا جہاں میوے دار درختوں کی افراط تھی، بعض خاندانوں نے اپنے ڈیرے کسی دریا کی وادی میں ڈال دیئے۔ کوئی میدانی علاقے میں آبسا تو کسی نے ساحل کو پسند کیا۔ ہر مقام پر آباد ہونے والا عموماً ایک خاندان یا گھرانا تھا۔ مگر اس زمانے کا خاندان آج کل کی طرح مختصر نہ ہوتا تھا بلکہ ایک خاندان میں بہت سے لوگ مثلاً ایک شخص، اس کی بیوی، اس کے بچے، لڑکیوں کے شوہر یا لڑکوں کی بیویاں اور ان کی اولاد شامل ہوتی تھی۔ یہ سب ایک ہی جگہ زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ جب تک خاندان یا گھرانا مختصر حالت میں رہا کسی قانون کی ضرورت ہی نہ تھی۔ گھر کے بڑے بوڑھے کی اپنے خاندان پر حکومت ہوتی تھی وہ ان سے جو چاہتا کراتا تھا۔ مگر جب ایک جگہ رہتے رہتے کچھ دن ہوگئے اور خاندان نے بڑھتے بڑھتے قبیلے کی شکل اختیار کی خاندان کے لوگوں نے مختلف پیشے مثلاً کھیتی باڑی ماہی گیری گلہ بانی اختیار کرلئے تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ چند اصولوں اور ضابطوں کے تحت زندگی بسر کریں۔ اس زمانہ میں رسم و رواج اور چلن اور دستور ہی کو قانون سمجھا جاتا تھا۔ گویا جیسا ہوتا آرہا ہے ویسا ہی ہونا چاہئے۔ اب گاؤں آباد ہوچلے تھے جہاں مختلف خاندان آباد تھے۔ یہ ناممکن تھا کہ کسی ایک خاندان کا آدمی دوسرے خاندان کے لوگوں سے اپنا حکم منوائے، اور جہاں چند خاندان رہتے ہوں وہاں ان میں طرح طرح کے جھگڑوں کا ہونا بھی لازمی ہے اور ان کے تصفیہ کے لئے کوئی صورت نکالنا بھی ضروری ہے۔ اس وجہ سے یہ طے کیا گیا کہ ایک ایسی مجلس ہو جس میں ہر خاندان کا ایک بزرگ شامل ہو اور وہ ان معاملات کا فیصلہ کیا کرے۔ یہی مجلس بعد میں "پنچایت" کہلائی۔ اور گاؤں کی پنچایتوں کے علاوہ مختلف طبقوں اور فرقوں کی پنچایتیں بھی بن گئیں۔ چنانچہ ہندوستان میں ابھی تک سقوں، کنجڑوں، بھنگیوں، دھوبیوں، نائیوں، اور دوسرے معمولی پیشہ وروں کی پنچایتیں موجود ہیں۔ ان میں گاؤں یا برادری کے بڑے بوڑھے اور تجربہ کار لوگ شامل ہوتے ہیں۔ گویا عام لوگوں سے قانون کو منوانا ان ہی کا کام ہے اور اس وقت اصل میں رسم و رواج ہی کا نام قانون تھا یہ قانون لوگوں کو زبانی یاد ہوتے تھے اور سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے۔

گاؤں میں زراعت ترقی کرتی رہی، گاؤں کا ایک آدھ فرد اپنی دولت، چالاکی اور دماغی قابلیت کی وجہ سے آگے بڑھ گیا اور یہی زمیندار کہلایا۔ بعض طاقتور زمینداروں نے اپنے یہاں کے کمزور زمینداروں کو دبا لیا اور اس طرح کئی کئی گاؤں

ان کے قبضے میں آ گئے اور یہی راجہ، اور نواب کہلائے اور جب ایک راجہ نے چند کمزور راجاؤں پر قابو پا لیا تو یہ بادشاہ بن گئے اس طرح قانون بنانے کا حق بھی عام لوگوں کے ہاتھ سے نکل کر ان بادشاہوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب جو بادشاہ ظالم، مغرور اور جابر تھے انھوں نے من مانے قانون اپنی طاقت کے بل پر رعایا سے منوانا شروع کئے۔ مگر بعض ہمدرد، انصاف پسند، اور رحم دل بادشاہوں نے یہ حق ایک جماعت کے سپرد کر دیا۔ جو قانون بنانے والی جماعت کہلانے لگی اس جماعت نے اس ترقی کے زمانہ میں مجلس مقننہ[1] یا مجلس قانون ساز کی صورت اختیار کی۔ قانون پر عمل کرانے کے لئے پنچائتوں کی جگہ عدالتیں قائم ہوئیں اور آپس کے جھگڑے مٹانے کے لئے منصف، مجسٹریٹ اور جج مقرر ہوئے

پرانے زمانے میں انسان آزاد تھا جو چاہتا تھا کرتا تھا۔ مگر جیسے جیسے ترقی کرتا گیا اس کے مشغلوں اور کاموں پر پابندیاں لگائی جانے لگیں۔ اور آج وہی قوم سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہے جس کے یہاں سب سے زیادہ قانون ہوں

پرانے زمانے میں قانون کا منشا یہ تھا کہ کمزوروں کی جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ مگر رفتہ رفتہ بہت سی باتیں قانون کی لپیٹ میں آنے لگیں۔ حکومت نے لوگوں کے نجی معاملات میں دخل دینا شروع کیا۔ مثلاً پہلے ایک شخص اپنے بچے سے جس عمر میں چاہے ہر قسم کا کام لے سکتا تھا مگر اب انگلستان میں چودہ سال سے کم عمر بچے کو ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں نہ صرف ملازم رکھنے والے بلکہ لڑکے کے والدین کو بھی سزا دی جاتی ہے۔ جن ملکوں میں ابتدائی جبری تعلیم کا قانون نافذ ہے، وہاں ہر شخص مجبور ہے کہ اپنی اولاد کو ایک مقررہ عمر تک تعلیم دلائے۔

جب قانون کا دائرہ بڑھنے لگا تو اس کی مختلف قسمیں ہوئیں مثلاً سب سے پہلے تو اس کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا اول فوجداری اور دوسرے دیوانی، پہلے میں تو وہ تمام چیزیں آتی ہیں۔ جو قتل خون، مارپیٹ، لڑائی، جھگڑوں، توہین، رشوت اور ایسی ہی دوسری چیزوں سے متعلق ہوں۔ دیوانی سے مراد وہ معاملات ہیں جن کا تعلق جائداد اور مال و اسباب سے ہو۔ انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے نئے قانون مثلاً سیاسی، معاشی اور عمرانی قوانین نافذ ہونے لگے۔ قانون کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مساوات ہوتی ہے۔ امیر و غریب، بادشاہ اور فقیر کا فرق نہیں ہوتا۔

جو باتیں قانون کے خلاف کی جائیں یا کی جائیں وہ "جرم" کہلاتی ہیں۔ جرم ملک اور زمانے کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً شوہر کے مرنے پر بیوہ عورت کا جل کر مر جانا ہندوستان کے ہندوؤں میں عمدہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اور جو عورت ستی نہ ہو اس کو لوگ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے مگر آج ستی قانوناً جرم ہے۔ اور ستی ہونے والی عورت اور اس کی امداد کرنے والے دونوں سزا کے مستحق ہیں۔ بعض چیزیں خاص خاص ملکوں میں جرم شمار کی جاتی ہیں اور دوسروں میں نہیں۔ مثلاً انگلستان اور یورپ کے اکثر ممالک میں مرد کا ایک وقت میں دو عورتوں سے شادی کرنا جرم ہے۔ مگر ہندوستان اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں یہ جرم نہیں۔ بعض باتیں ایسی ہیں جن کو تقریباً ہر ملک اور ہر زمانے میں جرم سمجھا جاتا رہا ہے۔ مثلاً قتل، چوری، فریب، جعل، دھوکہ بازی وغیرہ

[1] قانون بنانے والی وہ جماعت جو اپنے صوبے کے لئے قانون بناتی ہے جیسے ہمارے دیس میں صوبوں کی اسمبلیاں یا دہلی کی بڑی اسمبلی

گڑیا بنانا

محترمہ شمسی عباد الرحمٰن

اس گڑیا کے بنانے کی ترکیب یہ ہے کہ تصویر کے اس خاکے سے ذرا بڑا ایک ٹکڑا ٹریسنگ پیپر کا لو اور پورا خاکہ سنبھال کر اُتار لو۔ اب ایک چکور ٹکڑا دفتی کا میز پر رکھو اور اس پر کاربن پیپر رکھ کر اسے بھی پنوں سے قائم کر لو۔ تاکہ ہل جل کر خاکہ خراب نہ ہو جائے اب اس پر وہ ٹریسنگ پیپر رکھو جس پر تم نے تصویر کا خاکہ کھینچا ہے۔ اور پنسل کو ہاتھ روک کر آہستہ آہستہ پورے خاکے پر گھماؤ۔ کاربن پیپر کی سیاہی سے پوری تصویر دفتی پر اُتر آئے گی۔ پھر دفتی کے ٹکڑے کو خاکے کے کنارے کنارے تراش کر فاضل حصہ نکال دو۔ تاکہ تصویر کی شکل میں ہو جائے۔ لو گڑیا بن گئی آنکھیں، ناک اور مُنہ باریک برش سے سیاہ رنگ دو۔ بال بھی سیاہ رنگ دو۔ جوتے سیاہ اور موزے سفید۔ بٹن سُرخ ہونے چاہئیں رنگتے وقت اس کا خیال رکھنا کہ رنگ پھیل نہ جائے اگر خوب گاڑھا رنگ استعمال کرو گی تو پھیلنے کا اندیشہ نہ رہے گا پہلے گاڑھا رنگ بھر کر سوکھ جانے دو۔ پھر اس پر ایک ہاتھ رنگ کا اور پھیر دو۔ اور پھر ایک اور تین دفعہ رنگ دینے سے کوئی داغ نہیں رہتا اور سب رنگ یکساں ہو جاتا ہے۔

بلد

میزینی

گیریبالڈی

مقابل صفحہ ۵۲۳
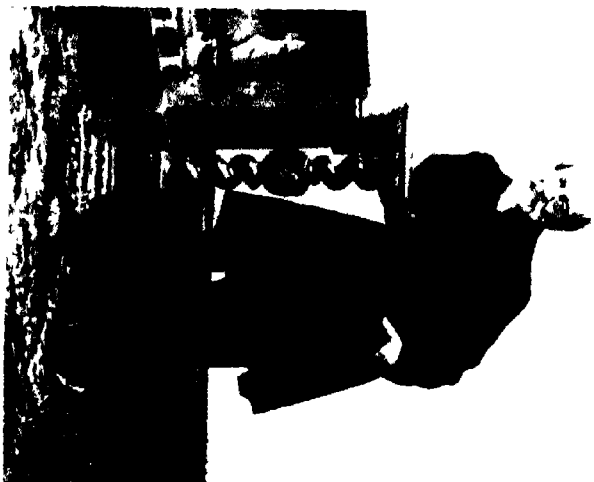
اِٹلی کی آزادی

سید نصیر احمد صاحب بی اے (جامعی)

اگر تم براعظم یورپ کے نقشے پر نظر ڈالو تو تمھیں اس کے جنوب میں بالکل نیچے کی طرف ایک ملک دکھائی دے گا جس کا نام اٹلی ہے۔ آج کل اٹلی ایک آزاد اور طاقت ور سلطنت ہے جس سے دوسری سلطنتیں خوف کھاتی ہیں مگر اب سے کوئی سوا سو برس پہلے ہندوستان کی طرح یہ بھی غلام ملک تھا۔ اس کے بڑے علاقے پر آسٹریا والوں کی حکومت تھی اور وہاں کے بادشاہ نے اس ملک کے بہت سے ٹکڑے کرڈالے تھے۔ تاکہ اٹلی کے باشندے متحد نہ ہو سکیں۔ حالت یہ تھی کہ لمبارڈی اور وینشیا کے دو بڑے صوبے بالکل آسٹریا کے قبضے میں تھے۔ وسط اٹلی کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر شاہ آسٹریا کے رشتہ داروں کی حکومت تھی۔ روم اور اس کے آس پاس کے علاقوں پر پوپ کا قبضہ تھا۔ جنوبی اٹلی اور صقلیہ پر فرانس کے ایک سابق شاہی خاندان کا بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ جس کی مدد نازک موقعوں پر آسٹریا والے کیا کرتے تھے۔ صرف ایک حصہ بالکل آزاد تھا۔ یعنی سلطنتِ سارڈینیا۔ اٹلی کا نقشہ دیکھ کر تمام علاقوں کا محل وقوع تمھاری سمجھ میں آجائے گا۔

اب لطف یہ ہے کہ آسٹریا والے بڑے ظالم تھے اور بڑی سختی سے حکومت کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اٹلی والوں پر بھاری محصول لگا رکھے تھے اور انھیں سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ اس لئے اٹلی کے باشندے ان سے سخت نالاں تھے۔ اور چاہتے تھے کسی نہ کسی طرح ان کے پنجے سے آزادی حاصل کریں۔ سنہ ۱۸۲۰ء سے لے کر سنہ ۱۸۴۸ء تک تو ملک کے اکثر حصوں میں عام شورش رہی، کئی جگہ فساد ہوئے مگر آزادی کے لئے آپس میں مل کر کسی نے بھی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شورش سختی سے دبا دی گئی۔ اس حالت کو دیکھ کر اٹلی کے بڑے بڑے لوگوں نے سوچا کہ جب تک اتحاد و اتفاق سے کام نہیں لیا جائے گا کچھ ہونے کا نہیں۔ اگر ملک بھر میں آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک جوش پیدا کر دیا جائے تو پھر کام چل سکتا ہے۔ جوش و ولولہ پیدا کرنے میں دو آدمیوں کا بڑا حصہ تھا ان کے نام ہیں میزنی اور گیری بالڈی۔

آخر ۱۸۴۸ء میں لوگوں نے فیصلہ کرلیا کہ کچھ بھی ہو آزادی ضرور حاصل کی جائے کیوں کہ اب ان کی تکلیفیں حد سے بڑھ گئی تھیں۔ سب سے پہلے لمبارڈی اور وینشیا کے باشندوں نے آزادی کا اعلان کر دیا اور اُن کی مدد کے لئے پوپ اور دوسری ریاستوں نے اپنی فوجیں روانہ کر دیں۔ میزنی نے ایک زبردست تقریر کر کے سپاہیوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ گیری بالڈی نے سُرخ پوشوں کی ایک جماعت تیار کر کے میدان جنگ کی راہ لی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سارڈینیا کے بادشاہ وکٹر البرٹ نے بھی آسٹریا کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں اٹلی آزاد ہی ہوا چاہتا ہے۔

مگر ابھی خدا کو یہ بات منظور نہیں تھی۔ اُدھر سارڈینیا کی فوجوں کو آسٹریا نے کئی شکستیں دیں۔ میزنی کے سپاہیوں نے وکٹر البرٹ کی مدد سے منہ موڑ لیا۔ کیونکہ وہ ڈرتے تھے کہ اگر اسے فتح ہوگئی تو خود ان کی جماعت کمزور پڑ جائے گی۔ اُدھر

پوپ نے میدانِ جنگ سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں۔ کیسے خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے ملکوں پر اس کا اثر کم ہو جائے۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں سارڈینیا کو شکست فاش ہوئی۔ اس شکست سے متاثر ہو کر وکٹر البرٹ تخت سے دست بردار ہوگیا اور اس کا بیٹا وکٹر عمونیل سارڈینیا کا بادشاہ

مقرر ہوا۔ مختصر یہ کہ چند ہی ماہ میں اٹلی کی وہی حالت ہوگئی جو پہلے تھی۔ مگر اس جنگ سے چار باتیں معلوم ہوگئیں ایک تو یہ کہ آزادی کی تڑپ پہلے سے بھی زیادہ تیز ہوگئی۔ دوسرے معلوم ہوگیا کہ پوپ پر اعتماد کرنا حماقت ہے۔ تیسرے یہ کہ میزنی اور اس کے ساتھی عملی آدمی نہیں ہیں۔ اور چوتھے یہ کہ سارڈینیا کا بادشاہ ہی اچھا لیڈر بن سکتا ہے۔ اور اسی کے جھنڈے تلے جمع ہونا چاہیئے۔

اسی زمانے میں ایک شخص کیور نامی سارڈینیا کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ یہ شخص نہایت عقل مند اور بے نظیر

سیاست داں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑنے سے پہلے ملک کی حالت کو درست کرنا چاہیئے۔ چنانچہ اس نے بہت سی اصلاحات رائج کیں اور فوجوں کو خوب منظم کیا۔ ایک جلسے کے موقع پر اس نے انگلستان اور فرانس کے سامنے اٹلی کی مصیبتوں کا حال بیان کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگلستان کو اٹلی سے ہمدردی ہو گئی اور فرانس کا بادشاہ لوئی نپولین نہ صرف اُن کا دوست بن گیا بلکہ اس نے وعدہ کیا کہ آسٹریا سے جنگ کی حالت میں وہ اٹلی کی مدد بھی کرے گا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ ۱۸۵۹ء میں آسٹریا اور سارڈینیا کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ لوئی نپولین اپنے وعدے کا سچا ثابت ہوا اور اس نے فوراً اپنی فوجیں آسٹریا کے خلاف روانہ کر دیں۔ سارڈینیا کو ہر مقام پر فتح حاصل ہوئی اور اس کے قبضے میں وسط اٹلی کی تمام ریاستیں اور لمبارڈی کا علاقہ آگیا۔ ۱۸۶۰ء میں دونوں ملکوں کے درمیان صلح ہو گئی۔ اب صرف وینشیا آسٹریا کے قبضے میں تھا۔

۱۸۶۰ء کے آخر میں کیور کے اشارے سے گیری بالڈی اپنے سُرخ پوشوں کو لے کر جنوبی اٹلی کی طرف روانہ ہوا اور پانچ ماہ کے اندر اندر سارے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ گیری بالڈی کو وہاں اتنی ہردل عزیزی حاصل ہوئی کہ اگر وہ چاہتا تو وہاں کا بادشاہ بن جاتا مگر اس نے اس علاقے کا الحاق سارڈینیا کے ساتھ کر دیا۔

اب اٹلی کا بہت سا حصہ آزاد ہو چکا تھا اس لئے وکٹر عمونیل دوم نے شاہ اٹلی کا لقب اختیار کر لیا۔ سارے ملک میں گھی کے چراغ جلائے گئے۔ اس وقت صرف روم اور وینشیا اس کے قبضے میں نہیں تھے۔ اسی سال کیور کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ اٹلی کے لئے سخت نقصان دہ تھا۔ کیور نے اٹلی کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ اور ابھی اس کی سخت ضرورت تھی۔

۱۸۶۶ء میں آسٹریا اور جرمنی میں جنگ چھڑ گئی۔ اٹلی نے جرمنی کا ساتھ دیا اور اس کے بدلے میں وینشیا پر بھی اس کا قبضہ ہو گیا۔ اب اٹلی ایک آزاد ملک تھا مگر روم کے بغیر اس کی وہی حالت تھی جو جسم کی روح کے بغیر ہو۔ روم اٹلی کا دل تھا۔ اس پر قبضہ اس لئے نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ فرانسیسیوں کی حفاظت میں تھا۔ اس پر حملہ کرنے کے معنی یہ تھے کہ فرانس سے لڑائی مول لی جائے۔ وکٹر عمونیل یہ نہیں چاہتا تھا۔ مگر وہ کسی موقع کی تاک میں تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ یہ موقع بھی جلد آگیا۔ ۱۸۷۰ء میں فرانس اور جرمنی میں جنگ کا اعلان ہو گیا۔ شاہ فرانس کو روم سے اپنی فوجیں واپس بلانا پڑیں۔ بس پھر کیا تھا وکٹر عمونیل نے روم پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۸۷۱ء میں اٹلی ایک آزاد ملک تھا۔

یہ ہیں مختصر واقعات اٹلی کی آزادی کے۔ اب ہم میزینی اور گیری بالڈی کے مختصر حالات بیان کر کے اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

میزینی

میزینی ۱۸۰۵ء میں بمقام جینوا پیدا ہوا۔ وہ قانون داں اور ادیب تھا اس نے تحریر و تقریر سے اپنے ہم وطنوں کو قومیت کا سبق دیا۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ حب وطن کو اپنا مذہب بنالیں اور اٹلی کے شاندار مستقبل پر ایمان رکھیں۔ اس نے "نوجوان اٹلی" کے نام سے ایک جماعت بنائی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اٹلی کو غیروں کے پنجے سے آزاد کیا

جائے۔ اور اٹلی میں جمہوری حکومت قائم ہو

مزینی بہت زیادہ عملی انسان نہیں تھا مگر اس کے جوش اور خلوص میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا کر دیا تھا اور ان کی خاطر قید و بند کی مصیبتیں برداشت کی تھیں۔ سنہ ۱۸۷۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

گیری بالڈی

گیری بالڈی مزینی کی پیدائش کے دو سال بعد فرانس میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے گھر سے بھاگ گیا اور ملاحی کا پیشہ اختیار کر لیا۔ بعد میں مزینی کی جماعت "نوجوان اٹلی" میں شامل ہو گیا۔ سنہ ۱۸۳۴ء میں شاہ سارڈینیا کے خلاف ایک سازش میں شرکت کی وجہ سے پھانسی کی سزا ہوئی۔ مگر وہ بھاگ کر جنوبی امریکہ چلا گیا۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں واپس آیا۔ اور سرخ پوشوں کی ایک جماعت بنائی جس نے پانچ ماہ کے اندر اندر جنوبی اٹلی کو فتح کر لیا۔ سنہ ۱۸۸۲ء میں اس کا انتقال ہوا ×

کودنے والا تاش

یہ دلچسپ کھیل تم اپنے دوستوں کو دکھا سکتے ہو وہ اسے بہت ہی مشکل چیز سمجھیں گے۔ تم کو صرف دو تاش کے پتوں ایک لفافے اور ایک لچک دار ربڑ (الاسٹک) کی ضرورت ہو گی۔ سب سے پہلے دو کارڈ تیار کرو۔ ان کو اس طرح کاٹو کہ ہر کارڈ کے بیچ سے سوراخ کر کے اسے نیچے تک پہنچا دو (جیسا تصویر میں ہے) اب تم ربڑ کا ٹکڑا لو اور اس کے دونوں سروں پر گرہیں لگا دو۔ پھر اس ربڑ کو دونوں پتوں کے شگاف میں اس طرح سے ڈالو کہ گرہیں دونوں پتوں کے پیچھے تک جائیں۔ پھر ان پتوں کو لفافے میں رکھ دو اور لفافے کو تھوڑا دبا کر پکڑو تاکہ ربڑ دونوں پتوں کے درمیان ڈھیلا رہے۔ اب تم اپنے دوستوں سے کہو کہ یہ جادو کا لفافہ ہے۔ میں اس میں بار بار کارڈ رکھتا ہوں لیکن یہ باہر نکل آتا ہے۔ پھر تم ایک کارڈ ڈالو اور لفافے میں اس بنے ہوئے کارڈ کے درمیان رکھو اور اپنے دباؤ کو کم کر دو تاکہ ربڑ کھنچ جائے۔ اس کی قوت اس کارڈ کو باہر پھینک دے گی۔
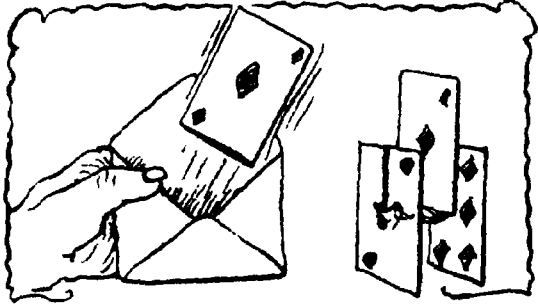
گوالن کی لڑکی

احسان اللہ خاں صاحب ساگر

آج سے ہزاروں برس پہلے ہندوستان ایسا نہیں تھا جیسا اب ہے۔ یہاں بڑے بڑے قد کے، خوفناک صورتوں کے دیو رہتے تھے۔ آؤ آج تمہیں اسی زمانے کی ایک کہانی سنائیں۔

کسی گاؤں میں ایک دودھ والی (گوالن) رہا کرتی تھی۔ وہ روزانہ دودھ بیچنے شہر جایا کرتی تھی۔ ایک دن وہ اپنی لڑکی کو بھی ساتھ لیتی گئی۔ لڑکی تھی چھوٹی اس لئے وہ بہت جلد تھک گئی۔ ماں نے اسے گود میں لے لیا۔ جب یہ دونوں دودھ بیچ کر گاؤں واپس جا رہی تھیں تو آرام کرنے کے لئے ایک پیپل کے درخت کے نیچے لیٹ گئیں۔ اتفاق سے دودھ والی کی آنکھ لگ گئی اتنے میں ایک عقاب آیا اور لڑکی کو اٹھا کر لے گیا۔ دودھ والی جاگی تو اپنی لڑکی کو نہ پاکر بہت روئی پیٹی، پر اب رونے سے کیا ہوتا بے چاری نا امید ہو کر چلی گئی۔

ادھر عقاب کی سنئے وہ لڑکی کو اپنے گھونسلے میں لے گیا۔ وہ اُسے ہر طرح آرام سے رکھنے کی کوشش کرتا۔ لڑکی بھی اُسے بہت چاہنے لگی۔ جب لڑکی کی عمر چودہ سال کی ہوئی تو عقاب شہر سے سونے، چاندی اور ہیرے کے خوب صورت اور قیمتی زیور اپنے پنجوں میں دبا کر اس کے لئے لاتا۔ مگر اسے ہاتھ کی انگلی کے لئے کوئی خوب صورت سا زیور نہ ملا۔ عقاب کو اس کا بہت رنج تھا۔ آخر اس نے طے کیا کہ کسی دوسرے ملک میں جاکر انگلی کے لئے زیور لائے۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے عقاب نے لڑکی کی نگہبانی کے لئے ایک کتے اور بلی کو مقرر کر دیا۔ کھانے پینے کا سامان بھی گھونسلے میں جمع کر دیا اور کسی ملک کی طرف روانہ ہو گیا۔

یہاں لڑکی بہت خوشی اور آرام سے رہنے لگی۔ وہ اکثر کتے اور بلی کے ساتھ کھیلا کرتی۔ کتا اُسے اپنے شکار کے مزے دار قصے سنایا کرتا۔ بلی اس کی باتیں سن کر کہا کرتی کہ خرگوش پکڑنا تو بہت آسان ہے۔ مگر چوہا کو پکڑنا صرف بلیوں ہی کا کام ہے۔ اس پر دونوں میں جھگڑا ہونے لگتا اور لڑکی پھر دونوں میں صلح کرا دیتی۔ ایک دن کیا ہوا کہ بلی کو بھوک لگی اور اس نے چوری سے دودھ پی لیا۔ جب لڑکی کو معلوم ہوا تو اس نے بلی کو خوب مارا۔ بلی کو بہت غصہ آیا اور اس نے آگ گھونسلے کے باہر پھینک کر ٹھنڈی کر دی۔ آگ کے بغیر لڑکی کو بہت تکلیف ہوئی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا اُسے دور، بہت دور دھوئیں کی ایک ہلکی سی لکیر دکھائی دی۔ لڑکی نے خیال کیا کہ وہاں ضرور آگ ہوگی۔ اور وہ اسی طرف چل دی۔ کچھ قریب پہنچ کر اُسے بہت بڑا مکان نظر آیا۔ مکان کے دالان میں ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ یہ بڑھیا ایک دیو کی ماں تھی لڑکی

نے کہا ۔ ہاں ! مجھے آگ کی ضرورت ہے ۔"

بڑھیا نے جواب دیا "بیٹی ! میں بہت بوڑھی ہو گئی ہوں ۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا ہے ۔ کام دھندا کرنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے ، تو میرا کچھ کام کردے تو میں تجھے آگ دے دوں ، بڑھیا نے لڑکی کو گیہوں پیسنے کے لئے دئے جب اس نے گیہوں پیس دئے تو بڑھیا نے کہا "بیٹی میرے گھر میں کئی دن سے صفائی نہیں ہوئی ہے تو میرا گھر صاف کردے تو میں تجھے آگ دے دوں" لڑکی نے جلدی جلدی اس کا گھر صاف کیا اور بڑھیا سے آگ مانگی ۔ بڑھیا نے پھر کام بتا دیا ۔ لڑکی نے وہ بھی کر دیا ۔ غرض اسی طرح بڑھیا کام بتاتی جاتی تھی اور لڑکی انھیں جلدی جلدی کرتی جاتی تھی ۔ بڑھیا اس لئے دیر لگا رہی تھی کہ اس کا لڑکا (دیو) آجائے اور لڑکی کو چٹنی بنا کر خوب مزے سے کھائے ۔ مگر جب بہت دیر تک اس کا لڑکا نہ آیا تو بڑھیا نے مجبوراً آگ دے دی ۔ لیکن اس نے لڑکی کو چانولوں کا ایک تھیلا بھی دیا اور کہہ دیا کہ انھیں تھوڑی تھوڑی دور گراتی جانا ۔ لڑکی نے اس کے کہنے پر عمل کیا ۔ اور راستہ بھر چانول گراتی گئی ۔

لڑکی کے چلے جانے کے بعد بڑھیا کا لڑکا (دیو) بادل کی طرح گرجتا اور گدھے کی طرح چیختا گھر میں داخل ہوا ۔ بڑھیا نے اسے بہت برا بھلا کہا اور کہا کہ کیا اچھا ہوتا اگر تو ذرا دیر پہلے آجاتا اور اس نے لڑکی کے آنے کا تمام ماجرا بیان کیا ۔ دیو چانولوں کو دیکھتا لڑکی کے مکان تک آپہنچا ۔ اس نے دروازہ توڑنے کی بڑی کوشش کی مگر مکان تھا لوہے کا بنا ہوا ۔ اس کوشش میں اس کے ہاتھ کا ایک ناخون ٹوٹ گیا ۔ آخر وہ ناکام ہو کر اپنے گھر واپس چلا گیا ۔ صبح لڑکی نے جوں ہی دروازہ کھولا اس کی نازک ہتھیلی میں دیو کا زہریلا ناخون چبھ گیا ۔ اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی ذرا دیر کے بعد عقاب آیا ۔ اس نے لڑکی کو مردہ سمجھا ۔ انگوٹھی اس کے ہاتھ میں پہنا دی اور غمگین ہو کر کہیں چلا گیا ۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہ چلا ۔

دوسرے دن ایک بادشاہ شکار کھیلتے کھیلتے اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر اس جنگل میں آیا ۔ اور تھک کر اسی درخت کے نیچے آرام کرنے لگا ۔ وہاں اسے ایک بہت بڑا گھونسلا نظر آیا وہ فوراً درخت پر چڑھ گیا اور لڑکی کو نیچے اتار لایا ۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح لڑکی ہوش میں آجائے ۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی ۔ اتفاق سے بادشاہ کی قمیص کا دامن کسی چیز میں الجھ گیا اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا دامن جو چھڑایا تو کپڑے کے ساتھ لڑکی کی ہتھیلی سے ناخن باہر نکل آیا اور وہ فوراً ہوش میں آگئی ۔ بادشاہ بہت خوش ہوا ۔ اپنے گھوڑے پر سوار کرکے محل میں لایا اور چند دنوں کے بعد اس سے شادی کر لی ۔

بادشاہ اس نئی ملکہ کو بہت چاہتا تھا اس نے اس کا نام "سورج مکھی" رکھا تھا ۔ بادشاہ کی پہلی ملکہ "سورج مکھی" سے حسد کرنے لگی ۔ ایک روز ملکہ اس کو نہر کی سیر کرانے لے گئی اور دھوکے سے لڑکی کو نہر میں ڈھکیل دیا وہ ڈوب کر مر گئی اور اسی جگہ سورج مکھی کا پودا پیدا ہو گیا جب کبھی بادشاہ سلامت اس پودے کے سامنے سے گذرتے تو یہ پودا ان کے سامنے جھک جاتا ۔ بادشاہ سلامت

سورج مکھی کے پھول کو دیکھ کر اکثر اپنی دوسری ملکہ کو یاد کر کے رویا کرتے۔ جب ملکہ کو بادشاہ سلامت کے رونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے مالی کو حکم دیا کہ وہ سورج مکھی کے پودے کو نکال کر جلا دے۔ اور اس کی راکھ دور پھینک دے مالی نے ایسا ہی کیا۔ لیکن جس جگہ راکھ پھینکی گئی تھی وہاں ایک بیل کا درخت اُگ آیا۔ اس درخت میں بھی وہی خوبی تھی کہ وہ بادشاہ سلامت کو دیکھ کر جھک جاتا تھا اور دوسرے لوگ اس کے نزدیک آتے تھے تو اس سے رونے کی آواز آتی۔ ایک دن وہی دودھ والی جس کی لڑکی کو عقاب اٹھا کے گیا تھا۔ شہر سے واپس گھر جا رہی تھی کہ درخت سے ایک بیل گرا اور اس کی ٹوکری میں آ پڑا۔ دودھ والی اُسے بھی اپنے ساتھ لئے گھر چلی آئی۔ رات کو اس نے بیل ایک طاق میں رکھ دیا صبح کو جب طاق پر اس کی نظر گئی تو وہاں ایک خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ دودھ والی کے اصرار پر لڑکی نے اپنا سب حال بیان کیا۔ دودھ والی اپنی کھوئی ہوئی لڑکی کو پا کر اس قدر خوش ہوئی کہ بس ناچنے لگی۔

ایک روز بادشاہ شکار کھیل کر آ رہا تھا کہ اس نے لڑکی کو کنوئیں پر پانی بھرتے دیکھا۔ وہ بہت دیر تک تکٹکی لگائے حیرت اور تعجب سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب لڑکی گھر چلی آئی تو بادشاہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا اور دودھ والی سے کہا کہ میری ملکہ کو واپس کر دو" دودھ والی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "حضور یہ میری اکلوتی لڑکی ہے اسے نہ چھینئے مگر بادشاہ لڑکی کو اپنے ساتھ محل میں لے گیا۔ اس نے دودھ والی کو اس قدر دولت دی کہ وہ مالامال ہو گئی اور سب کے سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

تمہارا اخبار

اخبار پڑھنے کے بعد تم ردی میں پھینک دیتے ہو۔ حالانکہ اس سے اور بھی مفید کام لئے جا سکتے ہیں سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ جس روشنائی سے چھپتا ہے۔ وہ کیڑوں کے لئے زہر کا حکم رکھتی ہے تو بس اپنے جاڑوں کے کپڑے اسی میں لپیٹ کر رکھا کرو۔ دوسرے تمہارے دروازے کے کواڑوں میں درزیں اور سوراخ ہوں تو کاغذ کئی گھنٹے تک پانی میں بھگوئے رکھو پھر پانی نتھار کر اس کاغذ کو آٹے کی گُنی کے ساتھ اچھی طرح پھینٹ کر اس مرکب کو درزوں میں بھر دو دو ایک دن میں سوکھ کر سخت ہو جائے گا

اپنے کمرے میں ناریل کی چٹائی کے نیچے اخبار کی کئی تہیں بچھا دو اس سے یہ ہو گا کہ جو کچھ گرد ہو گی کاغذ پر چلی جائے گی اور نیچے کا فرش صاف رہے گا

برف کا پانی زیادہ دیر تک رکھنا ہو تو جگ کے چاروں طرف اخبار لپیٹ کر اوپر سے مڑوڑ دو کہ باہر کی ہوا اندر نہ جا سکے اس طرح کئی گھنٹے پانی ٹھنڈا رہے گا اور برف بھی کم گھلے گی۔ جاڑوں کے زمانے میں یہ کرو کہ کاغذ پانی میں گلا کر کوئلے میں ملا لو۔ اب یہ انگیٹھی میں دیر تک دہکتا رہے گا۔ اگر اتفاق سے لکڑی یا کوئلہ وقت پر موجود نہ رہے تو اخبار کی بتیاں بنا لو اور اس میں کئی گرہیں دے لو۔ لکڑی کی طرح بہت دیر تک جلتا رہے گا۔ اپنا کوٹ یا کمبل وغیرہ کہیں بھول گئے ہو اور جاڑوں کا موزمانہ تو اخبار اپنے گھٹنوں پر ڈال لو سردی نہ لگے گی۔

حسین آباد کا پہلا ریڈیو

زہرا خاتون

ڈراموں کے انعامی مقابلے میں یہ اول آئی ہیں

(اختر حسین صبح کے وقت اپنے ریڈیو کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے ریڈیو سن رہے ہیں۔ اُن کی بیوی سلطانہ بیگم بھی پاس ہی بیٹھی ہیں ۔ بچّے بھی بڑے غور سے ریڈیو سُن کر خوش ہو رہے ہیں نصیبن، کلّو وغیرہ باورچی خانے میں باتیں کر رہی ہیں)

نصیبن۔ اری بوا کلّو یہ میاں نے لیڑیو (ریڈیو) کیا خریدا ہے کیسے مجے مجے (مزے مزے) کے گانے ہو وہیں ہیں اس میں۔ اور ایک لوگ بھی تو بولتے ہے اس میں۔

کلّو۔ اری ہاں مگر تو لیڑیو نہ سُنا کر۔ مولوی مُلّا لوگوں نے پھتوا (فتویٰ) دے دیا ہے کہ جو لیڑیوں سنیں وے کاپھر (کافر) ہو جاویں ہیں۔

نصیبن۔ اری ہاں بوا۔ سنیں تو ہم بھی ہیں مگر کیا کروں جد (جب) گانے کی اواج (آواز) آوے ہے اندر دالا (دل) تڑپے ہے کہ جا کے سُن ہی لیں۔ مَنے (مجھے) تو

کھیل میں کام کرنے والے

اختر حسین۔ حسین آباد کے رئیں جنھوں نے ریڈیو خریدا ہے۔
سلطانہ بیگم۔ اختر حسین کی بیوی۔
فاطمہ اور اظہر۔ اختر حسین کے بچّے۔
نصیبن۔ کلّو۔ مامائیں بطفن۔ دھوبن وغیرہ۔

بڈھے (میاں)
تے مَنے (منع)
کر دیا کہ تو کدھی
(کبھی) لیڑیو کے
آگے بیٹھ کر سُنیو
بے پردگی ہووے ہے
جو لوگ اندر بیٹھ کر بولتے ہے وہ جھانک کے دیکھے ہے بس بوبو میں تو پیچھے بیٹھ کے سُن لوں ہوں میاں کہیں بھی ہیں نصیبن آگے آ کے سُن لے۔ پر مجھے تو آگے جاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

کلّو۔ اور ہاں بوا یوں کہیں ہیں کہ جو آدمی لیڑیو پہ گا دیں انہیں بیس بیس روپے ملیں ہیں۔ بس تیری تو آواج بھی اچھی ہے تو تو گا لے۔

نصیبن۔ مگر بوبو یہ بھی تو کہیں ہیں کہ جو لیڑیو میں بولے

وہ گونگا ہو جاوے ہے. تو بوا کوئی دس بیس روپیے جبان (زبان) سے تو اچھے ہیں نہیں۔

(ابھی نصیبن اور کلّو باتیں ہی کر رہی ہیں، کہ سامنے سے لطفن دھوبن آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ریڈیو میں گانا ہو رہا ہے اور لطفن بہت سے آدمیوں کی آواز سُن کر گھونگٹ نکال لیتی ہے)

نصیبن۔ لطفن اری لطفن ہمارے دھورے (پاس) آجا۔

لطفن۔ اری بوا وہاں دلّان (دالان) میں کون کون بیٹھے ہیں بہت سے میاں صاحبوں کی آواج آوے ہے۔

کلّو۔ اری نہیں ری وہ تو میاں اکھتر نے لیڈیو منگایا ہے۔ یوں کہویں ہیں کہ اس میں دلی اور بمبئی پیاور کے آدمی گا دیں ہیں اور وہاں بھر نگی (فرنگی) بھی تو گٹ پٹ کریں ہیں۔

لطفن۔ اے بوبو پچھلے برس تو مَسین (گراموفون) آیا تھا اب یہ کیا آیا ہے۔

نصیبن۔ ہاں مَسین میں تو گا دیں ہی ہیں۔ اس میں تو تھیٹر (ڈرامہ) بھی ہووے ہے۔

لطفن۔ اری ہاں بڑے مجے کا گانا ہو رہا ہے چل ہم بھی چل کر سُنیں۔

(تینوں چپکے چپکے دالان کے باہر چبوترے پر بیٹھ کر ریڈیو سُنتی ہیں)

اختر حسین۔ اے بیوی ذرا اپنا سروتا چھالیا رکھ دو۔ اور مجھے گانا سننے دو۔ (بیوی تیوری پر بل ڈال کر سروتا پٹخ دیتی ہیں)

اظہر۔ ابّا جی ابّا جی یہ کون عورت گا رہی ہے۔

اختر حسین۔ ارے چپکا بیٹھا رہ۔ کیسا اچھا تو گا رہی ہے اور تیرے سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔

سُلطانہ۔ تمھیں شرم نہیں آتی ایک عورت کا گانا اتنے غور سے سُن رہے ہو۔ موئی کنجری کا!

اختر حسین۔ بس بس چپکی رہو۔ گانا تو تمہاری کل کل اور جھک جھک میں ختم ہی ہو جائے گا۔

سُلطانہ۔ اچھا اب پتا چل گیا۔ تم ضرور اس عورت سے بیاہ کرو گے جبھی تو یوں غور سے سُن رہے ہو۔ ہائے ہائے بس میرے امّاں باوا نے تو میری قسمت پھوڑ دی ایسے آدمی سے پالا پڑا جو کسی کنجری طوائف سے بیاہ کرے گا۔ بس بس اب میں اس گھر میں نہیں ٹھیر سکتی گھر کا اری کلّو تو ڈولی والوں کو بُلا لا میں تو اپنے میکے جاؤں۔

اُٹھ ری فاطمہ جوتی پہن۔ چل میرے ساتھ۔ (فاطمہ جوتی پہنتی ہے اور کلّو ڈوڈلی والوں کو بلانے جاتی ہے۔ اختر ریڈیو بند کرکے باہر چلے جاتے ہیں نصیبن اور لطفن، دونوں کھس پس کرتی ہوئی اٹھتی ہیں)

نصیبن۔ اری بہن جدہی (جب ہی) توکل ملاجی نے آواج (وعظ) میں کہا تھا کہ لیڈیو سُننا سرے (شرع) میں منع ہے۔

لطفن۔ ہاں بوا کوئی یہ بڑے عالم لوگ تو بہ توبہ جھوٹ بولیں ہیں۔ اچھا بوا اللہ بیلی بیوی تو اپنے گھر جارہی ہیں۔

پردہ گرتا ہے

ٹکٹوں کی خبریں

از جناب حافظ نبی احمد صاحب بی اے (جامعہ)

نئے جاری ہونے والے ٹکٹوں میں ایک ٹکٹ بلغاریا کے قومی ہیرو واسل لیوسکی کی سو سالہ برسی کے موقع پر نکالا جائے گا یہ شخص اس بغاوت کا سرپرست تھا جو ترکی کے خلاف کی گئی تھی۔ بعد میں اس کو اسی کے ساتھیوں نے ترکوں کے حوالے کردیا تھا۔ ترکوں نے اسے پھانسی دے دی لیکن اس کے ماننے والوں نے کچھ عرصہ کے بعد پھانسی کے مقام پر ہی اس کی یادگار قائم کردی نئے ٹکٹ میں لیوسکی کی تصویر ہوگی۔

فرانس نے اپنے مشہور مصنف پیر لوتی کی یادگار میں ایک ٹکٹ نکالا ہے اس ٹکٹ کی قیمت میں سے کوئی تیس فی صدی اس کی یادگار کے چندے میں دیا جائے گا۔

نیو فاونڈلینڈ کے کارونیشن ٹکٹوں کی قیمت غالباً بہت جلد بڑھ جائے گی اس لئے کہ ان کی چھپائی کے وقت رنگوں میں اکثر فرق ہوگیا ہے دوسرے تین سینٹ اور پندرہ سینٹ کے ٹکٹوں میں واٹر مارک نہیں ہے۔

امریکہ میں ٹکٹوں کے متعلق ریڈیو میں اکثر تقریریں کی جاتی ہیں کیا اچھا ہو جو ہندوستان کے ریڈیو اسٹیشنوں سے بھی ایسی چیزوں پر اکثر تقریریں کرائی جائیں۔ امریکہ میں تو محض ان تقریروں کی بدولت کوئی پچاس لاکھ نئے شوقین پیدا ہوگئے ان میں سے ہر ایک ہر ہفتے کوئی ایک ڈالر کے ٹکٹ خریدتا ہے گویا پچاس لاکھ ڈالر فی ہفتہ

آسٹریلیا اور کناڈا میں اس سال ٹکٹوں کی نمائشیں ہونے والی ہیں ان دونوں موقعوں پر چھوٹے چھوٹے پوسٹر شائع ہوں گے ٹکٹوں کی برابر یہ پوسٹر گویا نمائش کے اشتہار ہوں گے۔ ٹکٹ نہ ہوں گے۔

باغی سردار جنرل فرینکو نے اسپین میں جہاں جہاں قبضہ کر لیا ہے - وہاں یہ ٹکٹ جاری کئے ہیں

فہمیدہ

Calcutta Art Press Delhi

فلسطین

عبدالملک ــــ متعلم جامعہ

مسلمانوں کو دنیا میں تین شہر بہت عزیز ہیں، مکہ، مدینہ، بیت المقدس، مکہ میں خدا کا سب سے پہلا گھر یعنی خانہ کعبہ ہے۔ مدینہ میں خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مزار مبارک ہے اور بیت المقدس کی خاک میں بہت سے مشہور رسول آرام کر رہے ہیں۔

بیت المقدس فلسطین کا ایک شہر ہے اور فلسطین جس کا نام تم آجکل اکثر سنتے ہوگے، عرب کے شمال میں ایک چھوٹا سا ملک ہے، یوں رقبہ تو اُس کا خاصا بڑا ہے لیکن آبادی تمہارے کلکتہ سے کچھ ہی زیادہ ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی والدہ حضرت مریمؑ اسی ملک کی تھیں۔ اور حضرت موسیٰ (یہودیوں کے نبی) علیہ السلام نے اس کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اب اسی جگہ اُن کا مزار ہے۔ اس لئے عیسائی اور یہودی بھی فلسطین کی عزت کرتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے نبی کو جھوٹا کہتی ہیں۔ اس لئے ان میں ہمیشہ سے لڑائی چلی آرہی ہے۔

مسلمانوں کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی تعلق تو مکہ اور مدینہ سے تھا۔ لیکن چونکہ ہم پر خدا کے سب رسولوں کو سچا ماننا فرض ہے اس لئے ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی ایسی ہی عزت کرتے ہیں جیسے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اسی لئے یہ دونوں قومیں اب تک یہ مانتی رہی ہیں کہ فلسطین میں مسلمانوں سے اچھا حاکم اور کوئی نہیں ہوسکتا۔

ہمارے رسولؐ کے زمانہ میں یہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ مسلمان اُس زمانہ میں سچے مسلمان تھے ان کی ایمانداری، سچائی، انصاف اور رحم کو دیکھ کر سب لوگ ان سے محبت کرنے لگتے تھے۔ اس لئے فلسطین والے مسلمانوں کی حکومت میں بڑے مزے سے رہتے تھے۔ اور ان کی حکومت کے باقی رہنے کی دعائیں مانگتے تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ سے بڑی جنگ تک یہ ملک مسلمانوں ہی کے پاس رہا ہے۔ بیچ میں کچھ دنوں کے لئے عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تھا۔ پھر سلطان صلاح الدین کی بہادر فوجوں نے اسے واپس لے لیا۔ لیکن اب بڑی جنگ کے بعد اس پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ اس قبضہ کی داستان بھی عجیب ہے۔

ہوا یہ کہ بڑی جنگ میں جب انگریزوں کی حالت بہت نازک ہوگئی اور معلوم ہوتا تھا کہ اب ہار جائیں گے۔ اس موقع پر انگریزوں نے بجائے گھبرانے کے بڑی عقلمندی سے کام لیا اور عرب (اس میں فلسطین، شام، عراق، مکہ، مدینہ سب شامل ہیں) کے گورنر کو یہ کہہ کر اپنی طرف ملا لیا کہ ہم تمہیں عرب کا بادشاہ بنا دیں گے۔ عرب اِس وقت

ترکوں کے پاس تھا اور انگریز ترکوں کے خلاف لڑ رہے تھے عرب والے لالچ میں آگئے۔ اور اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کی فوج میں جا ملے۔ لڑائی ختم ہوگئی۔ انگریز جیتے اور ترک ہار گئے۔ عربوں نے جب اپنا حق مانگا تو انگریزوں نے بڑی ترکیبوں سے کام لیا اور اچھا اچھا حصہ خود رکھ کر باقی عربوں کو دیدیا۔ جو حصے خود رکھے ان میں یہ فلسطین بھی تھا۔

اس کھلی ہوئی ناانصافی پر عربوں کو بہت غصہ آیا اور انھوں نے فریاد شروع کی۔ اور جب کہنے سننے کام نہیں چلا تو مار پیٹ شروع ہوگئی۔ انگریزوں نے پریشان ہوکر غصہ کم کرنے کے لئے کچھ اِدھر سے ادھر دیا۔ لیکن فلسطین پھر بھی اپنے ہی پاس رکھا۔ اس پر تمام دنیا کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ اور سب نے ناراضی ظاہر کرنا شروع کردی۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی جن میں سب سے آگے آگے مولانا محمد علی تھے اس سلسلہ میں کوششیں کیں، اور پھر خود فلسطین والوں نے جان کی بازی لگا دی۔ اب جب انگریز بہت مجبور ہوگئے تو انھوں نے فلسطین کو آزاد کر دیا۔ مگر کس طرح؟ اس کے تین ٹکڑے کئے ایک خود لیا۔ دوسرا یہودیوں کو دیا۔ اور تیسرا مسلمانوں کو۔ ایسا عمدہ انصاف تم نے کہیں نہیں سنا ہوگا۔ اور لطف یہ ہے کہ خود سب سے اچھا حصہ لیا اور مسلمانوں کو سب سے ردی ٹکڑا دیا۔ اس تقسیم کے ذریعہ بیت المقدس بھی انگریزوں کے قبضہ میں رہیگا۔ یہ تین ٹکڑوں کی تجویز ابھی ابھی پاس ہوئی ہے اور اس تجویز نے فلسطین میں اور بھی بے چینی پیدا کر دی ہے۔ اسی ہفتہ کے اخباروں سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے بڑے بڑے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔

بیت المقدس میں ایک مسجد ہے مسجد اقصیٰ تم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام سنا ہوگا، انھوں نے کئی ہزار برس پہلے اس کی تعمیر کی تھی، پھر بعد میں مسلمان بادشاہ نے موقع بہ موقع اس کو بڑھایا۔

مولانا محمد علی اسی مسجد میں دفن ہیں۔ مولانا محمد علی کہا کرتے تھے کہ اگر ہندوستان آزاد ہوجائے تو یہ فلسطین وغیرہ سب اسلامی ملک جو گھن کی طرح گیہوں کے ساتھ پس رہے ہیں نجات پاجائیں گے۔ اسی لئے وہ آخر وقت تک ہندوستان کی آزادی کی کوشش کرتے رہے۔ فلسطین والوں پر ہندوستان کے مسلمانوں اور مولانا محمد علی کی خدمات کا بڑا اثر تھا۔ اسی لئے جب مولانا کا لندن میں انتقال ہوگیا تو انھوں نے مولانا شوکت علی (مولانا مرحوم کے بڑے بھائی) اور بیگم محمد علی سے ضد کر کے لاش کو مسجد اقصیٰ میں دفن کرنے کی اجازت لی۔ مسجد اقصیٰ ایک زمانے میں مسلمانوں کا قبلہ بھی رہی ہے۔ یعنی جیسے اب مسلمان کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں پہلے مسجد اقصیٰ کی طرف رُخ کر کے پڑھا کرتے تھے۔ اسی لئے مسلمانوں کو فلسطین سے اور بھی تعلق ہے۔ غازی کمال پاشا نے اعلان کیا ہے کہ ہم تو پہلے قبلہ پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم نہیں کریں گے

پہیلیاں

پچھلی پہیلیوں کے جواب صفحہ ۴۷۳

(۱) والدین (۲) ناریل۔

اِن پہیلیوں کا جواب اگلے پرچے میں دیا جائے گا

(۱) ایک دودھ والی کے پاس تین برتن تھے۔ جن میں ۸ سیر، ۵ سیر، ۳ سیر دودھ آسکتا تھا۔ ۸ سیر والا برتن دودھ سے بھرا تھا اور چھوٹے دونوں خالی تھے دودھ والی نے اپنی سمجھ داری سے اس دودھ کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرلیا اور سوائے ان تین برتنوں کے اور کسی چیز سے مدد نہیں لی۔ بتاؤ یہ کیوں کر ممکن ہوا؟

---

(۲)
کچھ چڑیاں دو پیڑوں پر ÷ آپس میں یہ کہتی تھیں
آئے جو ساجن ایک تمھاری ÷ ہم ہوں دو چند تم سے ساری
جائے جو تم میں ہم سے ایک ÷ تم ہو جاؤ برابر ہماری
بتاؤ کتنی تھیں

---

(۳) ایک صاحب نے ایک باغ لگایا۔ اس میں ۲۱ درخت اور ۲ قطاریں تھیں۔ ہر قطار میں پانچ درخت بتاؤ باغ کس طرح کا تھا؟

---

(۴) ایک انوکھی نار کہلائے۔ جیند جا کا ہوکے گھر لوجائے
چھوٹا بڑا کچھ نہ نہارے۔ جا کو چاہے تا کو مارے۔

(۵) نیلی سیج پہ گوری رانی۔ رو رو کہے وہ اپنی کہانی
رو دے تو عالم پھل پاوے۔ ہنس دے تو سارا جگ جل جاوے

---

(۶) سفید ملی اور سبز پونچھ
نہ بتائی جائے تو نانی اماں سے پوچھ

---

(۷) بیٹھے بیٹھے بات بناوے۔ ایسا پرکھ وہ کونے بھاوے
بوڑھا بالا جو کوئی آوے۔ اس کے آگے سیس نواوے

---

(۸) (ا) جوگی کیوں بھاگا۔ ڈھولکی کیوں نہ بجائی
(ب) ساجہ پیاسا کیوں۔ گدھا اداسا کیوں
(ج) گھڑا کیوں پھوٹا۔ ڈنڈا کیوں ٹوٹا
(د) انار کیوں نہ چکھا۔ وزیر کیوں نہ رکھا

---

(۹) (ا) بندوق اور پاجامے [illegible] ہے
(ب) حقیقت اور تلوا[illegible]
(ج) الماری اور [illegible]
(د) لکھنے اور گھ[illegible]

---

(۱۰) لگ [illegible]
تولگتا نہیں [illegible]
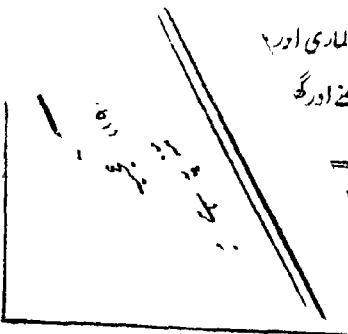
(۱۱) ادھر چلمن، اُدھر چلمن، بیچ کلیجہ دھڑکے۔ ہاتھ لگایں یوں کہے تو دو دو انگل سرکے۔

---

(۱۲) ایک جانور ایسا تھا ندی کے کنارے بیٹھا تھا چونچ بھی اس کی نیا کاری (چمکدار) دم سے پانی پیتا تھا۔

---

(۱۳) کالی تھی، کالے بن میں سوتی تھی۔ لال شوربا پیتی تھی ابرک کے انڈے دیتی تھی۔

---

(۱۴) اتنا سا صحن، اس کو لگے پانچ بیگن

---

(۱۵) راجہ کے راج میں نہیں، مالی کے باغ میں نہیں کھائے مگر توڑے نہیں۔

---

(۱۶) آم کھلے باغ میں، چھلکا ڈالے بازار میں۔ خوشبو گئی دربار میں۔

---

(۱۷) ہرا گھوڑا لال لگام، ٹُون ٹُون کرتے چلے غلام۔

---

(۱۸) ایک صندوق ۱۲ خانے۔ ایک ایک خانے میں ۳۰، ۳۰ دانے

کو سب ——— احمد بیگم۔ حیدرآباد دکن

پہیلی ہے مقبول
سنگ پہ پھول

(۲۰) دس سے بیس پاؤں کا گھوڑا
باگ اس کی بے دل نے موڑا

---

(۲۱) آدھا تل اور آدھا دار
سپاہی کرتا دل سے پیار

---

(۲۲) راجہ کے ہاتھی پہ جھلکیوں کا جھول
جس کا نہ پائیں عرض اور طول

---

(۲۳) ایک پرند ہے رنگ برنگ۔ دُم اس کی میلوں فرسنگ

---

(۲۴) ایک درخت ہے بہت ہرا۔ گیلا سوکھا خون بھرا
جگ میں پھرے وہ ہاتھوں ہاتھ۔ کام میں لائیں پاؤں بات

---

(۲۵) سارے سمندر شور مچائے۔ پر نہ کبھی وہ خشکی پہ آئے

---

(۲۶) ہم نے دیکھا تھا اک عجب جانور
رہتا خشکی پہ پانی میں ہے گھر
فیل سی گردن ہے اور چشم غزال
ٹھیک اس کی شیر سی آواز ہے مانند خر

---

(۲۷) جس بھیس میں جاؤ اس بھیس میں آئے
تم جو چڑاؤ وہ بھی چڑائے
برا بھلا جو کوئی جلائے۔ صاف دل ایسا منہ پہ بتائے

——— محمد عبدالحی۔ کٹل منڈی
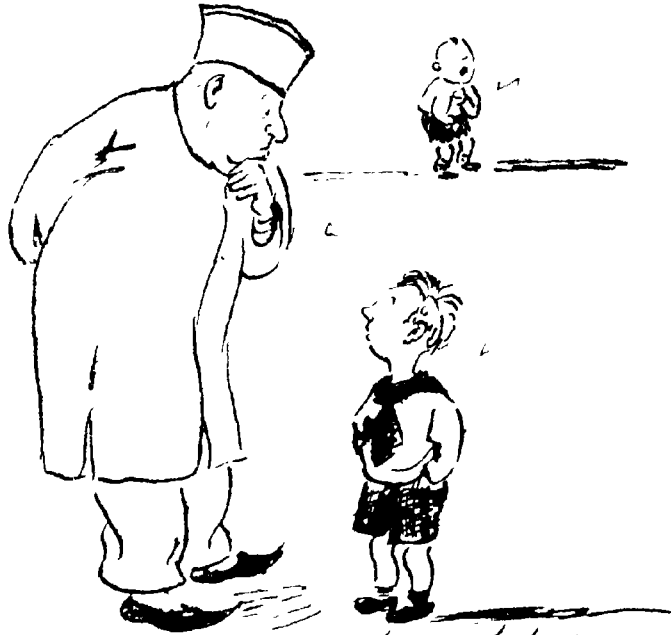
آدمی ۔ میاں تم نے آج کیا نیک (اچھا) کام کیا ہے؟
اسکاوٹ ؛۔ شیشی میں صرف ایک خوراک دوا رہ گئی تھی ۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی کو پی لینے دی ۔

پرانا طالب علم

پیام برادری

پیامی بچو اور بچیو - اللہ تمھیں خوش رکھے اور پروان چڑھائے - یہ معلوم کرکے میرا دل باغ باغ ہوگیا ہے کہ میرے پچھلے خط اور اعلان کا تم پر خاطر خواہ اثر ہوا - اور بچے اور بچیاں بڑی تیزی سے برادری میں شامل ہورہی ہیں . تمھارے شوق ، جوش اور ہمت کو دیکھ کر سچ جانو میرا دل بہت بڑھ گیا ہے - یہی جی چاہتا ہے کہ بس تمھارا ہی کام کئے جاؤں - مدرسے کے کام میرے ذمے میں نہ ہوتے تو ضرور ایسا ہی کرتی - پھر بھی انعامی مقابلے کا سب کام میں نے اڈیٹر صاحب سے لے لیا ہے - اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اُن کے کام کا بوجھ ہلکا ہوجائے -

اب تم انعامی مقابلے کے مضمون ، رنگ بھرنے کی تصویریں ، ٹائٹل اور دوسری چیزیں اپنی آپا جان ہی کے نام بھیجا کرو - مقابلے کے لئے عنوان بھی میں ہی تجویز کروں گی - اس پرچے کے لئے یہ عنوان ہیں :-

پیام تعلیم میں آئے دن بہت سے مشغلے بتائے جاتے ہیں تمھیں کون سا پسند ہے - اپنی پسندیدگی کی وجہ - مشغلے کے فائدے اور اس سلسلے میں اپنے کئے ہوئے کام اور تجربے بھی لکھو - مضمون تمھاری کاپی کے زیادہ سے زیادہ چار صفحوں میں آئے - اور ایک ہی طرف خوش خط لکھا جائے - نام اور پتہ مفصل ہو - استاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے

(۲) پیام برادری کی ترقی کے لئے تمھارے ذہن میں کیا کیا تجویزیں ہیں - یہ کام تمھارے ہاتھ میں دے دیا جائے تو تم اسے کس طرح کرو - یہ مضمون بھی اتنے ہی صفحوں میں آئے گا ان ہی شرطوں کے ساتھ -

(۳) (صرف بچیوں کے لئے) تم نے اپنی سہیلیوں یا بہنائیوں کی دعوت کی ہے - تم اس کے لئے کیا انتظام کروگی ؟ کیا کیا پکاؤگی اور کس طرح تمھارے یہاں مہمان کی خاطر اور کھانا کھلانے کا کیا طریقہ ہے - یہ مضمون بھی چار صفحوں میں لکھو اوپر کی شرطوں کے ساتھ

اڈیٹر صاحب سے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ تصویروں کے انعامی مقابلے میں بھی تم دلچسپی لے رہے ہو ایکے تم نے اچھی اچھی تصویریں بھیجی ہیں اچھا تو اگلے پرچے کے لئے زیادہ سے زیادہ ۱۰ دسمبر تک اپنے کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویریں میرے نام بھیج دو - اوپر کے تمام مضمون بھی اسی تاریخ تک میرے پاس پہنچ جائیں -

یہ خط میں وقت سے بہت پہلے لکھ رہی ہوں - تمھارے خط اب آنے شروع ہوئے ہیں - علاوہ اس کے رسالے میں صفحوں کی بھی بہت کمی ہے - اس لئے میں اس مرتبہ تمھارے خطوں کے جواب ڈاک کے ذریعے بھیجوں گی -

اس خط تک پہنچتے پہنچتے رسالہ تو تم سب پڑھ چکے ہوگے اور مجھے یقین ہے کہ تم نے اسے پسند بھی کیا ہوگا اچھا تو اب اسے اپنے دوستوں ، ہمجولیوں ، بہنایوں اور سہیلیوں کو بھی دکھاؤ اور انھیں اس کی خریداری اور برادری کی ممبری کی ترغیب دو

آج کل موسم کیا خوش گوار ہے - گلابی جاڑے نہ اتنی سردی نہ اتنی گرمی خوب مزے سے گذرتی ہوگی پڑھنے میں بھی جی لگتا ہوگا - ورزش بھی کرتے ہو ؟ ضرور کیا کرو - اس سے تندرستی بنی رہتی ہے اور آدمی چست و چالاک رہتا ہے - اچھا خدا حافظ - تمھاری آپا جان - ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۸ء

بچّوں کی کتابیں

بچّوں کا قاعدہ بچّوں کی نفسی اور جذباتی زندگی، اور بچوں کی اردو تعلیم کی ابتدائی دشواریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ قاعدہ مرتب کیا گیا ہے جس میں کام کو آخر تک دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی ہے بچّے اس کے ذریعے بہت جلد پڑھنے لگتے ہیں۔ قیمت ۴ر

رہنمائے قاعدہ بچوں کا قاعدہ پڑھانے کے لئے اس کتاب کا رکھنا ضروری ہے۔ قیمت ۲ر

بچّوں کی کتاب بچّوں کو کہانیوں میں بڑا مزا آتا ہے اور اس کے برعکس مختلف مضامین کے خشک اسباق ان کی دلچسپی کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ ایک ریڈر ہے، لیکن شروع سے آخر تک ایک کہانی کی صورت میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے ذریعے سے بچے بہت جلد پڑھنے لگتے ہیں۔ بے شمار تصویریں ہیں اور نہایت جلی قلم سے بہترین کتابت کرائی گئی ہے۔ قاعدے کے بعد بچّوں کو یہ کتاب پڑھانی چاہیئے۔ قیمت ۴ر

آسان خوش خطی جامعہ ملیہ نے لکھنے کی طرف عام بے توجہی اور بدخطی کے مرض کی ترقی کو محسوس کر کے یہ کاپیاں بچّوں کے لئے خاص طور پر تیار کرائی ہیں۔ اب تک متعدد محکمہائے تعلیم میں منظور ہو چکی ہیں۔

حصہ اول تختیاں لکھنے کی مشق بطرز جدید قیمت ۱ر

حصہ دوم تختیاں بطرز جدید قیمت ۱ر

حصہ سوم مرکب الفاظ جوڑ اور پیوندوں کی مشق بطرز جدید " ۱ر

حصہ چہارم دلچسپ اور اخلاقی اشعار لکھنے کی مشق " " ۱ر

جدولیں بچوں کا ہاتھ صاف کرنے کے لئے ہم نے ایسی جدولیں تیار کی ہیں جو کم خرچ اور بالانشین ہیں۔ قیمت فی

جدول برائے حصہ اول و دوم ۲ر

برائے حصہ سوم و چہارم ۲ر

مشق خوش نویسی جو بچّے آسان خوش خطی کے چاروں حصے ختم کر کے کافی مشق پیدا کر لیں وہ اس کاپی کو ضرور لکھیں۔ مختلف دائروں اور کششوں کو ناپ ناپ کر جس طرح دکھایا ہے اسے سمجھ کر آسانی خوش نویس بن سکتے ہیں۔ قیمت ۲ر

بچّوں کا حساب حساب کے ہندسوں کا گورکھ دھندا بنا کر غیر مانوس اور کریہہ شکل میں پیش کیا جاتا ہے جناب برکت علی صاحب استاد ریاضی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے حساب کا ایک سلسلہ تیار کرنا شروع کیا ہے جس میں بچّے کی طبعی شگفتگی کو سامنے رکھا ہے اور وہ اسلوب استعمال کیا ہے جس سے اس کی بے شمار بڑھتی ہوئی طاقتیں پامال نہ ہوں اب تک تین حصّے چھپے ہیں۔

حصہ چہارم	قیمت	۹ر
حصہ پنجم	"	۱۰ر
حصہ ششم	"	۹ر

آنحضرتؐ رسول مقبول (صلعم) کے حالات (۱۰ ۱۲) برس کے لڑکوں کے لئے۔ از مولوی الیاس احمد صاحب مجیبی (دوسرا ایڈیشن) قیمت ۴ر

ہمارے نبیؐ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی کی کہانیاں آسان اور دلچسپ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب ان مقبول کتابوں میں سے جن کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور جامعہ ملیہ کے نصاب تعلیم کے علاوہ محکمہائے تعلیم یو۔پی (مکاتب) حیدرآباد۔ میسور سی۔پی وغیرہ میں داخل نصاب ہے۔ قیمت ۳ر

آخری نبیؐ رسول مقبول (صلعم) کے مختصر مگر جامع حالات چھوٹے چھوٹے جملے اور ہلکے پھلکے الفاظ دوسرا ایڈیشن۔ قیمت ۲ر

ہمارے رسولؐ یہ کتاب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت پر مناسب اسلوب بیان اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ جس کے پڑھنے سے محبت رسول اور پیروی سنت کا جذبِ صادق پیدا ہوتا ہے۔
بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتاب ہے محکمہائے تعلیم ممالک متحدہ آگرہ و اودھ (مکاتب) حیدرآباد، سی۔پی میسور وغیرہ میں منظور کی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

سرکار کا دربار سرکارِ کائنات (صلعم) کے حالات میں بچوں، عورتوں اور عام مطالعے کیلئے مقبول و مشہور کتاب جو اب تک کئی ہزار نکل چکی ہے۔ قیمت ۶ر

سرکارِ دو عالمؐ کم استعداد لڑکوں کے لئے سیرت پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ کتاب بہت ہی صاف اور عمدہ چھاپی گئی ہے۔ جس میں مختصر تاریخ عرب

آنحضرتؐ کی پاک زندگی کے بچپن کے حالات، ہجرت، تمام سارے عرب کا مسلمان ہو جانا۔ عرب کے جغرافی حالات، جاہلیِ عرب۔ اہل قریش کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے ہیں تیسرا ایڈیشن، کتابت و طباعت وغیرہ اعلیٰ۔ ٹائٹل نہایت خوبصورت ڈیزائن کے بلاک سے چھپا ہے۔ قیمت ۸ر

سیرۃ الرسولؐ تاریخ الامت۔ حصہ اول مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری مولانا نے اردو زبان میں اسلام کی تاریخ اس فن کے اصول کے مطابق سات حصوں میں مرتب کی جس کا پہلا حصہ سیرۃ الرسول ہے۔ اسمیں زمانہ جاہلیت سے لیکر آنحضرتؐ کی وفات تک کے حالات ہیں۔ ۶ر

چاریار حضرات خلفاء راشدین یعنی حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ عثمانؓ و علیؓ رضوان اللہ علیہم کے سبق آموز اور دلچسپ حالات اخلاقی پہلوؤں کی سلیقے سے تعلیم دی گئی۔ اور باہمی خانہ جنگیوں سے بحسن و خوبی پرہیز کیا ہے۔ تیسرا ایڈیشن ۱۱۲ صفحات۔ قیمت ۶ر

خلفاء اربعہ اس کتاب میں حضرت ابوبکرؓ صدیق، حضرت عمرؓ فاروق حضرت عثمانؓ غنی، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حالات زندگی، خدمت اسلام، محبت رسول، عام عادات و اخلاق سہل زبان میں لکھے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ خلفاء اربعہ کے عہد میں عرب کی کیا حالت تھی اور اسلام نے کیا ترقیاں کیں۔ حجم ۴۴ صفحات۔ قیمت ۸ر

خلافت راشدہ تاریخ الامت۔ مصنفہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری۔ آنحضرتؐ کی وفات سے خلافت راشدہ تک کے مکمل اور جامع حالات خاص طور سے طلباء کے چھوٹے سائز پر چھپوائی گئی ہے۔ قیمت ایک روپیہ ۱۰ر

دس جنتی حضرات عشرہ مبشرہ یعنی حضرت زبیر و طلحہ، عبدالرحمٰن و سعد، ابو عبیدہ و سعید کے حالات تفصیل سے اور باقی چار یار رضی اللہ عنہم اجمعین کے حالات بہت مختصر۔ یہ ایسی پاکیزہ کتاب ہے کہ مولانا عبدالماجد بی۔ اے دریابادی اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ "اس کے پڑھنے والوں سُننے والوں، پسند کرنے والوں کو پروردگار جنت کی نعمتوں سے مالا مال کرے"۔ قیمت ۵ر

عقائدِ اسلام یہ رسالہ بچوں کو اسلامی عقائد سکھانے کے لئے نہایت اختصار کے ساتھ سلیس اُردو زبان میں لکھا گیا ہے۔ اُردو میں اس سے بہتر دینیات کا رسالہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ قیمت ۱ر

ارکانِ اسلام جو بچے عقائد اسلام ختم کرلیں انہیں یہ رسالہ ضرور پڑھایا جائے۔ اس میں اسلام کے پانچوں ارکان آسان زبان اور صاف عبارت میں سمجھائے گئے ہیں۔ قیمت ۲ر

ہمارا دین اس کتاب میں ایمان مفصل، برکات اسلام تعلیم دین اور اسلام کی خوبیاں عام فہم اور دل نشین پیرایہ میں بتائی گئی ہیں۔ قیمت ۲ر

الورد والریحان صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں کا انتخاب اردو زبان میں مسلمان بچوں کے لئے شائع کیا گیا ہے۔ حدیثوں کا ترجمہ نظم و نثر میں کیا گیا ہے، تاکہ طلباء دلچسپی اور سہولت کے ساتھ حفظ بھی کرسکیں۔ قیمت دو آنے (۲ر)

چالیس حدیثیں جناب خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی نے ایسی چالیس حدیثیں انتخاب فرمائی ہیں جو خاص طور پر بچوں کے لئے سبق آموز ہیں۔ یہ حدیثیں مختلف عنوانات مثلاً سادگی، استقلال، اتفاق وغیرہ کے ماتحت درج کی گئی ہیں اور ان کا ترجمہ و تشریح بھی کی گئی ہے۔ ۲ر

اچھی باتیں ان آیات قرآنی کی عام فہم تفسیر جو پند و نصائح پر مبنی ہیں۔ ترتیب مضامین بہت عمدہ ہے ہر آیت کریمہ الگ الگ سرخی کے ماتحت لکھی گئی ہے۔ جس قدر باتیں ایک ہونہار بچے کے لئے ضروری ہیں سب اس میں جمع کردی گئی ہیں۔ گویا بچوں کی ایک چھوٹی سی تفسیر ہے۔ ۳ر

نبیوں کے قصّے اس کتاب میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام نبیوں کے حالات بڑی آسان اور شیریں زبان میں لکھے گئے ہیں۔ مسلمان بچوں کے لئے ایسی کتاب نہ ہونے کے باعث وہ عام طور پر انبیاء کرام ؑ کے حالات سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ بچوں کیلئے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ قیمت ۵ر

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول میں اسلامی تاریخ کی بہت ہی مختصر کہانیاں چھوٹے بچوں کیلئے جمع کردی گئی ہیں۔ اور حصہ دوم میں کسی قدر بڑی کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں سچے اسلام کے اچھے لوگوں کے صحیح واقعات ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵ر۔ حصہ دوم ۵ر

تاریخ ہند کی کہانیاں سینکڑوں برس پہلے کی ہندوستان کی تاریخی کہانیاں ایسی آسان اور پیاری زبان میں لکھی گئی ہیں کہ کوئی بچہ بغیر ختم کئے نہیں چھوڑتا۔ قدیم ہندوستان کے باشندوں سے بچوں کو روشناس کرانے کے لئے یہ مختصر مجموعہ نہایت جامع اور مفید ہے۔ حصہ اول ۴ر حصہ دوم ۵ر

مکتبہ جامعہ دہلی

پیامِ
جاگو اور جگاؤ
مکتبہ جامعہ دہلی
C.A. STUDIO. DELHI

پیامِ تعلیم
دہلی

سال گرہ نمبر

سنہ ۱۹۳۶ء

مشغلے اور دستکاری

پیامِ تعلیم کا یہ سال گرہ نمبر بچوں کے رسالوں میں ایک نئی چیز ہے۔ پیامِ تعلیم کی شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ بچوں میں فرصت کے وقت اچھے، مفید اور دلچسپ کام کرنے کی عادت پیدا ہو۔ اس نمبر کے مضامین میں اِن باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ چنانچہ لکڑی کا کام، فریٹ ورک، کاغذ بنانا۔ ابری بنانا۔ گتے کا کام، کتائی، باغبانی وغیرہ اسی قسم کے مضامین ہیں۔ قصّے اور ڈرامے بھی ایسے چنے گئے ہیں جو ہمارے مقصد کے لئے مفید ہوں۔ بچیوں کے لئے سلائی، کشیدہ کاری اور کھانے پکانے کے متعلق اچھی اچھی چیزیں فراہم کی گئی ہیں۔ غرض ہم نے اس رسالے کو بچوں کے لئے مفید بنانے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تعلیمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ہماری اس کوشش کو اچھی نظر سے دیکھیں گے۔

محمد حسین حسّان

فہرست مضامین

جلد ۲۱- نمبر ۱۱، ۱۲

نومبر، دسمبر ۱۹۴۸ء

پرنٹر و پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

جب سے تمھاری برادری قائم ہوئی ہے مشغلوں اور دستکاریوں سے تمھاری دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے ہمارا مقصد بھی یہی تھا کہ تم اپنا خالی وقت اِدھر اُدھر کی باتوں میں ضائع نہ کرو۔ بلکہ اسے کسی مفید کام میں صرف کرو۔

ویسے تو بہت دنوں سے پیام تعلیم کے ہر نمبر میں مشغلوں پر ایک آدھ مضمون ضرور چھپتا تھا مگر تمھارے پڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر ہم نے گویا ایک کتاب کی کتاب تیار کردی اور اب تم اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھو اور ضرورت کے وقت اس سے مدد لو۔

اس نمبر کو تیار کرتے وقت ہم نے ایک بات کا خاص طور پر خیال رکھا ہے اور وہ یہ کہ ہر مضمون اسی شخص سے لکھوایا جائے جس کا اُسے خود بھی شوق اور تجربہ ہو۔ مضمونوں کو پڑھ کر تمھیں خود ہی اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

ہم نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ ایک ہی چیز پر مضمون پڑھتے پڑھتے تمھاری طبیعت کہیں اُکتا نہ جائے۔ اسی لئے اس میں نظمیں بھی ہیں، قصے بھی ہیں ایک ڈراما بھی ہے۔ مگر یہ ہیں سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے۔

اس پرچے میں سید ابوطاہر صاحب کا مضمون غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے۔ یہ مضمون بہت لمبا تھا۔ اور ابوطاہر صاحب نے ہمیں اجازت دے دی تھی کہ اُسے مختصر کردیں مگر مضمون اتنا دلچسپ اور اچھا تھا کہ کانٹ چھانٹ کو جی نہ چاہا۔ اس کے دو حصے اس پرچے میں چھپے ہیں تیسرا حصہ یعنی اپیل جنوری میں شائع ہوگی۔

سید ابوطاہر صاحب کے ایک خط سے یہ معلوم

کر کے سخت صدمہ ہوا کہ اُن کی محترم والدہ صاحبہ کا پچھلے ستمبر میں انتقال ہوگیا۔ سید صاحب پیام تعلیم کے لئے ایک اور اچھا سا مضمون لکھنے والے تھے مگر اسی پریشانی کی وجہ سے نہ لکھ سکے۔ ہمیں اس حادثے سید صاحب سے دلی ہمدردی ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو جنت میں جگہ دے اور سید صاحب اور اُن کے دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق عطا ہو۔ آمین۔

چین کی کہانی کا سلسلہ بچوں نے عام طور سے پسند کیا۔ اس کے چند باب ابھی باقی تھے۔ مگر اب محمود علی خاں صاحب نے طے کیا ہے کہ اُسے جلد سے جلد کتاب کی شکل میں چھاپ دیا جائے۔ جب یہ چھپ جائے گی تو ہم تمھیں اطلاع دیں گے۔

عزیزہ شمسیہ زیب النسا (داونگرہ میسور) کے بارے میں ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مڈل کے امتحان میں اول آئی تھی۔ پیام تعلیم کی طرف سے اس بچی کی ہمت بڑھانے کے لئے تاریخ الامت کا ایک سٹ انعام میں دیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ ہونہار بچی اپنے ہر امتحان میں اسی امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کرے گی

پیام تعلیم کا یہ نمبر تمھارے پاس شاید کچھ دیر میں پہنچے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاک خانے میں اسے تمھارے پاس بھیجنے کی تاریخ ہر مہینے کی چار لکھی ہوئی ہے۔ اب ڈاک خانے والے کہتے ہیں کہ رسالہ اسی تاریخ کو ڈاک میں ڈالا جائے۔ اس سے پہلے لینے سے وہ انکار کرتے ہیں۔ اس مجبوری کا خیال کر کے ہمیں امید ہے کہ تم ہمیں معذور سمجھو گے۔

ہاں ایک بات اور ..... تم اس رسالے کو پڑھ کر ہمیں اپنی رائے ضرور لکھنا۔ صحیح رائے۔ ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہماری تعریف لکھو۔ بس یہ بتاؤ کہ یہ رسالہ تمھیں پسند آیا یا نہیں۔ آیا تو کیوں نہیں آیا تو کن خرابیوں کی وجہ سے۔ یہ بھی لکھو کہ کون سی ایسی باتیں ہیں؟ جو اس میں نہ ہونی چاہئے تھیں۔ یا کن چیزوں کے بڑھانے سے رسالہ اور بھی دلچسپ ہو جاتا۔

جو بچہ ٹھیک ٹھیک اپنی رائے بتائے گا اُسے ہم انعام دیں گے۔ جو کچھ لکھنا بہت صاف صاف اور کھلا کھلا لکھنا۔ کاغذ کے بس ایک ہی طرف۔ رسالہ پہنچنے کے آٹھ دن بعد ہمیں بھیج دینا۔

خط یا منی آرڈر بھیجتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دو۔

مولوی شفیع الدین صاحب نیر، استاد ماڈرن ہائی اسکول دہلی

کالی کالی اس کی گھٹائیں ؛ ٹھنڈی ٹھنڈی اس کی ہوائیں
پیاری پیاری اس کی فضائیں ؛ بانکی بانکی اس کی ادائیں

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

اُجلی اُجلی نہریں جاری ؛ نرمل جل کی شوبھا نیاری
میٹھے پھل سندر پھلواری ؛ پھولوں کا بستر کیاری کیاری

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

صبح کا منظر پیارا پیارا ؛ سورج جیسے لال انگارا
شام کا چاند کچھ اور بھی نیارا ؛ موتی ہیرا اک اک تارا

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

گرمی اور سردی کی بہاریں ؛ برکھا رت کے مینہ کی پھواریں
ساون اور بھادوں کی ملاریں ؛ گنگا اور جمنا کی دھاریں

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

خِطّہ اک کشمیر یہاں ہے ؛ خوبی اس کی سب پہ عیاں ہے
خِطّہ ایسا اور کہاں ہے ؛ سچ تو یہ ہے یہ باغِ جناں ہے

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

سب سے اونچا اس کا ہمالا ؛ فطرت کی گودوں کا پالا
جھیلوں والا چشموں والا ؛ سب سے انوکھا سب سے نرالا

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

آؤ دیس پہ تن من واریں ؛ دیس کی حالت دل سے سدھاریں
دیس کے ہر طبقے کو ابھاریں ؛ نیّرؔ پھر سب مِل کے پکاریں

سب سے اچھا دیس ہمارا
سب سے پیارا دیس ہمارا

لالو کی ڈونگی
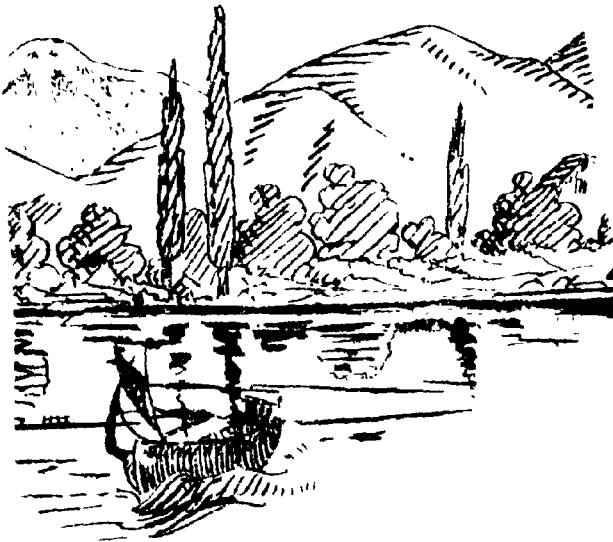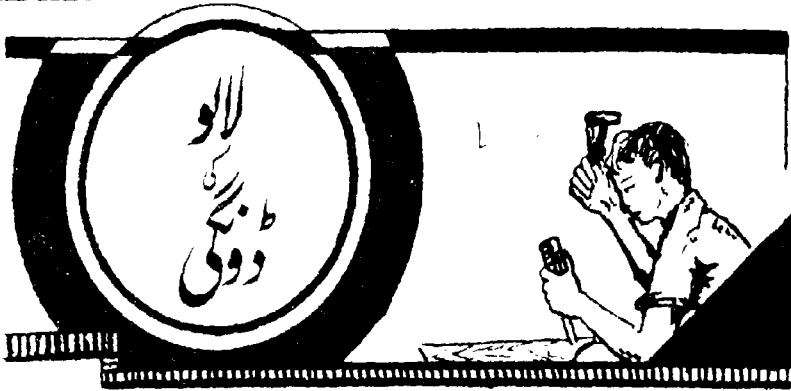
لالو تھا تو ننھا سا پر بہت چنچل اور تیز۔ نچلا بیٹھنا تو جانتا ہی نہ تھا بس ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ ذہین بھی بلا کا تھا اور ارادے کا تو اتنا پکا کہ جس کام کی دھن سوار ہو جاتی اسے بس کر ہی کے چھوڑتا۔

لالو کے ابا پڑھے لکھے زمیندار تھے۔ اپنی زمینداری میں لگے رہتے تھے۔ ان کا مکان گاؤں والوں کے جھونپڑوں سے دور ندی کے کنارے تھا۔ ایک طرف رہنے کے لئے صاف ستھرے کمرے دوسری طرف جانوروں کی سار بڑھئی خانہ وغیرہ

ایک دن کیا ہوا کہ اس کے یہاں بڑا سا لکڑی کا بکس آیا۔ میاں لالو نے جو دیکھا تو ہبولا اور رو کھانی سے آموجود ہوئے۔ صندوق کھولنے کا اسے اتنا شوق تھا کہ اس وقت کسی دوسرے کام کو کہا جاتا تو صاف انکار کر دیتا۔ ایک دفعہ تو کھولنے میں رو کھانی اس کے ہاتھ پر جا لگی اور انگلیاں لہو لہان ہو گئیں پر اسے جیسے اس کی خبر ہی نہ ہوئی۔ آخر بہت محنت کے بعد ڈھکنا کھلا۔ لالو نے جھٹ اندر کو جھانکا تو ایک تصویر تھی۔ بے چارا اداس ہو گیا۔ اس نے تو اس شوق سے بے تاب ہو کر ڈھکنا کھولا تھا کہ ضرور اس میں کوئی اچھی سی چیز ہوگی۔ پر تصویر چاہے کتنی ہی اچھی سہی اس کے کس کام کی۔ اس کے ابا

پاس ہی کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے تصویر نکال لی اور اچھے سے فریم میں لگاکر اسے اپنے کمرے میں لٹکا دیا اور بکس لالو کے حوالے کیا۔ لالو نے اسے ایک طرف لے جاکر رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اس سے کیا کام لیا جائے۔ کیوں نہ بسولے سے اس کے تختے الگ الگ کر دوں۔ بڑا مزا آئے گا جب یہ تختے چرچر الگ ہونے لگیں گے۔

اس نے بسولا لیا اور صندوق کی طرف چلا۔ لیکن پھر سوچا "پھاڑنے سے کیا فائدہ! ہاں! اہا ہا! اس کے تختوں سے اپنے لئے ندی کے کنارے ایک جھونپڑا کیوں نہ بناؤں؛ اس کے اندر بیٹھ کر مزے سے ندی کی سیر کیا کریں گے۔ خوب مزا آئے گا۔"

پھر کیا تھا صندوق کو چھوڑ، وہ ندی کے کنارے پہنچا۔ جھونپڑے کے لئے جگہ بھی پسند کرلی۔ ایک چھوٹے سے ببول کے پیڑ کو جھونپڑے کے کھمبے کے لئے پسند کیا۔ اور لگا اپنے بسولے سے اسے کاٹنے۔ پہلے بسولے سے ببول کی چھال کٹ گئی دوسرا بسولا مارا، لیکن کچھ نہ ہوا۔ تیسرا مارا تو ذرا سی خراش آگئی اور پیڑ ہلا تک بھی نہیں۔ چوتھا مارا تو بسولا اچھل کر دور جا گرا۔ لالو نے سوچا، یہ پیڑ نہیں کٹنے کا۔ اور بسولا ایک طرف کو ڈال ندی کے کنارے ٹہلنے لگا۔

ندی میں ایک تتلی بہتی ہوئی چلی آرہی تھی بہتیرا ہاتھ پاؤں مار رہی تھی کہ کوئی سہارا مل جائے، پر بیکار۔ اتنے میں ایک مچھلی نے سر نکالا اور تتلی کو ہڑپ کر گئی۔ اس کے بعد کھٹ کھٹ بڑھئی کے اڑنے سے ایک سوکھی ہوئی ٹہنی پاس کے درخت سے پانی میں گری اور تیرنے لگی۔ لالو نے جی میں سوچا لاؤ ایک چھوٹ موٹ کی ناؤ بنائیں اور پانی میں تیرائیں۔ اس نے جھٹ جیب سے چاقو نکال اور ایک ٹہنی کو کاٹ پانی میں پھینک دیا۔ اب میاں لالو کا دل بڑھا، سوچنے لگے، کیا اچھا ہوتا جو میرے پاس ایک ڈونگی ہوتی اور

میں اس میں بیٹھ کر دریا کی سیر کیا کرتا اور مچھلی کا شکار کھیلتا ہے۔

اب میاں لالو کو یہ فکر ہوئی کہ ڈونگی بنے کیسے۔ انھوں نے پہلے بھی اسی نیت سے ایک پرانے ٹھنٹھ کو کاٹنا شروع کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی انھوں نے اپنا بسولا کھانی اور ہتھوڑی اٹھا اُدھر کا رخ کیا۔ انھوں نے سوچا کہ اس ٹھنٹھ میں سوراخ کرکر اس میں اپنے بیٹھنے کی جگہ بنانی چاہیئے۔ بسولے اور رکھانی سے بہت دیر تک اس ٹھنٹھ سے کشتی لڑتے رہے۔ مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اسی نتیجے پر پہنچے کہ اس ٹھنٹھ کی ڈونگی نہیں بن سکتی۔

اب انھوں نے سوچنا شروع کیا کہ آخر چھال کی ڈونگی کیوں نہ بنائی جائے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اگر کسی پیڑ سے چھال اتار کر اسے کشتی کی شکل کا بنا بھی لوں تو اس کے دونوں سرے جو کھلے رہیں گے، وہ کیسے بند ہوں گے۔ ان کے رستے سے ڈونگی میں پانی بھر جائے گا۔ اور کشتی تیر نہ سکے گی۔ اس خیال کو انھوں نے چھوڑ دیا اور اب ایک دوسری ترکیب سوچی۔ کارخانے کے سامنے ایک پرانا نیم کا تنہ بہت دنوں سے پڑا تھا۔ اس طرح پڑے پڑے اس کی چھال اتر گئی تھی۔ لکڑی کو بھی دیمکوں نے کہیں کہیں سے چاٹ لیا تھا۔ لالو نے سوچا کہ اس ٹھنٹھ میں سوراخ کرنا آسان ہے۔ پھر کیا تھا، پہنچ گئے۔ بسولا رکھانی لے کر۔ کوئی آدھ گھنٹے تک اسے کاٹتے رہے لیکن سوائے ایک چھوٹا سا سوراخ بنانے کے اور کچھ نہ کر سکے۔ ان کو بڑا تعجب ہوا کہ معلوم نہیں، پرانے زمانے کے جنگلی لوگ درختوں کی جڑوں سے کیسے ڈونگیاں بناتے تھے۔

لالو یہ جانتا تھا کہ آج کل کشتیاں تختوں سے بنائی جاتی ہیں۔ لیکن تختہ بنانا آسان نہ تھا، پھر بھی اس نے کوشش کی۔ اور بہت محنت کے بعد مشکل سے دو تختے بنا پایا۔ وہ بھی اتنے صحیح نہیں تھے کہ ایک دوسرے سے ٹھیک ٹھیک جڑ جاتے۔ ہر کام میں برابر

ناکامی سے وہ تنگ آگیا اور یہ کام بھی چھوڑ دیا۔
لالو جلا بھنا ہوا بیٹھا تھا۔ پاس ہی میاں ٹی
بھی بیٹھے تھے۔ کبھی وہ پسوؤں پر غصہ ہو کر پنجہ
چلاتے کبھی غراتے۔ کبھی لالو کی طرف دیکھتے کہ
بے چارا محنت سے پسینے پسینے ہو رہا ہے
لیکن کام نہیں بنتا۔ لالو نے غصے میں آ کر بسولا
رکھ دیا اور ہتھوڑی اٹھا کر پھینک دی اور کہنے
لگا "یہ کچھ نہیں ہو سکتا"

اسے کبڈی اور گلی ڈنڈا بہت پسند تھا
بس سیدھے میدان کی راہ لی جہاں بہت سے
بچے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ وہاں وہ خوب
دل کھول کر کھیلا جیسے سارے دکھ بھول گیا

کھیل کھال کر لوٹا تو پھر وہی دھن سوار
ہوئی۔ بکس یاد آگیا۔ سوچنے لگا "آخر
کشتی تختوں ہی سے تو بنتی ہے، پھر اس
صندوق کی ڈونگی کیوں نہ بنا دوں۔ بڑی
مزے کی رہے گی" یہ خیال آنا ہی تھا
کہ صندوق لینے بھاگا اسے دیوار کے
سہارے جھکا کر دیکھا تو سوراخ بہت
سے تھے۔ ڈونگی تو بنی بنائی اسے مل گئی
تھی، پر اب یہ فکر ہوئی کہ اس کے یہ چھوٹے
چھوٹے سوراخ کیسے بند کئے جائیں
کیونکہ ان میں سے ڈونگی کے اندر پانی
بھر جائے گا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد
اس نے بڑے بڑے سوراخ تو لکڑی
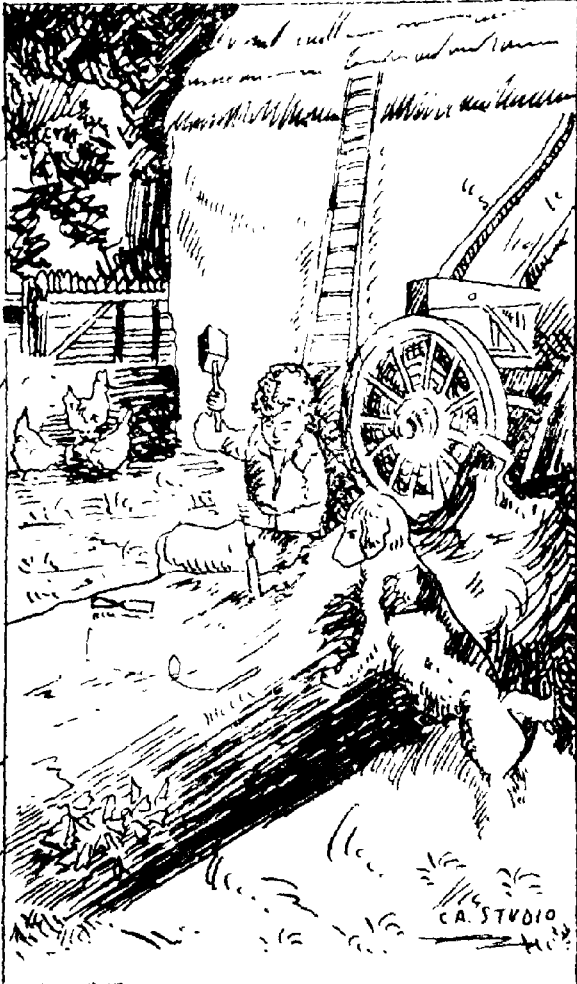
کی کھپاچوں سے بند کر دے، مگر باریک باریک سوراخ کیسے بند ہوں۔ اسے خیال آیا کہ کارخانے میں کچھ سن رکھی ہے، وہ گیا اور گٹھر اٹھا لایا اور لگا نکال نکال کر ان درازوں میں ٹھونسنے۔ جب ہاتھ نے کام نہ دیا تو جیب سے چاقو نکال اور اس سے ٹھونسنے لگا لیکن پھر بھی سوراخ نہ بند ہوئے۔ اب اس نے رکھائی سنبھالی مگر اس سے اوّل تو سن کٹ جاتا تھا اور دوسرے اس کا لو یا بھی موٹا تھا جو سوراخ میں جا نہیں سکتا تھا۔ اسے بھی چھوڑا اور دوڑ کر بوریاں سینے کا سوا لایا۔ اس ترکیب سے کچھ کامیابی ہوئی، لیکن ابھی بہت سے سوراخ بند کرنے تھے۔ لالو ہار گیا۔

ایک بار تو تھک کر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا اور پھر بھوک ستانے لگی تو مجبوراً کام چھوڑ کر رسوئی (یا باورچی خانہ) گیا اور دہی میں گڑ ملا کر خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اب پھر ڈونگی کی دھن سمائی۔ آکر اِدھر اُدھر سے دیکھا تو دو چار سوراخ کہیں کہیں باقی تھے، لیکن سن تو ختم ہو گئی تھی، اب اس نے سوچا کہ کوئی پرانی رسّی مل جاتی تو کام بن جاتا۔ بس جیب سے چاقو نکال ایک مکان میں گھس گیا جہاں بیلوں کی رسّیاں اور بہلی کے رسّے رکھے ہوئے تھے۔ چپکے ادھر اُدھر دیکھا کہ کوئی ہے تو نہیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو اس نے بہلی میں سے ایک بڑا سا رسّا کاٹا۔ چاقو سے اسے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ لیکن رسّے کا بل نہیں گیا اور نہ سن کے گالے ہی حاصل ہوئے اس نے اسے ایک طرف پھینک دیا۔ اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ اب وہ دوسری کمرے میں گیا اور ساری چیزیں الٹ پلٹ ڈالیں پھر کچھ سوچ کر وہ باورچی خانے گیا جہاں اسے چیتھڑوں کا ایک ڈھیر مل گیا جو اس کی ماں نے سنبھال کر رکھ چھوڑا تھا کہ وقت بے وقت کام آئے گا۔ لالو نے تھوڑے سے چیتھڑے لئے اور بھاگا ہوا ڈونگی کے پاس آیا، کہیں کہیں جو سوراخ رہ گئے تھے انھیں بند کیا۔ اب ڈونگی بالکل تیار ہو گئی۔

اور ندی میں اتارنا رہ گیا۔

کارخانے سے ندی کوئی سوا سو گز دور ہوگی۔ ڈونگی ندی تک کیسے جائے؟ اس لئے کہ راستے میں بہت سے کھیت تھے پھر جھاڑ کے جھاڑ جھنکاڑ۔ اس نے دو رسیاں پھر خریدیں اور ان کو ڈونگی کے ایک کنارے پر بیچ میں باندھ، کھینچنا شروع کیا۔ بیس گز تک تو لالومیاں کسی طرح ہانپ ہانپ کر لائے۔ مگر اس کے بعد اب اونچی اونچی گھاس تھی۔ بہتیرا زور لگا رہے ہیں لیکن ڈونگی ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ لالومیاں بہت سوچ میں پڑے کہ ہزار مصیبت سہہ کر تو ڈونگی تیار کی، لیکن اب یہ دوسری مشکل آن پڑی۔ یکایک خیال آیا کہ جیسے بڑے بڑے شہتیر ایک جگہ سے دوسری جگہ نیچے مضبوط بانس یا تختے رکھ کر لے جاتے ہیں اسی طرح اس ڈونگی کو کیوں نہ ڈھکیل کر پانی میں اتاریں۔ دوڑتے ہوئے گئے

اور تین چار بانس کے ٹکڑے اٹھا لائے دو بانس ڈونگی کے آگے رکھ دیئے اور ایک بانس سے ڈونگی کو اٹھا کر ان بانسوں پر کیا اور ڈونگی کو ڈھکیلا تو نیچے کے بانسوں کے پھسلنے کے ساتھ ساتھ ڈونگی بھی پھسلتی چلی گئی کچھ دور اس طرح لے گئے لیکن اب گھاس بہت اونچی اونچی تھی اس میں بانس بھی اٹکنے

لگے۔ اب کیا کریں۔ سینکڑوں جتن کر ڈالے پر ڈونگی آدھے رستے تک جا کر ایک جگہ ایسی جمی کہ ہلنے کا نام بھی نہیں لیتی۔ بہتیری کوشش کر دیکھی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ لالو میاں تھک کر چور ہو گئے تھے ڈونگی کو ڈھکیلتے وقت انگلی میں جو ایک پھانس چبھی تو بگڑ ہی تو گئے، کچھ جھنجھلا کر اور کچھ اپنی ناکامی پر کھسیانے ہو کر بانس وانس الگ پھینک وہاں سے چل دئے۔ گھر پہنچے تو باورچی خانے میں آگ جل رہی تھی۔ دل میں آیا کہ ایک لوہے کا ٹکڑا گرم کرکے اس سے اپنی کمان کے لئے تیر بنائیں۔ ایک ٹکڑا لے کر اسے خوب گرم کیا، لال ہو گیا تو اسے ہتوڑے سے کوٹنے لگے۔ لیکن ایک تو یوں ہی تھکے ماندے تھے، دوسرے باورچی خانے کی گرمی، دو تین مرتبہ لوہے کو گرم کر کے کوٹا، اور باہر نکل آئے۔ تھوڑی دیر باہر ٹہلتے رہے، پھر اپنے کمرے میں گئے۔ وہاں پتنگ اور ڈور کی چرخی رکھی ہوئی تھی۔ چرخی میں سے تیلی نکل گئی تھی۔ اسے لے کر جوڑنے بیٹھ گئے۔ اتنے میں دیکھا کہ پتاجی کی بندوق ایک کونے میں رکھی ہے۔ چرخی چھوڑ بندوق اٹھالی اور سامنے کی دیوار پر نشانہ لگایا۔ لیکن اس کا گھوڑا خراب ہو گیا تھا، بندوق نہ چلی۔ اب یہ سوچا کہ دیکھیں بندوق چلتی کیسے ہے۔ اس کے اندر کیا کیا مشینیں لگی رہتی ہیں۔ اسی شوق میں بندوق کو کھول ڈالا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا، اسے الگ ڈالا اور لگے ادھر ادھر ٹہلنے۔ اتنے میں خیال آیا کہ چلو متو مستری کے یہاں آج آلہا اودل کا گانا ہو رہا ہے، سنیں۔ وہاں پہنچے تو آلہا کے کارنامے بیان کئے جا رہے تھے، کہ وہ اپنی دلھن کو حاصل کرنے کے لئے اپنی سسرال کی فوج سے کس بہادری سے لڑا اور آخر میں سب کو شکست دے کر دلھن کو لے آیا۔ سننے والے ڈھولک کی تان پر جھوم رہے تھے اور متو مستری تو جیسے سچ مچ آلہا کی لڑائی میں شریک ہوں۔ لالو میاں پر بھی اس گانے کا اثر ہوا۔ اس وقت انھوں نے یہ ارادہ کیا کہ میں بھی اپنے گڑا نسے سے جھاؤ

کا ایک ایک پیڑ کاٹ ڈالوں گا۔ اور پھر اپنی ڈونگی کو لے جاؤں گا۔ وہاں سے اکڑتے ہوئے آئے اور گڑ انا اٹھا چلنے ہی والے تھے کہ اپنا چھوٹا سا پلنگ دیکھ کر سب کچھ بھول گئے۔ پلنگ پر ٹھاٹ سے لیٹ گئے۔ پھر کیا تھا۔ لیٹے لیٹے سوچنے لگے کیا اچھا ہوتا اگر اسی پلنگ پہ بادبان لگا کر میں ندی میں سفر کرتا اور جہاں جہاں جانا گھومتا پھرتا۔ اس ندی سے گنگا جی پہنچتا اور گنگا ہی گنگا بنارس۔ الہ آباد۔ گیا۔ کلکتہ ....

سوچتے سوچتے پھر وہی ڈونگی کا خیال آیا۔ پلنگ پر سے اتر سیدھے میدان میں پہنچے جہاں ڈونگی رکی پڑی تھی۔ موتی ان کے ساتھ ساتھ تھا، وہ بھی پیچھے پیچھے بھاگا۔

ڈونگی کے پاس پہنچکر اب سوچ رہے ہیں کہ اسے کس طرح پانی میں اتاروں۔ ہاتھ سے ڈھکیلوں تو کیسے ڈھکیلوں۔ بانس کام نہیں دیتے۔ رسی کھینچوں تو ڈونگی پہلے ہی کیا پھسلی تھی جو اب پھسلے گی۔ موتی کی گردن میں جو اڈال کر اس کو کھنچواؤں تو یہ بے چارا اتنا کہاں کا طاقت در کہ ..... ایک ہی زور میں چیں بول دے گا .... یہ کام تو بس بیل ہی کر سکتا ہے لیکن بیل تو سب گاڑی لے لے کر چلے گئے اور ڈونگی کو جلد سے جلد ندی میں اتارنا ہے۔ اگر یہ ہو جائے کہ یہاں مجھے کوئی نہ دیکھے اور جب میں ڈونگی کو ندی میں اتار کر اس کو کھینے لگوں اس وقت سب لوگ دیکھیں تو بڑا مزا آئے: سب لوگ کہیں گے لالو بہت ہوشیار ہے۔ دیکھو کیسا مزے سے ڈونگی میں بیٹھا کھے رہا ہے۔ ادھر تو کوئی آتا نہیں۔ آئے گا تو وہی بدمعاش راجو ہی آئے گا۔ بس اب آتا ہی ہوگا۔ اس نے مجھے یہاں جھک مارتے دیکھ لیا تو سب کھیل بگڑ جائے گا۔ چلو مہری کو بلا لاؤں، وہ اور میں ڈھکیل کر اسے ندی میں اتار دیں۔ یہ سوچ کر لالو دوڑا ہوا گیا۔ مہری سے پوری بات بھی نہ کہنے پایا تھا کہ وہ بگڑ اٹھی۔ "بڑے آئے ڈونگی بنانے والے۔ جا، الگ کھیل، مجھے فرصت نہیں" لالو میاں اپنا سا منھ لئے ہوئے وہاں سے الٹے پاؤں لوٹے۔ تھوڑی دیر سوچ کر بولے

"ارے ہاں! وہ بھگوا! اسے لائیں پکڑ کے بس! بس!! کام بن گیا" یہ کہہ لالو میاں دوڑے ہوئے ایکھ کے کھیت پر گئے۔ بھگوا اپنے کھیت میں کام کر رہا تھا۔ اسے آواز دی۔ "بھگوا! بھگوا! بھیا۔ ذرا میرا ایک کام کر دو۔ میری ڈونگی پانی میں اتار دو" بھگوا چاہتا تھا کہ لالو کے ساتھ کام کرے لیکن سن کر چپ ہو رہا اور پاس کے آم کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں خاں صاحب ایک موٹا سا ڈنڈا لئے کھڑے تھے۔ لالو ان سے ڈرتا بھی تھا اور ستاتا بھی تھا۔ چپکا ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں جا کر شرارت جو سوجھی تو ایک پتھر اٹھا کر خاں صاحب کی طرف زور سے پھینکا۔ پتھر ان کے سامنے دھم سے گرا۔ خاں صاحب چونک پڑے۔ لالو وہاں سے گھر کی طرف بھاگا۔ راستے میں دیکھا کہ گاڑی بان کا لڑکا کلوا گاڑی کو روکے کھڑا ہے۔ لالو کی باچھیں کھل گئیں۔ گاڑی پر سامان لدا تھا اور کلوا ہانکنے ہی والا تھا کہ لالو میاں نے بڑھ کر کہا "کلوا، روک گاڑی اور بیل کو ذرا میری ڈونگی میں جوت دے"۔

کلوا ایک مرتبہ لالو ہی کا کام کرنے کی وجہ سے ان کے پتاجی (باپ) کے ہاتھوں پٹ چکا تھا۔ اب جو انھوں نے اس کو بیل ڈونگی میں جوتنے کے لئے کہا تو وہ گھبرایا۔ اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ لالو نے پھر ڈانٹا "کھڑا منھ کیا دیکھتا ہے۔ لے چل بیل"۔

کلوا:- "میں تو نہیں، تمہارے پتاجی ماریں گے"۔

لالو:- "میں کہتا ہوں لے چل! نہیں لے چلیگا تو مار ڈالوں گا۔ نہیں تو تجھے دو آنے پیسے دوں گا۔ سمجھا بے!"

اب تو کلوا بھی پگھلا۔ بیل کو گاڑی میں سے کھول لالو کے ساتھ ہو لیا۔ لالو اچھلتا کودتا ڈونگی کے پاس گیا۔ بیل کو ڈونگی میں جوت اسے ہنکا دیا اور ڈونگی کو گھاٹ پر لے گیا۔ جہاں زمین ڈھالو تھی۔ وہاں بیل کھول کر دونوں نے ڈونگی کو پانی میں اتارا۔ لالو نے کہا "تو رسی کو پکڑے رہ اور میں ڈونگی میں اترتا ہوں"۔

اس نے ایک پاؤں ڈونگی میں رکھا ہی تھا کہ راجو کے پاؤں کی آہٹ سنائی

دی۔ لالو نے بے صبری سے کہا "ڈونگی کو ڈھکیل"۔ کلوا نے ڈونگی کو دھکا دیا اور ڈونگی پانی میں تیرنے لگی۔ اتنے میں راجو آپہنچا۔ لالو ڈونگی پر سوار ہوگیا تو تھوڑی دور

تک تو ڈونگی بڑے مزے میں گئی۔ لیکن نیچے سے کناروں کے رستے پانی آنا شروع ہوا

کلوا۔ چلایا۔ "ارے بابو! ڈوب جاؤ گے"۔
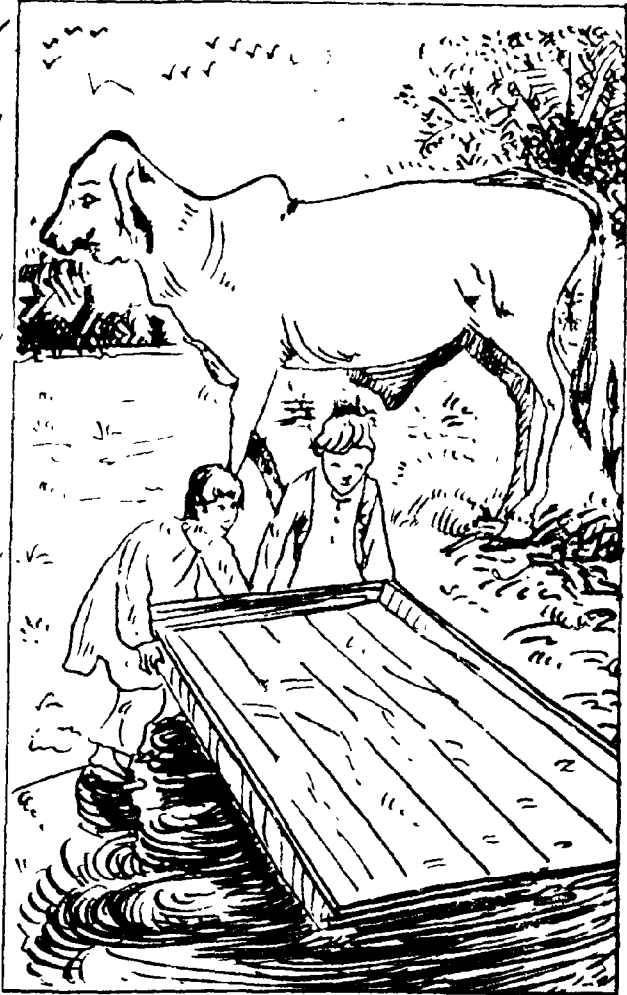
لالو:۔ "ہشت ...... "

راجو:۔ "دیکھو لالو۔ مجھے بھی آنے دو۔ نہیں تو میں یہیں سے ڈونگی میں کود پڑوں گا"

لالو:۔ (مکا دکھا کر) "کودو تو ذرا۔ مارے گھونسوں کے پیٹھ لال کردوں گا۔ کودو!"

لالو نے اپنے خیال میں ڈونگی کے سب سوراخ بند کردئے تھے۔ لیکن اب بھی جہاں تہاں باریک باریک سوراخ رہ گئے تھے۔ لالو تھوڑی دور گیا تھا کہ ڈونگی پانی سے بھرنے لگی۔ وہ ڈونگی کے ایک طرف آگیا جہاں پانی ابھی نہیں بھرا تھا۔ لیکن اتنے میں ڈونگی پانی سے بھر گئی اور لالو کے جوتے پانی سے شرابور ہوگئے۔ لالو نے چلا کر کہا ارے! مجھے اپنی طرف کھینچ"۔

اور یہ کہہ کر وہ وہیں سے کود پڑا۔ وہ تو خیریت
یہ ہوئی کہ اس کا ایک پاؤں زمین پر آکر
پڑا، نہیں تو لالو میاں پانی کے اندر ہوتے۔
"کم بخت"۔ ایک بھاری آواز سنائی دی۔
اور کلوا نے دیکھا کہ پیچھے سے کسی نے اس
کی گردن زور سے پکڑ لی ہے۔ خاں صاحب
کلوا کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آخر اسے
پا ہی گئے۔ ایک ہاتھ سے بیل کی رسّی پکڑی
اور دوسرے سے کلوا کی گردن۔
"نمک حرام! کام چھوڑ کر یہاں گلچھرے
اڑانے چلا آیا؟ دیکھ آج تجھے کیسی سزا دیتا
ہوں!"

راجو اور لالو نے پہلے تو ڈونگی کو اٹھا
کر اسے خوب ہلایا تاکہ سارا پانی نتھر جائے،
اس کے بعد سوچنے لگے کہ یہ سوراخ کیسے بند
ہوں۔ راجو نے کہا "یہ لو میرا انگوچھا۔ اس
سے بند کر دو۔" لالو نے اسے پھاڑ کر
سوراخوں میں بھرا۔ لیکن یہ بھی کافی نہ ہوا
تو اپنا رومال بھی پھاڑ کر بھر دیا۔ اس پر بھی
چند سوراخ رہ گئے۔ لالو ادھر ادھر دوڑا
تھا کہ کوئی چیز ملے تو کام چلے۔ کہنے لگا
اس طرح کام نہیں بنے گا۔ دیکھو، کائی کتنی گھنی
جمی ہوئی ہے۔ اس سے سوراخ بند ہو جائیں گے
ہے نا؟" دوڑا ہوا گیا اور ایک جگہ سے بہت
ساری کائی سمیٹ کر لایا اور ایک ایک
سوراخ دیکھ دیکھ کر بند کر دئے۔
"دیکھو اب کیسی چلتی ہے۔"
راجو: "میں بھی آؤں۔"
لالو: "ٹھہرو تو سہی۔ دیکھ لینے دو کہ اب بھی
سوراخ سے پانی آتا ہے یا نہیں۔"
اس نے اپنا ایک پاؤں ڈونگی میں رکھا
اور اسے خوب زور سے مچکایا۔ دیکھا تو اب
بھی کہیں کہیں سے پانی آرہا تھا۔ پھر ڈونگی نکال
لی۔ اور اس مرتبہ سوچا کہ اگر اس کے کناروں پر
موم پگھلا کر اس کا لیپ کر دیا جائے تو پانی آنا
بند ہو جائے گا۔ انھیں دنوں ایک بہت پرانا
شہد کا چھتا اتارا گیا تھا۔ ڈھیروں موم رکھا ہوا
تھا۔ دم کی دم میں لالو گیا اور موم اور آگ لے کر

آن پہنچا۔ موم پگھلا کر خوب موٹی سی تہ ڈونگی کے کنارے پر چڑھا دی گئی۔

اب ڈونگی پھر اتاری گئی۔ لالو اب کی بار سوار ہوا تو ہاتھ میں ایک لمبا سا بانس بھی لے لیا تاکہ اس کے سہارے سے سیدھا کھڑا رہے۔ اس نے پہلے محسوس کیا تھا کہ بغیر کسی سہارے کے ڈونگی پر کھڑا رہنا مشکل

ہے۔ راجو نے اسے دھکا دیا اور لالو بانس کے سہارے سے ڈونگی پر کھڑا ہو گیا۔ اب تو ڈونگی اچھی خاصی کشتی ہو گئی۔ نہ کہیں سے پانی آتا ہے نہ کہیں سے ڈگمگاتی ہے۔ لالو خوشی سے پھول گیا۔ ڈونگی پر سوار ہوتے وقت اپنی ٹوپی بھی بھول گیا۔ دھوپ بہت تیز تھی، ہوا بھی بہت گرم اور تیز تھی۔ لیکن لالو کو کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ ڈونگی میں سوار ہو کر ندی میں سفر کرنے کا شوق تھا، وہ پورا ہو گیا۔ وہ اپنی کامیابی کی خوشی میں ایسا کھویا ہوا اور مست تھا کہ ہاتھ بھی (موم سے لت پت ہو گئے تھے) دھونا بھول گیا۔ جوتے پانی سے تر بتر ہیں، اس کی بھی کوئی فکر نہیں ہے۔ بال ہوا میں بکھرے ہوئے ہیں، اس کی بلا سے۔

لالو نے اب ڈونگی کھینی شروع کی۔ ایک تو ہوا دوسرے بانس کا سہارا گھاٹ سے وہ کھیتا ہوا ڈونگی کو وہاں

لایا جہاں اس نے جھونپڑا بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ وہاں سے بڑھئی خانے کے سامنے راستے میں کوئی رکاوٹ ہوتی تو وہ اپنی "ڈانڈ" سے ڈونگی کا رخ پھیر دیتا۔

شام تھی۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ بڑھئی خانہ بند ہو چکا تھا، لیکن لالو کا وہاں کہیں پتہ نہیں۔ مہری دوڑی ہوئی گھاٹ پر آئی۔ دور سے دیکھا کہ لالو میاں ڈونگی پر سوار مزے سے کھڑے ندی کی سیر کر رہے ہیں۔ اس نے وہیں سے آواز دی اور ٹوپی اٹھا کر ان کے پاس پہنچی۔ لالو میاں اور راجو ندی میں ایک درخت کی شاخوں سے الجھے ہوئے تھے۔ درخت بہت گھنا تھا اور اس کی شاخیں ندی میں ڈوب گئی تھیں۔ ڈونگی یہاں آ کر رک گئی تھی۔ راجو شاخوں کو پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور لالو اپنی لاٹھی سے انھیں توڑنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شاخیں نہ ٹوٹیں۔ مہری بھی سر پکڑی چلا رہی تھی۔ مجبوراً لالو میاں نے اپنا سفر ملتوی کیا اور ڈونگی کو رسی سے اسی درخت میں باندھ دیا اور مہری کے ساتھ چلے۔

رستے میں کلوا دکھائی دیا۔ اپنا وعدہ یاد آیا۔ دوڑ کر اس کے پاس گئے، "لے یہ چار آنے پیسے ہیں!"

چار آنے!! ہئے!!

تجیفی

ٹکٹوں کی غیر فطری غلطیاں

از عبدالرشید صاحب صدیقی - میرٹھی

ٹکٹوں میں غلطیاں تو ہو ہی جاتی ہیں اکثر غلط قیمت درج ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض غلطیاں نہایت دلچسپ ہوتی ہیں۔ مثلاً جہاز کی جھنڈیوں کا ہوا کے جھونکے کے خلاف لہرانا۔ ایسے جانوروں کی تصویریں دکھانا جو موجود ہی نہیں ہوتے یا (1 CENT) کی بجائے (1 CENTS) لکھ دینا۔ اس قسم کی بعض غلطیاں ہم تمہاری دلچسپی کے لئے لکھتے ہیں۔
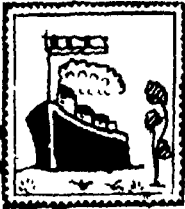
برموڈ کے ۱۹۰۵ء کے ایک فارذنگ کے ٹکٹ پر ٹلسن کا مجسمہ دکھایا ہے، مجسمے کے پیچھے کچھ درختوں کی تصویر ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ مجسمہ ایک صاف زمین پر ہے۔ اس کے چاروں طرف کوئی درخت نہیں ہے۔

۱۹۳۰ء میں بلجیم میں ہوائی ڈاک کے بڑے خوب صورت ٹکٹ چلے۔ سب ٹکٹ ٹھیک تھے مگر ایک میں بلجیم کے ہوائی جہاز کی جگہ اٹلی کا ہوائی جہاز بنا دیا تھا۔

جنگ عظیم کے زمانے میں ترکی کے ٹکٹوں پر مصر کے اہرام کی تصویر بنائی گئی تھی جس سے ترکوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں ترکی حکومت نے مصری اہرام اپنے قبضے میں تو نہیں کر لئے۔ اسی طرح ترکی کے

ٹکٹوں پر چاند اور ستارہ بنایا گیا تھا مگر غلطی سے چھ گوشوں والا ستارہ بن گیا۔ یہ ستارہ عیسائی استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ستارے میں پانچ گوشے ہوتے ہیں۔

(TURR & CAISCOS ISLAND) کے ایک ٹکٹ میں ایک جہاز کو نمک لادتے ہوئے دکھایا ہے۔ اگر تم اس ٹکٹ کو غور سے آتشی آئینے سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جہاز کا تختہ بالکل جزیرے کے کنارے سے لگا ہوا ہے حالانکہ جزیرے کے قریب سمندر اتنا گہرا نہیں ہے کہ اتنا بڑا جہاز اس کے کنارے پر آلگے، اسی وجہ سے کشتیوں کے ذریعے مال جہاز میں لے جایا جاتا ہے۔

(ST: KITTS & NAVIS) کے ایک ٹکٹ میں کولمبس کو دوربین سے دیکھتے ہوئے دکھایا ہے۔ دوربین کا نام ہم صرف آج کل سنتے ہیں۔ اُس زمانے میں دوربین کا نام بھی نہیں تھا۔

چین میں [illegible]ء میں مشہور رہنما سن یاٹ سین کی یاد میں ٹکٹ چلے۔ ان پر چینی گورنمنٹ کا نشان یعنی سورج بنا ہوا تھا۔ یہ نشان غلط تھا۔ کیوں کہ وہ تو اس حکومت کے خلاف تھا اور یہ اسی حکومت کا نشان تھا جو اُسے باغی سمجھتی تھی۔ بعد میں ٹکٹ دوبارہ چھاپا گیا۔

جمیکا کے ایک پنیس کے ٹکٹ میں دو غلطیاں ہیں۔ ایک تو اس پر ڈاک اور محصول نہیں لکھا ہے دوسرے وہاں کے باشندے کو (CASSAVA) تیار کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ لیکن تصویر کے نیچے (MAKING CASSAVA) لکھا ہے۔ حالانکہ کساوا اصل میں ایک درخت کی جڑ ہوتی ہے جس سے کھانا تیار ہوتا ہے۔ وہ بنائی نہیں جاتی بلکہ صاف کرکے کھانے

کے لائق تیار کی جاتی ہے اس لئے اس میں (PREPARING CASSAVA) ہونا چاہیئے۔ جب دو بارہ ٹکٹ چھپے تو پہلی غلطی کی تو اصلاح ہوگئی اور (POSTAGE ۷ REVENUE) لکھ دیا گیا لیکن دوسری غلطی بدستور رہی۔

کبھی کبھی ٹکٹ پر غلط تاریخی واقعہ درج ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر پیرو کا سنہ ۱۹۳۰ء کا ٹکٹ جو چھٹی پان امریکن چائلڈ کانگریس کے موقع پر چلا تھا۔ اس پر لفظ (SEPTIMO) لکھا تھا جس کے معنی سات کے ہیں حالانکہ وہ چھٹی سال گرہ کا موقع تھا۔ افغانستان کے ٹکٹوں پر اسی قسم کی غلطی ہوئی، یہ ٹکٹ خاص طور پر ملک کی آزادی کی چوتھی سال گرہ کے موقع پر چلے۔ لیکن ان پر پانچویں سال گرہ لکھا ہوا تھا۔ یہ غلطی متواتر تین سال تک رہی، پانچویں اور چھٹی سال گرہ کے ٹکٹوں پر چھٹی اور ساتویں لکھا گیا۔

اگر ہم اپنی البم غور سے آتشی آئینے کے ذریعے دیکھیں تو ہمیں اس قسم کی بہت کافی دلچسپ تاریخی غلطیاں معلوم ہوں گی۔ اپنی معلومات بڑھانے کے لئے ان سب کو ایک صفحے پر لکھتے رہنا چاہیئے۔

جناب سجاد حسین صاحب آرٹسٹ
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

تمھارے پرچے میں فوٹوگرافی کا ماہوار مقابلہ کوئی ڈیڑھ سال سے ہورہا ہے۔ اس عرصے میں تمھیں اس مشغلے سے اچھی خاصی دلچسپی ہوگئی ہے۔ اور تم ایڈیٹر صاحب کے پاس اچھی اچھی تصویریں اپنے کیمرے سے کھینچ کر بھیجنے لگے ہو آج میں فوٹوگرافی کے بارے میں کچھ ابتدائی باتیں بتاؤں گا جو تمھارے لئے اور اُن شوقین بچوں کے لئے بہت مفید ہوں گی۔ جنھوں نے ابھی ابھی اس مشغلے کو اختیار کیا ہے۔
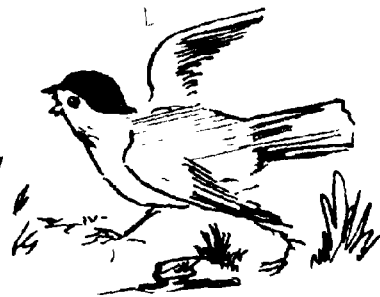
یہ کیمرہ جس کی تصویر سامنے بنی ہوئی ہے تمھیں پہلے اس سے فوٹو لینا سیکھنا چاہیئے۔ اس کی ترکیب آسان ہے جب اس سے تمھیں تصویر لینا آجائے گی تو دوسرے کیمروں کا حال بتائیں گے۔
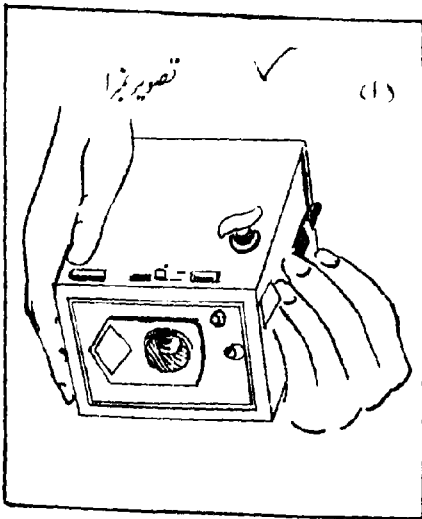
(فوٹوگراف) انگریزی زبان کا ایک لفظ ہے۔ اس کے معنٰی ہیں "روشنی کی مدد

سے لکھنا"۔ پرانے زمانے میں جبکہ فوٹو گرافی نہیں شروع ہوئی تھی لوگ پرچھائیں کی مدد سے پنسل سے نشان لگاکر خاکہ بناتے تھے۔ جس کی تصویر بنانی ہوتی تھی اُسے کسی جگہ اندھیرے میں بٹھاتے تھے۔ اس کے ایک طرف لیمپ یا چراغ رکھتے تھے۔ دوسری طرف ایک تختے پر کاغذ لگا کر اس پر عکس ڈالتے تھے اور خاکہ تیار کرلیتے تھے۔ آخر میں اس خاکے میں سیاہ رنگ بھر دیا جاتا تھا۔ تصویر میں آدمی کے چہرے کا ایک ہی رُخ ہوتا تھا اس نقشے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ تصویر ۲

رفتہ رفتہ کچھ دوائیں ایسی معلوم ہوئیں جن پر روشنی کا اثر ہوتا تھا۔ اُن ہی دواؤں کی مدد سے فوٹو گرافی شروع ہوئی۔ ولایت میں لوگوں نے ان دواؤں سے تجربے حاصل کرنے شروع کئے۔ اِن دواؤں کو کسی چیز پر اندھیرے میں لگانے سے اِن کے رنگ میں کوئی فرق نہیں ہوتا
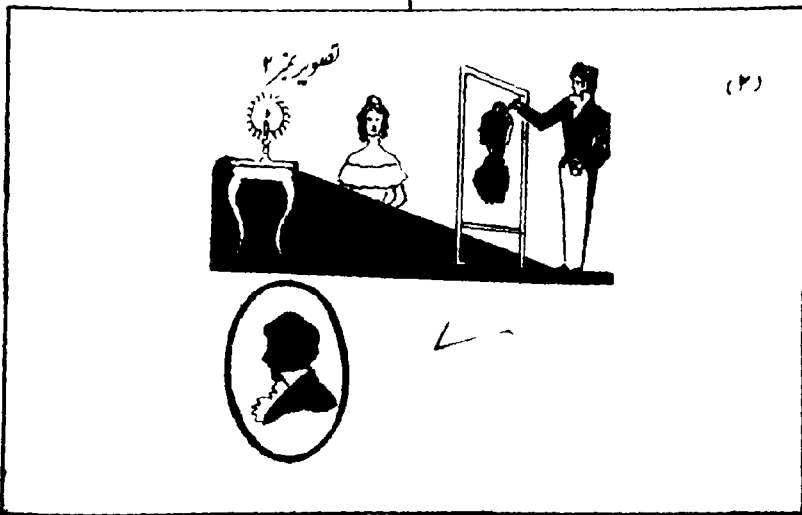
تھا۔ روشنی میں لانے پر ان کا رنگ کالا
ہو جاتا تھا۔ یہ بات معلوم ہو جانے پر لوگوں
نے ان دواؤں کو معمولی سفید کاغذ پر
اندھیرے میں بطور ہلکے لیپ کے لگانا
شروع کیا۔ کاغذ کو اندھیرے ہی میں
سکھا کر کوئی چپٹی چیز جیسے درخت کی پتی
یا لیس یا پر وغیرہ اس پر رکھ دیتے تھے۔
اس کاغذ کو جب کچھ دیر روشنی میں رکھتے
تھے تو اس کا وہ حصہ جو کسی چیز سے ڈھکا
نہ ہوتا تھا بالکل کالا ہو جاتا تھا۔ باقی حصہ
جو اس چپٹی چیز سے ڈھکا ہوتا تھا سفید رہتا
تھا۔ اب اس سفید خاکے یا تصویر کو قائم
رکھنے کے لئے کاغذ کو پھر اندھیرے میں
لے جاکر اور دوسری دواؤں میں کچھ
دیر کے لئے ڈبو دیتے تھے، اس طرح سے
کاغذ کا سفید حصہ یا خاکہ مستقل طور پر قائم
ہو جاتا تھا۔ مگر اس ترکیب سے صرف

چپٹی چیزوں کا خاکہ ہی بنایا جا سکتا تھا۔
چنانچہ لوگوں نے یہ کوشش کی کہ ہر ایک
چیز کی تصویر دور سے کھینچی جاسکے۔ اور یہ
کہ اس چیز کا صرف خاکہ ہی نہ ہو
بلکہ اس کے درمیانی خط و خال، بناوٹ
اور جسمانی اتار چڑھاؤ بھی ظاہر کئے جاسکیں
چنانچہ شروع میں انھوں نے صندوقچے
کی سی شکل کی ایک چوکھونٹی چیز بنائی۔ اس
کے بنانے میں انھوں نے یہ احتیاط کی کہ کسی
طرف سے جب تک وہ نہ چاہیں باہر سے
اس کے اندر روشنی نہ جاسکے۔ اور جب وہ چاہیں
تو صرف ایک طرف سے روشنی جاسکے۔ انھوں نے
اس صندوقچے کے ایک پہلو کے بیچ میں ایک
چھوٹا سوراخ رکھا (دیکھئے تصویر نمبر۲) اب جو چیز یا
چیزیں اس سوراخ کے سامنے ہوں گی، ان سب
کا عکس سوراخ کے سامنے والے صندوقچے کی
دیوار پر الٹا پڑے گا۔ اگر اس دیوار پر دوا لگا ہوا

کاغذ لگا دیا جائے تو یہ عکس اس کاغذ پر پڑے گا اور چیزوں کی تصویر اس کاغذ پر اتر آئے گی۔

اس طریقے سے اس صندوقچے دیا جس کو انگریزی زبان میں کیمرہ کہتے ہیں کی مدد سے تصویریں تو کھینچی جا سکتی تھیں نہیں کھینچی تھی ۔ لوگوں نے لگاتار کوششوں سے کیمرے کی شکل میں تبدیلیاں کیں ۔ اور دوسرے پرزے ایجاد کئے جن کی مدد سے تصویر لینے میں آسانی ہونے لگی۔ نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلنے لگا ۔ اول تو انھوں نے

مگر چونکہ سوراخ چھوٹا ہوتا تھا اس وجہ سے اس کو دیر تک کھلا رکھنے کی ضرورت ہوتی تھی ۔ دوسری خرابی یہ ہوتی تھی کہ اس سوراخ سے روشنی بھی ضرورت سے زیادہ اندر پہنچ جاتی تھی ۔ تصویر صاف
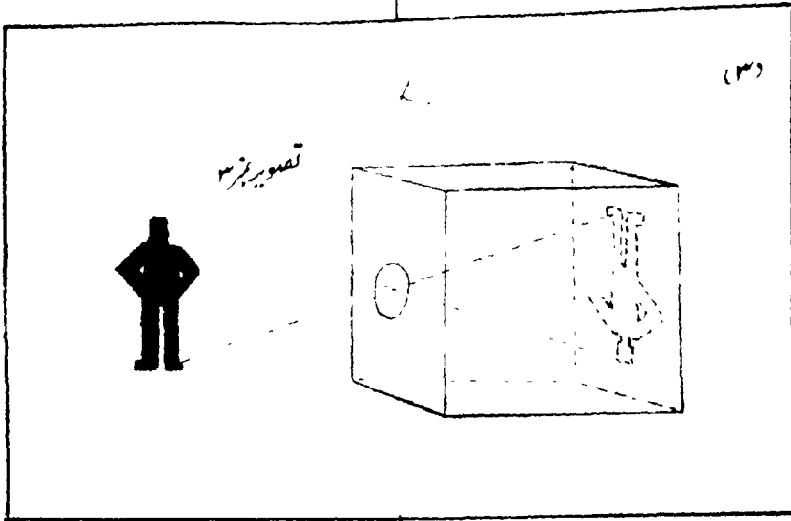
کیمرے کے سوراخ میں ایک خاص قسم کا (محدب) گول شیشہ جس کو انگریزی زبان میں "لینس" کہتے ہیں، لگایا ۔ اس کی مدد سے روشنی کی کرنیں کیمرے کی سامنے کی دیوار پر صفائی کے ساتھ پڑتی ہیں ۔ اور فوٹو

لینے میں وقت بھی کم صرف ہوتا ہے
دوسرے انھوں نے ایک آلہ ایجاد کیا
جو لینس کے پیچھے لگایا جاتا ہے۔ روشنی
کی کمی یا زیادتی کے لحاظ سے اس آلے کی
مدد سے سوراخ کو گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا
ہے۔ اس کو انگریزی میں "شٹر" کہتے ہیں۔
بعض قیمتی کیمروں میں ایسے شٹر لگے ہوتے
ہیں جن کی مدد سے سکنڈ کے ہزارویں حصے
میں تیز سے تیز حرکت کرنے والی چیز
کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔ تیسرے
ان ہی ماہروں نے دواؤں کو شیشوں کے
ٹکڑوں پر لگا کر کئی قسم کی پلیٹیں اور ان کے
لئے لوہے کے خانے بنائے اور گٹا پارچے
کے لانبے ٹکڑوں پر دوائیں لگا کر "فلمس"
تیار کیں۔ اور کیمرے کے اس پہلو پر
جو لینس کے مقابل ہوتا ہے لوہے کے
کھانچے بنائے تاکہ پلیٹس اور فلمس کے خانے
ان کھانچوں میں لگائے جا سکیں ؎
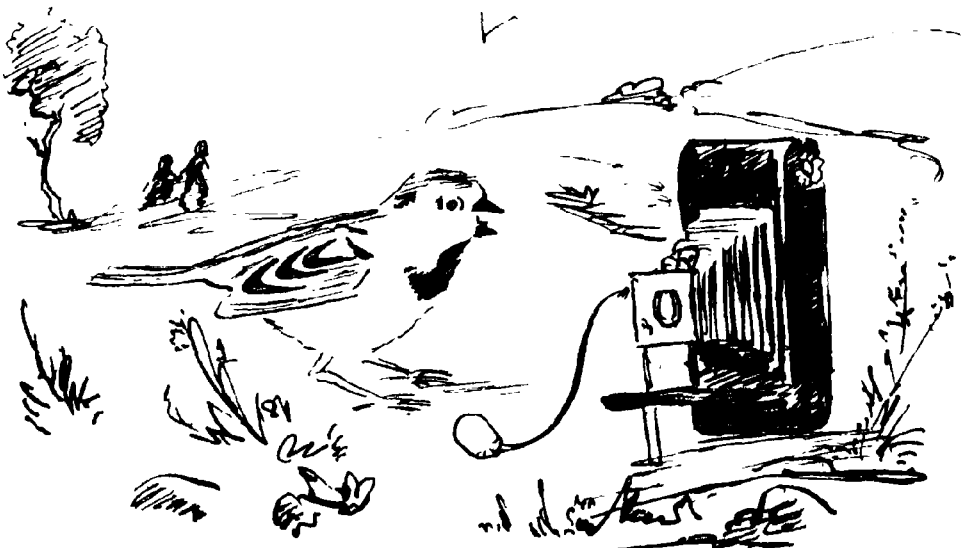
ہاتھ ملا کر گھیرا باندھیں، مل کر چکر کھائیں

چکر کھائیں چکر کھائیں، آؤ جی بہلائیں

آؤ

جی بہلائیں

ہاں ہاں آؤ جی بہلائیں

پہلے سیدھا ہاتھ اُٹھائیں ، الٹا ہاتھ گرائیں
الٹا ہاتھ اُٹھے پھر اوپر ، سیدھا ہاتھ گرائیں
سیدھا ہاتھ گرائیں
ہاں ہاں سیدھا ہاتھ گرائیں

پل بھر ٹھیریں چھم چھم کر کے آگے کو بڑھ جائیں
آگے جائیں پیچھے آئیں ، کھیل یہ ہم دکھلائیں
کھیل یہ ہم دکھلائیں
ہاں ہاں کھیل یہ ہم دکھلائیں

بیٹھ کے اُٹھیں اُٹھ کر بیٹھیں، بیٹھ کے پھر اُٹھ جائیں

ناچیں گائیں شور مچائیں، دل کی کلی کِھلائیں

دل کی کلی کِھلائیں

ہاں ہاں دل کی کلی کِھلائیں

ڈالی ڈالی پھول چُنیں، پھولوں کا ڈھیر لگائیں

پھولوں کے پھر ہار بنا کر، سکھیوں کو پہنائیں

سکھیوں کو پہنائیں

ہاں ہاں سکھیوں کو پہنائیں

ہندوستان کے تقریباً ہر صوبے میں کئی قسم کی مکھیاں شہد جمع کرتی ہیں۔ یہ عموماً پہاڑوں پر لٹکی ہوئی یا شہتیر کی طرح کے چھتے پر بیٹھی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ ان چھتوں سے شہد اور موم مختلف طریقوں سے نکالا جاتا ہے۔ پہاڑی مرد اکثر ان مکھیوں کو پالتے ہیں۔ اور دشمن کے چھیڑنے کے ساتھ انہیں بھی بند کر دیتے ہیں۔ بڑی مکھی سے کبھی کبھی اذیت پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ ڈنک کے زہریلے اثر سے کبھی انسان اور جانور ہلاک بھی ہو جاتے ہیں چونکہ ایک بڑے چھتے میں تقریباً بیس ہزار مکھیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کا مقابلہ ایک بڑی فوج بھی مشکل سے کر سکتی ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ شہد کی مکھیاں گھریلو مکھی کی طرح انسان کی دشمن ہیں۔ اس لئے ان کو نیست و نابود کرنا دور اندیشی ہے۔

گھریلو مکھی سے بہت سخت اور مہلک بیماریاں انسان تک پہنچتی اور پھیلتی ہیں۔ ان بیماریوں سے لاکھوں جانیں ایک سال میں تلف یا بیکار ہو جاتی ہیں۔ اور شہد کی مکھی سے سال میں شاید دس بیس جانیں اتفاقیہ ضائع ہوتی ہوں۔ برخلاف اس کے اگر شہد کی مکھی کی عادتوں کو سمجھ لیا جائے تو نقصان کا اندیشہ بہت کم رہ جاتا ہے بلکہ ان کے نظام، صفائی، جانفشانی، محنت، دوستوں کے ساتھ بھلائی، جماعتی اتفاق اور یکجہتی ایسی چیزیں ہیں جن سے ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے اور یہ معلوم کرکے تو خدا کی حکمت پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ مکھیاں اپنی نسل ہی کی ترقی کی کوشش میں منہمک نہیں ہیں بلکہ ان کی بدولت درختوں میں بھی پھل پھول آتے ہیں۔

اب شہد کی مکھیوں کی تین قسموں کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے

۱۔ بڑی مکھی

یہ مکھی پہاڑ کی چٹانوں، درخت کی شاخوں یا مکان کے اونچے دروں، محرابوں یا چھجوں میں شکل کی صورت کا چھتا بناتی ہیں۔ ایک طرف چھتا تیار ہوتا جاتا ہے اور دوسری طرف ان کی ملکہ جو کسی قدر بڑی ہوتی ہے۔ ہر گھر میں انڈا دیتی جاتی ہے۔ ہر

خانے میں — انڈے کے ساتھ تھوڑی سی غذا رکھ کر | فصل میں زیادہ جمع ہوسکا تو چھتے کے اوپر کے کونے

بڑی مکھی

اسے موم کی تہہ لگا کر بند کر دیا جاتا ہے۔ اگر شہد اچھی | میں علیحدہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ چھتا لگنے کے بیس پچیس

نوٹ صفحہ ۴۸۵ لہ اپنے بچوں کی پرورش میں یہ مکھیاں ہر قسم کا ایثار دکھاتی ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے ان کے لئے مکانات ایک ہی پیمانے کے اپنے لعاب دہن سے (یہ موم ہے) بناتی ہیں۔ اس کے بعد جو غذا لاتی ہیں اس کا زیادہ حصہ بچوں کے لئے وقف ہوتا ہے۔ انڈوں اور بچوں کی گرمی پروں سے بنکھا جھل کر اندر سردی اپنے جسم کی گرمی سے کم کرتی رہتی ہیں

لہ ۔ غذا جہاں بھی میسر ہو، ڈھونڈھ کر جمع کرتی ہیں۔ کبھی کبھی دو تین میل تک اسی کی تلاش میں جانا پڑتا ہے۔

لہ ۔ شہد کی مکھی کے ڈنک کی نوک اینے (کانٹے) تیر کی سی ہوتی ہے۔ جو دوسرے کے جسم کے اندر گھس جانے پر مکھی کی کوشش سے نہیں نکل سکتی۔ چنانچہ اس کوشش سے مکھی کے اندرونی جسمانی اجزا باہر نکل آتے ہیں۔ اور اس صدمے سے وہ جلد مر جاتی ہے۔ خیال رہے کہ ڈنک کی نوک کے قریب ایک چھوٹی سی تھیلی ہوتی ہے جس میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ اگر ڈنک کو احتیاط سے دبا کر آہستہ سے اوپر کھینچ لیا جائے تو جسم میں زہر پھیلنے نہیں پاتا اور اگر یہ تھیلی پھوٹ کر کرب و سوزش پیدا کرے۔ تو امونیا یا ہلکا چونے کا پانی یا اپنے دہن کا لعاب ہی لگا دیا جائے تو کرب و سوزش میں کمی ہو جاتی ہے۔

لہ ۔ اگر مکھیوں کو ستایا نہ جائے۔ بلکہ احتیاط سے شہد نکالا جائے تو ایک چھتے سے کئی بار شہد اور موم نکالا جا سکتا ہے۔

لہ ۔ بہت سے درخت جب پھولتے ہیں تو نر درخت کے پھول وہ مادے جو مادین درخت کے لئے ضروری ہیں۔ ایک باریک رنگین برادے کی طرح پیدا کرتے ہیں۔ اس کو "پالن" کہتے ہیں۔ چنانچہ جب مکھیاں ان پھولوں پر بیٹھ کر شہد جمع کرنے میں مصروف ہوتی ہیں تو ان کی ٹانگوں اور پروں پر اس برادے کے ذرے لپٹ جاتے ہیں۔ مکھی ان ذروں کو ایک پھول سے دوسرے پھول تک پہنچا کر درختوں کی اصل لانے میں مدد کرتی ہے۔ ان معلومات کا فائدہ بہت سے باغبان اٹھاتے ہیں۔ اور مکھیاں پال کر اپنی فصلوں کو ترقی دیتے ہیں۔

روز بعد اگر اس کونے کا تھوڑا حصہ چھوڑ کر احتیاط سے کاٹ لیا جائے۔ تو مکھیاں اپنے بچوں پر پھر آ بیٹھتی ہیں۔ اور کام شروع کر دیتی ہیں۔ اس طرح میں پچیس دن کے توقف سے دو تین بار شہد نکالا جا سکتا ہے۔ اس مکھی کا شہد ہلکے رنگ کا ہوتا ہے اور سال میں چار پانچ سیر تک مل سکتا ہے۔ یہ مکھی پالی نہیں جا سکتی کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے جلد غصہ میں بھر جاتی ہے۔ اور بدلہ لینے کے لئے تیار ہو جاتی ہے۔ جنگلوں کے محکمے شہد کا ٹھیکہ

کی قیمت صرف ایک روپیہ سیر ہی رکھی جائے تو یہ ایک سو ساٹھ روپے کا ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شہد کی مکھی کو اگر پالا جائے۔ تو یہ کس قدر آسان اور بلا خرچ آمدنی کا ذریعہ ہے۔

۲۔ چھوٹی مکھی

یہ اپنا چھتا بٹوے کے برابر درختوں کی شاخوں پر بناتی ہے۔ کیوں کہ یہ بہت ہی کم شہد جمع کرتی ہے اس لئے اس پر زیادہ تحقیقات نہیں کی گئی۔ اس کے چھتے سے

دے کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ٹھیکہ لینے والوں کو بہت زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ مثلاً پارسال ایک بڑے پیپل پر تقریباً پچیس چھتے دیکھے گئے۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ شہد نکال رہے ہیں معلوم ہوا کہ مالک آراضی نے تیس روپیہ لے کر اُن کو شہد نکالنے کی اجازت دی ہے۔ جب وہ شہد نکال چکے تو سنا گیا کہ ان لوگوں نے تقریباً چار من شہد نکالا۔ اور اس کے ساتھ بہت سا موم بھی ملا۔ اب اگر شہد

ایک بار میں پاؤ بھر شہد مل سکتا ہے۔ اس مکھی کے بھی ڈنک ہوتے ہیں۔ مگر اس کے ڈنک مارنے سے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ اس مکھی کی پیٹھ پر سفید دھاریاں ہوتی ہیں۔

۳۔ منجھولی مکھی

یہ مکھی مکان کے کھوکھل دیواروں یا درخت کی کھوکھل شاخوں یا بکسوں یا اور کسی اندھیری اور محفوظ جگہ پر چھتا بناتی ہے۔ سطحی نظر سے ایک مضبوط تر

چھتا بنے بُوے کی صورت کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر مکھیاں ہٹانے پر پانچ سے آٹھ علیحدہ علیحدہ متوازی چھتے ملتے ہیں۔ سامنے کے دو تین چھتوں میں بچے اور انڈے ہوتے ہیں اور پیچھے کے چھتوں میں خالص شہد جمع کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کی شہد کی مکھیوں میں سے یہی مکھی پالی جاتی ہے اور ایک بار میں کوئی سیر سوا سیر شہد نکالا جاسکتا ہے۔ یہ مکھی ڈنک مارنے

خاص طرح کا بکس بناکر اسی کے اندر فریم لٹکا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح ضرورت کے وقت ان فریموں کو بکس سے نکال کر ایک مشین کے ذریعے ان کا شہد نکال لیتے ہیں۔ اور موم کے خالی خانے جو فریم میں لگے رہ جاتے ہیں، وہ بکس میں واپس رکھ دیے جاتے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ مکھیوں کا وقت نئے خانوں کے بنانے میں ضائع نہ ہو۔ بلکہ خانے خالی پاکر ان ہی میں شہد

خدمتی — نَدون — ملکہ

پر کم آمادہ ہوتی ہے۔ اگر انسان ڈرے نہیں تو روزمرہ اُن کے قریب جاکر ہاتھ سے یا مرغی کے پر سے چھتے کی مکھیوں کو ہٹاکر شہد جمع کر سکتا ہے۔

پہاڑی علاقے میں گھر کی دیوار کے باہری رُخ اِس پار چھوٹا سا چھید کرکے اندرونی رُخ پر بکس رکھ دیا جاتا ہے۔ اور چھتا لگ جانے پر شہد نکالتے رہتے ہیں۔ مگر سائنٹفک طریقے سے ایک
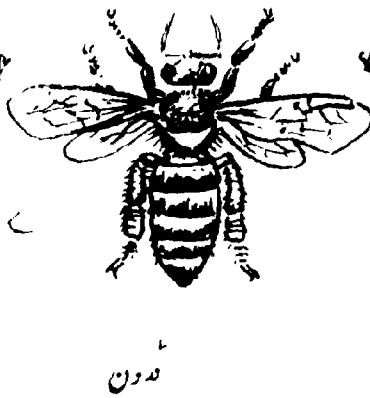
جمع کرتی ہیں

ان سب قسموں میں ایک ملکہ یعنی "کوئین بی" ہوتی ہے۔ جہاں یہ بیٹھتی ہے۔ وہاں اور سب مکھیاں اس کے چاروں طرف جمع ہوجاتی ہیں۔ یہ مکھی اور مکھیوں سے کسی قدر بڑی ہوتی ہے۔ اور اس کے ڈنک نہیں ہوتا۔ اس ایک مکھی پر ساری نسل کی پیدائش کا انحصار ہے۔ اگر یہ مرجائے تو

باقی سب مکھیاں نہ صرف بیکار ہوجاتی ہیں۔ بلکہ ایک
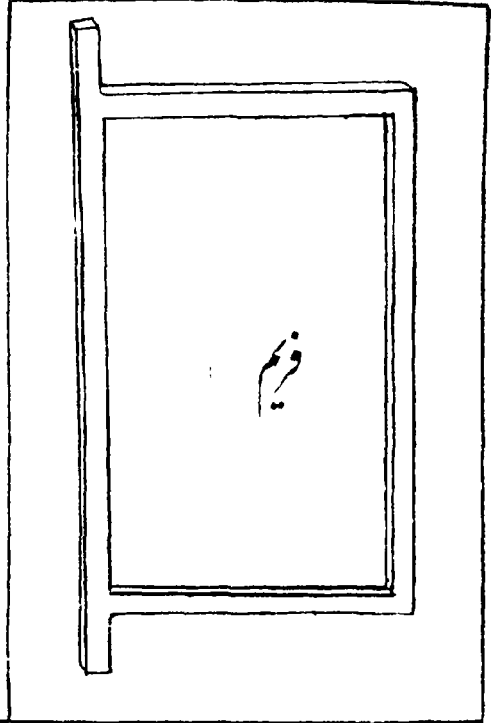
بعد برابر ہر خانے میں انڈے ڈالتی جاتی ہے۔ جب چھتے میں مکھیاں زیادہ ہوجاتی ہیں۔ یا ملکہ انڈے دینے کے قابل نہیں رہتی۔ تو خاص قسم کا خانہ بناکر انڈے کے ساتھ خاص قسم کی غذا رکھ دی جاتی ہے جس کو "رائل فوڈ" یا شاہی خاصا کہنا چاہیئے۔ جب نئی ملکہ پیدا ہوجاتی ہے تو اوڑان کے بعد نئی ملکہ چھتے پر قبضہ کرلیتی ہے۔ اور پرانی ملکہ کچھ ہمراہیوں سمیت دوسری جگہ چلی جاتی ہے۔

علاوہ ملکہ کے پچاس ساٹھ نر مکھیاں جن کو "ڈرون" (DRONE) کہتے ہیں، چھتے میں ہوتی ہیں یہ مکھیاں ناکارہ ہوتی ہیں۔ ان کے بھی ڈنک نہیں ہوتے اور سوائے چھتے پر ادھر ادھر پھرنے اور جمع کی ہوئی غذا کو کھانے کے اور کچھ کام نہیں کرتیں۔ اگر اُن کی تعداد

ایک کرکے سب ختم ہوجاتی ہیں۔ نر مکھیوں سے جوڑا کھانے کی نوبت صرف ہوا میں اُڑتے وقت آتی ہے۔ اس کے
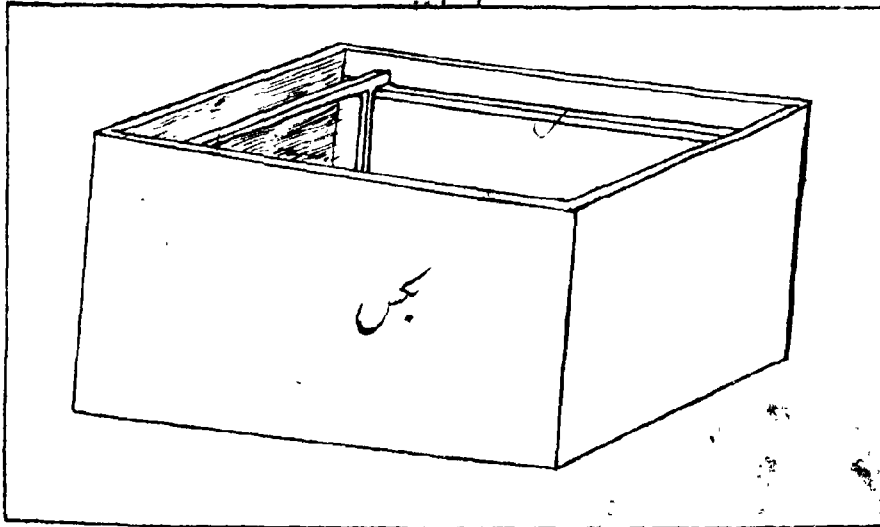
زیادہ ہوجائے تو اُن کو چھتے سے بھگا دیا جاتا ہے۔ یا لڑکر وہیں ختم کر دیا جاتا ہے۔ اکثر چھتے کے نیچے زمین پر

مری ہوئی مکھیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ یہ زیادہ تر نر ہی مکھیاں ہوتی ہیں۔

باقی سب مکھیاں خدمتی یا ورکر کہلاتی ہیں۔ ان مکھیوں کے ڈنک ہوتے ہیں۔ نسل کی پرورش اور چھتے کا کل انتظام یہی کرتی ہیں اور جب تک ملکہ ایک جگہ موجود ہے۔ یہ کام خوشی سے کرتی رہتی ہیں۔ اگر موسم کی خرابی یا کسی اور وجہ سے جگہ بدلنا منظور ہوتا ہے۔ تو ان میں بعض مکھیاں اسکاؤٹ کا کام دیتی ہیں اور اچھی جگہ کی تلاش کرکے خبر دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ کے ساتھ سب مکھیاں اول اس چھتے کا کل شہد کھا لیتی ہیں اور پھر اڑکر دوسری جگہ چلی جاتی ہیں۔ آخری فیصلہ ملکہ کی پسند پر موقوف رہتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے بچوں کو چھوڑکر دوسری جگہ جانے کا ارادہ نہیں کرتیں۔

شہد کی مکھی کو بہت سی چڑیاں اور بھڑیں پکڑ کھا لیتی ہیں۔ ریچھ بھی شہد کا شوقین ہوتا ہے جو خاموشی سے ان کو ہٹا کر جمع کیا شہد کھا لیتا ہے۔

کبھی مکڑی یا خاص تتلی یا بھڑ ان خانوں میں اپنے انڈے دے دیتی ہیں۔ اور جب ان سے بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو وہ شہد یا مکھی کے بچوں کو کھا کر مکھیوں کو چھتا چھوڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔

ملے:- یہ نہ تو نر ہوتی ہیں نہ مادہ سوائے خدمت کرنے کے ان کا کوئی اور کام نہیں۔

تمھارے اس خاص نمبر میں بہت سے مفید اور دلچسپ مشغلوں پر مضمون چھپ رہے ہیں۔ کھیل کود بھی فائدے اور دلچسپی میں ان میں کسی سے کم نہیں۔ دن بھر کی محنت کے بعد گھنٹے آدھ گھنٹے جی بھر کر کھیل لیا کرو تو تمھارا دماغ تازہ ہو جائے دوسرے اچھی خاصی ورزش بھی ہو جائے۔ آج کل بچوں میں نئے نئے قسم کے انگریزی کھیلوں سے دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ مگر ہمارے دیسی کھیل بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کھیلوں کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے ان میں اصلاح کی جائے۔ نیچے میں تمھیں چند ایسے ہی کھیل بتاؤں گا امید ہے کہ پیامی ان کا تجربہ کریں گے۔ برادری کی شاخوں کے عہدہ داروں سے میری خاص طور پر درخواست ہے کہ وہ ان کھیلوں کو اپنے ممبروں میں رواج دیں۔ اگر تمھیں یہ کھیل دلچسپ معلوم ہوئے تو آیندہ ہر مہینے کوئی نہ کوئی اچھا سا مزے دار کھیل تمھیں بتایا کروں گا۔

اندھا بچہ

سب بچے فرش پر ایک دائرے میں بیٹھ
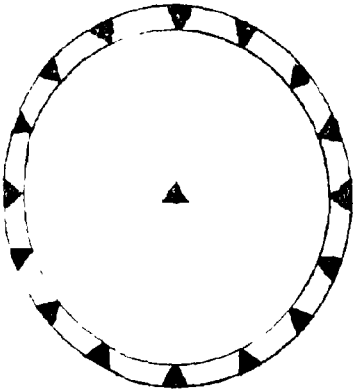
جائیں۔ ان میں سے جو بچہ اپنے کو کھیلنے کے لئے پیش کرے اُسے دائرے کے بیچوں بیچ کھڑا کر کے اس کی آنکھیں رومال سے اس طرح باندھ دو کہ دیکھ نہ سکے۔ اب دائرے کے بچے ایک چھوٹی سی گیند جلد جلد ایک دوسرے سے لیتے دیتے رہیں۔ گیند دو سکنڈ سے زیادہ ایک بچے کے پاس نہ رہے۔ اب جو لڑکا بیچوں بیچ دائرے میں آنکھیں بند کر کے کھڑا ہے وہ اٹکل سے اندازہ لگائے اور دفعتاً فوقتاً ایک ایک بچے

کا نام پکارے۔ اگر کسی کا نام صحیح نکل آئے تو جس کا نام نکلا ہے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دائرے میں کھڑا کر دیا جائے اور کھیل پھر سے شروع ہو لیکن اگر وہ چار نام غلط پکارے تو بچے اُسے اپنی تجویز کے مطابق کوئی معمولی سی سزا دیں۔ ہمارے خیال میں یہ سزائیں مناسب ہیں :- ۱۵ بیٹھکیں۔ ۱۰ ڈنڈ۔ تین یا چار قلابازیاں۔ ۲۰ یا ۳۰ گز کی دوڑ۔ دو ہاتھوں پر دیوار کے سہارے کھڑا ہونا۔ وغیرہ

اگر بچے ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں تو نام کی جگہ نمبر ہونا چاہئیں اور بیچ والا لڑکا نام کی جگہ نمبر پکارے۔

گیند نہ ہو تو کاغذ کے ٹکڑے، پنسل، قلم یا رومال وغیرہ سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔

اسی کھیل کو تم تھوڑی سی تبدیلی کے بعد مختلف طریقوں سے کھیل سکتے ہو۔ مثلاً آنکھیں بند کئے ہوئے بچے کو دائرے کے باہر کھڑا کر دو۔ اور دائرے کے بیچ میں دو اینٹیں رکھو۔ ہر لڑکا باری باری ان اینٹوں کو کھڑکائے۔ ہر آہٹ پر اندھا بچہ کسی ایک کا نام یا نمبر پکارے باقی کھیل اسی طرح۔

گرداگھوم

سب بچے ایک دائرے میں ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھیں۔ اور ٹانگیں اس طرح پھیلائیں کہ سب کے پاؤں بیچ میں ملیں اور گھٹنوں کو ذرا اونچا کر کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیں اب ایک کھلاڑی بیچ میں پاؤں کے درمیان کھڑا کر دیا جائے۔ یہ کھلاڑی لکڑی کی طرح سخت اور سیدھا، دوسرے کھلاڑیوں کے بڑھے ہوئے ہاتھوں پر اپنے کو گرا دے۔ جس بچے کے ہاتھوں پر یہ گرے وہ اسے اپنے دائیں ہاتھ والے ساتھی کے ہاتھوں پر دھکیل دے۔ اس طرح اس بیچ والے لکڑی کے کھلاڑی کو خوب گھمائیں۔ اگر کسی بچے کے ہاتھ تھک جائیں اور وہ بوجھ نہ سنبھال سکے تو اس تھکے ہوئے بچے کو بیچ والے لکڑی کے آدمی کی جگہ کھڑا کریں اور کھیل اسی طرح پھر سے شروع کیا جائے۔

سب کھڑے رہو

سب کھلاڑی کھیل کے میدان میں بیچوں بیچ کھڑے ہو جائیں۔ ان میں سے ایک ہاتھ اونچا کر کے ایک گیند (ربڑ، کپڑے یا رسی کا بنا ہوا) سب کے درمیان ڈال دے۔ ساتھ ہی ہر ایک کھلاڑی کا نام یا نمبر (اگر کھلاڑی ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں) بولے۔ مثلاً حمید اس وقت سوائے حمید کے باقی سب بچے ادھر اُدھر بھاگ جائیں۔ حمید جلدی سے گیند ہاتھ میں لے کر حکم دے کہ "سب کھڑے رہو"۔ یہ حکم سنتے ہی بھاگنے والے اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جائیں۔ حمید نے جس جگہ سے گیند اُٹھایا ہے وہاں سے ہلے بغیر دوسرے کھلاڑیوں میں سے کسی ایک

کو اپنی گیند کا نشانہ بنانے کی کوشش کرے۔ کھلاڑی اپنی جگہ چھوڑے بغیر گیند سے بچنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اگر حمید کا نشانہ ٹھیک بیٹھے تو باقی کھلاڑی حمید سمیت گیند سے دور بھاگیں اور اب جس بچے کے گیند لگی ہے جلدی سے گیند ہاتھ میں لے لے اور فوراً کہے کہ "سب کھڑے رہو"۔ پھر وہ حمید کی طرح کسی ایک کو نشانہ بنانے کی کوشش کرے۔

ان بچوں پر جو نشانہ ٹھیک نہ بٹھا سکے یا جن پر نشانہ ٹھیک بیٹھا ایک ایک نمبر ہوا۔ اس طرح کسی پر تین نمبر ہو جائیں تو وہ چور ہوا۔ اس چور کو سزا یہ ملنی چاہئے کہ اسے دیوار وغیرہ کے سامنے اوندھا رکوع کی حالت میں کھڑا کر دو۔ باقی لڑکے کم سے کم پندرہ فٹ کے فاصلے سے باری باری اسے گیند کا نشانہ بنائیں۔

اگر چور کو بھی موقع دیا جائے کہ وہ ان لڑکوں کو گیند کا نشانہ بنائے جو کھیلتے وقت اسے نشانہ نہ بناسکے تھے تو چور بھی آخر تک کھیل کا مزا لے سکتا ہے۔

کھیل کا میدان چھوٹا ہو یا بڑا سا ہال ہو تو کھیل کا زیادہ لطف آتا ہے۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے چاروں طرف حد مقرر کر لینی چاہئے۔ کھلاڑی اس حد سے باہر نہ جائیں۔ اگر گیند اس حد سے باہر چلی جائے تو اسے اسی جگہ لایا جائے جہاں سے وہ حد سے باہر ہوئی تھی۔ اور وہیں سے دوسروں کو نشانہ بنایا جائے۔
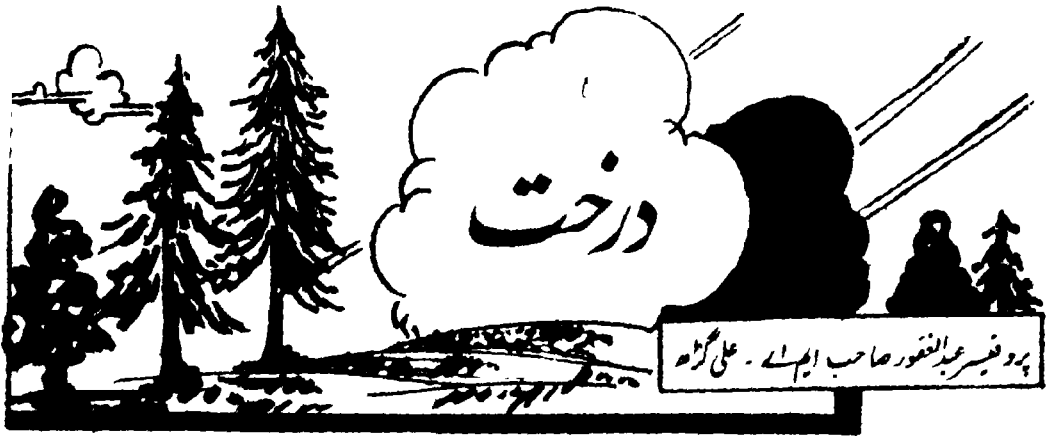
درخت بھی ہماری زندگی کے لئے بہت اہم ہیں اگر درخت نہ ہوتے تو دنیا ہمارے لئے سنسان اور بہت بھیانک ہوتی۔ تم ان درختوں کو فضول اور بے جان نہ سمجھو۔ یہ اپنی زندگی میں یہاں تک کہ موت کے بعد بھی تمھارے بہت مفید دوست ہیں۔

ویسے تو درختوں کی ہر چیز، پھول پتے، بیج چھال، جڑ، تنہ ہمارے کسی نہ کسی کام آتا ہے۔ مگر آج ہم صرف لکڑی کے بارے میں تمھیں کچھ دلچسپ باتیں بتائینگے کبھی تم نے اس پر بھی غور کیا کہ لکڑی کس کام آتی ہے؟ دیکھو جس کرسی پر تم بیٹھے ہو یہ شیشم کی بنی ہوئی ہے۔ یہ یوپی اور پنجاب کے میدانوں میں ہوتی ہے۔ تمھاری میز چیڑ یا دیوار کی بنی ہوئی ہے۔ یہ خوب صورت نوکیلے پتوں والے درخت پہاڑوں کا گہنا ہیں۔ تم ہاکی تو روز کھیلتے ہو۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ ہاکی اسٹک کہاں سے بن کر آئی؟ یہ سیال کوٹ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کی لکڑی شہتوت کی ہے۔ غور سے دیکھو۔ اس کا اوپر کا حصہ بہت سے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے۔ بھلا یہ جوڑ کیسے گیا؟ سریش سے اور سریش کہاں سے آیا؟ یہ گندہ بروزہ سے بنتا ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں چیڑ، کیل، دیودار کے درخت کھڑے ہیں۔ وہ دیکھو ایک پہاڑی مزدور ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کلہاڑی اور دوسرے میں برتن اور رسی ہے۔ کلہاڑی سے اس نے درخت کے تنے میں زخم کردیا۔ اس میں سے دودھ بہہ نکلا۔ اب رسی سے برتن اس کے نیچے باندھ دیا۔ چند دنوں میں اس دودھ سے برتن بھر جائے گا۔ پھر یہ مزدور درختوں پر دودھ اکٹھا کریں گے۔ اور یہ بڑے پیپوں میں بھر کر بریلی کے کارخانے میں بھیج دیا جائے گا۔ جہاں اس سے سریش، گندہ بروزہ، بوٹ پالش اور دوسری چیزیں بنائی جائیں گی۔

دیکھو ربر کتنے کام آتی ہے۔ تم ربر کے جوتے پہنتے ہو۔ ربر کی گیند سے کھیلتے ہو۔ تمھاری بائیسکل میں ربر کی جگہ لوہا لگا ہوتا تو تم اس تیزی سے بائیسکل پر کھیل کے میدان کا چکر لگا سکتے تھے؟ یہ ربر بھی تو درختوں کا عطیہ ہے۔ یہ سنگھائی لوگ ربر کے درخت سے دودھ اکٹھا کرتے ہیں اور اس کی ربڑ بناتے ہیں۔

اور سنو، اگر لکڑی نہ ہوتی تو نہ میں کچھ لکھ سکتا نہ تمھیں پڑھنے کی کوئی چیز ملتی۔ تم پوچھوگے یہ کیسے؟ جی صاحب کاغذ بھی تو لکڑی ہی کا بنتا ہے۔ کینڈا، امریکہ ٹیٹا گڑھ (بنگال) کے کارخانوں میں لکڑی کے لاکھوں گٹھے آتے ہیں۔ مشین کے ذریعے اُن کے پرزے پرزے کرکے برادہ بنا دیتے ہیں۔ کاغذ اسی سے بنتا ہے۔ پرانے وقتوں میں تو درخت کے پتوں سے کاغذ کا کام لیتے تھے۔ سنسکرت کی پرانی کتابیں بھوج پتر اور کیلے کے پتوں پر لکھی ہوئی ہیں۔ پرانے زمانے میں مصری لوگ ایک درخت (PAPYRUS) سے یہی کام لیتے تھے۔ انگریزی لفظ پیپر (کاغذ) اسی سے نکلا ہے۔ اگر لکڑی نہ ہوتی تو شاید چھاپنے کی مشین بھی ایجاد نہ ہوتی۔ ایک چینی موجد نے پہلے پہل لکڑی ہی کا چھاپہ ایجاد کیا تھا۔ اب تو اس صنعت نے بہت ترقی کرلی ہے اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ شروع میں چھاپہ لکڑی کا بنا تھا۔

اچھا صاحب کاغذ بھی لکڑی سے بنا۔ اور چھاپے کا فن بھی اسی کی بدولت دنیا میں رائج ہوا۔ اب دیکھیں ہمارا پیام تعلیم تیار کرنے میں لکڑی نے اور کیا مدد دی۔ کبھی تم نے اپنے ہاتھ کی کالی روشنائی بھی تیار کی؟ اس کا ضروری جزو گوند ہوتا ہے۔ اور گوند کہاں سے آیا؟ درختوں سے۔ پھر جب دفتر سے تمھارے پاس کوئی ضروری خط جاتا ہے تو اس پر لاکھ کی مہر لگائی جاتی ہے۔ یہ لاکھ بھی درختوں ہی سے تو ملتی ہے۔

ہاں دیا سلائی بھی تو لکڑی ہی سے بنتی ہے پہلے ہمارے ملک میں سوئیڈن سے آتی تھی۔ اب ہندوستانیوں نے اپنے کارخانے قائم کرلئے ہیں لکڑی ہمالیہ کے جنگلوں سے آتی ہے اور کارخانے میدانی شہروں۔ کلکتہ، بریلی، لاہور، رنگون وغیرہ میں قائم ہیں۔

جن ملکوں میں جنگلوں کی کثرت ہے وہاں لکڑی کے مکان بھی بنائے جاتے ہیں۔ کشمیر کے تیرتے ہوئے گھروں کی تصویریں تو تم نے دیکھی ہوں گی وہاں لوگ ہاؤس بوٹ (HOUSE BOAT) بناتے ہیں کشتیاں کیا اچھے خاصے گھر ہوتے ہیں۔ چین میں بھی کشتیوں کے گھر ہوتے ہیں وہاں تو بعض لوگ ایسی جل کی مچھلی بن جاتے ہیں کہ تمام عمر زمین پر قدم نہیں رکھتے۔ جاپانیوں کے لکڑی کے گھر دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ مکان کا فرش بھی لکڑی کا۔ چپل بھی لکڑی کے پہنتے ہیں جاپانی لکڑی کے مکان نہ بنائیں تو کل کے مرتے آج مر جائیں

کیوں کر اس ملک میں زلزلے بہت آتے ہیں۔ اینٹ پتھر کے مکان ہوں تو ہمیشہ تباہی آتی رہے۔

درخت ہمارے لئے پانی کے ذخیرے کا کام بھی دیتے ہیں۔ جب گرمی کی وجہ سے میدانوں میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے تو اُن سے پانی کی سوتیں جاری ہوتی اور پیاسے میدانوں کی پیاس بجھاتی ہیں۔ خلیج بنگال سے موسمی ہوائیں (مان سون) یا بخارات اُٹھ کر شمال کا رُخ کرتے ہیں اور کوہ ہمالیہ سے ٹکرا کر دھوا دھار مینہ برساتے ہیں۔ پہاڑ کی ڈھلانوں پر درخت اپنے پتوں کی نوکیلی زبان سے بارش کی بوندیں چوس لیتے ہیں اور اس پانی کو جڑوں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ جب برسات گذر جاتی ہے تو پانی اِن جڑوں سے رس رس کر چشموں کے راستے بہہ نکلتا ہے۔ مگر بعض ناسمجھ لوگوں نے کیا ظلم کیا کہ ایسے ہمدرد درختوں کی جڑوں پر کلہاڑی چلا دی۔ اور ہمالیہ کی ڈھلانوں پر جنگل کے جنگل کاٹ کر رکھ دئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑوں میں پانی سوکھ گیا۔ چشمے خشک ہو گئے۔ اور ندی نالے جو ترائی کی زمینوں کو ہریالی سے سرسبز کر دیتے تھے پانی سے خالی ہو گئے۔

پیارے بچو تم بھی جب کسی پودے یا درخت کو کاٹنے لگو تو پہلے یہ خیال کر لینا کہ تم پانی کے ایک نل کو تباہ کر رہے ہو۔

سچ پوچھو تو دنیا کے کاروبار کا ایک بڑا حصہ لکڑی کی بدولت چل رہا ہے۔ تم ریل گاڑی میں سفر کرتے ہو۔ بجلی کے قمقموں سے رات کو دن بنا دیتے ہو۔ بجلی کے پنکھے چلا کر ٹھنڈی ہوا کا لطف حاصل کرتے ہو۔ پانی میں برف ڈال کر پیاس بجھاتے ہو یہ سب لکڑی کی بدولت۔ ریل کے انجن میں اور بجلی کے کارخانے میں پتھر کا کوئلہ جلتا ہے اور وہ کیا ہے؟ ہمارے موجودہ جنگلوں کے دادا پردادا ہزاروں سال ہوئے زمین میں دفن ہو گئے تھے اور اب اُن کی کالی ہڈیاں جلانے کے کام آ رہی ہیں۔

دنیا میں سب سے پہلے چینی قوم نے پتھر کا کوئلہ استعمال کیا۔ ابن بطوطہ مشہور مسلمان سیاح جب پہلی بار ——— چین گیا تو اس نے یہی کوئلہ چینیوں کو جلاتے ہوئے دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہاں کے لوگ کالی مٹی جلاتے ہیں۔ اور اس کی آنچ بہت تیز ہوتی ہے۔ کالی مٹی یہی پتھر کا کوئلہ تھا۔ جسے چین کے لوگ مٹی میں سے کھود کھود کر نکال لیتے تھے۔

یہ لکڑی آتی کہاں سے ہے۔ پہاڑوں پر اور پہاڑوں کے نیچے کے میدانی علاقے میں کثرت سے جنگل ہیں تو بھی پہاڑوں سے تو اس طرح آتی ہے کہ درخت کاٹ کاٹ کر لٹھے دریاؤں میں بہا دیتے ہیں۔ یہ لٹھے بہتے بہتے میدانی علاقے میں آتے ہیں تو نکال لئے جاتے ہیں۔ بر ملک کے جنگلوں میں تو دریاؤں کے کنارے کی طرف ہزاروں ٹریلیں چھوٹی

ہیں جنھیں پانچ ٹانگوں والے سیاہ انجن کھینچتے ہیں۔ یہ انجن ہاتھی ہیں۔ سینکڑوں ہاتھی اس کام کے لئے سدھائے جاتے ہیں۔ بہت سے لٹھے زنجیروں سے ایک دوسرے کے پیچھے ایک قطار میں باندھ دیتے ہیں۔ سب سے اگلا لٹھا زنجیروں کے ذریعے ہاتھی کی کمر میں کس دیتے ہیں۔ ہاتھی آگے آگے چلتے ہیں اور لٹھوں کی گاڑی پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر لٹھے کھول کر پانی میں بہا دیے جاتے ہیں اور نیچے میدانوں میں ان لٹھوں کو دریا سے نکال لیا جاتا ہے۔

اور آگ تو لکڑی کے بغیر انسان کی ایسی مفید خدمت گذار بن ہی نہ سکتی تھی۔ تمھیں معلوم ہے کہ انسان نے آگ کیسے ایجاد کی؟ آج سے ہزاروں سال پہلے کی بات ہے کہ ایک جنگل میں بہت سے بانس کھڑے تھے۔ ہوا زور سے چلی تو بانس ہلنے لگے۔ دو بانسوں نے جو پاس پاس کھڑے تھے ایسی رگڑ کھائی کہ آگ پیدا ہوگئی۔ اِدھر گھاس پھوس کا ڈھیر، اُدھر ہوا کا زور بس پھر کیا تھا آناً فاناً جنگل میں آگ لگ گئی۔ انسان نے یہ دیکھا تو وہ بھی لکڑیوں کو آپس میں رگڑ کر آگ بنانے لگا۔ اگر تم آج سے چند ہزار سال پہلے پیدا ہوئے ہوتے تو تمھیں بھی لکڑی کے ایسے گھر میں رہنا پڑتا جو درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے بنایا جاتا تھا۔ کپڑوں کی جگہ درختوں کی چھال پہنتے۔ بناسپتی کھانے درخت کے تنے کو اندر سے کاٹ کر کشتی بناتے اور مزے سے دریاؤں کی سیر کیا کرتے۔ اگر کبھی جنگل میں راستہ بھول جاتے ہیں تو درختوں کی مدد سے ڈھونڈھ نکالتے۔

لکڑی میں ایک خرابی ہے۔ اسے گھن لگ جاتا ہے یا دیمک کھا جاتی ہے۔ انسان نے لکڑی میں گھن لگتے دیکھا تو اسے ایسے درخت کی تلاش ہوئی جسے گھن نہ لگے۔ اس لئے آبنوس، ساگون، سیاہ شیشم جیسی لکڑیوں کی قدر ہوگئی۔ بڑھئی پرانے شیشم کی لکڑی کی تلاش میں رہتے ہیں۔ پرانے شیشم کا رنگ سیاہ پڑجاتا ہے۔ مگر یہ چیزیں قیمتی تھیں۔ اس لئے اب فکر ہوا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ معمولی لکڑی میں بھی گھن نہ لگے ایسی ترکیب کیا ہوسکتی ہے؟ گھن کیڑے سے لگتا ہے اگر لکڑی ایسی جگہ رکھی جائے جہاں کیڑے نہ پہنچ سکیں یا لکڑی میں ایسی دوا داخل کر دی جائے جو کیڑوں کے دانت کھٹے کر دے تو لکڑی محفوظ رہے گی۔ وینس شہر کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیروں پر آباد ہے۔ جو ایک زمانے میں پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اِن جزیروں پر ہزاروں لٹھے ڈال کر زمین اونچی کی گئی اور سینکڑوں سال گذرنے پر بھی یہ لٹھے جوں کے توں قائم ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہ لٹھے سمندر کے نمکین اور کڑوے پانی کے اندر ہیں۔ اس لئے گھن والے کیڑے وہاں تک پہنچ نہیں سکتے۔ معمولی لکڑی میں اگر کریزوٹ (CREOSOTE) داخل کر دی جائے تو وہ گھن سے محفوظ رہتی ہے۔ ہندوستانی ریلوں کے

سلئے جتنی لکڑی دریاؤں سے آتی ہے اسے کریزوٹ ہی کے ذریعے ٹھیک کیا جاتا ہے۔ بس یہ سمجھو کہ جیسے ہم چیچک کا ٹیکہ لگواتے ہیں اسی طرح اس لکڑی کے دیمک اور گھن کا ٹیکہ لگا دیا جاتا ہے

درختوں کے بارے میں نئی نئی تحقیقاتیں ہوئی ہیں اور اُن کے ذریعے بہت دلچسپ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک کے مشہور سائنس داں سر جگدیش چندر بوس پودوں کی زبان جانتے تھے۔ تم حیران ہو کر پوچھو گے کہ پودے بھی بول سکتے ہیں؟ اور کیا یہ بھی انسانوں کی طرح خوش یا رنجیدہ ہو سکتے ہیں۔ ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں! سر جگدیش چندر بوس نے ایسے ایسے نازک آلے ایجاد کئے تھے جن کی مدد سے پودوں کی ہلکی سے ہلکی حرکت بھی معلوم ہو سکتی ہے۔ ان کی رائے میں درخت ہماری طرح سانس لیتے ہیں۔ خوراک کھاتے ہیں۔ اگر ان پر کوئی بدمزہ کیمیائی چیز ڈالی جائے تو ہٹ کر اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر مزے دار لقمہ ہو تو بہت رغبت سے اس کی پیشوائی کرتے ہیں۔

درختوں کی عمر معلوم کرنا ہو تو کیا کرو گے؟ ہم بتائیں ہوتا یہ ہے کہ سال کے سال اپنے وقت پر ہر درخت پر تازہ بہار آتی ہے نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ تازہ شاخیں نکلتی ہیں اور پرانے تنے پر نئی کھال چڑھ جاتی ہے لیکن پچھلے سال کی لکڑی کا ایک دائرے کی شکل کا نشان تنے میں رہ جاتا ہے اگلے سال ایک اور دائرہ بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح جتنے سال گذرتے جاتے ہیں۔ اتنے ہی دائرے بڑھتے جاتے ہیں اگر ہم تنے کو کاٹ کر دائروں کی تعداد گن لیں تو درخت کی عمر معلوم ہو جائے گی۔

درختوں کی عمریں مختلف ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بڑ اور پیپل کی عمر بہت ہوتی ہے پھر بھی یہی دو تین سو سال یا اس سے کچھ زیادہ۔ تم نے کبھی لاکھوں سال کی عمر والے درخت بھی دیکھے ہیں؟ نہیں دیکھے تو کسی بڑے شہر کے نباتاتی عجائب گھر میں چلے جاؤ۔ وہاں تم فوسل (FOSSIL) دیکھو گے۔ فوسل ان درختوں کو کہتے ہیں جو پچھلے زمانے میں مٹی میں دب گئے اور ہزاروں لاکھوں سال گذرنے پر پتھر بن گئے۔

امریکہ کی ایک ریاست اریزونا میں بہت بڑا جنگل ہے۔ اس جنگل میں پتھر کے ہزاروں بن تراشے ستون ہیں جو ایک زمانے میں لکڑی کے لٹھے تھے۔

درخت کی اونچائی معلوم کرنے کے لئے نہیں تو اسے کاٹنے کی ضرورت ہے نہ اس پر چڑھنے کی ہاں پیمائش کے وقت سورج ضرور نکلا ہوا ہو۔ پہلے ایک پیمانے سے درخت کا سایہ ناپ لو۔ فرض کر دیہ سایہ یا چھاؤں دس فٹ لمبی ہے اب ایک گز لمبی لکڑی عموداً زمین میں گاڑ دو اور اس کا سایہ ناپو۔ فرض کرو ایک فٹ ہے۔ اب حساب لگاؤ اگر سایہ ایک فٹ لمبا ہے تو اونچائی ۳ فٹ ہے۔ اگر ۱۰ فٹ ہو تو اونچائی ۳۰ فٹ ہوگی۔ بس درخت کی اونچائی ۳۰ فٹ ہوئی۔

لکڑی کا کام

جناب ماسٹر عبدالحیٔ صاحب ، استادِ جامعہ

تم میں سے شاید ہی کوئی بڑھئی کو نہ جانتا ہو۔ لکڑی کا کام کرنے والے کو بڑھئی کہتے ہیں۔ یہ بہت اچھا مشغلہ ہے۔ تمھارے لئے تو خاص طور پر مفید اور دلچسپ ہے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ اگر کچھ وقت اس پر بھی صرف کرو تو ایک تو یہ کام دلچسپ ہے دوسرے اچھی خاصی ورزش بھی ہو جائے۔ پھر شاید ہی کوئی گھر ہو

ہم تمھیں چھوٹی چھوٹی چیزیں بنانے کا طریقہ بتائیں گے جو تمھارے کام بھی آئیں۔ اچھا اب تم اپنے اوزار جمع کرلو۔ زیادہ کی ضرورت نہیں۔ بس اپنی ضرورت بھر۔ وہ اوزار یہ ہیں:۔ آری ، رندا ، بسولا ، زنبور خطکش ، پیچ کش ، ہتوڑہ ، ریتی ، برما ، چھرسیاں گنیا ، فٹا ، بٹھری۔

جس میں معمولی لکڑی کی چھوٹی موٹی چیزوں کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ خود تمھیں بھی ایک اسٹینڈ۔ شیلف اور ڈلیسک کے بغیر تکلیف ہوتی ہے۔

یوں تو لکڑی کے بڑے بڑے کام بنتے ہیں مگر

آری:۔

یوں تو آریاں کئی قسم کی ہیں۔ مگر تمھارے لئے صرف تین آریاں کافی ہوں گی۔ ایک بڑی لمبے تختے اور بڑی لکڑیاں چیرنے کے لئے۔ ایک چھوٹی چول

اور باریک کام کے لئے اور ایک نوکیلی گولائی وغیرہ کاٹنے کے لئے۔

آری چلانے کا طریقہ بہت آسان ہے لکڑی پر نشان لگاکر اس پر بالکل سیدھا رکھو۔ سیدھا دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ آری کی دونوں طرفیں دکھائی دیں۔ اگر ایک طرف تمھاری نظروں سے چھپ گئی تو سمجھو کہ تمھارا ہاتھ اور ہاتھ کے ساتھ آری بھی ٹیڑھی ہوگئی آری کو چلاؤ اس طرح کہ آہستہ سے ہاتھ لے جاکر اپنی طرف کھینچو۔ ہاتھ بالکل سیدھا اور ہلکا رکھو، زور نہ لگاؤ

آری
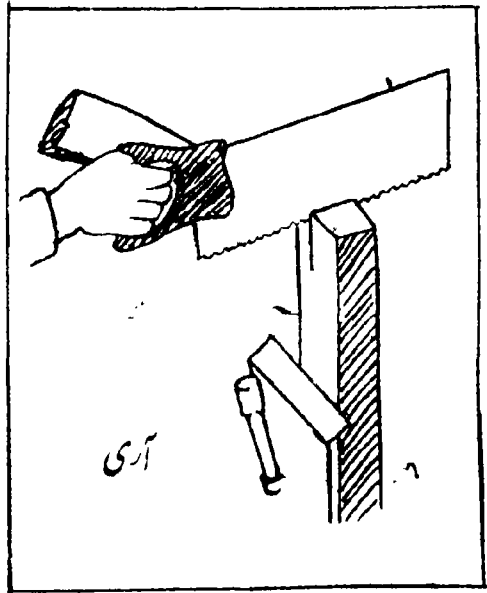
ورنہ آری ٹیڑھی ہو جائے گی۔ ہاں انگریزی آریاں اپنی طرف آہستہ اور آگے کو زور سے گھسا دینے سے کاٹتی ہیں۔

آری تیز کرنے کا طریقہ :۔ تکورا ریتی سے آری تیز کی جاتی ہے۔ دو پتلی لکڑیوں کے درمیان آری کو اس طرح رکھو کہ صرف دندانے باہر نکلے رہیں۔ اب اسے بانک میں باندھ دو اور تکورا لے کر جس طرح سے دندانے ہیں اسی طرح ایک زاویے میں ایک ہی جیسے سب گھستے چلے جاؤ۔ جب تیز ہو جائے تو آری سے کر اس کا ایک دندانہ ایک طرف ذرا سا جھکا دو اور اس کے بعد بالکل سیدھا چھوڑ دو۔ پھر دوسری طرف جھکا دو۔ آخر تک اسی طرح کرتے چلے جاؤ۔ اس سے آری پھنسے گی نہیں۔ اسے بیل کہتے ہیں

رندا :۔

رندا تین چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ ایک رندے کی لکڑی، ایک تیغ اور ایک لکڑی کی پھنّی۔ رندے کی لکڑی میں ایک سوراخ تقریباً ۴۵ درجے کے زاویے کا ہوتا ہے۔ اس سوراخ میں تیغ اور پھر اوپر سے پھنی رکھ کر ہتوڑی سے ٹھونک دو تو تیغ، رندے اور پھنی کے درمیان خوب مضبوط پھنس جائے گی۔ نکالنا ہو تو رندے کے اگلے سرے پر چوٹ دو۔ پھنی ڈھیلی ہو جائے گی۔ اور تیغ نکل آئے گی۔ اسی طرح ہر ایک رندا کھولا اور باندھا جاتا ہے۔

یہ چلایا اس طرح جاتا ہے کہ ایک ہاتھ آگے اور ایک پیچھے اس طرح رکھو کہ اگلا ہاتھ لکڑی سے

آگے بڑھ جائے تو گرے نہیں۔ اسی طرح پچھلا ہاتھ

لکڑی کے پیچھے ہٹے تو نیچے کو نہ جھکے بلکہ دونوں ہاتھوں کا زور برابر رہے۔ اس طرح لکڑی صاف اور سیدھی رندی جائے گی۔ ہاتھ ادھر اُدھر گرا تو لکڑی تو صاف ہو جائے گی مگر سیدھی

نہ ہوگی۔ ہر رندے کا یہی اصول ہے۔ رندوں
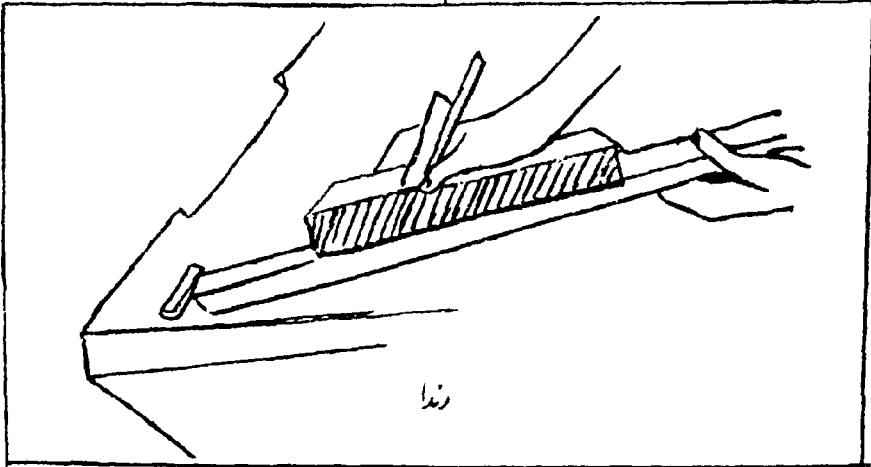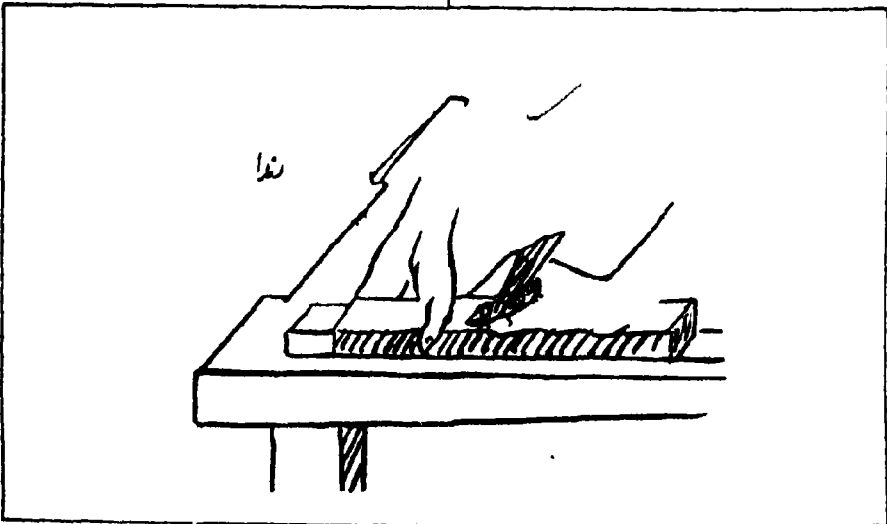
کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اکثر ضرورت کے لحاظ سے وقت کے وقت بنا بھی لیا جاتا ہے۔ تمھارے لئے بس دو کافی ہوں گے۔ ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ بڑا رندا عموماً بڑی لکڑی رندنے، سیدھی کرنے اور جوڑ ملانے میں مدد دیتا ہے۔ چھوٹا عام طور سے رندنے اور صاف کرنے کے کام آتا ہے۔

ایک فٹ سوا فٹ تک۔

برما:۔

یہ سوراخ کرنے کے کام آتا ہے۔ یہ بھی کئی طرح کا ہوتا ہے۔ ایک لکڑی کی چیز ہوتی ہے اُسے کمانی سے چلاتے ہیں ایک لوہے کا ہوتا ہے اسے ہاتھ سے گھماتے ہیں۔ اس کے پھل بھی مختلف ناپ کے ہوتے ہیں۔ ⅛ انچ سے لے کر ایک انچ تک جیسا سوراخ کرنا ہو ویسا ہی پھل لگایا جائے گا۔ لوہے کے برمے میں ایک ڈھبری لگی ہوتی ہے اس کے اندر پھل لگا کر کس دیتے ہیں۔ پھر ایک ہاتھ سے دباتے ہیں اور دوسرے سے گھماتے ہیں اور لکڑی کی چیز میں پھل ٹھوک کر ریتی سے تیز کر کے اسے گھماتے ہیں۔

چورسیاں:۔

یہ ایک سوت سے لے کر ڈیڑھ انچ تک ہوتی ہیں۔ مختلف ناپ کے سوراخ کرنے ہوتے ہیں جیسا سوراخ کرنا ہو اسی ناپ کی استعمال کرو۔ یہ لکڑی چھیلنے اور کاٹنے کے کام آتی ہیں۔

گنیا:۔

ایک لوہے کی پتی میں دوسری لوہے کی پتی بالکل صحیح زاویہ قائمہ بنائی ہوئی۔ لکڑی کے ایک طرف رندے سے رند لیتے ہیں تاکہ لکڑی بالکل چورس ہو جائے۔ اس سے چول وغیرہ بھی دیکھتے ہیں۔ بہت ضروری چیز ہے۔
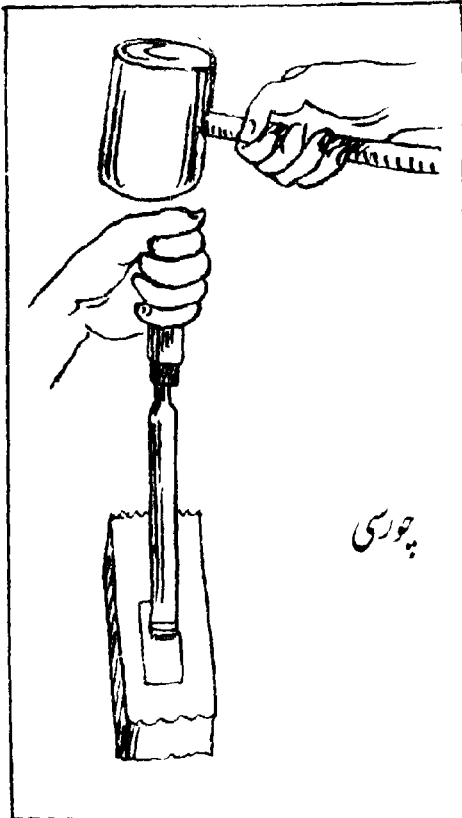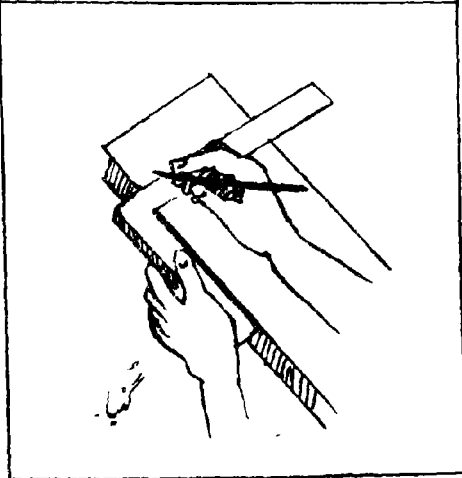
پچورسی

گنیا۔

دیوار گیری

فُٹا :- یہ تو تم روزانہ استعمال کرتے ہو ۔ مگر اس فیٹے میں ایک انچ میں آٹھ خانے ہوتے ہیں اور انھیں سوت کہتے ہیں چونکہ زیادہ لمبا ناپنا پڑتا ہے اس لئے چھ چھ انچ کے چار ٹکڑے فولڈنگ کر لیتے ہیں اور پیتل کے قبضے لگا کر جوڑ لیتے ہیں تاکہ جیب میں آسانی سے آسکے ۔

پتھری :-

یوں تو اوزار پتھر پر بھی تیز ہو جاتے ہیں مگر یہ ایک مصنوعی پتھر ہوتا ہے ۔ اسے کرنڈ کہتے ہیں ۔ یہ پتھر یا پتھری بازار میں ملتی ہے ۔

اوزار تیز کرنے کا طریقہ :- آری کے تیز کرنے کا طریقہ تو معلوم ہو گیا ۔ باقی سب اوزاروں کی دھار ایک ہی سی ہوتی ہے یعنی ایک طرف بالکل سیدھی اور دوسری

اوزار تیز کیا جا رہا ہے

طرف ڈھلوان (سلوپ) اگر ایک طرف ذرا سا بھی ہاتھ اُٹھ گیا تو دھار خراب ہو جاتی ہے ۔ اس لئے ایک طرف پتھر سے بالکل ملا کر گھسنا چاہیئے اور دوسری طرف ہاتھ اُٹھا کر دونوں طرف سے گھستے رہنا چاہیئے ۔ جب دھار صاف اور چکنی ہو جائے تو سمجھو کہ اوزار تیز ہو گیا ۔ تیز کرتے وقت پتھر پر تیل یا پانی ضرور ڈالنا چاہیئے ۔ ہر اوزار پر آب ہوتی ہے ۔ اگر اُسے خالی پتھر پر گھسا جائے تو گرم ہو جاتا ہے اور آب خراب ہو جاتی ہے ۔

تمھیں اوزاروں کے بارے میں تو کافی معلومات ہو گئیں ۔ اب میں مختلف قسم کی لکڑی اور اس کے استعمال کے بارے میں کچھ بتاؤں گا ۔ یوں تو ہمارے دیس میں قسم قسم کے درخت ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کی لکڑی تو جلانے کے کام آتی ہے ۔ جن درختوں کی لکڑی فرنیچر یا دوسری ضرورتوں میں کام آتی ہے ۔ وہ یہ ہیں ۔

ساگون ، شیشم ، چیڑ ، سال یا ساکھو ، آم سینبھل ، آبنوس وغیرہ وغیرہ ۔

ساگون :-

یہ لکڑی دو جگہ زیادہ پیدا ہوتی ہے سی پی اور برما ۔ سی پی کا ساگون برما کے مقابلے میں اچھا نہیں ہوتا گٹھیلا زیادہ ہوتا ہے اسی لئے اس کے دام بھی کم ہوتے ہیں ۔ برما کا ساگون اچھا ہوتا ہے اور

فرنیچر میں عام طور سے یہی زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی لکڑی مختلف ناپ کی ملتی ہے۔ جس ناپ کی ضرورت ہو بازار میں تیار ملتی ہے۔ اس کی پیمائش مکعب فٹ[1] کے حساب سے ہوتی ہے۔ قیمت للعہ ر فی مکعب فٹ سے معہ ر فی مکعب فٹ تک۔ میرے خیال میں تو تم یہی لکڑی استعمال کرو۔ ہلکی بھی اور مضبوط بھی۔ پھر کام کرنے میں صفائی اچھی آتی ہے۔

شیشم :-

یہ درخت عام طور پر ہر جگہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کی لکڑی سخت اور بھاری زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے اب اس کا استعمال کم ہو گیا ہے لیکن جہاں یہ کثرت سے استعمال ہوتا ہے وہاں اب بھی تمام فرنیچر اسی کا تیار ہوتا ہے۔ اس کا سامان یو۔پی میں، بریلی میں اور پنجاب میں، کرتار پور میں کثرت سے تیار ہوتا ہے یہاں بہت بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ اس کی قیمت عہ ر یا سے ر فی مکعب فٹ ہے۔ اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ کہیں کچی رہ جائے تو اس میں گھن لگ جاتا ہے اور خراب ہو جاتی ہے۔

چیڑ :-

یہ پہاڑی درخت ہے۔ لمبا زیادہ ہوتا ہے اس کی لکڑی کے ۱۰ انچ چوڑے پانچ انچ موٹے اور چھ فٹ سے بارہ فٹ تک لمبے سلیپر آتے ہیں۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔ دیودار، کیل، چیڑ، رئی چیڑ اور رئی معمولی قسم کی لکڑی ہے۔ کام کرنے میں اچھی نہیں ہوتی۔ دیودار کی لکڑی اچھی اور قیمتی ہوتی ہے۔ اس کے بعد کیل کا نمبر ہے یہ سستی ہوتی ہے اور نرم بھی۔ مزدوری کا خرچ بھی کم ہے اس لئے اس کا استعمال زیادہ ہے۔ ۱۰ × ۵ × ۱۲ رئی کے سلیپر کی قیمت للعہ کیل صہ اور دیودار ۱۰ × ۵ × ۱۰ کی آٹھ یا نو روپئے

سال یا ساکھو :-

یہ لکڑی بھی ہمالیہ کے جنگلوں میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ عمارتی کام میں زیادہ استعمال ہوتی ہے یہ لکڑی مضبوط اور بھاری ہوتی ہے۔ ناپ کے حساب سے بکتی ہے۔ فی مکعب فٹ قیمت عہ ر یا عہ ر یا عہ ر لکڑی کی اچھائی پر منحصر ہے۔

آم :-

یہ لکڑی کم زور مگر بھاری ہوتی ہے۔ اس کے تختے بنتے ہیں اور بہت معمولی کام میں آتے ہیں۔

سینبھل :-

یہ لکڑی بہت کم زور اور ہلکی ہوتی ہے اس کے تختے بھی آم کی طرح بہت معمولی کام میں استعمال ہوتے ہیں۔

---

[1] اسے یوں سمجھو کہ کوئی لکڑی ایک فٹ لمبی ایک فٹ چوڑی ایک فٹ موٹی ہو تو ایک مکعب فٹ ہوگی۔

آبنوس :-

یہ لکڑی بالکل سیاہ اور بہت وزنی ہوتی ہے بجنور کے ضلع میں کجلی بن میں پیدا ہوتی ہے اس لئے بجنور کے ضلع میں اس کا کام بہت بنتا ہے۔ یہ خاصی قیمتی ہوتی ہے۔ اور کوئی منگائے تو بالکل صحیح ناپ کے مطابق منگانا پڑتی ہے۔

میں یہ پہلے بتا چکا ہوں کہ ساگون کی لکڑی تمہارے لئے مناسب ہوگی۔ اب یہ بتانا ہے کہ اسے استعمال کس طرح کیا جائے اور کس طرح تم اس سے چھوٹی چھوٹی اور آسان چیزیں تیار کرسکتے ہو۔ مگر بھی پہلے اپنے اوزار بھی تو جمع کرلو۔ یہ تمھیں اپنے ہی شہر میں لوہا بیچنے والوں کے یہاں مل جائیں گے۔ ورنہ قریب کے بڑے شہر سے منگالو۔ سب اوزار پندرہ سولہ روپے میں آجائیں گے۔

کام کی جگہ :- گھر میں ایک طرف ہوادار جگہ تجویز کرلو۔ اور ایک میز اس نمونے کی چھوٹی سی تیار کرالو تو زیادہ بہتر ہوگا۔ ہاں میز کے ایک طرف اوزار رکھنے کے لئے دراز اور دوسری طرف لوہے یا لکڑی کا بانک بنوالو اس سے کام کرنے میں بہت آسانی ہوگی۔

کام کس طرح کیا جائے :- ساگون کی لکڑی کے بارے میں تمھیں معلوم ہوچکا ہے کہ ہر ایک ناپ کی بازار سے مل جاتی ہے پہلے پہل تم ۳" چوڑی ۱" موٹی اور ۲ فٹ لانبی کچھ لکڑیاں خرید لاؤ۔ ان میں سے کچھ پر تو ایک ایک انچ کے اور کچھ پر پون پون انچ کے نشان ڈالو اور پھر بانک میں باندھ کر جس ترکیب سے میں نے بتایا ہے اس ترکیب سے آری سے چیر ڈالو۔

اب تمھارے پاس کچھ لکڑیاں ۱" × ۱" × ۳" اور کچھ ۳/۴" × ۱" × ۳" کی ہوں گی۔ اپنا رندا ٹھیک کرلو۔ پھر ایک لکڑی میز پر رکھو اور اس کی ایک طرف رند و بالکل سیدھی نظر سے دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ لکڑی کو نظر کے سامنے رکھو اور بائیں آنکھ کو بند کرکے لکڑی کو دیکھو۔ اونچا نیچا سب معلوم ہو جائے گا۔ اس طرح جب ایک طرف سیدھی ہوجائے تو گنیا اور نظر دونوں کی مدد سے دوسری طرف سیدھی کرلو جب دونوں طرفیں ٹھیک ہو جائیں تو خط کش سے کر جہاں کم فاصلہ ہو باندھ کر خط لگادو اور رند ڈالو۔ اسی طرح چوتھی طرف ٹھیک کرلو۔ سب لکڑیاں اسی طرح ٹھیک ہوں گی۔ لو بھی تمھیں رندنا اور کاٹنا تو آگیا۔ اب کیا کروگے۔ اب کرو یہ کہ جو لکڑیاں چوکور شکل کی ہیں۔ انھیں گول کر ڈالو۔ لکڑی کا ایک سرا ہاتھ میں پکڑ و۔ دوسرا میز پر رکھو اور رندے سے کونے رند دو۔ اسی طرح دونوں سروں پر دائرے بناکر چھوٹے رندے سے رند کر گول کرلو۔ یہ لکڑیاں لکیریں کھینچنے کے لئے اور نقشوں میں لگانے کے لئے رول کا کام دیں گی۔ یا ایک سرا ذرا پتلا کردیا جائے اور موٹھ کسی قسم کی لگادی جائے تو ہاتھ کی چھڑی وغیرہ کے کام

ڈیسک کے ٹکڑے
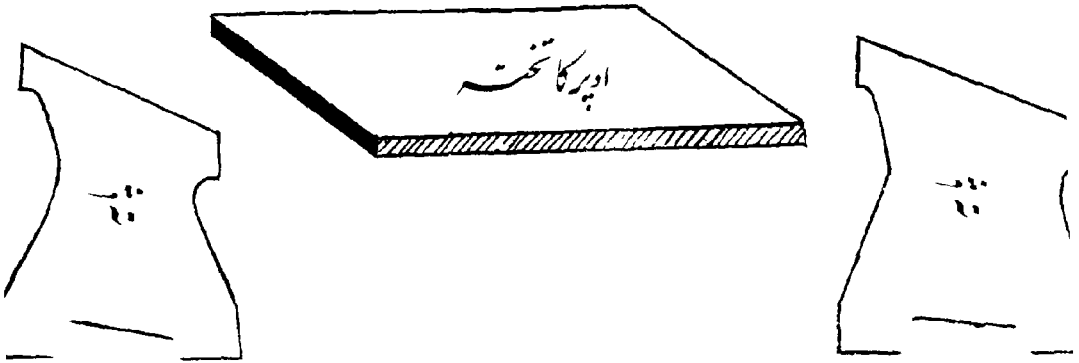
مکمل ڈیسک
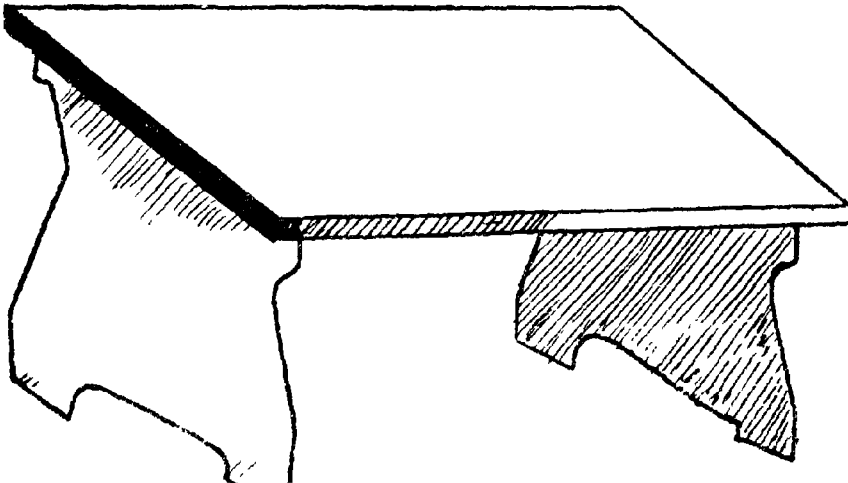
کام کرنے کی میز
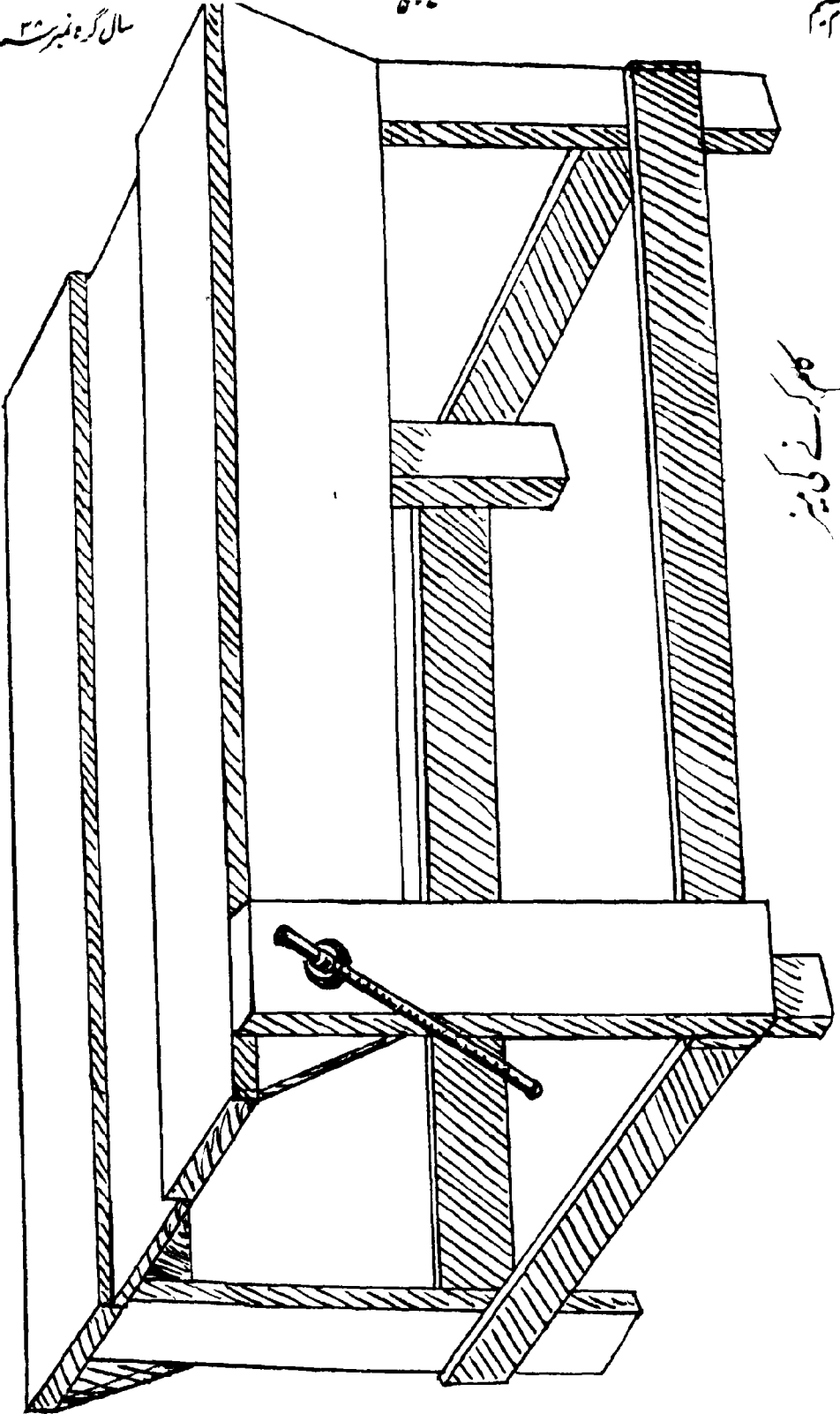
آسکتی ہیں۔ اسی طرح جو مستطیل شکل کی ہوں اُن کے چوکھٹے بن سکتے ہیں۔ اُن کے ایک طرف یعنی چوڑائی پر ¼ انچ کا نشان اور موٹائی میں ایک سوت کا نشان لگاکر کونا رند دو۔ نیچے کی طرف ¾ انچ چوڑی طرف اور ¼ انچ موٹائی میں نشان لگاکر چورسی سے کاٹ کر صاف کر دو اور پھر ضرورت کے مطابق ۴۵ درجے کا زاویہ ہر کونے پر بناکر اپنی ضرورت کے مطابق چار لکڑیاں کاٹ لو اور چار کونوں پر چار کیلیں ٹھونک دو۔ چوکھٹے بن جائیں گے۔ اس طرح لکڑی بھی بے کار نہ جائے گی۔ اور کام کی مشق بھی ہو جائے گی۔

اسی طرح چورس لکڑی "۲ × "½ × ½ لے کر جس طرح تمھیں پہلے بتایا ہے رند لو۔ چاروں طرف رندکے کونے پر ¼ انچ نشان لگاکر سلوپ میں رند لو۔ پھر بازار سے خوب صورت سی کھونٹیاں لاکر جڑ لو۔ بہت عمدہ کھونٹی بن جائے گی۔

ہاں ایک چیز اور "۱۰ × ½۱ × ½ کا ایک ٹکڑا لاؤ اور بیچ میں سے یعنی موٹائی میں سے اس کے دو ٹکڑے کر دو ایک کو رندکر یوں ہی رکھ دو۔ دوسرے کو پہلے صاف کرلو۔ پھر اُسے بھی بیچ میں سے دو ٹکڑے کرلو اور ذرا اچھی سی ڈرائنگ بناکر چورسی سے کاٹ لو نیچے کا حصہ بالکل سیدھا رکھو اوپر کی طرف ایک یا پون انچ کا سلوپ دے کر کاٹ لو۔ اب پہلے تختے کے دونوں طرف سروں پر رکھ کر کیل یا پیچ لگادو۔ تمھارے لکھنے کا بہت اچھا سا ڈیسک بن جائے گا۔ اسی طرح بک اسٹینڈ کیلئے ایک تختہ "۱۶ لمبا، "½۵ چوڑا، "¾ موٹا لے کر صاف کرلو۔ دو اور تختے "½۵ چوڑے اور "½۴ لمبے لے کر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان پر کسی اور نمونے کا یا اسی نمونے کا ڈرائنگ بناکر کاٹ لو اب بڑے تختے پر "½ دونوں طرف چھوڑ کر سروں پر دوسرے تختوں کی موٹائی کے برابر ¼ انچ گہرا کھانچا دے دو اور اس میں ان دونوں تختوں کو بٹھاکر کیل یا پیچ سے کس دو۔ اسی طرح دوسری شکل بک اسٹینڈ کی بڑ جو گھٹا یا اور بڑھایا بھی جاسکتا ہے۔ اس کا نقشہ دیکھو بہت آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ اسی طرح دیوار گھڑیاں بھی بنائی جاسکتی ہیں جس کے نمونے نقشے میں دے دیے گئے ہیں مثلاً ایک تختہ ۱۲ انچ لمبا ۶ انچ چوڑا اور ¾ انچ موٹا لے کر صاف کرلو۔ اس کے بعد سامنے کے دو کونوں پر ۲ انچ ہر طرف لگاکر کونا کاٹ لو اور اس کے بعد ½ انچ خط کش سے سب طرف نشان لگاکر سلوپ میں رندے سے رند دو۔ اس کے بعد ایک ٹکڑا ۵ انچ مربع لے کر دو کونوں کو ملاکر خط کھینچ دو اور آری سے کاٹ دو۔ دو ٹکڑے ہوگئے۔ اب ان کو ۲ انچ ہر ایک طرف چھوڑکر کیل سے یا پیچ سے بڑے تختے میں لگادو جیساکہ نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور دیوار پر لگانے کی تصویر ہے اس کو بھی غور سے دیکھوگے تو سمجھ میں آجائے گا کہ کیسے بن سکتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی ضرورت کی چیزیں بناسکتے ہو۔

ماسٹر عبدالحیٔ صاحب

اُستاد جامعہ

یہ بہت اچھا اور دلچسپ کام ہے۔ ہر بچہ بہت آسانی سے دو تین روپے خرچ کر کے اسے شروع اور بہت دلچسپ اور اچھی اچھی چیزیں تیار کر سکتا ہے۔ نظر اور ہاتھ کی تربیت کے علاوہ روزی کمانے کے لئے بھی اسے اختیار کیا جائے تو بہت کچھ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اچھا تو اب میں کچھ اوزاروں کے نام بتاتا ہوں اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی۔ ذرا توجہ سے پڑھو اور اپنے فالتو وقت میں اسی اور کچھ نہیں تو ایک دلچسپ مشغلے ہی کے طور پر شروع کرو۔ اور عمدہ عمدہ نمونے تیار کر کے اپنے مکان اور کمروں کو سجاؤ۔

عام طور پر بازاروں میں فرٹ ورک کا پورا سٹ گتے پر لگا ہوا ملتا ہے۔ قیمت کم سے کم چار روپے۔ جتنی زیادہ قیمت کا خریدو گے اتنا ہی قیمتی اور بہتر ہوگا۔ اس سٹ میں آری کا ایک فریم، چھوٹا سا بانک، ایک برما، ہتھوڑی، چھوٹی سی آری، اور ایک درجن تار کی آریاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ پورا سٹ نہ خرید سکو تو ہر چیز علیحدہ علیحدہ بھی ملتی ہے۔ مثلاً فریم آری ایک عدد اور تار کی آریاں ۴ درجن سے ۸ درجن تک۔ صرف ان ہی دو چیزوں سے تم کام شروع کر سکتے ہو۔

لکڑی:- ویسے تو ہر ایک لکڑی پر کام ہو سکتا ہے مگر لکڑی رندنے کے لئے رندے اور دوسرے سامان کی ضرورت ہوگی۔ اگر یہ سامان ہو تو خیر ورنہ ایک تختہ تھری پلائی کا بازار سے خرید لو۔ یہ تختہ بالکل صاف ہوتا ہے اور ⅛ یعنی ایک سوت سے لے کر دو اور تین سوت تک ملتا ہے۔ اس کا سائز [illegible] ہوتا ہے۔ تین پرت کا تختہ ایک سوت موٹا ہوتا ہے۔ جتنے پرت بڑھتے جائیں گے اتنا ہی موٹا اور مضبوط ہوتا جائے گا۔ چھ پرت تک کا تختہ ملتا ہے اور یہ اس کام کے لئے بہت اچھا ہوتا ہے۔ یہ بنایا اس طرح جاتا ہے کہ کسی درخت کا تنا لے کر مشینوں کے ذریعے اس کی گولائی کے

فائدے کے لئے ایسا ڈھالنا کہ وہ آپس میں مل جل کر کام کریں یہ بچپن ہی کی تربیت سے ہو سکتا ہے۔

ان بچوں کی تعلیم اور عام معلومات کے لئے ان کی برادریوں میں اچھے اچھے ماہوار اور ہفتہ وار رسالے آتے ہیں جنھیں وہ بڑے شوق سے پڑھتے ہیں ان بچوں کی سرداری بڑے بوڑھے لوگ نہیں کرتے اُن کا سردار انھیں میں سے ایک ہوتا ہے۔ البتہ یہ بات ہے کہ وہ ان سے عمر میں بڑا ہوتا ہے۔

اب تک تو تم نے یہ دیکھا کہ جرمنی کے بچوں کی یہ برادریاں کس مقصد کے لئے بنی ہیں اور کس طرح اُن کا انتظام ہوتا ہے۔ اب ذرا آؤ دیکھیں کہ یہ بچے کیا کھیلتے ہیں۔ کس طرح خوش ہوتے ہیں۔ اُن کے دل بہلاؤ کے طریقے کیا ہیں۔

ارے بھائی یہ لوگ تو پورے سپاہی ہیں! دیکھو! فوجی سپاہیوں کی طرح مارچ کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ جیسے دشمن سے لڑنے جا رہے ہوں بات یہ ہے کہ دو گاؤں کے لڑکے لڑائی کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ ایک گروہ ہے اُلم نام کے گاؤں کا اور دوسرا گروہ ہے جیزرلنجن نام کے گاؤں کا۔ اس سے پہلے جیزرلنجن کی فوج کا ایک ایلچی الم گیا تھا۔ اور وہاں کی فوج کے صدر دفتر کے دروازے پر ایک چٹھی چپکا آیا تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ "آج سے اُلم کے ڈاکوؤں اور بدمعاشوں سے ہماری لڑائی ہے" الم کی فوج بھلا اس توہین کو کیسے سہہ لیتی ان کے سردار نے اس ایلچی سے کہلوا دیا کہ ہم جیزرلنجن کے گستاخ بزدلوں کو تِکّا بوٹی کر ڈالیں گے اگر وہ ہمارے منہ آئے " بس کیا تھا۔ لڑائی چھڑ گئی۔ دونوں طرف سے اپنے اپنے میلیوں کو بلانے کے لئے ایلچی چھوٹ گئے۔ تاریخ مقرر ہو گئی کہ اس تاریخ کو مقابلہ ہو جائے۔ الم کی فوج کی طرف سے چار پانچ لڑکے سائکل پر بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہ اس بات کا پتہ لگائیں کہ دشمن کی فوج کس راستے سے آ رہی ہے۔ یہ جاسوس جیزرلنجن کے پڑوس کے بنوں میں گھس جاتے ہیں اور اچانک جیزرلنجن کے سپاہیوں کے ہاتھ پڑ جاتے ہیں۔ یہ سپاہی ان کو گرفتار کر کے اپنے صدر مقام پر لے جاتے ہیں جہاں اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ اُن کی فوج کس طرف ہے لیکن وہ بھلا اپنے بھید کیوں بتانے لگے۔ اب جیزرلنجن کا کمانڈر اپنی فوج کو حکم دیتا ہے کہ جس طرف سے یہ جاسوس آئے تھے اُسی رستے پر جا کر دشمن کی فوج کا پتہ لگائیں اتنے میں اُلم کا ایک جاسوس جو اپنے ساتھ کے جاسوسوں سے پیچھے رہ گیا تھا معلوم کر لیتا ہے کہ میرے ساتھی پکڑے گئے اور دشمن کی فوج اسی راہ جنگل میں آ رہی ہے۔ وہ الٹے پاؤں پھرتا ہے اور اپنے صدر مقام پر آ کر سارا قصہ بیان کرتا ہے۔ اُلم کا سردار پچاس سپاہیوں کی ایک ٹولی کو حکم دیتا ہے کہ وہ بن میں جا کر خوب شور غل مچائیں جیزرلنجن

نقشہ ۲
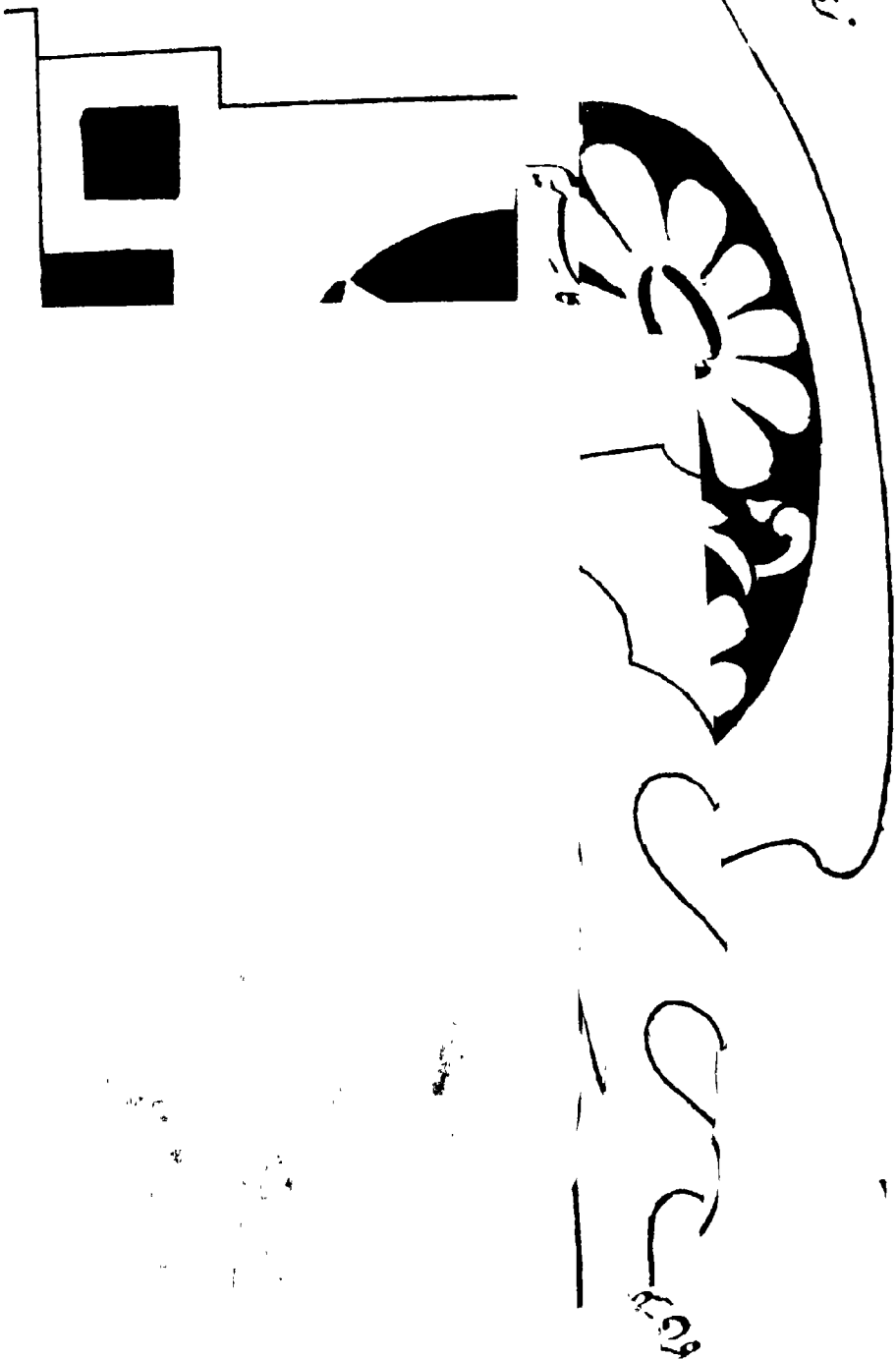
کے سپاہی یہ شور سُن کر ٹولی کی طرف بڑھتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ برابر شور مچاتے ہوئے پیچھے ہٹتے ہیں یہاں تک کہ دشمن کی فوج اُن کے پیچھے سارے بن میں بھاگتی پھرتی ہے استنے میں اُلم کی باقی فوج موقع پاکر بن کا محاصرہ کرلیتی ہے اور جیزرلیخن کے صدر مقام پر قبضہ کرلیتی ہے جو بن کے باہر چند سپاہیوں کی حفاظت میں ہے۔ اور اس کے جھنڈوں کو اتار لیتی ہے۔

اب تو جزرلیخن کے سپاہی اپنے صدر مقام اور اپنے سرداروں سے الگ ہوجاتے ہیں اور جو کوئی بن میں سے نکلتا ہے۔ پکڑا جاتا ہے۔ غرض جزرلیخن کی تمام فوج قیدی بناکر اُلم کے صدر مقام پر لائی جاتی ہے اور ایک ایک کو باندھ دیا جاتا ہے۔ اُن کے جنگی جھنڈوں کو نیچا کردیا جاتا ہے اور اُن کے جنگی نشانوں کو اُن کے سامنے جلایا جاتا ہے۔ فتح یاب فوج کا سردار اپنے بہادر سپاہیوں کے سامنے ایک جوشیلی تقریر کرتا ہے اور تنبیہہ کرتا ہے کہ اگر پھر کبھی ایسی نامعقول حرکت کی تو تمھارا دنیا سے نام و نشان مٹا دیا جائے گا۔

اب صلح صفائی ہوتی ہے۔ اُلم کے فتحیاب لڑکے اتفاق رائے سے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ "ہمارے دشمن" اصل میں غافل تھے جس کی وجہ سے وہ ہماری چالوں کو سمجھ نہ سکے لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ بہادر اور خوش طبع ہیں"۔ اب مغلوب لڑکوں کو اُن کے جھنڈے وغیرہ واپس دئے جاتے ہیں۔ اور سب آزاد کر دئے جاتے ہیں۔

واہ! یہ لیجئے۔ ابھی ابھی یہ دونوں آپس میں دشمنوں کی طرح لڑ رہے تھے اور اب ایک ہی دسترخوان پر مزے سے دُنر اُڑا رہے ہیں اور دیکھو تو کھا کیسے رہے ہیں جیسے مہینوں کے بھوکے ہوں لڑائی برسے آرہے ہیں نا! لیکن بھی یہ کھیل خوب ہے ابھی دو منٹ پہلے دشمن تھے۔ اب دوست جیسے ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوں کھانے سے چھٹی پاکر اب یہ لوگ گائیں بجائیں گے جلیں کودیں گے۔ غرض ایک ہنگامہ ہوگا جو دیکھنے کے قابل ہوگا

کیسی اچھی زندگی ہے لیکن یہ آپس کے میل جول اور بھائی چارے کا نتیجہ ہے۔ اب ہماری پیام برادری کے بچے بھی ایسا ہی میل جول پیدا کریں گے ∗

کاغذ بھی ہمارے لئے کتنی ضروری چیز ہے! یہ نہ ہو تو تمھارے لئے کتابیں کہاں سے آئیں۔ تمھارا پیام تعلیم کس پر چھپے اور تم اپنی آپا جان کو خط کس چیز پر لکھو۔ یہ کاغذ جو آج کل استعمال ہوتا ہے مشین کا بنا ہوا ہے۔ اب سے کچھ دنوں پہلے یہ ہاتھ سے بنتا تھا بلکہ ایک زمانہ تو ایسا گزرا ہے کہ کاغذ کا وجود ہی دنیا میں نہ تھا۔ لوگ دھاتوں، پتھروں، پتوں پر لکھتے تھے۔ چین والے پہلی صدی عیسوی تک بانس کے تختوں پر لکھتے تھے۔ مصر میں آٹھویں صدی عیسوی تک پیپرس (PAPYRUS) استعمال ہوتا تھا۔ یہ ایک قسم کا نرکل تھا جو دلدل میں پیدا ہوتا تھا۔ جنوبی ہندوستان والے بھوج پتر پر لکھا کرتے تھے۔

کاغذ کی ایجاد اب سے کوئی انیس سو برس پہلے چینیوں نے کی۔ چین میں شہتوت کثرت سے ہوتا ہے ریشم کے کیڑے اسی سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ بعد میں اس کی ٹہنیوں سے کاغذ بھی بننے لگا۔ ریشم کے پھٹے پرانے کپڑے اور مچھلی کے پرانے جال بھی اسی کام میں آنے لگے۔

۷۵۱ء میں عربوں اور چینیوں میں لڑائی ہوئی ایک عرب گورنر نے چند کاغذ بنانے والوں کو گرفتار کر لیا اور ان سے یہ ہنر معلوم کیا۔ پھر عرب جہاں جہاں گئے انھوں نے اس صنعت کو خوب پھیلایا۔ اٹلی نے گیارھویں صدی عیسوی میں، جرمنی نے بارھویں یا تیرھویں صدی عیسوی میں یہ صنعت سیکھی اور انگلستان نے ان سب کے آخر میں۔ ہمارے دیس میں بھی مسلمان ہی اس ہنر کو لائے بلکہ یہاں تو اب بھی کہیں کہیں اسی پرانے طریقے پر کاغذ بنتا ہے۔ مشین کے بنے ہوئے کاغذ کے مقابلے میں یہ بہت مضبوط اور دیرپا ہوتا ہے۔

پرانے طریقے پر کاغذ بنانا بہت سہل ہے ہاں ذرا محنت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ تم اس کا تجربہ کرو گے؟ ترکیب ہم بتاتے ہیں۔

پہلے تو یہ سمجھ لو کہ کاغذ بنتا کس چیز سے ہے۔ پودوں میں (CELLULOSE) نام کا ایک ریشہ ہوتا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ یہی کاغذ کی جان ہے۔ یہ

سفید رنگ کا لوچ دار مادہ ہے۔ سورج کی روشنی اور کرنیں اُسے پتیوں میں پیدا کرتی ہیں۔ پودے میں اس کے علاوہ اور چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ البتہ روئی میں خالص سیلولوز ہوتا ہے۔ غرض تمام ریشے دار پودوں سے

ملا دیا جاتا ہے۔ اور ہفتے دو ہفتے انھیں اسی حالت میں رہنے دیتے ہیں تاکہ چونے کی وجہ سے غیر ضروری چیزیں الگ ہو جائیں۔ کاسٹک کے ساتھ ابالنے کا بھی یہی مقصد ہے۔ اس کے بعد ندی یا تالاب

کاغذ بنایا جا سکتا ہے۔

اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بانس کپڑے، سن، اور جوٹ جیسی ریشے والی چیزوں کو ٹکڑوں میں کاٹ کر سوڈا کاسٹک کے ساتھ پانی میں اُبالا جاتا ہے یا ڈھینکی میں کوٹ کر ان میں چونا
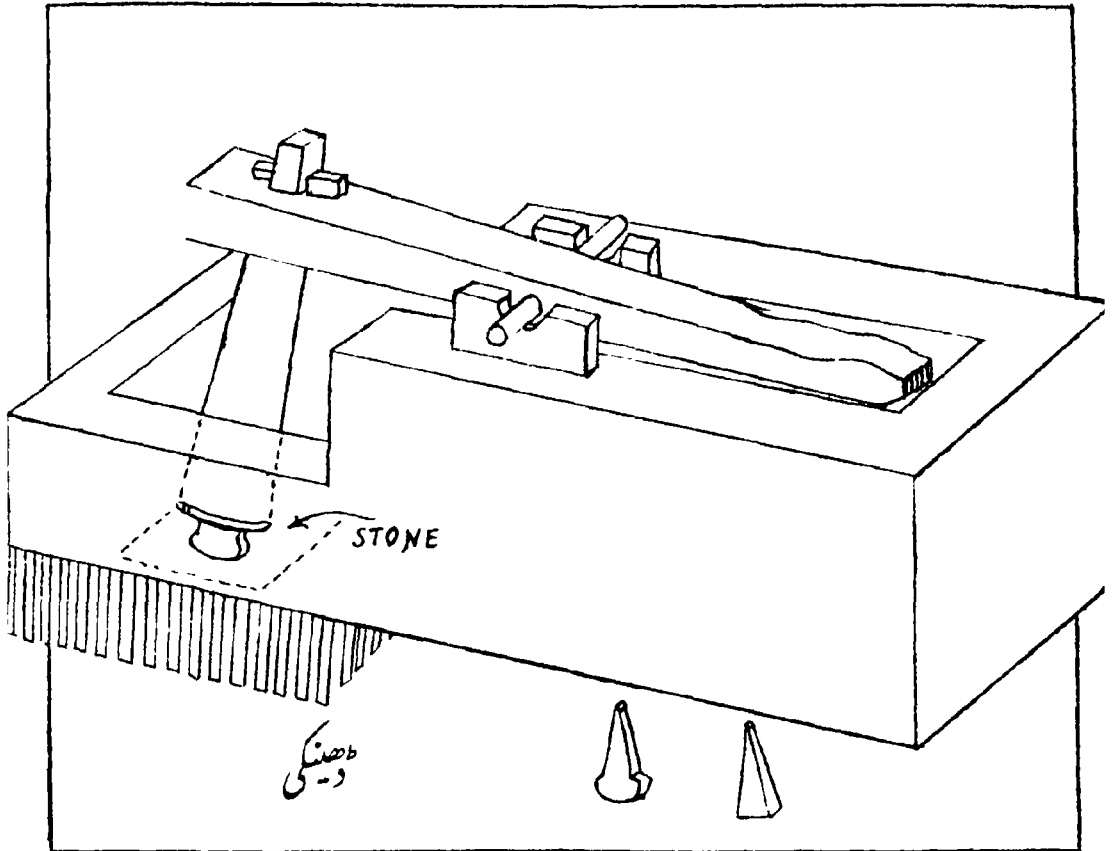
میں اس کٹے یا اُبلے ہوئے مادے کو کپڑے کی چادر میں دھویا جاتا ہے۔ اُبالنے، گلانے اور دھونے کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک سفید ریشہ (CELLULOSE) نہ نکل آئے۔ بعد میں بلیچنگ پاؤڈر سے اُسے پھر دھویا جاتا ہے۔ اور یہ

مکھن کی طرح سفید، ملائم لگدی کی صورت میں بدل جاتا ہے۔ لیکن بانس زردی مائل رہ جاتا ہے۔

اب اس لگدی کو پانی سے بھرے ہوئے ایک حوض میں ڈال دیا جاتا ہے اور کاغذ بنانے والا

حوض

ایک لکڑی سے پانی ہلاتا رہتا ہے اس سے ریشے الگ الگ ہوجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک فریم پر گھاس کی چٹائی پھیلاکر اُسے (چٹائی کو) دائیں بائیں دو لکڑیوں سے دبا دیتا ہے اور اس فریم کے ذریعے پانی کو ہلاکر لگدی کو اوپر اٹھاتا ہے

جونہی لگدی اوپر آتی ہے وہ فریم کو حوض کی کوئی آدھی گہرائی تک ڈبوکر لگدی کو چٹائی پر لے لیتا ہے۔ پانی نیچے بہہ جاتا ہے۔ اور لگدی کی ایک چادر سی چٹائی پر بن جاتی ہے۔ یہی کاغذ کی اصلی شکل ہے اس چادر کو وہ ایک مزدور کی مدد سے کپڑے پر ڈال لیتا ہے اور جب اس طرح بہت سی چادریں ہوجاتی ہیں تو ان پر پتھر رکھ کر اُن میں سے پانی نکالتا ہے۔ پھر یہ کپڑے دیواروں پر لٹکا دئے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد کپڑے الگ کرلئے جاتے ہیں اور لگدی کی چادریں دیواروں پر جمی رہتی ہیں۔ خشک ہونے

فریم

کے بعد انھیں کلف دیا جاتا ہے تاکہ یہ پانی یا نمی

کو جذب نہ کریں۔ اس عمل کے بعد جب وہ سوکھ جاتے ہیں تو ببول یا شیشم کے تختوں پر چکنے جاذب ہونے کا رہا سہا امکان بھی ختم ہوجاتا ہے۔

چٹائی

گھوٹنے کا تختہ
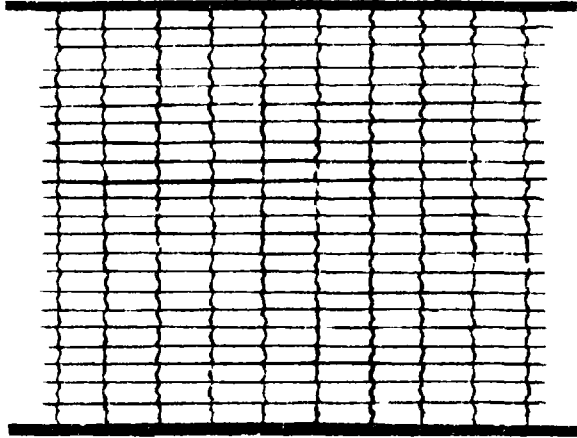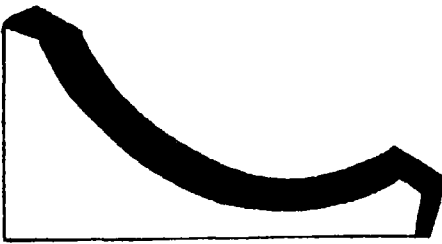
پتھروں یا بڑی کوڑیوں سے انھیں گھوٹا جاتا ہے اس سے کاغذ ہموار اور اِکسار ہوجاتا ہے۔ اور اب تمھارا کاغذ تیار ہے، اسے چاہے جس سائز میں کاٹ کر استعمال کرو۔

عبدالحمید ترین بی-اے

تم نے سنا ہوگا کہ جاپان کے لوگ کاغذ کا لباس پہنتے ہیں۔ کاغذ ہی کے تولیے استعمال کرتے ہیں۔ کمروں میں دروازوں اور کھڑکیوں پر کاغذ کے پردے لٹکاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی کاغذ کے پنکھے، ٹوپیاں چھاتے اور بچوں کے لئے کاغذ کے اور بہت سے کھلونے باہر سے آتے ہیں۔ ان کے علاوہ تم نے بدیسی سامان کی بڑی بڑی دکانوں پر کاغذ کے پھول بھی دیکھے ہوں گے۔

یوں تو ہمارے دیس میں بھی کاغذ کے پھول بنانے کا مشغلہ پرانے زمانے سے چلا آتا ہے۔ مگر جہاں بدیسی ملکوں کے لوگ باقی صنعتوں میں ہم سے بڑھ گئے ہیں، انھوں نے اس فن کو بھی کمال تک پہنچا دیا ہے پھول بنانے کے لئے ایک خاص قسم کا کاغذ استعمال ہوتا ہے، جسے "کریپ پیپر" (CREPE PAPER) کہتے ہیں۔ اس میں رگیں سی ہوتی ہیں۔ اس طرح ٹہنیوں کے لئے قسم قسم کے باریک اور موٹے تار استعمال ہوتے ہیں۔ اس سامان کے ساتھ پھول بنانے کے متعلق انگریزی میں ایک چھوٹا سا رسالہ بھی ملتا ہے۔ پھول بنانے کا یہ طریقہ آسان تو ضرور ہے، مگر تمھارے لئے مہنگا پڑے گا۔ تم پتنگ کے کاغذ سے بھی پھول بنا سکتے ہو اور ٹہنیوں کے لئے تار کی جگہ بانس کی ڈنڈیاں استعمال کر سکتے ہو۔ اس پر لاگت بہت کم آئے گی۔ ہاں محنت زیادہ کرنا ہوگی۔

پھول بنانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ بس ذرا توجہ اور مشق کی ضرورت ہے۔ جب سیر کے لئے باغ جایا کرو تو پھولوں کو غور سے دیکھا کرو۔ اس سے تمھیں پھول، پتوں اور ٹہنیوں کو صحیح طور پر جوڑنے کا ڈھنگ آجائے گا۔ اکثر لوگ گلاب کا پھول بہت پسند کرتے ہیں، اس لئے میں پہلے اسی کے بنانے کی ترکیب بتاتا ہوں۔ اگر تمھیں یہ مشغلہ پسند آیا تو باقی پھولوں کا ڈھنگ بھی بتاؤں گا۔

سامان

ایک چھوٹا سا گملا۔ بانس کا ایک فٹ لمبا ٹکڑا۔ لوہے کا بالشت بھر تار یا موٹی سوئی۔ ایک تیز چاقو

اور قینچی۔ ایک گوبی ناگا۔ لیئی۔ تھوڑا سا کاغذ گلابی رنگ کا۔ اور کچھ گہرے سبز رنگ کا۔

گملا

باغ میں مالی کے پاس تمھارے مطلب کا چھوٹا سا گملا مل جائے گا۔ یا پھر بچوں کے کھیلنے کی مٹی کی لٹیا گملے کا کام دے سکتی ہے۔ اگر ایسی کوئی چیز نہ ملے تو موٹے کاغذ کا گملا خود ہی بنالو۔ دس انچ لمبا۔ چار انچ چوڑا کاغذ موڑ کر اس کے سرے لیئی سے چپکا دو یا ٹانکے لگا دو۔ نیچے کی طرف آدھ انچ کاغذ اندر کو موڑ لو۔ اگر پانچ چھ جگہ سے کتر لو۔ تو آسانی سے مڑ جائے گا۔ ایک اور گول ٹکڑا کتر کر گملے کے اندر کی طرف پیندے پر لیئی سے چپکا لو۔ اب گملے میں گیلی مٹی بھر لو اور ایک اور گول ٹکڑے سے منہ بند کر دو۔ سارے گملے پر سبز کاغذ چپکا دو۔

(۱)

گملے کا پیندا

تاکہ خوب صورت معلوم ہو۔

ٹہنیاں

بانس کی پتلی پتلی ڈنڈیاں تراش لو۔ پانچ بڑی ہوں جن کی لمبائی ۹ انچ ہو۔ اور پانچ چھوٹی چھ انچ کی جو بڑی ڈنڈیوں سے ذرا باریک ہوں۔ ڈنڈیوں کا اوپر کا حصہ چاقو سے تھوڑا سا باریک کر لو۔ اس طرح یہ خم دار بھی ہو جائیں گی۔ باریک سرے پر ایک انچ تک گلابی کاغذ لپیٹ دو۔ اب

(۲)

ٹہنی

پتیوں[۱] کے لئے چھلکے کی طرح باریک باریک تین انچ لمبے ٹکڑے تراش لو۔ یہ پچاس سے کم نہ ہوں۔ اور انھیں سبز رنگ سے رنگ لو۔

پتیاں

آدھا سبز کاغذ لو اور لمبائی کے رُخ چار تہیں

---

[۱] اگر پتیوں کے لئے بانس کے باریک ٹکڑے ٹھیک طرح نہ تراش سکو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ پتیوں کو لیئی سے ڈنڈیوں پر چپکا دو پر یہ ذرا بھدی سی معلوم ہوں گی۔

کرلو۔ ایک تہ کاٹ کر پھر چار تہیں کرو۔ اب اس کی چوڑائی کوئی ڈیڑھ انچ ہوگی۔ اس کے چوکور ٹکڑے کرلو اور شکل نمبر۳، ۴ کی طرح تیس بڑی اور بیس چھوٹی پتیاں بنالو۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ گلاب کی پتیوں

چھوٹی پتی

بڑی پتی

میں رگیں سی ہوتی ہیں۔ تم چاہو تو کاغذ کی پتیوں میں بھی رگیں ڈال سکتے ہو۔ دو تین پتیاں اکٹھی لے کر انھیں دُہرا کرو۔ اب دائیں ہاتھ سے شکل نمبر۵ کی طرح پتی کی نوک ذرا سی اوپر کو موڑو اور انگوٹھے سے دباؤ۔ اسی طرح ساری پتی کو نوک کے گرد لپیٹ لو اور آخیر پر اچھی طرح دباؤ (دیکھو شکل نمبر۶)

کھولنے پر پتیوں میں رگیں نظر آئیں گی۔ اب ہر پتی

پتی کی نوک موڑنے کا طریقہ

پتی کو لپیٹنے کا طریقہ
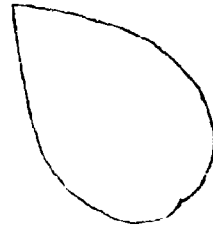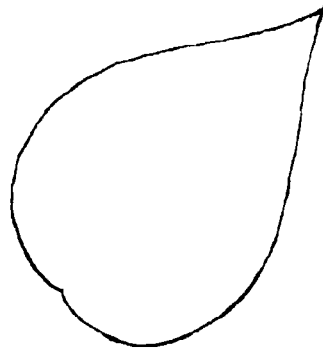
پر بالس کا رنگا ہوا ایک ٹکڑا چپکا دو۔ اور کسی کتاب وغیرہ کے نیچے دبا دو۔ تاکہ اچھی طرح جم جائیں (دیکھو مکمل پتی شکل نمبر۷)

مکمل پتی

پھول کی سری

پھول کی پینڈی کے نیچے تم نے سبز نوکدار پنکھڑیاں سی دیکھی ہوں گی۔ سبز کاغذ کے تین انچ لمبے اور دو انچ چوڑے ٹکڑے کتر لو اور پانچ تہیں کر کے شکل نمبر ۸، ۹ کی طرح پنکھڑیاں کاٹ لو۔ یہ بھی

ایک سری:- پہلو بھی تھوڑے تھوڑے کترنے چاہئیں۔

چار اکٹھی سریاں

پچاس ہونی چاہئیں۔

پھول کی پنکھڑیاں

گلابی کاغذ کا آدھا حصہ لو اور پانچ تہیں کرو جس کی چوڑائی تین انچ ہوگی۔ اب شکل نمبر ۱۰ کی طرح پنکھڑیاں کتر لو۔[2] ایک کاغذ سے ایک سو بیس پنکھڑیاں

پھول کی پنکھڑی

بن سکتی ہیں۔ تین چار پنکھڑیاں اکٹھی لے کر سری کی طرف

---

[1] (نوٹ نمبر ۱) شروع میں پتی میں رگیں بنانا مشکل معلوم ہوگا۔ اس لئے سادہ پتیوں سے کام لو۔

[2] پتی اور پھول کی پنکھڑی کا جو اندازہ اس مضمون میں دیا گیا ہے وہ تقریباً دونوں کا صحیح تناسب ہے۔ اس لئے موٹے کاغذ پر ان کی نقل اتار لو اور اسی سے اپنی پتیاں اور پنکھڑیاں بناؤ تو آسانی رہے گی

سے تار پر لپیٹ لو اور دونوں ہاتھوں میں تھام
کر دباؤ تاکہ اچھی طرح سکڑ جائیں۔ (دیکھو شکل نمبر ۱۱)
اب پنکھڑیوں کو کھول کر دیکھو۔ رگیں پڑ گئی ہوں گی
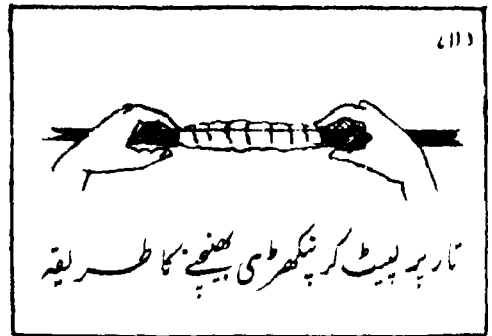
تار پر لپیٹ کر پنکھڑی بھینچنے کا طریقہ

چھوٹے پھول اور غنچے کی پنکھڑیاں پہلو پر مڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ تم بھی تقریباً پچاس پنکھڑیوں کے پہلو تار پر لپیٹ کر ذرا سے موڑ لو۔ جس طرف پہلے پنکھڑی کا سر تار پر رگیں بنانے کے لیے لپٹا تھا پہلو بھی اسی طرف کو لپیٹو۔ پہلو۔ بہت زیادہ نہ موڑنا۔ (دیکھو شکل نمبر ۱۲) اب پنکھڑیوں کو شکل نمبر ۱۳
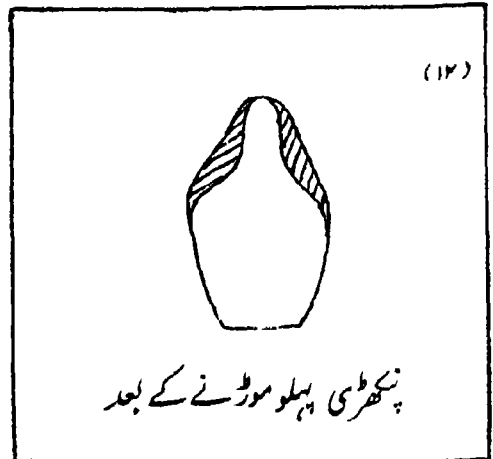
پنکھڑی پہلو موڑنے کے بعد

کی طرح دونوں ہاتھوں میں اس طرح لو کہ مڑے

پنکھڑی کو پیالے کی صورت خم دار کرنے کا طریقہ

ہوئے پہلو تمہاری انگلیوں کی طرف رہیں۔ پنکھڑیوں کے درمیان میں انگوٹھوں سے دباؤ ڈالو تاکہ اُن کا پیٹ پیالے کی طرح ہو جائے۔

پھول مکمل کرنا

ایک پنکھڑی لو اور اس کے نچلے حصے کو ڈنڈی کے کاغذ والے سرے کے ساتھ چٹکی سے مضبوط پکڑو۔ اس کے آگے دوسری پنکھڑی اس طرح لگاؤ کہ یہ پہلی پنکھڑی کا ایک پہلو ڈھانپ لے۔ اسی طرح تیسری پنکھڑی جوڑ دو۔ ہر پنکھڑی اپنے سے پہلی پنکھڑی کا ایک حصہ ڈھانپے رہے (دیکھو تصویر نمبر ۱۴) پہلے پہلو مڑی ہوئی پانچ پنکھڑیاں لگاؤ۔ بعد میں دس دوسری لگاؤ۔ اور دم پر تاگے سے مضبوط باندھ دو۔ اگر پھول کی دم بہت بھاری ہو تو احتیاط سے نیچے سے تھوڑا سا کاغذ کتر لو۔ پنکھڑیاں

لپیٹتے وقت خیال رہے کہ درمیان کی پنکھڑیاں اوپر

... پنکھڑیاں ... دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی ہے
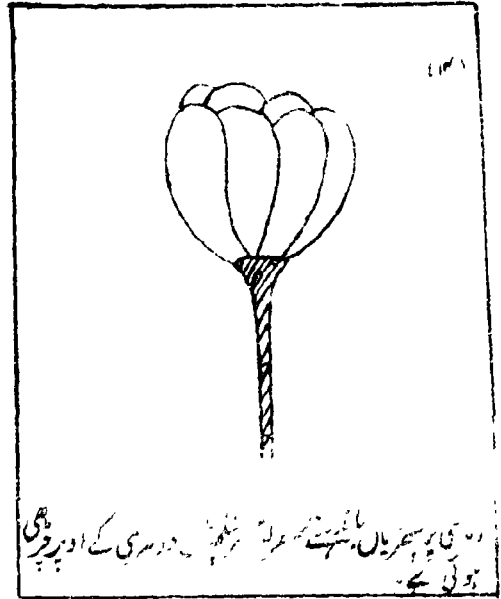
کو ابھر نہ آئیں۔ یعنی سب کے سر ہموار رہیں۔ ہاں مڑے ہوئے پہلو باہر کو ہونے چاہئیں، تاکہ پھول کھلا ہوا دکھائی دے۔ چھوٹے پھول میں صرف دس پنکھڑیاں لگاؤ۔ یہ بڑے پھول سے ذرا گھٹا ہوا ہونا چاہیے۔ غنچے پر تین یا چار پنکھڑیاں کافی ہوں گی جو ایک دوسرے سے لپٹی رہیں۔ پانچ بڑے پھول، تین چھوٹے اور دو غنچے بناؤ۔ ان سب کے پیندے کے نیچے سبز سریاں اس طرح چپکاؤ کہ آدھ انچ سے کچھ زیادہ پھول سے باہر نکلی رہیں۔ بڑے پھول پر پانچ چھوٹے پر چار اور غنچے پر تین کافی ہوں گی۔

ٹہنیاں مکمل کرنا:۔

اول غنچے اور چھوٹے پھول مکمل کرو۔ سبز کاغذ کی ڈیڑھ انچ چوڑی پٹی لو جیسے پتیاں بنانے کے لئے کیا تھا۔ اس کو پھر دہرا کرو۔ اور ایک سرے پر لیئی لگا کر پھول کے پیندے پر لپیٹو۔ اس سے نیچے ڈنڈی پر لپیٹتے جاؤ۔ اور مناسب موقع پر پانچ چھ پتیاں بیچ میں ساتھ ہی ساتھ لگاؤ۔ ڈنڈی کے سرے پر کاغذ کو پھر لیئی سے چپکا دو۔ اور پوری ڈنڈی پر انگلی سے لیئی مل دو۔ تاکہ کاغذ کھل نہ جائے۔ اگر شروع ہی سے کاغذ پر لیئی لگا کر لپیٹنا شروع کرو تو اور بھی آسانی ہوگی۔ پتیاں ایک دوسرے کے مقابل اوپر نیچے کرکے لگاؤ۔ اس کے بعد بڑے پھول کی ڈنڈی پر اسی طرح کاغذ لپیٹو اور مناسب موقع پر ایک چھوٹا پھول یا غنچہ لگا لو۔ ان کے جوڑ پر تاگا لپیٹ لینا چاہیے۔ تاکہ مضبوط رہے۔ پھول کے ساتھ جس موقع پر غنچہ وغیرہ باندھنا ہو وہاں تک پہلے کاغذ ڈنڈی پر لپیٹ لو۔ اگر انھیں پہلے باندھ دیا تو پھر کاغذ لپیٹنے اور پتیاں لگانے میں تکلیف ہوگی۔ اگر پتیوں کے ساتھ بانس کے ٹکڑے لگے ہوں تو وہ کاغذ لپیٹتے وقت بیچ میں پھنسلاتے جاؤ۔ بانس کے ٹکڑے نہ ہوں تو پھر پہلے ڈنڈی پر کاغذ لپیٹ لو اور ذرا خشک ہو جانے پر پتی کی دم پر ذرا سی لیئی لگا کر ڈنڈی پر مناسب فاصلے پر چپکاتے جاؤ۔ اس طرح پھول مکمل کرنے کے بعد گملے میں مناسب طور پر لگاؤ۔

چاند کی مہم

جناب سید ابو طاہر صاحب ، بی ایس سی (لنگ)

خبر — کچھ ہنسنے کی بات ہے کہ میں اپنے دوست واحدی کے یہاں بیٹھا ہوا ریڈیو سن رہا تھا۔ "دلی سے بولتے ہیں : خبریں پھیلانے والا کہہ رہا تھا "کلکتے سے ابھی ایک دل ہلا دینے والی اطلاع آئی ہے کہ وہ دیا پور میں دوپہر کے وقت ہوا کا ایک انوکھا طوفان آیا ہے جس کی نہ تو وجہ سمجھ میں آتی ہے اور نہ دنیا میں اس جیسی کوئی دوسری مثال ملتی ہے کہتے ہیں کہ۔

واحدی نے "اونہہ" کر کے ریڈیو کی سوئی بمبئی کے اسٹیشن پر لگا دی لیکن میں دیا پور کا نام سنتے ہی کانپنے لگا تھا اور میرے منہ سے بات تک نہ نکلتی تھی میں نے آن کی آن میں واحدی کو بیچ میں سے ہٹا کر ریڈیو کی سوئی کو دوبارہ دہلی پہنچا دیا اور خود وہیں کھڑا ہو کر سننے لگا۔

آواز پھر آنے لگی " یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے کہ چاروں طرف کی ہوا کا بھرپور زور بابو رتن سین زمیندار کے محل کی چھت کے اوپر تھا۔ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس جگہ ہوا کا اتنا زبردست بھنور بن گیا تھا کہ ایک حصے کی پوری چھت دیواروں پر سے خود بخود بلند ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کسی دیو نے اپنے ہاتھوں پر اٹھا لی ہو۔ آن کی آن میں چھت کا یہ حصہ پانسو فٹ کی بلندی پر پہنچ کر چکر کاٹنے لگا۔ اور اس کی اینٹیں اور کڑیاں ہوا میں اس طرح بکھرنے لگیں کہ جیسے ٹھوس چیزوں کا مینہ برس رہا ہو۔ اس سے بڑھ کر نرالی بات یہ ہوئی کہ کمرے کے اندر کی تمام چیزیں چھت کے کھلے ہوئے حصے میں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اڑ اڑ کر باہر آ رہی تھیں اور ہوا کے سمندر میں قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا کر گرتی تھیں ملک کی بڑی بدنصیبی ہے کہ اس کمرے میں ہمارے دیس کے ودیا جوت پروفیسر نرنجن پال اور ان کے نوجوان مددگار مسٹر عرشی بھی . . . . . "

آہ میں نے اپنا دل دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ میرے منہ سے بھائی عرشی کی ایک چیخ نکلی اور مجھے نہیں معلوم کہ بعد کو کیا ہوا۔

بھائی عرشی

میں اور بھابی رباب دگڈو بھائی کو ساتھ لے کر شام کی گاڑی سے کلکتہ روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت واحدی نے مجھے ریڈیو کی باتی خبر سنائی تھی کہ پروفیسر اور بھائی عرشی دونوں زندہ ہیں لیکن تھوڑے زخمی ہو گئے ہیں۔ لیکن مجھے اس بات پر کوئی یقین نہیں تھا کیونکہ درد مندوں اور دکھیوں کی تسلی کے لئے بہت سی ایسی باتیں کہنی پڑتی ہیں جو واقعہ کے خلاف ہوتی ہیں۔ راستے بھر میری آنکھوں کے سامنے عرشی بھائی کی تصویر تھی اور کانوں میں اُن کی آواز۔ جب میں بھابی رباب کے چہرے کی طرف نظر کرتا تھا تو مجھے اور بھی دکھ ہوتا تھا۔ خیر خدا خدا کرکے ہم کلکتہ پہنچے۔ پلیٹ فارم پر میں نے اسٹیشن کا تازہ پرچہ خرید کر پڑھا تو واحدی صاحب کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ اس پرچے سے اتنا اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں مشن ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ لیکن اُن کی زندگی چاقو کی دھار پر ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم ہسپتال کے دروازے پر پہنچ گئے اور ڈاکٹروں کو اپنے آنے کی اطلاع دے کر دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے لگے۔ ہمیں بڑی نا امیدی ہوئی جب ڈاکٹروں نے کہا کہ ابھی ہمیں تین چار دن تک انھیں بغیر دیکھے رہنا پڑے گا۔ آخر مجبور ہو کر ہم اپنے ایک عزیز مسٹر نجم الحسن زیدی کے یہاں ٹھہر گئے۔ ایک ہفتے کے بعد ہمیں اجازت دی گئی کہ ہم نہ صرف انھیں دیکھ ہی سکتے ہیں بلکہ اُن کے پاس رہ بھی سکتے ہیں۔ ہم نے کمرے میں پہنچ کر وہ سین دیکھا ہے کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ عرشی بھائی کے جسم پر ایسی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں کہ وہ مصر کے مقبروں کی "ممی" معلوم ہوتے تھے۔ نہ تو وہ بات کر سکتے تھے اور نہ ہل سکتے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر مسکرائے۔ شاید ڈاکٹروں نے انھیں ہمارے آنے کی اطلاع پہلے ہی سے دے دی تھی۔ اسی لیے انھیں ہم کو دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوا بھابی رباب کو جن کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو اُبلے پڑتے تھے بھائی عرشی نے بڑی یاس سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ ہم سب کے سب گونگے بن گئے تھے اور سوائے ایک دوسرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے اور کچھ نہ کر سکتے تھے۔

نرنجن پال

رات کو ایک بجا ہوگا۔ بھائی عرشی سو رہے تھے۔ بھابی رباب آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں اور میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا اور ایک ایسا شخص اندر داخل ہوا جسے دیکھ کر میں قریب تھا کہ چیخ مار کر بے ہوش ہو جاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہزار سال کا مردہ سفید کفن کی دھجیاں لپیٹے قبر سے اُٹھ کر بھاگ آیا ہے لمبی سی داڑھی۔ انڈے جیسا چکنا سر۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں اور اُن کے اُبھرے ہوئے حلقے۔ دیوالوں جیسا چہرہ۔ وہ آتے ہی چلّایا "عرشی"! عرشی بھائی نے

فوراً آنکھیں کھول دیں اور اطمینان سے اس کی طرف دیکھا۔

پھر وہ ہماری طرف دیکھ کر کہنے لگا "تم نے ان لوگوں کو بلا لیا؟"

عرشی بھائی نے سر ہلا دیا۔

پھر وہ محبت بھری نگاہوں سے بھائی رباب کی طرف دیکھ کر کہنے لگا "بیٹی ڈرو مت" اس کے بعد وہ کھڑکی کے قریب جاکر آسمان پر بلند ہوتے ہوئے چاند کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں سسکیاں لے کر کہنے لگا۔ اے آکاش کے سندر چندر ماں! تو اپنے ہاتھ بڑھا کر مجھے اُٹھا کیوں نہیں لیتا۔" پھر وہ عرشی بھائی کی طرف پلٹ کر آہستہ سے کہنے لگا "عرشی! اگر طوفان نہ آیا ہوتا تو اب تک ہمارا کرّہ تیار ہو چکا ہوتا اور ہم دونوں چاند کی منزلیں طے کر رہے ہوتے۔ (درد بھری آواز میں) عمر بھر کی محنت ایک ذراسی بھول کی وجہ سے برباد ہو گئی۔"

میں نے دیکھا کہ عرشی بھائی رو رہے ہیں۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ یہی پروفیسر نرنجن پال ہے کیونکہ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ چاند کے سفر کے خواب دیکھا کرتا ہے۔

"عرشی"! وہ پٹی کے پاس کھڑا ہو کر کہنے لگا میں چپکے سے بستر سے اُٹھ کر بھاگ آیا ہوں۔ (آہستہ سے) مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے (اور آہستہ) ہم جب اچھے ہو جائیں گے تو سرکار ہمارے اوپر مقدمہ چلائے گی کہ یہ تمام طوفان ہماری وجہ سے آیا ہے۔ رتن سین ہم پر اپنے محل کے نقصان کا دعویٰ کرے گا اور جتنے آدمیوں کی جان اور مال کا نقصان ہوا ہے اس کا جواب بھی ہمیں ہی دینا پڑے گا (مٹھیاں بھینچ کر) کاش! میں کڑھائی کو بھٹی میں پھنسا دیتا۔ اُف! بس ایک ہی ترکیب ہے کہ میں دیوانہ بن جاؤں۔ پھر یہ لوگ کچھ نہ کرسکیں گے مگر تمھارے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلے۔ خبردار اتنا کہنے کے بعد انھوں نے دیوانہ پن سے غل شور مچانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے آکر انھیں پکڑ لیا اور کمرے میں بند کر دیا۔

مقدمہ

پروفیسر دیوانے ہو چکے تھے اس لئے اُن کو یورپ جانے کی اجازت مل گئی، رہ گئے عرشی بھائی تو اب ان پر مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ تاج کے وکیل نے جج صاحب کے سامنے گرجتی ہوئی آواز میں اُن پر بہت سخت الزام لگائے تھے اور اب جرح ہو رہی تھی۔ عرشی بھائی نے کوئی وکیل نہیں کیا تھا بلکہ وہ خود اپنے وکیل تھے

وکیل:- می لارڈ! میں ملزم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس کی ملاقات پروفیسر نرنجن پال سے کہاں ہوئی تھی؟

عرشی :۔ میں اُن سے کلکتہ کے چڑیا خانے میں ملا تھا۔ ہم ایک ذہین بندر سے باتیں کرنے کی مشق کیا کرتے تھے۔

وکیل کیا تم بندر کو اپنی زبان سکھا رہے تھے یا خود اس کی زبان سیکھ رہے تھے (قہقہہ)

عرشی۔ جی نہیں میں اس کو وکیل بنانے کی کوشش کر رہا تھا (قہقہہ)

وکیل۔ میں می لارڈ سے اپیل کرتا ہوں کہ ملزم عدالت کے کمرے میں میری ہتک کر رہا ہے۔

جج :۔ آپ آگے بڑھ سکتے ہیں۔

وکیل۔ اس ملاقات کے بعد کیا ہوا۔

عرشی۔ ہم دوست بن گئے اور پھر وزیا پور میں بابو رتن سین کے پرانے محل میں آکر رہنے لگے۔

وکیل وہاں کتنے دن رہے ؟

عرشی ایک سال

وکیل کیوں ؟

عرشی۔ میں سائنس کے تجربوں میں ان کی مدد کیا کرتا تھا۔

وکیل تم نے یہ کام کیوں قبول کیا ؟

عرشی۔ میرے دل میں کوئی بڑا کام کرنے کی آرزو تھی۔ پروفیسر مجھ سے بہت خوش تھے۔ اس لئے میں وہاں رہ گیا۔

وکیل پروفیسر کس قسم کے تجربے کرتے رہے۔

عرشی۔ پروفیسر پچیس سال سے کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح چاند کا سفر کر سکیں۔

وکیل (جج سے) می لارڈ! افسوس ہے کہ پروفیسر پر مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا۔ لیکن ملزم نمبر ۲ اس جرم میں برابر کا شریک ہے۔ اس نے خدا کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔

جج ۔ کس طرح ؟

وکیل۔ اس کو زمین پر پیدا کیا گیا تھا اور یہ چاند پر جانا چاہتا تھا۔

جج ۔ ملزم جواب دے۔

عرشی ۔ وکیل صاحب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں پیدا ہوئے تھے ؟

وکیل۔ میں الہ آباد میں پیدا ہوا تھا۔ کیوں ؟

عرشی حضرات! کیا آپ نے کلکتہ آکر خدا کے قانون کو نہیں توڑا ؟ قہقہہ

[وکیل بولنے کی کوشش کرتا ہے جج خاموش رہنے کا اشارا کرتا ہے]

جناب حرکت کرنا خدا کا قانون ہے۔ میں آپ کو وطن چھوڑنے کی حرکت پر ملزم نہیں ٹھہراتا۔ آپ جس قانون سے مدد لے کر کلکتہ آگئے میں اسی قانون کی مدد سے چاند کا سفر کر رہا تھا۔ یہ تو اپنی اپنی ہمت ہے۔

وکیل۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میری اس حرکت سے سرکار اور اس کی رعایا کے جان اور مال کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ مگر آپ کی حرکت کے ارادے ہی سے قیامت آگئی۔

جج۔ یعنی ؟

وکیل۔ میں سرکار کے قانون کے ماتحت ملزم کو مجرم قرار دیتا ہوں کہ اس نے ایک دیوانے پروفیسر کے خطرناک تجربوں میں حصہ لے کر غریب رعایا کے جان اور مال کو نقصان پہنچایا ہے۔ میں ملزم کو ذمہ دار ٹھہراتا ہوں کہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۲ء کو دریا پور میں جو طوفان آیا تھا وہ قدرتی نہیں تھا۔ بلکہ ملزم کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ملزم کا یہ جرم سوسائٹی کے لئے ایسا ہی تھا جیسے کسی شخص کا بم بنا کر چھوڑنا ہو سکتا ہے۔ اس طوفان سے وہاں کی آبادی کو چھ لاکھ پچیس ہزار روپے کا نقصان ہوا ہے اور بیس تندرست آدمی زخمی ہو گئے ہیں۔ میں می لارڈ سے اپیل کرتا ہوں کہ ملک کے قانون کو سامنے رکھ کر ملزم کو پوری سزا دی جائے۔

جج۔ کیا تم ملزم کو جادوگر ثابت کر رہے ہو ؟

وکیل۔ میں ثبوت کے لئے آب و ہوا کے محکمے کی رپورٹ پیش کرنا چاہتا ہوں جس سے معلوم ہوگا کہ اس روز بنگال اور خلیج بنگال میں طوفان آنے کا کوئی سبب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے تمام رپورٹیں چھان ماری ہیں لیکن دنیا میں ایسے طوفان کی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ دیواریں کھڑی رہیں اور چھت خود بخود اُٹھ کر ہوا میں تیرنے لگے۔

جج۔ ملزم جواب دے۔

عرسی۔ می لارڈ اگر انسان آنے والے واقعات کا صحیح صحیح پتہ چلا لیا کرتا تو آج میں پروفیسر کے ساتھ چاند کی سطح پر بیٹھا ہوا وکیل صاحب کے اوپر قہقہے لگاتا ہوتا۔ وکیل صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ آب و ہوا کی سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ ہم اس کے محکمے کی رپورٹ کو کسی نبی کا حکم سمجھ کر مان لیں۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ ہوا پانی کے پروفیسروں نے بارش ہونے کا حکم لگایا ہے تو دھوپ نکل آئی ہے اور بوندا باندی کا حکم لگایا ہے تو جل تھل بھر گئے ہیں۔ اگر انسان کو اتنی ہی قدرت ہوتی تو آج ہوائی جہاز چلانے والے طوفان آنے کا وقت بھی اسی طرح دریافت کر لیا کرتے جس طرح ہم پنجاب میل کا وقت معلوم کر لیتے ہیں۔ مجھے وکیل صاحب کی عقل پر ہنسی آتی ہے کہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان سائنس کے

ذریعے دنیا کی ہواؤں پر حکم چلا کر دریا پورتیا طوفان اٹھا سکتا ہے۔ جناب ہم ہواؤں سے کام تو لے سکتے ہیں لیکن اُن پر حکم نہیں چلا سکتے۔ میرا خیال ہے کہ وکیل صاحب طلسم ہوش ربا کی داستان پڑھ کر آئے ہیں۔ افسوس ہے کہ وہ مجھے خدائی کا مرتبہ دے کر خدا کے قانون کو خود توڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔"

مقدمہ خارج کر دیا گیا۔

"زندہ باد" بھائی عرشی

نئے خوبصورت ٹکٹ خاص سالگرہ کے لئے

پیام تعلیم کی سالگرہ کی مسرت میں پانچ روپے یا اس سے زائد کی خریداری پر علاوہ محصول ڈاک کی معافی کے ہم فی روپیہ دو آنے کی رعایت بھی کریں گے۔ باقی شرائط حسب سابق۔

۵ بلجیم ملکہ آسٹرڈ ماتمی سیاہ حاشیہ ۹ر ۵ بلجیم پرنس باڈون ۹ر ۵ بلجیم شہزادی شارلٹ ۹ر ۲۵ اٹلی خوبصورت یادگاری ۱۸ اسپین گویا کی شہزادی مکمل سٹ ہے ۳ نیوزیلینڈ کارونیشن غیر مستعملہ ۲ار مستعملہ ۱۴ر ۶ منگولیا ۷ر ۵۰ مختلف اسلامی ممالک ۱۲ ۷۵ مختلف اسلامی ممالک ۱۲ر ۱۰۰ مختلف اسلامی ممالک ۱۴ ۲۵ بھوپال مختلف ۱۲ر ۲ بوسنیا مکمل ۲ر ۲ یونان خوبصورت غیر مستعملہ ۲ر ۱۲ یونان خوبصورت مستعملہ ۸ ۵۰ ہنگری مختلف ۳ر ۲ ہنگری اسٹیفن ۳ر ۱۱ مراکو ایڈورڈ ہشتم مکمل ۱۵ ۲۰ ایران احمد شاہ مکمل ۱۲ ۱۲ انبا ما سرچارج ۱۲ ۷ لائیبیریا سرچارج ٹوگو وغیرہ ۱۲ ۵۰ برطانیہ ۱۲ ۱۰۰ افریقی کالونیاں ۱۲ ......

گذشتہ اشتہاروں کے ٹکٹ بھی مل سکتے ہیں۔ گر رعایت صرف اسی اشتہار کے ساتھ مخصوص ہے ہم دیا سلائی کے لیبل بھی فروخت کرتے ہیں۔ ارجنٹ تفصیلی فہرست طلب فرمائیے۔

صدیقی برادرس
سیف آباد حیدر آباد دکن

SIDDIQI BROS
SAIFABAD
HYDERABAD (Dn)

کیمپنگ

محمد یوسف صاحب بی اے جامعہ

اگر تمھیں دو چار روز کی چھٹی مل جائے تو سب سے بہتر مشغلہ یہی ہے کہ دو چار ساتھیوں کے ساتھ اپنے گھر سے کچھ دور دیہات میں بسنے کی زندگی بسر

کرو۔ اس سے تمھاری تفریح بھی ہو گی، دماغ بھی تازہ ہوگا، تندرستی کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اور دیہاتی زندگی کے بارے میں تمھاری معلومات بھی بڑھیں گی۔
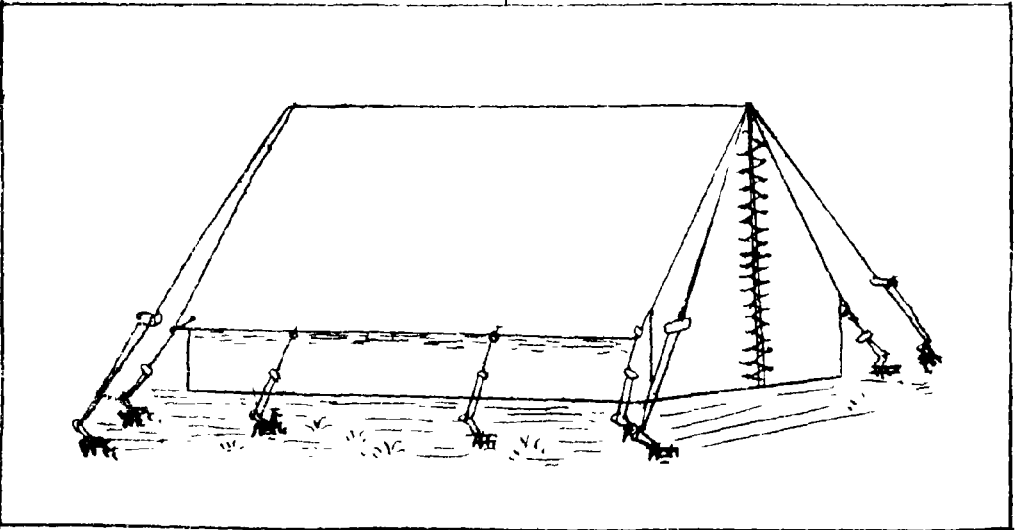
دوسرے ملکوں میں تو لڑکے اپنے خیمے بھی خود ہی بنا لیتے ہیں مگر تم ابھی یہ نہیں کر سکتے۔ ابھی تو یہی غنیمت ہے کہ تم ہماری بات پر کان دھرو اور دو چار روز کی چھٹیوں میں اس تفریح کا تجربہ کر کے دیکھو۔ خیمے ہر شہر میں کرایہ پر نہایت سستے داموں مل جاتے ہیں۔

جانے سے پہلے خیمے کے علاوہ یہ سامان اکٹھا کر لو۔ دیگچیاں، کڑھائی، فرائی پان، پلیٹیں (ضرورت کے مطابق) ڈونگا، دسترخوان

کرمچ کا ڈول۔ دو نیچے بچھانے کے لئے فرش، جن پر پانی اثر نہ کرسکے، کمبل، سوئی ڈورا، ڈبوں کو کھولنے والا چاقو۔ پیچ کش۔ لالٹین، ٹارچ، چند دوائیاں، پہننے کے کپڑے اچھے سے اچھے۔ ان کے علاوہ جو سامان تم موسم اور موقع کے لحاظ سے ضروری سمجھو۔

اب یہ طے کرنا ہے کہ خیمہ کہاں گاڑا جائے۔ ایک ہی جگہ رہنا پسند کرو۔ چاہے جگہ بدلتے رہو۔ بہرحال اس جگہ کے کسانوں سے مشورہ کرو۔ وہ تمھیں خوشی سے اپنے کھیتوں میں خیمہ لگانے کی اجازت بھی دے دیں گے۔ اور مشورہ بھی ٹھیک دیں گے۔ اس لئے کہ اُن کے دودھ، دہی، مکھن اور انڈوں وغیرہ کی بکری ہوگی۔

خیمہ ہمیشہ ڈھلوان زمین پر لگاؤ۔ اس کا دروازہ دکھن کی طرف ہو۔ اس کا بھی خیال رکھو کہ گھاس چھوٹی ہو اور سخت نہ ہو۔ لمبی اور سخت گھاس سے نمی پیدا ہوتی ہے۔ خیمہ ایسی جگہ کے قریب ہو جہاں تازہ پانی آسانی سے مل سکے۔ اگر نل، پمپ یا کنوئیں کا پانی نہ مل سکے تو اُسے اُبال لینا ضروری ہے۔ خیمہ کسی درخت کے نیچے نہ گاڑنا چاہیئے۔ اس کے دروازہ کا رُخ کسی جھاڑی کی طرف بھی نہ ہو کیونکہ اس سے ہوا رُکتی ہے۔ پہاڑ کی چوٹی پر بھی خیمہ نہ لگانا چاہیئے۔

خیمہ کھڑا کرلینے اور کھونٹے گاڑ لینے کے بعد خیمے کے پیچھے اور دونوں طرف پانی کے نکاس کے لئے ایک نالی کھودلو۔ اس نالی کے ساتھ ساتھ مٹی کے ڈھیلوں سے خیمے کی طرف ایک منڈسی بنادو اس سے خیمے کا فرش ہمیشہ خشک رہے گا۔

آگ خیمے کے قریب نہ جلانا، نہ خیمے کے دروازے کے آگے۔ ہوا سے اکثر دھواں اندر چلا جاتا ہے۔ جہاں آگ جلانا ہو وہاں کی گھاس چھیل دو۔ اور جب اس جگہ کو چھوڑو تو پھر وہاں گھاس جما دو۔ کھانا دھیمی آگ پر پکانا چاہیئے۔

خیمے کی صفائی کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھو خیمے کے اوپری اور نچلے حصے کو دھونا ضروری ہے، گندے اور ناپاک پانی کے لئے خیمے سے دور گڑھا کھود لو۔ کوڑے کرکٹ کو جلا دو۔ اور باقی کو زمین کھود کر گاڑ دو۔ اگر ان باتوں کا خیال رکھوگے تو مکھیاں نہ پیدا ہوں گی۔ جہاں تک ممکن ہو خیمے کے دروازے کھول کر سوؤ۔ دن میں دروازے کا کپڑا اور دونوں طرف کی دیواروں کا کپڑا اوپر ڈال دو۔ فرش ہر صبح کو اُٹھا دو۔ تمام کپڑوں اور بستر کو ہوا دینا بھی ضروری ہے۔

کبھی کبھی کھانے کا مسئلہ بہت اہم بن جاتا ہے ٹین کی چیزیں زیادہ استعمال نہ کرنی چاہئیں۔ ترکاریاں زیادہ کھاؤ۔ بہت زیادہ کھانا اپنے ساتھ نہ رکھو۔ اس کے

رکھنے کے لئے تمھارے پاس جگہ کہاں ہے

سوکھی لکڑیاں تمھیں آسانی سے مل جائیں گی قریب کی جھاڑیوں میں تلاش کرو۔ آگ چھوٹی چھوٹی لکڑیوں سے جلاؤ۔ ہاں رات کو خیمے میں کچھ سوکھی ہوئی لکڑیاں ضرور رکھ لو۔ صبح کو بارش ہوگئی تو دقت ہوگی۔

اگر تم سیر گشت کو جانا چاہو تو خیمے کو کھلا چھوڑ دو۔ وہاں کھانا کسی اونچی جگہ رکھ دو۔ اگر بارش آجائے تو بھیگو مت خیمے میں آجاؤ۔ اور بارش کا لطف اٹھاؤ سچ پوچھو تو بارش کا لطف کچھ دیہات ہی میں ہے۔

اگر جنگلی جانوروں کا خطرہ ہو تو خیمہ چھوڑتے وقت اسے رسیوں سے خوب کس دو۔ اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔ چند شوقین لوگ اسی طرح خیمے کی زندگی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔ رات کو خیمے میں ایک سور گھس آیا۔ خیمے والوں نے اُسے آدمی سمجھ کر خوب کہنیاں ماریں۔ صبح کو معلوم ہوا کہ ایک سور گرمی کی تلاش میں خیمے میں آگیا تھا۔ لیکن تمھیں اس سے ڈرنا نہ چاہیئے۔ سوتے وقت اپنے خیمے کا دروازہ کھلا رکھو ہاں روک کے لئے دروازے کے سامنے دو تین لکڑیاں گاڑ دو۔

ایک بات کا اور خیال رکھو۔ رات کو بارش ہونے لگے تو خیمے کے رسّے ڈھیلے کر دو۔ ورنہ پانی میں بھیگ کر یہ رسّے سکڑ جائیں گے اور خیمہ تم پر گر پڑے گا۔

اگر تم نے اوپر لکھی ہوئی باتوں کا خیال رکھا تو کیمپنگ میں تمھیں بڑا مزا آئے گا اور تمھاری چھٹیاں ایسے لطف سے گذریں گی کہ بس بیان سے باہر!

ہمارا کیمپ

ممتاز احمد پھلاحی
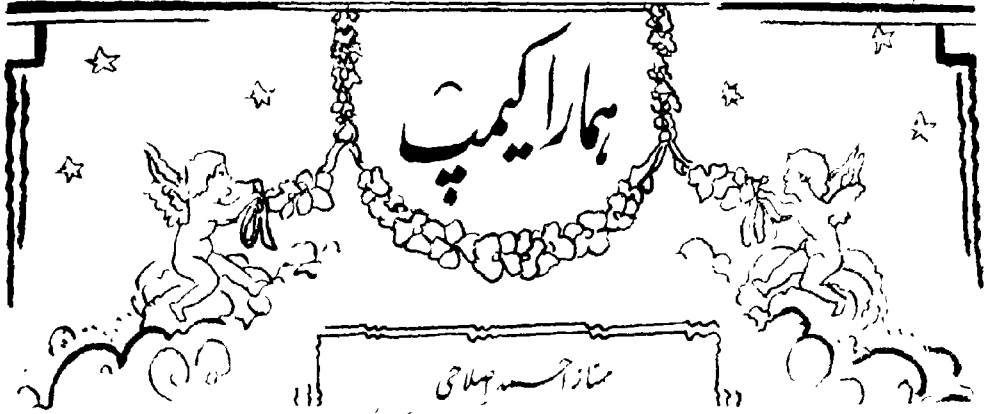
استادوں کے مدرسے کے طالب علم پچھلے دنوں کیمپنگ کے لئے دہلی سے باہر گئے تھے۔ ہماری درخواست پر کیمپ کے نگراں جناب الطاف علی صاحب نے مدرسے کے ایک ہونہار طالب علم سے یہ مضمون لکھوایا ہے جسے ہم شکریے کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ ایڈیٹر

ہمیں کوئی ایک مہینہ پہلے سے معلوم تھا کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں دہلی سے باہر کسی دیہات میں دس دن گذارنا ہوں گے۔ آخر خدا خدا کرکے وہ مبارک دن آہی گیا۔ تیاریاں شروع ہوئیں بستر باندھے گئے کھانے پینے کا تمام سامان ساتھ لیا گیا۔ اور کوئی چار بجے شام کو چل کھڑے ہوئے۔ طے یہ ہوا تھا کہ لوگ کیمپ کے انتظام کے لئے الطاف علی صاحب کی نگرانی میں لاری پر جائیں۔ باقی سب پیدل۔ اسکاؤٹ لیڈر کی ہدایت کے مطابق سب کے پاس ایک ایک لاٹھی، ایک ایک وسل اور رسی تھی۔ ہم لوگ ہنستے کھیلتے نئی دہلی اور راستے کے پر لطف منظر کا لطف اٹھاتے۔ کوئی چھ بجے ہمایوں کے مقبرے پر پہنچ گئے۔ ہاتھ منہ دھویا اور مغرب کی نماز پڑھی۔ کھانا پہلے سے آگیا تھا۔ وہیں دستر خوان بچھ گیا۔ چاندنی رات میں کھانے کا بہت لطف آیا کھانے سے فارغ ہوکر کچھ لوگ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر گئے۔ وہاں سے واپسی پر معلوم ہوا کہ ایک صاحب بے ہوش ہوگئے ہیں۔ بہت مشکل سے ایک گھنٹے کے بعد ہوش میں آئے پہلے خیال تھا کہ رات یہیں گذاری جائے مگر اس واقعے کا لوگوں پر اتنا اثر تھا کہ سیدھے چل کھڑے ہوئے اور کوئی ۱۱ بجے جامعہ نگر جاکر دم لیا۔ صبح کو اپنے کیمپ پہنچے۔ یہ جامعہ نگر کی عمارت سے کوئی ۲ فرلانگ آگے جمنا کے کنارے پر تھا۔ ہمارے نگراں الطاف صاحب پہلے ہی سے انتظار کر رہے تھے۔ ناشتے

کے بعد ہم سب اپنے اپنے خیمے ٹھیک جگہ لگانے میں لگ گئے پھر پروفیسر سرور صاحب کے ساتھ دریا میں خوب نہائے۔ وہاں سے آکر کھانا کھایا اور پڑ کر سو رہے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی سونے کے لئے جو لیٹے تو کوئی چار بجے الطاف صاحب کی وِسل پر اٹھے [illegible] وغیرہ پہن کر تیار ہوئے اور اد کھلا چلے۔ وہاں تھوڑی دیر تک کھیلتے رہے۔ گاؤں والوں کو بھی بلایا۔ [illegible] نفیس کوئی دلچسپی نہیں ہوئی۔ وہاں سے لوٹے تو [illegible]ب کا وقت ہوگیا تھا۔ نماز پڑھی اور کھانا کھایا۔ پھر [illegible]فائر کی تیاری شروع ہوئی۔ ہر شخص کو اپنے خیالات بات ظاہر کرنے کی آزادی تھی کوئی ایک گھنٹے تک [illegible]سلہ جاری رہا اور بہت کافی دلچسپی رہی کوئی ۹ بجے [illegible]ے کا ارادہ کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے آکر [illegible]میں نے اپنے خیمے کے پاس سانپ مارا۔ کسی نے کہا میں نے دو بچھو دیکھے۔ باورچی خانے کا کیمپ بالکل الگ تھا۔ باورچی نے خبر دی کہ میں نے دو آدمیوں کو [illegible]ت کی آڑ میں بات چیت کرتے دیکھا ہے۔ دو آدمی [illegible]معہ نگر گئے تھے وہ بھی کچھ گھبرائے ہوئے سے آئے کہنے لگے ہم ابھی راستے میں پندرہ ، بیس سٹھ بند دیکھ کر [illegible]آ رہے ہیں۔ یہ جگہ تھی بھی واقعی کچھ مخدوش۔ ہر طرف پہاڑیاں اور گھنے درخت تھے۔ پانی بھی بہت فاصلے [illegible]تھا۔ اس لئے طے ہوا کہ صبح کو جگہ بدل دی جائے۔ یہ [illegible] اکثر ساتھیوں نے جاگ کر گذاری۔

دوسرے دن صبح کو تھوڑی دور آ گئے، اچھی سی جگہ مل گئی۔ یہ بالکل کھلی ہوئی تھی۔ کیڑے مکوڑوں کا بھی ڈر نہیں تھا۔ پانی بھی قریب تھا۔ ایک طرف دریا تھا۔ دوسری طرف نہر۔ مگر یہاں ایک دوسری آفت کا سامنا ہوا۔ چاروں طرف جدھر دیکھو مکھیاں ہی مکھیاں اس سے کچھ ایسی طبیعت گھبرائی کہ طے کر لیا گیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک میل کے فاصلے پر گندے پانی کا تالاب ہے اس کی وجہ سے یہ مصیبت ہے مکھیاں تالاب کے چاروں طرف چار پانچ میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ پرنسپل صاحب کو ٹیلیفون کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ لوگ گھبرائیے نہیں میں مچھر دانیاں فلٹ اور چقیں بھیجتا ہوں۔ خدا خدا کر کے شام ہوئی تو مکھیوں سے نجات ملی چاندنی رات میں یہاں کا منظر اتنا سہانا تھا کہ دن کی ساری مصیبتیں بھول گئے۔ کھانا کھایا اور کیمپ فائر شروع ہوا۔ آج ہم گاؤں والوں کو بھی بلا آئے تھے وہ بھی آکر شریک ہوئے اور بہت دلچسپی لیتے رہے۔ کیمپ فائر کے ختم ہونے پر سونے کی تیاری شروع ہوئی۔ آج سب نے مل کر طے کیا کہ ہر رات ایک گروپ[1] رات بھر پہرا دے۔

---

[1] ہم سب چار گروپ یا جماعتوں میں تقسیم تھے۔ ہر جماعت کا الگ الگ کیمپ تھا۔

دوسرے دن صبح اُٹھ کر جامعہ نگر کے بچوں کو ڈرل کرانے گئے۔ وہاں سے واپسی پر دو گروہوں میں بٹ کر باری باری دیہات سُدھار کا کام کیا۔ آج بھی مکھیوں کی وجہ سے وہی پریشانی تھی۔ اب ہمارا روزانہ کا یہی معمول تھا صبح کو جامعہ نگر کے بچوں کو ڈرل کراتے پھر دو جماعتیں باری باری دیہات سُدھار کے لئے جاتیں نہر میں نہاتے اور چار بجے جامعہ نگر کے استادوں سے کسی نہ کسی چیز کا میچ کھیلتے در کنز ہم ہی کامیاب ہوتے پانچویں چھٹے روز ہوا کی وجہ سے مکھیوں کا زور بھی بہت کم ہوگیا۔ ساتویں دن ہم نے اپنے استادوں، پرنسپل صاحب اور جامعہ نگر کے اُستادوں کو کھانے کی دعوت دی۔ یہ حضرات ہمارے کیمپ فائر میں بھی شریک ہوئے۔ آج ہم نے پہلے سے بھی کچھ تیاری کی تھی۔ اس لئے غیر معمولی طور پر دلچسپی پیدا ہوگئی۔

دیہات سُدھار کے سلسلے میں ہم نے بہت سے کام کر ڈالے۔ گاؤں والوں کو عام طور سے صفائی کی خوبیاں بتائیں۔ خود اپنے ہاتھ سے صفائی کرکے انھیں صفائی کا طریقہ بتایا۔ کیمپ فائر کے ڈراموں میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ او کھلا گاؤں میں دو مکتب ہیں۔ ایک مکتب یا مدرسے کے پیچھے کچھ میدان تھا۔ اُسے صاف کرکے بچوں کے کھیلنے کے لئے ایک فیلڈ بنائی۔ بیچ میں کئی درخت تھے، انھیں کاٹا اور چاروں کونوں پر ایک ایک جماعت کی طرف سے ایک ایک درخت لگایا۔ مسجد کی کچھ اینٹیں ایک میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے پڑی تھیں ہم لوگ خود کشتی کھینچ کر لے گئے اور اینٹیں لاد کر لے آئے گاؤں والوں کو اب ہم لوگوں سے کافی دلچسپی ہوگئی تھی ہمارے کیمپ فائر کے لئے لکڑیاں بھی لاتے تھے۔ آخری دن کیمپ فائر اُن کی خواہش پر او کھلا گاؤں میں ہوا گاؤں کے بوڑھے، بچے سبھی شریک تھے۔ جامعہ نگر کے بچے بھی آگئے تھے ایک میلے کا سا سماں معلوم ہوتا تھا۔ گاؤں والے تو بہت ہی خوش تھے۔

دسویں دن یا ۱۰ اکتوبر کو واپسی کا دن تھا خیمے اُکھاڑ دئے گئے سامان لاد دیا گیا اور ہم لوگ اتنے دن باہر کی ہوا کھا کر پھر قرول باغ واپس آ گئے۔ ہمارا کیمپ ہر اعتبار سے کامیاب رہا۔ البتہ مکھیوں نے مزا کچھ کرکرا کر دیا تھا۔ سو وہ بھی پانچ چھ روز بعد خود ہی غائب ہوگئیں ٭

سردیوں کے پھول

سید غلام الثقلین زیدی

یہ مضمون عزیزی سید غلام الثقلین زیدی کا لکھا ہوا ہے۔ ہمارے محترم دوست ماسٹر لطیف احمد صاحب انصاری (استاد باغبانی استادوں کا مدرسہ) نے اس کی جگہ جگہ اصلاح کی ہے اور آخر میں بہت سے پھولوں کے نام بڑھائے ہیں۔ ماسٹر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ آئندہ وہ ہر مہینے باغبانی پر ایک مضمون دیا کریں گے۔ ہم اُن کی اس عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ "ایڈیٹر"

ہندوستان میں پھول زیادہ تر خوشبودار ہوتے ہیں۔ بس ایک دفعہ پودا لگا دو۔ اب وہ ہر سال پھول دیتا رہے گا۔ لیکن آج کل ہندوستانی پھولوں گل عباس، جوہی، بیلا، چنبیلی، کامنی وغیرہ کی جگہ ولایتی پھولوں نے لے لی ہے۔ یہ ہمارے دیسی پھولوں سے خوب صورت تو زیادہ ہوتے ہیں مگر خوشبودار بالکل نہیں ہوتے۔ یہ زیادہ تر موسمی ہوتے ہیں۔ اُن کی قسمیں بے شمار ہیں۔ اس وقت ہم ان میں سے صرف چند کا ذکر کریں گے۔

ہاں یہ بات یاد رکھو کہ عمدہ پھول محض عمدہ بیج بو دینے ہی سے حاصل نہیں ہوسکتے۔ پھول کا اچھا ہونا بہت کچھ آب و ہوا بونے کے ٹھیک وقت، زمین، بیج اور دیکھ بھال پر منحصر ہے

جس زمین میں پھول کے بیج بونے کا ارادہ ہو اسے پہلے خوب گہرا کھدوا دینا چاہئے۔ پھر کھاد کی تین انچ تہہ بچھا کر اُسے زمین میں ملا دو۔ گلے سڑے پتوں کی کھاد اس کے لئے بہت اچھی ہوتی ہے۔ یہ نہ مل سکے تو گوبر کی کھاد استعمال کرو۔ زمین سخت ہو تو اس میں بالو یا ریت ملا دو۔ مختلف پھولوں اور مختلف رنگوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کیاریاں بنانی چاہئیں۔

پہلے پود تیار کرنے کے لئے۔ ناند یا بکس کا انتظام کرلو۔ بکس چار انچ گہرے کافی ہوں گے۔ ان کے پیندے میں سوراخ کرکے اس پر ٹھیکری رکھ دینی چاہئے تاکہ زائد پانی آسانی سے نکل سکے۔ ان بکسوں میں پتوں کی چھنی ہوئی کھاد اور ایک حصہ ریت تین انچ تک بھر دو اور

انھیں بیج بونے کے بعد ایسی جگہ رکھو جہاں صبح شام ہلکی دھوپ آتی ہو (گیارہ بجے سے چار بجے تک تیز دھوپ سے بچاؤ۔)

بیج ہمیشہ کسی اچھے کارخانے سے عمدہ قسم کے منگانے چاہئیں، کیوں کہ عمدہ اور معمولی پودوں کی بس ایک ہی سی دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے لیکن معمولی بیج سے اُگے ہوئے پودے میں پھول اچھے نہیں آتے سرکاری باغ سے بیج اچھا اور سستا ملتا ہے[1] یہ دیسی ہوتا ہے اس لئے ہر جگہ اچھی طرح اُگتا ہے اور پھول بھی خاصے دیتا ہے۔ ہر بیج بیچنے والے کی فہرست میں بونے کا وقت لکھا ہوتا ہے اور یہ بھی کہ کس قسم کی آب و ہوا میں اُگتا ہے۔ ہمیشہ وہ بیج منگاؤ جو تمھارے شہر کی آب ہوا میں اُگ سکتے ہوں ورنہ تمھاری محنت اکارت جائے گی۔ بیج بونے سے صرف آٹھ دس روز پہلے منگانے چاہئیں۔ زیادہ پہلے منگانے سے خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہم انھیں بیج بیچنے والوں کی طرح احتیاط سے نہیں رکھ سکتے۔

بیج کبھی گھنے نہ بونا، نہ بہت گہرے (NAST(U)R TIUMS) اور (SWEET PEA) یا اسی جسامت کے دوسرے پھولوں کو دو سے تین انچ تک گہرا بونا چاہئے۔ اس کا عام اصول یہ ہے کہ بیج کا قطر (DIAMETOR) تین چار گنی کھاد کی تہہ سے ڈھک دینا چاہئے۔ بہت ہی باریک بیج ہو تو اُن میں اُن سے چار گنی باریک مٹی ملاکر بیج برابر بکس میں چھڑک دو۔

بونے سے ایک دن پہلے بکسوں میں پانی بھر دو۔ پھر خشک موسم میں روزانہ ورنہ تیسرے دن پانی دینے کی ضرورت ہے۔ شام کا وقت پانی دینے کے لئے سب سے بہتر ہے۔ اس بات کا بھی خیال رکھو کہ پانی کیاریوں میں ٹھہرا رہے۔

پود کو زیادہ دنوں تک بکسوں میں نہ لگا رہنے دو۔ جب پود تین چار انچ اونچی ہو جائے تو اُسے اس کی مستقل جگہ یعنی کیاری میں لگا دو۔ پود اُکھاڑنے سے دو تین گھنٹے پہلے کیاری میں اور خود پودے میں پانی دینا چاہئے۔ تاکہ دونوں زمینوں کی حالت ایک سی ہو جائے۔ پود لگانے کا وقت سب سے اچھا تو وہ ہے جب آسمان پر بادل چھائے ہوں ورنہ شام کے وقت یہ کام کرنا چاہئے۔ پود کو اس طرح احتیاط سے اکھاڑو کہ اُن کی نازک جڑوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور جس وقت اکھاڑو فوراً کیاری میں لگا دو۔

ANTIRRHINUM گل اژدھا:۔ یہ مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔ اس

[1] بیج کی دُکانیں اور بڑی بڑی فرمیں تمام ہندوستان میں ہیں۔ مگر سہارنپور کی سرکاری نرسری کے بیج میرے تجربے میں سب سے زیادہ اعتماد کے قابل ہیں۔ یہ نرسری کمپنی باغ کہلاتی ہے اور یہاں تمام دنیا کے درخت پائے جاتے ہیں اس کے علاوہ اور بھی اچھی اچھی دُکانیں ہیں۔ اُن کے پتے یہاں لکھتا ہوں:۔

(۱) گولڈن نرسری اسٹیشن روڈ، سہارنپور۔ (۲) ایل آر برادرس، نرسری مین و سیڈس مین، کچہری روڈ، سہارنپور (۳) یونین نرسری سہارنپور (۴) رام اینڈ کو، سہارنپور۔ بڑی دکانوں کا تجربہ کچھ اچھا نہیں ہے۔ بس یوں سمجھو کہ اونچی دُکان اور پھیکا پکوان۔ (لطیف احمد انصاری)

کا پھول گل دانوں میں بھی لگایا جاتا ہے۔ قد کے اعتبار سے اس کی تین قسمیں ہیں (۱) بڑے قد کا (GIANT) جو ۲۴ انچ کا ہوتا ہے۔ (۲) اوسط درجے کا اونچا (SEMIDWARF)۔ (۳) پستہ قد جو آٹھ سے دس انچ تک اونچا ہوتا ہے (DWARF) کے تنے کے اوپر کے حصے میں خوب پھول آتے ہیں اور عرصے تک کھلتے رہتے ہیں۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کو توڑ دو۔ ان میں بیج نہ بننے دو۔ اگر اس پھول کی گردن آہستہ سے دبائی جائے تو اس کا منہ اژدہے کی طرح کھل جائے گا۔ اسی لئے اس کا نام گل اژدہار رکھا گیا ہے۔

اس کی پود کیاریوں میں پستہ قد ہو تو چھ انچ اور لمبے قد کی ہو تو ایک فٹ کے فاصلے سے لگاؤ۔ اسے گملوں میں بھی لگا سکتے ہو۔

ASTER یہ پھول کوئی دو سو سال پہلے چین سے لایا گیا تھا۔ اب یہ خوب صورتی میں گل داؤدی کے مقابلے کا ہو گیا ہے۔ یہ گل دانوں میں لگانے کے لئے اچھا ہوتا ہے اس کے پودے آٹھ انچ سے تین فٹ تک اونچے ہوتے ہیں۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک جولائی میں بوئی جاتی ہے اور نومبر میں پھول آجاتے ہیں دوسری قسم اکتوبر میں بوئی جاتی ہے اور فروری میں پھول آجاتے ہیں۔

اس کی پود تین تین پتی کی ہو جائے تو دوسرے بکسوں میں ایک ایک انچ کے فاصلے سے لگا دو۔ جب کافی بڑی ہو جائے تو اس کی مستقل جگہ پر لگا دو۔ پھول نکلنے سے پہلے سڑے ہوئے گوبر کی کھاد دی جائے تو پھول عمدہ آئیں گے۔ اس کی کیاریوں کو پانی سے خوب بھر دینا چاہیئے۔ تھوڑا تھوڑا پانی دینے سے اس کی جڑیں پانی حاصل کرنے کے لئے اوپر آجاتی ہیں اور پودا اچھی طرح غذا نہ ملنے سے کمزور رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے پتلی کھاد بہت مفید ہے۔ یہ اس طرح بناؤ کہ ایک ناند میں آدھی برات تازہ گوبر ڈالکر ناند کو پانی سے بھر دو اور دن میں دو تین بار چلاؤ۔ پھر دو تین روز تک اسے ٹھہرنے دو۔ تیسرے دن اس میں سے اوپر کا پانی لے کر اتنا پانی اور ملا دو کہ ہلکی چائے کا سا رنگ ہو جائے۔ یہ پانی ہفتے میں دو بار پودوں میں ڈالو مگر پھول آنے سے ایک مہینہ پہلے۔ اس طرح کی کھاد گل داؤدی کے لئے بہت مفید ہے۔

NASTURTIUM یہ ہندوستان کے ہر حصے میں بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ البتہ جہاں پالا پڑتا ہے وہاں اسے بچانے

کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں پھول کثرت سے آتے ہیں اور بہت خوب صورت رنگوں کے ہوتے ہیں۔ اس کی تین خاص قسمیں ہیں (۱) اکہرا (۲) بھرواں (۳) بیل کی طرح چڑھنے والا۔ یہ تین فٹ اونچا ہوتا ہے اوپر چڑھنے کے لئے اسے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی پود نہیں لگتی۔ بس جہاں لگانا ہو وہاں نو نو انچ کے فاصلے سے بو دیا جائے کہ وہی زیادہ نہ ڈالی جائے یا جگہ سایہ دار ہو تو پھول کم دیتا ہے اس کا پھول گراموفون کے بگل کا سا ہوتا ہے اس سے کچھ میٹھا میٹھا رس بھی نکلتا ہے۔ بچے اسے بہت مزے سے کر چوستے ہیں۔

POPPY گل لالہ :- اس کا پھول بہت نازک اور خوب صورت ہوتا ہے۔ بہت عام
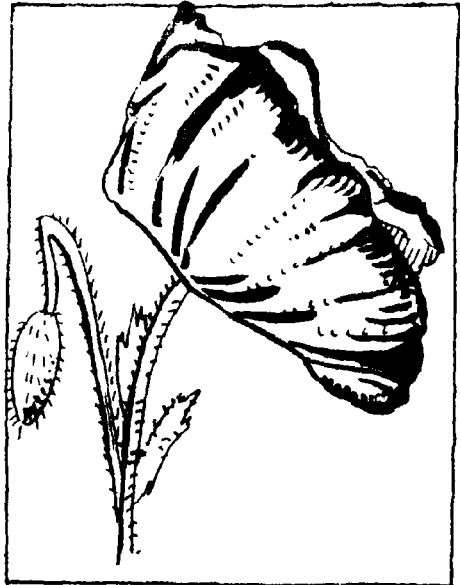
ہے ستمبر یا اکتوبر میں بو یا جاتا ہے پود الگانے کی ضرورت نہیں بیج آٹھ سے پندرہ دن تک اُگ آتے ہیں۔

SWEETPEA پہلے یہ چھوٹے پھولوں اور کم رنگوں کا ہوتا تھا مگر اب باغبانی کے ماہروں نے اس میں بہت اصلاحیں کی ہیں اور اب

اس میں بڑے پھول مختلف رنگوں کے آتے ہیں۔ یہ بھی بہت عام ہے۔ اس کے بیج مٹر کی طرح ہوتے ہیں۔ پھول بھی اسی طرح کے مگر بہت خوشبو دار۔

اس کے لئے زمین ایسی انتخاب کرو جہاں خوب تیز دھوپ آتی ہو۔ مگر جہاں بہت تیز ہو وہاں اُسے تیسرے پہر کی دھوپ سے بچاؤ۔ بیج بونے سے پہلے زمین دو فٹ گہری کھود کر خوب کھاد ملاؤ اور اکتوبر میں جب بارش ختم ہو چکی ہو چھ چھ انچ کے فاصلے پر بیج بو دو

پودے چھ چھ انچ کے ہو جائیں تو سہارے کے لئے ۵ فٹ اونچی لکڑیاں لگا دو۔ پودے ایک فٹ کے ہو جائیں تو ان میں سوڈیم نائٹریٹ دو اونس کنستر میں حل کر کے پندرہ پندرہ روز کے بعد ڈالو پھول بڑے اور خوبصورت آئیں گے۔ اگر مرجھائے ہوئے پھول فوراً توڑ دئے جائیں تو بہت دنوں تک پھول آتے رہیں گے۔

PANSY ولائتی پھولوں میں سب سے زیادہ خوبصورت پھول ہے اس کا پودا چھ سے آٹھ انچ تک اونچا ہوتا ہے پھول بالکل تتلی کی طرح خوب صورت اور خوش رنگ ہوتا ہے

اس کے بیج آخر ستمبر یا شروع اکتوبر میں بونے چاہئیں۔ پودے ایک ایک انچ کے ہو جائیں تو انھیں اکھاڑ کر اسی طرح کے دوسرے تختوں میں لگا دینا چاہیئے

جب پودے دو انچ کے ہو جائیں تو کیاری میں چھ چھ انچ کے فاصلے پر لگا دینے چاہئیں۔ ان کے لئے بھی وہی پتلی کھاد بہت مفید ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

ALYSSUM الیسم:- یہ اکتوبر میں لگایا جاتا ہے اور پانچ قسموں کا ہوتا ہے۔ پھول بہت خوب صورت، رنگ سب کے الگ الگ، نیلے رنگ کا پھول زیادہ پسند کیا جاتا ہے اونچائی تقریباً دو فٹ، ایک فٹ کے فاصلے سے بونا چاہیئے۔

ANCHUSA انچوزہ۔ نیلا پھول۔ اونچائی کوئی ڈیڑھ فٹ۔ ایک ایک فٹ کے فاصلے سے بونا چاہیئے۔

CHRYSHNTH EM گل داؤدی:- اس کی تین قسمیں ہیں:- اس کا پھول

اصلی گل داؤدی کے پھول سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس میں کچھ خوشبو بھی ہوتی ہے۔ سفید پھول زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اونچائی تین سے پانچ فٹ تک۔

CALENDULA کیلنڈولا:۔ اسے ولائتی گیندا بھی کہتے ہیں۔ اس کی بہت سی قسمیں ہیں۔ نارنجی رنگ کا بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ کچھ بھینی بھینی خوشبو بھی ہوتی ہے۔ ایک یا ڈیڑھ فٹ کے فاصلے سے بونا چاہیئے۔

CANDYTUET کینڈی ٹفٹ:۔ یہ پودا چھتری کی طرح کا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی بارہ تیرہ قسمیں ہیں۔ پھول سفید رنگ کے۔ پھول کے بیچ میں سبز اور سرخ ٹکیاں بہت بھلی لگتی ہیں۔ اونچائی ایک فٹ۔

CARNATION کارنیشن:۔ یہ مختلف رنگ کا ہوتا ہے۔ اس

کی حفاظت کی جائے تو سال بھر تک رہ سکتا ہے۔ اسے بالکل گل داؤدی کی طرح تیار کرنا پڑتا ہے۔ گملوں میں سہارے کے لئے لکڑیاں لگانی چاہئیں۔ اونچائی ۳ فٹ تک۔

CLARKIA کلارکیا:۔ اس کی کئی قسمیں ہیں مگر سرخی مائل زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ اونچائی کوئی ۲ فٹ۔

CONFLOWER کان فلاور:۔ اس کی بھی کوئی تیرہ، چودہ قسمیں ہیں۔ یہ سفید ہوتا ہے یا سفیدی میں نیلا ہٹ لئے ہوئے۔ اونچائی ۱½ فٹ۔

DAHLIA ڈیہلیا:۔ یہ مختلف رنگوں کے پھول دار پودے

ہوتے ہیں۔ پھول گلاب کی طرح بڑا ہوتا ہے۔

سوئٹ سلٹن SWEET SULTAN

اس کی کئی قسمیں ہیں۔ پھول سفید یا سفیدی اور نیلاہٹ لئے ہوئے۔ کچھ خوشبو بھی ہوتی ہے۔ اونچائی ۲ فٹ۔
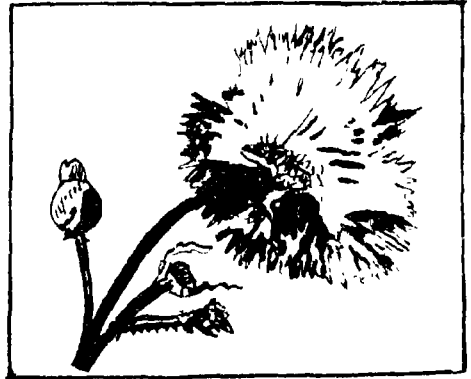
آرکٹوٹس گرانڈس ARCTOTISGRANDIS

اس کا پھول نہایت خوب صورت سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ بیچ کا حصہ کچھ خاکی خاکی سا۔ کنارے سنہرے۔ اونچائی کوئی ڈیڑھ فٹ۔

پتیاں جمع کرنا

پروفیسر اختر حسن صاحب باٹنی ڈپارٹمنٹ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ
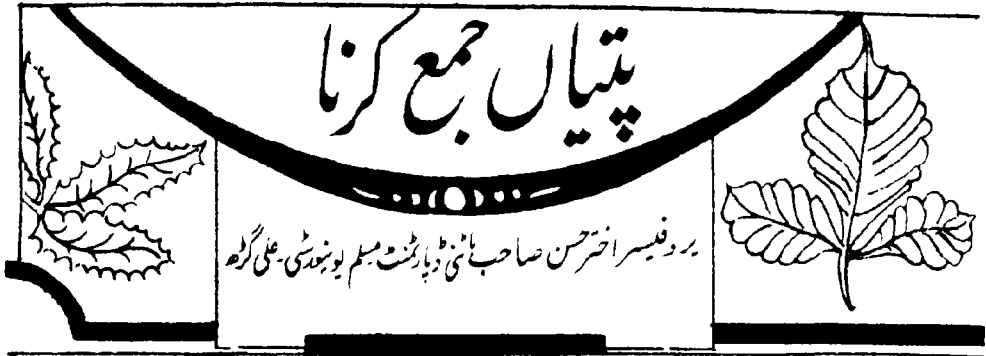
اس مشغلے کے بارے میں ایک مختصر مضمون تم کسی پچھلے پیامِ تعلیم میں پڑھ چکے ہو۔ آج ہم پھر تمھیں اس کی اہمیت اور اس کے کچھ فائدے بتائیں گے۔

پتیاں جمع کرنے میں تمھیں ایک ہی وقت کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آئے گا۔ تمھاری معلومات بڑھے گی۔ تمھارے پاس ایسا ذخیرہ ہوگا جو تمھیں قدرت کی کاری گری کا اندازہ لگانا اور اُن کی صحیح قدر کرنا سکھائے گا اگر تم کسی سائنس جاننے والے سے سوال کروگے کہ پتیوں کی کیا اہمیت ہے تو وہ تمھیں بتائے گا کہ یہ چھوٹی چھوٹی پتیاں قدرت کے وہ کارخانے ہیں جہاں تمام جان داروں کے لئے غذا بنتی ہے۔ پتیاں نہ ہوں تو دنیا میں کوئی مخلوق زندہ نہ بچے اور اس اعتبار سے یہ دنیا میں سب سے اہم چیز ہیں۔

پتیاں جمع کرتے وقت دو باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہئے۔ ایک تو یہ کہ ان کی شکل و صورت نہ بدلنے پائے۔ دوسرے وہ بہت دنوں تک اپنی اصلی حالت پر قائم رہ سکیں مگر اس کے لئے تدبیر کیا کی جائے؟

یہ تو تمھیں معلوم ہی ہوگا کہ پتیوں میں بہت سا پانی ہوتا ہے۔ تم نے جب کبھی پتیاں توڑی ہوں گی تو اُن کے ڈنٹھل سے اکثر پانی نکلا ہوگا۔ پتیاں ملتے وقت بھی تم نے ان میں رس پایا ہوگا۔ شاید تمھیں یہ بھی معلوم ہو کہ جس چیز میں پانی ہوتا ہے وہ جلد سڑ جاتی ہے۔ جو کھانا محض گھی یا شکر کے قوام میں پکتا ہے اس کھانے کے مقابلے میں زیادہ دنوں تک اچھی حالت میں رہ سکتا ہے جو پانی میں پکتا ہے۔ چونکہ پتیوں میں بھی پانی ہوتا ہے اس لئے انھیں محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کا پانی اس طرح نکال لیا جائے کہ اُن کی شکل و صورت نہ بدلنے پائے۔

اب پانی کے نکالنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں یا تو انھیں دھوپ کی گرمی سے خشک کیا جائے۔ اس میں یہ خطرہ ہے کہ پتیاں مرجھا جائیں گی۔ اور ان کی شکل بدل جائے گی یا پھر کسی طریقے سے ان کا پانی جذب کر لیا جائے (سوکھ لیا جائے) یہ دوسرا طریقہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ یہی استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ ہم تمھیں اس کی ترکیب بتاتے ہیں:۔

جاذب کے چند تختے لو اور جمع کی ہوئی پتیوں

کو ان کی قدرتی حالت میں پھیلا کر رکھو۔ ایک حصہ دوسرے حصے پر پڑنے نہ پائے۔ اب ان تختوں کو پودوں کے پریس میں دبا دو۔ اس پریس کی تصویر یہ ہے۔ پہلے دباؤ زیادہ نہ پڑے۔ رفتہ رفتہ اُسے بڑھاتے جاؤ۔ آٹھ دس روز میں پتوں کا پانی سوکھ جائے گا۔ درمیان میں ایک آدھ

پریس

بار تختوں کو نکال کر دھوپ دکھا دو گے تو پتیاں اور بھی جلد سوکھ جائیں گی۔ ایسے پریس گھر پر بھی بن سکتے ہیں جن کے پاس پریس نہ ہو۔ وہ بھاری ٹرنک یا صندوق سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ پریس اور طرح کے بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ مگر ان کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے۔ اس طرح سوکھی

ہوئی پتیاں کافی عرصے تک رہ سکتی ہیں۔ پھر بھی یہ خطرہ رہتا ہے کہ انھیں کیڑے مکوڑے نہ کھا جائیں۔ اس کے لئے ایک زہریلا نمک جسے " کروسیو سلیمیٹ "

(CORROSIVO SUBLIMATE)

کہتے ہیں، پانی میں گھول کر پتیوں کے دونوں طرف نقشہ کشی کے برش سے لگا دیا جاتا ہے۔ اور پتیاں دھوپ میں سکھالی جاتی ہیں۔ اسے دو تین بار لگا دینے کے بعد پتیاں محفوظ ہو جاتی ہیں، پھر بھی جب تک انھیں ماونٹ (MOUNT) نہ کر لیا جائے ٹھیک حالت میں نہیں رہ سکتیں۔ ماؤنٹ سے مراد ہے کہیں لگانا یا چسپاں کرنا۔

حفاظت کرنے کے لئے جاذب کے تختوں یا موٹے کاغذ کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لئے اکثر بنے ہوئے البم[1] بھی مل جاتے ہیں[2]۔ کاغذ کے تختوں کے مناسب سائز کے ٹکڑے کاٹ لو۔ اور ہر ٹکڑے پر علیحدہ علیحدہ ایک پتی خوب صورتی سے رکھو۔ اب معمولی کاغذ کی پتلی پتلی چٹیں کاٹ کر۔ اُن میں گوند لگا لو اور ان چٹوں کے ذریعے پتی کو کاغذ پر چسپاں کر دو۔ اب یہ پتی کاغذ پر جم جائے گی۔ اور تم آسانی سے اِدھر اُدھر لے جا سکو گے۔ زیادہ حفاظت اور خوب صورتی کے لئے ہر ٹکڑے پر باریک کاغذ لگا لو یا دو کاغذوں کی تہوں کے درمیان رکھ لو۔ ہاں گوند بہت صاف ہونا چاہیئے۔

اس طرح جب کافی تختے تیار ہو جائیں تو ان کا البم بنا لو یا انھیں فائلوں میں رکھ لو۔ کیڑوں وغیرہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو "نیپتھلین" (NAPHTHALENE) کی گولیاں توڑ کر رکھ دو۔ اب یہ پتیاں اپنی اصلی حالت میں بہت دنوں تک تمھارے پاس رہ سکیں گی۔

ہاں ایک بات کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے۔ وہ یہ کہ پتیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ بعض مفرد جیسے پیپل، آم، جامن وغیرہ کی پتیاں۔ ان میں بس ایک ڈنٹھل اور ایک جسم ہوتا ہے۔ بعض مرکب جیسے نیم، املی، شیشم وغیرہ ان میں بہت سے جسم اور ڈنٹھل ہوتے ہیں۔ اکثر غلطی یہ ہوتی ہے کہ لوگ اس کا ایک ہی حصہ لے لیتے ہیں اور اس دھوکے میں رہتے ہیں کہ ہم نے پوری پتی لے لی۔ اس لئے جس پتی کو جمع کرو اسے غور سے دیکھ لو کہ کیسی ہے۔ اور اس کا خیال رکھو کہ کہیں اس کا ایک حصّہ تو تم پوری پتی کے دھوکے میں نہیں لے رہے ہو۔ تھوڑے سے تجربے کے بعد تمھیں خود ہی پہچان ہو جائے گی۔

ہر پتی کے ساتھ اپنی معلومات بھی اختصار کے ساتھ لکھو۔ مثلاً کس پیڑ کی پتی ہے۔ یہ پیڑ کیسا ہوتا ہے۔ اس میں پھول کب اور کس قسم کے آتے ہیں۔ یہ پتیاں کب گرتی اور کب نکلتی ہیں۔ یہ کس کام آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی اور دلچسپ بات تمھیں معلوم ہو تو وہ بھی لکھو۔

غرض پتیاں جمع کر کے تم اپنے ماحول یا آس پاس کی چیزوں کو بہت کچھ جان سکتے ہو۔ کیوں کہ اس ماحول میں پودوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ ماحول سے انسان کا بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ انسان نے اس سے بہت کچھ سیکھا اور ایک حد تک اس پر قابو بھی پا لیا ہے۔ انسان کی آئندہ ترقی کا دارومدار بھی بہت کچھ اسی پر ہے۔

---

[1] یہ البم مکتبہ جامعہ نئی دہلی یا اس کی لاہور اور لکھنؤ کی شاخوں سے مل سکتے ہیں۔ [2] موٹے کاغذ کی جگہ جاذب سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ تفصیل اپریل سنہ کے پرچے میں دیکھو مضمون پتیاں جمع کرنا صفحہ [illegible]

ان آخری جملوں میں ایسی باتیں آگئی ہیں جنھیں پھیلا کر بیان کیا جائے تو مضمون بہت لمبا ہو جائے گا۔ اگر تمھاری سمجھ میں یہ باتیں نہ آئیں تو اپنے استاد سے ضرور پوچھ لینا کیونکہ یہ باتیں سمجھنے کی ہیں اور کام کی۔ میں تمھیں بتاؤں کہ دنیا کے تمام بچّے اپنے ماحول سے دلچسپی رکھتے ہیں اور معلومات بہم پہنچاتے ہیں پھر کیا وجہ ہو کہ تم بھی ایسا نہ کرو۔
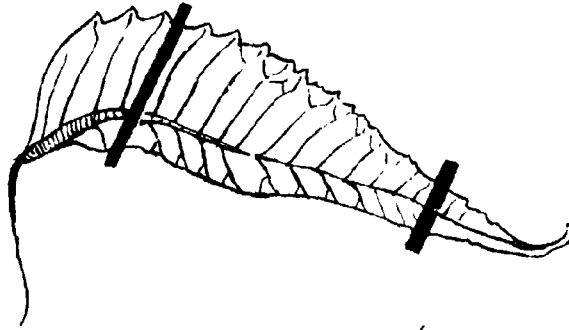
یہ نیم کی پتی ہے۔ پندرہ سے بیس فٹ تک اونچا ہوتا ہے یہ سدا بہار درخت ہے۔ صرف سال کے تھوڑے سے حصے میں اس کا پت جھڑ ہو جاتا ہے۔ پھر وہی بہار آجاتی ہے۔ اس کے پتے پھل، پھول، چھال غرض ہر چیز مفید ہے۔ اس کی نرم کونپلیں دواؤں میں استعمال ہوتی ہیں۔ اس سے عرق تیار کیا جاتا ہے۔ نیم کا صابن بھی بنایا جاتا ہے۔ اس کے پتوں کی دھونی سے مچھر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کی لکڑی سے غریب کاشتکار اوزار بناتے ہیں۔ اس کی نرم شاخوں سے مسواک کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

دفتی، گتے یا کارڈ بورڈ (CARD BORD) کی چیزیں آج کل بہت عام ہیں۔ تمہارے گھر میں بھی ضرور ہوں گی۔ مثلاً رومال، موزوں اور کھلونوں کے ڈبے، فوٹو لگانے کی البم، بلاٹنگ پیڈ، تمہاری کتاب کی جلد۔ تمہارے بھائی صاحب یا ابا کے کاغذوں کا فائل وغیرہ یہ سب چیزیں گتے یا کارڈ بورڈ ہی سے تو بنتی ہیں۔ کبھی تم نے یہ بھی سوچا کہ یہ بنتی کیسے ہیں۔ ہم بھی انھیں بنا سکتے ہیں یا نہیں؟۔

خیر اگر تم نے غور نہیں کیا تو ہم بتاتے ہیں کہ ایسی چیزیں بنانا کچھ مشکل نہیں۔ بس ذرا محنت اور صبر کی ضرورت ہے۔ اچھا تو پہلے تم اس کے لئے سامان جمع کر لو۔ اگر تمہارے پاس جیب خرچ کی اتنی رقم نہ ہو تو پھر اپنے ابا سے مانگ لینا۔ مگر دیکھو ضد نہ کرنا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا اور پیسے برباد ہوں گے۔ اچھا تو ہم یہاں اُن چیزوں کے نام لکھے دیتے ہیں اور تصویریں بھی بنائے دیتے ہیں۔ بعض چیزیں تو تم خود بنوا سکتے ہو۔ باقی بازار سے خرید لینا یا چاہو تو ہم سے منگوا لو۔

(۱) لکڑی کا بورڈ یہ ساگون (TSAK) کا ہو ۱½ فٹ لمبا۔ ۱¼ فٹ چوڑا اور ⅛ انچ موٹا۔

(۲) چاقو

(۳) چاقو
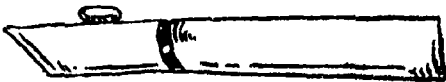
یہ چاقو ایک خاص قسم کا ہوتا ہے شکل نمبر ۱ لیپزک نمونہ کہلاتا ہے جس کا کنارا نوکیلا اور خم دار ہوتا ہے۔ چاقو نمبر ۲ لندن نمونہ کہلاتا ہے اس کا کاٹنے والا کنارا نوکدار اور سیدھا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں لیپزک نمونہ کام کرنے میں زیادہ بہتر ہے۔

(۴) ہمواری

یہ بانس کی بنائی جاسکتی ہے۔

(۵) لوہے کا پیمانہ

(۶) پرکار

(۷) سٹ اسکوائر

اس سامان کے علاوہ اور چند چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ مگر وہ تمھارے گھر میں موجود ہوں گی۔ مثلاً لئی کے لئے پیالا اور دوسرے برتن۔ ان چیزوں کے اکٹھا ہونے کے بعد بھی کام اسی وقت شروع کیا جا سکتا ہے جب انھیں استعمال کرنے کا طریقہ بھی معلوم ہو۔ مگر یہ بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے کہ چیزوں کا استعمال تو بتا دیا جائے اور یہ نہ معلوم ہو کہ بنے گا کیا۔ اس لئے اس وقت تو ہم صرف ان چیزوں کے نام بتاتے ہیں جو تمھیں بتانے ہیں یا جنھیں ہم بتا چکے ہیں۔ ان کے بنانے کا طریقہ ہم وقتاً فوقتاً تمھیں بتاتے رہیں گے۔ اگلے پرچے میں ہم تمھیں کوئی آسان سی چیز بنانے کی ترکیب بتائیں گے۔ ان اوزاروں کا صحیح صحیح استعمال بھی ساتھ ہی ساتھ بتایا جائے گا۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے یا اور کوئی بات معلوم کرنا چاہو تو خط بھیج کر معلوم کر لینا۔

اب تم آئندہ مضمون تک اوپر بتلائی ہوئی چیزوں کو جمع کر لینا۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمھیں کسی چیز کے بنانے کی ترکیب بتائیں اور تم ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہو کہ صاحب ہمارے پاس کوئی سامان ہی نہیں۔ یہ عذر نہیں سنا جائے گا۔

ہمارے اسکول کی چوتھی جماعت میں بارہ ، تیرہ سال تک کے لڑکے ہیں۔ یہ لڑکے پڑھائی کے علاوہ یہ کام بھی کرتے ہیں۔ انھیں کوئی دقت نہیں محسوس ہوئی۔ بلکہ روز بروز دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ تم نے بھی اس کام کو جی لگا کر کیا تو دیکھنا کتنی جلدی اچھی اچھی چیزیں بنانے لگو گے۔

اچھا اب ہم چند نمونوں کے نام یہاں لکھتے ہیں۔ اور اُن کی شکلیں بھی بنائے دیتے ہیں۔

۱۔ بلاٹنگ پیڈ

۲۔ البم

۳۔ چوکور بکس

۴۔ چھ کونوں کی کشتی

۵۔ بستہ

۶۔ قلموں کی کشتی
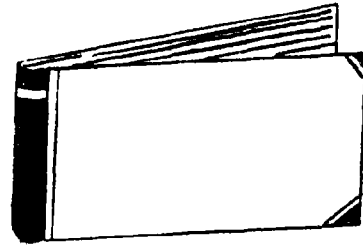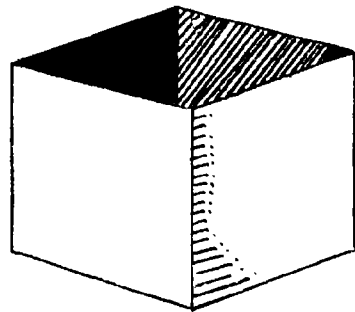
ابری بنانا

محمد اکرم خاں - میرٹھی　طالب علم استادوں کا مدرسہ

تمہاری کتاب کی جلد پر جو کاغذ لگا ہوتا ہے اسے ابری کہتے ہیں۔ دیکھو اس پر کیسے اچھے اچھے رنگ برنگے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ تم تو ابھی تک یہی سمجھتے ہوگے کہ ابری ولایت سے بن کر آتی ہے۔ اس پر تو تم نے کبھی کاہے کو غور کیا ہوگا کہ یہ بنتی کیسے ہے؟ میں ترکیب بتا دوں تو تم اچھل ہی تو پڑ و گے۔ ابری بنانا اتنا آسان ہے اور اس میں خرچ اس قدر کم ہے کہ ترکیب پڑھتے ہی تم فوراً اسے بنانے کی تیاری کرنے لگو گے۔

سامان:- بس تھوڑی سی لئی پکالو ذرا پتلی ہو چپک بھی کافی ہونا چاہیئے۔ اسے پکاتے وقت اس کا خیال رکھنا کہ گٹھلیاں نہ پڑیں تھوڑا سا نیلا تھوتھا بھی ڈال دینا۔ ڈرائنگ والے دو برش بھی ہونا چاہیئں مگر ان کے بال نہ گرتے ہوں۔ ہاں رنگ جو تمہیں پسند ہو وہی منگوانا البتہ ذرا اچھی قسم کا۔ کاغذ موٹا نہ ہو کوئی آٹھ دس پونڈ والا بس۔ یہی تمہارا کل سامان ہے۔

اب کاغذ کسی بورڈ یا تختے پر پھیلا کر برش سے اس پر لئی پھیرو، کاغذ پر گانٹھیں نہ رہنے پائیں پھر دوسرے برش سے گھلا ہوا رنگ اس لئی والے کاغذ پر پھیر دو۔ اب قلم یا اسی موٹائی کی لکڑی سے اپنی منشا کے مطابق نقش و نگار بناؤ اور کاغذ کو خشک ہونے کے لئے چھوڑ دو۔ جب خوب خشک ہو جائے تو موم بتی سے اور موم بتی نہ ملے تو صاف کئے ہوئے موم سے اسے خوب گھونٹو۔ اس سے ابری کا رنگ چمک جائے گا اور چکناہٹ اور پختگی بھی پیدا ہو جائے گی۔

لیجئے صاحب آپ کی ابری تیار ہو گئی۔ اب لے آپ اپنی کتاب پر چپکا یئے یا کہیں اور استعمال کیجیے۔

اُستادوں کا مدرسہ

سعید انصاری صاحب پرنسپل استادوں کا مدرسہ

مدرسوں کے استاد تو تم نے بہت سنے اور دیکھے ہوں گے لیکن جامعہ میں اس سال سے ایک استادوں کا مدرسہ بھی کھلا ہے جس میں کچے اُستاد پکے بنائے جاتے ہیں۔ تصویر میں تمھیں اس مدرسے کی عمارت نظر آئے گی۔ یہ مدرسہ یکم اگست سے کھلا ہے۔ اور اس میں ہندوستان کے دور دور حصّوں سے اُستاد پڑھنے کے لئے آئے ہیں۔ کوئی حیدرآباد کا ہے تو کچھ کشمیر کے ہیں۔ دو ایک بمبئی کے ہیں تو ایک آدھ بنگال بہار کے بھی ہیں۔ بہت سارے صوبہ متحدہ کے ہیں۔ لیکن مختلف میل اور رنگ کے۔ بعض عربی مدرسوں کے ہیں تو کچھ انگریزی اسکولوں کے، کسی کو میونسپل بورڈ نے بھیجا ہے تو بہتوں کو ڈسٹرکٹ بورڈ نے۔ اس میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، اور سب ایک ساتھ مل جل کر رہتے سہتے ہیں۔ کسی کو کسی سے بیر نہیں۔

یہ استاد یہاں اس غرض سے آئے ہیں کہ کوئی ایسا طریقہ تعلیم سیکھیں جس سے بچوں کو لکھنے پڑھنے سے دلچسپی ہو۔ اور تعلیم اُن کے لیے مفید اور کارآمد بن سکے۔ اب تک بچوں کی تمام تعلیم زیادہ تر کتابی ہوتی ہے اور وہ پڑھنے لکھنے کے بعد کسی کام کے نہیں ہوتے۔ یہ استاد ان بچوں کے لئے ایسا طریقہ تعلیم سیکھ رہے ہیں جس میں زیادہ تر کرنے دھرنے سے تعلق ہو اور وہ بچے جب پڑھ لکھ لیں تو دنیا میں کوئی مفید کام کر سکیں

اس مدرسے میں ان بچوں کے پڑھانے لکھانے کا تمام طریقہ کسی نہ کسی حرفہ یا دستکاری سے وابستہ رکھا گیا ہے۔ یعنی وہ لڑکے کوئی نہ کوئی چیز کام کی بنائیں اور اسی کے ساتھ وہ اور دوسری چیزیں بھی سیکھیں مثلاً کچھ بچے اگر گتے اور کاغذ کی کوئی چیز بنا رہے ہیں جیسا کہ اس تصویر میں اس مدرسے کے لڑکے کام کرتے نظر آئیں گے۔ مثال کے طور پر پیڈ یا قلمدان ہے لو۔ تو اس سلسلے میں انھیں سب سے پہلے ڈرائنگ کا کام کرنا ہوگا اور انھیں ایک کاغذ پر پیڈ یا قلمدان کا خاکہ بنانا ہوگا۔ اس خاکے کے بنانے میں انھیں لکیروں کی لمبائی چوڑائی بھی ناپنی ہوگی اور اس طرح

وہ علم ہندسہ (جیومیٹری) کا کام کر رہے ہوں گے۔ ییڈ یا قلمدان بناتے بناتے قدرتاً سوال کاغذ کے متعلق پیدا ہوگا اور اس سلسلے میں انھیں کاغذ کی تاریخ پڑھنی پڑے گی اور انھیں یہ معلوم ہوگا کہ سب سے پہلے کاغذ کہاں سے ایجاد ہوا، اور کس طرح یہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچا اور آج کاغذ کہاں کہاں سے آتا ہے، اور ہندستان میں کہاں کہاں کاغذ کے کارخانے ہیں۔ اس ضمن میں انھیں بہت کچھ جغرافیائی معلومات بھی حاصل ہوں گی۔ اور اگر وہ کاغذ بنانے کے طریقوں اور ان چیزوں سے کاغذ بنتا ہے اس پر بھی غور کرنے لگیں تو بہت کچھ سائنس بھی آجائے گی۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ اس طرح جو کچھ انھیں پڑھنے لکھنے کی ضرورت ہوگی، اس سے اُن کے پڑھنے اور لکھنے کی استعداد میں کس قدر ترقی ہوگی۔

اب تم اندازہ کرو کہ اس طرح جو بچے تعلیم حاصل کریں گے۔ اُن کے لئے لکھنا پڑھنا کس قدر دلچسپ مشغلہ ہوگا اور وہ لکھ پڑھ کر کتنے مفید اور کارآمد آدمی بنیں گے۔ یہ استاد یہاں یہی طریقے سیکھنے آئے ہیں اور اس طریقے کے سیکھنے میں، ظاہر ہے انھیں بہت سے حرفے اور دستکاریاں خود بھی سیکھنی ہوں گی۔ چنانچہ یہ استاد علاوہ طریقۂ تعلیم سیکھنے اور یہ بات جاننے کے کہ بچوں سے کس طرح برتاؤ کرنا چاہیئے۔ چند دستکاریوں کے ہنر بھی حاصل کر رہے ہیں۔

ان دستکاریوں میں ایک چیز تکلی اور چرخے سے سوت کاتنا اور دھنکی سے روئی دھننا بھی ہے۔ تصویر میں کہیں تم دیکھو گے کہ اس مدرسے کے استاد تکلی پر کس قدر انہماک سے سوت کات رہے ہیں۔ ابھی انھیں آئے ہوئے دو مہینے بھی مشکل سے ہوئے ہیں اور وہ نہایت باریک اور تیزی سے سوت کات سکتے ہیں۔ اسی طرح وہ دھنکی سے روئی بھی نہایت باریک دھن لیتے ہیں اور اس سے نہایت اچھی اچھی پونیاں بنا لیتے ہیں

دوسری چیز ان کی دستکاری میں گتے اور لکڑی کا کام ہے۔ تصویر میں تم پھر انھیں دیکھو گے کہ وہ گتے کا کام بھی کس قدر شوق سے کر رہے ہیں اور اس سے مختلف چیزیں بنا رہے ہیں۔ مثلاً قلمدان دیوارگیر، پیڈ اور فائل وغیرہ۔

اسی طرح وہ باغبانی کا کام بھی نہایت محنت سے کرتے ہیں اور طرح طرح کے پھول بونا اور قلم لگانا سیکھتے ہیں۔ سردی اور گرمی میں موسمی سبزیاں تیار کرتے ہیں اور پانی، کھاد، زمین، سردی اور گرمی کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرتے ہیں۔

یہ چیزیں وہ اس لئے سیکھتے ہیں تاکہ وہ یہاں سے فارغ ہوکر اپنے اپنے مدرسوں میں

جائیں اور وہاں بچوں کو یہی چیزیں سکھائیں اور ان کے ذریعے دوسرے مضامین پڑھائیں۔ وہ صبح شام مختلف قسم کے کھیل اور ورزش کی چیزیں بھی سیکھتے ہیں تاکہ ان کے بچے مضبوط، تندرست اور خوب خوش و خرم رہیں۔ یہ ہے ہمارا استادوں کا مدرسہ

ریل کا انجن کس نے بنایا؟

احسن عثمانی صاحب

چھک چھک کرتا انجن آیا
سر پہ دھوئیں کا بادل چھایا
سیٹی دیتا شور مچاتا
شوں شاں کرتا اور لہراتا
جیسے دیو چلا آتا ہے
جانے کس پر غصّہ آتا ہے
بھاپ اور پانی سے چلتا ہے
کوئلے کھا کھا کر پلتا ہے
آگ بھری ہے پیٹ میں اُس کے
جلتا رہتا ہے اندر سے
انجن پانی بھی پیتا ہے
آگ اور پانی سے جیتا ہے
پیچھے پیچھے جُتے ہیں ریل کے ڈبّے
اندر اُن کے مسافر بیٹھے
دوڑ رہا ہے گاڑی لے کر
لاکھوں من کا بوجھ ہے جس پر
سامنے اس کے جو آ جائے
دم کے دم میں کچلا جائے
یہ ہے آفت کا پرکالا
کتنا تیز اور طاقت والا
ریل کا انجن کس نے بنایا
کس نے بنایا کس نے چلایا

جانتے ہو تو؟ جلد بتاؤ!
ورنہ ابّا سے پوچھ آؤ

مجھے مشہور عمارتوں کی تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے۔ چند دوسرے پیامیوں کو بھی اس مشغلے سے دلچسپی ہوگی۔ مجھے اس مشغلے کو اختیار کئے ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے ہیں، پھر بھی دلچسپی کے علاوہ جو غیر معمولی فائدہ ہوا ہے۔ اس کا اندازہ کچھ اس مشغلے کو اختیار کرنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ خصوصاً تاریخ کی استعداد تو بہت بڑھ جاتی ہے۔

مختلف اخباروں، رسالوں، کتابوں، فہرستوں اور کیلنڈروں میں مشہور عمارتوں کی تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔ عام طور پر لوگ ان تصویروں کو دیکھ کر چھوڑ دیتے ہیں اور اخبار یا اور کوئی دوسری چیز ردی کی نذر ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تصویریں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ حالانکہ انھیں کاٹ کر رکھ لیا جائے تو عجیب و غریب ذخیرہ جمع ہو جائے۔

اب تم کسی مشہور عمارت کی تصویر دیکھو تو اُسے کاٹ کر رکھ لو مگر اپنی تاریخ کی کتاب پر ہاتھ صاف نہ کرنا۔ تمھاری کتاب بدنما ہو جائے گی اور نقصان الگ ہوگا۔ جب تمھارے پاس تصویروں کا کافی ذخیرہ جمع ہو جائے گا تو تمھیں ان تصویروں کے آراستہ کرنے کے لئے البم کی ضرورت ہوگی۔ البم مختلف قسم کے گھر ہی بن سکتے ہیں جیسا چاہو بنا لو۔ میرے خیال میں اس قسم کی کاپی موزوں رہے گی جس میں ضرورت کے وقت تم اور کاغذ لگا سکو یا نکال سکو۔ کاغذ سفید ہوں، ایک طرف سادہ اور دوسری طرف رول دار۔ سائز فلسکیپ کاغذ کا آدھا رکھو۔ کیونکہ تصویریں عموماً اس سے بڑی نہیں ہوتیں۔ لیکن تم بڑے سائز کا البم بنانا چاہو تب بھی کوئی ہرج نہیں۔

اچھا صاحب البم تو تمھارا تیار ہو گیا۔ بس تصویریں لگانے کی دیر ہے۔ یہ کام بہت نفاست اور سلیقے سے کرنے کا ہے۔ اب تم کرو یہ کہ بہت صاف سا گوند تیار کرو۔ ایک نوکدار اور چکنی چھری چھ انچ لمبی بنوا لو۔ ایک ہموار تختے پر البم، تصویروں کا ذخیرہ، گوندانی اور چھری رکھ لو۔ ذخیرے میں سے کوئی تصویر نکالو۔ اب البم کو کھولو اور بائیں طرف کے

سادہ ورق پر تصویر چپکاؤ۔ مگر بھائی بہت احتیاط سے چپکانا۔ کہیں تصویر کی پوری پشت پر گوند نہ پھیر دینا بلکہ چاروں کونوں اور کناروں پر بہت احتیاط اور صفائی سے ہلکا ہلکا گوند لگا کر اسی سادہ ورق پر چپکاؤ۔ کوئی سلوٹ یا دھاری نہ پڑنے پائے۔ اب اسے ذرا دیر ہوا میں سوکھنے دو۔ جب تک پہلی تصویر گیلی رہے دوسری تصویر ہرگز نہ چپکانا ورنہ پہلی بھی خراب ہو جائے گی۔ اگر اپنے البم کو صاف اور خوب صورت رکھنا چاہتے ہو تو ذرا صبر سے کام لو۔

مگر اب اتنی باتیں کرنے کے بعد تمہاری تصویر سوکھ گئی ہوگی۔ ذرا اٹھا تو لاؤ۔ او ہو! یہ تو واقعی سوکھ گئی۔ پر اب دوسرے خالی صفحے پر کیا کرو گے؟ ہم بتاتے ہیں۔ یہ تصویر کس عمارت کی ہے؟ تاج محل کی؟

اچھا تو تاج محل کا کچھ مختصر حال لکھو۔ یعنی یہ کہ کہاں واقع ہے۔ کس نے بنایا۔ کب بنا۔ تاریخی عمارتوں میں اسے کیا اہمیت حاصل ہے وغیرہ۔ دیکھو دلچسپی ہی دلچسپی میں تم نے کتنی تاریخ پڑھ لی۔ بھئی میرے خیال میں تو یہ بہت ہی مفید مشغلہ ہے۔

ہاں ایک بات اور رہ گئی۔ تمہارے البم کا سرورق یا کور بھی بہت خوب صورت ہونا چاہئے۔ اگر یہ ذرا بھی بدنما ہوا تو تمہارے البم کی ساری خوب صورتی جاتی رہے گی۔ اس پر مختلف رنگوں سے کوئی اچھا سا ڈیزائن بنا دو یا رنگ برنگے کاغذ اس سلیقے سے چپکاؤ کہ پہلی نظر میں دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ سرورق کی مضبوطی کا خاص طور سے خیال رکھنا، تاکہ اندر کی تصویروں کی حفاظت رہے ۔

البم کا نمونہ
تاج محل

علی احمد صاحب ۔ بی ایس سی ۔ استاد جامعہ

دھاگے کے کئی قسم کے ریل بازار میں ملتے ہیں ان میں سے ایک بڑا ریل لو جس پر دھاگہ لپٹا ہوا نہ ہو۔ اس ریل پر کوئی سوا سو فٹ لمبا بجلی کا باریک تار ریل کے ایک سرے سے لپٹنا شروع کرو اور نہایت ترتیب سے پورے ریل پر لپیٹ دو۔ جب تار کی ایک تہ ریل پر مکمل ہو جائے تو پھر واپس پہلے سرے کی طرف پلٹے آؤ۔ اسی طرح کئی ایک تہوں میں پورا تار لپیٹ دو۔ لیکن تار کے دونوں سرے ریل کے ایک ہی سرے کی طرف نکلے رہیں۔ اب اس سرے پر تقریباً پون انچ لمبے پتلے پیچ گاڑ کر تار کے دونوں سرے علیحدہ علیحدہ ایک ایک پیچ کے اردگرد مضبوطی سے باندھ دو۔ یہ بجلی کے تار کا ایک گچھا بن گیا۔ جس کا نام ہم "طلسمی گچھا" رکھتے ہیں۔

بجلی کی رَو کا لمبا سفر

اس سے قبل ہماری بیٹری کی بجلی کئی سفر کر چکی ہے ۔ لیکن ان میں سے کسی سفر میں بھی دو اڑھائی فٹ سے زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ اس سفر میں تو بجلی کی رو کو سوا سو فٹ سے کچھ زیادہ ہی فاصلہ طے کرنا ہے ۔ آؤ دیکھیں کہ رو کتنی دیر میں یہ فاصلہ طے کر لیتی ہے۔

اپنی بیٹری میں نقشے اور طلسمی گچھے کو شکل ۱۵ کی طرح ترتیب دے کر بٹن گھماؤ۔

شکل ۱۵
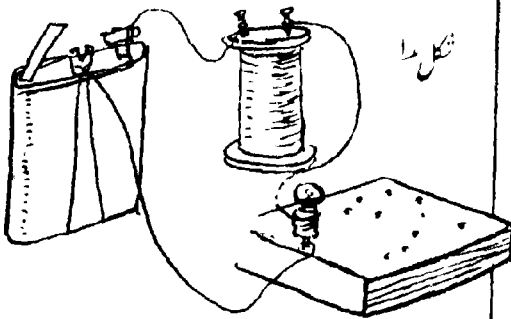
خوب! ادھر بٹن گھمایا ادھر قمقمہ روشن ہوگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بجلی کی رو کو جتنا لمبا سفر طے کرنا ہو اتنی ہی اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے ۔

دنیا کے گرد سیاحت

تم نے اپنی کتابوں میں ابن بطوطہ کولمبس اور واسکو ڈے گاما کی سیاحت کے حالات پڑھے

ہوں گے جس سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ ان سیاحوں نے کہاں سے اپنا سفر شروع کیا اور کن کن ملکوں اور سمندروں کے حالات معلوم کئے تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ ان میں سے ہر ایک کو سیاحت میں کتنا عرصہ لگا۔

آؤ ہم اندازہ لگائیں کہ بجلی کی رو کو بھی اگر دنیا کے گرد سیاحت کے لئے روانہ کیا جائے تو اس کو پورا کرنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ شاید تم کو معلوم ہو کہ خط استوا پر دنیا کا گھیر ۲۴۸۰۲ میل ہے اگر ہم بجلی کے ایک لمبے سے تار کو اس گھیر پر ۷½ مرتبہ لپیٹ دیں اور تار کے ایک سرے پر ایک قمقمہ اور دوسرے پر ایک بیٹری جوڑ کر بٹن دبا دیں۔ تو بجلی کی رو اتنا طویل یعنی ۲۴۸۰۲ × ۷½ میل کا سفر طے کرنے کے بعد صرف ایک سکنڈ میں قمقمے کو روشن کر دے گی۔

ہماری چھوٹی بیٹری کی بجلی کی رفتار کس قدر حیرت انگیز ہے۔

شکل ۷

ڈاک کے ردی ٹکٹوں میں دولت کے انبار

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں ہزاروں حضرات ڈاک خانے کے استعمال شدہ ٹکٹوں سے کافی روپیہ کما رہے ہیں ٹکٹ خریدنا اور فروخت کرنا ایک شاندار شغل اور پیشہ ہے۔ اگر آپ ڈاکخانہ کے ردی ٹکٹوں سے آمدنی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہماری کتاب کا مطالعہ کریں۔ اس میں ٹکٹوں سے روپیہ پیدا کرنے کے طریقے۔ ٹکٹ جمع رکھنے۔ فروخت کرنے کے طریقے درج کئے گئے ہیں۔ اسوقت دنیا کے بڑے بڑے کروڑپتی بادشاہ۔ شہزادے۔ نواب۔ راجے تک ٹکٹ جمع کر رہے ہیں۔ امریکہ کی ایک بڑھیا کو ایک ٹکٹ کے عوض میں ہزاروں پونڈ دیا گیا۔

غرضکہ اس کتاب کے مطالعہ سے آپ اس فن سے پورے طور پر واقف ہو جائیں گے۔ اور ٹکٹوں سے معقول آمدنی پیدا کر سکینگے کتاب بالتصویر ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ۔ بذریعہ وی۔ پی۔ آٹھ آنے۔ زائد خرچ ہوں گے۔ اسلئے منی آرڈر بھیجنے میں فائدہ ہے۔

جام کوثر آفس رجسٹرڈ دہلی

ریلوے انجن کا موجد

مترجمہ حمدی صاحب
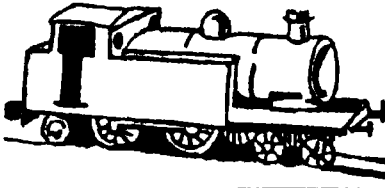
کھیل میں کام کرنے والے

جارج اسٹیفنسن عرف جارڈی

رابرٹ اسٹیفنسن ۔ جارج کا والد

ایڈورڈ پس ۔ سٹاکٹن اور ڈارلنگٹن ریلوے کا محرک اعلیٰ

بل تھرل وال ۔ جارج کا ہمجولی

نکولس وڈ ۔ ایک کاریگر اور جارج کا دوست

جیمز ۔ مسٹر پیس کا ملازم

پہلا منظر

سنہ ۱۷۹۰ء

جارج اسٹیفنسن کا بچپن

ڈیولی بوگ کے قریب ایک ندی کا کنارا ۔

[نو سال کی عمر کا ایک لڑکا پھٹے پرانے کپڑے پہنے ندی کے کنارے کھیل رہا ہے ۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبا سا نرسل ہے ۔ وہ اس کا ایک سرا منہ میں رکھ کر زور سے پھونک مارتا ہے ۔ سیٹی بجتی ہے ۔ لڑکا خوشی سے ناچنے لگتا ہے ۔]

لڑکا :۔ آہا ۔ کیسی اچھی سیٹی ہے ۔ کتنے ہی نرسل ضائع کئے ۔ تب کہیں جا کر بنی ۔ جارج کہتا تھا کہ نہیں بنے گی ۔ اب جو وہ آجائے تو کیا ہی مزہ ہو ۔ اسے بتاؤں کہ یوں بناتے ہیں سیٹی ۔

[وہ دوبارہ سیٹی بجاتا ہے ۔ دور سے ایک بچے کے گانے کی آواز آتی ہے ۔ لڑکا کان لگا کر سنتا ہے ۔ آواز قریب آ رہی ہے ۔ وہ نرسل پھینک کر کھڑا ہو جاتا ہے اور پکارتا ہے]

لڑکا :۔ جارڈی ! جارڈی !!

آواز :۔ میں آ رہا ہوں ، کیا نام ہو بل

بل :۔ ہاں جارڈی میں ہی ہوں ۔ جلدی آؤ

[جارڈی دوڑتا ہوا بل کے پاس آ جاتا ہے]

میلے کچیلے کپڑے، سر کے بال الجھے ہوئے
ہاتھ میں درخت کی ایک ٹہنی پکڑے
ہوئے ہے۔ یہ جارج سٹیفنسن ہے۔
رابرٹ سٹیفنسن ایک غریب فائرمین
کا بیٹا]
بل :۔ دیکھو جارڈی میں نے بنالی نا آخر سیٹی۔ تم

جارڈی :۔ کوئی سا۔ اچھا ٹھہرو میں سوچتا ہوں۔
[سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ سر کے
بال کھجاتا۔ پھر یک لخت کہتا ہے]
جارڈی آؤ انجن بنائیں۔
بل (ناک بھوں چڑھاکر) ہوں۔ تمھارے سر
پر تو ہر وقت انجن کا بھوت سوار رہتا ہے۔

کہتے تھے کہ نہیں بنا سکوں گا۔
(نرسل اٹھاکر سیٹی بجاتا ہے۔ جارج
ہنستا اور کہتا ہے۔)
جارج: اماں چھوڑو اس قصّے کو۔ آؤ کوئی اور دلچسپ
کھیل کھیلیں۔
بل :۔ کون کھیل؟
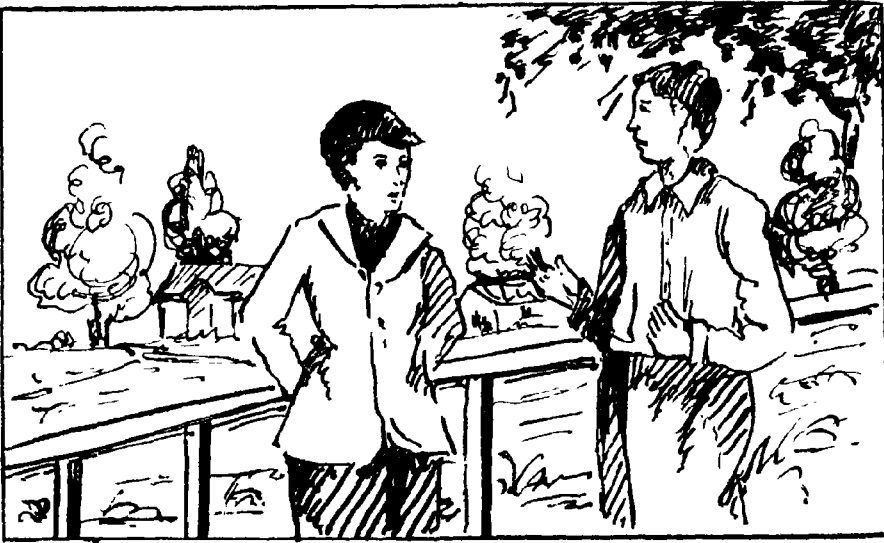
کیا تمھیں اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا؟
جارڈی اخاہ، ائے بڑے انجنوں سے نفرت کرنے
والے۔ کیوں صاحب۔ یہ حالت کب سے
ہوئی ہے؟
بل :۔ (ہنستا ہے) اچھا بھئی تمھاری مرضی، جاؤ پھر
مٹی لینے۔ میں نرسل اور سرکنڈے لاتا ہوں

جارڈی تم خود مٹی لینے کیوں نہیں جاتے۔ ڈر لگتا ہوگا
تاکہ کہیں ندی میں ڈوب نہ جاؤ۔
بل :۔ مجھے ڈر لگتا ہے ؟ بل تھرل وال کو ؟ لو
میں ہی جاتا ہوں۔
بل :۔ [جارڈی اس کی ٹانگوں سے لپٹ
جاتا اور اُسے گرا دیتا ہے۔]
بل اور جارڈی :۔ مجھے چھوڑ دو۔ نہیں تو تمھارے ابا سے یہ
کہہ دوں گا کہ تم گائیں آوارہ چھوڑ کر انجن
بنانے لگتے ہو۔
جارڈی ہوں۔ تم میں اتنی جرأت ہے ؟ ذرا کہہ کر تو
دیکھو، تمھیں کیسا مزا چکھاتا ہوں۔
[دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ جارڈی مٹی لینے چلا جاتا
ہے اور بل نرسل وغیرہ اکٹھا کرنے لگتا ہے]

دوسرا منظر

۱۷۹۵ء

جارج اسٹیفنس بعمر ۱۴ سال
کوئلے کی کان ۔ واقعہ دائیلم کا انجن گھر
[سورج ڈوب چکا ہے ۔ انجن گھر
میں مٹی کے تیل کا لیمپ جل رہا ہے۔
رابرٹ اسٹیفنسن انجن کے پاس کھڑا ہے
اور جارج اس کے پرزوں کو بغور
دیکھ رہا ہے۔ دونوں خاموش ہیں۔
آخر رابرٹ بولتا ہے ۔]
رابرٹ :۔ جارڈی ! پھر ہوائی قلعے بنانے لگے !

[جارڈی جواب نہیں دیتا ۔]
رابرٹ (ذرا زور سے) جارڈی !
جارڈی :۔ ابا جان !
رابرٹ ۔ میں کہتا ہوں پھر ہوائی قلعے بنانا شروع
کر دئے ۔ اب کیا سوچ رہے ہو؟
جارڈی ۔ ابا جان میں یہ سوچ رہا ہوں کہ انجن چلتا
کیوں کر ہے ۔ میں جب بڑا ہوں گا تو ایک
انجن خود بناؤں گا۔
انجن بناؤ گے ؟ کیا ——— تم سا لڑکا جس
نے مدرسے کا منہ تک نہیں دیکھا، توقع کرسکتا
ہے کہ جیمز واٹ سے سبقت لے جائے ۔
جارڈی (بھرائی ہوئی آواز میں) کاش ابا جان میں
کچھ لکھ پڑھ سکتا ۔
رابرٹ ۔ لیکن بیٹا اس سے فائدہ ؟ ہم سارا دن محنت
کرتے ہیں ۔ تب جا کر کہیں روٹی کا منہ دیکھنا نصیب
ہوتا ہے ۔ میں بارہ سال سے یہاں فائرمین
ہوں ۔ صرف بارہ شلنگ ہفتے کی تنخواہ ملتی
ہے ۔ اتنی قلیل آمدنی اور اتنا بڑا کنبہ! کھانے
پینے کی چیزوں کو آگ لگی ہوئی ہے ۔ خدا ہی
جانتا ہے کس مشکل سے بسر ہوتی ہے ۔ تم بڑے
سعادت مند بچے ہو ۔ تم نے ہمیشہ میری
مصیبتوں کو ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے ۔
پہلے تم گائیں چراتے رہے ۔ پھر مزدوری کرتے
رہے ۔ اب میرے ساتھ کام کرتے ہو ۔ کچھ نہ
کچھ مل ہی جاتا ہے ۔ غریبوں کے لئے ایسے

وقت میں یہ بھی غنیمت ہے۔

جارج: ابا جان میں جانتا ہوں۔ آپ نے ہمارے لئے بڑے بڑے دکھ اُٹھائے ہیں۔ اب بھی آپ صبح سے شام تک اپنی جان مارتے ہیں لیکن میں انجن کو اس لئے غور سے دیکھ رہا ہوں کہ ایسے انجنوں کی اچھی طرح مرمت کر سکوں اور خود اس سے اچھا انجن بنا سکوں۔ اگر خدا نے مجھے کامیاب کر دیا تو کہیں اچھی سی ملازمت مل جائے گی۔ اور ہمارے دن پھر جائیں گے۔

رابرٹ:۔ اچھا بیٹا خدا تمھاری آرزو پوری کرے! لیکن جتنا اس انجن کے متعلق مجھے علم ہے تم بھی جانتے ہو۔ اگر تمھیں اتنا ہی شوق ہے تو کل مجھے اس کی صفائی کرنی ہے۔ تم میرے پاس رہنا، اگر ہو سکے تو خود اس کے پرزوں کو جوڑنے کی کوشش کرنا۔

جارج۔ (خوشی سے بے تاب ہو جاتا ہے) اچھے ابا جان یہ تو میری مدت سے خواہش تھی۔ شکر ہے کل پوری ہوگی۔ میں تو چاہتا ہوں کل ابھی آجائے۔

رابرٹ۔ (ہنستے ہوئے) اتنی بے صبری! کل جب سارا دن گرمی میں کام کرنا پڑا تو قدر عافیت معلوم ہو جائے گی۔ آئندہ کبھی بھول کر بھی نام نہ لوگے۔

جارج۔ (فخر سے) میں کام سے جی چرانے والا نہیں ہوں۔ ابا جان میں تو سارا دن اور ساری رات کام کر کے بھی نہ تھکوں۔

رابرٹ۔ اچھا بہت باتیں ہو لیں۔ تم اب گھر جاؤ میں بھی تمھارے پیچھے پیچھے آتا ہوں۔ بس دوسرے آدمی کا انتظار ہے۔ وہ آئے تو چلوں۔

[جارج سلام کر کے چلا جاتا ہے
رابرٹ اسے دیکھ رہا ہے۔]

تیسرا منظر

۱۸۲۱ء

مسٹر ایڈ ورڈ پیس کا مکان واقعہ ڈارلنگٹن۔

[مسٹر پیس اسٹاکٹن سے ڈارلنگٹن تک مجوزہ ریلوے کا محرکِ اعلیٰ ہے۔ اس نے بڑی دقتوں کے بعد پارلیمنٹ سے ریل کی پٹری بچھانے کی منظوری حاصل کی ہے۔ گاڑیوں کو کھینچنے کے لئے گھوڑوں، آدمیوں اور مقامی انجنوں سے کام لیا جائے گا۔ مسٹر پیس اپنے مطالعے کے کمرے میں بیٹھا آگ تاپ رہا ہے۔ بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایک بوڑھا خادم داخل ہوتا ہے۔]

خادم آقا۔ دو نوجوان آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

پیس کون ہیں وہ؟

خادم میں نے ان کے نام دریافت نہیں کئے۔ انھوں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ کلنگ ورتھ سے آئے ہیں اور آپ سے ایک ضروری کام کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔

پیس - ان کی ظاہری حالت سے تم نے کیا اندازہ لگایا ؟

خادم - سیدھے سادھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کوئلے کی کان کے ملازموں کے سے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔

پیس - انھیں اندر لے آؤ۔

خادم بہتر جناب!

[ملازم باہر جاتا ہے - دونوں ملاقاتی کمرے میں داخل ہوتے ہیں -]

ایک ملاقاتی شام بخیر جناب!

پیس - (آرام کرسی سے اُٹھ کر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے) شام بخیر صاحب! (پھر دوسرے ملاقاتی کی طرف بڑھتا اور ہاتھ ملاتا ہے) حضرات! میں آپ کی کیا خدمت بجا لا سکتا ہوں!

پہلا ملاقاتی - جناب ہم کلنگ ورتھ سے آئے ہیں۔ وہاں کوئلے کی کان میں کام کرتے ہیں۔ میرا نام نکولس وڈ ہے۔ اور یہ میرے دوست جارج اسٹیفنسن انجن ساز ہیں۔

پیس - مجھے شرف ملاقات بخشنے کا مقصد ؟

اسٹیفنسن یہ مجھے مختصر عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ میں نے سنا ہے کہ اسٹاکٹن ڈارلنگٹن ریلوے بل پاس ہوگیا ہے اور جلد ہی اس پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔ آپ چونکہ اس کے محرکِ اعلیٰ ہیں اس لئے آپ کے پاس حاضر ہونے کا مقصد یہ ہے کہ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اپنی ناچیز خدمات پیش کروں!

پیس - (تعجب سے اس کی طرف دیکھتا ہے) ، خوب! کیا آپ کو اس کے متعلق پہلے بھی کچھ تجربہ ہے۔

وڈ - جناب ان سے بہتر آدمی آپ کو ملنا مشکل ہے میں ان کے ساتھ محض اُن کے دعوے کی تائید کے لئے آیا ہوں۔

پیس یہ آپ کی عنایت ہے۔

وڈ - شکریہ - مسٹر جارج ریلوے لائن کے متعلق جو کچھ پہلے کر چکے ہیں اس کا مجھے بخوبی علم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اگر انھیں موقع دیا جائے تو وہ کیا کچھ کر سکیں گے۔

اسٹیفنسن - میرا خیال ہے کہ آپ کو اکہری پٹڑی کی جگہ دوہری پٹڑی بچھانی چاہیے۔

پیس - کیوں ؟

اسٹیفنسن - پھر گاڑیاں متحرک انجنوں سے کھینچی جاسکیں گی۔

پیس (زیادہ تعجب سے) متحرک انجن ؟ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے ؟ کیا انجن لائن پر چل کر گاڑیاں کھینچ سکیں گے ؟

اسٹیفنسن ۔ بے شک ۔

پیس ۔ یہ ناممکن ہے ۔

اسٹیفنسن ۔ لیکن میرے نزدیک ناممکن نہیں ۔ میں اس میں کامیاب ہو چکا ہوں ۔

وڈ ۔ (جارج کو ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کرکے پیس کی طرف متوجہ ہوتا ہے) میرے دوست مسٹر جارج نے متحرک انجن بنالیا ہے جو پانچ سال سے تسلی بخش کام کررہا ہے ۔ ہم وہاں کان سے کوئلہ اسی کے ذریعے اِدھر اُدھر لے جاتے ہیں ۔

پیس ۔ کیا یہ حقیقت ہے ؟

اسٹیفنسن ۔ جی ہاں یہ حقیقت ہے ۔ مسٹر وڈ نے جس انجن کا ذکر کیا ہے، یہ میرا دوسرا انجن ہے اور میرے پہلے انجن سے زیادہ مکمل ، اُس کی نسبت زیادہ تیز چلتا اور زیادہ بوجھ کھینچتا ہے ۔

پیس ۔ لیکن مجوزہ لائن کی لمبائی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے تو آپ کا انجن کام نہیں دے گا ۔

اسٹیفنسن ۔ کیوں نہیں ؟

پیس ۔ صاف اور ہموار پٹری پر تو اس کے پہیے پھسل جائیں گے ۔

اسٹیفنسن ۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا ۔ انجن پانچ سال سے کام کررہا ہے ۔ بھاری بھاری بوجھ کھینچتا ہے ۔ آج تک ایک دن بھی اس کے پہیے نہیں پھسلے اور پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتا ہے ۔

پیس ۔ اگر یہ سچ ہے تو واقعی ایک عجیب چیز ہے ۔

اسٹیفنسن ۔ جارج اسٹیفنسن کبھی جھوٹ نہیں بولتا ۔

پیس ۔ (جلدی سے) معاف فرمائیے ۔ میرا یہ مطلب نہ تھا ۔ اصل میں بات یہ ہے کہ آپ کا بیان میرے نزدیک اتنا عجیب ہے کہ مجھے اس کے سمجھنے کے لئے کچھ وقت چاہئے ۔

اسٹیفنسن ۔ تو کسی دن براہِ کرم کلنگ ورتھ تشریف لائیے ۔ آپ میرے بیان کی صداقت کا ثبوت اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمالیں گے ۔

پیس ۔ جتنی جلدی ہو سکا میں وہاں آؤں گا ۔ اور اس اثنا میں میں آپ کا نام کمپنی کے ڈائرکٹروں کے سامنے پیش کروں گا کہ وہ لائن کی پیمائش کا کام آپ کے سپرد کردیں ۔

اسٹیفنسن (خوش ہوکر) میں آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں کہ آپ نے میری آرزوؤں کے پورا ہونے کا موقع دیا ۔ جس دن میں اپنے انجن کو نئی لائن پر چلتا دیکھوں گا تو سمجھوں گا کہ مجھے دنیا بھر کی نعمتیں میسر آگئیں ۔ میں آپ کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

پیس ۔ فی الحال آپ کو زیادہ مطمئن نہیں ہونا چاہئے کیونکہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یہی ہے کہ گھوڑوں وغیرہ سے کام لیا جائے ۔ بہرحال اس ملاقات کا اتنا فائدہ تو ضرور ہوا ہے کہ ہمیں لائن کی پیمائش اور تعمیر کے لئے آپ سا قابل آدمی مل گیا ہے ۔

میں جلدی ہی کلنگ ورتھ آؤں گا۔ اگر آپ نے مجھے یقین دلا دیا کہ آپ کا انجن مجوزہ لائن پر کامیابی سے کام کر سکے گا تو میں آپ کے لئے اپنا تمام اثر و رسوخ کام میں لاؤں گا۔ اور کمپنی کے ڈائرکٹروں کو مجبور کروں گا کہ آپ کی ایجاد سے فائدہ اٹھائیں۔

اسٹیفنسن خدا آپ کو خوش رکھے! آپ کو ہماری آج کی ملاقات کا افسوس نہیں ہوگا۔ جارج اسٹیفنسن نے جیسا کہا ویسا کر کے دکھا دے گا۔ (نکولس کی طرف مڑکر) آؤ نکولس چلیں ہم نے مسٹر پیس کا کافی وقت لیا ہے۔

[آپس میں مصافحہ کرکے اور شب بخیر کہہ کے رخصت ہو جاتے ہیں
پیس کرسی پر بیٹھ کر زیرِ لب کہتا ہے]

پیس ۔ متحرک انجن! متحرک انجن!! اگر یہ حقیقت ہے تو واقعی عجیب حقیقت ہے۔

چوتھا منظر

۲۷ ستمبر ۱۸۲۵ء کی ایک شام
مسٹر پیس کے مطالعے کا کمرہ

[مسٹر پیس اور جارج اسٹیفنسن آرام کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے ہیں]

پیس دوست آج کا دن بھی دنیا کی تاریخ میں ایک حیرت انگیز دن شمار ہوگا۔

اسٹیفنسن ۔ شکر ہے آخر ہم نے ثابت کر دیا کہ کلنگ ورتھ کا انجن ساز اپنے کام کو بخوبی سمجھتا ہے۔ سب سے بڑھ کر خوشی اس بات کی ہے کہ میں نے آپ کا اعتماد نہیں کھویا۔ بہر حال اب میں اطمینان سے کام کر سکوں گا۔

پیس انجینیروں اور نکتہ چینوں نے کیا کچھ نہ کہا۔

اسٹیفنسن انھوں نے سب کچھ کہا۔ لیکن اس وقت انھیں علم نہ تھا جس شخص نے انھیں بنایا، اس کی خوبیوں کو پرکھا اور اس کے نقائص دور کئے وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کامیابی یقینی ہے۔

پیس ۔ اور کتنا بھاری بوجھ انجن نے کھینچا؟

اسٹیفنسن ۔ بارہ گاڑیاں کوئلے اور آٹے سے اور بائیس "ناشتے دانوں" سے لدی ہوئی (دونوں ہنستے ہیں) کل چونتیس، اور پائدانوں سے جو لوگ چمٹے ہوئے تھے وہ مزید برآں۔

پیس جارج تم نے تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ بہت جلد تمھارے نقال پیدا ہو جائیں گے۔

اسٹیفنسن ۔ اسی بات کا تو مجھے انتظار ہے۔ میں تصور کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ ملک بھر میں ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ بادشاہ سے لے کر غریب تک اس ایجاد سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کاش وہ دن میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں لیکن افسوس میری یہ آرزو پوری نہ ہوگی زندگی بہت تھوڑی ہے اور انسانی ترقی بڑی سست رفتار۔

[باہر سے نعروں کی آواز آتی ہے۔
جارج اسٹیفنسن۔ زندہ باد!
جارج اسٹیفنسن زندہ باد!!]
پیس۔ سنو! لوگ تمھاری زیارت کرنا چاہتے ہیں۔
اسٹیفنسن۔ زیارت اور مجھ نا چیز کی!

پیس۔ اس قدر کسر نفسی سے کیوں کام لیتے ہو اُٹھو۔
[دونوں باہر آتے ہیں۔ لوگ انھیں دیکھ کر بڑے جوش و خروش سے "جارڈی زندہ باد" "جارڈی زندہ باد!!" کے نعرے لگاتے ہیں]
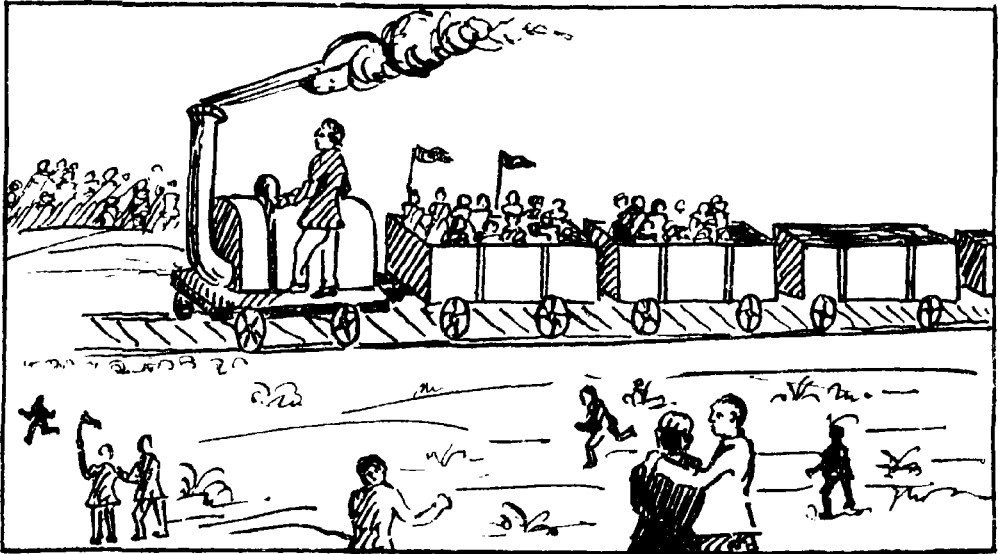
پہیلیوں کے جواب

(۱) بھڑوں کا چھتا (۲) مکڑی (۳) خرگوش (۴) حجام (۵) تارے۔ قبر۔ جھوٹ۔ ہڈی۔
(۶) ہوسلے (۷) گنا (۸) مینڈک (۹) موسم (۱۰) جامن (۱۱) مرچ

روئی یا کپاس

نور محمد صاحب، استاد تکلی۔ اُستادوں کا مدرسہ (جامعہ)

آج کل یورپ، امریکہ اور جاپان کی تجارت کا بہت کچھ دار و مدار روئی پر ہے۔ مگر تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اب سے کوئی دو سو سال پہلے یورپ کے

لوگ جانتے بھی نہ تھے کہ روئی کیا چیز ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک جانور ہوتا ہے۔ جو درخت پر پیدا ہوتا ہے۔ اوپر کی تصویر دیکھو ایک بھیڑ ایک پودے پر اگی ہے۔ وہ اون سے واقف تھے اور وہ اِسے بھی اون ہی کی ایک قسم سمجھتے تھے یعنی ایسا اون جو درخت سے پیدا ہوا ہو۔ یہ چیز سب سے پہلے ہمارے ملک میں ہوئی تھی، یہیں سے یہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں پھیلی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ سے کوئی تین سو برس پہلے جب سکندر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کے سپاہی روئی کا پودا دیکھ کر بہت تعجب کرنے لگے۔ انھوں نے اسے اپنے گھوڑوں کا چار جامہ بنانے کے لئے

بہت مفید اور کار آمد پایا، بس اسی وقت سے روئی باہر جانے لگی۔ بحیرۂ احمر کے کنارے کے تمام ملک ہندوستان سے روئی منگاتے تھے۔

یونانیوں کے بعد سے روئی کا پودا بھی ہندوستان سے باہر گیا۔ اور بعض اور جگھوں میں بھی لوگ کپاس بونے لگے۔ لیکن ان جگھوں کی روئی ہندوستانی روئی کی نفاست اور عمدگی کو نہیں پہنچتی تھی، اس لئے تمام ملک یہیں سے روئی منگاتے تھے۔ اگرچہ وہ ہندوستان جیسا مہین دھاگا نہ کات سکتے تھے۔ یہاں کی سی ململ اور تن زیب بننا تو اُن کے خواب وخیال سے باہر تھا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ:"ہندوستان میں جب ململ بننے کے بعد گھاس پر پھیلا دی جاتی تھی اور رات میں جب اس پر اوس پڑتی تھی تو کوئی شخص ململ کو آنکھ سے نہ دیکھ سکتا تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانے میں ہندوستان کی ململ یورپ کے تمام ملکوں میں جاتی تھی۔ اور ہر سال کروڑوں روپے کا کپڑا ہندوستان سے باہر بھیجا جاتا تھا۔

لیکن روئی ہندوستان سے باہر دنیا کے دوسرے ملکوں میں کیسے پھیلی، اس کی داستان عجیب وغریب ہے۔ اب سے کوئی ایک ہزار سال پہلے مسلمانوں نے جب جزیرۂ سسلی پر قبضہ کیا تو انھوں نے اس پودے کی وہاں کاشت شروع کی اور جب انھوں نے اسپین فتح کیا تو یہ پودا اُن کے ساتھ اسپین میں آیا۔

ایک عرصے تک اسپین میں روئی کی بہت اچھی پیداوار ہوتی رہی۔ انگریزی میں روئی کے لئے جو لفظ ہے (COTTON) وہ اسی عربی لفظ قطن سے بنا ہے جس کے معنیٰ روئی کے ہیں۔ سسلی میں جب تک اس کی کاشت تھی اس وقت تک یہاں سے روئی اٹلی، قسطنطنیہ، ایران، مصر اور شمالی افریقہ کے تمام علاقوں میں جاتی تھی اور صرف یہیں تک نہیں، انگلستان بھی پہنچتی تھی۔ اسپین سے یہ یورپ کے باقی حصوں میں بھیجی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۴۹۲ء میں جب کولمبس نے امریکہ کا پتہ لگایا تو یہ پودا اسپین سے امریکہ پہنچا اور پھر اس کے بعد مکسیکو اور برازیل (جنوبی امریکہ) میں آیا۔ جاپان میں یہ پودا یورپ اور امریکہ سے پہلے بھی ۸۰۱ء میں آچکا تھا لیکن پھر دوبارہ اسے کوئی تین سو برس ہوئے پرتگیز لائے اور اس کے بعد وہاں اس کی بڑے پیمانے پر کاشت شروع ہوئی۔ اس طرح جس چیز کو ہمارے ہندوستان نے سب سے پہلے پیدا کیا، مسلمانوں نے اسے تمام دنیا میں پھیلایا اور آج یورپ امریکہ اور جاپان کی تمام دولت کا اس پر دار و مدار ہے۔

نیچے دئے ہوئے عددوں سے ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ آج کل دنیا کے کن کن ملکوں میں کتنی روئی پیدا ہوتی ہے۔ روئی کی مقدار گانٹھوں سے ناپی جاتی ہے اور ایک گانٹھ ۵۰۰ پونڈ یعنی

۲۵۰ سیر کی ہوتی ہے

ہندوستان	۲،۶۰،۰۰۰
ایشیا کے دوسرے ملک	۳،۸۰،۰۰۰
افریقہ	۹۲،۰۰۰
دوسرے ملک	۴۰،۰۰۰

اوپر کے عددوں سے تمھیں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہمارے دیس میں اب بھی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کتنی کپاس پیدا ہوتی ہے۔ اس کی

دنیا کا نقشہ :- اس میں دکھایا گیا ہے کہ روئی کہاں کہاں پیدا ہوتی ہے۔

نوٹ :- جو جگہیں بالکل کالی ہیں وہاں روئی سب سے زیادہ پیدا ہوتی ہے

برازیل (جنوبی امریکہ)	۴۴،۰۰۰
میکسیکو اور جنوبی امریکہ کے دوسرے ممالک	۱۱۳۶۰۰۰
جزائر غرب الہند (امریکہ کے پاس)	۲۴،۰۰۰
ریاستہائے متحدہ امریکہ	۴،۰۰۰

وجہ بھی معلوم ہے؟ ہمارے ملک میں زیادہ تر لوگ (کوئی سَو میں نوّے) دیہاتوں میں رہتے، بستے اور کھیتی کسانی کرتے ہیں۔ روئی اُن کی آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے ہندوستان کے

ہر حصے میں کپاس بوئی جاتی ہے - مغربی حصے میں اس کی کاشت کثرت سے ہوتی ہے - گجرات اور سورت ، بھڑوچ اور سی ، پی دبرار کا علاقہ کپاس کی پیداوار کے لئے مشہور ہے -

کپاس کی پیداوار کے لئے نہایت عمدہ کالی زمین کی ضرورت ہے - دریائے تاپتی اور نربدا کے دہانوں نے بمبئی کے علاقے میں ایسی زمین پیدا کر دی ہے -

ہندوستان میں کپاس کا پودا جون اور جولائی
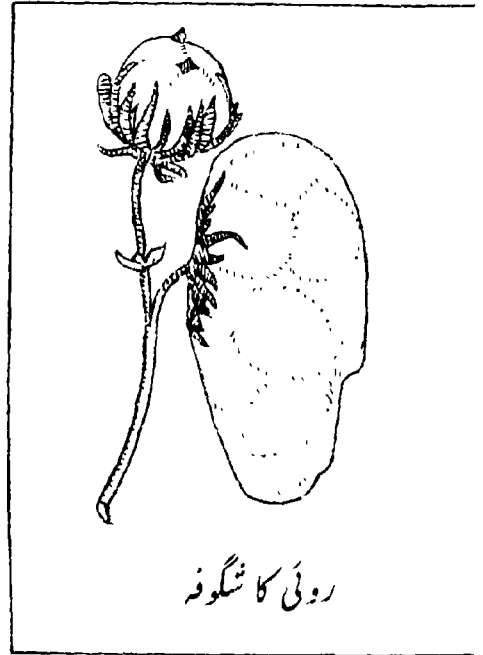
روئی کا شگوفہ

میں بویا جاتا ہے - اور اکتوبر نومبر میں فصل نکل آتی ہے - بیج بونے سے پہلے زمین برابر کر لیتے ہیں اور جب ایک دو بار مینہہ برسنے سے زمین کی گرمی نکل جاتی ہے تو بیج بو دیا جاتا ہے زمین میں ڈالنے سے پہلے بیج کو اچھی طرح صاف کر کے بیل یا گائے کا گوبر ملاتے ہیں -

ہندوستان کا نقشہ دیکھو کالا حصہ وہ علاقہ ہے جہاں کپاس کی کاشت ہوتی ہے اس سے تمھیں یہ

روئی کا پودا

اندازہ تو ہو جائے گا کہ ہمارے دیس کے کوئی آدھے حصے میں کپاس کی کھیتی ہوتی ہے - کپاس کی قسمیں اور نام کئی ہیں - بھڑوچ ، سورتی ، ویرم ، جڑی ، بنی ، روزیہ وغیرہ - بھڑوچ اور سورت میں پیدا ہونے والی کپاس اُن ہی شہروں کے ناموں سے مشہور ہے ؂

لمبے ریشے کا کپاس اعلیٰ درجے کا مانا جاتا ہے۔
جس کپاس میں بیج کم روئی زیادہ نکلے وہ کپاس بھی
اچھا سمجھا جاتا ہے۔ سورت اور بھڑوچ کے کپاس سے
۳۰ سے ۴۰ فی صدی تک روئی نکلتی ہے یعنی سو سیر
کپاس میں ۳۵ سے ۴۰ سیر تک روئی اور ۶۰ سے
۶۵ سیر تک بنولے نکلتے ہیں۔ یہ کپاس ہندوستان میں
عمدہ قسم کی مانی جاتی ہے۔ مدراس کی کپاس گھٹیا
قسم کی ہوتی ہے۔ اس سے صرف ۲۵ سیر روئی نکلتی
ہے۔

روئی سے کپڑا بنانے کے کارخانے لنکا شائر[۱]
میں کثرت سے ہیں۔ مگر انگلستان میں کپاس نہیں
پیدا ہوتی۔ اس لئے جب تک امریکہ اور مصر
انگریزوں کو روئی نہ دیں لنکا شائر کی ملیں نہیں
چل سکتیں۔ امریکہ والے کپاس کے معاملے میں
انگریزوں کو ہمیشہ تنگ کیا کرتے ہیں۔ اس مصیبت
سے بچنے کے لئے انگریز برابر اس کوشش میں
لگے ہوئے ہیں کہ بجائے امریکہ کی کپاس کے ہندوستان
کی کپاس لنکا شائر کے لئے خریدی جائے۔ انگریز
ہندوستان پر قبضہ کئے ہوئے ہیں اور یہاں کی
تجارت بھی اُن ہی کے قبضے میں ہے۔ اس لئے یہ
بالکل آسان تھا کہ ہندوستان کی کپاس لنکا شائر
بھیج دی جاتی مگر مشکل یہ ہے کہ لنکا شائر کو صرف لمبے
ریشے والی کپاس کی ضرورت ہے جو ہندوستانی
کپاس کی پوری پیداوار میں صرف پندرہ فی صدی
ہوتی ہے اور یہ لنکا شائر کی ضرورتوں کے لئے
بالکل ناکافی ہے۔ لنکا شائر کے اکثر مل باریک
سوت کا کپڑا بناتے ہیں اور باریک سوت نکالنے
کے لئے ایک انچ سے زیادہ لمبے ریشے والی کپاس
کی ضرورت ہوتی ہے مگر ہندوستان میں پچھتر
فی صدی کپاس کا ریشہ ۷/۸ انچ سے زیادہ لمبا نہیں
ہوتا۔ حکومت نے کپاس کی قسم سدھارنے کی
بہت کچھ کوشش کی۔ امریکہ اور مصر سے اچھے قسم
کے بیج لاکر یہاں بوئے گئے۔ لیکن ان بیجوں کے
لئے یہاں کی آب و ہوا موافق نہیں آئی۔ پھر بھی
کوششیں برابر جاری ہیں اور امید ہے کہ عنقریب
ہندوستان میں کل چھ کروڑ گانٹھیں ہر سال نکلا کریں
گی۔ ان میں دو کروڑ گانٹھیں ایسی ہوں گی جن کا
ریشہ ایک انچ سے زیادہ ہوگا۔

ہمارے ملک میں دو کروڑ تینتیس لاکھ
باون ہزار (۲۳۳۵۲۰۰۰) ایکڑ زمین پر کپاس
کی کاشت ہوتی ہے۔ روئی کا کپڑا بنانے والے
کارخانوں کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ ان

[۱] انگلستان کا ایک شہر ہے۔

ہندوستان اور سیلون
میں
روئی کے علاقے
سرحد
پنجاب
سی پی
حیدر آباد (دکن)
سیلون
روئی کا علاقہ
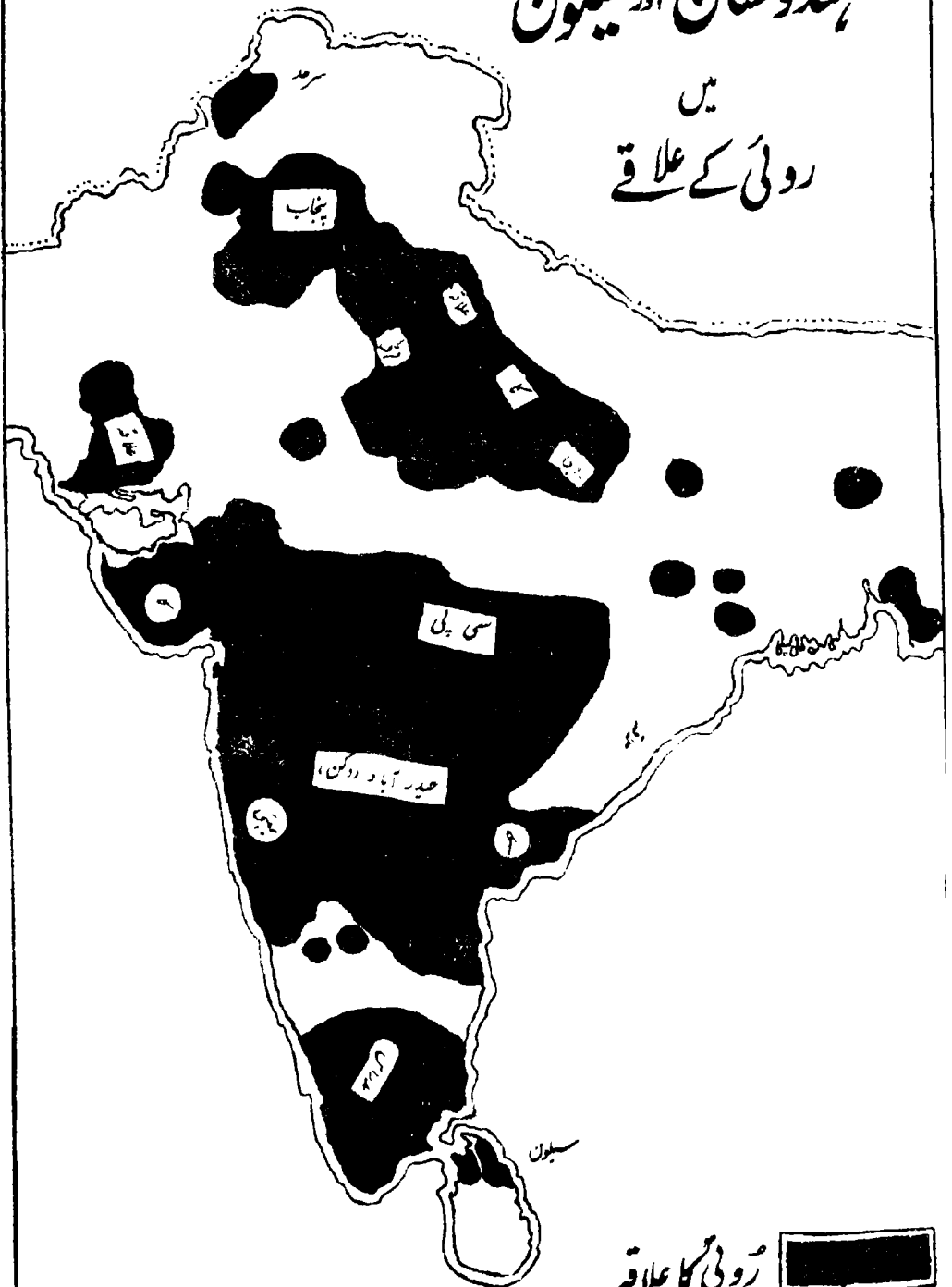
میں سے اکثر کارخانے بمبئی کے علاقے [illegible] ہیں۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ اسی علاقے میں کپاس کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے قدرتاً کپاس ہی کے علاقے میں کپڑے کی ملیں بن گئیں۔ ناگپور میں بھی کپڑے کی کچھ ملیں ہیں۔ علاوہ اس کے ہاتھ سے کپڑا بننے والے کرگھوں کی تعداد دو کروڑ ہے جس کے ذریعے آٹھ کروڑ ہندوستانیوں کو کام مل رہا ہے اور یہ سالانہ ایک ہزار کروڑ گز کپڑا بن لیتے ہیں۔ پھر بھی ہمیں ساٹھ کروڑ روپئے کا کپڑا باہر سے خریدنا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں کپڑے کا خرچ فی آدمی اوسطاً چودہ گز سالانہ ہے۔ دس گز کپڑا ہندوستان کی ملوں سے مل جاتا ہے۔ چار گز کپڑا باہر سے خریدنا پڑتا ہے۔ کئی سال سے ہمارے ملک کے بڑے بڑے لوگوں نے ایک انجمن بھی چرخہ سنگھ کے نام سے بنائی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ باہر سے کپڑا نہ خریدا جائے اور اپنی ضرورتیں ہم خود پوری کرلیں۔

لطیفے

چھوٹا بچہ:- اماں! آسمان کیوں بنایا گیا......

ماں:- تاکہ اوپر کی بلائیں زمین پر نہ آسکیں۔

چھوٹا بچہ:- پھر یہ ماسٹر زمین پر کیوں آئے؟

(عرفان احمد خاں)

چار شخص روزگار کی تلاش میں ایک حاکم کے پاس گئے۔ ایک قوم کا جولاہا۔ دوسرا تیلی۔ تیسرا دھوبی۔ چوتھا سید۔ صاحب بہادر نے حکم دیا کہ ان کے نام امیدواروں میں لکھ لئے جائیں۔ محرر نام لکھنے لگا۔ جولاہے نے اپنی ذات شیخ۔ تیلی نے پٹھان۔ دھوبی نے سید بتائی۔ جب سید صاحب سے پوچھا گیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے خدا لکھو۔

ایک انسپکٹر صاحب کسی اسکول کا امتحان لے رہے تھے۔ ایک لڑکے سے سوال کیا اوسط کسے کہتے ہیں؟ جس میں مرغی ہر سال انڈے دیتی ہے۔ یہ سن کر انسپکٹر صاحب نہایت حیران ہوئے۔ لڑکے نے جلدی سے اپنی کتاب کھول کر دکھائی جس میں یہ عبارت تھی کہ مرغی اوسط میں ہر سال "پانچ سو" انڈے دیتی ہے۔

ایک شخص نے جیل خانے میں جاکر ایک قیدی سے کہا "بہت افسوس ہے کہ تم جیسا نمازی یہاں ہو" اس نے کہا "جی یں مسجد ہی میں جانے کا قصوروار ہوں" اس نے دریافت کیا "وہ کیسے؟ مسجد میں جانے سے بھی کوئی گرفتار ہوتا ہے؟" قیدی نے کہا "نہیں مجھ پر جوتیاں چرانے کا الزام ہے۔"

عبدالواحد فاروقی، بھوپال

کتائی

نور محمد صاحب

ہمارے دیس میں ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ یہاں مشینیں نہیں آئی تھیں۔ گھر گھر چرخا چلتا تھا۔ اس پڑوس کی دس پانچ عورتیں گھر کے دھندوں سے فارغ ہوکر ایک جگہ جمع ہو جاتی تھیں اور چرخا کاتتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان دیہاتوں میں جہاں ریل وغیرہ کا گذر نہیں ہوا ہے، اب بھی یہی منظر نظر آتا ہے۔ چرخا بوڑھی عورتوں کے وقت گذارنے کا بہترین ذریعہ تھا۔

مجھے بچپن کا وہ زمانہ یاد ہے جب ہم چاندنی رات میں اپنے گھر کے آنگن میں لیٹتے تھے اور اپنی دادی اماں کو کہانی سنانے پر مجبور کرتے تھے۔ ایک دن چودھویں کا چاند نکلا ہوا تھا۔ دادی اماں کہنے لگیں "یہ چاند میں جو کالا کالا داغ نظر آتا ہے، تو بات یہ ہے کہ یہاں ایک صندل کا درخت ہے۔ اس درخت کے نیچے ایک بڑھیا چرخا کات رہی ہے۔ پاس ہی ایک جھاڑو رکھی ہے۔ قیامت کے دن جب سورج سوا نیزے پر آجائے گا اور لوگوں کی کھوپڑیاں پکنے لگیں گی تو بڑھیا سورج کو جھاڑو سے مارے گی اور سورج پھر اپنی جگہ چلا جائے گا"

غرض اب سے چالیس پچاس برس پہلے چرخا ایک عام چیز تھی۔ مگر جب سے انگریزوں کے قدم ہندوستان میں آئے، رفتہ رفتہ بے معلوم طریقے پر چرخے کو مٹانے کی کوششیں کی گئیں۔ ڈھاکے کی ململ تمام دنیا میں مشہور تھی۔ یہاں کی عورتیں اپنے ناخنوں میں سوراخ کرکے دھاگا کاتتی تھیں[۱]۔ بہترین کاتنے والوں کی انگلیاں تک کاٹ ڈالی گئیں[۲]

بیسویں صدی کے شروع میں (آج سے کوئی تیس چالیس سال پہلے) سوت کاتنے کی مشینیں ہندوستان میں آگئیں اور مشین کے ایک ایک تکلے نے ہزاروں چرخا کاتنے والے بیکار کر دئے۔ اس سے غریبی بڑھتی گئی اور آج ہندوستان میں فی شخص روزانہ آمدنی ۲ ہے حالانکہ دوسرے ملکوں میں دو روپے روزانہ تک ہے۔

یہ ایک عام خیال ہے کہ بُننے سے پہلے لوگوں نے کاتنے کا ہنر جانا ہوگا لیکن اصل میں لوگوں نے

سلہ / سلہ آئندہ صفحہ پر دیکھئے

بنا پہلے سیکھ لیا تھا۔ گھاس اور درختوں کی چھال سے ریشے نکال کر اس سے کپڑا بنا کرتے تھے۔ اس کے بعد

کرتے ہیں۔ پہلے پہل کاتنے کے لئے یہی تکلی استعمال ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوئی اور اعلیٰ قسم

مختلف قسم کی تکلیوں کے نمونے

کپاس سے سوت کاتنے کا ہنر معلوم ہوا۔ سب سے پہلے سوت تکلی کے ذریعے کاتا گیا۔ تم نے دیہاتیوں کو دیکھا ہوگا کہ لکڑی کی تکلی پر سن کی رسّیاں اور اون کاتا
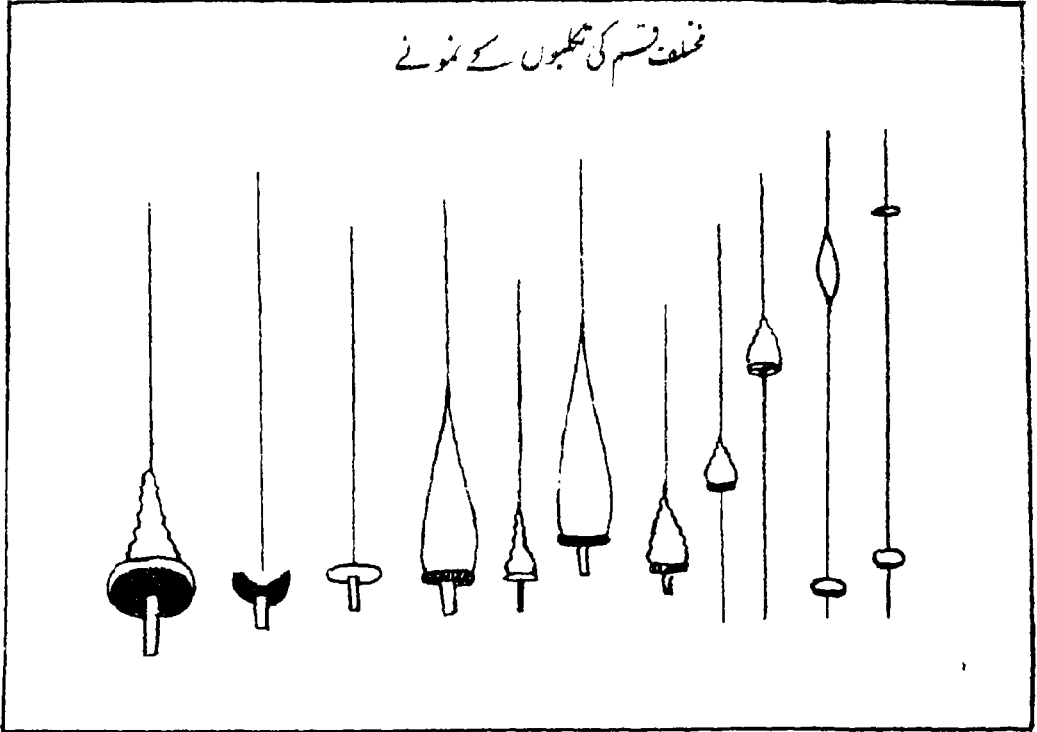
کی تکلیاں اور چرخے بنائے گئے۔ مختلف قسم کی تکلیوں کے نمونے اوپر دئے گئے ہیں۔

تم اپنے فرصت کے وقت میں تکلی کا شغل

نوٹ صفحہ ۵۸۱ ایک انگریز ضلع پورنیہ کے بارے میں لکھتا ہے "او نچے گھرانے کی عورتیں تکلیوں سے باریک سوت کاتتی ہیں اور کوئی دوسرا کام نہیں کرتیں۔ کالی گنج کے آس پاس بانس کی باریک تکلیوں کے نیچے کچھ مٹی کا وزن لگا کر اس سے کاتتی تھیں۔"

ایک اور انگریز لکھتا ہے "ڈھاکے میں ایسی ململ بنتی اور ایسا سوت کاتا جاتا ہے کہ یورپ کی عقل حیران ہے اس ململ کو دیکھ کر ایک صاحب نے یہاں تک کہا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انگلستان کے بنے ہوئے سب سے باریک سوت سے بھی زیادہ باریک سوت تکلی پر کیسے کتتا ہوگا؟ اور پھر وہ بنا کیوں کر جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک ہوشیار کاتنے والا ایک تولے میں چار میل لانبا سوت کات سکتا ہے۔

انڈیا ہاؤس لندن میں ڈھاکے کے سوت کا ایک نمونہ ہے۔ حساب کرکے دیکھا گیا تو ایک پونڈ میں ایک سو پندرہ میل دو فرلانگ اور ساٹھ گز لانبا ہوگا۔ ڈاکٹر ٹیلر کے پاس سوت کا ایک نمونہ تھا جو لمبائی میں دو سو گز اور وزن میں پانچ گرین تھا۔

۵۲ کھادی مینول حصہ دوم صفحہ ۱۰۰

اختیار کرو تو یہ تمھارے لئے بہترین شغل ہے۔ اس کے چلاتے وقت انسان کے دماغ میں ایک خاص یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بھی تجربے کی بات ہے کہ اس سے ارادے میں ایک خاص پختگی آ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں اور بہت سی خوبیاں ہیں۔ تمھیں اگر اس مشغلے سے دلچسپی ہو تو روئی دھننا اور پونیاں بنانا بھی سیکھ لو جب تک پونیاں اچھی نہ بنیں گی سوت اچھا نہیں کتے گا۔ ہاں روئی بھی اچھی ہونی چاہیئے۔ جتنی زیادہ لمبے ریشے والی ہو گی اتنا ہی سوت اچھا کتے گا۔ تمھارے لئے چرخا بھی بہت اچھی چیز ہے۔ مگر ہم نے تکلی کو اس لئے ترجیح دی ہے کہ یہ بہت سستی ملتی ہے۔ چرخے کی طرح یہ جگہ نہیں گھیرتی۔ اس کے چلانے سے پہلے کسی تیاری کی ضرورت نہیں، نہ اس کے چلانے سے شور و غل ہوتا ہے۔ مرمت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ اسے جیب میں رکھ کر جہاں جی چاہے لے جاؤ۔ اور جب جی چاہے سوت کاتنے لگو۔ تکلی سے اون کی کتائی بھی اچھی طرح ہو سکتی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شروع میں تم موٹا سوت کاتو گے۔ مگر جوں جوں مشق ہوتی جائے گی سوت بھی باریک ہوتا جائے گا۔ اچھا سوت تمھارے پاس کافی جمع ہو جائے تو اپنے پہننے کے لئے تم کوئی نہ کوئی چیز بنوا لو اور چاہو تو بیچ بھی سکتے ہو۔

روئی دھنکنے کا سامان

ذاکر ہمارے گھر کے پاس ہی رہتا ہے۔ اس کے مکان پر شام کو پاس پڑوس کے لڑکے لڑکیاں جمع ہو کر کھیلا کرتے ہیں۔ خوب رونق رہتی ہے۔ طرح طرح کے کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ کبھی گیند بلا، کبھی گلی ڈنڈا۔ کبھی دائی دکا۔ میں اکثر ان کا تماشا دیکھا کرتی ہوں۔ اُن کی ہنسی اور خوشی کی باتوں سے جی خوش ہوتا ہے۔ اُن میں کوئی جھگڑا ہو جاتا ہے تو مجھی سے فیصلہ کرایا جاتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بچے ہمیشہ میرے فیصلے سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ کبھی مجھ پر جانب داری کا الزام نہیں لگاتے۔ خیر کل شام کو ہمیشہ کی طرح بچوں کا جمگھٹا تھا۔ دائی دکا کھیلا جا رہا تھا۔ بچے ہنستے تھے اور دوڑتے تھے۔ دوڑتے تھے اور ہنستے تھے۔ ایکا ایکی ہنسی موقوف اور ایسا معلوم ہوا جیسے لڑائی شروع ہوگئی۔ میں نے اٹھ کر دیکھا۔ شاہد کھڑا رو رہا تھا۔ ذاکر نعیم کو پکڑے اُسے پیٹنے کی فکر میں تھا۔ کچھ لڑکے ذاکر کی طرف تھے کچھ نعیم کی۔ دو لڑکیاں جمیلہ اور ثریا صلح کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں دور سے کھڑی اس جلوس کو اپنی طرف آتے دیکھ رہی تھی۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟ ذاکر تمہیں اس قدر غصہ کیوں آ رہا ہے جیسے نعیم کو کھا ہی جاؤ گے۔ اس نے کیا قصور کیا؟ شاہد تم کیوں رو رہے ہو؟ کھیل میں کوئی روتا بھی ہے۔

ذاکر:- (طیش میں) دیکھئے نعیم نے بے چارے شاہد کا قمیص پھاڑ ڈالا۔

شاہد:- (روتے ہوئے اٹک اٹک کر) امی۔ ماں جان مجھ کو ماریں گی۔

نعیم کا ایک طرفدار:- کوئی اس نے جان بوجھ کر تو نہیں پھاڑا۔

دوسرا طرفدار:- قمیص ہی بودا ہو تو بے چارے نعیم کا کیا قصور

گھبرائی ہوئی بچیوں نے مجھ سے التجا کی کہ آپ ہی فیصلہ کر دیجئے۔

میں:- لیکن میں تو اسی وقت فیصلہ کر سکتی ہوں جب کوئی مجھ سے کرائے۔ آج تو یہ سب جج بنے ہوئے ہیں۔

سب:- (ایک زبان ہو کر) نہیں نہیں آپ فیصلہ کر دیجئے۔

میں :۔ اچھی بات ہے پہلے مجھے پورا واقعہ بتاؤ۔ جمیلہ تم غیر جانب دار معلوم ہوتی ہو۔ تم بتاؤ۔

جمیلہ نے لڑائی کا قصہ اس طرح سنایا "ہم سب دائی دکا کھیل رہے تھے۔ نعیم چور تھے۔ سب دائی دے چکے تھے، صرف شاہد باقی تھے۔ نعیم نے انھیں پکڑنے کے لئے اُن پر ہاتھ ڈالا۔ اتفاق سے ان کا قمیص ہاتھ میں آگیا اور جب شاہد چھٹا کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگے تو قمیص پھٹ گیا۔

میں :۔ شاہد میاں اس میں نعیم کا واقعی کوئی قصور نہیں، اُس نے قصداً قمیص نہیں پھاڑا۔ اتفاق کی بات ہے، اس کا ہاتھ قمیص پر پڑا۔ تم نے جھٹکا دیا۔ قمیص پھٹ گیا تم نعیم کو معاف کردو۔

شاہد :۔ مگر اماں جان تو مجھ پر خفا ہوں گی

بات تو ٹھیک تھی پر اس کا علاج کیا کیا جائے۔ آخر میں میں نے سوچ کر کہا۔

"ہم ایک ترکیب بتاتے ہیں،، اس میں رفو کردیا جائے۔ کون کرے گا؟

ثریا :۔ (جو اب تک چپ چاپ کھڑی تھی) مجھے تو آتا نہیں ورنہ میں کردیتی۔

میں :۔ ہم سکھائیں گے۔ شاہد قمیص لاؤ۔

ذاکر اُسے اپنے گھر لے گیا۔ اُسے اپنا قمیص پہنایا اور پھٹا ہوا قمیص بی ثریا کے سپرد ہوا۔ میں نے سب بچوں سے کہا کہ اگر وہ بھی رفو کرنا سیکھ لیں تو اچھا ہوگا۔ چنانچہ سب بچے اندر آگئے۔ میں نے اپنے سینے پرونے کی بقچی ثریا کے سامنے رکھ دی۔ اور رفو کرنے کے لئے اُسے جو باتیں بتائیں وہ یہ تھیں: "ثریا اس بقچی میں سفید نئے کپڑے کی کوئی دھجی ہوگی، وہ لے لو۔ اس میں سے کچھ دھاگے نکال لو۔ ایک سوئی لو جو نہ بہت موٹی ہو نہ زیادہ باریک، اس میں ان دھاگوں کے دو تار پرو لو۔ اب قمیص کا جو حصہ پھٹا ہوا ہے اُسے فریم پر لگا لو۔ دیکھو تانے کے دھاگے تو سلامت ہیں مگر بانے کے پھٹ گئے (خاکہ نمبر ا) اب تم سوئی سے اس میں

ا
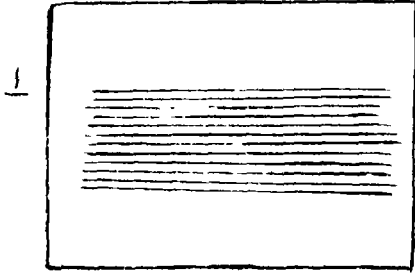
اس طرح دھاگے بھرو کہ وہ ان ٹوٹے ہوئے دھاگوں کی جگہ لے لیں ——— پھٹے ہوئے دھاگوں کے پھونسڑے قینچی سے کتر دو۔ سوئی کو بائیں طرف پھٹے ہوئے حصے سے کچھ پرے، کپڑے میں داخل کرو اور تیپچی کے طریقے پر سوئی کو کپڑے کے اوپر نیچے کرتے۔ پھٹے ہوئے حصے سے ذرا اوپر نکال لو (خاکہ نمبر ۲) پھر جس جگہ سے سوئی نکالی ہے اس کے برابر سے سوئی داخل کرکے دوسری طرف پہلے کی طرح تیپچی کرتے ہوئے نکال لو لیکن یہ خیال رکھو کہ پہلی مرتبہ جس جگہ سوئی کپڑے کے نیچے تھی۔ اس دفعہ اوپر ہو اور جہاں پہلے اوپر تھی

۲

اب وہاں نیچے ہو۔ (خاکہ نمبر ۳) جب پھٹے ہوئے حصے پر پہنچو تو تانے کے تاروں میں سے ایک تار سوئی کے اوپر

۳
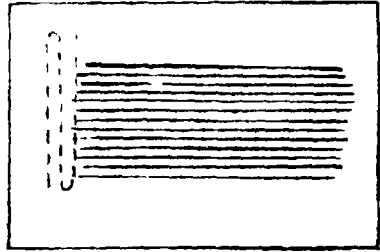
رہے اور دوسرا نیچے۔ اگلی مرتبہ نیچے والا اوپر اور اوپر والا نیچے (خاکہ نمبر ۴) جب پھٹا ہوا حصہ ختم کر کے پھر ثابت پر

۴
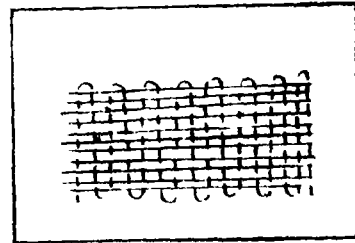
پہنچو تو دو تین سوئیاں پہلے کی طرح اور بھر دو۔ پھٹے حصے کے آس پاس کا کپڑا بودا ہو جاتا ہے۔ وہ بھی مضبوط ہو جائے گا۔ ثریا نے میری ہدایت کے مطابق رفو کر دیا اور تیار ہونے پر اس کی شکل ایسی ہوئی۔ (خاکہ نمبر ۵)

۵

اس خاکے میں سلائی دور دور اس لئے دکھائی گئی ہے کہ تم اسے دیکھ کر آسانی سے سمجھ جاؤ۔ کپڑے پر ٹانکے بالکل برابر برابر ہونے چاہئیں۔

"تو بھئی شاہد تمھارا قمیص تیار ہے۔ ثریا کا شکریہ ادا کرو اس نے تمھارا پھٹا قمیص ثابت کر دیا۔"

شاہد: بہت بہت شکریہ آپ کا۔

اس کے چہرے پر خوشی جھلک رہی تھی، اور خوش کیوں نہ ہوتا بچارا مار کھانے سے بال بال بچا تھا۔

تم رفو کرنے لگو تو ان باتوں کا ضرور خیال رکھنا۔

(۱) رفو ہمیشہ کچے دھاگے سے کیا جائے

(۲) دھاگا جہاں تک ممکن ہو اسی کپڑے سے نکالو جس میں رفو کرنا ہے اگر اس میں سے نہ نکل سکے تو جس قدر ممکن ہو دھاگا کپڑے کا ہم رنگ ہو۔

(۳) رفو ہمیشہ کپڑے کے الٹی طرف کرنا چاہئے۔

(۴) سوئی اور دھاگے کی موٹائی کا انحصار کپڑے پر ہوتا ہے۔

(۵) نئے کپڑے پر رفو باریک اور پرانے پر موٹا کرو۔

اس لئے کہ پرانا کپڑا جلد پھٹ جائے گا۔ بہت باریک کپڑے کے لئے دھاگے کا ایک تار استعمال کرنے کی کوشش کرو اگر یہ نہ چل سکے تو دو تار سے رفو کرو

ایک چھوٹے سے کپڑے پر رفو بنا کر میرے پاس بھیج دو۔ تمہارا رفو سب سے اچھا ہوا تو تمھیں انعام ملے گا۔

نوٹ:۔ رسالہ ملنے کے چھ دن بعد اپنا رفو ڈاک کے ذریعے میرے پاس بھیج دو ٭

پہیلیاں

(۱) ایک قلعہ میں برج ہزار ہر برج میں پہرے دار۔ کیسا عجائب قلعہ بنایا نا مٹی۔ نا چونا۔ لگایا

(۲) نٹ چڑھے۔ بانس بڑھے۔ نٹ اترے گھاٹ جائے اور انوکھی بات سنو۔ نٹ میں بانس سمائے

(۳) آدھا ہے کمہار کے پاس اور آدھا سب کے پاس سارا نہیں جو چاہیئے جنگل اس کا باس

آفتاب احمد

(۴) آدھا تو کعبہ ہی میں رہتا آدھا سے خانے میں سارے بشر کی بستی میں جو آتا ہے آدھا آنے میں

(۵) وہ چیز کیا جو زمین میں نہیں وہ چیز کیا جو آسمان میں نہیں

عقیلہ بانو

(۶) وہ چیز کیا جو قرآن میں نہیں وہ چیز کیا جو زبان میں نہیں وہ کیا چیز ہے جس سے باندی کے ہاتھ کالے اور بیوی کا منہ کالا

(۷) ایک شجر ہے اس کی پتلی بوٹے چپر۔ اس کا شور رہا ہے چلا اس کی بوٹی ہے مردار

(۸) اونٹ کی سی بیٹھک ہرن کی سی چال
خدا کی قسم اس کے دم ہے نہ بال

(۹) چار گرم چار نرم چار سرمہ دانی
بتاؤ تو بتاؤ ہماری کہانی ورنہ مرے تمہاری نانی

(۱۰) کاجل کی کجلوٹی اور دوں کا سنگار
ہری شاخ پہ بیٹا بیٹھی اسکا کوئی نہیں ہے پوچھن ہار

(۱۱) ہری ڈنڈی لال کمان۔ توبہ توبہ کرے پٹھان

عبدالواحد فاروقی۔ بھوپال

نوٹ جوابات ۵۷۳ پر دیکھو۔

دستکاری

اعجاز فاطمہ دختر مرتضائی بیگم

دستکاری سیکھنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ دستکار بھوکا اور حاجت مند نہیں رہ سکتا۔ جہاں ضرورت ہوئی کوئی رومال کاڑھا، کوئی بیل بنائی، کوئی گلوبند تیار کیا۔ کوئی جُراب بنی۔ کوئی میز پوش یا گدی بنائی اور فروخت کر دی۔ ملازمت جاتی رہے تو آدمی بیکار ہے، سرمایہ چوری ہو جائیں تو آدمی محتاج ہو جائے لیکن جس شخص کے ہاتھ میں ہنر اور دستکاری ہوگی وہ کبھی بھوکا اور بیکار نہیں رہ سکتا۔ اکثر مصیبت کی ماری عورتوں کے شوہر اُن کی طرف سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔ نہ اُن کے کھانے پینے کے لئے خرچ دیتے ہیں نہ اُن کی خبرگیری کرتے ہیں۔ ایسی پریشانی میں عورت کے ہاتھ میں ہنر ہوگا تو اسے شوہر کی بے پرواہی سے تکلیف کم ہوگی۔ وہ چیزیں تیار کرے گی اور انہیں بیچ کر اپنی گذر کرے گی۔ بعض اتفاقی موقعے ایسے بھی آ جاتے ہیں کہ شوہر زیادہ دنوں تک بیمار رہتا ہے۔ گھر میں اثاثہ اتنا نہیں ہوتا کہ بیٹھ کر کھا بھی لے اور علاج میں بھی خرچ کرے۔ نوکری بیماری کی وجہ سے پہلے ہی چھوٹ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں دستکار عورت گھر کا خرچ چلا سکتی ہے۔ بعض دفعہ ایسے ناگہانی خرچ آ پڑتے ہیں کہ پہلے سے کچھ جمع نہ ہو تو بہت پریشانی کا سامنا ہوتا ہے۔ اگر عورت دستکاری سے واقف ہو اور اس کے ذریعے سے کچھ جمع کرتی رہے تو ایسے موقع پر وہ رقم بہت کام آتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے اور بے چاری عورت بے یار و مددگار رہ جاتی ہے۔ اس وقت دستکاری سے واقفیت عورت کے بہت کام آ سکتی ہے اور وہ فاقوں کی مصیبت سے بچ جاتی ہے

پھر اگر ہمیں دستکاری آتی ہو اور ہمیں روپے پیسے کی بالکل ضرورت نہ ہو تو ہم فرصت کے وقت اچھی اچھی چیزیں کاڑھ کر، ٹانک کر، سی کر گھر کی آرائش و زیبائش بڑھا سکتے ہیں۔ اچھے سے اچھے کپڑے تیار کرکے خود پہن سکتے ہیں، اپنے بچوں کو پہنا سکتے ہیں۔ اور جو چیزیں دوسروں کو روپوں میں حاصل ہوتی ہیں ہمیں کوڑیوں کے مول پڑ سکتی ہیں۔

دستکاری کے سلسلے میں خاص نمبر میں بہت سے اچھے اچھے مضمون چھپ رہے ہیں۔ بہن اعجاز فاطمہ کا مضمون "کپڑے پر جالی کا کام" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ بہنیں مضمون کی ہدایتوں کے مطابق کپڑے پر جالی بنانے کی کوشش کریں گی

مرتضائی بیگم۔ معلمہ مسلم گرلز اسکول۔ پانی پت۔

کپڑے پر جالی کا کام

کبھی جالی کا کام بھی کیا ہے؟ جالی پر کشیدہ نہیں یہ تو بہت عام ہے، بلکہ جالی ریشمی یا سوتی کپڑے پر۔ یہ تو تم نے ضرور دیکھا ہوگا۔ مگر یہ سمجھا ہوگا کہ ہمارے بس کا نہیں یہ دستکاری کچھ مشکل تو ضرور ہے مگر کوشش اور محنت ہر مشکل کو حل کر دیتی ہے۔ اس نمونے کو ذرا دل لگا کر بناؤ تو سہی۔ دیکھو کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر ابھی نو سکھ ہو تو مہربانی کرکے کسی قیمتی کپڑے پر حملہ نہ کر بیٹھنا۔ پہلے معمولی کپڑے پر ہاتھ صاف کر لو۔ پھر اچھے کپڑے پر بناؤ

پہلے اس نمونے کا عکس اتار لو۔ اگر کپڑا باریک ہو تو نمونہ اس کے نیچے رکھ کر اتار لو۔ نہیں تو کاربن پیپر استعمال کرو۔ پتوں اور پھولوں کے لئے الگ الگ جالی کے ٹکڑے کاٹ لو یہ ٹکڑے ناپ میں پھول پتوں سے بڑے ہوں کیونکہ سلائی کا حق بھی چاہیئے۔ اگر تمھارا کپڑا موٹا ہے تو جالی کو دہرا کر لو تاکہ یہ تمھارے کپڑے کا ساتھ دے سکے۔ یہ جالی کے ٹکڑے پھول پتوں پر کپڑے کی الٹی طرف ٹانک دو اور کپڑے کے ہم رنگ دھاگے سے پھول کو کچا کر لو۔ جب یہ ان پھول پتیوں کے ہم شکل کچا ہو جائے تو جس جگہ کو تم نے کچا کیا ہے اس پر بہت قریب قریب کاج کا ٹانکہ بنا لو۔ اس کا خیال رکھنا کہ اس کا رخ اندر کی طرف ہو۔ ختم ہو جانے پر اوپر سے کپڑا کاٹ دو۔ جالی کا پھول بنا رہ جائے گا نیچے سے پھول پتی سے باہر جو جالی نکلی ہوئی ہو وہ بھی کاٹ ڈالو۔ پتے بنانے کے لئے سبز رنگ کا دھاگا اور پھول کے لئے گلابی، سفید یا زرد رنگ استعمال کرنا چاہیئے۔ بعد میں جالی کے اوپر پتوں کی درمیانی لکیریں ڈنڈی ٹانکے سے بناؤ۔ پتوں کی ڈنڈیاں گہرے رنگ کے سبز دھاگے سے بنیں گی ان کے واسطے بھی ڈنڈی ٹانکا استعمال کرو۔ کلیوں پر جالی نہیں لگے گی انھیں کشمیری ٹانکے سے کاڑھ لو۔ دھاگے کا رنگ وہی استعمال کرو جو پھول کا ہے

ہاں یہ بتانا بھول گئی کہ کاٹنے میں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ جالی کی جگہ کپڑا اور کپڑے کی جگہ جالی کاٹ ڈالو۔ ایسا ہوا تو تمھاری قمیص کا ستیاناس ہوگا اور تم پیام تعلیم پر الزام رکھو گی کہ نہ اس میں یہ نمونہ ہوتا نہ ہمارا کپڑا خراب ہوتا۔

اعجاز فاطمہ
مسلم گرلز اسکول۔ پانی پت

آج میں اپنی بہنوں کی خدمت میں ایک معمولی سی دستکاری کا نمونہ پیش کرتی ہوں - امید ہے کہ بہنیں اسے پسند کریں گی -

ضروری سامان

(۱) ایک ۱۶ انچ لمبا اور ۱۲ انچ چوڑا اطلس کا ٹکڑا (رنگ اپنی پسند کا -)

(۲) روئی کا تختہ ۹ انچ مربع - (روئی دوا فروشوں کی دکان سے مل سکتی ہے -)

(۳) کاغذ ، پنسل ، گوند ، قینچی ، سوئی وغیرہ

(۴) ڈی ، ایم ، سی نمبر ۳۰ - رنگ کے نمبر یہ ہیں -
(۸۴۴ ، ۹۰۴ ، ۹۰۵ ، ۹۰۷ ، ۹۵۴ ، ۹۲۱ ، ۴۱۵ ، ۶۶۶ ، ۴۴۴ ، ۵۵۳ ، ۵۷۹ ، ۳۱۰ ، سفید - ۴۲۰) ہر رنگ کی لچھیاں ایک ایک عدد منگوا لو

بنانے کی ترکیب :-

پانی :- پانی دکھانے کے لئے جو لکیریں بنائی گئی ہیں انہیں ڈنڈی ٹانکے سے (جو الٹا بخیہ بھی کہلاتا ہے) آبی رنگ نمبر ۸۴۸ سے بناؤ -

گھاس :- گھاس گہرے سبز رنگ نمبر ۹۰۴ سے ترچھے ٹانکے سے بناؤ -

پتے :- پتے کشمیری ٹانکے سے بناؤ - یہاں دو رنگ استعمال ہوں گے - بیچ میں نمبر ۹۰۵ اور باہر کی طرف نمبر ۹۰۷ - پتوں کے ڈورے رنگ نمبر ۴۵۴ سے ڈالو -

پھول :- پتی والے پھول ترچھے ٹانکے سے بناؤ - یہاں رنگ نمبر ۶۶۶ استعمال کرو - بیچ میں زرد رنگ نمبر ۴۵۴ سے فرانسیسی گرہ بناؤ -

گول پھول :- رنگ نمبر ۵۵۳ سے بنے گا - کاج کے ٹانکے سے بناؤ -

تیتری :- زرد رنگ نمبر ۳۱۰ سے کشمیری ٹانکے سے بنے گی اور نشانات رنگ نمبر ۶۶۶ اور ۴۴۴ سے ڈالے جائیں گے -

بنگلے کے لئے سفید رنگ استعمال کرو - باہر کی لائن اور پردوں کے نشان الٹے بخیے سے بنیں گے پھر اندر کا حصہ بنانے کے لئے کشمیری ٹانکا استعمال

ہوگا۔ ٹانکوں کے خط پر زنجیرہ بناکر بیچ کے حصے کو گول ٹانکے سے بھر دو۔ پنجے الٹے بخیئے سے بنالو۔ خیال رہے کہ چونچ اور ٹانگیں رنگ نمبر ۴۴ سے بنیں گی۔

کنول کا پھول:۔ سفید رنگ سے بنے گا۔ اس کا درمیانی حصہ بنانے کے لئے رنگ نمبر ۵، ۵ استعمال کرو اور ڈنڈیاں رنگ نمبر ۱۲۴ سے ڈنڈی ٹانکے سے بناؤ۔

مچھلی:۔ رنگ نمبر ۵۱۴ سے اس طرح بناؤ۔ کہ پہلے اس کے چاروں طرف ڈنڈی ٹانکا کرلو۔ اس کے بعد اندرونی حصہ کشمیری ٹانکے سے بھرو۔ نشانات سفید بناؤ۔ چھوٹی مچھلی بھی کشمیری ٹانکے سے بنے گی

پھلی۔ رنگ نمبر ۱، ۲، ۳ سے بناؤ۔ بیج بنانے کے لئے کشمیری ٹانکا اور لائنیں بنانے کے لئے ڈنڈی ٹانکا استعمال کرو۔ اب تمھارا نقشہ تیار ہوگیا۔

روئی کی بطخ کاٹنے کا طریقہ :۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس کا خاکہ باریک کاغذ پر اتار کر اسے قینچی سے کاٹ لو۔ پھر اس خاکے کو روئی کے تختے پر چپکا کر خاکے کے مطابق روئی کی بطخ کاٹ لو۔ کٹی ہوئی بطخ کو گوند لگا کر تیار نقشے پر چپکا دو۔ آنکھیں سُرخ رنگ سے بناکر چونچ پر زرد رنگ بھر دو۔ اگر اس نمونے کو محنت سے دل لگا کر بناؤ گی اس کا نتیجہ نہایت دلفریب ہوگا۔ اسے تم فریم میں لگوا کر اپنے کمرے کو آراستہ کرو۔ اگر کوئی تم سے پوچھے کہ یہ تم نے کس سے بنانا سیکھا ہے۔ تو

"مسلم گرلز اسکول، پانی پت"

کا حوالہ دے دینا ؞

میں پیام بچوں اور بچیوں کے لئے ایک خوبصورت جاذب (بلوٹنگ) بنانے کی ترکیب بتاتی ہوں۔ جو لڑکے لڑکیوں دونوں کے لئے ایک سا کارآمد ہے۔ امید ہے کہ بچے اسے پسند کریں گے۔ اور بنا کر اپنے لکھنے پڑھنے کی میز کو رونق دیں گے۔

جاذب کی پیمائش ۱۰ ½ × ۸ ½ انچ ہوگی۔ اس کے بنانے کے لئے ان چیزوں کی ضرورت ہوگی۔

(۱) ۱۰ ½ انچ چوڑا ۴۳ ½ انچ لمبا گہرے آبی رنگ کا اطلس یا پاپلین کا ٹکڑا۔

(۲) ۱۰ ½ × ۸ ½ انچ کے دو ٹکڑے سخت گتے کے۔

(۳) دھاگا ڈی ایم سی کا نیلے، سبز، نارنجی رنگ میں۔

(۴) آدھ انچ چوڑا الاسٹک یا معمولی فیتا۔

الف ۱ ب الف

۴	۳	۲	۱

الف ۲ ب الف

خاکہ ۱

بنانے کی ترکیب :۔

کپڑے کو موڑ کر چار برابر حصوں میں تقسیم کرو لیکن ان کو کترو مت جیسا کہ خاکہ نمبر ۱ سے ظاہر ہے۔ حصہ نمبر ۲ پر کشتی کا خاکہ ٹریس کرکے ڈنڈی ٹانکے :۔ (STEM STITCH) سے کاڑھ لو۔ نمبر ۱، ۲، ۳ سبز۔ درمیانی مستول و بادبان۔ نمبر ۴، ۵، ۶ نارنجی اور باقی تمام لکیریں

طرف ہو۔ یہ دو تھیلیاں سی بن جائیں گی۔ ان میں دونوں گتے کے ٹکڑے رکھ کر شگاف کو اوپر سے سی کر

ماگے سے بناؤ۔ اب سرے پلٹ ب کے قریب لاکر مشین یا
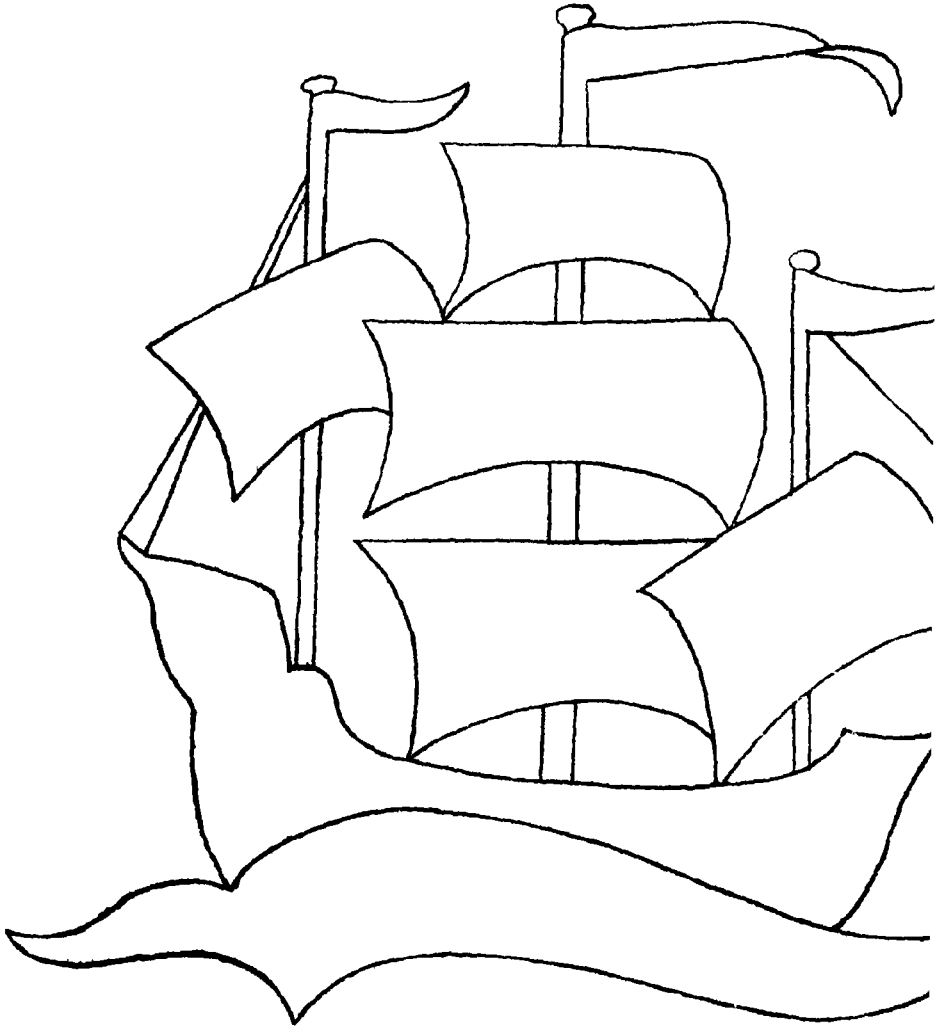
بند کردو۔ اب اس کی شکل خاکہ نمبر ۲ کے مطابق ہوجائے گی۔ الاسٹک کا ایک سرا الف پر اور دوسرا ب پر

۔ جب دونوں طرف سے سل جائے ھاکر لو۔ یہ خیال رہے کہ سلائی الٹی

مضبوطی سے ٹانک دو۔ ۱۰½ . ۱۷ انچ کے فیتے کے تیار ہے ؛

اندر سے گذار کر کتاب کی طرح موڑ لو۔ جاذب

الف

خاکہ ۱۲

ب

تیار جاذب

ویسے تو چوڑیوں کی بہت اچھی اچھی چیزیں بن سکتی ہیں، پر آج تو تم چوڑیوں کی ٹوکری بناؤ۔ اس کے لئے بہت باریک چوڑیوں کی ضرورت ہوگی ۔ یہ چاندنی چوک، دہلی اور دوسرے شہروں میں آسانی سے مل جائیں گی ۔ تم نیلی یا کالی خریدنا اور کوئی پچیس کے قریب ۔ کیونکہ بناتے وقت کچھ نہ کچھ ٹوٹیں گی ضرور ۔ چوڑیوں کے علاوہ باریک لچکا یا ڈھنک تین گز لے لو۔ اب ٹوکری بنانا شروع کر دو۔ پہلے دو چوڑیاں لو اور انہیں اس طرح رکھو (شکل نمبرا) اور لچکے کا دو انچ لمبا ٹکڑا کاٹ لو پھر اسے اس طرح رکھ کر گرہ لگا دو ۔ پھر اسے نمبر ۲ کی طرف موڑ کر دونوں چوڑیاں الٹ دو اور ادھر بھی ایسی ہی گرہ لگا دو ۔ اس طرح سات چوڑیوں کو باندھ دو ۔ اب سات چوڑیاں اسی طرح علیحدہ باندھو
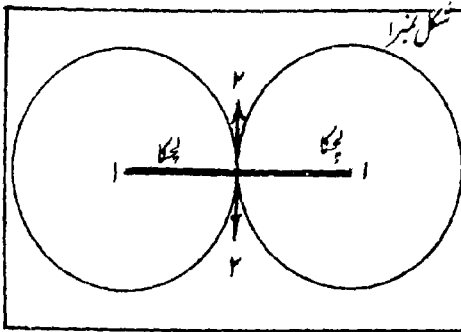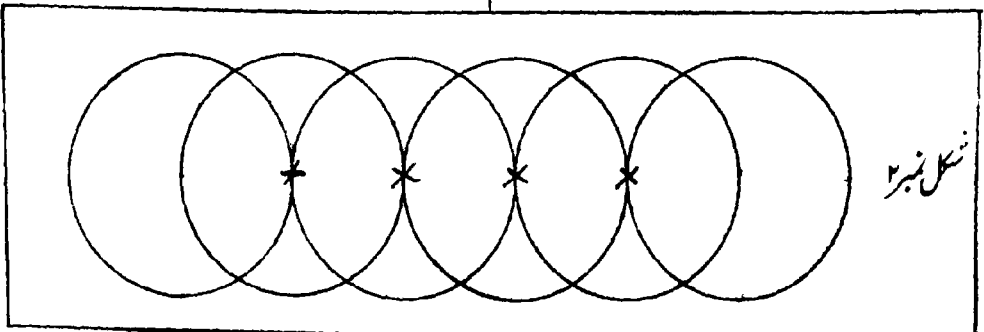
یعنی سات سات چوڑیوں کی دو زنجیریں سی ہو جائیں ۔ پھر انھیں اس طرح رکھو اور × نشان پہ اسی طرح لچکے سے باندھو ۔ اب اسے گول کر کے سرے بھی باندھ دو

بس اب اس کی پیندی بنانا باقی ہے۔ اس کے لئے یہ کرو کہ چار چوڑیاں اسی طرح رکھ کر × نشان کر کے گھیرے کے اوپر اس طرح باندھ دو اور چھلے کے
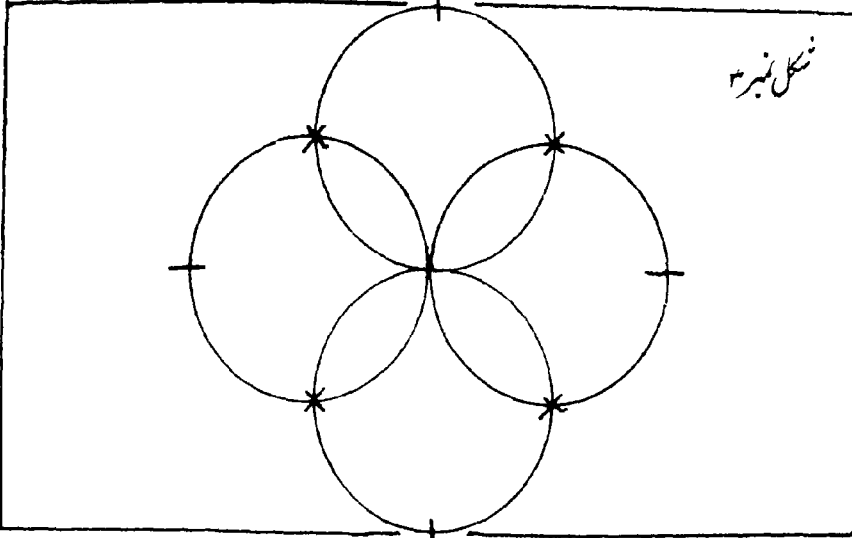
پر مضبوط باندھ دو۔ اب چوڑیوں کا گھیرا اس کے اوپر رکھ کر نمبر ا نشان پر باندھ دو۔ تمہاری ٹوکری تیار ہے۔ ہاں اسے پکڑو گی کیسے؟ چھلے کو دُہرا بیچ میں ایک بو بنا دو۔ اب تم اسے سنگھار میز پر رکھ سکتی ہو۔ اس میں سر میں ڈالنے کے ربن وغیرہ رکھے ہوئے بہت اچھے معلوم ہوں گے ؛

تیار ٹوکری

شکیلہ	نئی بیاہی لڑکی
رشید	شکیلہ کا شوہر
سلیمہ	شکیلہ کی سہیلی
شائق	رشید کے دوست
شریف	رشید کے دوست

...لیک خوب صورت مکان۔ کھلا کھلا آنگن۔ ...نت خوب صورت پودے لگے ہوئے۔ ان ...ں کھل گئی ہیں۔ کچھ ابھی مسکرا رہی ہیں۔ سامنے ...ے میں فرش بچھا ہے۔ صاف صاف چاندنی ...ر کھا ہے۔ شکیلہ دروازے کے سامنے بیٹھی ...ہے۔ اتنے میں رشید داخل ہوتا ہے۔

...:۔ شکیلہ آج شائق صاحب اور رشید صاحب آئے تھے۔

...۔ اچھا۔

...۔ ہاں بھئی۔ وہ کہتے تھے کہ خدا خدا کرکے تو ہماری بھاوج آئی ہیں۔ اب تو ہم ضرور دعوت لیں گے اور اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے۔

شکیلہ:۔ پھر آپ نے کیا کہہ دیا۔

رشید۔ میں اور کہہ ہی کیا سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ منظور کروں۔ تمھیں تکلیف تو ضرور ہوگی مگر میری خاطر اُسے برداشت کرلو۔

شکیلہ:۔ بہت خوب؟

دوسرا منظر

(سلیمہ داخل ہوتی ہے)

سلیمہ:۔ بہن شکیلہ کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو۔ تم تو ابھی سے اندر گھس گئیں۔

شکیلہ:۔ دھوپ تیز ہوگئی تھی اس لئے اندر چلی آئی۔

سلیمہ:۔ کس فکر میں ایسی خاموش بیٹھی ہو؟ کیا بات ہے؟

شکیلہ:۔ کوئی بات نہیں۔ میں ابھی آپ کے پاس ماما کو بھیج رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ خود ہی آگئیں۔

سلیمہ:۔ نہیں کوئی بات تو ضرور ہے اچھا کیوں بلا رہی تھیں

شکیلہ:۔ بات یہ ہے کہ اُن کے دوست کہتے ہیں کہ ہم بھاوج کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے۔ اور آپ کو تو معلوم ہے کہ مجھے پکانا نہیں آتا، بہت پریشان ہوں کیا کروں۔ کاش میرے والدین پہلے ہی اس بات کا خیال رکھتے تو کیوں آج اس دقت کا سامنا ہوتا۔

سلیمہ:۔ شکیلہ برا نہ ماننا۔ جو والدین اپنی بچیوں کو کھانا پکانا نہیں سکھاتے وہ بڑی غلطی کرتے ہیں۔ لڑکی چاہے کتنے ہی بڑے گھر بیاہی جائے، کبھی نہ کبھی اُسے ضرور کھانا پکانا پڑتا ہے۔ نہ جاننے کی صورت میں یہ اسے ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ اگر اُسے پہلے سے عادت ہو تو کیوں یہ کام مصیبت معلوم ہو۔ پھر یہ کہ ایسی لڑکیاں اکثر باورچی خانے کی بھی خبر نہیں لیتیں اور وہاں اکثر خاک اُڑا کرتی ہے۔

شکیلہ:۔ ہاں بہن آپ سچ کہتی ہیں۔ یہ کام سیکھنا بہت ضروری ہے۔

سلیمہ:۔ اچھا یہ بتاؤ تمھیں پکانا کیا ہے۔ میں ہر ایک کھانے کی ترکیب بتا دوں گی۔ تم تو ماشاء اللہ عقل مند ہو۔ بہت جلد سیکھ لوگی۔

شکیلہ:۔ سلطانی پلاؤ، قیمہ کشمشی، ڈبل روٹی کے ٹکڑے

سلیمہ:۔ اچھا تو غور سے سنو بلکہ ایک کاغذ پر لکھ لو۔ پہلے سلطانی پلاؤ کی ترکیب سمجھ لو۔

اس کے لئے اتنے سامان کی ضرورت ہوگی۔
گوشت (چربی وغیرہ سے صاف کیا ہوا) سیر بھر۔ چاول پرانے باریک سیر بھر۔ گھی آدھ سیر۔ پاؤ بھر میٹھا دہی۔ بالائی آدھ پاؤ دودھ آدھ سیر۔ مغز بادام ایک چھٹانک آب ادرک چار تولے۔ انجیر دو۔ زعفران اور چھوٹی الائچی ایک ایک تولہ۔ کالی مرچ اور لونگ چار چار ماشے۔

گوشت کو تھوڑا سا چھری سے کچل لینا اور انجیر پیس کر آب ادرک کے ساتھ گوشت میں ملا دینا۔ پھر یہ گوشت آدھا آدھا کر لینا۔ پھر دودھ، دہی، بالائی ایک جگہ کرکے کپڑے میں چھان لینا اور آدھے گوشت میں اسے ملا کر صاف پتیلی میں چولھے پر چڑھا دینا۔

شکیلہ:۔ دہی دودھ دہی کا چھنا ہوا پانی ملایا جائے گا نا۔

سلیمہ:۔ ہاں، ہاں بہن دہی چھنا ہوا پانی تو ملایا جائے گا۔ نہیں چھاننے کی کیا ضرورت تھی
ہاں تو باقی آدھے گوشت کی معمولی طریقے پر یخنی پکا لینا۔ سیر بھر پانی ڈالنا اور نمک اپنی پسند کا۔ اب چاول خوب صاف دھو کر چولھے پر چڑھا دو۔ پانی چاولوں کی سطح سے چھ انگل اوپر ہو چاول آدھے گل جائیں تو بانس کی لکڑی وغیرہ میں لپٹا لو۔ اس کے بعد لونگ کالی مرچ، چھوٹی الائچی گھی میں

ڈال کر کڑکڑا لو۔ لونگیں وغیرہ سرخ ہو جائیں تو چاول اور دونوں یخنیاں اس میں ڈال دو۔ دھیمی آنچ میں آدھے گھنٹے میں دم پر آجائیں گے۔ اب زعفران چھان میں کر اور بادام باریک کتر کر ڈال دو۔ یہ چیزیں ڈالنے کے دو منٹ بعد اتار لو۔

اچھا اب کشمشی قیمے کی ترکیب سنو:۔

اس کے لئے یہ سامان منگا لو:۔

قیمہ موٹا بنا ہوا ایک سیر۔ گھی پاؤ بھر کشمش پاؤ بھر۔ پیاز آدھ پاؤ۔ لہسن پسا ہوا دھنیا ایک چھٹانک۔ زعفران چھ ماشے۔ دارچینی تین ماشے۔ گرم مسالہ چار ماشے۔ نمک اپنی پسند کا۔

پہلے زعفران کو ایک تولہ پانی میں بھگو دو پھر پیاز باریک کاٹ کر گھی میں سرخ کر لو اور سب سامان قیمہ اور کشمش سمیت ایک جا کر کے گھی میں ڈال دو۔ جب خوب بھن جائے تو آدھا پیالہ یعنی کوئی پاؤ بھر کے قریب پانی ڈال کر پکنے دو۔ زعفران خوب چھان میں لو قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو زعفران ڈال کر اتار لو۔

اب رہ گئے ڈبل روٹی کے ٹکڑے تو اُن کے لئے ایک ڈبل روٹی منگا لو۔ سیر بھر شکر۔ آدھ سیر گھی۔ چار ماشے زعفران۔ اور ایک تولہ کیوڑہ۔

ڈبل روٹی کے سخت حصے چاروں طرف سے چھیل کر چوکھونٹے ٹکڑے بنا لو۔ اب کڑھائی میں گھی خوب کڑکڑا کر سب ٹکڑے ڈال دو۔ جب چاروں طرف سے خوب سرخ ہو جائیں تو دودھ ڈال کر دھیمی آنچ پر پکا لو۔ شکر میں آدھ پاؤ پانی ڈال کر قوام بنا لو۔ جب تار بندھ جائے اور ادھر ٹکڑوں کا دودھ خشک ہو جائے تو قوام ان میں ڈال دو پھر زعفران کیوڑے میں ڈال کر اور ٹکڑوں پر چھڑک کر اتار لو۔

شکیلہ:۔ سلیمہ بہن میں آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتی ہوں۔ آپ نے اس وقت میری بہت مدد کی۔

سلیمہ: نہیں بہن اس میں مدد کی کیا بات ہے اگر تم ان سب ترکیبوں پر عمل کرو گی تو انشاءاللہ بہت نفیس کھانے تیار ہوں گے۔ اچھا میں جا رہی ہوں۔

شکیلہ:۔ ابھی سے؟ ابھی تو آپ سے باتیں کرنا تھیں۔

سلیمہ:۔ اس وقت کام ہے پھر آؤں گی۔

شکیلہ:۔ اچھا آداب۔ خدا حافظ۔

(دوسرے دن رات کو)

رشید:۔ شکیلہ میں بہت ہی خوش ہوں۔ سب لوگ تمہارے کھانے کی تعریف کر رہے تھے۔

شکیلہ:۔ آپ مجھے بنا تو نہیں رہے ہیں؟

رشید:۔ نہیں واللہ کھانا بہت اچھا تھا۔

شکیلہ:۔ خیر خدا کا شکر ہے۔ ورنہ میں تو بہت ڈر رہی تھی کہ خدا جانے کیسا پکے کیسا نہ پکے۔ میری بدنامی ہو۔ اور آپ کو شرمندگی۔

رشید:۔ کیوں ڈرنے کی کیا بات تھی۔

شکیلہ میں نے عمر بھر میں آج پہلی مرتبہ کھانا پکایا ہے اور وہ بھی لکھی ہوئی ترکیب دیکھ دیکھ کر جب کبھی میں باورچی خانے میں جاتی۔ پھوپھی اماں خفا ہونے لگتیں کہ "تو میری بچی چولھا جھونکے گی"۔ بس اسی وجہ سے مجھے کچھ آیا ہی نہیں کل آپ نے کہا تو میں بہت پریشان ہوئی۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ آپ کو کھانا پسند آ گیا۔

رشید:۔ تم ماشاء اللہ بہت ہوشیار ہو۔ پہلی ہی بار ایسا عمدہ کھانا پکایا۔ اچھا اب ہم ایک ہنڈیا روز تمھارے ہی ہاتھ کی کھائیں گے تمھیں پکانا آ جائے گا۔ اور ہمیں مزے کا کھانا مل جایا کرے گا۔

شکیلہ:۔ بہت خوب۔
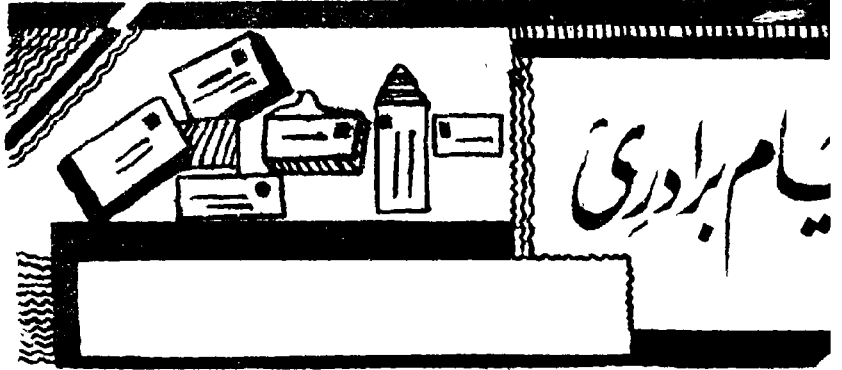
بچو اور بچیو ! افسوس ہے کہ اس مرتبہ پھر مجھے ایک ضروری کام سے بمبئی جانا پڑا ۔ تمہارے خطوں کے جواب
ے سکی ۔ پیام تعلیم کے لئے کئی اچھے اچھے مضمون لکھنا چاہتی تھی وہ بھی نہ لکھ سکی ۔
ن کر خوشی ہوئی کہ بیج تم سب کو پسند آئے ۔ میری خواہش بھی یہی تھی کہ چاہے جتنی دیر لگ جائے مگر چیز اچھی
ں کہ ہر پیامی بچے اور بچی کے پاس یہ بیج ضرور ہو ۔ مجھے امید ہے کہ سب بچے اور بچیاں جلد سے جلد دام
ں گے ۔ منیجر صاحب کہتے ہیں ۔ کہ ایک ایک بیج بھیجنے میں ڈاک کا خرچ بہت بڑھ جاتا ہے بچے چار چار
ساتھ منگائیں تو اس میں بہت سہولت رہے گی ۔
احب کے خط سے معلوم ہوا کہ دلی میں بھی برادری کی شاخ قائم ہو گئی ہے یہ سچ مچ میرے سلئے
ہے میں تو بہت دنوں سے ارادہ کر رہی تھی مگر مصروفیت کی وجہ سے موقع ہی نہ مل سکا ۔ عزیزی
رے پیامیوں نے یہ بھی بہت اچھا کیا کہ سعید انصاری صاحب ایم اے ، کولمبیا (پرنسپل) استاد دل
سرپرست بنایا وہ ہر اعتبار سے اس کے لئے موزوں تھے ۔ اور مجھے امید ہے کہ دلی کے پیامی اُن
یادہ مدد حاصل کر سکیں گے ۔ ابھی ابھی سعید صاحب کا ایک خط بھی مجھے ملا ہے ۔ اس میں انھوں
م برادری کے بچوں کا پروگرام کیا ہونا چاہیئے ۔ پروگرام ملاحظہ اسی پرچے میں کسی دوسری جگہ
مجھے تو یہ پروگرام بہت پسند آیا ہے اور امید ہے کہ تم سب بھی اسے بہت پسند کرو گے ۔ پسند ہی
ں کرو گے ۔ دلی کے بچوں سے مجھے خاص طور پر یہ کہنا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پیام برادری کے
ں پروگرام کو کامیاب بنائیں ۔

م

ں چاہتی ہوں کہ تمہارے شہروں اور دیہاتوں کے رسم و رواج رہنے سہنے کا اندازہ اور صحیح
طریقہ معلوم کروں تو تم یہ کرو کہ ایک مضمون کی شکل میں ان چیزوں پر روشنی ڈالو یعنی یہ کہ تمہارے

کے لوگ کیسے رہتے سہتے ہیں۔ اُن کے یہاں شادی بیاہ اور دوسری تقریبوں کی کیا کیا رسمیں ہیں کون کون سے کھیل رے شہر میں زیادہ کھیلے جاتے ہیں۔ بچوں کو کون سے کھیل زیادہ پسند ہیں۔ تم اپنے تہوار خصوصاً بڑے بڑے تہوار طرح مناتے ہو پھر تمھارے دیہاتوں کے لوگوں کے رہنے سہنے کا طریقہ کیا ہے۔ وہاں صفائی کا کیا انتظام ہے۔ ک شادی بیاہ اور تہواروں میں کیا کیا کرتے ہیں۔ یہ مضمون بارہ سے سولہ برس تک کے بچوں کے لئے ہے۔ بارہ تک کے بچے ایک کہانی لکھیں جس میں بہادری کے کارنامے بیان کئے گئے

لڑکیوں کے لئے میں نے الگ مضمون تجویز کیا ہے "سہیلیوں کی دعوت" یعنی اگر تم نے سہیلیوں کی دعوت کی کی کیا خاطر مدارات کروگی۔ انھیں کیا کھلاؤ گی اور کھانے کی چیزیں کس طرح پکاؤ گی اس کے علاوہ اپنا کمرہ کس طرح گی۔ یہ مضمون مختصر، صاف، خوش خط اور کاغذ کے ایک ہی طرف لکھے جائیں۔ نام کے ساتھ عمر، والدین یا سرپرست مدیق بھی ہو اور رسالہ پہنچنے کے دس دن بعد یہ ڈاک میں ڈال دئے جائیں۔ اچھا اب رخصت

"تمھاری آپا جان"

د انصاری صاحب کا خط۔

پیام برادری کا عام پروگرام نوعیت کے اعتبار سے دو طرح کا ہونا چاہئے :- ایک تو یہ کہ وہ کمروں کی چہار دیواری ر کھلی فضا میں ہو اور دوسرے یہ کہ اس کے تمام مشاغل ایسے ہوں جن میں بہت کچھ کرنے دھرنے چلنے، پھرنے ملق ہو۔

۱- تفریح اور کھیل کود سے متعلق :- ایسے پروگرام تین قسم کے ہو سکتے ہیں :- (۱) چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں ی سیریں جو چھٹیوں کے دنوں میں ہوا کریں۔ (۲) یا کبھی کبھار تہواروں اور تعطیلوں کے موقع پر باغوں اور ں میں کھانے پکانے اور کھیل کود کی تقریب۔ (۳) سال میں ایک دو بار اچھے ڈرامے جن سے کچھ آمدنی بھی ہو سکتی ۴) مختلف اسکولوں اور ٹیموں سے کھیلوں کے مقابلے۔

۲:- تمدن اور سماج کی اصلاح سے متعلق :- (۱) تاریخی عمارتوں کی سیر اس نقطۂ خیال سے کہ یہ ہمارے عہد ماضی کی رین یادگاریں ہیں۔ (۲) اردو یا ہندوستانی زبان کے بقاء و تحفظ کی مختلف صورتیں (۳) شہر کے مختلف محلوں پنے جلسے اور کھیل رکھنا تاکہ دوسرے بچوں کو تعلیم اور اچھی زندگی کی طرف شوق ہو (۴) گاؤں کے بچوں کی عادت ن کی زندگی کا مطالعہ جو اپنی لمبی سیروں اور تفریحوں کے سلسلے میں بھی ہو سکتا ہے۔

۳- اخلاق اور مذہب سے متعلق :- (۱) بچوں کے اندر بعض بُری عادتوں کے خلاف مظاہرہ۔ مثلاً بیڑی یا سگرٹ ت۔ چوری اور مدرسے سے بھاگنے کی عادت (۲) آپس میں سچ بولنے، سادہ زندگی بسر کرنے اور اپنے ر قومی شعار پر قائم رہنے کا عہد (۳) بڑوں کا ادب۔ برابر والوں سے دوستی اور چھوٹوں سے ہمدردی

کا سلوک

یہ ہیں جیسے اشارے جن پر عمل کرنے سے "پیام برادری" کے ارکین اپنے مقصد میں جو وہ "جاگو اور جگاؤ" کا نعرہ لے کر اٹھے ہیں پورے طور پر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ دہلی کی "پیام برادری" اور اس کے علاوہ دوسرے شہروں کی "پیام برادریاں" اپنے پروگرام میں اس نوعیت اور اس تقسیم کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کریں گی۔

سعید انصاری ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء

جلسوں کی کارروائی

سیال کوٹ:۔ ہمارا جلسہ ۱۲ اگست کو ۸ بجے منعقد ہوا البنور کی دعا کے بعد مختلف ممبروں نے تقریریں کیں۔ پھر یہ تجویز پاس ہوئی کہ لائبریری کے لئے کتابیں منگوائی جائیں۔ جھنڈے وغیرہ کا انتظام بھی اگلے جلسے پر رکھا گیا۔ آئندہ تقریر کے لئے یہ عنوان طے ہوئے۔ (۱) فیشن کرنا اچھا ہے یا برا (۲) صفائی کے فائدے گندگی کے نقصان (۳) لائبریری کے فائدے۔ پرکاش چند سیکرٹری۔ صدر شاخ (پیام برادری)

جھانسی:۔ ہمارا تیسرا جلسہ ۱۹ ستمبر کو چار بجے تحصیل بہاری لال صاحب کے مکان پر منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن کے بعد برادری کے مقصد اور فائدوں پر تقریر ہوئی۔ پھر احمد حسن صاحب نے وردھا اسکیم پر ایک مضمون پڑھا۔ دوسرے ممبروں نے بھی اس عنوان پر تقریریں کیں اور کثرت رائے سے پاس ہوا کہ وردھا اسکیم کامیاب اسکیم ہے صدر صاحب نے تقریر کرنے والوں کو نمبر بھی دیے۔ تقریروں کے بعد یہ تجویزیں پاس ہوئیں:۔
(۱) چودہ سال سے کم عمر بچوں کی تعلیمی کمی کو پورا کرنے کا صدر صاحب انتظام کریں۔ (۲) ہفتے میں ایک بار بیت بازی ہوا کرے (۳) مباحثے میں ہر ممبر کو تقریر کرنا چاہیے۔ صدر صاحب نمبر دیں گے۔ (۴) جو ممبر اچھی کہانی سنائے گا اُسے سالانہ انعامی جلسے میں انعام دیا جائے گا۔ (۵) مکتبہ جامعہ دہلی سے کتابیں منگائی جائیں۔ اس کے بعد بیت بازی شروع ہوئی اور غالب، انیس، داغ وغیرہ کے شعر پڑھے گئے۔ صدر صاحب کی آخری تقریر کے بعد طفیل احمد صاحب اور یوسف صاحب نے ممبروں کی پھل اور مٹھائی سے تواضع کی۔

الطاف حسین صدیقی صدر "پیام برادری"

علی گڑھ:۔ اس عرصے میں برادری کے چار جلسے ہوئے جلسہ نمبر ۱۶ میں صدر صاحب موجود نہیں تھے اس لئے نائب صدر منیر احمد صاحب جلسے کے صدر مقرر ہوئے پھر قرآن مجید کی تلاوت اور پچھلے جلسے کی کارروائی سننے کے بعد ممبروں نے مقررہ عنوان پر تقریریں کیں اسی جلسے میں یہ بھی طے ہوا کہ اکتوبر کے آخری ہفتے میں تقریروں کا مقابلہ ہو اگلے جلسے کے لئے عنوان یہ تجویز ہوا۔ ہندوستانی پہلے زیادہ مالدار تھے یا اب ہیں۔

سترھواں جلسہ بھی نو بجے نیلی چھتری میں منعقد ہوا۔ ممبروں نے مقررہ عنوان پر تقریریں کیں اور صدر صاحب نے اُن کی تقریروں کی غلطیاں بتائیں۔ آخر میں آیندہ جلسے کے لئے یہ عنوان طے ہوا: "ہمارے رسول آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بیان کئے جائیں۔ اٹھارھواں جلسہ بھی ۹ بجے نیلی چھتری میں منعقد ہوا۔ تلاوت کلام پاک اور پچھلے جلسے کی روداد سنانے کے بعد کچھ تجویزیں پیش کی گئیں جو آیندہ جلسے کے لئے ملتوی ہوگئیں۔ پھر بڑے لڑکوں نے آں حضرتؐ کی پاک زندگی پر تقریریں کیں اور چھوٹے بچوں نے کہانیاں سُنائیں۔

۱۲ ستمبر کو ہمارے دو اہم جلسے ہوئے۔ پہلا جلسہ ۹ بجے نیلی چھتری میں منعقد ہوا۔ احمد سعید صاحب نے کلام پاک کی تلاوت کی پھر نئے عہدہ داروں نے اپنے انتخاب پر ممبروں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر خلیل عمر صاحب نے بہت پرجوش خطبہ صدارت پڑھا۔ نائب صدر منیر احمد صاحب نے بھی بہت اچھا خطبہ پڑھا جو پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ممبروں نے مختلف عنوانوں پر تقریریں کیں اور جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ ختم ہونے پر صدر صاحب، سکریٹری صاحب اور خزانچی صاحب نے شام کے جلسے کے لئے انعامات وغیرہ کا انتظام کیا اور چند معزز لوگوں مثلاً پروفیسر حبیب، مسز حبیب، مس قمر جہاں، جناب ظفر عمر صاحب ڈاکٹر نیاز احمد صاحب وغیرہ کے پاس دعوت نامے بھیجے گئے۔ کوئی ۵½ بجے یہ جلسہ منعقد ہوا۔ یہ تقسیم انعامات کا سہ ماہی جلسہ تھا۔ اسی لئے بہت اہتمام کیا گیا۔ ہمارے صدر صاحب نے مہمانوں کو بتایا کہ پیام برادری کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد صدر صاحب کی درخواست پر مسز حبیب نے انعام تقسیم کئے۔ پھر ڈاکٹر نیاز احمد صاحب نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ اور ہماری ہر طرح ہمت بڑھائی۔ آخر میں ممبروں اور معزز مہمانوں کی چائے سے تواضع کی گئی۔

انعام پانے والوں کے نام نیچے لکھے جاتے ہیں:۔

۱۔ تقریر

پہلا انعام — نسیم احمد انصاری

دوسرا " — احسان رشید

۲۔ کہانی

پہلا انعام — اقبال احمد صدیقی

دوسرا " — اشفاق حسین قادری

۳۔ سب سے زیادہ ممبر بنانے کا انعام احمد سعید صاحب کو، ہر جلسے میں شرکت کرنے کا احسان رشید صاحب کو، اور قرأت کا احمد سعید صاحب کو دیا گیا۔

محمد شائق الرسول۔ سکریٹری "پیام برادری"

میرٹھ :۔ ہم نے اپنے یہاں قانون کچھ بدل دئے ہیں اور اپنی برادری کو کونسل اور پارلیمنٹ کے طریقے پر ڈھالنے کی کوشش کی ہے یعنی جو شخص سب سے زیادہ ممبر اپنے موافق بنائے گا وہی اپنی وزارت بنائے گا یا عہدہ دار منتخب کرے گا جس لڑکے کے موافق رائیں کم ہوں گی وہ مخالف پارٹی کا سرگروہ یا لیڈر ہوگا۔ یہ صورت صرف مباحثے کے وقت ہوگی۔ ورنہ ہر بھائی ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کرے گا۔ اس وقت محمد مبین جاوید کا ساتھ دینے والے زیادہ تھے اس لئے وزارت اُن ہی نے بنائی۔ وہ خود وزیرِ اعظم بنے۔ نفیس احمد فاروقی وزیرِ خزانہ اور انچارج لائبریری محمد شفیق سوشل منسٹر، ایم لے پرویز مہتمم لائبریری، نعیم پاشا اور اسلام مرتضیٰ کو ابھی کوئی عہدہ نہیں ملا ہے۔ محمد مختار جوہر مخالف پارٹی کے لیڈر یا سرگروہ منتخب ہوئے ہیں۔

"نفیس احمد فاروقی"

دہلی :۔ ہمارا پہلا جلسہ ۱۷ اکتوبر کو جامعہ میں ۱۲ بجے جناب سعید انصاری صاحب ام لے۔ کولمبیا۔ پرنسپل استادوں کا مدرسہ" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تلاوت قرآن کے بعد برکت علی صاحب فراق کی نظم "پیام برادری کے بچوں کی دعا" پڑھی گئی۔ اس کے بعد میں نے برادری کے اغراض و مقاصد اور پچھلی تاریخ پر مختصر سی تقریر کی۔ اس کے بعد نیا سوالہ اور دوسری نظمیں پڑھی گئیں۔ پھر جناب صدر صاحب نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ ہمارا آیندہ پروگرام کیا ہونا چاہیئے۔ آپ کی تقریر کے بعد الطاف علی صاحب نے ہال کے باہر میدان میں ہمیں بہت اچھے اچھے کھیل کھلائے۔ آخر میں مہمانوں کی شربت سے تواضع کی گئی اور جلسہ برخاست ہوا۔

حسن احمد قنوجی، متعلم جامعہ

یہ پرچہ نومبر اور دسمبر کا ہے۔ اب اگلا پرچہ جنوری میں چھپے گا۔ دسمبر کے پہلے ہفتے میں انتظار مت کرنا

"مینجر"

ابو الکلام آزاد اور جواہر لال نہرو بننا چاہتے ہو؟

اگر تم بڑے ہو کر قوم کے لیڈر بننا چاہتے ہو یا کوئی بڑا کام ملک کی سیوا کے لئے کرنا چاہتے ہو تو ڈرو نہیں۔ تم بہت آسانی سے مشہور انسان بن سکتے ہو۔ شرط بس اتنی ہے کہ تمھاری صحت اور حافظہ اچھا ہو۔ اگر تم اپنے درجے میں ہوشیار ہو اور تمھاری صحت بھی اچھی ہے تو خدا کا شکر ادا کرو لیکن اگر خدانخواستہ تمھاری یادداشت کم زور ہے اور جو کچھ پڑھتے یا سنتے ہو فوراً بھول جاتے ہو۔ تب بھی مایوس نہ ہو تم بہت جلد ہوشیار لڑکوں کا مقابلہ کرسکو گے۔ شرط بس اتنی ہے کہ پندرہ دن۔

"بچوں کی اوبیم"

استعمال کرلو۔ اس کی ایک ہی خوراک سے تمہارے حافظے کے بند پٹ کھل جائیں گے۔ اور تم میں چستی و چالاکی اور ہنرمندی جیسے جوہر پیدا ہو جائیں گے

"بچوں کی اوبیم"

سائنس کا حیرت انگیز معجزہ ہے۔ جس سے ہزاروں کند ذہن بچے ذہین بن سکتے ہیں۔ ایک بچے کی ماں لکھتی ہے:۔

"میرا بچہ بہت ہی کم زور اور کند ذہن تھا۔ آپ کی 'اوبیم' منگوا کر اس کو استعمال کرائی جس نے جادو کا اثر کیا۔ میں اور میرے بچے کے استاد حیران ہیں کہ اس میں یہ حیرت انگیز تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی۔ اب وہ کلاس کے اچھے لڑکوں میں شمار ہوتا ہے اور اس کی صحت بھی بہت اچھی ہو گئی ہے"

مہربانی سے دو شیشیاں اور بھیج دیجئے" مسز ایم این اماجی

پندرہ دن کی دوا کے دام صرف پانچ روپے ہیں۔ اگر فائدہ نہ ہو تو قیمت واپس کر دی جاتی ہے۔

ملنے کا پتہ

انڈین میڈیسن کمپنی (۶/۸) کنائی سیل سٹریٹ کلکتہ۔ یا معرفت پوسٹ بکس ۶۶۵ کلکتہ

حق مضمون اشتہار ہٰذا محفوظ ہے۔ کوئی صاحب اسے نقل کرکے فائدہ کی جگہ نقصان نہ اٹھائیں
فائدہ اُٹھانے کا شاندار موقعہ
رعایت کا مبارک مہینہ
فائدہ اُٹھانے کا شاندار موقعہ
قائم شدہ سنہ ۱۹۰۳ء
جو سال میں ایک ہی بار آتا ہے اس سے ضرور فائدہ اُٹھائیے
قائم شدہ سنہ ۱۹۰۳ء
گیارہ ماہ گذرنے کے بعد خدا کے فضل و کرم سے رمضان المبارک کا مہینہ نصیب ہوتا ہے یہ بھلائیوں اور نیکیوں کا مہینہ ہے اسلئے ہمنے بھی یہی مہینہ اپنے خریداروں کو فائدہ پہنچانے کیلئے انتخاب کر رکھا ہے۔ لہٰذا حسب معمول اعلان کیا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل گھڑیوں و ٹائم پیسوں کی قیمت میں عظیم الشان رعایت کردی ہے اس رعایت سے ہر شخص خواہ کسی مذہب و ملت کے ہوں فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ جلد سے جلد فرمائش بھیجئے ورنہ یہ زریں موقعہ ایک سال بعد آئے گا۔ راقم منیجر
ولٹن واچ کمپنی کی فل جوئل ریڈیم رسٹ واچ
نمبر ۱۰۴۱
گارنٹی ۱۵ سال
مشہور لیور ۱۵ جوئل والی مضبوط اور خوشنما گھڑی ہے جو دوڑ بھاگ میں خراب نہیں ہوتی۔ وقت صحیح بتاتی ہے۔ نیز شب بین ہے یعنی دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں بھی ٹائم بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت مع اسٹراپ کلائی اور بکس بارہ روپے آٹھ آنے
بیدار
کرنیوالا ٹائم پیس
غفلت کی نیند سے
خوشنما اور پائیدار لیور رسٹ واچ
نمبر ۱۰۴۶
گارنٹی ۴ سال
لیور مشین کی یہ رسٹ واچ اگرچہ کم قیمت ہے مگر پرزے بہت پائیدار ہیں، دیکھنے میں خوبصورت نکل سلور کیس کی ہے اور وقت صحیح بتاتی ہے اسی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں۔ رعایتی قیمت مع اسٹراپ کلائی اور بکس تین روپے چار آنے
اگر آپ کی خواہش ہے کہ کسی آدمی کے جگانے بغیر آپ سحری تہجد یا ڈیوٹی کے وقت خود بخود بیدار ہو جائیں تو آپ کو یہ الارم ٹائم پیس اپنی خوشگوار اور تیز آواز سے اسی ٹائم پر جگا دیگا۔ الارم کی آواز بہت بلند ہے۔ تمام پرزے پختہ اور پائیدار ہیں۔ ٹائم صحیح بتاتا ہے۔ بحفاظت رکھا جائے تو برسوں خراب نہیں ہوتا۔ مندرجہ ذیل میں سے جو پسند ہو طلب فرمائیے
نمبر ۱۰۴۳ پشت کی گھنٹی والا جو ریپیٹر بھی ہے یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور ایکدم دونوں طرح الارم بجاتا ہے۔ گارنٹی چھ سال۔ رعایتی قیمت چھ روپے تین آنہ محصولڈاک پیکنگ بکس و منی آرڈر فیس ایک روپیہ چار آنہ آپ کو اور دینا ہوگا۔
نمبر ۱۰۴۴ اس میں ڈبل یعنی دو گھنٹیاں اوپر لگی ہوتی ہیں اور الارم کی آواز بہت تیز ہے گارنٹی چار سال رعایتی قیمت تین روپے۔
نمبر ۱۰۴۵ اس میں ایک گھنٹی اوپر لگی ہوتی ہے اسکی آواز بھی تیز ہے گارنٹی چار سال۔ رعایتی قیمت دو روپے بارہ آنے۔
محصولڈاک وغیرہ ٹائم پیس نمبر ۱۰۴۴ اور نمبر ۱۰۴۵ کا ایک روپیہ آپ کو ادا کرنا ہوگا
مشہور لیور ولٹن پاکٹ واچ
گارنٹی ۱۰ سال
نکل کیس۔ لیور چال۔ مضبوط و پالش دار پرزے مشین میں دس جوئل یاقوت آویزاں ہیں جسکی وجہ سے دوڑ بھاگ وغیرہ میں خراب نہیں ہوتی۔ گلاس بھی ڈبل لگا ہوا ہے جو ضرب سے نہیں ٹوٹتا وقت نہایت صحیح بتاتی ہے رعایتی قیمت مع بکس گیارہ روپے آٹھ آنہ
ریگولیٹر لیور پاکٹ واچ
گارنٹی ۵ سال
شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو اس پائدار اور سچا وقت بتانیوالی اصلی انجن مارک ریلوے ریگولیٹر لیور گھڑی کے نام سے واقف نہ ہو یہ گھڑیاں اپنی مضبوطی اور درستی ٹائم کے باعث لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکی ہیں۔ رعایتی قیمت مع بکس صرف دو روپے چودہ آنے
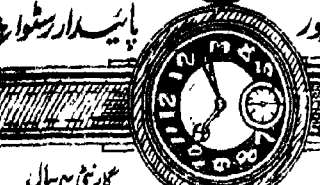
پیام تعلیم
جو گھڑی ٹائم پیس یا کلاک طلب فرمائیں
۲
اس کا نام نمبر اور قیمت ضرور لکھیں!
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی کلائی اور جیب کی گھڑیاں ٹائم پیس ایس۔ ایم عثمان اینڈ کمپنی دہلی سے منگائیے
فیشن ایبل رکنگلر رسٹ واچ
۱۰۴۸
گارنٹی ۴ سال
یہ کلائی کی گھڑی بالکل نئے فیشن کی خوشنما اور پائیدار کرومیم کیس کی بنی ہوئی ہے۔ وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس چار روپے بارہ آنے۔
شب چراغ لیور پائیدار رسٹ واچ
۱۰۴۹
گارنٹی ۴ سال
یہ گھڑی دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے مشین لیور اور مضبوط ہے ٹائم صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس چار روپے بارہ آنے
ریگولیٹر پاکٹ واچ
۱۰۵۰
یہ گھڑیاں ایسی ہر دلعزیز ہوئی ہیں کہ ہر شخص انکے نام سے واقف ہے۔ اگرچہ کم قیمت ہیں مگر مدتوں چلتی ہیں مشین لیور پرزے مضبوط انجن مارک دیکھنے میں خوشنما ہے۔ وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت مع بکس صرف دو روپے پانچ آنہ محصولڈاک وغیرہ بذمہ خریدار
خوشنما اور پائدار گجردار ٹائم پیس
گارنٹی ۴ سال
۱۰۵۲ یہ ٹائم پیس سلور کیس کا خوشنما پرزوں کا مضبوط اور ٹائم بتانے کا سچا ہے۔ شب کو آپ جس ٹائم پر جگانا چاہیں یہ اسی ٹائم پر دوہری گھنٹی کے ذریعہ بلند آواز سے الارم بجا کر آپکو خواب سے بیدار کر دیگا۔ یہ ٹائم پیس ایک چوکیدار کا کام دیتا ہے۔ رعایتی قیمت صرف تین روپے۔
۱۰۵۳ یہ ایک گھنٹی والا خوشنما اور پائدار ٹائم پیس ہے۔ یہ بھی وقت صحیح بتاتا ہے اور الارم کی آواز بھی تیز ہے۔ رعایتی قیمت دو روپے بارہ آنہ
۱۰۵۴ اس ٹائم پیس میں بجائے اوپر کے پشت پر گھنٹی تیز آواز کی لگی ہوئی ہے وقت صحیح بتاتا ہے۔ رعایتی قیمت چار روپے دو آنہ۔
ولٹن لیور ریڈیم پاکٹ واچ
۱۰۵۶
مشہور ولٹن واچ کمپنی کی لیور دس جوئلز شب چراغ گھڑی ہے جو دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں بھی مثل دن کے وقت بتاتی ہے مشین پختہ پرزے مضبوط موزوں سائز اور خوشنما بنی ہوئی ہے وقت نہایت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ بکس بارہ روپے آٹھ آنہ
بیحد خوشنما آٹھ پہل رسٹ واچ
۱۰۵۱
کیس گیرنٹ گولڈن کیس مختلف ڈیزائن خوشنما شیپ اور چھوٹے سائز کی بنی ہوئی ہے دیکھنے میں نہایت خوبصورت ہے پرزے اسکے پختہ اور پائدار ہیں۔ وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس صرف پانچ روپے دس آنہ محصولڈاک وغیرہ بذمہ خریدار
خوشنما سیپ کے کیس کی رسٹ واچ
۱۰۵۷
اس رسٹ واچ کا کیس سیپ کا بنا ہوا ہے جو پسینہ وغیرہ میں خراب نہیں ہوتا ہمیشہ یکساں رہتا ہے مشین اسکی جنیوا سوئس میڈ ہے پرزے پختہ و پائدار ہیں۔ ٹائم صحیح بتاتی ہے دیکھنے میں بہت خوبصورت ہے رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس پانچ روپے بارہ آنے
نیو پیٹنٹ پائیدار رسٹ واچ
۱۰۵۵
یہ سوئس میڈ رسٹ واچ نکل سلور کیس کی دیکھنے میں خوبصورت پرزوں کی مضبوطی رفتار کی سچی اور موزوں سائز کی بنی ہوئی ہے وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی چار روپے آٹھ آنے۔
گارنٹی ۴ سال

مندرجہ ذیل رسٹ پاکٹ واچ اور ٹائم پیسوں کی قیمت میں خاص رعایت کردی گئی ہے لہذا خریداری کا اچھا موقعہ ہے
نمبر ۱۰۵۸
نہایت خوبصورت گولڈن رسٹواچ
یہ رسٹواچ ۲۲ کیرٹ گولڈن کیس کی مختلف ڈیزائن ہیں
ایسی خوشنما بنی ہوئی ہے کہ بار بار دیکھنے کو دل
چاہتا ہے خوشنمائی کے علاوہ پرزے بھی پائدار
ہیں ٹائم صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت مع
اسٹراپ کلائی اور کیس پانچ روپے آٹھ آنے
محصولڈاک وغیرہ گیارہ آنہ بذمہ خریدار ہوگا۔
نمبر ۱۰۵۹
خوشنما کوئین اینی سائز کی رسٹواچ
یہ رسٹواچ ۱۵ سائز کل سلور کیس کی خوشنما
اور پائدار بنی ہوئی ہے اسپر گلاس غیر
معمولی موٹا لگا ہوا ہے۔ جو ضرب سے بھی
نہیں ٹوٹتا۔ پرزے نہایت پختہ مضبوط
دپالشدار ہیں۔ وقت صحیح بتاتی ہے رعایتی
قیمت معہ خوشنما اسٹراپ چھ روپے بارہ آنہ
حیرت انگیز لیو کلنڈر واچ
نمبر ۱۰۶۰
گھڑی کیا ہے پوری جنتری ہے اسمیں چھ ڈائل ہیں
ایک سے تاریخ دوسرے سے دن تیسرے سے مہینہ
چوتھے سے چاند کا گھٹنا بڑھنا مثل آسمانی چاند کے پانچویں
سے سکنڈ چھٹے سے گھنٹہ منٹ معلوم ہوتا ہے اور
وقت صحیح بتاتی ہے پرزے بھی پختہ و پالش دار ہیں
رعایتی قیمت بارہ روپے آٹھ آنے۔
خوشنما پائدار لیو لیس پاکٹواچ
نمبر ۱۰۶۵
یہ گھڑی باوجود کم قیمت ہونے کے بھی وقت صحیح بتاتی
ہیں پچاس ساٹھ روپے کی گھڑی کا مقابلہ کرتی ہے
مشین اس گھڑی کی لیو ہے پرزے اسکے مضبوط
اور پالش دار ہیں۔ دیکھنے میں بھی خوشنما معلوم ہوتی
ہے۔ رعایتی قیمت صرف ایک روپیہ پندرہ آنہ
اور
الارم دار ٹائم پیس
گارنٹی
نمبر ۱۰۶۲ یہ ٹائم پیس دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں بھی ٹائم بتاتا ہے
اس کا الارم بڑی گھنٹی کا ہے
بھی جاگ اٹھتا ہے۔ پرزے کا مضبوط اور ٹائم بتانیکا سچا ہے۔ رعایتی قیمت
سات روپے تین آنہ۔ نمبر ۱۰۶۳ یہ ٹائم پیس اندھیرے میں تو وقت نہیں
بتائیگا۔ رعایتی قیمت صرف چھ روپے تین آنہ
نوٹ محصولڈاک پیکنگ کبس و منی آرڈر فیس ایک روپیہ چار آنہ بذمہ خریدار
گولڈن کیس کی شب چراغ رسٹواچ
نمبر ۱۰۶۱
اس کلائی کی گھڑی کا ڈائل اور سوئیاں گیس دار ہیں
جن کی وجہ سے دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں
بھی ٹائم معلوم ہو جاتا ہے۔ وقت صحیح بتاتی ہے پرزے
پائدار ہیں۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور کیس کے
پانچ روپے بارہ آنہ
۲۲ کیرٹ گولڈن خوشنما چوپہل رسٹواچ
نمبر ۱۰۶۶
یہ رسٹواچ ۲۲ کیرٹ
گولڈن کیس مختلف ڈیزائن کی نہایت خوشنما بنی
ہوئی ہے علاوہ خوشنمائی کے پائدار بھی ہے پرزے پختہ پالشدار
ہیں وقت صحیح بتاتی ہے رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور کیس
نمبر ۱۰۶۷ یہ گھڑی ۱۰۶۶ کے موافق ہے مگر اسمیں
نہیں ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی پانچ روپے دو آنہ
نمبر ۱۰۶۴
سونے کے ملمع کی رسٹواچ
یہ رسٹواچ سنہری کیس کی خوشنما اور
پائدار بنی ہوئی ہے مشین اسکی سوئس میڈ
پرزے مضبوط دپالشدار ہیں ٹائم صحیح بتاتی
ہے رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور کیس صرف
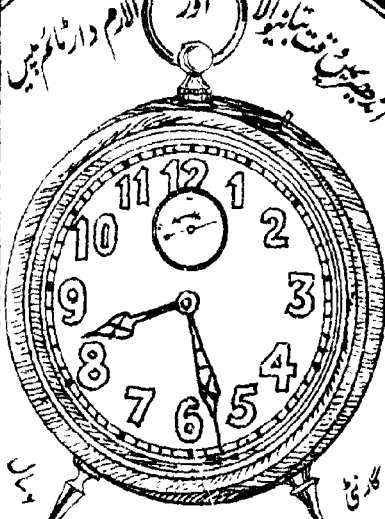
دستی گارنٹی بھیجی جاتی ہے
ہر گھڑی نام ہیں اور قلاف کے ہمراہ
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی نیز لیوا اور جنیوا مشین کی گھڑیاں اور خوشنما، پائدار ٹائم میں ارزاں قیمت پر الیس ایم عثمان اینڈ کمپنی دہلی سے منگایئے
۱۰۶۸
نیو فیشن ایبل رسٹ واچ
گارنٹی ۴ سال
بائیس کیرٹ گولڈن مختلف ڈیزائن اور
لمبا شیپ بہت خوبصورت بالکل نئی
وضع کی بنی ہوئی ہے خوبصورتی کے علاوہ پائدار
پرزے مضبوط اور پالشدار ہیں۔ وقت بھی صحیح بتاتی ہے
رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس سات روپے آٹھ آنہ
۱۰۶۹
لاجواب جرمن میڈ لیور رسٹ واچ
یہ وہی جرمنی گھڑی ہے جسکے اشتہار آپ کی نظر
سے گذرے ہوں گے۔ اسکی جس قدر تعریف کیجائے
کم ہے مضبوط اس قدر کہ گرنے پر بھی خراب نہیں
ہوتی وقت نہایت صحیح بتاتی ہے۔ اور بند ہونیکا نام
نہیں لیتی قیمت معہ اسٹراپ اور بکس تین روپے بارہ آنے
۱۰۷۰
بائیس کیرٹ گولڈن پاکٹ واچ
گارنٹی ۵ سال
یہ مختلف شکل چورس اور بیضوی ڈائل کی پاکٹ واچ
سنہری کیس کی نہایت خوش وضع اور سبک بنی ہوتی
ہے۔ علاوہ خوشنمائی کے مشین لیور پرزے پائدار اور
مضبوط ہیں۔ وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ بکس
تین روپے سات آنے۔ محصولڈاک وغیرہ ۱۱
پائیدار رسٹ واچ
۱۰۷۲
گارنٹی ۵ سال
یہ رسٹ واچ نکل سلور
کیس کی بہت مضبوط بنی ہوئی ہے گلاس بھی اسپر موٹا لگا ہوا ہے۔ جو
ضرب سے نہیں ٹوٹتا ڈائل اور سوئیاں ریڈیم ہیں جن کے باعث
دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں بھی ٹائم معلوم ہو جاتا ہے۔
قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس سات روپے بارہ آنے۔
۱۵ جوئل والی لیور پاکٹ واچ
۱۰۷۶
گارنٹی ۱۰ سال
نکل کیس۔ لیور چال۔ مضبوط و پالش دار پرزے
مشین میں ۱۵ جوئل یاقوت آویزاں ہیں جن کی وجہ
سے دوڑ بھاگ وغیرہ میں خراب نہیں ہوتی۔ گلاس
بھی ڈبل لگا ہوا ہے جو ضرب سے نہیں ٹوٹتا وقت نہایت
صحیح بتاتی ہے رعایتی قیمت معہ بکس بارہ روپے آٹھ آنہ
خوشنما چھوٹے سائز کی بٹن واچ
گارنٹی ۴ سال
گارنٹی ۴ سال
۱۰۷۳ یہ رسٹ واچ چھوٹے سائز کی ہے اسکو بٹن واچ بھی کہتے ہیں دیکھنے
میں بہت خوبصورت اور پرزوں کی مضبوط ہر وقت صحیح بتاتی ہے کیس
نکل سلور کا ہے رعایتی قیمت معہ اسٹراپ چار روپے آٹھ آنے۔
۱۰۷۴ اس کا کیس گولڈن (سنہری) ہے رعایتی قیمت معہ اسٹراپ
نہایت مضبوط لیور جوئلدار رسٹ واچ
۱۰۷۱
گارنٹی ۱۰ سال
یہ مضبوط لیور فل جوئل (۱۵ جوئل) مشین میں آویزاں ہیں
رسٹ واچ ہے اسکی خوبی اسکے نام ہی سے ظاہر ہے،
پرزے بیحد پختہ اور پالشدار ہیں۔ ٹائم صحیح بتاتی ہے
دوڑ بھاگ میں خراب نہیں ہوتی۔ رعایتی قیمت معہ
اسٹراپ کلائی اور بکس گیارہ روپے آٹھ آنے
نئے فیشن کی خوشنما رنگکر رسٹ واچ
۱۰۷۵
گارنٹی ۴ سال
یہ لمبے شیپ کی رسٹ واچ نہایت خوشنما مختلف ڈیزائن کی بنی ہوئی ہیں۔
پرزوں کی مضبوط اور ٹائم صحیح بتاتی ہے کیس نکل سلور کا ہے۔
رعایتی قیمت معہ خوشنما اسٹراپ و بکس چھ روپے چودہ آنے
کم خرچ بالانشین گیس والی رسٹ واچ
۱۰۷۷
گارنٹی ۲ سال
اس رسٹ واچ میں خوبی یہ ہے کہ دن کے علاوہ رات کو
اندھیرے میں بھی وقت بتاتی ہے۔ اس کا ڈائل
اور سوئیاں ریڈیم ہیں جو رات کو اندھیرے میں مثل
بجلی کے چمکتی ہیں مشین لیور اور پرزے مضبوط ہیں
وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ
کلائی چار روپے آٹھ آنہ

امسال مندرجہ ذیل گھڑیوں اور ٹائم پیسوں کی قیمت میں خاص رعایت کی گئی ہے حسب پسند گھڑی جلد طلب فرما کر فائدہ اٹھائیے

۱۰۷۸ — نئی طرز کی گولڈن خوشنما رسٹ واچ

یہ رسٹ واچ نہایت خوشنما مختلف ڈیزائن نئی نئی شکل گولڈن کیس کی بنی ہوئی ہے اس کے پرزے مضبوط اور پائدار ہیں۔ ٹائم صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس پانچ روپے۔ محصولڈاک وغیرہ اار بذمہ خریدار ہوگا۔

(گارنٹی ۳ سال)

۱۰۷۹ — دس جوئل والی لیور رسٹ واچ
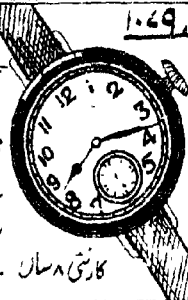
اس رسٹ واچ کی خوبی اور پائداری اسکے نام سے ظاہر ہے مشین اسکی لیور دس جوئلدار مضبوط اور پائدار ہے۔ گلاس اس پر ڈبل فٹ کیا ہوا ہے جو ضرب سے نہیں ٹوٹتا وقت نہایت صحیح بتاتی ہے رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس نو روپے چودہ آنے

گارنٹی ۸ سال

۱۰۸۰ — مشہور جرمن لیور پاکٹ واچ

گارنٹی ۵ سال

جرمن کی بنی ہوئی مشہور و معروف گھڑی ہے اسکی تعریف جس قدر کیجائے کم ہے۔ لیور مشین ہے جو مدتوں کام دیتی ہے۔ گر جانے پر بھی بند ہونا نہیں جانتی وقت صحیح بتاتی ہے۔ رعایتی قیمت معہ بکس تین روپے آٹھ آنے محصولڈاک وغیرہ گیارہ آنہ بذمہ خریدار

خوبصورت اور پائیدار آٹھ روزہ ریلوے یا آفس کلاک

صحیح ٹائم بتانے والے آٹھ روزہ کلاک گھنٹہ آدھا گھنٹہ آوازے بجاتے ہیں پرزے ان کے مضبوط اور کیس خوشنما عمدہ پائدار بہترین وضع کے بنے ہوئے ہیں۔

۱۰۸۲ — اس کا سائز لمبائی قریب ۱۹۔ انچہ چوڑائی قریب ۱۲۔ انچہ ہے گارنٹی ۱۰ سال رعایتی قیمت آٹھ روپے۔

۱۰۸۳ — اس کا سائز لمبائی قریب ۲۲۔ انچہ چوڑائی قریب ۱۴۔ انچہ گارنٹی ۱۲ سال رعایتی قیمت نو روپے آٹھ آنہ۔

۱۰۸۴ — ریگولیٹر شیپ اس کا سائز لمبائی قریب ۲۲۔ انچہ چوڑائی قریب ۱۳۔ انچہ ہے گارنٹی ۱۰ سال رعایتی قیمت نو روپے۔

۱۰۸۵ — ریگولیٹر شیپ اس کا سائز قریب ۲۰۔ انچہ چوڑائی قریب ۱۵ انچہ گارنٹی ۱۲ سال رعایتی قیمت گیارہ روپے۔

۱۰۸۶ — شب تاب گیس والی لیور پاکٹ واچ

گارنٹی ۵ سال
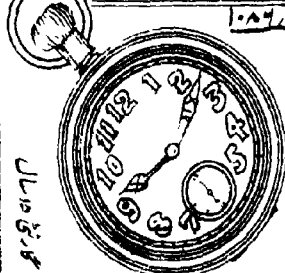
یہ مشہور و معروف لیور فل جوئل گھڑی ہے۔ بیحد مضبوط۔ خوشنما اور ٹائم بالکل صحیح بتاتی ہے ڈائل اور سوئیاں گیس والی ہیں۔ جن کی وجہ سے دن کے علاوہ رات کو اندھیرے میں بھی وقت معلوم ہو جاتا ہے رعایتی قیمت معہ بکس تیرہ روپے آٹھ آنے

۱۰۸۱ — خوشنما اور پائدار جنٹلمین رسٹ واچ

گارنٹی ۲ سال

یہ خوشنما رسٹ واچ نکل سلور کیس کی پائدار پرزوں کی مضبوط بنی ہوئی ہے وقت صحیح بتاتی ہے بوجہ کم خرچ بالانشین ہونے کے بکثرت فروخت ہوتی ہیں رعایتی قیمت معہ اسٹراپ اور بکس صرف چار روپے محصولڈاک وغیرہ گیارہ آنہ بذمہ خریدار ہوگا۔ اپنا پتہ خوشخط لکھیں۔

۱۰۸۷ — خوشنما اور پائیدار لیور رسٹ واچ

گارنٹی ۳ سال

یہ رسٹ واچ نکل سلور کیس کی اگرچہ کم قیمت ہے مگر درستی ٹائم میں بیس پچیس روپے کی گھڑی کا مقابلہ کرتی ہے اسکی مشین لیور اور پرزے پختہ و پائدار ہیں سکنڈ کی سوئی بھی اس میں لگی ہوئی ہے۔ رعایتی قیمت معہ اسٹراپ کلائی اور بکس تین روپے بارہ آنے۔

ہر دلعزیز اور مقبول عام فیشن ایبل زنیتھ، سینڈو، جان بیرل رسٹ واچ جنکی قیمتوں میں نمایاں تخفیف ہوگئی ہے
اسٹے برائٹ اسٹیل کیس
فیشن ایبل زنیتھ رسٹواچ
۱۰۸۸
گارنٹی ۱۰ سال
اس زنیتھ رسٹواچ کا کیس نئی قسم کی دھات کا بنا ہوا ہے جو کبھی بھی خراب نہیں ہوتا مشین اسکی
لیور فل جوئل ہے اور صحیح وقت بتانے میں اس سے بہتر کوئی گھڑی نہیں زیادہ تعریف لکھنا ہی
فضول ہے۔ قیمت معہ خوشنما اسٹراپ کلائی اور بکس اٹھائیس روپے۔ علاوہ محصولڈاک
خالص چاندی کے کیس کی
خوشنما زنیتھ رسٹواچ
۱۰۸۹
گارنٹی ۱۰ سال
یہ رسٹواچ گول شیپ کی نہایت خوبصورت اور بہت ہی پائدار سویزرلینڈ کی بنی ہوئی ہے مشین
لیور اور فل جوئل ہے درستی ٹائم کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زنیتھ گھڑی کا
مقابلہ کوئی گھڑی بھی نہیں کرتی کیس اس کا چاندی کا ہے۔ قیمت باسٹھ روپے
۱۰۹۰
ان مشہور گھڑیوں کی تعریف کی چنداں ضرورت
نہیں ہر شخص جانتا ہے سلور کیس۔ قیمت
معہ اسٹراپ بکس انیس روپے آٹھ آنے
۱۰۹۱ رولڈ گولڈ کیس چوبیس روپے آٹھ آنہ
خوشنما چورس شیپ اسٹے برائٹ اسٹیل کیس
قیمت معہ اسٹراپ بکس اٹھائیس روپے
۱۰۹۳ رولڈ گولڈ دس سالہ گارنٹی
کیس قیمت معہ اسٹراپ بکس تیس روپے
خوبصورت بیضوی شیپ اسٹے برائٹ اسٹیل
کیس قیمت معہ اسٹراپ اٹھائیس روپے
۱۰۹۵ رولڈ گولڈ دس سالہ گارنٹی کیس
قیمت معہ اسٹراپ بکس بتیس روپے
خوش وضع مستطیل (لمبا شیپ) اسٹے برائٹ
اسٹیل کیس قیمت معہ اسٹراپ بکس چھبیس روپے
۱۰۹۷ رولڈ گولڈ دس سالہ گارنٹی کیس
قیمت معہ اسٹراپ کلائی و بکس تینتیس روپے
۱۰۹۸
گارنٹی ۱۰ سال
مشہور و معروف جان بیرل رسٹواچ
یہ آٹھ پہل شیپ کی گھڑی لیور فل جوئل بہت
مضبوط بنی ہوئی ہے۔ قیمت کرومیم کیس کی
معہ اسٹراپ کلائی و بکس تیرہ روپے۔
۱۰۹۹ رولڈ گولڈ دس سالہ گارنٹی کیس
قیمت معہ اسٹراپ کلائی و بکس اکیس روپے
۱۱۰۰
یہ رسٹ واچ چھوٹے
سائز کی نہایت خوشنما بنی
ہوئی ہے مشین اسکی لیور
اور فل جوئل ہے کیس اس کا
کرومیم کا ہے۔ قیمت معہ اسٹراپ
کلائی و بکس سولہ روپے۔
۱۱۰۱
اس گھڑی کا کیس رولڈ
گولڈ کا ہے اسکا سنہری رنگ دس
سال تک قائم رہیگا مشین اسکی لیور
اور فل جوئل ہے۔ ٹائم تمام گھڑیاں
صحیح بتاتی ہیں۔ قیمت معہ اسٹراپ
کلائی و بکس اکیس روپے۔
گارنٹی ۱۰ سال
۱۱۰۲
گارنٹی ۱۰ سال
فیشن ایبل جان بیرل کشنگر رسٹواچ
یہ خوشنما مستطیل (لمبی) رسٹواچ کرومیم کیس
لیور مشین کی فل جوئل مضبوط بنی ہوئی ہے
قیمت معہ اسٹراپ و بکس بیس روپے۔
۱۱۰۳ رولڈ گولڈ دس سالہ گارنٹی کیس
قیمت معہ اسٹراپ کلائی و بکس روپے

مندرجہ ذیل مشہور ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی رسٹ اور پاکٹ واچ جنکی قیمتیں پہلے کی بہ نسبت غیر معمولی کم ہو گئی ہیں

ان مستند و مشہور لیور جولیدار گھڑیوں کی تعریف لکھنا فضول ہے ہر شخص انکی خوبیوں سے واقف ہے جس ڈیزائن کی پسند ہو طلب فرمائیں۔

۱۱۱۱ سکنڈس نکل سلور (سفید) کیس قیمت معہ خوشنما اسٹراپ کلائی و بکس پندرہ روپے

۱۱۱۲ رولڈ گولڈ (سنہری چکدار) دس سالہ گارنٹی کیس قیمت معہ اسٹراپ و بکس تیئیس روپے

۱۱۱۳ میجلس رسٹ واچ نکل سلور کیس۔ قیمت معہ اسٹراپ و بکس بیس روپے۔

ریڈیم گھڑی کے دو روپے زائد ہونگے

۱۱۱۴ اس رسٹ واچ کا کیس رولڈ گولڈ (سنہری) دس سالہ گارنٹی کا ہے مشین لیور فل جوئل ہے ٹائم نہایت صحیح بتاتی ہے ہر گھڑی گارنٹی سے زائد کام دیتی ہے قیمت معہ اسٹراپ و بکس بیس روپے محصولڈاک وغیرہ تیرہ آنہ بذمہ خریدار

۱۱۱۵ یہ آٹھ پہل رسٹ واچ بھی رولڈ گولڈ کیس کی نہایت خوبصورت بنی ہوئی ہے مشین لیور اور فل جوئل ہے پرزے پختہ پائدار ہیں وقت نہایت صحیح بتاتی ہے قیمت معہ خوشنما اسٹراپ و بکس چھبیس روپے۔ محصولڈاک وغیرہ گیارہ آنہ۔

۱۱۱۶ یہ رسٹ واچ بالکل تعویذ کی شکل کی چورس نہایت خوشنما بنی ہوئی ہے مشین لیور بہت پختہ فل جوئل یعنی پندرہ جوئل والی ہے وقت بالکل صحیح بتاتی ہے کیس اکمل سلور کا ہے جو کبھی خراب ہی نہیں ہوتا۔

قیمت معہ اسٹراپ و بکس بائیس روپے

۱۱۱۷ یہ رسٹ واچ مندرجہ بالا گھڑی کے موافق ہے مگر اس کا کیس رولڈ گولڈ سنہری چکدار دس سالہ گارنٹی کا ہے قیمت معہ اسٹراپ و بکس اکتیس روپے۔ محصولڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

یہ ویسٹ اینڈ واچ کمپنی کی مندرجہ ذیل تمام گھڑیاں لیور اور جوئل دار مشین کی ہیں ہر گھڑی صحیح وقت بتاتی ہے۔ پرزے پختہ پائدار ہیں جو گھڑی پسند ہو اس کا نام نمبر اور قیمت لکھ کر طلب فرمائیں

۱۱۱۸ یہ رسٹ واچ رولڈ گولڈ کیس کی خوبصورت اور بہت چھوٹی بنی ہوئی ہے مشین اسکی لیور اور فل جوئل ہے وقت بالکل صحیح بتاتی ہے۔ قیمت معہ اسٹراپ و بکس اٹھائیس روپے (۲۸)

محصولڈاک وغیرہ بذمہ خریدار

۱۱۱۹ ووسٹ پاکٹ واچ لیور راسکوپ موومنٹ جوئلدار مشین نکل سلور کیس ۱۶ لین۔ قیمت معہ بکس بارہ روپے۔ گارنٹی سات سال۔

۱۱۲۰ سکنڈس پاکٹ واچ لیور جوئلدار مشین نکل سلور کیس خوشوضع درمیانہ سائز۔ قیمت معہ بکس تیرہ روپے گارنٹی آٹھ سال

۱۱۲۱ میجلس پاکٹ واچ نکل سلور کیس جوئلدار مشین خوبصورت اور چھوٹا سائز۔ قیمت معہ بکس سترہ روپے۔ گارنٹی نو سال۔

۱۱۲۲ کوٹن ایجی پاکٹ واچ نکل سلور کیس لیور جوئلدار مشین متوسط چھوٹا سائز۔ قیمت معہ بکس سترہ روپے۔ گارنٹی نو سال

۱۱۲۳ کمپٹیشن واچ نکل سلور کیس لیور فل جوئل مشین چھوٹا سائز قیمت معہ بکس پچیس روپے۔ گارنٹی دس سال۔

۱۱۲۴ نہایت خوشنما رولڈ گولڈ دس سالہ گارنٹی کیس لیور فل جوئل مشین گارنٹی سے بہت زیادہ چلنے والی۔ قیمت معہ اسٹراپ کلائی و بکس بتیس روپے علاوہ محصولڈاک

۱۱۲۵ یہ رسٹ واچ بھی ۱۱۲۴ کے مطابق ہے مگر کیس نکل سلور کا ہے۔ قیمت معہ بکس و اسٹراپ کلائی تیئیس روپے علاوہ محصولڈاک

Registered No. L 1961

Only Title & Art plates printed at Calcutta Art Press, Katra Baryan, Delhi.

پیام تعلیم
دہلی

پیامِ تعلیم
دہلی
ال گرہ نمبر

عید کی خوشی

غنچے چٹک رہے ہیں اس عید کی خوشی میں پھولوں کی انجمن ہی مصروف دل لگی ہیں
پیڑوں کی ٹہنیوں پر چڑیاں چہک رہی ہیں باغوں میں پیاری پیاری کلیاں مہک رہی ہیں
پھولوں کے دل کھلے ہیں بلبل کے چہچہوں سے اور سرو ہنس رہے ہیں قمری کے قہقہوں سے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گانا سا گا رہی ہیں نغمے مسرتوں کے کانوں میں آ رہے ہیں
ہے عید کی مسرت سارے جہاں پہ طاری خوشیاں منا رہی ہے خلقت خدا کی ساری
بوڑھے بھی آج خوش ہیں اور ہیں جوان بھی خوش مسرور ہیں توانا اور ناتوان بھی خوش
بچوں کا پوچھنا کیا چہرے کھلے ہوئے ہیں کھانے پہ شیر خرما سارے پلے ہوئے ہیں
اچھے لباس پہنے سب نے نہا نہا کر ماں باپ نے نظر کی بچوں پہ مسکرا کر
سج بن کے گھر سے نکلے خوش خوش ہوئے روانہ پڑھنے کو عیدگہ میں سب عید کا دوگانہ
پڑھ کر نماز یہ سب باہم گلے ملیں گے غنچے محبتوں کے ہر قلب میں کھلیں گے
آپس کے سارے جھگڑے یہ بھول جائیں گے اب الفت کے پاک نغمے سب مل کے گائیں گے اب

نیر کی یہ دعا ہے، یہ عید ہو مبارک
عیش و طرب کے رخ کی پھر دید ہو مبارک

محمد شفیع الدین صاحب نیر

قیمت سالگرہ نمبر آٹھ آنے

فہرست

قیمت سالانہ عہ

فی پرچہ ۳ر

جلد ۲۲ نمبر ۱۱، ۱۲

ایڈیٹر:- محمد حسین حسان

پرنٹر پبلشر ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی۔ محبوب المطابع پریس دہلی

برکت علی صاحب فراق
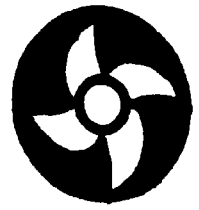
آؤ آؤ پھرکی بنائیں — اور ہوا میں خوب نچائیں
آؤ چلیں اور کاغذ لائیں — نیلا پیلا کاغذ لائیں
لالوؔ، پیلا کاغذ لائے — کالوؔ نیلا کاغذ لائے
لالوؔ جاکر قینچی لائے — کالوؔ جاکر لیئی لائے
لالوؔ نے پھر کاغذ کاٹے — آڑے ترچھے ٹیڑھے بانکے
پھر ان سب ٹکڑوں کو موڑا — اور سب کو لیئی سے جوڑا
لو اب وہ تیار ہے پھرکی — پیلی پیلی نیلی نیلی
ایسی پھرکی بنائی سب نے — پھلواری میں پھول ہوں جیسے
لالوؔ نے لی پیلی پھرکی — کالو نے لی نیلی پھرکی
ایک بچی تھی پیلی پھرکی — وہ آکر راجوؔ نے لے لی

لالوؔ بھی خوش کالو بھی خوش
ننھے منّے سے راجو بھی خوش

کوئی ایک مہینہ ہوا ایک پیامی نے مجھ سے کہا "سنا ہے اب کی تو آپ کا سال گرہ نمبر بہت شان دار نکل رہا ہے"۔ میں نے جواب دیا "بھائی کوشش تو ہم یہی کر رہے ہیں۔ مگر تمھیں معلوم ہے کاغذ اور دوسری چیزوں کے دام لڑائی کی وجہ سے کس قدر زیادہ ہو گئے ہیں اسی کی وجہ سے انگریزی اور اردو کے روزانہ پرچوں نے بھی چار چار صفحے کم کر دئے ہیں۔ پھر بھی ہم کوشش کریں گے کہ اس گرانی یا مہنگائی کا اثر پیام تعلیم پر نہ پڑے۔

اور ہم نے سچ مچ کوشش بھی کی مگر حالات نے ہمیں مجبور کر دیا۔ بہت سے اچھے اچھے مضمون ہمیں وقت کے وقت نکالنا پڑے اور بہت سی اچھی اچھی دلچسپ تصویریں پرچے میں شامل نہ ہو سکیں

ہمیں اپنے محترم بھائی جناب سید محمد صاحب ٹونکی۔ جناب سید محمد ادیبا صاحب، جناب الیاس احمد صاحب مجیبی۔ جناب الطاف علی صاحب سے خاص طور پر شرمندگی ہے۔ ان سے ہم نے بہت اصرار کے ساتھ مضمون لکھائے تھے۔ یہ دلچسپ اور اچھے مضمون اگلے پرچوں میں چھپیں گے۔

موجودہ مضامین ہم نے بہت احتیاط سے منتخب کئے ہیں اور اس بات کا خیال رکھا ہے کہ کوئی مضمون ایسا نہ چھپنے پائے جو تمھارے لئے دلچسپ اور مفید نہ ہو۔ توڑے دار بندوق، ولیم ٹل کے ملک میں پہلا سبق آنکھوں پر اعتبار اور اسی طرح کے دوسرے مضمون ہمیں امید ہے کہ تم بہت پسند کرو گے۔

اس سال پچھلے سال کے مقابلے میں پیام تعلیم

کو بچوں کے لئے اور بھی مفید اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی گئی اور ہمیں خوشی ہے کہ بچوں نے بھی ہماری اس کوشش کو بہت پسند کیا۔ اگلے سال چند اور دلچسپ اور مفید چیزیں بڑھانے کا ارادہ ہے۔

ہمیں سب سے زیادہ دقت صفحوں کی کمی کے سبب پیش آتی ہے۔ پچھلے سال سے ہم نے ۸ صفحے بڑھائے

ایک ایک خریدار بھی بنا دیا تو پھر دیکھنا تمھارا پرچہ کتنی ترقی کرتا ہے۔ اور کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

پچھلے سال ہمیں اپنے محترم بھائی جناب سلطان عالم خاں صاحب چیرمین ایجوکیشن کمیٹی ڈسٹرکٹ بورڈ سے بہت مدد ملی آپ نے اپنے حکم سے کوئی دو تین سو پرچے دسٹرکٹ بورڈ فرخ آباد کے مدرسوں میں جاری

ستمبر کے پیامِ تعلیم میں ماسٹر کلورام کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا کہ یہ کسی خاص شخصیت کے بارے میں لکھا گیا ہے مگر جناب رام کشن بال مصرا صاحب وکیل کی ایک اطلاع سے یہ معلوم کرکے بہت افسوس ہوا کہ ماسٹر کالورام صاحب فرخ آباد میں ڈرائنگ کے استاد ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ماسٹر کالورام صاحب اور اُن کے صاحب زادے مسٹر رام کشن بال مصرا وکیل ہماری اس نادانستہ غلطی کو معاف کریں گے ہمیں پیامِ تعلیم میں مضمون لکھنے والے چھوٹے اور بڑے بھائیوں سے امید ہے کہ آیندہ وہ خاص احتیاط سے کام لیں گے اور ہمیں اس قسم کا کوئی مضمون نہ بھیجیں گے۔

ہیں موجودہ حالت میں ہم اس سے زیادہ بڑھا بھی نہیں سکتے۔ ہاں اگر پیامی خریدار بڑھانے کی کوشش کریں تو سب کچھ ممکن ہے

کیا پیامی اپنے پرچے کی ترقی کے لئے اسے اپنے ساتھیوں میں مقبول بنانے کی کوشش نہ کریں گے اپنا سال گرہ نمبر اپنے دوستوں اور ہم جولیوں کو دکھاؤ اور انھیں پیامِ تعلیم خریدنے پر مجبور کرو۔ اگر تم سب نے

کرائے ہیں۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے دوسرے بزرگ بھی اس مثال کی تقلید کریں۔

سال گرہ نمبر کا یہ پرچہ ہمیشہ کی طرح نومبر اور دسمبر کا یکجائی پرچہ ہے۔ اب اگلا پرچہ جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوگا۔ پیامی دسمبر میں پیامِ تعلیم کا انتظار نہ کریں۔

غازی

محمد شفیع الدین صاحب نیر

گھوڑے پہ ہے سوار عجب آن بان سے
پیدا شکوہ و شان ہے اس کے نشان سے
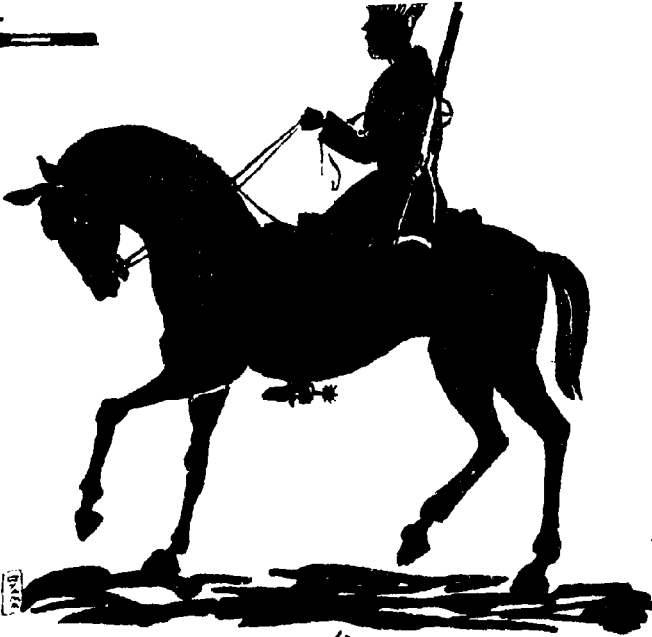
ٹوٹا ہوا ہے خود تو وردی پھٹی ہوئی
ہر شے ہے اس کی گرد سے ان کی اٹی ہوئی

کاندھے پہ تیز انی کا ہے نیزہ ٹکا ہوا
بیٹھا ہے اپنے گھوڑے پہ کیسا ڈٹا ہوا

تلوار تیز پہلو میں ہے اک لٹک رہی
برچھی سی ہے جو چشم عدو میں کھٹک رہی

ظاہر ہے چال ڈھال اور رنگ ڈھنگ سے
ہے آرہا ابھی ابھی میدانِ جنگ سے

ہوتا عیاں ہے معرکہ سر کرکے آیا ہے
صف دشمنوں کی زیر و زبر کرکے آیا ہے

ہیں زخم بے شمار بدن چور چور ہے
فرطِ سرور سے مگر آنکھوں میں نور ہے

خوش ہے کسی پہ آپ یہ چڑھ کر نہیں گیا
حملہ ہوئے بغیر یہ بڑھ کر نہیں گیا

یہ سچ ہے خاک و خون میں کھیلا ہے جوش میں
اور دشمنوں کو خوب ہی ریلا ہے جوش میں

جم کر بہادری سے یہ کچھ اس طرح لڑا
بے ساختہ پکار اُٹھے دشمن بھی واہ وا

دنیا کو اپنی تیغ کے جوہر دکھا دئے
اعدارِ دیں کے جنگ میں چھکّے چھڑا دئے

لیکن کسی کا جنگ میں پیچھا نہیں کیا
مانی شکست جس نے اسے دکھ نہیں دیا

کچھ اس طرح سے جنگ کا نقشہ جما دیا
کم عمر اور ضعیف کو زد سے بچا دیا

عورت پہ اس نے ہاتھ اُٹھایا نہیں کبھی
بچوں کو بھول کر بھی ڈرایا نہیں کبھی

آبادیوں کو اس نے مٹایا نہیں ذرا
باامن شہریوں کو ستایا نہیں ذرا

ظلم وستم مٹانے کو تلوار اُٹھائی تھی
دنیا کے امن کے لئے تیغ آزمائی تھی

یہ آرزو تھی دین کا جھنڈا بلند ہو
دنیا میں اس کی قوم سدا ارجمند ہو

ارمان تھا کہ راہِ خدا میں شہید ہو
حق پر فدا ہو جان تو بس اس کی عید ہو

نے مال کے لئے تھی نہ تھی جاہ کے لئے
جنگ اس کی جنگ تھی فقط اللہ کے لئے

آ شیر مرد! تجھ کو گلے سے لگائیں ہم
آ تیری خاکِ پاک کا سرمہ بنائیں ہم

تو وہ ہے جس کی ذات پہ ہے حریت کو ناز
اسلامیت کو فخر ہے انسانیت کو ناز

نیرؔ کا قلب بھی اسی وقت شاد ہو
راہ خدا میں نوک قلم سے جہاد ہو

شام کا وقت (مرسلہ عطا محمد جامعی)

عکس (مرسلہ حسن احمد ندوی)

ریل کا پل

پہاڑی دریا پر پل (کشمیر)
(مرسلہ محمود احمد خان سیالکوٹ)

(بائیں سے کھڑے ہوئے)
زبیدہ بیگم اور کشور آرا بیگم
(بیٹھے ہوئے)
راحت علی وجاہت علی
امتیاز علی

سید محمد رضا رضوی
جھانسی

محمد منصور رضا آگرہ

(دائیں طرف سے) ساجدہ انصاریہ (صدر)
عزیزہ انصاریہ (سیکرٹری)

توڑے دار بندوق

سید ابو طاہر صاحب بی، ایس، سی، بی، ٹی

ہمارے مکان کی گھنٹی بجی اور گول کمرے میں نوکر نے ایسے شخص کے آنے کی اطلاع دی جو اپنا نام اور آنے کی غرض بتانا نہیں چاہتا تھا۔ عرشی بھائی نے سر ہلایا۔ نوکر نے چک ہٹائی اور ایک قوی ہیکل جوان کوٹ پتلون پہنے اندر داخل ہوا۔

"ہلو انسپکٹر مسٹر امیر عالم"

آنے والا شخص حیران کھڑا رہ گیا اور پھر مسکرا کر کہنے لگا "میں لاہور سے کل ہی آیا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ نے مجھے اس سے پہلے کبھی دیکھا بھی نہیں"

"جی ہاں" عرشی بھائی نے قہقہہ لگایا" اور اب سے دو سال پہلے کلکتے میں، میرے اور نرنجن پال کے پیچھے کون ہاتھ دھو کر پڑا تھا"

"لیکن اس زمانے میں تو میں ایک بنگالی بابو کے بھیس میں تھا اور آپ کو سراغ رسانی سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا"

"لیکن آپ اپنے ماتھے کا مسا نہ چھپا سکے تھے"

"اُسے میں نے سیندور سے چھپا لیا تھا"

"اور اتفاق سے آپ گرمی کے سبب اتنے بوکھلائے ہوئے تھے کہ رومال سے منہ پونچھتے وقت اُسے بھی صاف کر گئے تھے"

"بڑے ہوشیار ہو.......مگر یہ تو بتاؤ میرا نام کیسے معلوم ہوا"

"جی اس سے پہلے ایک کیس کے سلسلے میں آپ کی تصویر ہفتہ وار اجل میں شائع ہو چکی ہے اور اس کے نیچے آپ کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا تھا"

"مگر اس میں مونچھیں تو تھیں نہیں"

"اور اس وقت بھی نہیں ہیں" عرشی بھائی نے انسپکٹر کو گھورتے ہوئے کہا"

انسپکٹر نے خاموشی سے اپنی مونچھیں نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیں اور جھینپ مٹانے کے لئے خوب قہقہے لگانے لگا۔

"آپ مرزا حکیم کے قتل کی تفتیش کرنے آئے

ہیں۔" عرشی بھائی نے مسکرا کر کہا۔
"آپ مجھے اپنی ذہانت سے ٹکڑے ٹکڑے کئے ڈالتے ہیں۔"
"انسپکٹر! اس میں ذہانت کی کون سی بات تھی۔ دلی میں اس ہفتے کے اندر یہی سب سے مشہور اور اہم واقعہ ہوا ہے۔ خیر آپ بیان تو کیجئے۔"
انسپکٹر نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "حکیم صاحب ۱۰ر جون کو صبح کے وقت شکار کھیلنے گئے تھے اور وہاں سے دو بجے واپس آکر اپنی محل سرا کے خاص کمرے میں جو اوپر کی منزل پر تھا کوچ پر لیٹے آرام کر رہے تھے کہ لوگوں نے بندوق چلنے کی آواز سنی سب دوڑتے ہوئے اندر آئے تو دیکھا کہ بندوق زمین پر پڑی ہے اور حکیم صاحب اس کے قریب اوندھے منہ پڑے ہوئے ہیں۔ سارا سینہ چھرّوں سے لہو لہان ہے۔......."
"میں ایک بات کہوں بھائی جان۔"
"ہاں"
"میری رائے میں انھوں نے خودکشی کی ہے" میں نے ایک تجربے کار سراغ رساں کی طرح کہا
"بندوق سے خودکشی کرنا ذرا مشکل بات ہے۔" انسپکٹر نے میری بات کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔
"ہاں خودکشی تو ہو سکتی ہے مگر اس طرح گولی یا تو ٹھوڑی پر لگے گی یا کھوپڑی پر۔" عرشی بھائی نے ذرا نرمی سے کہا۔
"اور حکیم صاحب خود بھی بندوق کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے" انسپکٹر نے اب کی مرتبہ ذرا مسکرا کر کہا۔
"خیر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قتل کئے گئے" عرشی بھائی نے انسپکٹر کی طرف مخاطب ہو کر کہا
"اس میں کیا شک ہے۔"
"اور قاتل؟"
"بھائی صاحب۔"
"اُن کو آپ جیل بھجوا چکے ہیں؟"
"جی ہاں"
"ثبوت؟"
"سنئے! حکیم صاحب کی پہلی بیوی مر چکی تھیں انھوں نے کوئی اولاد بھی نہیں چھوڑی حکیم صاحب نے ابھی تین چار سال ہوئے ایک عیسائی اُستانی سے نکاح کیا۔ لیکن اُن کے بھائی یہ چاہتے تھے کہ حکیم صاحب اس کو طلاق دے دیں تاکہ وہ خود اس سے نکاح کرلیں اس بات پر کبھی کبھی آپس میں لڑائی بھی ہو جاتی تھی اس لئے اس کا قطعی امکان ہے کہ انھوں نے حکیم صاحب پر گولی چلا دی ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا ہے اس وقت وہ حکیم صاحب کے پاس ہی کے کمرے میں

سو رہے تھے۔"

"یعنی وہ سو بھی رہے تھے اور اسی حالت میں بندوق بھی چلا رہے تھے۔"

"نہیں صاحب کھلا ہوا بہانہ ہے۔ دنیا کا خون سفید ہو گیا ہے۔"

"یہ باتیں آپ کو کس طرح معلوم ہوئیں۔"

"حکیم صاحب کے گھر والوں سے۔"

"اور ان کے گھر میں ہے کون کون۔"

"حکیم صاحب کی عیسائی بیوی، گھر کی مامائیں اور نوکر۔"

"یعنی اس کے یہ معنی ہیں کہ حکیم صاحب کی بیوی خود اپنے دیور کے خلاف ہیں .... آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ اچھے آدمی نہیں"

"نہیں بلکہ اس لئے کہ .... اس لئے کہ ...." عرشی بھائی کہتے کہتے رک گئے پھر چیخ کر بولے "انسپکٹر! آپ اتنا نہیں سمجھ سکتے کہ ایک بی۔ اے پاس نوجوان خود اپنے بھائی کو اتنی بے وقوفی سے قتل کرے گا ......" عرشی بھائی دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلنے لگے اور پھر انسپکٹر کی طرف رُخ کر کے بولے "مسٹر آپ دوسرے بے گناہ کے خون میں ہاتھ رنگ رہے ہیں ...."

"تو آپ ہی بتائیے قاتل کون ہے؟"

"چلئے"

دو دن تک عرشی بھائی گھر سے غائب رہے تیسرے روز دیکھتا کیا ہوں کہ بہت خوش خوش چلے آرہے ہیں۔ غلاف میں ایک بندوق لئے ہوئے اور جیبوں میں کچھ چیزیں بھرے ہوئے۔

میں نے کہا "کہئے بھائی جان شیر یا بھیڑ"

"شیر" میرے سر پر ایک ٹیپ جماتے ہوئے کہا۔

"سچ! آپ نے پتہ لگا لیا؟"

"کبھی کا۔ ایک نے سائنس کی مدد سے ایک بے گناہ کو قتل کیا اور دوسرے نے سائنس کی مدد سے ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے سے ہٹا کر ایک گناہ گار کو اس کی جگہ لا کر کھڑا کر دیا۔"

"میں عرشی بھائی سے دوڑ کر لپٹ گیا۔"

"اچھا تم بتاؤ قاتل کون ہے۔"

"استانی"

"اوہو نہ وہ تو اتنی کمزور اور نازک ہے کہ بندوق چھوڑنا تو کجا اٹھا بھی نہیں سکتی۔" پھر انھوں نے بندوق غلاف میں سے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"دیکھو کتنی بھاری بندوق ہے۔"

"اوہو۔ اس پر تو شہنشاہ فرخ سیر کی مہر بھی ہے۔"

"ہاں حکیم صاحب کے بزرگوں کو انعام میں ملی تھی۔"

"لیکن یہ تو عجائب خانے کے لئے ہے۔ شکار کے لئے نہیں۔"

"ہاں حکیم صاحب بھی اپنی وضع کے ایک ہی تھے۔ ہر ساتویں آٹھویں روز شکار کو ضرور جاتے تھے۔ لیکن لاتے کچھ بھی نہیں تھے۔ کیونکہ جب تک بندوق میں چھرا بھرو، بارود ڈالو اور گز کے ذریعے روئی ٹھونسو، اس وقت تک کوئی جانور انتظار نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ وہ خود بھی شکار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ البتہ گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے بزرگوں کی بہادری کی نشانی اپنے ہاتھ میں لے کر وہ خود کو مغل سردار سمجھنے لگتے تھے۔"

"تو اس روز بھی وہ خالی ہاتھ آئے ہوں گے۔"

"ہاں ہاتھ خالی تھے مگر بندوق بھری ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے"

"اور بندوق خالی کرنے لگے۔"

"توڑے دار بندوق صرف فیر کرنے سے خالی ہوتی ہے اور چونکہ وہ تھک گئے تھے۔ گرمی بھی بہت تھی۔ منہ میں روزہ بھی تھا، اس لئے انھوں نے بندوق شاید بیچ کی گول میز پر رکھ دی ہوگی۔"

"انھیں خیال نہیں آیا کہ کہیں گھوڑا نہ گر جائے۔"

"گھوڑا گرا ہوا تھا۔ گرا ہوا نہ بھی ہوتا تب بھی اس کے لئے ٹوپی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تجربے کار شکاری اپنی بندوق بھری رکھتے ہیں لیکن اس پر ٹوپی اسی وقت چڑھاتے ہیں جب انھیں فیر کرنا ہوتا ہے۔"

"اچھا پھر کیا ہوا۔"

"ہاں! تو بندوق رکھنے کے بعد انھوں نے اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھولی ہوں گی اور شکاری کوٹ اتار کر یونہی کوچ پر دراز ہو گئے ہوں گے۔ اب تم بتا سکتے ہو کہ اس کے بعد کیا ہوا؟"

"بندوق چھوٹ گئی۔"

"کیسے"

"یہی تو معلوم نہیں"

"اچھا بتاؤ بندوق چھوٹتی کس طرح ہے"

"ہم لبلبی دباتے ہیں۔ گھوڑا کیل پر ضرب مارتا ہے۔ کیل چھروں اور بارود سے ٹکراتی ہے۔ اس ٹکر سے حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ بارود آگ پکڑ لیتی ہے بارود کا شورہ آکسیجن دیتا ہے۔ گندھک جلنے لگتی ہے گیس پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ پھیلتی ہیں اور زور کے دھماکے سے اپنے ساتھ چھروں کو لئے ہوئے نال کے اندر سے نکل جاتی ہیں......."

"شاباش! اب بتاؤ بندوق کی لبلبی کس نے دبائی ہوگی۔"

"استانی نے"

"شی۔ تم استانی کے دشمن کیوں ہوگئے کیا بغیر لبلبی دبائے بندوق نہیں چھوٹ سکتی؟"

"میگزین کو گرم کیا جائے تو........"

"بھئی خدا کی قسم تو بڑا عقل مند ہے۔ اچھا بتا میگزین کس طرح گرم ہوا"

"استانی نے اس پر آگ رکھ دی ہوگی۔"

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا

"کیا خوب! استانی تمھاری طرح بے وقوف نہیں ہے۔"

"اچھا ٹھہرئے۔ دس جون کو۔ دہلی کی گرمی میں دن کے ایک بجے ٹھیک دوپہری میں سورج کی کرنیں حکیم صاحب کے کمرے میں آرہی تھیں"

"کدھر سے"

"مغرب کی طرف کی کھڑکی سے"

"پھر"

"میگزین گرم ہوگیا"

"میگڈین گلم ہوڈیا" عرشی بھائی میرا منہ چڑھانے لگے۔

"سچ بھائی جان ایسی دوپہری ہیں میری سائیکل کے ٹیوب جو پھٹ چکے ہیں"

"جناب! وہ کول تار کی سڑک پر پھٹ جاتے ہیں کیونکہ اس میں خاصیت ہے کہ وہ سورج کی کرنوں کو جذب کرکے خوب گرم ہوجاتا ہے۔"

"تو یہاں ایسی کون سی چیز تھی جس نے سورج کی کرنوں کو جذب کرلیا۔"

"یہی تو پوچھ رہا ہوں......"

"مجھے نہیں معلوم"

عرشی بھائی نے اپنی جیب سے ایک آتشی شیشہ نکالا جو بیچ میں سے موٹا تھا۔ اور کناروں پر سے پتلا۔

میں اچھل کر کھڑا ہوگیا مگر عرشی بھائی نے کان پکڑ کر بٹھا دیا۔ میں نے کہا "بھائی جان اپ اس سے کاغذ اور کپڑے جلا چکا ہوں۔ پرسوں ہی میں نے تربا کے بال جلا دئے تھے۔ اور اس پر اماں کے ہاتھ سے پٹا بھی خوب تھا" عرشی بھائی نے جھنجھلا کر میرے ایک چپت رسید کی اور پھر کہنے لگے "بتاؤ اس کے ذریعے چیزیں کیوں کر جل جاتی ہیں۔"

میں نے ہار مان لی تو انھوں نے یہ شکل بنائی۔

کہنے لگے "دیکھو سورج کی کرنیں اس شیشے میں داخل ہونے کے بعد مڑنا شروع کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ تھوڑی دور جاکر سب ایک نقطے پر جمع ہوجاتی ہیں۔ یہی نقطہ اس شیشے

کا فوکس کہلاتا ہے۔ چونکہ اتنی ذرا سی جگہ پر اتنی کرنوں کا جماؤ ہوتا ہے اسی وجہ سے اس مقام پر سورج کا چھوٹا سا گول عکس اُتر آتا ہے اور چیزیں جلنے لگتی ہیں۔ اب کہو میگزین کس طرح گرم ہوا"

"استانی نے ایسا شیشہ لے کر۔۔۔"

"ہاں وہ دو گھنٹے تک اس شیشے کو لئے ہوئے کھڑی رہی تاکہ حکیم صاحب جاگ اُٹھیں اور

"ارے اب میں سمجھ گیا"

"ہاں اس نے وہ حوض اُٹھا کر گول میز پر رکھ دیا۔"

"یہ حوض گول شیشے کا کام کرنے لگا۔"

"پھر بندوق کو ذرا سرکا کر اس طرح رکھ دیا کہ اس کی نال کا رخ حکیم صاحب کے سینے کی طرف ہو گیا اور اس کا میگزین حوض کے ٹھیک فوکس پر آ گیا۔"

اُسے یہ حرکت کرتے دیکھ کر پولیس کے حوالے کر دیں۔۔۔۔۔۔ بھائی وہ واقعی اُستانی تھی اور شادی سے پہلے لڑکیوں کو سائنس پڑھایا کرتی تھی۔"

میں نے سر ہلایا

"حکیم صاحب کے کمرے میں شیشے کی ایک بڑی سی ہانڈی رکھی تھی۔ جس کے اندر سرخ سبز مچھلیاں تیر رہی تھیں۔۔۔۔۔۔"

میں نے ایک جھرجھری لی پھر چونکتے ہوئے کہا "ممکن ہے وہ حوض وہیں رکھا جاتا ہو۔"

"نہیں وہ ہمیشہ کمرے میں کونے کی میز پر رکھا رہتا تھا اسی روز وہ بیچ کی میز پر رکھا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اندر کی تمام مچھلیاں مر گئیں۔"

"اس کا کیا ثبوت کہ یہ کام اُستانی ہی نے کیا حکیم صاحب کے بھائی بھی ایسا کر سکتے تھے

کیونکہ وہ بھی بی اے پاس ہیں"
"میاں صاحب زادے! سائنس سمجھ لینا ہر بی اے پاس کا کام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہانڈی کی سطح پر اُستانی کی انگلیوں کے تازہ نشان موجود تھے ان کا فوٹو لے کر اس بات کا

بعد اور حکیم صاحب زخمی ہونے کے بعد"
"تو بھائی جان اب استانی کو پھانسی....."
میرا دل دھڑک رہا تھا۔
"ہاں"
میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ بڑا ہو کریں

پورا ثبوت دے دیا گیا"
میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
"کچھ اور پوچھنا ہے"
"حکیم صاحب اور بندوق زمین پر کیسے آ رہے؟"
"دونوں اچھل پڑے، بندوق چھوٹنے کے

سائنس پڑھانے والی اُستانی سے کبھی.... "کیا سوچ رہے ہو"
عرشی بھائی نے مجھے چونکا دیا۔
"یہی کہ اگر یہ قصہ پیامِ تعلیم کے سالگرہ نمبر میں بھیج دیا جائے"

جی ہاں ماٹ صب! یہ تصویر بغیر دیکھے بنائی ہے۔ نقل نہیں ہے!

جناب ... صاحب بی ایس سی - لندن

کہو یارو! آپ بیتی سنائیں یا جگ بیتی؟

آپ بیتی؟

اچھا صاحب آپ بیتی ہی سہی...... سُنو کچھ دنوں کی بات ہے کہ لندن میں ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ چلو ذرا سوئستان یعنی سوئٹزرلینڈ کی سیر کی جائے......

اب میں تمھیں کیا بتاؤں کہ سوئستان کیسا ملک ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ معلوم ہوتا ہے اللہ میاں نے خاص اپنے ہاتھ سے اس ملک کو بنایا ہے۔ جدھر دیکھو اونچے اونچے پہاڑ برف سے ڈھکے سفید ٹوپی پہنے کھڑے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور بہت دور نیچے برف کی حد تک درختوں کا نام و نشان نہیں ہے۔ برف کے ختم ہوتے ہی سبزی شروع ہوتی ہے۔ اور پہاڑ خوب صورت درختوں سے ڈھکے ہوئے ہوتے ہیں، جن میں سرو، صنوبر، چیڑ، چنار، شمشاد سبھی کچھ ہوں گے۔ لیکن صنوبر کی تعداد زیادہ نظر آتی ہے۔ پھر وادیوں میں نہایت خوب صورت جھیلیں ہیں۔ ان کا رنگ کہیں پر فیروزی کہیں پر گہرا نیلا ہے۔ اور پانی ایسا شفاف کہ تہ تک کی چیز صاف نظر آتی ہے۔ جھیلوں کے کنارے، وادیوں میں پہاڑوں پر صاف ستھرے اور خوب صورت گاؤں آباد ہیں۔ ہر گاؤں میں چھوٹے چھوٹے ہوٹل اور رہنے کی جگہیں ہیں۔ ان بستیوں کی گلیوں اور سڑکوں کو دیکھو تو ایسی صاف ستھری کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر وقت جھاڑ دی جاتی ہے۔ مکانات اُجلے اُجلے اور گرد و غبار سے بالکل پاک و صاف ہیں۔ سارے ملک میں نہایت نفیس سڑکوں کا جال پھیلا ہوا ہے اور ریلیں ہر مقام پر موجود ہیں یہ ریل گاڑیاں بجلی سے چلتی ہیں۔ ان میں بیٹھنے والوں کے کپڑے کوئلے کے دھوئیں سے اور اُن کی آنکھیں کوئلوں کے ریزوں سے خراب نہیں ہوتیں۔ سوئستان میں بجلی آبشاروں سے بنائی جاتی ہے اور اس وجہ سے بہت سستی بنتی اور ملتی ہے اور ہر کام میں لائی جاتی ہے۔ سارے ملک میں جدھر دیکھو صفائی اور

جدھر دیکھو ستھرائی ہے۔ جب ہی تو تمام دنیا کے لوگ یہاں سیر و تفریح کے لئے آتے ہیں۔

توبہ! میں کہاں سے کہاں نکل گیا۔ کہہ یہ رہا تھا کہ سوئٹستان جانے کا خیال پیدا ہوا۔ خیال پیدا ہونا تھا کہ بوریا بستر اُٹھا، لندن سے نیوہے ون،

آج تو صرف ایک دو دن کے واقعات سن لو۔

لوسرن ایک نہایت خوب صورت شہر ہے اور جھیل لوسرن کے مغربی کنارے پر آباد ہے۔ جھیل کے کنارے کنارے نہایت نفیس ہوٹل بنے ہوئے ہیں اور ہوٹلوں کے سامنے نہایت

جنیوا کی جھیل کا ایک حصہ

نیوہے ون سے جہاز پر ڈی اپ، ڈی اپ سے ریل پر پیرس اور پھر پیرس سے جو ریل پر بیٹھے تو سوئٹستان کے مشہور شہر لوسرن جا کر دم لیا۔

وہاں کیا سُنا اور کیا دیکھا اس کی داستان لانبی ہے۔ تم سنتے سنتے تھک جاؤ گے۔ اس لئے
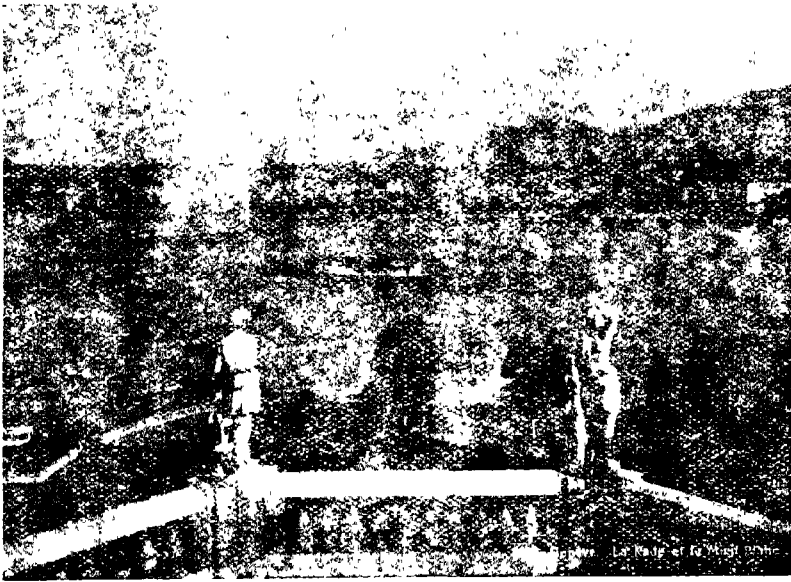
خوب صورت باغیچے لگے ہوئے ہیں جن میں ہر وقت اور خاص کر شام کے وقت باجا بجتا رہتا ہے اور لوگ چائے شربت پیتے رہتے ہیں۔

یہاں پر بیٹھ کر جھیل کا منظر کیسا معلوم ہوتا ہے؟ پوچھو مت بس دیکھنے کی چیز ہے۔ جی

میں آیا کہ ' یامولا ' کا نعرہ ماروں اور انھی ہوٹلوں میں سے کسی ایک میں جم جاؤں ، اور اس طرف دو قدم بڑھائے بھی تھے کہ معاجیب کا خیال آگیا بس سارا نشہ ہرن ہوگیا۔ اور مجبوراً ایک سستے ہوٹل کی طرف رُخ کیا۔ یہ بے چارا ہوٹل جھیل کے جنوبی سمت ایک دو مکانات کے پیچھے تھا۔

ہم نے اپنے آپ کو دلاسا دیا کہ کیا غم ہے اگر ہوٹل سے جھیل ہماری نگاہ کے سامنے نہیں آتی تو کیا ہوا! ہم خود اس کے کنارے جاکر اپنے آپ کو سامنے کر دیں گے۔

شام ہوگئی۔ تمام شہر بقعۂ نور بن گیا۔ چاروں طرف پہاڑ جگ مگ جگ مگ کرنے لگے۔ ان پر ہر طرف اونچی اونچی جگھوں پر ہوٹل کلب اور صحت گاہیں بنی ہوئی ہیں۔ ان کی روشنیاں چراغاں کا لطف دے رہی تھیں۔ میں کپڑے بدل جھیل کے کنارے پہنچ گیا.......... اوہو ہو ہو! کیا سماں ہے۔ جھیل کے کنارے کنارے بجلی کے ہزاروں رنگین قمقمے لگے ہوئے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے تفریحی جہاز رنگ برنگی روشنی سے منور آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔ ان پر باجا بج رہا ہے گانا ہو رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے موٹر بوٹ پانی کو روئی کی طرح دھنتے ہوئے، غنغناتے ہوئے، دگدگاتے ہوئے تیر کی طرح نکلے چلے جا رہے ہیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے مرد قہقہہ لگا رہے ہیں اور عورتیں ڈر کے مارے چیخ رہی ہیں۔ پانی کے کنارے کنارے رنگین فوارے اُڑ رہے ہیں۔ ہر ملک اور ہر رنگ کے لوگ چہل قدمی اور گپ بازی میں مشغول ہیں۔ جہاں جہاں پانی ساکن ہے وہاں اوپر کی روشنی نیچے منعکس ہو کر جھلک رہی ہے۔ اوپر بھی چراغاں ہے نیچے بھی چراغاں ہے۔ بس کچھ نہ پوچھو، دل لوٹ پوٹ ہوگیا۔ افسوس میں شاعر نہ ہوا۔

جھیل کے اس پار بھی آبادی ہے اور اُس پار بھی آبادی۔ جہاں پر اس کی چوڑائی کم ہے ایک پل بنا ہوا ہے۔ یہی پل ان دونوں آبادیوں کو ملاتا ہے۔ میں پل سے گذر کر شہر کے شمالی حصے میں پہنچا اور کچھ چہل قدمی کر کے جھیل کے کنارے ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اور بہت دیر تک اس منظر کا لطف اُٹھاتا رہا۔ پھر ایک چکر کاٹ کر اپنے ہوٹل میں واپس پہنچا اور ہوٹل کے منیجر سے میں نے کہا " دیکھو ہم آس پاس کے مقامات کی سیر کرنا چاہتے ہیں۔ ذرا کوک کمپنی کو اطلاع کر دو کہ وہ اپنی موٹر صبح سویرے بھیج دے" اس کے بعد کھانا کھا کر میں سو گیا۔

صبح ابھی ٹھیک سے منہ ہاتھ بھی نہ دھونے پایا تھا کہ موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ میں نے جلدی سے کپڑے پہنے اور ناشتہ کھا کر تیار ہوگیا۔ ہوٹل کے منیجر نے دن کے کھانے کا لفافہ ساتھ کر دیا۔

تم کہوگے کہ کھانے کے لفافے کے کیا معنی۔ بات یہ ہے کہ اس میں خشک چیزیں مثلاً کچھ اُبلے ہوئے انڈے کچھ سینڈوچ اور اسی قسم کی چیزیں تھیں۔

سوئستان کی ایک سڑک

باہر دیکھتے ہیں کہ ایک کھلی موٹر جس میں دس، پندرہ آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے کھڑی ہوئی ہے موٹر کے ڈرائیور کے ساتھ ایک رہبر بھی تھا۔ جس کا کام تھا کہ مختلف مقامات کی سیر کرائے اور اُن کے حالات ہمیں بتلائے۔ رہبر نے مسکراکر مجھے سلام کیا اور آگے بیٹھنے کو کہا۔ میں بیٹھ گیا لیکن تعجب ہوا کہ تین، چار آدمیوں کے لئے ایسی بڑی موٹر کس واسطے آئی تھوڑی دیر میں اس کا سبب بھی معلوم ہوگیا کیونکہ موٹر ہمارے ہوٹل سے نکل کر دوسرے ہوٹلوں میں پہنچی اور ایک دو اشخاص ہر جگہ سے سوار ہوئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ وقت پر اطلاع کرنے کا نتیجہ ہوا کہ اچھی جگہ ملی ورنہ سب کے پیچھے بیٹھنے کو جگہ ملتی۔

اسی طرح مختلف نسل اور اقوام کا یہ مختصر قافلہ ولیم ٹل کے ملک کی سیر کو چلا۔

ولیم ٹل کو نہیں جانتے؟

بھئی واہ! اس کا ذکر تو تم نے اکثر سنا ہوگا۔ اس کے قصے بچوں کے لئے اور بوڑھوں کے لئے لکھے گئے۔ اس کا افسانہ تیار ہوا۔ اس کا ڈراما تیار ہوا۔ کون سی ایسی زبان ہے جس میں ولیم ٹل کے واقعات نہ لکھے گئے ہوں گے۔

ہاں تو یہ کیوں نہ کہو کہ تم میں سے اکثر جانتے ہیں۔ لیکن بہت سے ایسے بھی ہیں جو نہیں جانتے۔

اچھا بھائی انھی کی خاطر سہی، دو، چار جملوں میں ولیم ٹل کا ذکر کر دیتا ہوں۔ تفصیل سے پھر کبھی پڑھ لینا۔

آج سے تقریباً سات سو سال پہلے یعنی تیرھویں صدی میں سوئستان کا ملک بڑی مصیبت میں تھا۔ اس کی آزادی چھن گئی تھی۔ اس پر آسٹریا والوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ اور جس طرح بہت سی حاکم قوموں کا قاعدہ ہے آسٹریا والے سوئستان والوں

کو محکوم سمجھ کر بہت ستاتے تھے، اُن کی بڑی بے عزتی کرتے تھے۔ یہ بے چارے غم و غصہ سہتے مگر کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اندر اندر آگ کی طرح جلتے لیکن اتنی طاقت نہ تھی کہ ظالموں کو مار بھگائیں

اس زمانے میں آسٹریا کے ڈیوک نے ایک شخص گیسلر نامی کو سوئستان کے اس علاقے یعنی جھیل لوسرن کے اطراف کے ملک کا والی (گورنر) بناکر بھیجا۔ یہ گیسلر بڑا ہی بے رحم ظالم اور خونی تھا۔ ہزاروں سوئس لوگوں کو اس نے قید کروا دیا سینکڑوں کی اس نے گردنیں کٹوا دیں۔ اور لوگوں کو ذلیل کرنے کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ قصبہ الٹ ڈورف کے چوراہے پر ایک کھمبے پر اپنی ٹوپی لگوادی، جو کوئی اس ٹوپی کے سامنے نہ جھکتا اس کو موت کی سزا دی جاتی۔ غرض یہ کہ ظلم و زیادتی کے اس نے عجیب عجیب طریقے نکال رکھے تھے، مگر کب تک؟ ......

کہتے ہیں کہ الٹ ڈورف کے قریب ہی ایک گاؤں میں ایک بڑا بہادر شخص رہتا تھا۔ اس کا نام ولیم ٹل تھا۔ ولیم ٹل بڑا جی دار اور بے خوف انسان تھا۔ اس کے تیر کا نشانہ بے خطا سمجھا جاتا تھا اور ایسا اُستاد کشتی کھینے والا تھا کہ وہ جھیل میں طوفان کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔ وہ بڑا محب وطن تھا۔ ہر وقت اپنے دیس کی آزادی کے خواب دیکھا کرتا تھا۔

ولیم ٹل کا ایک لڑکا تھا جس کو وہ بہت پیار کرتا تھا اور بے حد چاہتا تھا۔ ایک دن اسی بچے کو لے کر الٹ ڈورف پہنچا اور چوک پر سے گذر ہی رہا تھا کہ ایک سپاہی نے اس کو پکڑ لیا اور کہنے لگا "چونکہ تم اس ٹوپی کے سامنے نہیں جھکے اس لئے موت کی سزا دی جائے گی"۔......

ولیم ٹل نے ایک بے جان چیز اور غلامی کے نشان کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ یہ جھگڑا ہو ہی رہا تھا کہ گیسلر بھی پہنچ گیا اور کہنے لگا "تو باغی ہے میں تجھے موت کی سزا دوں گا"...... اتنے میں ولیم ٹل کا بچہ "ابا، ابا" کرتا اس کے قریب آیا۔ گیسلر تو مجسم شیطان تھا۔ بچے کو دیکھ کر کہنے لگا "اس لڑکے کو درخت سے باندھ دو"

ٹل یہ دیکھ کر پریشان ہوا، کہنے لگا "دیکھو! اس بچے کو نہ ستاؤ، یہ میرا سب سے بڑا لڑکا ہے" گیسلر نے کہا "اس بچے کے سر پر ایک سیب رکھ دو" اور پھر ٹل سے کہنے لگا "اگر جان کی امان چاہتا ہے تو تیر مار کر سیب کے دو ٹکڑے کر ڈال۔ اگر سیب نہیں کٹا یا بچہ مر گیا تو تجھے مار ڈالوں گا"

ولیم ٹل بہت گھبرایا، کہنے لگا "ظالم کیا تیرے سینے میں دل نہیں ہے۔ کیا میں اپنی جان کے لئے اپنے بچے کی جان خطرے میں ڈالوں گا؟" گیسلر تو چھٹا ہوا بدمعاش تھا، کہنے لگا "اچھا تو میں پہلے تیرے بیٹے کو تیری آنکھوں کے سامنے ذبح کر دوں گا پھر تیری

جان لوں گا........ تو تو بڑا نشانہ باز کہلاتا ہے۔ اب کیا ہو گیا؟"

مجبور ہو کر ٹل نے دو تیر اُٹھائے۔ ایک کمر میں رکھا، دوسرا کمان پر چڑھایا۔ خدا سے دعا کی اور ایسا نشانہ لگایا کہ سیب دو ٹکڑے ہو کر گر گیا اور بچے کا

الٹ ڈورف میں ولیم ٹل کا مجسمہ۔ اسی جگہ پر تیر والا واقعہ ہوا تھا۔

بال بھی بیکا نہ ہوا۔ گیسلر کھسیانا سا ہو گیا۔ لوگ دنگ رہ گئے۔ پھر گیسلر نے پوچھا "اور یہ دوسرا تیر کس لئے تھا؟"

ولیم ٹل نے بے خوف انداز سے جواب دیا "اگر میرے بچے کی جان جاتی تو دوسرا تیر تیرے سینے کے پار ہو جاتا"۔

گیسلر غصے سے بھوت ہو گیا۔ لیکن کرتا کیا۔ سارے مجمع کے سامنے جان کی امان دے چکا تھا۔ دانت پیس کر کہنے لگا "اچھا تو میری جان خطرے میں ہے؟ خیر میں تجھے قتل نہیں کروں گا لیکن تمام عمر اپنے قلعے میں بند رکھوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں تیرا تیر مجھے کس طرح چھوتا ہے"۔

سپاہیوں نے ٹل کو گرفتار کر لیا اور لے جا کر گیسلر کے جہاز پر ڈال دیا۔ ابھی جہاز پر سوار ہو کر گیسلر تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ جھیل میں بڑے زور کا طوفان آیا۔ بڑا ہی خوفناک طوفان تھا۔ ملاحوں نے بڑی کوشش کی مگر جہاز کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔ ظالم کو دوسرے کی جان کی پروا نہیں ہوتی۔ مگر اپنی جان بہت پیاری ہوتی ہے۔ گیسلر مارے خوف کے بے حال ہو گیا اور گھبرا کر ولیم ٹل کو باہر نکلوایا۔ اس کی ملاحی کی تعریف سن چکا تھا ــــ جہاز کو سنبھالنے کا حکم دیا۔

ٹل تو ایسے کتنے ہی طوفان دیکھے ہوئے تھا۔ فوراً جہاز کو راہ پر لے آیا اور اس کے رُخ کو دوسرے کنارے کی طرف پھیر دیا۔ اس وقت اس کے دماغ میں اپنی آزادی اور ملک کی آزادی کا خیال چکر لگا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں جہاز کو وہ ایک چٹان کے قریب لے آیا اور خود ایک چھلانگ میں چٹان کے اوپر۔ لوگ جب تک ہوشیار ہوں اور جہاز ٹکرانے سے بچائیں، وہ

بندر کی طرح تیزی سے پہاڑ پر چڑھ کر چھپ گیا۔ اس کے لئے یہ دن رات کا کھیل تھا۔ وہ تاک کر ایسی جگہ چھپا تھا کہ گیسلر کو، اگر بچ گیا، تو اسی راستے سے گذرنا پڑتا۔ اس نے تیر کو کمان پر چڑھا لیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی دیر میں کچھ لوگوں کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ ٹل اور بھی چھپ کر بیٹھ گیا۔ گیسلر مع اپنے ساتھیوں کے آ رہا تھا اور کہہ رہا تھا "اگر میں زندہ بچ گیا اور الٹ ڈورف واپس پہنچا تو قسم کھاتا ہوں کہ اس باغی کے سارے خاندان کا خاتمہ کر دوں گا۔ ٹل اس کی بیوی اور بچوں کو ایک ساتھ ہی قتل کروں گا"

ٹل نے اپنے جی میں کہا تو کبھی واپس نہ جائے گا اور ایسا تیر مارا کہ گیسلر وہیں گر کر مر گیا .... اس طرح سوئٹسان نے ایک بڑے ظالم سے نجات پائی۔ ولیم ٹل اس کے بعد باغیوں سے جا ملا۔ لوگوں کو ابھارتا رہا اور مضبوط بناتا رہا۔ آخرکار ان سب بہادروں نے مل کر آسٹریا والوں کو مار بھگایا اور ملک آزاد ہو گیا

تو صاحب یہ ہے ولیم ٹل کا قصہ۔ اب یہ تاریخی حیثیت سے کہاں تک صحیح ہے، اس کا بتانا بہت مشکل ہے لیکن یہ قصہ سوئٹسان والوں کے بچے بچے کی زبان پر ہے اور ولیم ٹل ان کا قومی ہیرو ہے۔ ہر جگہ اس کے یادگار مجسمے بنے ہوئے ہیں اور ہر جگہ اس کے ترانے گائے جاتے ہیں۔

ولیم ٹل کی کہانی سن چکے اب میری سنو کہ موٹر شہر کے شمالی طرف سے باہر نکلی اور جھیل کے کنارے کنارے مشرق کی سمت چلی۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ ایک چھوٹی سی عمارت نظر آئی۔ موٹر رک گئی۔ رہبر نے کہا اس جگہ ولیم ٹل نے گیسلر کا خاتمہ کیا تھا...... اُتر کر دیکھا تو واقعی اس واقعہ کو عمارت کی دیوار پر ایک نفیس تصویر کے ذریعے ظاہر کیا گیا تھا۔ گیسلر تیر کھا کر گر رہا ہے اور ولیم ٹل کمان لئے کھڑا ہے۔

ایک خوب صورت وادی

اسی طرح ہم چلتے چلتے زوگ نامی جھیل کے کنارے پہنچے۔ تھوڑی دیر اس کے کنارے کنارے چلے پھر جنوب کی جانب مڑے اور پھر جھیل لوسرن کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں پر جھیل دکھن کی طرف مڑ گئی ہے۔ اور منظر بے حد خوب صورت ہے یہاں

سڑک کے کنارے صنوبر کے درخت

پار پہاڑ پر ایک نہایت نفیس ہوٹل بنا ہوا ہے۔ رہبر نے کہا کہ ملکۂ وکٹوریہ اکثر اس میں ٹھیرا کرتی تھیں۔ ہم جھیل کے کنارے کنارے آگے بڑھتے گئے۔ یہاں پر سڑک پہاڑ کو بہت ہوشیاری کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ کہیں کہیں پر آبشار آ گئے تھے۔ تو اس خیال سے کہ پانی سے سڑک برباد نہ ہو جائے، آبشار کے نیچے سے سرنگ کاٹ کر سڑک نکال دی گئی۔ کہیں کہیں پر تو ایسا دلچسپ منظر ہوتا ہے کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ نیچے سڑک جا رہی ہے اور اوپر سے پانی کی چادر گر رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اللہ میاں نے سڑک پر سایہ کرنے کے لئے پانی کی چادر جاری کر دی ہے۔

جگہ جگہ پہاڑ کے پھسل پڑنے سے سڑک ٹوٹ گئی تھی، لیکن مرمت کر دی گئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے درخت اب بھی نظر آ رہے تھے۔ ایک زمانے میں اس ملک میں یہ پہاڑوں کا پھسلنا بہت غضب ڈھایا کرتا تھا۔ اکثر بے سان گمان پہاڑ کے بڑے بڑے ٹکڑے ٹوٹ کر پھسل جاتے اور بادل کی طرح گرجتے، راستے میں درختوں کو توڑتے اور جنگلوں کو روندتے ہوئے نیچے والوں پر اچانک آن پڑتے۔ ہزاروں جانیں اسی طرح برباد ہوئیں اور سینکڑوں بستیوں کا نام و نشان مٹ گیا۔ ایک جگہ ہم نے دیکھا کہ ایک پہاڑ کے نیچے بہت بڑی بڑی چٹانیں بکھری ہوئی ہیں۔ اور ان کے بیچ میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے درخت اگ آئے ہیں۔ رہبر نے کہا "یہ پہاڑ جو آپ لوگوں کو نظر آ رہا ہے کچھ سال پہلے اس سے زیادہ اونچا تھا اور اس کی شکل دوسری طرح کی تھی۔ اس کے نیچے ایک بہت بڑا گاؤں آباد تھا۔ ایک رات یک بیک اس

پہاڑ کی چوٹی پھسل کر گر پڑی اور گاؤں والے پھر کبھی نہ جاگے۔ ایسا دردناک واقعہ سوئستان میں کبھی نہ ہوا تھا۔ یہ جو پتھر بکھرے ہوئے ہیں، اسی کے نیچے گاؤں دب گیا۔"۔۔۔۔۔۔ یہ سُن کر بہت افسوس ہوا اور انسان مضبوط ہونے پر بھی کتنا کمزور ہے، اس کا احساس ہونے لگا۔۔۔۔۔۔ خیر جو ہونا تھا ہوگیا۔

لیکن لوگوں کو اس کی روک تھام کی فکر ہوئی۔ ملک کے بڑے بڑے سائنس داں پہاڑوں کے ماہر، جنگلوں کے ماہر ایک جگہ جمع ہوئے۔ سب نے اپنے اپنے تجربے بتائے اور بحث مباحثے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس پھسلن کو روکنے کے لئے درختوں سے مدد لینے کی رائے ٹھہری۔ تجربے سے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جن پہاڑوں پر کافی درخت ہوتے ہیں، وہ نہیں گرتے۔ وجہ یہ ہے کہ درختوں کی جڑیں مٹی اور پتھر کو تھامے رہتی ہیں۔ اس لئے اب حکومت نے حکم دے دیا کہ درخت بالکل نہ کاٹے جائیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اب اس قسم کے حادثے بہت کم ہوگئے ہیں۔ ہمارے ہندوستان میں شملے کے قریب اکثر پہاڑ پھسل جایا کرتے ہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ یہ چیز ایسی عام نہیں ہے۔

موٹر آگے بڑھتی گئی۔ سیدھے ہاتھ کو بہت نیچے فیروزی رنگ کی جھیل، اُلٹے ہاتھ کو اونچا پہاڑ، سامنے وادیاں اور بہت دور برف سے ڈھکی ہوئی اجلی اجلی چوٹیاں، ایسا خوب صورت منظر تھا کہ میں تم سے اچھی طرح بیان نہیں کرسکتا۔ اس کے لئے تو عبدالحلیم شرر اور محمد حسین آزاد کا قلم ہو تب تمھیں کچھ مزا آئے۔

میں نے دل میں دعا کی کہ یا اللہ بس نوکری

ایک دل فریب منظر

کے جھنجھٹ میں نہ پڑوں اور دن رات اسی طرح گھومتا پھرتا رہوں۔ مگر اللہ میاں ہم سے بہتر جانتے ہیں، ہماری دعا قبول نہ ہوئی۔

چل ہی رہے تھے کہ ایک جگہ چند کُتے پنجروں میں بند نظر آئے۔ رہبر نے موٹر رکوائی اور کہنے لگا

"یہ مشہور سینٹ برنارڈ کتے ہیں، اس جگہ پر رکھے
اور پالے جاتے ہیں" اور ایک چھوٹے سے بچے
کی طرف اشارہ کرکے کہنے لگا "اس کی قیمت سَتّر
پونڈ (تقریباً ۹۰۰ روپے) ہے۔ بڑا ہوگا تو قیمت
اور زیادہ ہو جائے گی۔"

اس دریا نے کروڑوں برس کی محنت سے اس
پہاڑ میں گہری گھاٹی بنائی ہے۔

میں نے پوچھا "انھیں خریدتا کون ہے؟"
رہبر نے جواب دیا "حکومت خریدتی ہے"
کچھ اپنے پاس رکھتی ہے، کچھ سینٹ برنارڈ کے راہبوں
کو دے دیتی ہے۔"
کیوں بھئی تمھیں تعجب تو ضرور ہوگا کہ ایک کتے
کی قیمت ہزار روپے!! اس کے کیا معنی؟ بات یہ ہے
کہ یہ کتے بڑے کام کے ہوتے ہیں۔........

سوئٹسان اور اطالیہ کے درمیان الپس نامی
ایک بہت اونچا پہاڑ ہے۔ اس میں صرف چند ہی
درّے ایسے ہیں جن سے ایک ملک سے دوسرے
ملک کو آیا جایا جا سکتا ہے۔ ایک درّے کا نام درہ سینٹ
برنارڈ ہے۔ برنارڈ کوئی عیسائی بزرگ تھے۔ انھی
کے نام پر ہے۔ درّے پر ایک خانقاہ بھی ہے
جہاں عیسائی راہب رہا کرتے ہیں اور وہیں یہ کتے
بھی رہا کرتے ہیں۔ سردیوں میں یہ درّہ برف سے
ڈھک جاتا ہے، اور رات دن برفانی آندھیاں
چلا کرتی ہیں اور آمدورفت مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر
بھی ضرورت والوں کو آنا ہی پڑتا ہے۔ ان میں سے
بعض بدقسمت برف سے پھسل کر جان دے دیتے
ہیں۔ بعض بُری طرح زخمی ہو جاتے ہیں۔ بعض سردی
کے مارے اکڑ جاتے ہیں۔ اور بعض طوفان سے
نڈھال ہو کر گر جاتے ہیں اور برف سے دب
جاتے ہیں۔ ایسے موسم میں یہ کتے اِدھر اُدھر
درّے میں پھرا کرتے ہیں۔ ان کے گلے میں ایک
بوتل شراب کی بندھی رہتی ہے۔ اگر کوئی انسان برف
کے نیچے دبا ہوا ہو تو انھیں فوراً پتہ چل جاتا ہے۔
کھود کر نکال لیتے ہیں۔ اس کے منہ کو چاٹ کر
گرم کرتے ہیں۔ اگر ہوش میں آ جاتا ہے تو شراب

پی لیتا ہے۔ کچھ قوت آجاتی ہے۔ انھی کتوں کے ذریعے راہبوں کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ زخمیوں، مردہ یا بے ہوش لوگوں کو اٹھاکر اپنی خانقاہ میں لے جاتے ہیں اور اُن کا علاج معالجہ کرتے ہیں۔ ------ کیوں صاحب اب کیا کہتے ہو؟ کیا کتوں کی قیمت زیادہ ہے؟۔

تھوڑی دیر میں جھیل پیچھے چھوٹ گئی۔ اور ہم الٹ ڈورف پہنچ گئے۔ وہی الٹ ڈورف جس کا ذکر ولیم ٹل کے بیان میں آچکا ہے۔ ہماری موٹر ایک جگہ رکی اور رہبر نے کہا "یہی وہ جگہ ہے جہاں ولیم ٹل نے اپنے بیٹے کے سر پر سیب کاٹ ڈالا تھا" ------ سامنے ایک مجسمہ بنا ہوا تھا ولیم ٹل اپنے بیٹے کو لئے کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے لقاشی کے ذریعے اس کے گاؤں کا منظر پیش کیا گیا تھا۔ رہبر نے بتایا کہ آگے چل کر اس کا گاؤں بھی نظر آئے گا۔ موٹر آگے بڑھی۔ الٹ ڈورف پیچھے چھوٹ گیا۔ ایک وادی آئی وہ بھی گذر گئی اور سڑک بلند ہونے لگی۔ سامنے اونچا پہاڑ تھا۔ لیکن کہیں پر درہ نظر نہ آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا، اب تو سامنے کچھ راستہ نظر نہیں آتا۔ واپس لوٹنا ہوگا، لیکن موٹر ہے کہ چلی جارہی ہے۔ اب سڑک بہت ڈھلوان ہوگئی تھی اور موٹر کو بہت زور کرنا پڑ رہا تھا۔ سامنے جو دیکھتے ہیں تو سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پہاڑ کی بلندی پر چلی گئی ہے۔ ہم سے آگے اونچائی پر بہت سی موٹریں جارہی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ چیونٹیاں

درۂ فرکا کے قریب پہاڑ پر
ایک گاؤں کے چند مکانات

رینگ رہی ہیں۔ ہمارے پیچھے بھی بہت سی موٹریں تھیں۔ ہماری رفتار بہت آہستہ تھی تقریباً ڈیڑھ بجے ہم پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے۔ ہمیں بتایا گیا کہ پہاڑ کی چوٹی نہیں ہے بلکہ ایک درہ ہے اس کا نام درہ فرکا ہے۔ یہ درہ سوئٹزرلینڈ میں غالباً سب سے اونچا درہ ہے

گرمی کا موسم ہونے کے باوجود یہاں پر ابھی تک برف موجود تھی اور بہت کافی ٹھنڈک تھی۔ یہاں ایک ہوٹل بھی موجود تھا۔ چھ مہینے یہ ہوٹل برف سے ڈھکا رہتا ہے اور یہاں کوئی آ جا نہیں سکتا۔ گرمی جب رہتی ہے تو یہ ہوٹل کھلتا ہے اور سیاحوں کے لئے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام ہوتا ہے۔

آج دن اتنا صاف تھا اور سورج ایسا چمک رہا تھا کہ بڑی دور دور کی چیزیں صاف معلوم ہو رہی تھیں۔ ایک امریکی کہنے لگا کہ "میں یہاں تین بار آچکا ہوں۔ لیکن ایسا صاف شفاف اور سہاؤنا دن کبھی نہ دیکھا۔ کبھی تو بادل چھائے رہتے تھے اور کبھی کہر"۔ میں نے دل میں کہا یہ اس فقیر کی برکت ہے۔

فرکا پر موٹر رکی تو لوگ ہوٹل میں کھانے کے لئے گھس گئے۔ پہاڑی ہوا سے بھوک کو بڑی محبت ہے۔ اِدھر ہوا لگی، اُدھر بھوک صاحبہ حاضر۔ اور کھانا کھائے کچھ دیر نہیں ہوتی کہ پھر حاضر۔ غرض کہ اس وقت ہم بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے

میں تو اپنا کھانا ساتھ ہی لایا تھا۔ لفافے کو بغل میں دبا ایک طرف چلا کہ پہاڑ پر کسی جگہ بیٹھ کر کھاؤں گا۔ ایک آسٹریلیا کا رہنے والا شخص میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں ایک برفانی چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر کی گپ کرتے رہے اور کھانا اُڑاتے رہے۔ اس کے بعد برف کے چشمے کا پانی پیا۔ پانی زیادہ مزے دار نہ تھا مگر بے حد ٹھنڈا تھا۔ اتنا ٹھنڈا کہ پینا مشکل تھا۔ بعد میں جب ہمارے رہبر نے یہ سُنا کہ ہم نے برفانی چشمے کا پانی پیا ہے تو اس نے وہ ڈانٹ بتائی کہ آیندہ کے لئے توبہ کرتے ہی بنی۔ کہنے لگا کہ فوراً زکام ہو جائے گا اور اس کے بعد انفلوئنزا پھر نمونیہ اور پھر..........

جب سب لوگ کھانے دانے سے فارغ ہوگئے تو موٹر آگے بڑھی۔ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ ایک بڑا گلیشیر یعنی برف کا دریا نظر آیا

رون گلیشیر
برف کے پگھلنے سے جو چھوٹا سا نالا نکلا ہے یہیں سے رون دریا شروع ہوتا ہے۔

گلیشیر تو تم لوگ جانتے ہی ہو گئے۔ جن پہاڑوں پر برف جمی ہوتی ہے اُن میں کہیں کہیں سے برف آہستہ آہستہ نیچے کی طرف کھسکتی رہتی ہے، اس کی رفتار بہت آہستہ ہوتی ہے۔ دن بھر میں بس ایک آدھ فٹ۔ اسی طرح چلتے چلتے یہ گلیشیر پہاڑ کے نیچے پہنچ جاتا ہے اور برف پگھلنے لگتی ہے چھوٹا سا چشمہ جاری ہو جاتا ہے اور آگے بڑھ کر ایک چھوٹی سی ندی بن جاتا ہے۔ یہ ندی اور آگے بڑھتی ہے اس میں دوسری چھوٹی بڑی ندیاں آکر ملتی ہیں اور اس طرح دریا بن کر یہ سارا پانی سمندر میں جا گرتا ہے .... اسی طرح دنیا کے بہت بڑے بڑے دریا نکلے ہیں۔ ہمارے دیس کے گنگا جمنا بھی ہمالیہ پہاڑ کے گلیشیر دل سے ہی نکلے ہیں۔

جس گلیشیر کے نزدیک ہم پہنچے، اس کا نام رون گلیشیر ہے۔ اس سے یورپ کا مشہور رون دریا نکلتا ہے۔ جہاں پر درّہ فر کا ختم ہوتا ہے اور پہاڑوں کے دوسری طرف اتار شروع ہوتا ہے یہیں پر یہ گلیشیر بھی وادی میں گرتا ہے۔ جہاں پر برف ختم ہوتی ہے اور پانی شروع ہوتا ہے وہاں پر اس پانی کی چوڑائی دس بارہ گز سے بھی کم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چھوٹا سا نالہ ہے۔ اگر تم اس دریا کو کچھ دور آگے بڑھ کر جینوا کی جھیل میں گرتا ہوا یا اس سے نکلتا ہوا دیکھو تو تمھیں ہرگز یقین نہ ہو کہ یہ وہی ننھا نالا ہے۔

خیر تو یہ ٹھیری کہ اس گلیشیر کو خوب اچھی طرح دیکھا بھالا جائے۔ گلیشیر کے اندر برف کو کاٹ کر ایک سرنگ بنادی گئی تھی۔ ہم لوگ ٹکٹ لے کر اس کے اندر گھس گئے۔ اندر بہت ٹھنڈک تھی۔ اور اوپر سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ اس وجہ سے تمام سرنگ ایک سبزی مائل روشنی سے منوّر معلوم ہو رہی تھی۔ اندر سب لوگ سبز ہی سبز نظر آ رہے تھے۔ اوپر نیچے ہر طرف برف کے حرکت کرنے کی کچھ کچھ آواز آ رہی تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں گلیشیر کی رفتار دن بھر میں ایک آدھ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی، پھر بھی یہ خفیف حرکت آواز پیدا کرنے کے لئے کافی تھی، اور رہ رہ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری سرنگ بیٹھ جائے گی۔ یہ خیال کہ ہم برف کے دریا میں غوطہ مار رہے ہیں اور گو آہستہ ہی سہی لیکن یقینی طور پر پہاڑ کی چوٹی سے نیچے کی طرف کھسک رہے ہیں، کافی دہشت انگیز تھا۔

یہاں سے ہماری سڑک نیچے اُترنے لگی اور سامنے وادی میں گلیشیر کا بچہ رون دریا بہتا ہوا نظر آیا۔ ہم لوگ تھوڑی دور دریا کے ساتھ ساتھ گئے پھر شمال کی طرف مڑ گئے۔ معلوم نہیں تم نے ابھی تک اس سفر کے سمتوں کا خیال رکھا یا نہیں۔ یہ بہت ضروری چیز ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ لوسرن سے ہم پورب

کی طرف جھیل کے کنارے کنارے چلے۔ کچھ دور بعد
جھیل دکھن سمت مڑ گئی۔ ہم اس کے کنارے کنارے
چلتے گئے۔ جھیل چھوٹ گئی پھر الٹ دورف ملا۔ ہم لوگ
اس کے آگے کافی دور تک گئے۔ پھر درۂ فرکا پر
چڑھنے کے لئے پچھم سمت کو گئے۔ اب فرکا پرت اترنے

ایک خوب صورت آبشار

کے بعد کچھ دور ہم لوگ پچھم سمت ہی گئے پھر اُتر کی طرف مڑ گئے
راستے میں پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت جگہیں
ملیں۔ ایک آبشار اتنا خوب صورت نظر آیا کہ دل
لوٹ پوٹ ہو گیا۔ میں نے بہت احتیاط سے اس
کے اوپر کے حصے کی تصویر لی۔ سارے آبشار کی
تصور لینا ممکن نہ تھا کیونکہ پانی سینکڑوں فیٹ نیچے گرتا
تھا اور کافی پیچھے ہٹنے کی جگہ نہ تھی۔

راستے میں ایک عجیب و غریب دریا نظر آیا۔ یہ
دریا اب سے کروروں سال پہلے ایک پہاڑ کے اوپر
بہتا تھا۔ اس وقت آدم علیہ السلام دنیا میں تک
بھی نہ تھے۔ جب دریا کہیں پر بہتا ہے تو نیچے کی ریت
مٹی وغیرہ کو ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔ اور زمین گہری
ہوتی چلی جاتی ہے، اور جہاں پر دریا سمندر میں گرتا ہے
زمین بھرتی جاتی ہے۔ جس دریا کا میں ذکر کر رہا ہوں اس
نے بھی ایسا ہی کیا۔ اور پتھر اور مٹی کو کاٹتے کاٹتے،
کاٹتے کاٹتے، اپنے لئے ایک نہایت ہی گہرا اور تنگ
راستہ بنا لیا ہے اور اس میں بڑے زور و شور سے بہتا
ہے۔ جو گھاٹی اس نے کاٹ کر بنائی ہے وہ اس قدر
تنگ ہے کہ کہیں کہیں پر دونوں دیواروں کو ہاتھ
بڑھا کر چھو سکتے ہیں۔ اور یہ دیواریں اس قدر اونچی
ہیں کہ نیچے پورے طور سے روشنی بھی نہیں جاتی۔ اور
آسمان کو دیکھنے کے لئے ٹوپی سنبھالنی پڑتی ہے۔

سیاحوں کے لئے پانی سے کچھ اوپر لکڑی
کے تختے لگا دئے گئے ہیں۔ اور ایک پتلا چھجا سا بن
گیا ہے۔ داخلے کے لئے ٹکٹ کی ضرورت پڑتی ہے
میں ٹکٹ لے کر اندر گیا اور ندی کے ساتھ ساتھ چل کر
پہاڑ کے دوسری طرف نکل گیا۔ موٹر چکر کاٹ کر
ادھر آ گئی تھی اور پہلے ہی سے کھڑی تھی۔ ہم لوگ

موٹر پر بیٹھ گئے اور لوسرن کی طرف روانہ ہوئے۔ اور مغرب کے بعد ڈھائی سو میل کا چکر لگا کر مغرب سے شہر میں داخل ہوئے۔

لو صاحب آج کا قصہ تو ختم ہوا۔ سر دست خدا حافظ۔ پھر کبھی ملیں گے ۔

میاں بدھو
(۱) ایک تھے میاں بدھو
جا رہے تھے میلے
(۲) رستے میں ملے کلو
موٹے کیلے والے
(۳) بولے میاں بدھو
کھلاؤ ہمیں کیلا
(۴) بولے میاں کلو
دکھاؤ ہمیں پیسا
(۵) بولے میاں بدھو
نہیں ایک پائی
(۶) بولے موٹے کلو
تو جاؤ میلے بھائی
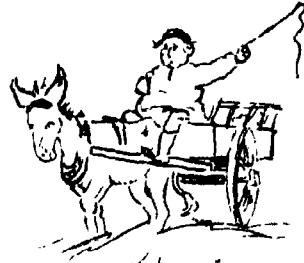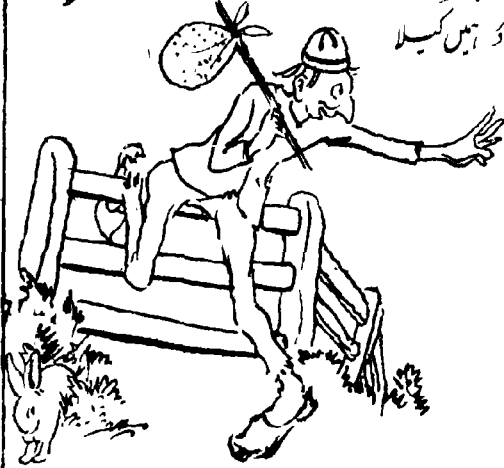
دعوت

حضرت مولانا سید شرف الدین صاحب مرحوم سابق استاد جامعہ

پساؤ بیسن دہی منگاؤ ۔ کڑھی پکاؤ ہمیں کھلاؤ۔
یہ سب ہے حاضر
جلاؤ چولھا۔ چڑھاؤ ہانڈی ۔ چڑھا بھی دی آنچ اب لگاؤ
وہ کھد بدائی اُبھان آیا ۔ چلاؤ ڈوئی لگاؤ چھینٹا۔
اُتارو بس بس یہ پک چکی اب
اب گڑ میں آٹا گھولو۔ اور گلگلے پکاؤ، گڑ کے نہیں میاں جی ۔ ہاں گھی شکر کے کھنے
میدے کے اور دہی کے ۔ شیرے کے گلگلے ہوں۔ کچھ پھلکیاں بھی پکیں اور کچھ دہی بڑے ہوں
آیا چڑھی کڑھائی۔
بیسن گھولو۔ زیرا ملاؤ ۔ پیاز اور پودینہ کترو۔ خوب ملاؤ۔
متھو اور پھینٹو۔ ہو گیا تیل اب جھٹ سے نکالو ۔ تاؤ کہیں نہ مارا جائے
جلدی سے اک گھائی اتارو ۔ پھلکیاں لے کر کڑھی میں ڈالو
پیاز اور زیرا داغ کر دو اب ۔ اب خوب مزے کا بگھار لگاؤ
بس بس اب جلدی سے بگھارو۔ ارے ارے۔ وہ چھن۔ آہا ہا ہا۔

زِندگی کی گھڑی

حامد حسین صاحب متعلم جامعہ

اس تصویر میں ایک گھڑی دنیا کی زندگی کی بنائی گئی ہے۔ اگر ہم دنیا کو چوبیس گھنٹے پرانا مان لیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ زندگی کا پہلا خاکہ ایک ایک دن ہے اور اس سے پہلے کا عرصہ ایک رات ہوئی۔ اس طرح ہم زمانے کو دنیا کی بے زندگی والی رات اور زندگی والے دن میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

یہ گھڑی دنیا کے دنوں کے چوبیس گھنٹے دکھاتی ہے اور ہر گھنٹہ تقریباً ۳۰...... برس ظاہر کرتا ہے

زندہ مخلوق کی پیدائش کے لحاظ سے مختلف حلقوں میں ان کی تصویریں ہیں۔ اس کو مخلوق کے زندہ رہنے کا زمانہ سمجھنا۔

پہلے دو گھنٹوں میں سمندر میں چھوٹے چھوٹے کیڑے کھپرے والی مچھلی اور (TR!LD BITES) پیدا ہوئے۔
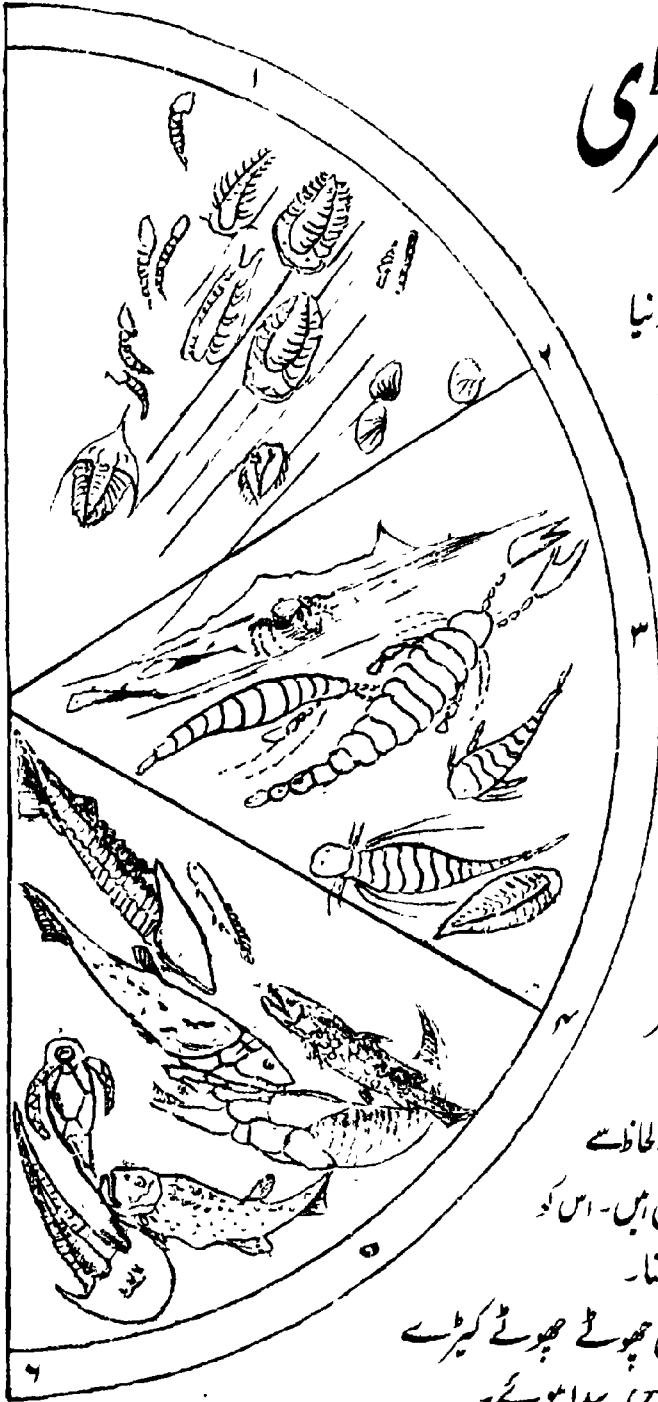
دوسرے اور تیسرے گھنٹے میں سمندری بچھو بڑے جھینگوں کی طرح بڑھے۔ تیسرے اور چوتھے میں مچھلی جس کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی تھی پیدا ہوئی اور دنیا میں ریڑھ کی ہڈی وجود میں آئی۔

چار سے چھ تک ایسی مچھلیاں بڑھیں جن میں ایک دوسرے سے لڑنے کے لئے قدرتی طور پر ہتھیار کی سی چیز جسم میں ہوتی تھی۔ یہ مچھلیاں بڑے بڑے جھینگوں سے لڑتی تھیں۔ ریڑھ کی ہڈی نے پہلی دفعہ تمام چیزوں پر فتح پائی۔

چھ سے آٹھ تک عظیم الشان درخت پیدا ہوئے۔ کوئلے کی کانیں حقیقت میں جنگل تھے۔ یہ درخت اس قدر دل کش تھے کہ انھوں نے زندہ چیزوں کو ساحلوں پر متوجہ کیا۔ یہ دور جل تھلی کہلاتا ہے جس میں خشکی اور تری کے جانور پیدا ہوئے اور اُن کے ہاتھ پیر نکلے۔

آٹھ سے نو تک سمندری چھپکلی کا زمانہ تھا۔

نو سے دس تک رینگنے والے جان دار برچھے (STEGOSAUR اور BANTOSAUA) جنگلوں میں پھرنے لگے۔ اُڑنے والے اژدہے وجود میں آئے۔

دس سے گیارہ تک کھریا (مٹی) کا زمانہ تھا جب کہ سمندر میں کھریا

کی سطح پیدا ہوئی۔ رینگنے والے جانور انسان اور حیوان کی ملی جلی بے ڈھنگی اور خوفناک شکل میں تبدیل ہوگئے۔ پہلے اُڑنے والا جان دار پیدا ہوا جس کے بڑے بڑے پنجے اور دانت تھے۔ دس اور گیارہ کے وسط میں دودھ پلانے والے جانور بھی بڑھے ایک قسم کا تھیلی دار دودھ پلانے والا جانور جو پانی میں یا درختوں پر رہتا تھا اور ایک مہیب رینگنے والا جانور پیدا ہوئے۔

گیارہ سے بارہ تک تیسرا جگ (زمین کی ساخت کا زمانہ ہے۔ جس کے آخر میں ہم رہتے ہیں۔ اس زمانے میں دودھ پلانے والے جانور بڑھ گئے اور مہیب رینگنے والے ناپید ہوگئے۔ اس زمانے کے شروع میں ایک عظیم الجثہ سونڈ دار چوپایہ چار لمبے نوکیلے دانتوں والا (MUSTDON) اور چھ سینگوں والا (TINOCERAS) ایسے شیر سے لڑا جس کے دانت خم دار ہوتے تھے۔ شاید ساڑھے گیارہ کے لگ بھگ ڈغاسکر کے بندر کی قسم کا ایک دودھ پلانے والا شب رو جانور کی طرح جان دار بندروں میں تبدیل ہو گیا۔ اور بعد میں یہی بوزنہ بن گیا پھر شاید گھنٹے کے آخری حصے کے چوتھائی کے آدھے میں انسان وجود میں آیا۔

وہ زمانہ کروڑہا سال پہلے کا ہوگا۔ ہم نہیں جانتے۔ انسان کی لکھی ہوئی تاریخ........ پتھروں اور چٹانوں پر یا پھر پیپرس (نرسل) کے بنے ہوئے ورق جن پر قدیم مصری لکھا کرتے تھے۔ دس ہزار (۱۰۰۰۰) برس کے ہیں

(تلخیص)

سید سبط نبی صاحب نقوی - ایم ایس سی (علیگ)

پیاری بہن آج تیسرے پہر کی گاڑی سے میرے پاس آئی ہیں۔ شام کو ہم سب بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے پچھلے سال جو تصویریں کھینچی تھیں ان کے البم کا ذکر کیا۔ انھوں نے بڑے شوق سے کہا " دکھاؤ" کتابوں کی الماری پاس ہی رکھی تھی۔ میں اس الماری میں سے البم نکال لایا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ پیاری بہن میرے پاس بیٹھ گئیں، اور ان کے بچوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہم سب اس البم کی تصویروں کے دیکھتے ہی اس قدر محو ہوئے کہ دنیا و ما فیہا کی خبر نہ رہی۔ آخر ہم ایک بہت ہی دلچسپ تصویر پر پہنچے۔ اس کو دیکھتے ہی پرانے واقعات میری آنکھوں کے سامنے پھر گئے، اور پیاری بہن کو اس تصویر کے کھینچنے کے حالات سنانے لگا۔

میں نے کہا کہ گذشتہ مئی میں جب میں کراچی سے کلکتے کو ہوائی جہاز سے جا رہا تھا تو گیا کے قریب پہنچ کر یہ تصویر کھینچی تھی۔ جب ہم الہ آباد پہنچے تو معلوم ہوا کہ کلکتے سے جو بیانات (آب ہوا) کے محکمے نے الہ آباد اور کلکتے کے ہوائی راستے کے متعلق جو نیوز میٹ (NEWSMET) (موسمی حالت کی وہ پیش بینی جو آب و ہوا کے محکمے کی طرف سے روز صبح و شام کی جاتی ہے) براڈ کاسٹ کیا ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ "کہیں کہیں پر بجلی کے طوفان پیدا ہونے کا امکان ہے بعض جگہ آندھی کی وجہ سے حد نظر (VISIBILITY) بہت کم ہو جائے گی اور درمیانی علاقے پر بالائی ہوائیں پر زور ہوں گی۔"

ہم امپیریل ایرویز کے ایک بڑے ہوائی جہاز میں سفر کر رہے تھے اس لئے معمولی طوفان کے امکان سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اور حد نظر کے بہت کم ہو جانے پر مشاق ہوا بازوں کے لئے تھوڑی دیر تک اڑتے رہنا کچھ مشکل نہیں۔ اس لئے ہمارے جہاز کے اڑان کے اوقات وہی رہے۔ مجھے بجلی کے طوفان کے اندر گھس کر اس کی اندرونی حالت معلوم کرنے کا مدتوں سے شوق تھا اور موقع ملنے پر میں تڑپتی اور چمکتی ہوئی بجلیوں اور بخارات کے ان اٹھتے بڑھتے

اور پھیلتے ہوئے پہاڑوں کی تصویر بھی کھینچنا چاہتا تھا
جن کے گہرے غاروں میں سبک رو بجلیوں کی آہٹ بھی
دل ہلا دینے والی گرج میں تبدیل ہو جاتی ہے نیوز میٹ
دیکھنے کے بعد مجھے اپنی اس دیرینہ آرزو کے پورا
ہونے کی امید سی پیدا ہو گئی

ابھی الہ آباد چھوڑے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں
ہوا تھا کہ وائرلیس آپریٹر نے ایک چھوٹا سا پیغام ہوائی جہاز
چلانے والے ہوا باز کو دیا۔ اس کے پاتے ہی ہوا باز
ہوش باختہ سا ہو گیا اور آگ کی طرح اس کی خبر ہم تک بھی
پہنچ گئی۔ میرے تمام ہم سفر گھبرا گئے لیکن میں نے اپنے
حواس قائم رکھنے کی کوشش کی اور فوراً ہوا باز سے
دریافت کیا۔ آخر ایسی وحشتناک خبر کیا موصول ہوئی
ہے اور کہاں سے۔ اس نے مجھے ایک چھوٹا سا پرچہ
دیا اس پر دو انگریزی لفظ ڈینمیٹ (DANMET)
اور گیا (GAYA) اور تین پانچ پانچ اعداد کے
مجموعے لکھے تھے۔ یہ پیغام آندھی سے خطرے کا تھا
اور گیا کی موسمی مشاہدہ گاہ سے آیا تھا۔ اس پیغام کو
وصول ہوئے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ایک ویسا
ہی دوسرا پیغام وصول ہوا جس میں گیا کے قریب بجلی
کے طوفان سے خطرے کا اور اضافہ کیا گیا تھا اس
خبر کو سن کر مجھے بھی سب کے ساتھ گھبراہٹ تو ضرور
ہوئی لیکن اپنی چھپی ہوئی آرزو کے پورا ہونے کی خوشی
بھی پیدا ہو گئی۔ اور میں کھڑکی کے قریب اپنا کیمرہ لے کر
تیار ہو بیٹھا کہ جوں ہی موقع ملے بجلی کے طوفان کی
بالکل قریب سے تصویر لے لوں

ہم تھوڑی ہی دور اور اڑے ہوں گے کہ ہوا
کی رفتار میں تیزی شروع ہو گئی۔ اس کے جھکڑوں
کا اندازہ ہمیں جہاز کے ہچکولوں سے ہو رہا تھا۔ ہوا
خاک سے اٹی ہوئی تھی۔ ابھی تک ہم ایک ایسی دنیا پر
اڑتے ہوئے آئے تھے۔ جس میں شہر، قصبے، گاؤں
باغ، کھیت، دریا، پہاڑیاں اور جنگل اپنی گوناگوں
رنگینیوں کے ساتھ ہمارے نیچے نکلتے چلے جا رہے تھے
اور اوپر نیلا آسمان تھا۔ کبھی ہم بادلوں کی دنیا میں
پہنچ جاتے تھے اور ان کی بناوٹ کی نیرنگیاں ہمیں
محوِ حیرت بنا دیتی تھیں۔ ان کی بھی کئی تصویریں آپ
اس البم میں دیکھیں گے لیکن اب ہم ایک ایسی خاک
آلود ہوا کی دنیا میں پہنچ گئے تھے جہاں چاروں طرف
زردی مائل مٹیلے رنگ کے سوا کچھ اور نظر ہی نہ
آتا تھا۔ اس فضا سے طبیعت اکتانا شروع ہوئی تھی
کہ ایک ساتھ ایسا معلوم ہوا کہ ہمارا سبک رو ہوائی جہاز
ہوا سے اتر کر کسی بڑی سخت خراب سڑک پر پہنچ گیا
ہے کہیں پر ہوا کی اوپر کو اٹھتی ہوئی رو ہوائی جہاز
کو اپنے ساتھ اوپر اٹھا کر لے جاتی تھی اور دوسرے قدم
پر نیچے آنے والی رو ایک سخت جھٹکے کے ساتھ لے

نیچے دھکیل دیتی تھی۔ غرض ہم سب جانسوں کی طرح ہوائی جہاز کے اندر اچھل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک کوہستان میں پہنچ گئے ہیں جہاں چاروں طرف سر بفلک پہاڑ ہمیں گھیرے ہوئے ہیں اور جہاں کی ہیبت ناک فضا سے ڈر کر سورج نے بھی اپنا منہ چھپا لیا ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اور اب ہم بجلی کے طوفان میں پہنچ گئے تھے۔

وائرلیس آپریٹر نے ایریل کا تار جو جہاز سے باہر لٹک رہا تھا فوراً اندر گھسیٹ لیا کیونکہ اس کے باہر رہنے سے یہ اندیشہ تھا کہ بادلوں کی بجلی سے جہاز میں آگ نہ لگ جائے۔ ہواباز نے پہلے یہ کوشش کی کہ وہ ادھر ادھر کو راستہ کترا کر طوفان سے باہر نکل جائے۔ میں نے بھی اس دوران میں تین چار تصویریں کھینچیں۔ لیکن یہ تصویر تھوڑی دیر بعد کی ہے۔ ہر طرف راستہ بند معلوم ہوتا تھا۔ ہم بادلوں کی بھول بھلیوں میں پھنس گئے تھے کسی طرف بھی اُن کا سلسلہ ختم ہوتا ہوا دکھائی نہ دیتا تھا۔ مجبور ہو کر ہواباز نے چاہا کہ اونچا اُڑ کر ان بادلوں کے اوپر پہنچ جائے اس کے کمرے میں ایک گھڑی سی لگی ہوئی تھی جس سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ ہوائی جہاز کس اونچائی پر اُڑ رہا ہے۔ اس کو بلندی پیما "(ALTIMETER)" کہتے ہیں۔ اس آلے کے ذریعے ہمیں معلوم ہوا کہ سطح سمندر سے بارہ ہزار فٹ اونچے پہنچ جانے کے باوجود ہم اس طوفان کے اوپر نہ پہنچ سکے۔ اب سوائے اس کے چارہ کار ہی نہ تھا کہ طوفان کے بیچ میں سے سیدھا اُڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی جائے۔ ہواباز اس تگ و دو میں لگے ہوئے تھے اور میں اس طوفان کے مشاہدے میں۔

وہ ہوا جس کو ہم اپنی مٹھی میں بند کر لیتے ہیں جس کو ہم ہر وقت اس طرح چرتے پھاڑتے پھرتے ہیں کہ جیسے کچھ ہے ہی نہیں، جو گرمی کی سہانی صبح کو اپنی سبک خرامی سے تھپکیاں دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس وقت اپنے جھکڑوں کے ذریعے سے یہ کہتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی کہ اے کمزور اور حقیر انسان! تو چاہتا ہے کہ ان دھات کی بنی ہوئی بے جان کلوں سے حرکت کرنے والی چیزوں کے بل پر مجھ پر حکومت کرے۔ آ، آج میرے ہی سبک ساخت آبی بنے ہوئے قلعوں کے اندر مجھ سے مقابلہ کر۔ گھاس کے وہ چھوٹے چھوٹے تنکے جن کو ہم اپنی انگلیوں سے مل ڈالتے ہیں اس وقت اس تیزی سے حرکت کر رہے تھے کہ جب ہمارے جہاز کے قریب سے گذرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ رام چندر جی کی دھنش سے پھینکا ہوا تیر جا رہا ہے۔ اور جب وہ جہاز کے نازک حصوں سے ٹکراتے تھے تو ان میں چھد جاتے تھے۔ آپنے گرمی کے دنوں میں کاغذ کے پرزوں اور گھاس کے تنکوں کو

ہوا میں اڑتے دیکھا ہوگا۔ اسوقت ہوا کے جھکڑوں میں ہمارا ہوائی جہاز، ان کاغذ کے پرزوں اور گھاس کے تنکوں سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا وہ ہوا باز کے قابو سے باہر تھا اور بس خدا کے رحم پر گرم و سرد ہواؤں اور پانی کے بخارات کے پیدا کئے ہوئے طوفان میں ہچکولے کھا رہا تھا۔ ہم اس وقت وید کے زمانے کے دیو اور اندر دیوتاؤں کی لڑائی کے ڈراؤنے منظر کو بہت قریب سے دیکھ رہے تھے۔

بجلیاں جو دور سے صرف بے قراری کے پیکر معلوم ہوتی ہیں، اس وقت ہمارے چاروں طرف اس طرح تڑپ رہی تھیں، جیسے اندھیری رات میں کوئی سانپوں سے بھرے ہوئے کھیت میں پہنچ گیا ہو اور وہ سانپ اس کو چاروں طرف سے لپٹ گئے ہوں۔

وہ بادل جو دور سے صرف ہیبت ناک دیو یا اونچے پہاڑوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں اس وقت ہمارے سامنے بڑے بڑے ستونوں کی طرح ایسے اٹھ رہے تھے جیسے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھونس کے ڈھیر رکھے ہوں اور اُن میں کسی نے آگ لگادی ہو، اور ان میں سے دھوئیں کے ستون اٹھ رہے ہوں۔ اس میں جگہ جگہ پر بجلیاں ایسی روشنی کردیتی تھیں جیسے دھوئیں کے ستونوں میں آگ کے شعلوں کی زبانیں اٹھ آتی ہوں۔ جب ہمارا جہاز اونچائی کا رُخ کرکے طوفان سے باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو ہم نے بادلوں کی ایسی منزلیں دیکھیں جنھیں ہم زمین پر کھڑے ہو کر کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ سب سے پہلے بادل ایک بہت بڑے ستون کی طرح اُٹھتا تھا، ذرا اوپر جاکر وہ چھتری کی طرح پھیل جاتا تھا اور ایک ایسے روئی کے پہاڑ کی طرح اونچا اٹھتا چلا جاتا تھا جو زور شور سے دھنکی جارہی ہو اور جس کے ہر ہر حصے میں تلاطم مچا ہوا ہو۔ وہ تلاطم قدم قدم بے قرار بجلیوں کی صورت میں ظاہر ہوجاتا تھا بہت کافی اونچائی پر پہنچ کر یہ پہاڑ ختم ہوجاتا تھا لیکن اس کے اوپر کہیں سے ایک اور ستون اُٹھتا معلوم ہوتا تھا اور وہ تمام اُن مدارج سے گذرتا ہوا جن سے کہ اُن کے نیچے والا بادل گذرا تھا، پھر ایک بے قرار کل پہاڑ بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہوجاتا تھا۔ ان بادلوں کی منزلوں کے درمیان ہم نے چھوٹے اور بڑے قطرے کہیں پر گرتے اور کہیں پر اُچھلتے ہوئے دیکھے۔ جب ہم بہت زیادہ اونچائی پر پہنچ گئے تو ہم نے اولوں کو بنتے اور گرتے ہوئے دیکھا، کہیں کہیں پر بادلوں کی علیحدہ منزلیں تمیز نہیں کی جاسکتی تھیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر نظر آنے لگتی تھیں۔ یہ تصویر میں نے ایسے ہی ایک موقع پر کھینچی تھی۔

ادھر میں یہ واقعات سنا رہا تھا ادھر اماں جان کھانا کھانے کے لئے آوازیں دے رہی تھیں لیکن محویت کے عالم میں ہم میں سے کسی نے اُن کی آواز نہ سُنی، آخر کار تنگ آکر وہ مجھ پر خفا ہوتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ہم اماں جان کی آواز سے اچھل پڑے ایک لمحے کے لئے تو معلوم ہوا کہ ہمارا ہوائی جہاز ہوا میں غوطے مار رہا ہے اور بجلی کی کڑک ہمارے کانوں میں آرہی ہے لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔

پہلا سبق

از جناب صدیق احمد صاحب بی اے (علیگ)

اختر :- راضیہ۔ آج تمھارے ماسٹر صاحب نہیں آئے۔ کیا اتوار کو وہ بھی چھٹی دیتے ہیں؟

راضیہ :- ہاں آج ماسٹر صاحب نہیں آئیں گے۔ آج چھٹی ہے۔ تمھاری بھی تو چھٹی ہے؟

اختر :- ہاں ہماری بھی چھٹی ہے۔ چلو باغ میں چل کر کھیلیں۔

رضو :- ہاں چلو۔

دونوں بچے بھاگتے ہوئے باغ میں پہنچے۔ وہاں ایک کرسی پر بھائی جان بیٹھے ہوئے بلی کے بچے سے کھیل رہے تھے۔ ان دونوں کو جو انھوں نے آتے دیکھا تو بولے "ارے اختر! آج تم اسکول نہیں گئے؟"

اختر :- بھائی جان۔ آج تو چھٹی ہے۔ اتوار کو ہمارا اسکول بند رہتا ہے۔

راضیہ :- اور ہمارے ماسٹر صاحب بھی اتوار کو نہیں آتے۔

بھائی جان :- واہ بھئی۔ تم لوگوں سے تو ہمارا بلی کا بچہ ہی اچھا۔ وہ نہ کبھی اتوار مناتا ہے نہ چھٹی لیتا ہے۔

اختر :- تو کیا بلی کا بچہ کوئی اسکول جاتا ہے؟ وہ تو دن بھر کھیلا کرتا ہے۔ ہماری طرح اسے بھی روز کتابیں بغل میں دبا کر اسکول جانا پڑے تو معلوم ہو!

بھائی جان :- واہ جناب! آپ کو یہ بھی نہیں معلوم

بلی کا بچہ تو ہر وقت سبق یاد کیا کرتا ہے۔ وہ اسکول نہیں جاتا تو کیا ہوا؟ اس کی ماں تو اُسے ہر وقت پڑھایا کرتی ہے۔

راضیہ:- اہاہا۔ بلی کا بچہ سبق پڑھتا ہے!

بھائی جان:- اور کیا؟ اور بلی کا بچہ ہی نہیں بلکہ ہر جانور جب چھوٹا ہوتا ہے تو اُسے سبق پڑھنا

شریر تھا۔ اس نے بطخ کے بچوں کو جو تیرتے ہوئے دیکھا تو ایک دن چپکے سے خود بھی پانی میں اُتر گیا۔ مگر اُسے تیرنا تو آتا نہیں تھا بس لگا ڈبکیاں کھانے۔ اب اسے یاد آیا کہ ماں نے پانی میں جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ بچارا ڈوب گیا۔

(چڑی کھلنے کا مدرسہ)

پڑتا ہے۔ اس کے ماں باپ اُسے پڑھاتے ہیں۔

اختر:- تو کیا انھیں بھی ہماری طرح مار کھانا پڑتی ہے؟

بھائی جان:- ہاں انھیں بھی مار کھانا پڑتی ہے۔ البتہ انھیں ماں باپ نہیں مارتے بلکہ جب وہ غلطی کرتے ہیں تو انھیں بڑی تکلیفیں ہوتی ہیں تم نے وہ کہانی نہیں پڑھی جس میں ایک مرغی نے اپنے بچے کو پانی میں جانے سے منع کیا۔ لیکن مرغی کا بچہ بہت

راضیہ:- تو بھائی جان بلی کا بچہ کب سبق پڑھتا ہے؟

بھائی جان:- دیکھو جب بلی کوئی چوہا پکڑتی ہے تو اس سے کھیلا کرتی ہے۔

اختر:- ہاں ہاں ہم نے دیکھا ہے۔ کبھی اسے چھوڑ دیتی ہے، کبھی پکڑ لیتی ہے، پھر چھوڑ دیتی ہے، پھر دبوچ لیتی ہے۔

بھائی جان:- ہاں یہی سبق تو وہ اپنے بچوں کو

بھی پڑھاتی ہے۔ شروع شروع میں تو اس کے بچے چوہا پکڑنے سے گھبراتے ہیں مگر جب اُن کی ماں چوہوں سے کھیلنا انھیں سکھا دیتی ہے تو پھر ان کا ڈر نکل جاتا ہے اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے جانور پکڑنے لگتے ہیں۔

اختر:۔ تو یہ سبق پڑھانا ہوا؟

بھائی جان:۔ ہاں یہ سبق ہی تو ہوا جیسے تم پڑھتے لکھتے ہو تاکہ بڑے ہو کر اپنی روزی کماؤ اور بھلے مانس کہلاؤ، ویسے ہی یہ جانور بھی اپنا اپنا کام سیکھتے ہیں تاکہ بڑے ہو کر اپنی روزی آپ پیدا کریں۔

راضیہ:۔ اچھا بھائی جان! بندر بھی کیا اپنے بچوں کو پڑھاتا ہے؟

بھائی جان:۔ ہاں بندر بھی پڑھاتا ہے۔ تم نے کل دیکھا نہیں کہ ایک بندریا اپنے بچے کو پیٹ سے چمٹائے کوٹھے کی دیواروں پر پھاندتی پھرتی تھی؟

اختر:۔ ہاں ہاں میں نے دیکھا تھا۔ ایک بندریا اپنے بچے کو پیٹھ پر چڑھائے ہوئے تھی۔

بھائی جان:۔ بس وہ ایک طرح سے اپنے بچے کو سبق پڑھا رہی تھی۔ تم جانو بندر تو اچھل پھاند کا جانور ہی ہے۔ کبھی اس دیوار پر کبھی اس دیوار پر! اور پھر اس کی چھلانگ بھی غضب کی ہوتی ہے ابھی اس درخت پر بیٹھا ہے۔ یہاں سے اچھلا تو دوسرے درخت پر پہنچ گیا۔ وہاں سے پھاندا تو تیسرے درخت پر جا پہنچا۔

راضیہ:۔ تو اس میں سبق پڑھانا کیا ہوا۔

بھائی جان:۔ یہی اچھلنے کودنے کا سبق ہوا۔ بات یہ ہے۔ پہلے پہلے تو بندر کے بچے کو بھی کودتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے کہ کہیں گر نہ پڑے۔ مگر اس کی ماں جب اسے چمٹا کر خود کودتی پھاندتی ہے تو دس پانچ دفعہ میں اس کا ڈر نکل جاتا ہے اور پھر وہ بھی آسانی سے کودنے پھاندنے لگتا ہے۔ بعض بچے جو بہت ڈرپوک ہوتے ہیں اور ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی پر کودتے ہوئے گھبراتے ہیں ان کی ماں

(درخت پر چڑھنے کا پہلا سبق)

انھیں مارتی بھی ہے اور زبردستی پڑھاتی ہے

راضیہ:۔ اچھا اور کتے کے بچے کیا کرتے ہیں؟

بھائی جان:۔ کتے کے بچے تو سب سے زیادہ سبق پڑھتے ہیں اور ایسی ایسی مار کھاتے ہیں کہ آدمی کے بچے کیا کھائیں گے۔

اختر:۔ ہم نے تو نہیں دیکھا۔ ہمارا جیک تو خوب کھیلتا ہے۔ اسے نہ کوئی مارتا ہے نہ پیٹتا ہے۔

بھائی جان:۔ تمھیں کیا معلوم کہ جیک نے کیسی کیسی مار کھائی ہے۔ دیکھو جیک سے پہلے جو بچے ہوئے تھے وہ بچارے اسی تکلیف کے مارے مر گئے۔ جانوروں کی مار ایسی تھوڑا ہی ہوتی ہے جیسی تم لوگوں کی۔ ان کی مار تو یہ ہے کہ ماں نے منع کیا کہ بیٹا یہ چیز نہ کھانا۔ شریر بچے نے ماں کا کہنا نہیں مانا اور وہ چیز کھالی تو بس سمجھ لو کہ موت کے منہ میں چلا گیا تو کیا یہ کوئی کم سزا ہے؟ اور پھر اگر حساب لگایا جائے تو ساری دنیا میں آدھے کے قریب کتوں کے بچے اپنی اسی ضد اور شرارت کی وجہ سے جان دے بیٹھتے ہیں۔

اختر:۔ اچھا بھائی جان۔ اور کون کون سے جانور سبق پڑھتے ہیں؟

بھائی جان:۔ سب جانور سبق پڑھتے ہیں۔ دیکھو ہاتھی۔ کتنا بڑا جانور ہے! مگر وہ بھی پڑھتا ہے۔ اور بیس پچیس برس تک پڑھتا رہتا ہے۔

راضیہ:۔ وہ کیا پڑھتا ہے؟

بھائی جان:۔ وہ اپنی سونڈ سے پانی پینا سیکھتا ہے۔ درخت گرانا سیکھتا ہے۔ دشمن سے بچنے کی ترکیب سیکھتا ہے اور وہ سب باتیں سیکھتا ہے جو تم اپنے ہاتھ سے کرتے ہو۔ ہاتھی جب بچہ ہوتا ہے تو بچارے کو اپنی سونڈ سے دودھ پینا بھی نہیں آتا۔ لیکن اس کی ماں اسے سکھاتی ہے۔ اور دو تین ہفتے کے بعد وہ خوب مزے سے دودھ بھی پیتا ہے اور سونڈ سے دوسرے کام بھی لینے لگتا ہے۔

راضیہ:۔ اور بھائی جان کبوتر؟

بھائی جان:۔ کبوتر بھی اپنے بچوں کو سبق پڑھاتے ہیں۔ یہ تو تم جانتی ہی ہو کہ ان بچاری چڑیوں کی زندگی اسی دانے دنکے پر بسر ہوتی ہے۔ جو ادھر ادھر پڑے رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ پھدک پھدک کر ایک جگہ سے دوسری جگہ اڑتی پھرتی ہیں تاکہ جہاں کہیں کھانے کی کوئی چیز ملے فوراً چونچ میں دبالائیں۔ ان کے بچے جب انڈوں میں سے نکلتے ہیں تو بالکل گوشت کے لوتھڑے معلوم ہوتے ہیں۔ نہ اڑ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ ان بچاروں کو یہ بھی نہیں آتا کہ اپنی چونچ سے دانہ ہی اٹھالیں۔ ایسی حالت میں ان کے ماں باپ

دانہ چن چن کر لاتے ہیں اور اپنے پوٹے میں رکھ
کر انھیں خوب نرم کر لیتے ہیں۔ جب وہ ہضم ہونے
کے قابل ہو جاتا ہے تو بچوں کے منہ میں اپنی چونچ
ڈال کر وہ دانہ اُن کے پیٹ میں پہنچا دیتے ہیں
اس طرح وہ انھیں دانہ کھانا سکھاتے ہیں۔ کبوتر
اس معاملے میں بڑا ہوشیار ہوتا ہے وہ اپنے
بچوں کا بڑا خیال رکھتا ہے اور ایسی ایسی دوائیں
کھلاتا ہے کہ جن سے بچوں کا معدہ خوب صاف
اور مضبوط ہو جائے۔

راضیہ :۔ تو کیا کبوتر حکیم ہوتا ہے جو اُسے دوائیں
معلوم ہوتی ہیں؟

بھائی جان :۔ ہاں چھوٹا موٹا حکیم ہی سمجھو۔ جیسے
ہماری امی جان کو بہت سی دوائیں معلوم
ہیں، ویسے ہی کبوتروں کو بھی دو چار
کام کی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔

اختر :۔ ہماری امی جان تو ہمیں منقے کھلاتی ہیں۔
کبوتروں کو منقے کہاں سے ملتے ہیں؟

راضیہ :۔ کلو پنساری کے ہاں سے لے آتا ہوگا۔
اسے کیا ہے؟ اپنے چھجے سے اڑ گیا اور ایک
منقّا چونچ میں دبا لایا۔

بھائی جان :۔ نہیں، نہیں! کبوتر منقے نہیں کھلاتا
وہ دوسری دوا لاتا ہے۔ تم نے حمام میں دیکھا
ہوگا کہ دیواروں پر کہیں کہیں لونی لگی ہوتی ہے۔

اختر :۔ ہاں ہاں ہم نے ایک دن چکھی تھا۔ نمکین
نمکین ہوتی ہے۔

بھائی جان :۔ بس، بس وہی۔ اسی کو لونی کہتے
ہیں۔ تو کبوتر یہ لونی لے جا کر اپنے بچوں کو
کھلاتے ہیں۔ اس سے اُن کا معدہ خوب
صاف اور قوی ہو جاتا ہے۔

راضیہ :۔ واہ بھئی۔ کبوتر بھی بڑا سیانا ہوتا ہے!

بھائی جان :۔ ہاں اور کیا۔ اللہ میاں نے کام
چلانے بھر کی عقل سب ہی کو دی ہے۔ اب
دیکھو پہاڑی بکرا ہے۔ یہ بھی اپنے بچوں کو
سکھاتا پڑھاتا رہتا ہے۔ پہاڑ تو تم نے دیکھے
ہی ہیں کہیں اونچے کہیں نیچے۔ جو بکرے ان
میں رہتے ہیں انھیں بھی ان ٹیلوں پر کودنا
پھاندنا پڑتا ہے۔ پھر پہاڑ پر چڑھنا کوئی معمولی
کام تو ہے نہیں۔ تم دس قدم چلو تو تھک جاؤ
مگر یہ بچارے اگر چڑھیں اتریں نہیں تو انھیں
گھاس کھانے کو نہ ملے اور پھر شکاری جانور
کھا جائیں وہ الگ!

اختر :۔ تو بھائی جان وہ اپنے بچوں کو کیسے سکھاتا
ہے؟

بھائی جان :۔ بہت آسانی سے مگر شروع شروع
میں وقت ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا ہے
پہاڑی بکرے کے سینگ کتنے بڑے ہوتے ہیں؟

راضیہ :۔ ہاں، ہم نے عجائب خانے میں دیکھا ہے
بڑے بھاری سینگ ہوتے ہیں، جیسے درخت
کی شاخیں۔

بھائی جان :۔ ٹھیک! تم سمجھ گئیں۔ ہوتا یہ ہے کہ
بچوں کی ماں زمین پر بیٹھ جاتی ہے اور اس کے

(پہاڑ پر چڑھنے کا پہلا سبق)

بچے کبھی پیٹھ پر کبھی سینگوں پر چڑھ جاتے ہیں
پھر اُترتے ہیں پھر چڑھ جاتے ہیں۔ اس طرح
انھیں عادت ڈلوائی جاتی ہے کہ پہاڑ کی
چڑھائیوں پر بھی چڑھ اُتر سکیں۔

راضیہ :۔ تو کیا بھائی جان یہ سینگ اسی لئے ہوتے
ہیں؟۔
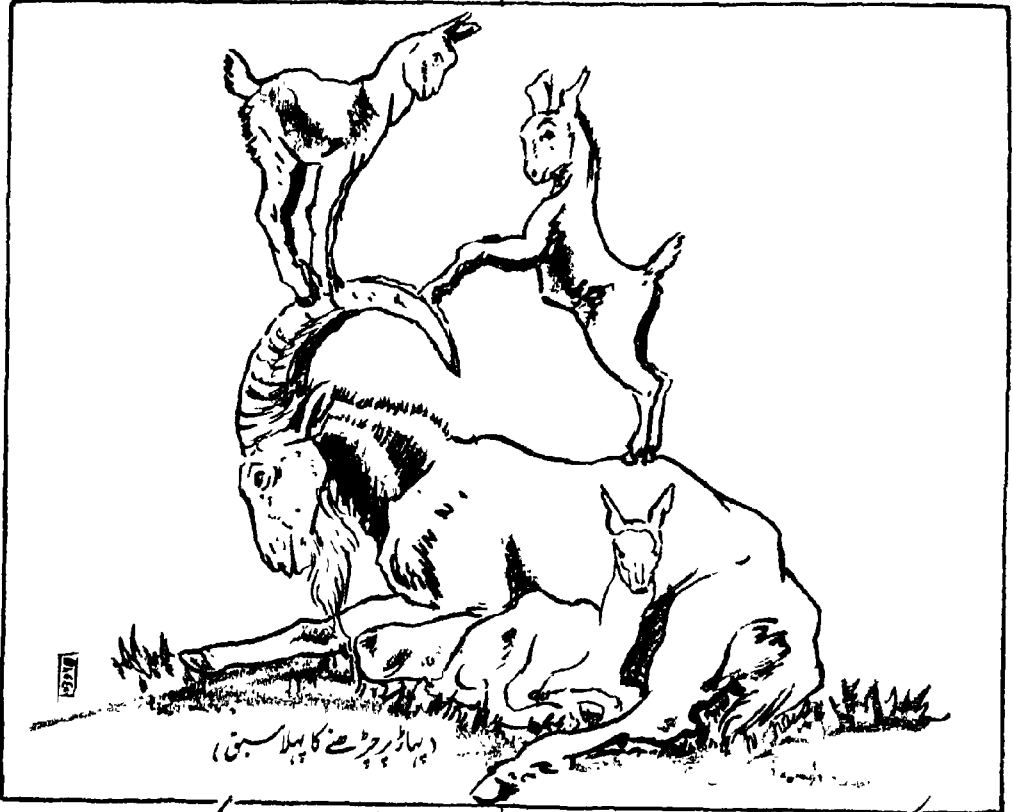
بھائی جان :۔ نہیں! اس لئے تو نہیں ہوتے سینگوں
سے تو بکرے اپنی حفاظت کرتے ہیں۔ اور جب
کوئی دشمن مقابلے پر آجاتا ہے تو اپنے سینگوں
سے اُسے خوب مارتے ہیں۔ اپنے بچوں کو بھی وہ
سینگوں سے مارنا سکھاتے ہیں۔

اختر :۔ اچھا تب ہی ہماری بکری اپنے بچوں کو کبھی کبھی
سینگوں سے مارا کرتی ہے۔ ہم نے ایک دفعہ
بچایا تو بکری ہمیں بھی مارنے دوڑی۔

بھائی جان :۔ ہاں وہ مار نہیں رہی تھی بلکہ اپنے

بچوں کو سینگوں سے لڑنے کا سبق پڑھا رہی تھی
تم نے بچوں کا ہرج کیا تو وہ تمھیں مارنے دوڑی
اب نہ کرنا۔ نہیں تو وہ تمھیں ڈھکیل دے گی
راضیہ :۔ مگر بھائی جان بطخ کے بچے تو پیدا ہوتے
ہی تیرنے لگتے ہیں۔
بھائی جان :۔ واہ بھئی! یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟
پہلے وہ بھی سیکھتے ہیں۔ اس روز تالاب میں تم
نے دیکھا نہیں کہ بڑی بطخ آگے آگے اور اس کے
بچے پیچھے پیچھے ایک قطار میں تیر رہے تھے؟
تو یہ اسی وجہ سے کہ ان کی ماں نے سکھا دیا ہے
کہ دیکھو آگے آگے ہم چلتے ہیں، پیچھے پیچھے تم آؤ
اور جیسے ہم تیرتے ہیں ایسے ہی تم بھی تیرو۔
اختر :۔ اور بھائی جان وہ کبھی کبھی پانی میں چونچ
ڈال کر مچھلی بھی تو پکڑتے تھے؟
بھائی جان :۔ ہاں! مگر مچھلی پکڑنے والی ایک اور
چڑیا ہوتی ہے جو پانی پر اُڑتے اُڑتے ہوا میں
ایک جگہ پر رک جاتی ہے اور جیسے ہی اسے
پانی میں کوئی مچھلی دکھائی دیتی ہے، وہ تیر کی طرح
غوطہ مار کر اُسے پکڑ لاتی ہے۔
راضیہ :۔ اس کے بچے پانی میں غوطہ لگاتے ڈرتے
نہیں؟
بھائی جان :۔ ڈرتے کیوں نہیں۔ اس کے بچے
تو بہت ڈرتے ہیں مگر وہ چڑیا بھی تو بڑی ہوشیار

ہوتی ہے۔ جہاں اس نے دیکھا کہ اس کا بچہ
پانی میں غوطہ لگانے سے ڈر رہا ہے۔ بس وہ
جھپٹ کر اس کی گردن اپنی چونچ میں دبا لیتی
ہے اور اُسے لے کر خود پانی میں غوطہ مارتی ہے
پہلے پہلے تو بچہ گھبراتا ہے۔ مگر پھر اس کا بھی
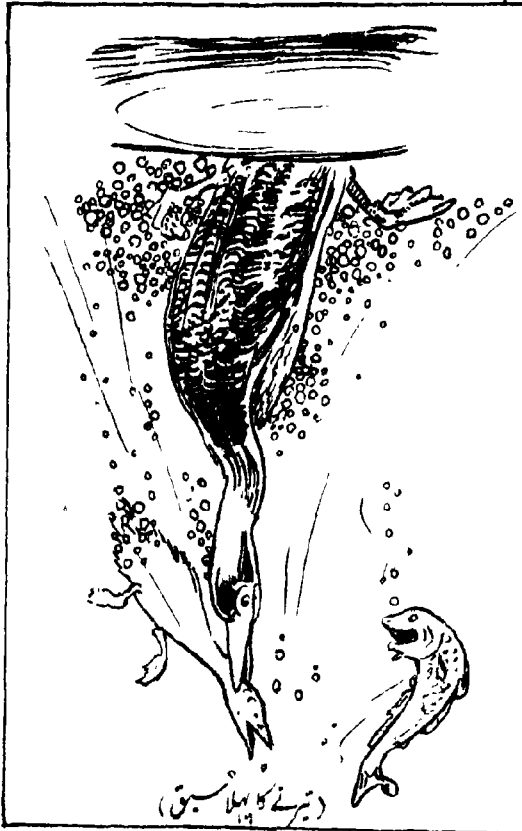
(تیرنے کا پہلا سبق)

ڈر نکل جاتا ہے اور وہ اپنے آپ مچھلی کا شکار
کرنے لگتا ہے۔
راضیہ :۔ اوئی اللہ۔ کیسی بے رحم ہوتی ہے۔ اگر
پانی میں اس کا بچہ چھوٹ جائے تو ڈوب ہی

جائے۔

بھائی جان :۔ ہاں اور کیا۔ لیکن اگر وہ یوں نہ سکھائے تو جیسے ہم لوگوں میں بہت سے بچے جاہل نکل جاتے ہیں، ویسے ہی اس کے بچے بھی جاہل رہ جائیں۔

اختر :۔ بھائی جان ایک جانور بھی تو ہوتا ہے جو اپنے بچے کو پیٹ میں رکھ لیتا ہے۔ کل ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ وہ آسٹریلیا میں ہوتا ہے۔

بھائی جان :۔ ہاں، اس کا نام کنگرو ہے۔ اس کی اگلی ٹانگیں بہت چھوٹی اور پچھلی بہت بڑی ہوتی ہیں۔ اس کی جان کے لاگو بہت سے جانور ہوتے ہیں لہذا یہ بھاگنے میں بہت تیز ہوتا ہے۔ مگر بچارے کے بچے تو جانو چھوٹے چھوٹے ہوتے ہی ہیں، وہ بھلا کیسے تیز بھاگ سکتے ہیں۔

راضیہ :۔ تو کیا وہ بھی اپنے بچے کو بندریا کی طرح اپنے پیٹ سے چمٹا لیتا ہے؟

بھائی جان :۔ نہیں پیٹ میں چھپتے تو نہیں۔ البتہ ان کی ماں کو اللہ میاں نے ایک تھیلی دی ہے یہ اس کے پیٹ میں لگی رہتی ہے، جہاں اس نے کسی دشمن کو دیکھا بس فوراً اپنے بچے کو اس میں بٹھا کر تیر کی طرح بھاگنے لگی۔

راضیہ :۔ اور بچہ؟

بھائی جان :۔ بچہ اپنے مزے سے گردن نکال کر اِدھر اُدھر جھانکتا رہتا ہے۔

"اللہ ننھے کو ہمارے ساتھ کھیلنے دیجئے"

اختر :۔ تو بھائی جان پھر وہ اپنے بچے کو سکھاتی کیسے ہے؟

بھائی جان :۔ یہی سکھاتی ہے کہ جب دشمن اس طرح دکھائی دے تو تم بھی بھاگ جایا کرو۔

راضیہ :۔ بچہ تو بڑے مزے میں رہتا ہے اپنے سیر سپاٹے بھی کرتا ہے اور مفت میں سبق بھی پڑھتا ہے!!

بھائی جان :- سب سے زیادہ مزے میں مگرمچھ رہتا ہے۔

اختر :- وہ کیسے ؟

بھائی جان :- بھئی بات یہ ہے کہ دریائی گھوڑا تو جانو پانی کا جانور ٹھیرا۔ اس کے بچے ہزاروں آفتوں کا شکار بنے رہتے ہیں۔ کہیں مگرمچھ منہ پھیلائے بیٹھا ہے۔ کہیں سونس جبڑا کھولے تیرتا چلا آرہا

نہیں ہوتے۔ وہاں تو بس پانی ہی پانی ہوتا ہے۔

راضیہ :- تو اُن کے بچے کیا کرتے ہیں؟ آپ تو کہتے ہیں وہ بڑے مزے میں رہتے ہیں۔

بھائی جان :- ہاں وہ ہمیشہ اپنی ماں کی پیٹھ پر سوار رہتے ہیں اور ان کی ماں اُنھیں سیلئے لئے گھوما کرتی ہے۔ اُنھیں سیر کرنے میں بڑا لطف

(ان کے ماں باپ نے انھیں یوں ہی چھوڑ رکھا ہے)

ہے، کہیں بڑی بڑی مچھلیاں اس کے پیچھے لگی ہوئی ہیں، بس ایک مصیبت میں جان رہتی ہے تو ایسے موقع پر اگر اس کے بچے اکیلے رہ جائیں تو کوئی نہ کوئی جانور انھیں کھا جائے۔

اختر :- تو کیا ان کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔

بھائی جان :- ہوتا کیوں نہیں، وہ سمندر ہی میں کوئی جگہ ایسی تلاش کر لیتے ہیں جہاں دوسرے جانور کم ہوں۔ البتہ گھرے ہوئے مکانات

آتا ہے۔ کبھی تہہ میں چلے گئے، کبھی کنارے آگئے کبھی سطح پر تیر رہے ہیں، اور پھر مزا یہ کہ مچھلیاں پکڑنے انھیں کہیں جانا نہیں پڑتا۔ اُن کی ماں اُنھیں اپنی پیٹھ پر سوار کرا کے اس طرف تیرتی ہوئی جاتی ہے، جہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہوں۔ بس یہ اپنا جبڑا کھول دیتا ہے، اور پانی کے ساتھ سینکڑوں مچھلیاں اس کے منہ میں سما جاتی ہیں۔ جب منہ بند کرتا ہے تو پانی تو

نکل جاتا ہے اور مچھلیاں پیٹ کے اندر چلی جاتی ہیں۔

راضیہ :۔ واہ بھئی خوب۔ اللہ میاں ہم بھی مگرمچھ ہوتے تو بڑا مزا آتا۔ اپنی اُمّی جان کی پیٹھ پر سوار ہوکر خوب گھومتے اور مچھلیاں پکڑتے۔

اختر :۔ بس تم سب کچھ ہوئیں۔ بڑی بچاری مگرمچھ بنیں گی۔ گدھی نہ ہوئیں؟

راضیہ :۔ تو ہم کوئی تم سے بول رہے ہیں؟ ہم تو ایک بات کہہ رہے ہیں۔ تم کیوں بُرا مانتے ہو؟

بھائی جان :۔ ارے پھر تم لوگوں نے لڑنا شروع کیا!! ابھی چپ چاپ بیٹھے کام کی باتیں سُن رہے تھے۔ اب لڑنے لگے؟ جاؤ اب نہیں سنائیں گے۔

اختر :۔ اچھا بھائی جان اب نہیں لڑیں گے۔ اور سنائیے؟

بھائی جان :۔ اب آج نہیں۔ کل آنا تو اور باتیں بتائیں گے۔

دونوں بچے جاتے ہیں لیکن افسوس ضرور ہے کہ ہم نے کیوں لڑکر ایسی اچھی باتیں ختم کردیں۔

چینی

محترمہ ہاجرہ بیگم

"کچھ سلک چاہیے میم صاحب"۔

حمیدہ دوڑی دوڑی امّی پاس آئی "امّی "چائنا مین" ہے۔ کچھ چاہیے ؟"

"دیکھوں"! امّی بولیں اور چق میں سے جھانکنے لگیں۔ "اے ہے ان سب کی شکلیں ایک سی ہوتی ہیں کل آیا تھا وہ بھی اسی قطع کا تھا اور دیکھو تو کیسا بڑا سا گٹھر سائیکل پر لئے گھوم رہا ہے اور زبان تو ایک کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ ہاں کام بہت عمدہ کرکے لاتے ہیں"۔ حمیدہ کا چھوٹا بھائی اسکول سے لوٹ رہا تھا بیچنے والے کو دیکھ کر کودنے لگا اور بستہ اُچھال اُچھال کر لگا گانے۔ "چائنا مین، چائنا مین چوں، چوں، چوں۔ کھو جون کیا لایا ہے"۔

اتنے میں بھائی جان آپہنچے۔ انھوں نے بُری طرح سعید کو گھورا اور اشارے سے اندر بُلایا سعید چپکا پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ بھائی جان بولے "سعید اگر تم کو کوئی کہے" کالا کلوٹا۔ کالا کلوٹا تم کو کیسا لگے گا"؟

سعید کھسیا سا گیا اور بولا" کوئی کہے ہی کیوں"۔

"کیوں نہیں جب میں ولایت میں تھا تو لندن کے بچّے اکثر میرے پیچھے دوڑتے تھے اور کہتے تھے "کالا آدمی، کالا آدمی"۔

سعید کا مُنہ لال ہوگیا۔ دانت بھینچ کر بولا۔ "بڑے بدتمیز ہوتے ہیں۔ ہم کالے ہیں تو وہ لال منہ کے بندر ہوں گے"۔

"بس تو" بھائی جان نے کہا" جیسے تمھارا دل ویسے ہی دوسروں کا دل سمجھو۔ یہ بے چارے اپنے ملک سے تمھارے یہاں کاروبار کرنے آئے ہیں ہمارے تمھارے جیسے انسان ہیں۔ اگر شکل میں فرق ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم بدتمیز بن کر اُن کو چائنا مین کہیں اور چڑھائیں"؟

"تو پھر کیا کہیں" سعید نے حیرت سے پوچھا "چائنا مین تو ہیں ہی"۔

"چائنا مین کوئی لفظ نہیں۔ یہ تو انگریزوں نے اُن کی ہتک کرنے کو لفظ بنالیا ہے۔ جیسے ہندستانیوں

کو نمستو کہا کرتے تھے۔ یہ لوگ قوم کے چینی ہیں اُن کو چینی مرد کہنا چاہیئے۔"

سعید اب بھی اپنی ضد پر قائم رہا۔ بولا "واہ چینی کیا ؟ چینی تو مرغی ہوتی ہے یا چینی برتن ہوتے ہیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔" بھائی جان بولے" ہوتے ہیں۔ اور شروع شروع میں یہ سب چیزیں جن کو ہم چینی کہتے ہیں صرف چین ہی میں بنتی تھیں اور وہاں سے ہم تک پہنچتی تھیں۔ اگر تمھیں چینیوں کی ہوشیاری اور کاریگری کا حال معلوم ہو تو بجائے اُن پر ہنسنے کے تم شرم سے سر جھکا لو۔"

اب تو سعید، حمید اور امی سب کی سب بھائی جان کی باتوں میں لگ گئیں۔ حمیدہ بولی "بھائی جان کیا چینی بہت مال دار ہوتے ہیں؟"

"نہیں یہ تو میں نہیں کہتا۔ لیکن چینی قوم بہت ہنرمند ہے اور آج سے نہیں سینکڑوں برس سے چینی اتنی خوب صورت اور نایاب چیزیں بناتے آئے ہیں کہ دنیا بھر میں اُن کے مال کی مانگ تھی۔ ریشہ کا کام ہی دیکھو جس زمانے میں انگریز موٹا جھوٹا پہنتے تھے یا کھالیں لپیٹ کر گھومتے تھے۔ چینی نہایت عمدہ ریشم بنانے تھے، ہیرے، جواہرات، ہاتھی دانت کا کام، خوب صورت پھول پتے، لکڑی اور کاغذ پر بنانا، غرضکہ ہر طرح کی دستکاری میں ماہر تھے۔ اور تو اور چینی اس وقت لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور کتب خانے، یونیورسٹیاں اُن کے یہاں تھیں جبکہ یورپ کے لوگ ان باتوں سے ناواقف تھے۔ تم نے سنا ہی ہوگا کہ ہمارے رسولؐ نے فرمایا کہ" علم حاصل کرو چاہے اس کے لئے تمھیں چین ہی جانا پڑے۔"

"ہاں، ہاں" سعید بات کاٹ کر بولا" ہماری اردو کی کتاب میں لکھا ہے" نگارخانہ چین۔"

امی بہت دیر سے چپ تھیں بولیں۔ "بیٹے جب ان کے ملک میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے تو نگوڑے کیوں دیس بدیس در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ رہیں نہ اپنے ہی شہر میں۔ آخر ہم تو انجان ہیں ہمارے یہاں آئیں گے تو ہم اُن کا دل دکھائیں گے۔"

بھائی جان نے کہا۔ "امی اللہ کا دیا سب یہ کچھ تو تھا ہی لیکن یہ میں نے کب کہا کہ اب بھی ہے۔ آخر یوں تو ہندوستان میں لوگ کہتے ہیں کہ دودھ دہی کی نہریں بہتی تھیں۔ اب کیوں نہیں بہتیں؟"۔

حمیدہ بھائی جان کی پرانی شاگرد تھیں جھٹ چٹک کر بولیں۔" انگریز سب لوٹ کھسوٹ کرلے گئے۔"

بھائی جان نے کہا بس تو یوں ہی سمجھو۔ چین جیسا خزانہ دوسرے لوگ کیسے چھوڑ دیتے۔ سب سے پہلے تو جاپان ہی چین پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔ ۱۴ سال سے جاپان حملے پر حملہ کر رہا تھا لیکن پورے ملک پر قبضہ نہ کر سکا۔ پھر آئے انگریز، انھوں نے اپنی پرانی چال چلی۔ تجارت کی غرض سے گئے لیکن چینیوں

نے یوں تو اپنے ملک پر قبضہ نہ ہونے دیا البتہ روپیے کے معاملے میں پھنس گئے۔ انگریزوں میں جرمن، فرانسیسی، امریکن اور برٹش سب نے چین کے تاجروں کو روپیہ دیا اور اس کے بدلے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کرلیا۔ اور کل کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بس اس طرح چین چاروں طرف سے پٹتا گیا۔ اور چینی روز بروز تباہ ہوتے گئے؟"

"اور چپکے بیٹھے پٹتے رہے؟" امّی نے پوچھا۔

"ارے بھئی ہندوستانی کیسے پٹتے گئے؟ اتنا بڑا ملک کیسے مٹھی بھر لوگوں کے قبضے میں آگیا؟ وہاں اپنی ہی خانہ جنگی سے فرصت نہ تھی۔ پہلے چینیوں کا شاہنشاہ تھا وہ نوابی ہی کرتا رہتا تھا۔ لوگوں نے اس کو مار بھگایا۔ انقلاب کیا۔ پھر اس پر لڑائی ہوئی کہ اب کیسی حکومت ہو، تو ایک حصّہ تو جمہوریت بن گیا ایک قومی حکومت قائم کرنے کے پیچھے پڑا رہا۔ انگریز اور جاپان دونوں فریقوں کو رشوت دینے کے پیچھے پڑے رہے، ادھر ملک تباہ ہوتا رہا۔ نہ وہ دولت رہی نہ علم و ہنر۔ آج ایک فوج آکر دھاوا مار گئی کل دوسری آن کر بم برسا گئی۔"

"اُسے ہئے" امّی بولیں "جب ہی یہ نگوڑے چینا گھبرا کر نکل بھاگے۔" بھائی جان ہنسنے لگے۔

"نہیں امّی یہ لوگ جنھیں آپ دیکھتے ہیں یہ تو تجارت کی غرض سے آئے ہوئے ہیں، لڑنے والے تو چین ہی میں رہتے ہیں۔ بھاگتے تھوڑا ہی ہیں۔"

"بھائی جان کیا چین ختم ہو جائے گا؟"

"اب یہ کون کہہ سکتا ہے" بھائی جان نے جواب دیا" البتہ ختم ہونا نہ چاہیئے پچھلے دنوں جب جاپان نے زوروں میں چین پر چڑھائی کی تو چینیوں کو عقل آئی اور آپس کے جھگڑے قصّے چھوڑ کر اتفاق کرلیا اور اس بات کا عہد کرلیا کہ مرتے مرجائیں گے لیکن جاپان کے غلام بن کر نہ رہیں گے اور حمیدہ میں نے ابھی اخبار میں دیکھا تھا کہ چینی یونیورسٹیوں سے جتنے لڑکے لڑکیاں پڑھ کر نکلے ہیں۔ انھوں نے مل کر چینی حکومت کو عرضی دی ہے کہ ہم نوکری کرنا چاہتے ہیں نہ کاروبار بلکہ اپنی جانیں قوم کی خدمت کے لئے آپ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ آپ جس طرح کا کام چاہیں ہم سے ملک کے بچانے کے لئے لیں۔"

"جناب" سعید اکڑ کر بولا۔ "چینی بچوں کے بارے میں ہم نے اسکول میں پڑھا ہے سب لمبے لمبے لبادے پہنتے ہیں۔ لڑکوں کے سر پر چوٹیاں ہوتی ہیں اور لڑکیوں کے پاؤں باندھ دئے جاتے ہیں۔"

بھائی جان کھل کھلا کر ہنس پڑے" ارے میاں کس زمانے کی باتیں کر رہے ہو؟ تم سمجھتے ہو کہ یونیورسٹی کے لڑکے چوٹیاں رکھتے ہوں گے اور لڑکیاں پاؤں باندھ کر بیٹھتی ہوں گی؟ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی کہے ہندوستانی بچے کان میں بندہ

اور ہاتھ میں کڑا پہنتے ہیں اور لڑکیاں لہنگا پہنتی ہیں۔ یہ تو پرانے وقتوں کی باتیں ہیں بے شک چین کے دیہاتوں میں اب بھی بچّے لبادے اور پاجامے پہنتے ہیں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی پرانی رسمیں بھی چھوڑ دی ہیں نہ لڑکیوں کے پاؤں بندھتے ہیں نہ لڑکوں کی چوٹیاں ہوتی ہیں۔ کپڑے بھی ہماری تمھاری طرح ضرورت کے لحاظ سے پہنتے ہیں۔ فوجی افسر وردی پہنتے ہیں۔ باقی لوگ کوٹ، پتلون یا پاجامے پہنتے ہیں پیسے والے بوٹ بھی پہنتے ہیں۔ اور غریب ننگے پاؤں بھی پھرتے ہیں۔"

سعید میاں ذرا کھسیانے ہوگئے تھے شرمندگی مٹانے کو بولے "خیر آپ نے لکچر تو پلا دیا لیکن وہ چینیا جی نہیں معاف کیجئے چینی سوداگر صاحب ابھی تک دھوپ میں کھڑے ہیں۔ اُن کی تو سُن لیجئے۔"

"سچ تو ہے" اُمّی بولیں "ہمیں خریدنا ورینا تو ہے نہیں اور وہ غریب دھوپ میں تپ رہا ہے۔"

بی حمیدہ کا ہمدردی کا پارہ تو جلد چڑھتا تھا۔ کہنے لگیں "بے چارہ! پیاس بھی تو لگ رہی ہوگی کیوں بھائی جان۔ اگر ہم اس کو کچھ کھانے کو دیں تو کھائے گا"

"کوئی فقیر تھوڑا ہی ہے" بھائی جان نے کہا "شاید بُرا مان جائے۔ ہاں اگر تم کہو تو تمھاری طرف سے چائے پینے کے لئے پوچھ لوں۔"

بھائی جان نے انگریزی میں چینی سے پوچھا تو اس نے مسکرا کر چائے سے تو انکار کر دیا لیکن پانی کا ایک گلاس مانگا جو حمیدہ تمیز سے تشتری میں رکھ کر لائیں اور جس کو شکریے کے ساتھ چینی نے پیا اور اپنی سائیکل پکڑ، چلتا ہوا۔

عابد حسین صدیقی
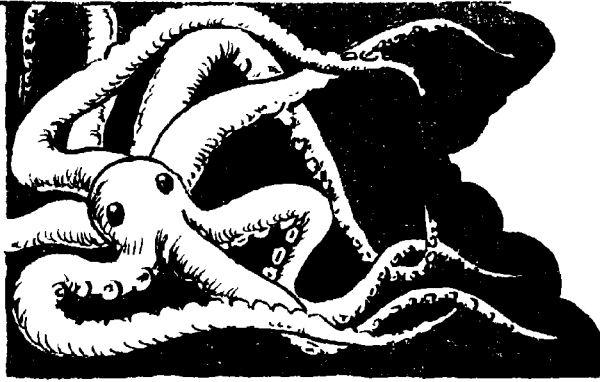
اکٹوپس دسیپ کی قسم کا ایک بڑا جانور جس کے آٹھ سونڈیں سی ہوتی ہیں، ساحلوں کے کنارے پایا جاتا ہے۔ اندھیری راتوں میں دیہاتی آگ، بھالے اور جال کی ٹوکریاں لئے ہوئے اُن کو پکڑتے ہیں۔ لیکن ان دقیانوسی ترکیبوں سے زیادہ اکٹوپس ہاتھ نہیں آتے۔ زیادہ تعداد میں پکڑنے ہوں تو شکاری سمندر میں دور تک جاتے ہیں۔ ایک دفعہ شام کو ہم بھی ان کے ساتھ خلیج پار گئے۔ مگر سورج غروب ہوگیا اور

رات وہیں پہاڑی پر بسر کرنا پڑی۔

جب سورج کی پہلی کرن نظر آئی تو ہم نے ایک دُور سے جس میں بہت سے بلّے لگے ہوئے تھے مچھلی کا شکار شروع کیا۔ کشتی میں ڈالتے ہی یہ پکڑی ہوئی مچھلیاں اچھلیں اور گول اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتیں رات ہوئی تو پیٹرول سے جلنے والا بڑا لیمپ روشن کیا گیا جس طرح لوکے اُس پاس پروانے چکر کاٹتے ہیں، بس بالکل اسی طرح لیمپ کی شعاعوں کے آس پاس چھوٹی چھوٹی مچھلیاں تیر رہی تھیں۔

ان مچھلیوں کو کھانے کے لئے ایک بڑی مچھلی آئی، شکاری اُسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اور دس لوگوں والا بھالا اُٹھا کر اس کے بھونک دیا پانی سے جب بھالا اوپر اُٹھایا تو اس میں اکٹوپس تھا جس کے بدن سے کالا پانی نکل رہا تھا۔ تنہا تیرنے والوں کو یہ خطرے میں ڈال دیتا ہے اس لئے کہ چار یا پانچ پونڈ وزنی اکٹوپس آدمی کو بہ آسانی ڈبو سکتا ہے۔

اس کے آٹھ ہاتھوں یا سونڈوں میں بہت سے منہ سے ہوتے ہیں۔ اُن کے ذریعے یہ جانور پتھر وغیرہ سے چمٹ جاتا ہے۔ انھی سے وہ مچھلی تو مچھلی آدمی کو بھی پکڑ لیتا ہے۔ اپنی نوک دار سونڈ سے یہ پتھروں کے نیچے سے مچھلیاں نکال لاتا ہے۔

دشمن سے حفاظت کے لئے خدا نے اسے عجیب چیز دی ہے جب کوئی جانور اس کا پیچھا کرتا ہے تو یہ اپنے جسم سے کالا کالا رنگ نکالتا ہے جس سے سارا پانی سیاہ ہو جاتا ہے اور یہ چپکے سے اپنا راستہ لیتا ہے

صبح ہوتے ہی ہم نے واپسی کے لئے لنگر اُٹھایا۔ کنارے پر پہنچے تو عورتیں ہماری طرف اس خیال سے دوڑیں کہ جو کچھ ہم نے رات بھر پکڑا تھا وہ خریدلیں۔ اکٹوپس سے عورتیں سپیارنگ نکیں جا و لوں کا خاص قسم کا کھانا اور ملکرونی بناتی ہیں۔ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کو مزے لے لے کر کھاتے ہیں مگر اُن کو یہ نہیں معلوم کہ اس زردی مائل جھینگے جیسی مزے دار گول گول چیز کی حقیقت کیا ہے ٭

غروب آفتاب (مرسلہ خلیق الزماں اندور)

طلوع آفتاب (مرسلہ ارتضاء الرحمان دہلی)

نئی دہلی (مرسلہ صلاح الدین جامعہ)

محمد نسیم انصاری (علیگڑھ)

محمد فاروق رضا (آرہ)

محمد انور رضا (دہلوی)

پیام برادری آگرہ

وحید الدین صدر

ام شریف

محمد عثمان خان

مبارک الدین
سکریٹری

ام ریاض احمد

محمد یحییٰ پٹنہ

احسن کا مچھلی گھر

برکت علی صاحب فراق (جامعی)

ایک دن کا ذکر ہے، احسن میاں کے والد انھیں چڑیا گھر دکھانے لے گئے۔ اس روز احسن میاں کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔

چڑیا گھر پہنچے تو اتنا مزہ آیا کہ اپنے ابا کا ساتھ چھوڑ کر چار قدم آگے ہی آگے رہتے۔ طرح طرح کے جانور تھے ایسے کہ انھوں نے دیکھے بھی نہ تھے کہیں لمبی لمبی گردن والا، بدن پر بیل بوٹے بنے ہوئے، زراف گردن اوپر اُٹھائے درخت کی پتیاں کھا رہا ہے تو کہیں شتر مرغ اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا ہے، کہیں شیر گرج رہا ہے، تھوڑی دیر میں احسن میاں اس جگہ پہنچے جہاں مچھلیاں پلی ہوئی تھیں، نیلی پیلی، لال، سبز ہر رنگ کی مچھلیاں دیکھیں سامنے ایک چھوٹا سا شیشے کا برتن نظر آیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس کے اندر طرح طرح کے پانی کے کیڑے اور مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ احسن میاں اس برتن کو دیکھ کر ایسے کھوئے کہ کسی بات کی سُدھ ہی نہ رہی۔ اُن کے والد اپنے چھوٹے بچے محسن کی انگلی پکڑے دوسری طرف چلے گئے پر احسن وہیں جمے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ابا کو احسن میاں کا خیال آیا، اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا، احسن کہیں ہوں تو ملیں! آخر مچھلی گھر کی طرف آئے، دیکھتے کیا ہیں کہ احسن میاں وہیں کھڑے مچھلیوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ محسن نے دوڑ کر پیچھے سے اُن کی آنکھیں موند لیں، تب کہیں جا کر اُن کو ہوش آیا۔

گھر پہنچ کر خیال ہوا کہ ہم بھی ایسا ہی مچھلی گھر

بنائیں اور مچھلیاں پالیں، مگر اُن کا گھر کیسے بنے؟ بڑا ٹیڑھا سوال تھا۔ مدرسے سے آنے کے بعد ہر وقت اسی فکر میں لگے رہتے۔ ایک روز گھر والوں کی نظر بچا کر شیشے کا جگ اُٹھا لائے اور چھپا کر رکھ دیا۔ مچھلیوں کی فکر ہوئی۔ برسات کا مہینہ تھا ہی، ماموں جان کو ساتھ لے کر ایک نالے پر چلے گئے اور بڑی مشکل سے دو تین ننھی ننھی مچھلیاں پکڑ لائے اور جگ میں لا کر چھوڑ دیں۔ مچھلیاں پانی سے باہر ہونے کی وجہ سے بے جان ہو رہی تھیں۔ پانی پا کر ان میں کچھ جان آ گئی اور لگیں اِدھر اُدھر تیرنے۔ احسن میاں بہت خوش ہوئے تھوڑی دیر تک تو یہ تماشا رہا لیکن مچھلیاں کچھ تو بے جان ہو گئی تھیں اور کچھ احسن میاں کے چھیڑنے سے ڈر گئی تھیں، گھنٹے دو گھنٹے میں مر گئیں۔ احسن کو بہت افسوس ہوا اور رونے لگے۔
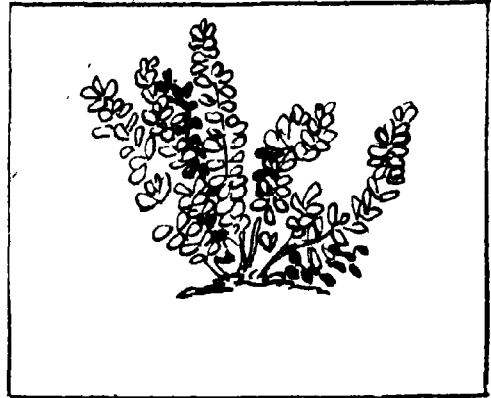
ایک ماسٹر صاحب احسن کو گھر پر پڑھانے آتے تھے۔ آج جو شام کو وہ آئے تو احسن کو بہت غمگین پایا۔ وجہ پوچھی تو رو کر کہنے لگے "ماسٹر صاحب میری مچھلیاں مر گئیں"۔ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں اُن کی بات نہ آئی، کہنے لگے "آخر کیا ہوا، مچھلی تو پانی سے باہر آتے ہی مر جاتی ہے"۔ احسن میاں نے روتے ہوئے کہا "ماسٹر صاحب، پانی میں تو تھیں" ماسٹر صاحب اب سمجھے کہ انھوں نے مچھلی گھر بنایا ہوگا کہنے لگے، "چلو دیکھیں تو سہی"۔

ماسٹر صاحب نے مچھلی گھر دیکھ کر کہا "اچھا روؤ نہیں، ہم تمھارے لئے اچھا سا مچھلی گھر بنا دیں گے، جس میں مچھلیاں ہفتوں اور مہینوں زندہ رہیں گی اچھا آج تمھیں مچھلی گھر بنانے کی ترکیب بتائیں"۔ اب کون پڑھتا ہے! اب تو مچھلی گھر کی دھن تھی۔

ماسٹر صاحب نے کہا "اچھا چلو، مالی سے ایک بڑا گملہ مانگ لاؤ"۔

احسن، ماسٹر صاحب گملے کا کیا ہوگا۔ چڑیا گھر کا مچھلی گھر تو شیشے کے برتن میں تھا۔

ماسٹر صاحب: تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہ شیشے کا برتن کسی چیز پر رکھا ہوا تھا۔ مچھلی گھر اسی گملے پر رکھا جائے گا۔ جاؤ۔

احسن میاں بھاگے بھاگے مالی کے پاس گئے اور ایک خوب صورت سا نیا گملا اُٹھا لائے۔

"اب کیا لاؤں ماسٹر صاحب؟"

"کچھ نہیں، اب اِسے مٹی سے بھر دو"

احسن میاں دوڑے دوڑے گئے اور گملے کو مٹی سے بھر لائے۔

"بھر دیا ماسٹر صاحب، لیجئے یہ رہا"۔ ماسٹر صاحب نے کہا "تم تو ہو بے وقوف۔ کوڑا کرکٹ سے بھر لائے جاؤ اُسے خالی کرو، اور اچھی صاف ستھری مٹی بھر لاؤ"

احسن میاں نے کچھ منہ بنایا مگر کام تو کرنا ہی تھا اب کے نہایت صاف ستھری مٹی سے گملا بھر لائے۔

ماسٹر صاحب نے کہا "شاباش! اب تم نے اچھا کام کیا ہے اب تمہارا مچھلی گھر ضرور بن جائے گا لیکن شیشے کا یہ برتن تو کام نہیں دے گا۔ اس کے لئے بڑا سا مرتبان یا ہانڈی چاہیئے۔ کل مرتبان لاؤ تو کام چلے"۔

احسن نے ضد کرکے اپنی ماں سے دام لئے اور شام ہی کو شہر سے ایک بڑا سا نیا مرتبان منگوا لیا۔

دوسرے دن ماسٹر صاحب کو ساری داستان کہہ سنائی، ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ اور کہنے لگے "اب تمہارا مچھلی گھر تیار ہو جائے گا، اچھا لاؤ، وہ گملا"

گملا آگیا تو ماسٹر صاحب نے کہا "اب مرتبان کو گملے پر رکھ کر اُسے خوب کس کر گھماؤ، تاکہ مرتبان مٹی پر خوب جم کر بیٹھ جائے"۔

احسن:- "یہ دیکھئے ماسٹر صاحب! خوب جم گیا اب اس میں پانی ڈالیں"؟

ماسٹر صاحب:- "دیکھو پھر تم نے جلدی کی۔ جلدی کروگے تو تمہارا مچھلی گھر خراب ہوجائے گا۔ اچھا چلو اب دریا پر چلیں"۔

"مچھلیاں پکڑنے ماسٹر صاحب!"

"نہیں جی! وہاں سے ریت لائیں گے۔ اُسے خوب خوب پانی سے دھو دھو کر صاف کیا جائے گا اور پھر اُسے مرتبان میں ڈال دیں گے اور ہاں! تھوڑی سی پانی کی گھاس بھی تو آئے گی؟ وہی جو پانی کے نیچے کیچڑ میں اُگتی ہے اور پانی کی سطح تک
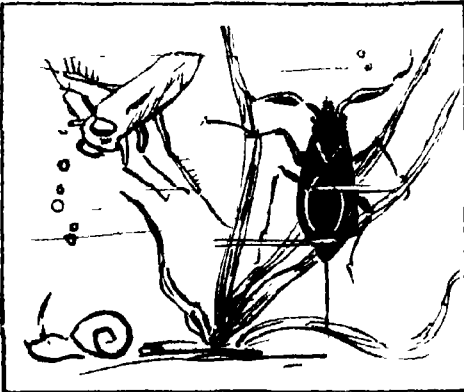
کھڑی رہتی ہے"۔

ماسٹر صاحب یہ گھاس اور ریت کس لئے آئے گی؟ مچھلی گھر میں تو مچھلیاں رہیں گی"۔

"مچھلی کے لئے گھر تو ہو گیا، پانی، مگر پانی تو اُن کے سیر کرنے کی جگہ ہے، اُن کے رہنے کی جگہ تو یہی گھاس ہے۔ پانی میں گھاس بھی تو اُگتی ہے تمہارے

مچھلی گھر میں اگر نرا پانی ہی پانی رہے گا تو مچھلیاں سمجھیں گی کہ یہ ہمارا اصلی گھر نہیں ہے اور بے گھبرا گھبرا کر جلد ہی مر جائیں گی۔ یہ گھاس رہے گی تو وہ تمھارے مچھلی گھر کو اپنا اصلی گھر سمجھیں گی اور پھر بہت خوشی سے رہیں گی اور یہ جو ریت پانی میں ڈالی جائے گی، وہ گھاس کو زندہ رکھنے کے لیے ہوگی۔ گھاس بھی تو ہماری تمھاری طرح ایک جان دار چیز ہے اور اس کے لیے بھی کوئی خوراک ہونی چاہیے۔ اُسے یہ خوراک اسی ریت سے ملے گی اور وہ تمھاری مچھلیوں کے لیے گھاس کو ہرا رکھے گی۔"

احسن میاں اب سمجھے کہ یہ سب چیزیں تو میں چڑیا گھر والے مچھلی گھر میں بھی دیکھ کر آیا تھا۔ خیر تو دونوں دریا کے کنارے گئے۔ تھوڑی سی نہایت صاف ستھری اور چمک دار ریت لی اور تھوڑی سی گھاس ایک جگہ سے اکھیڑ لی۔

یہ سب سامان لے کر دونوں استاد اور شاگرد گھر آئے۔ ماسٹر صاحب نے کہا "تم ریت کو ایک شیشے کے برتن میں رکھ کر اس میں پانی ڈال دو اور ایک لوہے کی تیلی سے خوب چلاؤ اور پانی گرا دو۔ دیکھو ریت نہ گرنے پائے۔" احسن نے بڑی پھرتی سے یہ کام کر ڈالا اور ماسٹر صاحب کے پاس لائے۔ ماسٹر صاحب نے کہا "اسی طرح پانچ مرتبہ اور دھوؤ تاکہ ریت میں مٹی کا ایک ذرہ بھی نہ رہنے پائے، ورنہ تمھارے مچھلی گھر کا پانی گدلا رہے گا۔"

ادھر احسن میاں ریت کو دھونے گئے، ادھر ماسٹر صاحب نے گھاس کا جڑ سمیت ایک گچھا بنایا اور اُسے پانی سے خوب صاف کر کے رکھ لیا۔

احسن میاں ریت لے کر آئے اور گھاس دیکھ کر کہنے لگے۔ "ارے ماسٹر صاحب، یہ تو ہری ہری ہو گئی، ہم جب توڑ کر لائے تھے تو میلی میلی تھی، جیسے پیلے رنگ کی۔"

ماسٹر صاحب نے کہا "اچھا اب مرتبان لاؤ۔ اور مالی سے کہو، برتن خوب صاف کر کے کنویں سے تازہ تازہ پانی لائے، اور ہاں ایک چھوٹا سا پتھر تو اٹھا لاؤ۔ اس گچھے میں باندھ دیں تاکہ پانی میں ڈوب جائے اور ریت سے اپنی خوراک لے لے، ورنہ اوپر ہی اوپر تیرتی رہے گی اور بھوک کے مارے مر جائے گی۔"

اتنے میں مالی بہت صاف پانی لایا۔ ماسٹر صاحب نے یہ پانی مرتبان میں بھر دیا، اور اس میں پہلے ریت ڈال دی۔ جب ریت پانی کے نیچے بیٹھ گئی تو گھاس بھی مرتبان میں ڈال دی۔ مچھلی گھر بالکل تیار ہو گیا۔ ہری ہری گھاس ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے صاف ستھرے تالاب میں سچ مچ کی اُگ آئی ہو۔

ماسٹر صاحب نے کہا "لو بھئی تمھارا مچھلی گھر

تو تیار ہوگیا، صرف مچھلیوں کی کمی ہے۔ اسے نہایت احتیاط سے اپنے باغ میں کسی محفوظ جگہ پر رکھ آؤ۔ کل اس میں مچھلیوں کو لاکر بسائیں گے۔"

ماسٹر صاحب چلے گئے تو احسن میاں مچھلی گھر کو لے کر چلے۔ اس قدر خوش تھے جیسے عید کے دن بچے نئے نئے کپڑے پہن کر اور عیدی پاکر خوش ہوتے ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے مچھلی گھر اُٹھائے باغ میں جا رہے تھے مگر یہ پانی کی وجہ سے بے حد وزنی ہوگیا تھا۔ وہ تو کہیے اُن کے ماموں جان مل گئے نہیں تو باغ تک جاتے جاتے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ اُن کے ماموں جان نے لپک کر مچھلی گھر اُن کے ہاتھ سے لے لیا اور باغ میں ایک نہایت محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔

دوسرے دن چھٹی تھی، پر آج وہ اور بھی تڑکے سے اُٹھے اور سیدھے باغ میں پہنچے۔ تھوڑی دیر میں ماسٹر صاحب بھی آگئے۔ احسن کو معلوم ہوا تو دوڑے دوڑے آئے اور ماسٹر صاحب کو باغ میں لے گئے۔ ماسٹر صاحب وہاں مچھلی گھر دیکھ کر خوش ہوئے اور کہنے لگے "اچھا ہمیں اب مچھلیوں کا انتظام کرنا ہے۔ آج اس گھر میں مچھلیوں کو لاکر بسا دینا ہے۔"

"تو ماسٹر صاحب دریا کی طرف چلئے۔ ماموں کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ وہ بہت جلد مچھلیاں پکڑ دیں گے۔"

"ہاں ماموں کو بھی لے لو۔ لیکن مچھلی گھر کے لئے مچھلیوں کو بڑی احتیاط سے پکڑا جاتا ہے تاکہ اُن کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ مچھلیاں تمھارے مچھلی گھر کی مہمان ہوں گی۔ مہمان کی خاطر کرنی چاہئے۔ اچھا اپنے ماموں سے کہو کہ وہ اپنے چارے کا برتن لے لیں اسی میں مچھلیاں پکڑ کر لائیں گے، اور ہاں تم نے تتلیاں پکڑنے کے لئے جو جال خریدا تھا اُسے لے لو۔ پہلے جو خریدا تھا، وہ نہیں، وہ کمزور ہوگیا ہے۔ مچھلیوں کے لئے ذرا مضبوط ڈورے کا جال چاہیے۔ تمھارا نیا جال ٹھیک رہے گا۔"

یہ سب چیزیں لے کر ماسٹر صاحب، احسن اور اُن کے ماموں، دریا کی طرف چلے۔ تھوڑی دیر میں دریا کے پاس ایک نالا ملا اس میں پانی پر تیرنے والی گھاس بہت اُگی ہوئی تھی۔ ماسٹر صاحب نے کہا "دریا پر کہاں جاؤ گے، یہیں بہت سے مہمان (مچھلیاں) مل جائیں گے۔" ماسٹر صاحب احسن سے جال لے کر ایک جگہ بیٹھ گئے جہاں پانی گھاس سے بالکل ڈھکا ہوا تھا۔ انھوں نے جال کو زور سے دبایا اور وہ گھاس کے اندر تک چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک جال کو اسی طرح پانی میں رکھا، اور پھر نکال لیا جال میں گھاس ہی گھاس بھری ہوئی تھی۔ احسن میاں بہت مایوس ہوئے۔ "ماسٹر صاحب یہاں مچھلیاں نہیں ملیں گی۔ دریا پر چلئے۔" ماسٹر صاحب نے کہا

تم بڑے جلد باز ہو۔ دیکھو، ابھی اسی گھاس میں سے کتنی مچھلیاں نکلتی ہیں۔ اچھا آنکھیں بند کرو۔ جب میں کہوں تب کھولنا۔ دیکھو تم جھانک رہے ہو۔ بند کرو اچھا اب کھول دو۔" احسن میاں نے آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چار پانچ خوب صورت مچھلیاں جال میں پڑی ہوئی ہیں۔ ان کے ماموں نے چائے کے برتن میں تھوڑا سا پانی بھرا اور مچھلیوں کو اس میں انڈیل دیا۔ ماسٹر صاحب نے ایک دوسری جگہ پھر جال پھینکا۔ اب کی مرتبہ چار پانچ چھوٹے چھوٹے گھونگھے اور آٹھ دس دوسرے پانی کے کیڑے چلے آئے اس کے بعد انھوں نے پانی پر تیرنے والی گھاس کا گچھا
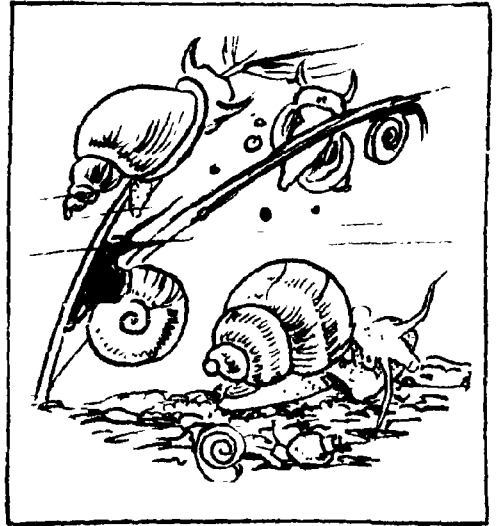
اکھیڑ لیا اور اس کو بھی جال میں رکھ لیا۔ احسن میاں نے پوچھا "ماسٹر صاحب یہ سب کیا ہوگا۔" ماسٹر صاحب نے کہا "اب چپکے سے گھر چل دو، وہیں بتائیں گے۔"

تینوں شکاری گھر آئے۔ منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد ماسٹر صاحب اور

احسن باغ میں گئے یہاں ماسٹر صاحب نے پہلے گھاس کو خوب صاف کیا اور اس کے بعد مچھلی گھر میں ڈال دیا۔ گھاس کی پتلی پتلی جڑیں پانی کے نیچے لٹک گئیں اور اس کے چکنے چکنے پتے پانی پر تیرنے لگے اور پانی کی سطح اس طرح ڈھک گئی جیسے تسلے کے اوپر کسی نے گھاس کے پتے جڑ دیے ہوں۔ پھر مچھلیوں اور گھونگھوں کو پہلے تازے پانی میں صاف کیا اور پھر گھاس پر چھوڑ دیا۔ مچھلیاں بڑے مزے میں گھاس کو چیر کر اندر چلی گئیں اور لگیں ادھر ادھر تیرنے۔ گھونگے چپ چاپ پانی کی تہ میں جاکر بیٹھ گئے۔

اب تو احسن تھے اور مچھلی گھر۔ اتنے خوش تھے اتنے خوش تھے کہ کچھ نہ پوچھو۔ پہلے تو نیچے سے دیکھ رہے

تھے۔ یک بیک خیال آیا کہ دیکھیں اوپر سے کیسی لگتی ہیں۔ اوپر گھاس ہی گھاس، کچھ نظر ہی نہ آیا۔ ماسٹر صاحب سے کہنے لگے۔" ماسٹر صاحب اوپر سے تو ہم دیکھ ہی نہیں سکتے، یہ گھاس آپ نے کس لئے ڈال دی ہے؟ اسے پھینک دیجئے" ماسٹر صاحب نے کہا" پھینک دو، لیکن مچھلیاں ڈر ڈر کر مرجائیں گی۔ یہی گھاس تو اُن کے اس گھر کے لئے چھت ہے تمھارے گھر میں چھت نہ ہو تو رہ سکو گے؟ مچھلی کی عادت ہوتی ہے کہ اگر اس کو پانی کے اوپر کسی کا سایہ نظر آئے تو وہ اپنے کو خطرے میں سمجھنے لگتی ہے وہ یا تو بھاگنے کی کوشش کرتی ہے یا گھبرا کر مرجاتی
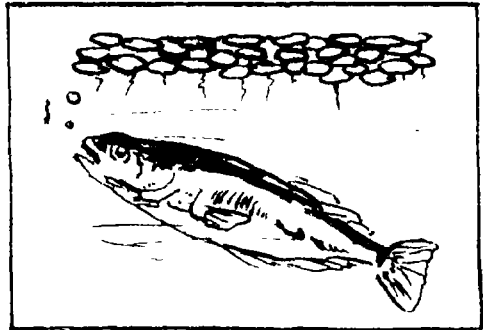
ہے۔ مچھلی کے لئے اس گھاس کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ مچھلیاں اس میں نہیں رہ سکیں گی"

"اور ماسٹر صاحب، آپ نے وہ گھونگھا کس لئے ڈالا ہے؟"

"گھونگھے، پانی سے جو کائی جم جاتی ہے اسی کو کھاکر زندہ رہتے ہیں۔ برتن میں پانی جب زیادہ دن تک رہتا ہے تو اس میں کائی جم جاتی ہے، تمھارے مچھلی گھر کے کناروں پر جب کائی جم جائے گی تو بُرا معلوم ہوگا نا! یہ گھونگھے وہ سب کائی چاٹ جائیں گے اور مچھلی گھر صاف ستھرا رہے گا"

"اچھا بھائی! انھیں کھانے کو کیا دوگے؟ انھیں بڑھیا اور لذیذ کھانا دینا چاہئے۔ بے چاری اپنا پیارا گھر تالاب چھوڑ کر آئی ہیں، تمھارے یہاں اچھا کھانا نہیں ملے گا تو اُن کا دل دکھے گا"

"ماسٹر صاحب ہم انھیں گوشت کاٹ کاٹ کر کھلائیں گے۔ جیسے اپنی مرغی کے بچوں کو کھلاتے ہیں۔ دیکھئے وہ گوشت کھا کھا کر کتنے موٹے ہوگئے ہیں۔ مچھلیاں بھی موٹی ہوجائیں گی۔ جی ماسٹر صاحب"

"لیکن بھئی ہر ایک کے لئے کھانے کی چیزیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ ہم روٹی، سالن، دال کھاتے ہیں۔ تمھارے مرغی کے بچے گوشت کے ٹکڑے دانے دُنکے، ننھے ننھے کیڑے کھاتے ہیں۔ ان مچھلیوں کا کھانا ہم سب سے الگ ہے۔ یہ صرف ننھے ننھے کیڑے ہی کھاتی ہیں۔ ان کو یہی خوراک دیا کرنا۔ یہ کھانا مچھلیاں بڑے شوق سے کھاتی ہیں" "جی اچھا ماسٹر صاحب۔ ڈھیر سے کیڑے لاؤں گا۔ خوب کھلاؤں گا"

"ایک بات اور۔ یہ گھونگھے پوری کائی نہیں چاٹ سکیں گے اس لئے ہر پندرھویں روز مچھلی گھر کی صفائی بھی کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ مچھلی گھر میں اِدھر اُدھر

کی چیزیں بھی پڑ جاتی ہیں، اُن کو نکالتے رہنا چاہیئے ابھی تو تم اس کو باغ میں لے جا کر رکھ آؤ۔ اور روزانہ ان مچھلیوں کو کھانے کے لئے ننھے ننھے کیڑے دیا کرو۔ ابھی یہ تیرنے والی گھاس ذرا پھیلی نہیں ہے۔ اس پر جب بارش کی دو چار بوندیں پڑ جائیں گی تو یہ پوری طرح سے کھل جائے گی۔"

"ماسٹر صاحب وہ آپ نے جال میں دوسرے کیڑے جو پکڑے تھے، اُن کا کیا ہوگا؟ وہ بھی مچھلی گھر میں رہیں گے؟"

"ہاں رہیں گے تو وہ بھی اسی مچھلی گھر میں لیکن ابھی ایک مہینے تک مچھلیوں کو ہی رہنے دو۔ اگلے مہینے میں ہم تم کو مچھلی گھر صاف کرنے کے طریقے اور ان کیڑوں کے متعلق باتیں بتائیں گے۔ اب تمھارا مچھلی گھر تیار ہو گیا ہے۔ دیکھو اس کی حفاظت کرتے رہنا اس کو اوپر سے ایک شیشے کی پلیٹ سے ڈھک دینا نہیں تو چڑیاں آکر مچھلیوں کو تنگ کریں گی۔ اب جاؤ۔ اپنے دوستوں اور ابا کو بلاؤ۔ وہ سب لوگ دیکھ کر خوش ہوں گے اور تمھیں انعام دیں گے۔"

تھوڑی دیر میں احسن کے ابا، محسن، صفیہ، مونا سعیدہ، راجو سب آگئے۔ احسن کہنے لگے "اہا میرا مچھلی گھر دیکھو۔ کیسی اچھی اچھی مچھلیاں تیر رہی ہیں۔ جیسے سچ مچ کا تالاب ہو۔"

احسن کے ابا اور سب حیرت سے مچھلیوں کو دیکھ رہے تھے۔ صفیہ نے کہا "ایک مچھلی پکڑ لوں؟" احسن نے کہا خبردار جو میری مچھلی کو ذرا بھی چھیڑا۔ بڑی آئیں وہاں سے مچھلی پکڑنے والی۔" صفیہ بے چاری کھسیانی سی ہو کر رہ گئی۔

شاخ پیام برادری دہلی

(دائیں سے بائیں کرسیوں پر آگے) عمر کامل (صدر)- آپا جان- حسن احمد قنوجی (سکریٹری)
(بیٹھے) عروج الحسن صاحب (مربی)- رشید نعمانی صاحب (مربی)-
حکیم محمد کامل صاحب (مربی)- قاسم حسن صاحب (مربی)-
(کھڑے ہوئے) محمد یوسف صدیقی (نائب صدر)- محمد علی بھٹکلی (رکن)-
سلیم اختر (خزانچی)- سید صلاح الدین (نائب ناظم)-

تالکٹ کیمپ کا ایک منظر

جناب سعید انصاری صاحب پرنسپل استاد دوم مدرسہ جامعہ

اکثر بچے یہ سرخی دیکھ کر منہ بنائیں گے بعض اس کا عجیب نام ہی پڑھ کر دیکھنا چاہیں گے کہ اس میں لکھا کیا ہے؟ اصل میں یہ بچوں کے ایک کیمپ کا حال ہے جو "ٹالکٹ" نامی امریکہ کے ایک چھوٹے سے مقام پر قائم کیا گیا تھا۔ یہ جگہ نیویارک شہر سے کچھ دور ایک نہایت خوش نما پہاڑی پر واقع ہے۔ یہاں کبھی پرانے زمانے میں سرخ ہندیوں کی بستی تھی اور یہ نام غالباً انھی کے وقت سے چلا آتا ہے۔ ٹالکٹ عام سطح زمین سے کچھ بلندی پر واقع ہے، اور اس کا راستہ پیچ در پیچ ہو کر اس بلندی تک پہنچتا ہے۔ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر دوسری جانب دیکھیے تو ایک نہایت خوش نما صاف شفاف پانی کی جھیل ہے جس کے ایک طرف ہرے بھرے درختوں کا ایک جنگل ہے۔ یہ کیمپ اس جھیل کے چاروں طرف واقع ہے۔

ٹالکٹ کیمپ اصل میں ابتدائی مدرسے کے بچوں کا کیمپ ہے۔ اور اس کیمپ میں کوئی ۷ سال کی عمر سے لے کر ۱۴ سال کی عمر تک کے بچے آتے ہیں، اور کل تعداد کوئی ۲۰۰ کے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ کیمپ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں لگتا ہے جن پر نہایت اونچے اونچے درخت سایہ کیے ہوتے ہیں۔ ہر کیمپ میں ۷ بچے اور ایک ان کا نگراں ہوتا ہے۔ ان کے سونے کے لیے اوپر تلے دو دو زینے کے بستر ہوتے ہیں یعنی اس قسم کی جیسی سفری چارپائیاں ہوتی ہیں اور یہ انھی پر اپنے توشک یا کمبل بچھا کر سوتے ہیں۔

اس کیمپ کے یا اس قسم کے دوسرے بہت سے کیمپوں کے وجود میں آنے کی وجہ اصل میں یہ ہے کہ بچے سال بھر تک شہر کی شور بھری زندگی اور گھٹی ہوئی آب و ہوا سے تنگ آجاتے ہیں اور وہ کوئی کھلی جگہ یا صاف فضا چاہتے ہیں، جہاں وہ آزادی سے چل پھر سکیں اور سانس لے سکیں اس کے علاوہ اسکول اور مدرسے کے معمولی کاموں سے وہ اتنا گھبرا اٹھتے ہیں کہ وہ کوئی ایسے کام کے

خواہش مند ہوتے ہیں۔ جو وہ اپنی خوشی اور طبیعت سے کرسکیں اور انھیں ہر وقت کوئی روک ٹوک کرنے والا۔ اُن کے سر پر بھوت کی طرح سوار نہ ہو۔ پھر گرمی کا زمانہ خواہ گرم ملک کا ہو یا ٹھنڈے ملک کا، ایسا ہوتا ہے کہ انسان ٹھنڈک، پانی کا قرب اور اردگرد سبزا اور ہریالی چاہتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ایسے کیمپوں کی تحریک شروع ہوئی۔

تالکت کیمپ جس کا ذکر تم اس مضمون میں پڑھوگے نہ صرف اپنے موقع اور جگہ کے لحاظ سے بہترین کیمپ ہے بلکہ اس کا روزمرہ کا پروگرام نہایت بہترین تعلیمی اصولوں اور بچوں کی صحیح دلچسپی اور شوق کے کاموں پر مبنی ہوتا ہے، اس کے نگراں اور کام کرنے والے مختلف کھیل کود اور دلچسپی کے کاموں کے ماہر ہوتے ہیں اور یہ بچوں کے نگراں اور دیکھ بھال کرنے والے اصول تعلیم اور بچوں کی نفسیات کے بڑے واقف کار اور تجربہ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اس کیمپ کا صحیح اندازہ ان کے روزمرہ کے پروگرام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے زیادہ بہتر ہو سکتا ہے جو ان چیزوں پر مبنی ہیں۔

ورزشی کھیل

یوں بے ضابطہ کھیل کود کے لئے تو انھیں پوری آزادی ہوتی ہے لیکن بہت سے بچے چاہتے ہیں کہ باقاعدہ کھیلوں میں سے بھی چند ایک منظم طور پر ہوا کریں۔ چنانچہ ہر روز صبح کو فٹ بال، باسکٹ بال وغیرہ ہوا کرتا ہے۔ اور سہ پہر کے وقت آپس میں کوئی میچ بھی ہو جاتا ہے۔ جس سے اُن کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے

حرفے اور دستکاریاں

ورزشی کھیلوں کے بعد دوسرے درجے پر جس میں بچوں کا سب سے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، وہ مختلف چھوٹے چھوٹے حرفے اور دستکاریاں ہیں۔ ان حرفوں میں سب سے زیادہ مقبول چمڑے کا کام، پیتل کا کام، بید کا کام، ابرک کا کام وغیرہ ہیں۔ جن میں بچے چمڑے کی بیلٹ یا پیٹی، کنجیاں رکھنے کا خانہ۔ بڑے چاقو رکھنے کے خانے۔ پیتل کی سگریٹ جھاڑنے کی چھوٹی چھوٹی طشتریاں اور ابرک کی انگوٹھیاں اور پھل رکھنے کی ٹوکریاں بناتے ہیں۔ یہ حرفے اور دستکاریاں بچوں کے لئے ایک بالکل نیا شغل ہوتا ہے، اُن کی معمولی پڑھائی اس قدر کتابی ہوتی ہے کہ وہ ہاتھ کے کام کے لئے ترستے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور انھیں یہ موقع بہت غنیمت معلوم ہوتا ہے

لیکن یہ حرفے اور دستکاریاں کچھ انھی چیزوں پر مبنی نہیں ہوتی ہیں بلکہ اپنے ماحول کے

لحاظ سے کچھ قدرتی سامان اور مقامی اشیار سے بھی وابستہ ہوتی ہیں، مثلاً بعض درختوں کی چھالوں سے مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں یا بعض پل کے ڈوڈے اور پتیوں سے بہت سی چیزیں بن سکتی ہیں۔ ان میں بچوں کی جدت طبع اور قوت اختراع کے کام میں لانے کا زیادہ موقع ملتا ہے، اس لئے ان کا بہت سا وقت اس کام میں صرف ہوتا ہے۔

ہائی کنگ اور ڈیرے ڈالنا

ہائک یہاں کی عام اصطلاح میں سیر و تفریح کی غرض سے پیدل چلنے کو کہتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ایک خاص لباس ہوتا ہے، اور ساتھ لے جانے کے لئے مخصوص سامان، اس لئے کہ اکثر راتیں ڈیرے ڈال کر رہنے اور کھانے پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیشتر خود ہی کھانا پکانا بھی ہوتا ہے، اور اکثر بچے زندگی کے اس نئے تجربے کے لئے بے چین رہتے ہیں، اور اگرچہ وہ اس میں اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے کچھ بہت کامیاب نہیں ہوتے لیکن اس تجربے سے گذرنے کے لئے وہ بے قرار ضرور ہوتے ہیں۔ ہائیکنگ اور کیمپنگ دونوں کی کامیابی بہت حد تک نگراں پر موقوف ہوتی ہے جو بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اسے خود بھی اس کا پورا تجربہ اور اس سے شوق ہونا چاہئے اور وہی بچوں کو بھی اس تجربے سے پورا پورا لطف اور فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچا سکتا ہے۔

ہائیکنگ اور کیمپنگ کا یہ تجربہ واقعی بچوں کے لئے بہت نفع بخش اور پر از لطف ہوتا ہے۔ اس بڑے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے سامانِ سفر کی تیاری راستے میں موٹر اور لاریوں سے بچاؤ کی تدبیریں، راستے اور موڑ کا پتہ رکھنا اور پھر منزل مقصود پر پہنچ کر ڈیرے کے لئے مناسب جگہ کا تلاش کرنا دھوپ اور بارش سے حفاظت۔ یہ سب ایسے مواقع ہیں جن میں بچے بہت سی ایسی باتیں سیکھ سکتے ہیں جو وہ اپنی تمام زندگی میں شاید کبھی بھی نہ جان سکتے

مطالعۂ فطرت

ایک بڑا پسندیدہ شغل بچوں کا کیمپ کے زمانے میں ایسی چیزوں کی تلاش سے تعلق رکھتا ہے جسے مطالعۂ فطرت کہتے ہیں حقیقت میں اس کا منشار چنداں فطرت کا کوئی باقاعدہ مطالعہ نہیں ہوتا جتنا اس عمر میں اپنی تلاش اور تجسس کی عادت کو تشفی دینا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ مختلف قسم کی پھول، پتیاں، پانی پر جمی ہوئی کائی، کیڑے مکوڑے، مینڈک اور مچھلیاں، چڑیوں کے خالی گھونسلے اور بہت سی اس قسم کی چیزیں جمع کر لاتے ہیں۔ جن سے یقیناً انھیں بہت کچھ کائنات فطرت سے متعلق معلومات بھی حاصل ہوتی ہوں گی کیمپ

کے سلسلے میں لٹوؤں اور پٹیوں کا ایک بھونڈا سا عجائب خانہ بھی ہوتا ہے۔ جہاں یہ سب چیزیں اکٹھا ہوتی ہیں لیکن بعض بچے اس پر اکتفا نہیں کرتے اور اپنے کیبنوں کو بھی چھوٹا چھوٹا میوزیم بنا رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف بچوں کی تلاش کرنے کے سلسلے میں محنت اور مشقت قابل ستائش ہے بلکہ وہ جس طرح ان چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اُن کی دیکھ بھال رکھتے ہیں، وہ اس سے زیادہ قابل داد ہے، اس لئے کہ وہ کسی عارضی جذبے کا نتیجہ نہیں، بلکہ اُن کے مسلسل شوق اور لگاتار دلچسپی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

کہانیاں اور ڈرامے

یوں تو اکثر کام اس کیمپ کے زمانے میں ایسے ہوتے ہیں جن میں چلنے پھرنے اور دوڑ دھوپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن میں ایک جگہ بیٹھے رہنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ خصوصاً یا تو رات کے وقت ہوتا ہے یا جب بارش ہوتی ہے۔ ایسے موقعوں پر بچے نہایت شوق سے کوئی جوش دلانے والی کہانی یا خیالی قصے سننا پسند کرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ کہانیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے ان کی مذہبی اور اخلاقی زندگی پر اثر پڑتا ہے۔ اور بہت سی صورتوں میں تو وہ صرف ان کی کُرید اور جستجو کی پیاس کو بجھاتی ہیں۔

کہانیاں سننے کے ساتھ ساتھ وہ کہانیوں کے ڈرامے کرنے کے بھی ویسے ہی شائق ہوتے ہیں۔ اس کیمپ میں سب سے مشہور ڈرامہ جو بچوں نے کیا تھا وہ 'رابن ہوڈ' کا تھا۔ اکثر وہی ڈرامے کامیاب ہوتے ہیں جن کے قصے اُن کو بہت پسند آتے ہیں۔ حقیقت میں کسی کہانی کا شوق کے ساتھ سُننا اور اس کا کامیابی کے ساتھ ڈرامہ کرنا دونوں کا اصل راز یہ ہے کہ بچہ اپنے کو اسی حالت میں تصور کرنا چاہتا ہے۔

کبھی کبھی اُن کی کامیاب نقلیں بعض کھیلوں کے سلسلے میں بھی ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ڈاکو اور سپاہی کا کھیل یا آگ بجھانے کا کھیل، چھوٹے بچے اچھا کھیلتے ہیں اور اس سلسلے میں اُن کے جسم کی حالت اُن کا بھاگنا دوڑنا اور اُن کی دوسری حرکتیں کسی طرح ایک مشاق ایکٹر سے کم نہیں ہوتیں۔

ان باقاعدہ مشاغل کے علاوہ بہت سی ایسی بے ضابطہ باتیں ہوتی ہیں جن میں بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں مثلاً اجتنی وقت جھیل کے کنارے ریت میں کچھ بچے جمع ہو گئے اور پرانے زمانے کا محل بنانا شروع کر دیا۔ یہ بادشاہ کے سونے کا کمرہ ہے، یہاں بادشاہ کی فوجیں رہا کرتی تھیں، اس جگہ بادشاہ کے گھوڑے بندھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح بلیوں اور لٹھوں سے پرانے

زمانے کے پانیر یعنی سب سے پہلے بسنے والوں کے مکانات بنانا شروع کئے اور اُن کی زندگی کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ یا کہیں کسی طرف جنگل میں نکل گئے اور کچھ درخت ادھر ادھر کاٹ کر آرام گاہ بنالی۔

اس طرح باضابطہ اور بے ضابطہ کاموں کا ایک ایسا سلسلہ ہوتا ہے کہ بچے دو ڈھائی مہینے کے اس عرصے میں سال بھر کی ساری کلفتیں بھول جاتے ہیں یا پھر اگلی سال اس مدت کا ایک ایک دن یاد کرتے رہتے ہیں۔ کیا ہم بھی کوئی اس قسم کی چیز اپنے ہاں شروع کرسکتے ہیں۔ ضرورت تو بہت ہے، لیکن شروع کرنے والا کون ہو؟

برما میں یہ پگوڈا ایک پتھر پر بنا ہے اس کے ایک طرف گہرا غار ہے۔ ہوا چلتی ہے تو یہ ہلنے لگتا ہے کہتے ہیں کہ بدھ کے ایک بال کی برکت سے اس کا وزن سنبھلا ہوا ہے اور یہ گرنے نہیں پاتا
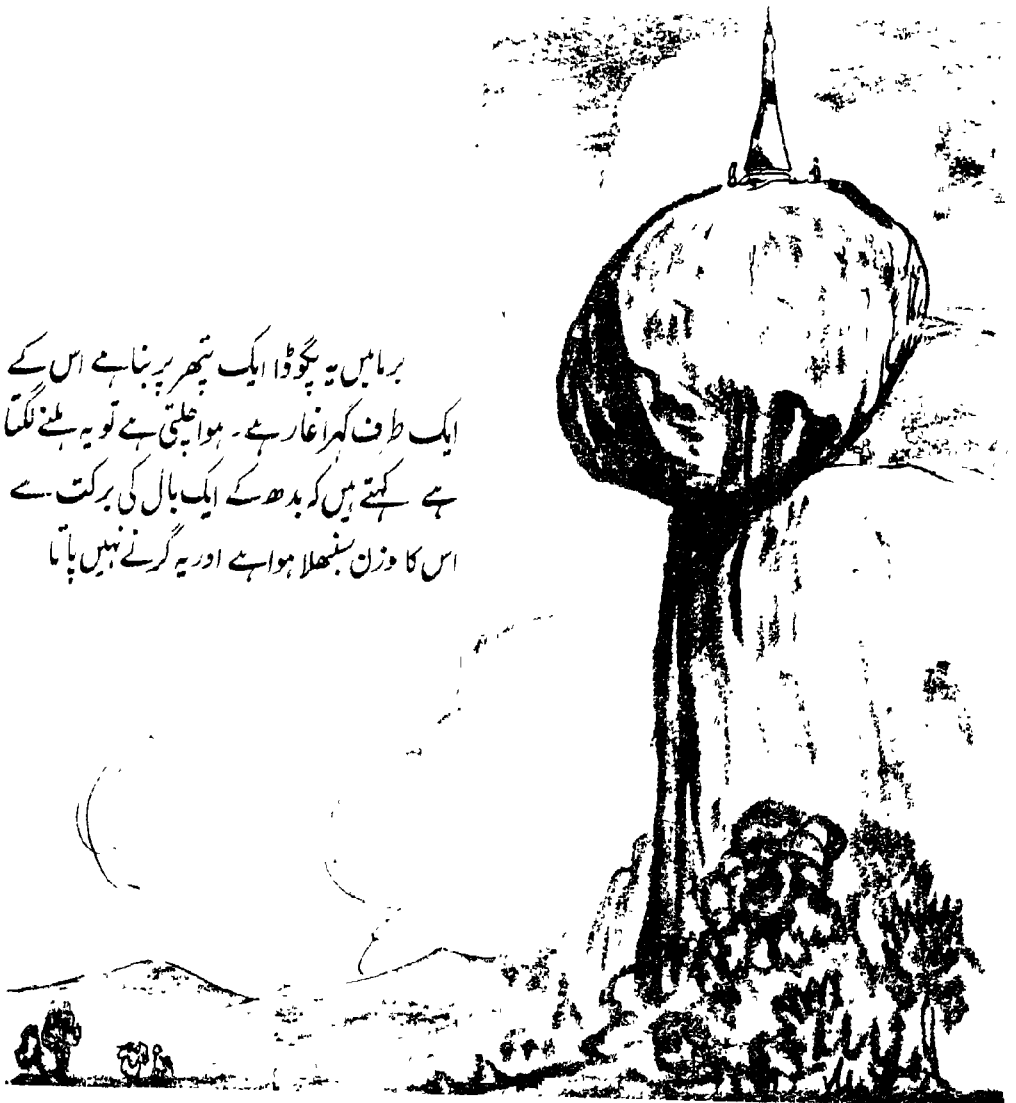
پرندوں کی عدالت

پُھل چسپی کو کس نے مارا
میں نے میں نے میں نے
بولی اک چھوٹی گوریا
تیروں سے ہاں مارا میں نے

کس نے اس کا کفن سیا تھا
میں نے۔ میں نے میں نے
بول اٹھا اک بیا پرانا
سی ہے اس کی کفنی میں نے
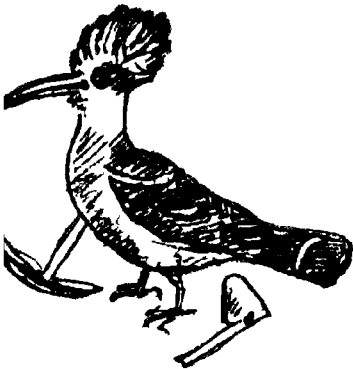
کس نے اس کی قبر ہی کھودی
میں نے میں نے میں نے
بول اُٹھا پھر ہُدہُد بھی
اس کی قبر ہی کھودی میں نے

کس نے لحد میں لاش اُتاری
میں نے میں نے۔ میں نے

بول اُٹھی اک بطخ پرانی
قبر میں لاش اُتاری میں نے

ماتم اس کا کس نے کیا تھا
میں نے میں نے میں نے
بول اٹھی اک پیاری شاما
ماتم اس کا کیا تھا میں نے
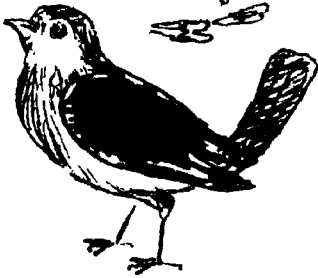
کس نے سب سے پہلے خبر دی
میں نے میں نے میں نے
بولی ابابیل ایک پرانی
پہلے خبر دی سب سے میں نے

دے چکیں جب سب چڑیاں گواہی
رونے لگیں تب چڑیاں ساری
کہنے لگیں تقدیر ہماری
پھل جیسی بے چاری سدھاری

دوسرے دن اک لگ گیا نوٹس
ہووے گی اک قانونی مجلس
بحثیں گے وکیل اور بیرسٹر
گوریا کو پھانسی ہو گی مقرر[1]

[1] یعنی ضرور

معلومات

سنہ ۱۷۱۹ء میں انگلینڈ میں سیلسبری کے قریب ایک انسان کا ۹ فٹ ۴ انچ لمبا ڈھانچا ملا تھا۔

چینی اپنے شہروں کی گلیاں سیدھی نہیں بناتے۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ سیدھی گلیوں پر بھوتوں کے جلوس گذرتے ہیں اور اُن پر قبضہ کر لیتے ہیں۔

لنکا شائر میں سوتی کپڑا اب اس قدر زیادہ بنایا جاتا ہے کہ اگر اس کو پھیلایا جائے تو سورج اور چاند کے درمیان کے فاصلے سے آٹھ گنا زیادہ ہوتا ہے۔ سنہ ۱۹۲۷ء میں ۳۴۳،۶۱۷،۵۰۰ گز لمبا کپڑا بیچا گیا اور ۰۰۰،۳۰۰ ۹۵ پونڈ کا کچا مال اس کی تیاری کے لئے خریدا گیا۔

دنیا میں سب سے گرم مقام پنجاب میں جیکب آباد ہے اور سرد مقام سائبریا میں ورکو بانسک ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ سب سے بڑا دن ۲۱ جون اور سب سے چھوٹا دن ۲۲ دسمبر ہے۔

فارن ہیٹ تھرمامیٹر سنہ ۱۷۱۴ء میں اسحٰق نیوٹن نے ایجاد کیا تھا۔ اس کا نقطۂ جوش ۲۱۲ درجے اور نقطہ انجماد ۳۲ درجے تک ہوتا ہے۔

کیا تمھیں اپنی آنکھوں پر اعتبار ہے؟

محمد حسن صاحب لکھنؤ

آپ ہر وقت اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ جو چیز آپ دیکھتے ہیں وہ ہمیشہ صحیح بھی ہوتی ہے یا کبھی آپ کو دھوکا بھی ہو جاتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آپ سوچتے ہیں کہ آپ ایک چیز دیکھ رہے ہیں۔ مگر ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ جو چیز آپ نے دیکھی ہے وہ وہی ہو جس کے بارے میں آپ نے سوچا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جس میں کہ کچھ کسر یا کوئی عیب نہ ہو۔ آنکھ بھی آدمی کے بدن کا ایک حصہ ہے۔ پھر ہم یہ کیسے مان لیں کہ اس میں کوئی عیب نہیں ہوگا۔ یہی آنکھ جس پر ہم کو اتنا بھروسا ہے کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی چیزوں میں دھوکا دے جاتی ہے۔

اچھا اب مثالیں بھی سن لیجئے۔ آپ کو خود سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ مثال نمبر ۱ کو دیکھئے۔ اس میں ایک موٹی سی بینڈی لکیر ہے اور اس کے بیچوں بیچ ایک سیدھی پتلی سی لکیر کھڑی ہے۔ آپ بتائیے کون سی لکیر بڑی ہے؟ یا بڑی معلوم ہوتی ہے؟ یقیناً کھڑی لکیر بڑی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے، دونوں لکیریں برابر کی لمبی ہیں۔

شکل نمبر ۱

اچھا اب دوسری مثال کو لیجئے (شکل نمبر ۲)

ا

ب
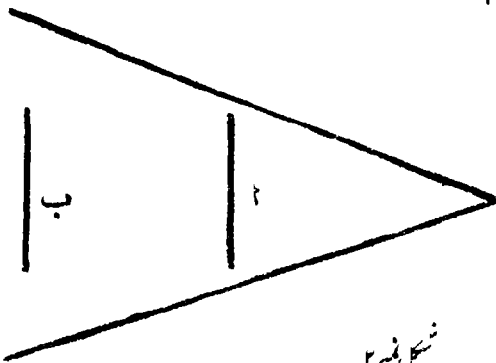
شکل نمبر ۲

اس میں ایک زاویہ ہے اور اس کے بیچ میں دو لکیریں کھنچی ہوئی ہیں۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کون سی لکیر چھوٹی

ہے، بے شک، وہ لکیر جو زاویے کے زیادہ اندر ہے (لکیر الف) لمبی معلوم ہوتی ہے اور (لکیر ب) چھوٹی۔ اچھا اب آپ انھیں ایک پٹری سے ناپیے۔ آپ کو فوراً معلوم ہوجائے گا کہ دونوں لکیریں برابر ہیں!

اگر میں آپ سے پوچھوں کہ کیا آپ صحیح صحیح دو چیزوں کے بیچ کے فاصلے کا اندازہ کرسکتے ہیں تو آپ جھٹ بول اٹھیں گے کہ ارے یہ کیا مشکل ہے۔ مگر نہیں دو چیزوں کے بیچ میں فاصلے کا اندازہ لگانا کافی مشکل ہوتا ہے۔ اچھا تو اگر آپ بہت کہتے ہیں تو بتائیے تو ذرا کہ کون سا فاصلہ زیادہ ہے۔ الف سے ب تک یا ب سے ج تک تصویر نمبر
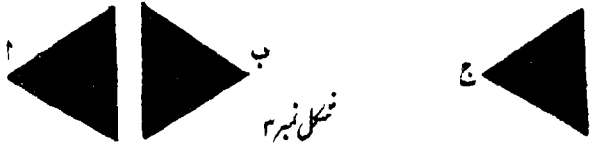
شکل نمبر ۳

آپ فوراً ہی کہہ دیں گے کہ ب سے ج تک فاصلہ زیادہ ہے، آپ غلط کہہ رہے ہیں کیونکہ دونوں فاصلے برابر

کے ہیں۔

ایک نقص آپ کی آنکھ میں اور ہے، وہ یہ کہ اگر آپ کو دو برابر کی چیزیں، ایک کالی اور دوسری سفید، زمین پر دکھائی جائیں تو آپ کو وہ چیز جو کالی زمین پر ہے بڑی معلوم ہوگی۔ یہ دھوکا آپ کو روشنی کی چمک سے ہوتا ہے۔ مثلاً شکل نمبر ۴ کو لیجیے۔ اس میں دو دائرے ہیں ایک سفید اور دوسرا کالا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ سفید دائرہ (جو کالے دائرے سے گھرا ہوا ہے) بڑا ہے یا کالا دائرہ؟ لگتا تو واقعی سفید ہی بڑا ہے۔ مگر اصل میں وہ کچھ چھوٹا ہے۔

اچھا اب بارہ مربعوں کی ترتیب کو دیکھیے اور ذرا اپنی آنکھوں کے قریب لاکر اپنی نگاہ کو اس پر جما دیجیے۔ کچھ لمحوں کے بعد آپ کو کالے مربعوں کے بیچ میں سفید لکیروں پر کالے دھبے

شکل نمبر ۴

دکھائی دینے لگیں گے۔ (شکل نمبر ۵) دیکھیے آپ کی آنکھیں

پھر آپ کو دھوکا دے رہی ہیں۔ وہاں کوئی دھبے وبے نہیں ہیں، اور بالکل صاف لکیریں ہیں۔
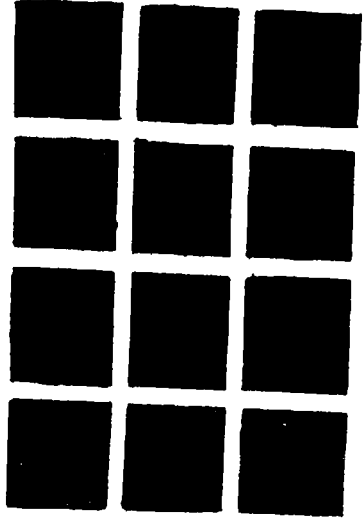
شکل نمبر ۵

اس کے بعد آپ بارہ سفید مربعوں کو دیکھئے (جن کے چاروں طرف کالے کنارے کھنچے ہوئے ہیں)
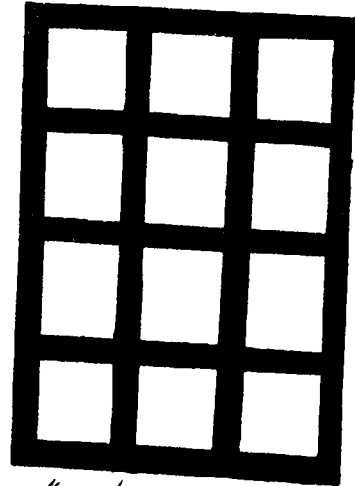
شکل نمبر ۶

اس مرتبہ آپ کو مربعوں کے بیچ کی کالی جگہ پر سفید دھبے دکھائی دیں گے۔ (دیکھئے شکل نمبر ۶)

اچھا اب آپ کو ایک اور چیز بتائیں۔ مگر یہ بتا دیجئے گا کہ آپ کو ڈر تو نہیں لگتا ہے۔ ورنہ کہیں آپ ڈر جائیں تو اور آفت ہو۔ دیکھئے یہ ایک بھوت کی تصویر ہے اور وہ بھی کالے بھوت کی۔ (شکل نمبر ۷)؛ آپ اسے لیجئے اور ایک سے لے کر بیس تک گنتی گنئے، اور اس بھوت پر اپنی نظر جمائے رکھئے۔ جب آپ گنتی گن چکیں تو ذرا اندھیری دیوار یا پردے کی طرف دیکھئے آپ کو ایک سفید بھوت کی تصویر چلتی نظر آئے گی۔

شکل نمبر ۷

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آپ کو یقین نہیں آیا، تو لیجئے، دو ایک تجربے کر لیجئے۔ ایک ایسی کتاب یا کوئی اور چیز لیجئے جس کا اوپری حصہ کالا ہو۔ اس پر تین دیا سلائیوں سے (Y) کی شکل بنائیے۔ اچھا اب آپ اس کو ذرا غور سے تو دیکھئے، دیکھیں آپ کیا دیکھتے ہیں۔ ارے یہ Y کی بغل میں Y کا بھوت یا ہمزاد (پرچھائیں) کہاں سے آگیا؟ (شکل نمبر ۸)

دیہ پرچھائیں یا ۷ کا بھوت آپ کو لکیر دار لائن پر ملے گا۔) دیکھئے آپ ایک مرتبہ پھر دھوکا کھا گئے۔ کیوں کہ وہاں سوائے تین دیا سلائیوں کے اور کچھ نہیں ہے
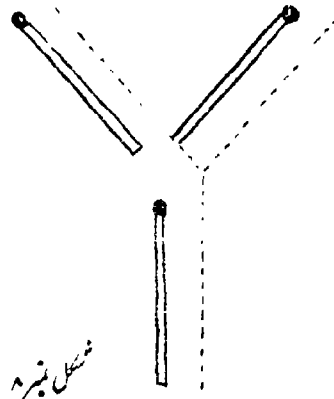
شکل نمبر ۸

اگلی دو مثالیں گو چھوٹی ہیں مگر بہت ہی عجیب پہیلی ہیں (شکل نمبر ۹) آپ ایک چیز دیکھتے ہیں۔ یہ چار ٹانگ کی ایک میز معلوم ہوتی ہے۔ جب آپ اسے
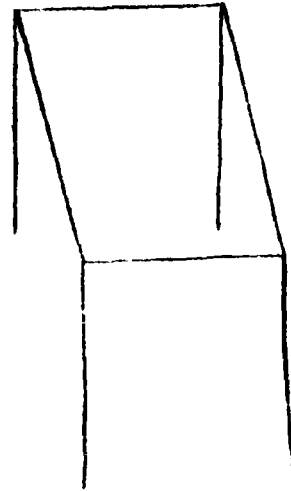
شکل نمبر ۹

پہلے پہل ایسے ہی دیکھئے گا تو معلوم ہوگا کہ آپ میز کا اوپری حصہ دیکھ رہے ہیں۔ اچھا اب آپ تھوڑی دیر اسے دیکھتے رہیے۔ ہائیں! یہ کیا ہوگیا۔ یہ میز تو ابھی سیدھی تھی الٹی کیسے ہوگئی۔ ابھی تو اوپری حصہ دکھائی دے رہا تھا اب یہ اندر کا حصہ دکھائی دے رہا ہے۔ ضرور کسی جن یا بھوت کا کام ہے یا پھر آنکھیں خراب ہوگئی ہیں۔ معلوم نہیں کیا ہوگیا دیکھئے نہ تو آپ کی آنکھیں خراب ہوئی ہیں اور نہ یہ کسی جن بھوت کا کام ہے بلکہ صرف آپ کی آنکھیں دھوکا دے رہی

شکل نمبر ۱۰

ہیں۔ اگر آپ اس کا ثبوت چاہتے ہیں تو آپ اپنی آنکھیں تھوڑی دیر کے لئے اس پر سے ہٹا لیجئے اور پھر دیکھئے، اب آپ کو کیا دکھائی دے رہا ہے؟ دیکھا آپ نے میز سیدھی ہوگئی۔

دیکھئے یہ سب آپ کی آنکھوں کا کرشمہ ہے ورنہ میز تو ویسی رہتی ہے۔ شکل نمبر (۱۰) میں کچھ چھلے دکھائے گئے ہیں جو ایک نلکی کی شکل میں ہیں۔ یہ پہلے پہل تو شاید آپ

کو دکھائی دے گا کہ نلکی ٹیڑھی ٹیڑھی رکھی ہوئی ہے دیکھیں تو آپ کی آنکھوں نے آپ کو کہاں تک صحیح بتایا کچھ دیر تصویر کو گھورتے رہئے۔ چند ہی سیکنڈ میں آپ چلا اٹھیں گے! "یہ نلکی تو سیدھی رکھی ہوئی ہے!" حالانکہ چھلّے ویسے ہی رکھے ہوئے ہیں۔

ابھی تو آپ ایسی چیزیں دیکھ رہے تھے جن کی صرف شکلیں بدل جاتی تھیں۔ اب آپ دیکھیں گے تو ٹھہری ہوئی چیزیں، مگر وہ آپ کو چلتی نظر آئیں گی۔

اچھا اب آپ شکل نمبر ١١ کو لیجئے اور اس کو دونوں آنکھوں کے بیچ میں ناک سے کوئی ایک انچ دور مشاق
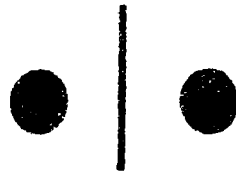
شکل نمبر ١١

نظروں سے دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ دونوں کالے دھبے اپنی جگہ سے ہٹ رہے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف آتے معلوم ہو رہے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہونے لگے گا کہ دو کے بجائے ایک ہی رہ گیا۔ اس کے بعد دوسری شکل کو لیجئے (شکل نمبر ١٢) اور اس کے ساتھ بھی یہی عمل کیجئے۔ آپ کو معلوم ہوگا جیسے چھلّے میں کوئی مقناطیسی قوت ہے اور کالا دائرہ، لوہے کا ایک گولا ہے جو چھلّے کی طرف کھنچا جا رہا ہے اور اس کے اندر سے پار ہونا چاہتا ہے

شکل نمبر ١٢

اس سے بھی عجیب شہد کی مکھی اور پھول کا قصہ ہے۔ اس شکل کو لیجئے اور سیدھی لکیر کو اپنی ناک کے

شکل نمبر ١٣

پاس رکھئے اور پھر کچھ اپنی نگاہ پر زور دیجئے۔ آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ یا تو آپ پر کسی نے جادو کر دیا، یا پھر مکھی جادو کی بنی ہوئی ہے۔ اور اگر ان دونوں میں سے کوئی سی بات نہیں ہے تو پھول پر ضرور کسی جادو کا اثر ہے، کیوں کہ آپ دیکھیں گے کہ جس مکھی اور پھول کو آپ نے شکل میں الگ الگ دیکھا تھا اور

ان دونوں کے بیچ میں ایک لکیر بھی کھنچی ہوئی تھی، وہ دیکھی، اب لکیر کو پار کرکے پھول تک آنے کی کوشش کررہی ہے، خدا معلوم کیا بات ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھول میں سے شہد کی مٹھاس کی خوشبو نکل رہی ہے۔ اور اس وجہ سے شہد کی مکھی دیوانہ وار اس کی طرف کھنچی چلی جارہی ہے۔

آپ نے ایکس رے کا نام تو ضرور سنا ہوگا جس کے ذریعے ہڈیوں کا فوٹو لیا جاتا ہے اگر آپ چاہیں تو یہ نتیجہ ایک معمولی کھلونے سے حاصل کرسکتے ہیں۔ ایک پتلا سا دفتی یا کارڈ کا ٹکڑا لیجئے اور اس میں سے چھ انچ لمبی اور ایک انچ چوڑی پٹی کاٹ لیجئے اب اس پٹی کے دونوں سروں پر ایک چھید بنا دیجئے (جیسا شکل نمبر(۱۴) میں دکھایا گیا ہے) اس کے بعد

شکل نمبر ۱۴

کٹی ہوئی لکیر پر پٹی کو موڑ لیجئے، اور چھیدوں کے بیچ میں مرغی کا ایک سفید پر رکھ دیجئے۔ اب پٹی کے سروں کو گوند یا لیبی سے چپکا کر، پر کا باقی حصہ ایک قینچی سے کاٹ ڈالیئے۔ بس اب خوش ہوجائیے آپ کا (۔ ایکس رے (X, ۲۹۷) تیار ہوگیا۔ (دیکھئے شکل نمبر ۱۵) مگر ایک بات ابھی باقی ہے، اسے استعمال کیسے کیا جائے، اچھا آپ ایک کھڑکی کے سامنے کھڑے ہوجائیے، ایک ہاتھ میں آلہ لے لیجئے اور دوسرا ہاتھ اپنے سے کوئی پندرہ انچ دور کر لیجئے اور آلے کا سوراخ اپنی ناک کے قریب آنکھ کے سامنے کر لیجئے۔ اب آپ اپنا ہاتھ (جو پندرہ انچ کے فاصلے پر ہے) فوکس (FOCUS) کے لئے آگے یا پیچھے کیجئے؛ آپ کو ایک ایسی جگہ مل جائے گی جہاں سے
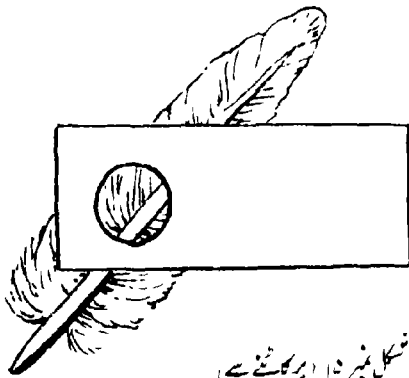
شکل نمبر ۱۵ (پر کاٹنے سے)

ہڈیوں کا عکس بہت آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اب تو آپ ڈاکٹری بھی سیکھ گئے!

یہ لیجئے یہ ایک اور ترکیب، ترکیب کیا ہے بالکل شعبدہ بازی اور معما ہے۔ ایک دفتی لیجئے جو نہ بہت موٹی ہو نہ بہت پتلی؛ اس کی ۴½ انچ لمبی اور ۱¾ انچ چوڑی پٹی کاٹ لیجئے۔ اچھا اب اس پٹی پر گیارہ دیا سلائیوں کی شکلیں برابر فاصلے پر بنا دیجئے (شکل نمبر (۱۶) الف) اس کے بعد پٹی کے ایک سرے

سے دوسرے سرے تک ایسی لکیر کھینچیے جو پہلی دیاسلائی
کے سر کو کاٹے اور آخری دیا سلائی کے نچلے حصے کو کاٹے

شکل نمبر ۱۶ (الف)

(شکل نمبر (۱۶) الف) اب آڑی لکیر سے پٹی کو کاٹ کر
اس کے دو حصے کر دیجیے۔ اب آپ ایک میز پر پہلے کی
طرح پٹی بنا کر رکھ دیجیے اور بہت اچھی طرح سے گن کر
اپنا اطمینان کر لیجیے کہ پوری گیارھوں دیاسلائیاں ہیں
یا نہیں۔ پھر اوپر کے حصے (۱) کو بائیں طرف ایک درجے
سرکا دیجیے، بس ویسے ہی جیسا کہ (شکل نمبر ۱۶ ب) میں
دکھایا گیا ہے۔ اچھا اب تو گنیے، اور بتائیے کہ اب
کتنی دیاسلائیاں ہیں۔ ہائیں! یہ کیا؟ ایک دیاسلائی
کہاں چلی گئی؟ یہ تو دس ہی رہ گئیں! ذرا پھر سے تو گنیے
شاید آپ نے گننے میں غلطی کی ہو (آپ حساب میں تو
کم زور نہیں ہیں؟) ارے! اب کی بھی دس!! یہ ہو کیا
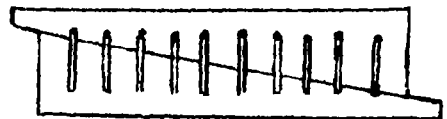
شکل نمبر ۱۶ (ب)

گیا؟۔ اچھا اب زیادہ نہ گھبرائیے اور اوپری حصہ
(۱) کو پہلے کی طرح کر دیجیے۔ اب تو دیاسلائیوں کو
گنیے۔ ہائیں! آپ تعجب میں کیسے پڑ گئے۔ کیا دیاسلائیاں
پوری نکل آئیں؟ معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ
کے گننے میں کچھ غلطی نہیں تھی بلکہ اس میں کوئی ایسی
ترکیب تھی کہ جس کی وجہ سے آپ کی آنکھیں دھوکا کھا گئیں
بہت کم لوگ یہ بتا سکتے ہوں گے کہ گیارھویں
دیاسلائی کہاں چلی جاتی ہے۔ کیا آپ اس بات کو
بتا سکتے ہیں؟ اگر نہیں تو سنیے۔

اس کی وجہ بہت آسان ہے۔ یہ سن کر آپ
کو بہت تعجب ہوگا کہ گیارھویں دیاسلائی ان ہی میں
رہتی ہے، مگر پوری طور پر نہیں۔ یہ ہی اصل وجہ فریب
کی ہے۔ جب آپ دفتی کو کاٹ کر بائیں طرف سرکا
دیتے ہیں تو اس سے ایک دیاسلائی دس برابر،
حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ دسوں دیاسلائیاں
آپ کو شکل (۱۶ ب) میں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں
سے ہر ایک دیاسلائی $\frac{1}{10}$ حصہ بڑھی ہوتی ہے، اور
چونکہ یہ فرق بہت معمولی ہوتا ہے اس وجہ سے آپ کو
سرسری طور پر دیکھنے سے پتہ نہیں چلتا ہے۔ اور آپ
کو دس دیاسلائیاں دکھائی دیتی ہیں۔

ہے نا آسان ترکیب! میں نے پہلے ہی آپ سے
کہہ دیا تھا۔ دیکھا آپ نے، اب، ہر چیز جو آپ دیکھیں
اس پر ہمیشہ یقین نہ کر لیا کیجیے۔

دھنک

(ننھے میاں اپنی ترنگ میں)

لڑکا جو دھنک تک دوڑ گیا سونے کا پیالا اس کو ملے
ایسے بھی ہیں جن کے پاس سدا سونے کا پیالا ساتھ رہے
لیکن وہ دھنک کو پائیں کہاں
معصوم چمک کو پائیں کہاں

رضیہ کے بیاہ کو تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ میاں کے ساتھ پردیس جانا پڑا۔ میاں جمیل (رضیہ کے دولھا) فیروزپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ چھٹی لے کر شادی کے لئے وطن آئے تھے۔ شادی کی ہنسی خوشی میں وقت بڑی جلدی گذر گیا۔ چھٹی ختم ہونے کو آئی اور رضیہ کے جمیل کے ساتھ جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

رضیہ کی ساس بڑی عقل مند اور نیک بی بی تھیں وہ جانتی تھیں کہ میکے میں رضیہ کا سارا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوا ہے۔ گھر کا کام کاج کبھی کیا نہیں۔ فیروزپور میں اکیلی سارے گھر کا انتظام کیسے کر سکے گی۔ انھوں نے بہت چاہا، بہو کو ابھی نہ جانے دیں کچھ روز اپنے پاس رکھ کر گھر کا انتظام اس کے ہاتھ میں دے دیں۔ بہو ہونہار ہے، تھوڑے دنوں میں سب کچھ سیکھ جائے گی اور گھر کا انتظام بڑی اچھی طرح کرنے لگے گی۔ مگر میاں جمیل کب ماننے والے تھے انھوں نے یہ کہہ کر "ماشاءاللہ ہوشیار ہیں، پڑھی لکھی ہیں، سب کر لیں گی۔" ماں کی بات کو ٹال دیا۔ آخر وہ دن آ پہنچا کہ رضیہ جمیل کے ساتھ وطن اور عزیزوں سے رخصت ہو کر فیروزپور چلی گئی۔

فیروزپور میں رضیہ نے دیکھا۔ میاں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے ہیں۔ بنگلہ ہے، موٹر ہے، نوکر چاکر ہیں۔ بہت سے دوست اور اُن کی بیویاں ملنے کو آتی ہیں ایسے گھر کا انتظام بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ رضیہ کچھ گھبرائی مگر سمجھ دار اور بہادر لڑکی تھی۔ اُن لڑکیوں میں نہ تھی جو شادی کی خوشی میں یہ بات بھلا دیتی ہیں کہ بیاہ کے بعد اُن کے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ اور ان پر کتنی ذمہ داریاں آ جاتی ہیں۔ اُسے اپنے فرائض کا احساس اور اس بات کا خیال تھا کہ جمیل یا کسی اور کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس نے بڑی تندہی اور سلیقہ سے گھر کا انتظام کرنا شروع کیا۔ مگر ہر کام کے لئے تجربے کی ضرورت ہے اور تجربہ ہوتے ہی ہوتے ہوتا ہے۔

جمیل نے ایک روز اپنے دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانا چھ آدمیوں کا پکنا تھا۔ مگر اتنا پک گیا کہ بارہ آدمی کھالیں پھر بھی بچ رہے۔ ایک اور بدانتظامی

یہ ہوئی کہ کھانا وقت پر تیار نہ ہو سکا۔ مہمانوں کا بھوک کے مارے بُرا حال ہو گیا تب کہیں کھانا نصیب ہوا۔

اس روز بے چاری رضیہ کو بڑی ندامت ہوئی۔ وہ اس بات کی بہت کوشش کرتی کہ اس کا گھر چند دن کی طرح صاف اور دلھن کی طرح سجا رہے۔ تاکہ جمیل دیکھ کر خوش ہو اور اس کی تعریف کرے لیکن جب غلطیاں ہوتیں بہت سے کام بگڑ جاتے، چیزیں برباد ہوتیں تو رضیہ کو رنج ہوتا۔

ایک دن شام کو جمیل کلب گئے۔ رضیہ کا بیٹھے بیٹھے جی گھبرایا۔ اُٹھ کر بنگلہ کے سامنے ٹہلنے لگی۔ پڑوس میں ایک اور بنگلہ تھا۔ اس میں بڑا خوب صورت باغ تھا، خوش قطع روشوں کے دونوں طرف طرح طرح کے پھول کھلے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی باغ کی خوب صورتی دیکھ کر رضیہ خوش ہوئی۔ دیوار کے قریب جاکر کھڑی ہوگئی، دیکھا، اس طرف بھی ایک خاتون ٹہل رہی ہیں۔ عمر میں رضیہ ہی کے برابر ہوں گی۔ ہاتھ میں سلائیاں اور اون لئے کچھ بُن رہی ہیں۔ انھوں نے جو رضیہ کو دیکھا، پاس آئیں باتیں کرنے لگیں۔ پھر اپنے ہاں لے گئیں۔ تھوڑی دیر کی ملاقات میں اتنا میل بڑھا کہ رضیہ انھیں زہرہ اور وہ اُسے رضیہ کہہ کر پکارنے لگیں۔ رضیہ، زہرہ کا باغ دیکھ کر تو خوش ہو ہی رہی تھی، دل ہی دل میں تعریف کر رہی تھی، گھر دیکھ کر اور بھی حیران رہ گئی۔ ایک ایک چیز سے سگھڑپن ظاہر ہوتا، بات بات سے سلیقہ ٹپکتا تھا۔ ہر چیز میں سادگی اور سادگی میں دل کشی تھی۔ صفائی ایسی کہ گھر بھر میں کوڑا یا گرد کا نام نہیں۔ رضیہ سے نہ رہا گیا بولی "بہن ت[illegible] تمھارا گھر دیکھ کر میرا جی بڑا خوش ہوا۔ گھر کا انتظام ماشاء[illegible] تمھیں خوب آتا ہے اور سجاوٹ میں تو کمال حاصل [illegible] زہرہ نے کہا "بہن کیوں بنا رہی ہو؟ مجھے تو کچھ بھ[illegible] نہیں آتا۔" رضیہ نے کہا "سچ کہتی ہوں میں نے آ[illegible] تک کسی گھر میں اتنا اچھا انتظام نہیں دیکھا، نہ سجاوٹ میں ایسی خوب صورتی پائی۔ میں خود لاکھ کوشش کرت[illegible] ہوں مگر میرے ہاں یہ بات کہاں!" زہرہ بولی "[illegible] ہے یہ بھی کوئی بڑا کام ہے، ذرا سا سمجھ کا پھیر ہے بس" رضیہ نے کہا "یہ سمجھ ہی کا پھیر تو ٹیڑھی کھیر ہے" ہر آدمی وہ سمجھ کہاں سے لائے جو تم میں ہے۔ میں ت[illegible] آج سے تمھاری شاگرد ہوگئی گھر داری کی باتیں تم سے سیکھوں گی۔" زہرا ہنس پڑی کہنے لگی "تو آج [illegible] سے سیکھنا شروع کر دو نا او سب سے پہلے میں تمھیں گھر سجانے پر سبق دیتی ہوں۔ بہت بیبیاں خیال کرت[illegible] ہیں کہ بھڑک دار اور نمائشی چیزوں سے گھر سجتا ہے بہت سارا پیسہ دکھاوے کا سامان خریدنے میں صرف کر دیتی ہیں ایسا سامان بڑی جلدی خراب [illegible] بدنما ہو جاتا ہے۔ مثلاً پردے کچے رنگوں والے چمکیلے کپڑے کے بنا دیئے۔ ایک ہی بار دُھلنے [illegible] اُن کا رنگ خراب ہو گیا۔ اب یہ پردے کمرے

میں لگے ہوئے کیا اچھے معلوم ہوں گے۔ اتنی ہی قیمت پر ایک رنگ سادہ کپڑا پردوں کے لائق بہت اچھا مل جاتا ہے جو برسوں خراب نہیں ہوتا اور سادہ پردے زیادہ اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اب میں تمھیں پھول سجانے کے متعلق کچھ باتیں بتاؤں گی۔ پھول سجانے کا ہنر بہت مشکل ہے۔ میں خود اس میں کچی ہوں۔ جی چاہتا ہے کاش جاپانی عورتوں کی طرح مجھے پھولوں کا سجانا آتا۔" رضیہ بولی "بس، بس رہنے دو، زیادہ باتیں نہ بناؤ (آتش دان کی طرف اشارہ کرکے) یہ پھول تم نے کچھ کم خوب صورتی سے سجائے ہیں! نازک گلدستہ بن گیا ہے!" زہرا نے کہا "یہ تو معمولی بات ہے، دیکھو، گلابی رنگ کا صراحی نما چھوٹا سا پھول دان ہے، اس میں صرف دو گلابی ہی رنگ کے لمبی ڈنڈیوں والے گلاب لگائے ہیں۔ اور بس دو ہی مورپنکھی کے پتے لگاکر پھولوں کو ایک طرف تھوڑا سا جھکا دیا اور پتوں کو پیچھے کی طرف ذرا پھیلا دیا ہے، بس خوب صورت معلوم ہونے لگا" رضیہ نے کہا "اسی کی تو میں تعریف کر رہی ہوں کہ دو پھول اور دو پتے آتش دان پر رکھے ہوئے کیا بہار دے رہے ہیں۔ میں تو رنگ رنگ کے بہت سے پھول پھول دانوں میں لگاکر جگہ جگہ کمروں میں رکھتی ہوں، پھر بھی یہ خوب صورتی نہیں آتی۔" زہرہ نے کہا "بات یہ ہے سجانے کے لئے بہت سے پھولوں کی ضرورت نہیں، دو پھول ہوں مگر قاعدے سے پھول دان میں لگائے جائیں ان کی خوب صورتی کمرے کی سجاوٹ میں چار چاند لگا دے گی۔ اور اگر بہت سے خوب صورت پھول اس طرح سجائے جائیں کہ گلاب، گیندا، زینیا، گل داؤدی یہ سب چھوٹی چھوٹی ڈنڈیوں سے توڑ کر بے تکے پن سے ایک پھول دان میں ٹھونس دئے تو پھول کے پھول خراب ہوں گے اور ان کا بھدّا پن کمرے کی سجاوٹ کو بھی شرما دے گا۔ اسی طرح بہت زیادہ تصویریں بھی کمرے میں لگی ہوئی اچھی نہیں معلوم ہوتیں۔ بہت سے گھروں میں دیکھا ہے، بیٹھک کے کمرے میں کیلنڈر بھی دیواروں پر لٹکائے جاتے ہیں۔ وہ کیلنڈر جو دکان دار اشتہار کے طور پر چھپوا کر تقسیم کراتے ہیں۔" یہ سن کر رضیہ نے جلدی سے کہا "یہ تو مجھے بھی پسند نہیں۔ ایسے کیلنڈر بیٹھک کے کمرے میں واقعی بہت بھدّے معلوم ہوتے ہیں۔" زہرا بولی "بھدّے معلوم ہوتے ہیں اور ایسی سجاوٹ سے گھر کی بیوی کا بھدّا مذاق ظاہر ہوتا ہے۔ اچھے مذاق کے لوگ نشست گاہ میں کیلنڈر رکھتے ہی نہیں۔ ان کی جگہ مطالعے کے کمرے میں یا کھانے اور سونے کے کمروں میں ہوتی ہے۔" رضیہ نے کہا "اچھا، اور وہ تصویریں سجانے کی بات تو رہ ہی گئی (آتش دان کے اوپر دیوار پر اشارہ

کرتے ہوئے) وہ بڑی تصویر کسی باکمال مصور کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے ایسے موقع سے لگائی ہے کہ پوری تصویر پر روشن دان سے چھن کر ہلکی ہلکی روشنی پڑ رہی ہے جس نے اس کی خوبی کو اور بھی بڑھا دیا۔ اتنی اونچی ہے اور کیسی صاف نظر آ رہی ہے۔" زہرہ نے کہا "بات یہ ہے، ہاتھ کی بنائی ہوئی بڑی تصویریں دور سے زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لئے دیوار کے اونچے حصّے پر جہاں روشنی پڑتی ہو ایسی تصویریں لگائی جاتی ہیں۔" رضیہ نے پوچھا "فوٹو سجانے کا اچھا طریقہ کیا ہے۔" زہرہ نے جواب دیا "اسکول یا کالج کے جلسوں یا کسی جماعت کے فوٹو بیٹھک کے کمرے میں نہیں سجائے جاتے۔ گھر والوں یا دوستوں کے اچھے اچھے فوٹو اگر بڑے ہوں تو چوکھٹوں میں لگا کر دیواروں پر لٹکائے اور چھوٹے ہوں تو چاندی یا نکل کے فریموں میں آتش دان یا میزوں پر قرینے سے رکھ دئے جاتے ہیں۔ خوش نما مناظر کے فوٹو نشست گاہ میں بہت خوب صورت معلوم ہوتے ہیں۔" رضیہ نے کہا "شاباش، تمھاری سمجھ بوجھ کی میں داد دیتی ہوں گھر داری کے متعلق اتنی باریکیاں سمجھنے اور سمجھانے میں تمھیں کمال حاصل ہے۔ اچھا ایک بات اور بتاؤ تمھارا گھر اتنا صاف ستھرا کیوں رہتا ہے میں تو بڑی کوشش کرتی ہوں پھر بھی میرے ہاں صفائی نہیں رہتی۔" زہرہ نے جواب دیا "یہ ایک آدمی کے کرنے کا کام نہیں ہے۔ گھر کے سب لوگ صفائی کا خیال رکھیں تو صفائی رہ سکتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک آدمی تو صفائی کرتا پھرتا ہے دوسرے نے پھل چھیل کر چھلکے صحن میں پھینک دئے۔ تیسرے نے خط چاک کرکے پرزے فرش پر ڈال دئے، بچے ہیں کہ جگہ جگہ کوڑا کرتے پھرتے ہیں۔ نوکر چیزوں کو بے ٹھکانے کر دیتے ہیں لیکن گھر کی بیوی کا اتنا فرض ضرور ہے کہ وہ گھر والوں پر صفائی رکھنے کی تاکید کرے۔ بچوں کو ایسی تربیت دے کہ وہ اپنے کھلونے، کتابیں اور کپڑے وغیرہ جو جگہ ان کے لئے مقرر ہو وہیں سنبھال کر رکھا کریں۔ گھر کی چیزوں کو نہ بگاڑیں۔ نوکروں پر تاکید رہے، وہ جو چیز جس جگہ سے اٹھائیں پھر وہیں رکھیں کوڑا، کوڑے کے کنستر میں ڈالیں، اِدھر اُدھر نہ پھینک دیا کریں۔ ہفتے میں ایک دن، گھر بھر کی صفائی کے لئے مقرر کر دیا جائے۔ اس دن کمروں کے فرش، قالین کرسیوں کے گدوں، پردوں، بستر وغیرہ کو دھوپ میں ڈال کر جھاڑا جائے۔ مکڑیوں کے جالے لئے جائیں۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے شیشے بھیگے کپڑے سے صاف کر دئے جائیں۔ سب کمروں میں جھاڑو دلوا کر جب گرد بیٹھ جائے تو جھاڑن سے کرسی، میز تصویروں اور سب چیزوں کی گرد صاف کر دی جائے۔ پھر ہفتے بھر تک روزانہ صبح کو کپڑے سے

ہلکی سی جھاڑ پونچھ کر دی جایا کرے ۔ لو ، ہر چیز صاف ستھری نظر آئے گی ۔ وقت کا وقت بچے گا اور محنت کم ہو گی ۔" رضیہ خوش ہو کر بولی " زہرہ بہن شکریہ! تم نے مجھے گھر داری کی بڑی اچھی اچھی باتیں بتائیں ، ابھی میں تم سے اور بہت کچھ سیکھوں گی ۔ وعدہ کرو کہ سکھاؤ گی ۔" زہرہ نے کہا ضرور سکھاؤں گی جو کچھ مجھے آتا ہے میں بڑی خوشی سے تمھیں سکھاؤں گی ۔" رضیہ نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا " اے لو ، باتوں باتوں میں آٹھ بج گئے ۔ وہ کلب سے آگئے ہوں گے ۔ اچھا بہن اب اجازت دو ۔ شب بخیر ، کل پھر ملیں گے ۔"
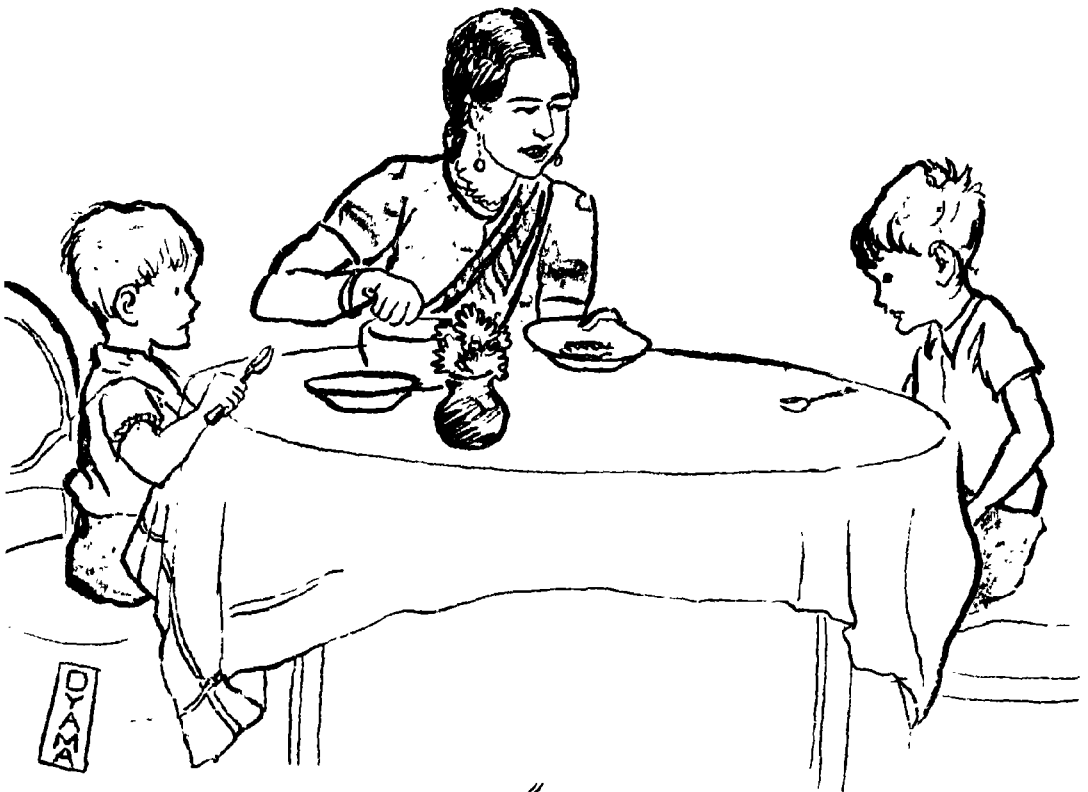
بڑا لڑکا :- اماں ! کیا یہ سب ، احمد کو دو گی ؟"

اماں :- نہیں ۔ یہ تمھارے لئے ہے ۔"

بڑا لڑکا :- " ارے ! اتنا سا ؟"

ایک دفعہ مجھے کسی کے ہاں مہمان جانے کا اتفاق ہوا، رات کو وہیں سونا تھا۔ صاحبِ خانہ نے ہر طرح میرے آرام کا انتظام کیا۔ صاف بستر میرے لئے بچھوایا۔ اجلا تکیے کا غلاف، صاف ستھری چادر پلنگ پر۔ مگر ایک ذرا سی بات کی وجہ سے میری تمام رات بے آرامی سے گذری۔ تم خیال کروگی شاید پلنگ میں کھٹمل ہوں گے یا زیادہ کھنچا ہوا ہوگا۔ یا بہت ڈھیلا ہوگا یا چوں چوں کرتا ہوگا۔ ان میں سے ایک بات بھی نہ تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ پلنگ پر جو چادر بچھی تھی، موٹے کپڑے کی تھی اور اس کے بیچ میں ایک نہایت ہی موٹی سیون تھی، وہ سیون میرے چبھتی تھی۔ تم کہوگی بھلا اس سیون کا بھی کچھ علاج ہو سکتا تھا؟ ہم تمہیں سیون جوڑنے کا ایک ایسا نیا طریقہ بتاتے ہیں جس سے اس میں موٹائی نہیں آتی۔ سلائی کے اس طریقے کو گون کرنا کہتے ہیں۔ اور یہ عام طور پر چادر، دوہر، چاندنی اور دوسرے موٹے کپڑوں کی سیونیں جوڑنے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ پہننے کے کپڑوں میں گون شاذ و نادر کی جاتی ہے۔ گون کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ جو دو کپڑے جوڑنے ہوں ان کو برابر کرکے ایک سرے پر ٹانکا لگا دو۔ اور پھر ان کو کھولو۔ (خاکہ نمبر ۱)

اس کے بعد ایک کپڑے میں نیچے سے سوئی داخل کرکے اس کے اوپر نکال لو اور دھاگا کھینچ لو۔ (خاکہ نمبر ۲)

اس کے بعد اسی طرح دوسرے
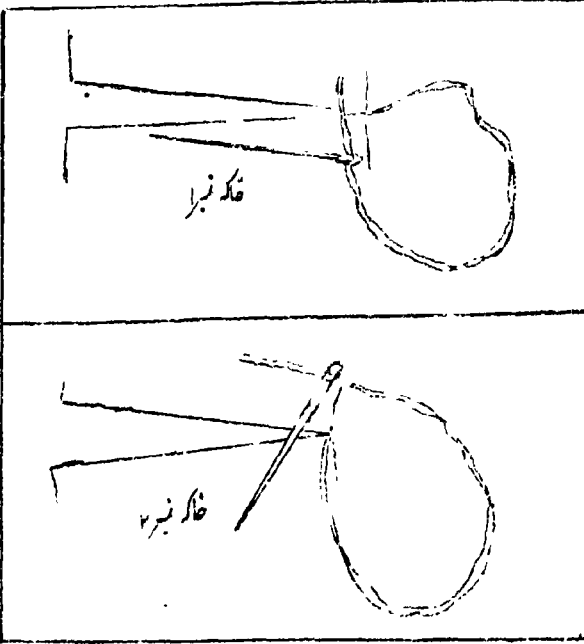
کپڑے میں نیچے کی جانب سے سوئی داخل
کرکے اوپر کی طرف نکال لو اور دھاگا کھینچ
لو۔(خاکہ نمبر ۳)
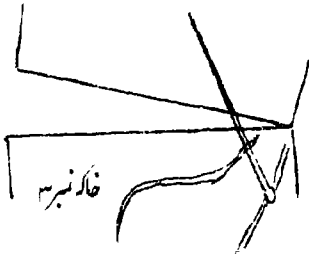
اسی طرح ایک مرتبہ ایک کپڑے میں
سے اور دوسری دفعہ دوسرے میں سے
ٹانکے لیتی رہو۔ ایک خوب صورت جالی سی
بن کر دونوں کپڑے جڑ جائیں گے۔ (خاکہ نمبر ۴)

شکل نمبر ۴
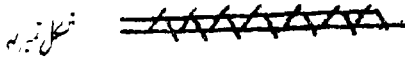
گون کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھو:۔

(۱) دھاگا اس قدر کھینچو کہ دونوں کپڑے مل جائیں۔ نہ تو ایسا ڈھیلا ہو کہ دونوں کپڑوں میں فاصلہ رہے۔ (خاکہ نمبر ۴ میں صرف سمجھانے کے لئے فاصلہ دکھایا ہے) اور نہ اس قدر تنگ کہ جھول آجائے۔

(۲) ٹانکا کنارے کے قریب ہو۔

(۳) دونوں کپڑے برابر رکھو ورنہ جب ختم کروگی تو دیکھوگی کہ ایک کپڑا دوسرے سے چھوٹا رہ گیا۔ اس کی سب سے اچھی ترکیب یہ ہے کہ گون کرنے سے پہلے دونوں کپڑوں کو ملاکر کوئی پاؤ پاؤ گز کے فاصلے پر ان میں ٹانکا لگا دو۔

تم گون کرنے کی مشق کرو اور جب سیکھ جاؤ تو ایک ایک انگل چوڑی دو پٹیاں لے کر ان پر ایک بالشت بھر گون کرکے ہمارے پاس بھیج دو۔ اگر تم نے اس کو اور بچیوں سے سب سے اچھا کیا تو تمھیں بہت عمدہ انعام ملے گا۔ دیکھنا ضرور بھیجنا اور رسالہ پہنچنے سے دس دن بعد روانہ کردینا۔

پتہ :۔
درۃ البیضا بیگم
منیجر مسلم گرلس اسکول لطیف منزل۔ پانی پت

پیام بچو! دیکھنا یہ پھول کس قدر خوب صورت ہے۔ دیکھتے ہی تمھارا دل چاہے گا کہ تم اس کو کاڑھ لو جتنا یہ خوب صورت ہے اسی قدر آسان۔ ہم تمھیں اس کے بنانے کا طریقہ بتادیں گے۔ مگر جب تمھیں یہ آجائے تو ایک نمونے کا بناکر ہمارے پاس ضرور بھجوانا تاکہ ہمیں بھی معلوم ہو کہ تم نے سیکھ لیا ہے۔ اور اگر تمھارا پھول اور سب بچوں سے اچھا ہوا تو تمھیں ایک عمدہ سا انعام ملے گا۔ اس کے کاڑھنے کے لئے موٹا سا کپڑا استعمال کرنا۔ باریک کپڑا دھاگے کے ساتھ کھنچ جائے گا اور دھاگا بھی موٹا، اور پھولا ہوا ہو تو بہت اچھا۔ اون سے یہ پھول بہت خوش نما بنے گا۔

خاکہ نمبر ۱

بنانے کی ترکیب

کسی ایک پتی کی جڑ میں کپڑے کے نیچے سے اوپر کی طرف سوئی نکال لو۔ پھر دھاگا باہر انگوٹھے سے دباکر سوئی کو اسی سوراخ میں دوبارہ ڈال کر پتی کے سرے پر اس طرح نکالو کہ دھاگا جو تم نے دبایا ہے، وہ سوئی کے نیچے رہے اور اس طرح ایک پھندا سا بن جائے (خاکہ نمبر ۲) پھر سوئی کو اسی سوراخ میں ڈال کر دھاگا نیچے کھینچ لو، تاکہ پھندے کا سرا دب جائے۔ (خاکہ نمبر ۳) اسی طرح سب پتیاں بنالو۔ ڈنڈیاں ڈنڈی ٹانکے سے (جو ہم تمھیں پہلے سکھا چکے ہیں) بناؤ۔ دیکھا کس قدر آسانی اور جلدی سے بننے والا پھول ہے ؂

خاکہ نمبر ۲

خاکہ نمبر ۳
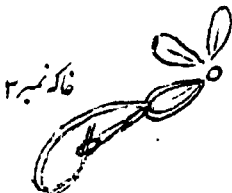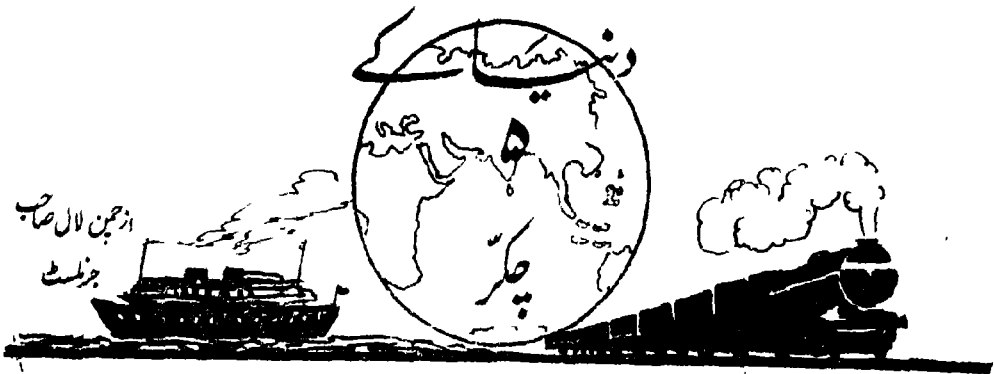
سیر و سیاحت بھی ایک طرح کا نشہ ہے۔ جس کے منہ کو لگ جائے اس کے پیر میں بس چکر ہی رہتا ہے۔ میں ابھی دنیا کے گرد پانچواں چکر لگا کر لوٹا ہوں مگر روزانہ صبح اُٹھ کر اخبارات میں جہاز کی روانگی کے اشتہار دیکھ کر پھر دل بے قرار ہوجاتا ہے کہ ایک بار پھر اُن خوب صورت شہروں بڑے بڑے جہازوں برف سے لدے ہوئے پہاڑوں اور دنیا کے رنگ برنگے میلوں کو دیکھوں۔ سب سے زیادہ جس چیز کے لئے میرا جی بیتاب ہوتا ہے وہ ہے سمندر میں چاندنی رات کا نظارہ اور بحرالکاہل میں غروب آفتاب کا سُہانا منظر۔

شاید تم پوچھو کہ سیر و سیاحت کا یہ چسکا کب اور کیسے پیدا ہوا تو بھائی آج سے کوئی انیس برس پہلے کی بات ہے جب تم شاید پیدا بھی نہ ہوئے ہوگے کہ ہندوستان میں ترکِ موالات کے نام سے آزادی کی لڑائی چھڑی تھی۔ میں اُن دنوں پڑھتا تھا۔ مگر کچھ ایسا جوش آیا کہ میں کالج چھوڑ چھاڑ اس لڑائی میں شامل ہوگیا۔

مجھے کانگریس کے کام کے سلسلے میں دیہاتوں میں دورہ کرنا پڑتا تھا میں نے ایک ایک دن میں دس دس گاؤں کا چکر لگایا ہے اس چلنے پھرنے میں کچھ ایسا مزا آتا تھا کہ میں تمھیں بتا نہیں سکتا۔

تھوڑے دنوں بعد ۱۹۲۲ء میں جب یہ لڑائی بند کردی گئی تو میں اخبار بندے ماترم میں کام کرنے لگا۔ اسی زمانے میں راجہ مہندر پرتاب کابل میں تھے۔ ان کے خط اور سفر کے حالات بندے ماترم میں چھپنے کے لئے آتے تھے۔ میں نے راجہ صاحب کو اخبارات کے پیکٹوں میں رکھ کر چند خط بھیجے۔ ان خطوں میں میں نے لکھا تھا کہ اُن کے دلچسپ سفرناموں کو پڑھ کر میرے دل میں بھی دوسرے ملکوں کی سیر کا شوق پیدا ہو رہا ہے اور کوئی ایسی ترکیب پوچھی تھی کہ میں بغیر پاسپورٹ کے کابل پہنچ جاؤں آزادی کی لڑائی میں شریک ہونے کی وجہ سے مجھے پاسپورٹ نہیں مل سکتا تھا۔ راجہ صاحب نے جواب میں ایک

لمبا سا خط لکھا کہ آنے والے کے لئے سب راستے کھلے ہوئے ہیں۔ جو مصمّم ارادہ کر لیتا ہے اُسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

یہ خط ۱۹۲۳ء میں آیا تھا۔ اُس کے ٹھیک دس سال بعد یعنی ۱۹۳۳ء میں میں راجہ صاحب سے ٹوکیو میں ملا اور اس طرح اُن کا قول صحیح کر دکھایا۔ میں ابھی ابھی پانچویں دفعہ راجہ صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔

۱۹۲۳ء ہی میں مہاتما گاندھی سخت بیماری کی وجہ سے یروادہ جیل سے رہا ہوئے اور انھوں نے ینگ انڈیا میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

یہ مضمون پڑھ کر تو میرا دل اور بھی بے چین ہو گیا۔ اور میں نے بندے ماترم اخبار سے رخصت لے کر ہمالیہ کی راہ لی۔ پہلے میں نے دھرم سالا شوالک کی پہاڑیوں، کلو کی پر فضا وادیوں اور ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کی سیر کی۔ کوئی چھ ہفتے میں نے اس دشوار گذار اور دلچسپ سفر کا خوب لطف اُٹھایا۔ پہاڑی لوگوں کی مہمان نوازی کا مزا میں اب تک نہیں بھولا ہوں۔ میرا ارادہ تھا کہ جنوبی تبّت کے راستے سے سنٹرل ایشیا اور روس کی طرف نکل جاؤں لیکن اسی زمانے میں مجھے مسٹر پاینکر کا تار ملا کہ میں فوراً دہلی آ کر ہندوستان ٹائمس اخبار کے اسٹاف میں شریک ہو جاؤں۔ میں مجبوراً اس ارادے کو خیرباد کہہ کر دہلی پہنچا۔

اگرچہ اخبار کا کام بہت دلچسپ معلوم ہوتا تھا اور ایک نئے اخبار کی ترقی کے لئے کوشش کرنے میں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ تاہم دنیا کی سیاحت کا خیال دل سے کبھی جدا نہیں ہوتا تھا۔

آخر میں اکتوبر ۱۹۲۶ء میں میں نے دنیا کے گرد پیدل چکر لگانے کا مصمّم ارادہ کر لیا اور پاسپورٹ کے لئے درخواست بھی دے دی۔

اخبارات میں یہ خبر شائع ہوتے ہی مجھے بہت سے نوجوانوں کے خط ملے۔ ان میں انھوں نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں اُنھیں بھی ساتھ لے چلوں۔ خط لکھنے والوں میں گریجویٹ، وکیل، ڈاکٹر، کالج کے طالب علم وغیرہ تھے۔ ہاں پٹیالے سے ایک سکھ بہن نے بہت پر زور خط لکھا تھا کہ میں اُنھیں بھی ساتھ لے چلوں۔ وہ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر تلوار لگائے اور اپنا مختصر سا سامان پیٹھ پر اُٹھائے دہلی آ گئیں اور سیدھی ہندوستان ٹائمس کے دفتر میں پہنچیں۔ میں نے انھیں سمجھایا کہ ایک عورت کے لئے پیدل دنیا کا سفر بہت مشکل ہوگا مگر وہ کہنے لگیں آپ میرے ساتھ دوڑ لگا لیں۔ اُن کی یہ اولوالعزمی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اور

میں نے وعدہ کر لیا کہ جب مجھے پاسپورٹ مل جائے گا تو انھیں اطلاع دوں گا۔

پاسپورٹ نامنظور

دسمبر کے مہینے میں میں گوہاٹی (صوبہ آسام) گیا ہوا تھا جہاں انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ وہاں مجھے ڈپٹی کمشنر دہلی کی طرف سے ایک چٹھی ملی کہ چونکہ تمھاری پیدائش دہلی کی نہیں ہے اس لئے تمھیں پاسپورٹ نہیں مل سکتا۔ یہ جواب پڑھ کر میرے ارادوں کو بہت ٹھیس لگی۔ دوسرے ساتھی بھی بہت مایوس ہوئے۔ مگر میں نے سیاحت کا ارادہ نہیں چھوڑا اور تقریباً ہر سال پاسپورٹ کی درخواست دیتا رہا اور ہر سال ہی وہ نامنظور ہوتی رہی۔

تبت کے دو سفر

۱۹۲۷ء میں میں نے شملے سے روانہ ہو کر چھوٹا تبت، مغربی تبت، لداخ، کشمیر وغیرہ بارہ سو میل پیدل سفر کیا۔ میں اب کے بھی سنٹرل ایشیا جانا چاہتا تھا مگر برٹش ٹریڈ کمشنر اجازت دینے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ میرا یہ سفر بہت ہی دلچسپ اور مشکلوں سے پُر تھا اس میں دو مرتبہ میں نے نئی زندگی پائی۔ تین ہفتے تک صرف جو کے ستو پر گذارا کیا۔ اس سفر کی کہانی پیام تعلیم میں پھر کبھی تفصیل سے بیان کروں گا۔

کیلاش پربت

۱۹۲۸ء میں میں نے ایک جرمن جرنلسٹ کے ساتھ کیلاش پربت (جو تبت کی بلند ترین پہاڑیوں پر واقع ہے اور ہندوؤں کا تیرتھ ہے) کی زیارت کی جب ہم تبت کی اندرونی سرحد پر پہنچ گئے تو ہمارے وارنٹ جاری کر دئے گئے اور ہمیں واپس لوٹنا پڑا یہ سفر بھی بہت ہی دلچسپ تھا۔ اس کی کہانی ایک علیحدہ سلسلۂ مضامین میں لکھی جائے گی۔

ایک دلچسپ لطیفہ

اس سلسلے میں ایک نہایت دلچسپ لطیفہ آج ہی تمھیں سناتا ہوں۔ میرے جرمن دوست جو یہودی تھے بہت ہوشیار نکلے۔ انھوں نے جرمنی و امریکہ کے اخباروں کو راستے ہی سے مضمون لکھ دئے کہ ہم کیلاش پربت پر پہنچ گئے ہیں اور ماں سرور جھیل بہت ہی خوب صورت ہے اور وہاں بہت سے سادھو، مہاتما خدا کی عبادت کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ مضامین مجھ سے بغیر مشورہ کئے بھیج دئے اور کیلاش کی کچھ تصویریں بھی جو ہم نے راستے میں بہت دور سے لی تھیں اخباروں کو بھیج دیں اور وہ شائع بھی ہو گئیں۔ لیکن جب ہم کو پولیس نے واپس لوٹا دیا اور ہم کئی دنوں کے بعد الموڑہ پہنچے تو میں نے اخبارات کو اور رائٹر نیوز ایجنسی کو ناکام واپس

لوٹنے کی کہانی بذریعہ تار بھیجی وہ تار جرمنی اور امریکہ کے اخباروں میں بھی شائع ہوا۔ اس سے چند ہی روز پہلے ہمارے جرمن دوست کے جھوٹے مضامین شائع ہو چکے تھے۔ اخباروں والے بہت ناراض ہوئے اور ہمیشہ کے لئے اُن سے مضامین لینا بند کر دیا۔ اب وہ حضرت ڈاکٹری کا پیشہ کرتے ہیں مجھے اس واقعے کا علم پانچ سال تک نہیں ہوا۔

۱۹۳۳ء میں میں پہلی مرتبہ یورپ گیا اور ویانا میں مسٹر سبھاش چندر بوس کے پاس ہوٹل فرانس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ مسٹر بوس نے مجھ سے کہا کہ تمھارا ایک یہودی دوست یہاں رہتا ہے اور تم کو بہت بد دُعا دیتا ہے۔ میں اُن کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ انھوں نے اس کو ٹیلی فون کر کے ہوٹل میں بلوا لیا۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا مگر چھوٹتے ہی اس نے یہ کہا کہ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ میں اس کا منہ دیکھنے لگا۔ مگر جب اس نے اپنی تمام حرکت بیاں کی تو مجھے اور بھی حیرانی ہوئی اور افسوس ہوا۔ وہ ایک مشہور اخبار نویس تھا اور اب اعتبار اُٹھ جانے کی وجہ سے کوئی اخبار اس کا مضمون شائع نہیں کرتا۔

لا ممبر کی بیوی کی سفارش

۱۹۳۲ء میں میں نے لیڈی متر کے ذریعے (جن کے خاوند سر بی، ایل، متر اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر قانون تھے) اس وقت کے اسسٹنٹ ہوم ڈیپارٹمنٹ (جو ہندوستانی تھے) سے سفارش کرائی اور پاسپورٹ ملنا تقریباً طے ہو گیا میں نے یورپ کے سفر کی سب تیاری کر لی تھی مگر وقت پر پھر پاسپورٹ نامنظور کر دیا گیا اور سبب وہی یعنی آزادی کی تحریک میں شرکت

تمنا بر آئی

۱۹۳۳ء کے شروع میں ہندوستان ٹائمس کے ایڈیٹر مسٹر پوتھن جوسف نے ڈائرکٹر جنرل سی آئی، ڈی سے یہ دریافت کیا کہ جب مسٹر پٹیل اور مسٹر سبھاش چندر بوس جیسے سرگرم لیڈروں کو پاسپورٹ دے دیا گیا تو چمن لال جیسے سپاہی کو پاسپورٹ دینے سے آپ کیوں گھبراتے ہیں۔ سی آئی ڈی کے چیف جو در اصل وائسرائے کا دایاں ہاتھ تھے اس کا کوئی معقول جواب نہ دے سکے۔ انھوں نے مجھے ایک تحریر لکھ دی کہ جوں ہی سول نافرمانی کی تحریک بند ہو جائے گی مجھے پاسپورٹ مل جائے گا اگرچہ اُن کی یہ شرط بڑی مضحکہ خیز تھی مگر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا چند مہینوں بعد جب تحریک ختم کر دی کر دی گئی تو مجھے خدا خدا کر کے سات سال کے بعد پاس پورٹ ملنے کا پکا وعدہ ہو گیا۔

دہلی کی سی، آئی، ڈی نے میرے ارادے

کو ناکام بنانے کے لئے پھر طرح طرح کی ترکیبیں کیں مگر سخت ناکامی ہوئی اور پھر مجھے حکومت برطانیہ و یورپ (بغیر روس) کا پروانہ راہ داری مل گیا میں نے مئی ۱۹۳۳ء میں اپنا پہلا سفر دنیا شروع کیا اور حال ہی میں پانچواں چکر ختم کرکے واپس آیا ہوں اب میرا پاسپورٹ لندن میں ضبط ہو چکا ہے اور یہ آخری سفر میں نے بلا پاسپورٹ کے ختم کیا اس آخری سفر میں مجھے فرانس، ہانگ کانگ، سنگاپور، ہند چینی، کولمبو، پینانگ وغیرہ میں اترنے نہیں دیا گیا۔ ہالینڈ میں انگریزی حکومت کی شہ پر گرفتار کر لیا گیا۔ جرمنی میں جیل جانے سے بمشکل بچا اور آئرلینڈ سے اپنی ضبط شدہ کتاب "برباد ہونے والی سلطنت" کو بطور پاسپورٹ استعمال کرکے جہاز پر سنٹرل امریکہ کو روانہ ہوا۔ گذشتہ چھ سال میں میں نے تقریباً دو لاکھ میل سفر کیا جس کے دوران میں ۷۴ جہازوں کی سیر کی۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک کو دیکھا اور مہاتما گاندھی جی کے مضمون کے مطابق خوب ہی زندگانی کا لطف اٹھایا۔ اب ہر مہینے یہ دلچسپ سفرنامہ قسط وار تمہارے پیام تعلیم میں شائع ہوگا۔ اب تو اس شعر پر میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

سیر کر دنیا کی غافل زندگانی پھر کہاں
زندگانی گر رہی تو نوجوانی پھر کہاں

کپڑے کے کھلونے

آپا جان

تم گڑیاں تو ضرور کھیلتی ہوگی۔ گڑیاں بنانا بھی آتا ہوگا۔ اگر تم چاہو تو کپڑے سے گڑیوں کے علاوہ بھی دلچسپ دلچسپ چیزیں بنا سکتی ہو۔ آج میں تمھیں یہی بات بتاؤں گی۔ یہ چیزیں یا کھلونے تم اونی یا سوتی کپڑے سے بہت آسانی سے بنا سکتی ہو بس چند باتیں سمجھ لو۔

۱۔ جو نمونے میں تمھیں بتاؤں گی وہ پورے سائز یا ناپ کے ہوں گے۔ ہر نمونے کے حصوں کو معمولی کاغذ پر اتار لو پھر ان ہی حصوں کے ناپ کا کپڑا کاٹ لو۔ آسان صورت یہ ہوگی کہ ہر حصے پر حرف یا نمبر ڈال دو۔ پھر ان کو ملا لو۔

۲۔ سینے کے لئے ہر نمونے میں ½ انچ کنارہ چھوڑ دو۔ کاغذ کے ناپ کو ہمیشہ کپڑے کے الٹی طرف رکھو۔ چاروں طرف پنسل یا چاک سے لکیر کردو یعنی سیدھا رخ اندر کی طرف ہو۔ اب دوہری سلائی سے سیو۔ تاگا کپڑے کے رنگ کا ہو۔ مشین سے بھی سی سکتی ہو۔

کھلونوں کو بھرنے کے لئے بہت سی چیزیں استعمال کی جاتی ہیں۔ روئی۔ لکڑی کا برادہ، اون پرانے کمبل یا کپڑے کے چیتھڑے۔ رزائی یا تکیے کی پرانی روئی، اون، کاغذ

کھلونے کے ناک، کان ٹانگیں اور ہاتھ پیر پہلے بھرو۔ جسم سب سے آخر میں بھر کر تیار کرنے سے پہلے کھلونے کی بناوٹ اور شکل کو اچھی طرح ٹھیک کرلو پھر سوئی سے ٹانک دو ایسا سیو کہ سوراخ باقی نہ رہے۔ تاکہ خوب مضبوط ہو۔

کھلونے کی آنکھ، ناک، دم، چونچ وغیرہ بہت مضبوط تاگے سے سینا چاہئے۔ سوئی بہت گہری نکالو آنکھیں رنگین یا سیاہ ریشم، جوتے کے بٹن یا تسبیح کے رنگین دانوں سے بنائی جاتی ہیں ناک اور منہ سیاہ رنگین تاگے سے بناؤ۔

(۱) بطخ

سامان:- پاؤ (¼) گز سفید یا ہلکے زرد کپڑے میں سے دو ٹکڑے کاٹو۔ ایک پیٹ کے

لئے۔ دوسرا چاروں پیروں کے لئے۔ ۲۔ نارنجی کپڑے سے چار پیر اور دو چونچیں کاٹو۔ کٹی ہوئی بطخ کے حصوں یا ٹکڑوں پر بائیں طرف ہوشیاری سے نمبر یا حرف لکھ دو۔ پھر ٹکڑوں کو اس طرح جوڑو

(۲) پیٹ کو ایک طرف کے نیچے کے حصے سے ٹانک دو الف کے مقام سے شروع کرو اور ب پر ختم کرو۔ پیٹ کو جسم کے دوسرے ٹکڑے سے کاٹو اس طرح کہ الف الف اور ب، ب پر لگ جائے۔ چاروں طرف سے سی لو صرف ص سے ص تک بھرنے کے لئے چھوڑ دو۔

۳۔ سب سی چکیں؟ اچھا اب اسے الٹ دو اور بھر دو۔ اب کی شکل ٹھیک کر لو۔ یہ بھی دیکھ لو کہ اس کا سر، دم اور پیٹھ سڈول ہیں یا نہیں، اب کھلے ہوئے حصے کو بھی لیس والی سوئی سے سی دو۔

۴۔ پروں کے جوڑے کو سیتے وقت ص سے ص تک کھلا رکھو پھر انھیں بھی الٹ دو۔ پر زیادہ نہ بھرنا۔ بھرنے کے بعد اس کے کھلے حصے کو سی دو اور جسم پر اس طرح لگاؤ کہ د؛ د پر اور س س پر آجائے نارنجی چونچ کے دونوں حصوں کو سی کر الٹ دو اور روئی خوب کس کر بھر دو۔ پھر اسے جسم پر ص کے مقام پر لگا دو۔ جسم کا ص چونچ کے ص پر لگے۔

(۵) پیر بھی سینے کے بعد سیدھے کر لو اور بھرنے کے بعد ج پر لگا دو اس طرح کہ ج ج پر لگ جائے۔

(۶) گول آنکھیں موٹی سوئی سے۔ اون یا تاگے سے بنا دو۔

(۷) اگر بطخ اس نقشے سے چھوٹی یا بڑی بنانا چاہو تو اس کے حصوں کو اسی مناسبت سے چھوٹا یا بڑا کاٹ لو
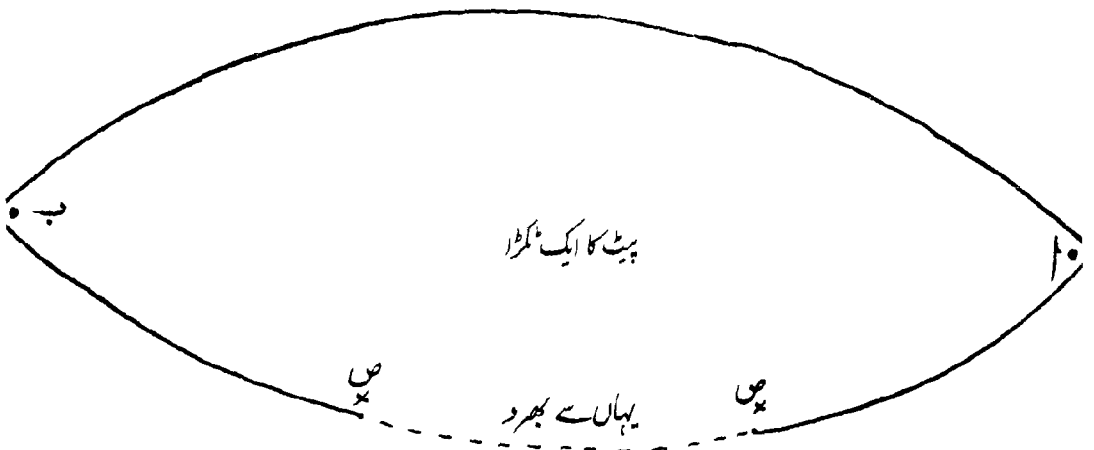
برسات کی آمد کی خوشی میں لڑکیاں ناچ رہی ہیں

کلا بھون کے لڑکے اپنے بورڈنگ میں ڈسکو کر رہے ہیں

کلا بھون کے لڑکوں کا کھا ہوا ٹھیرا کوٹا

بدھ بھگوان کا مجسمہ
(کلا بھون کے ایک طالب
علم کا بنایا ہوا)

سر رابندر ناتھ ٹیگور

ششو وبھاگ کے دو بچے
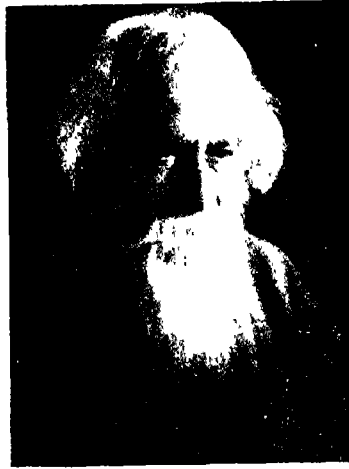
چھوٹے بچوں کے کھیل

کلا بھون کی پکنک
(لڑکے اور لڑکیاں مل کر کھانے کا انتظام کر رہے ہیں)

اے بکلام طالب علم - شانتی نکیتن

شانتی نکیتن صوبہ بنگال میں کلکتے سے ۹۵ میل دور ضلع بیربھوم میں واقع ہے۔ کلکتے والی لائن پر بردوان اسٹیشن پر گاڑی بدلنا پڑتی ہے۔ پھر لوپ لائن سے سوار ہوکر ۳۹ میل کے فاصلے پر ایک اسٹیشن آتا ہے بولپور۔ بس یہیں سے شانتی نکیتن کو جاتے ہیں۔ یہاں سے شانتی نکیتن کل ڈو میل ہے گاڑی سے اُترتے ہی موٹر تیار ملتی ہے۔

یہ تو تمھیں معلوم ہوگا کہ یونیورسٹی کسے کہتے ہیں یعنی وہ جگہ جہاں سب علم سکھائے جاتے ہیں اور بڑی بڑی ڈگریاں دی جاتی ہیں، اس اعتبار سے شانتی نکیتن بھی اچھی خاصی یونیورسٹی ہے۔

یہ یونیورسٹی یا مدرسہ دیس کے مشہور شاعر رابندرناتھ ٹیگور نے قائم کیا ہے۔ تم نے اُن کا نام تو ضرور سُنا ہوگا، حالات شاید نہ معلوم ہوں۔ چلو ذرا مختصر سا حال بتاتے چلیں۔

رابندرناتھ ٹیگور ۷ مئی ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے باپ دیبیندرناتھ ٹیگور مہارشی کہلاتے تھے۔ یہ گھرانا علم و شرافت میں ممتاز تھا ٹیگور کی تعلیم زیادہ تر گھر ہی پر ہوئی۔ انھوں نے بچپن میں اپنے والد کے ساتھ ہندوستان کی سیر کی ہے۔ شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں بہت اچھے شعر کہنے لگے تھے۔ سیر و سیاحت کا بھی بہت چسکا تھا۔ یورپ کوئی چار بار گھوم آئے ہیں۔ اس کے علاوہ امریکہ، چین، جاپان غرض قریب قریب تمام دنیا کی سیر کی ہے۔ ان کی سب سے مشہور کتاب گیتان جلی ہے۔ اس میں اُن کی بہترین نظمیں ہیں۔ یہ بنگالی زبان میں تھیں۔ ٹیگور نے خود ان کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ اسی کتاب پر انھیں نوبل پرائز ملا ہے اور انگریزی حکومت نے انھیں سر کا خطاب اور کلکتہ یونیورسٹی نے ڈاکٹری کی اعزازی ڈگری دی ہے۔ ٹیگور بنگالی زبان کے بہت بڑے شاعر، ناول نگار اور ادیب سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں کا انگریزی میں خود ترجمہ کیا ہے اور انگریزی ادب میں انھیں بڑی حیثیت حاصل ہے۔

ٹیگور کے والد کے زمانے میں شانتی نکیتن کی حیثیت ایک آشرم کی تھی۔ ٹیگور نے اُسے پہلے ۱۹۰۱ء باقاعدہ اسکول کی شکل میں تبدیل کیا اور پھر بڑھاتے بڑھاتے اُسے یونیورسٹی بنا دیا۔ اس یونیورسٹی کا نام وشوا بھارتی ہے یعنی عالم گیر برادری۔ وشوا بھارتی میں شروع سے لے کر آخر تک تعلیم کا انتظام ہے۔ بچوں کا مدرسہ شِشو وہاگ کہلاتا ہے۔ اس میں چار سال تک کی عمر کے بچے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ پھر پاٹھ بھون میں میٹرک تک پڑھائی ہوتی ہے۔ اس کے بعد شکشا بھون ہے اس میں بی۔اے تک تعلیم ہوتی ہے۔ آرٹ یعنی مصوری سکھانے کا انتظام علیحدہ ہے۔ اس مدرسے میں ہندوستانی مصوری، مٹی سے مورتیں بنانا، ربڑ اور لکڑی سے تصویروں کے بلاک بنانا (لینوکٹ اور وُڈکٹ) دیوار پر تصویریں بنانا (فریسکو) دیوار پر مٹی سے شکلیں بنانا۔ (ٹیراکوٹا) سکھایا جاتا ہے

ایک علم موسیقی کا مدرسہ ہے یہاں گانا اور ناچنا سکھایا جاتا ہے۔ پکا گانا، ٹیگور کے بنگالی گانے ٹیگوری ناچ ان ہی چیزوں کی یہاں تعلیم دی جاتی ہے اس کے بعد وِدیا بھون اور ہندی بھون بھی ہے یہاں لڑکے نئی نئی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ایک خاص چیز چینا بھون ہے۔ یہاں چینی زبان پڑھائی جاتی ہے چینی حکومت نے کوئی ایک لاکھ کتابیں شانتی نکیتن کو دی ہیں اور کتب خانے اور پڑھائی کے لئے ایک شان دار عمارت بنوا دی ہے۔ ایک چینی پروفیسر چینی پڑھاتے ہیں۔

شانتی نکیتن کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ شہری زندگی سے بالکل دور کھلی ہوا میں بسا ہوا ہے تعلیم کے لئے کوئی عمارت نہیں بنائی گئی ہے۔ طالب علم گرمیوں میں درختوں کے نیچے اور جاڑے کے موسم میں دھوپ میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں۔ ہر طالب علم کے پاس بچھانے کو کوئی نہ کوئی چیز ہوتی ہے، اس کو بچھا کر بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں کلا بھون کے طالب علموں کے لئے الگ الگ کام کرنے کے لئے مکان بنے ہوئے ہیں جہاں تھوڑے تھوڑے طلبا مل کر کام کرتے ہیں۔ کلا بھون کے ساتھ ایک عجائب خانہ بھی ہے۔ اس میں ایرانیوں، مغلوں اور راجپوت مصوروں کی قلمی تصویریں ہیں۔ ان کے علاوہ بہترین چینی اور جاپانی تصویریں بھی ہیں۔

یہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ساتھ تعلیم پاتے ہیں اظہارِ خیال اور تعلیم کی جتنی آزادی لڑکوں کو ہے اتنی ہی لڑکیوں کو۔ سب بہن بھائی مل کر کام کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سب کے سب ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔

اُستادوں اور شاگردوں کا تعلق بھی بڑے اور چھوٹے بھائیوں جیسا ہے۔ ایک دوسرے سے بہت خلوص اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور

ایک دوسرے کی امداد کے لئے آمادہ رہتے ہیں۔

یہاں تربیت بھی تعلیم ہی کا ایک جزو سمجھی جاتی ہے۔ چھوٹے بچے اور بچیاں اپنے جلسوں اور پکنک وغیرہ کا انتظام خود ہی کرتے ہیں۔ استاد صرف ضرورت کے وقت اُن کی مدد کرتے ہیں۔

شانتی نکیتن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہر فرقے اور ہر ملک کے طالب علم موجود ہیں۔ کسی میں مذہبی تعصب قطعاً نہیں ہے۔ سب بھائی بھائی کی طرح رہتے ہیں۔ ہندو مسلمان وغیرہ کا سوال کبھی درمیان میں نہیں آتا۔ ہر مذہب کے طالب علموں کو مذہب کی پابندی کی پوری آزادی حاصل ہے۔ سب مذہبوں کے خاص خاص تیوہار سب مل کر مناتے ہیں۔ ان سب ملکوں اور مذہبوں کے طالب علموں کے ایک جگہ جمع ہونے سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ان کے تہذیب و تمدن سے واقفیت کا موقع ملتا ہے۔ مگر ان کی بھانت بھانت کی بولیاں سمجھنے میں کافی دقت ہوتی ہے۔

شانتی نکیتن میں مناظرِ قدرت سے لگاؤ پیدا کرنے کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جب موسمِ بہار کی آمد ہوتی ہے تو لوگ خوب کھیلتے کودتے ناچتے گاتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔ یہی حال برسات کی آمد پر ہوتا ہے۔ بہار کے خیر مقدم کو بسنت اُتسو اور برسات کو برشا منگل کہتے ہیں۔

ہر شعبے کے لڑکوں کے لئے الگ الگ بورڈنگ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں لڑکے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ لڑکیوں کے لئے خواہ وہ کسی شعبے کی ہوں ایک ہی ہوسٹل ہے۔ سب طالب علموں کے لئے باورچی خانہ بھی ایک ہی ہے۔ گوشت کھانے اور گوشت سے پرہیز کرنے والوں کے لئے الگ الگ انتظام کر دیا گیا ہے۔

ہفتے میں ایک دن یعنی بدھ کو سب شعبے بند رہتے ہیں اور چھٹی منائی جاتی ہے۔ اس دن صبح کو سب لوگ مندر میں اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ مندر نام ہی کا مندر ہے۔ یہاں نہ تو کوئی مورتی ہے نہ کسی کی پوجا وغیرہ ہوتی ہے۔ سب مل کر خدا کی حمد و ثنا کے گیت گاتے ہیں اور بعد میں علم و عقل کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ جلسہ کوئی آدھ گھنٹے تک رہتا ہے۔

ویسے ہر صبح کو کام شروع کرنے سے پہلے سب ایک جگہ جمع ہو کر خدا کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور گانا گاتے ہیں اور پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں شام کو مختلف کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ بچوں کے لئے کھیلنا لازمی ہے۔ باقی کالج اور دوسرے شعبوں کے لڑکوں کو اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کچھ لوگ کھیلتے ہیں اور کچھ سیر و تفریح کو چلے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے لئے کھیل کا الگ انتظام ہے۔

کھیل کے بعد اور کھانے سے پہلے اکثر مباحثے

کے جلسے اور ڈرامے وغیرہ کئے جاتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر دوسرے شعبوں کے طالب علموں کو بھی بلایا جاتا ہے۔

شانتی نکیتن میں اس کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ لڑکے تیاری کر کے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کا امتحان دے سکیں۔ شانتی نکیتن کا کسی یونیورسٹی سے تعلق نہیں ہے نہ حکومت نے اسے تسلیم کیا ہے پھر بھی یہاں کے پڑھے ہوئے لڑکوں کی ملک میں کافی مانگ ہے۔ خصوصاً کلا بھون کے طالب علم سرکاری عہدوں پر ممتاز ہیں۔

تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ شانتی نکیتن کو ہندوستانیوں سے زیادہ باہر کے لوگ جانتے ہیں اور اس کی صحیح معنوں میں قدر کرتے ہیں۔ دوسرے ملکوں کے اکثر سیاح یہاں آتے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھنے ان سے ملنے اور اُن کی باتیں سننے کا موقع ملتا ہے اور اس طرح ہمارے علم میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔
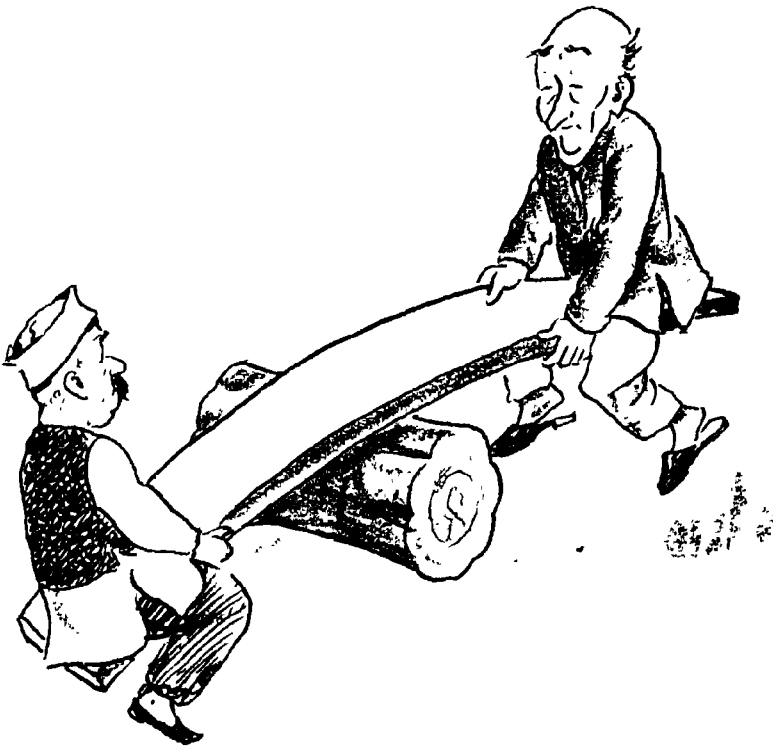
مزا آرہا ہے!
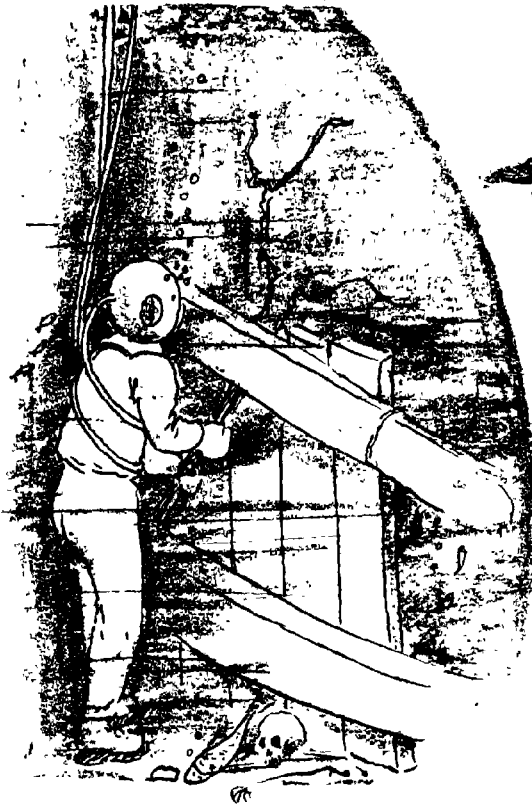
خطرے کی تلاش

حامد حسین صاحب متعلم جامعہ

اگر میں تم سے سوال کروں کہ کیا تم آتش فشاں پہاڑ کے اس سوراخ میں جانا پسند کرو گے جس میں سے لاوا نکلتا ہے تو تم ضرور جواب دو گے کہ مجھے خودکشی کے اس سے زیادہ بہتر اور آسان طریقے معلوم ہیں لیکن میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس قسم کے دلاوری کے کام ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں بار معلومات کی خاطر انسانوں نے کیے۔

تین سال پہلے کی بات ہے، اٹلی کے تین طالب علم اٹنا کی رصد گاہوں کے ایک افسر کے ساتھ دس ہزار فیٹ بلندی پر چڑھے۔ وہاں انھوں نے خاص قسم کے آگ سے بچانے والے کپڑے پہنے۔ آنکھوں کی حفاظت کے لئے عینکیں اور گیس نقابیں چہروں پر لگائیں اور آتش فشاں پہاڑ کے آٹھ ہزار فیٹ گہرے دہانے میں رسّی ڈال کر نیچے اُتر گئے۔

اٹنا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے۔ اس کے دہانے سے گیس اور دھواں نکلتا رہتا ہے۔ جب یہ لوگ اندر گئے اس وقت یہ پہاڑ ساکن تھا۔ پھر بھی زہریلی اور گندھک ملی ہوئی ہوا اور دھواں شگافوں سے نکل رہا تھا۔

چاروں خیریت سے اندر پہنچ گئے۔ نیچے

گہرے غار اور درزیں تھیں۔ چاروں طرف گئی رنگ کا کاربونیٹ آف لائم کا تہ نشین مادہ تھا جو عموماً قلموں کی صورت میں غار کی چھت وغیرہ سے لٹکتا رہتا ہے اور پانی کے رِسنے سے بنتا ہے۔ پگھلا ہوا لاوا، تہہ میں اُبل رہا تھا۔ انھوں نے گیس کے بہت سے نمونے بوتلوں میں بھر لئے اور کئی مشاہدے کئے۔ غار سے باہر آنا بڑا مشکل تھا۔ مگر وہ سب بخیر و خوبی نکل آئے۔

آج کل آتش فشاں پہاڑوں کا مطالعہ ایک مستقل علم ہے۔ اسی لئے اِٹنا اور ویسو ویس کی آتش فشانی کا وقت ہفتوں کیا بلکہ مہینوں پہلے معلوم کر لیا جاتا ہے۔

پروفیسر بروس وائٹ زہروں کے بڑے ماہر ہیں۔ ایک شخص کی موت پر انھیں پنیر میں زہر کا شبہ ہوا۔ لیکن جب بہت سے تجربوں کے بعد بھی کچھ پتہ نہ چلا تو انھوں نے خود پنیر کھایا اور زہر کو پہچانا۔ ایک دفعہ انھوں نے ایک زہر چکھا اور بہت سخت بیمار پڑ گئے اور اس طرح ثابت کیا کہ وہ زہر کتنا خطرناک تھا۔

نیویارک میں ستر طلبا کی جماعت ہے جو بہ خوشی زہر کھاتے رہتے ہیں اور زہر کے بُرے اثرات کو اپنے ذاتی تجربوں سے ثابت کرتے ہیں تین آدمیوں نے ان زہر کھانے والوں سے بھی زیادہ خطرہ جھیلا۔ انھوں نے سیٹ سی مکھی سے اپنے جسم پر کٹوایا اس مکھی کے کاٹنے سے انسان کو نیند کی بیماری ہو جاتی ہے ان تین آدمیوں میں ڈاکٹر اس کا نائب اور ایک افریقی تھا۔ اتفاق کر ایک سوراس مرض میں مبتلا تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے جراثیم سے اپنے جسم میں ٹیکہ لگایا اور اس طرح ایک نئی دوا جو "جرمینین" کہلاتی ہے، دریافت کی۔ اس دوا نے ڈاکٹر کو اچھا کر دیا۔

اسی طرح دو امریکن سپاہیوں نے پیلے بخار کے مچھروں سے اپنے آپ کو کٹوا نے دیا۔ انھیں پیلا بخار چڑھا مگر اچھے ہو گئے۔ اس تجربے میں اُن کے ساتھ ایک نرس بھی شریک تھی مگر وہ جانبر نہ ہو سکی ان بہادر مردوں کی رہنمائی سے وسطی امریکہ کے مہذب حصّوں میں اس پیلے بخار سے بالکل نجات مل گئی ہے۔

نقطۂ انجماد سے کم درجے میں زندگی:۔

تم نے اکثر سنا ہو گا کہ لوگ برف میں دب کر مر جاتے ہیں۔ سر جوسف بارکرافٹ ایک سائنس داں نے قطبین کی حالت معلوم کی ایک خاص سرد تجربہ گاہ میں وہ خود منجمد ہوئے۔ شروع میں تو انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ انھوں نے بیان دیا کہ "مجھ پر ایک وقت ایسا بھی گذرا کہ سردی کا احساس ختم ہو گیا اور ہلکی سی گرمی محسوس ہوئی

ہوا یہ کہ رگوں کے درمیانی نظام میں خون کا دوران بند ہوگیا اور خون کھال کی طرف بڑھنے لگا .... میرا درجہ حرارت بہت جلد گر گیا اور میں اس حالت کے بہت زیادہ قریب پہنچ گیا تھا جو سخت سردی میں ہمیشہ کے لئے سو جانے والے پر گذرتی ہے۔

اسی سائنس داں نے ایسی فضا میں جس میں نائٹروجن بہت زیادہ اور آکسیجن بہت کم تھی سائکل چلائی۔ اس نے ہاتھ میں ایک نلکی لی تاکہ جب آکسیجن کی ضرورت ہو اس کو کھول کر حاصل کرسکے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں بہرحال اس تجربے میں اس کے دماغ پر ایسا اثر پڑا کہ وہ گیس والی نلکی کو کھول بھی نہ سکا اور مرنے ہی والا تھا کہ ایک شخص نے جو یہ سب دیکھ رہا تھا نلکی کھول کر آکسیجن پہنچائی اور اسے موت سے بچایا۔ اسی طرح پہاڑ پر چڑھنے والے جب ۱۷۰۰۰ فیٹ سے زیادہ اوپر جاتے ہیں تو اُن کا دماغ بھی کام نہیں کرتا۔

سائنس کی خاطر پروفیسر بارکرافٹ نے کئی بار اپنی زندگی خطرے میں ڈالی۔ زہریلی ہواؤں مثلاً بورک ایسڈ اور فاسجین کے اثر کے تجربے کے سلسلے میں انھوں نے حصہ لیا اور معلوم کیا کہ بورک ایسڈ جھینگروں اور اسی قسم کے کیڑوں کے مارنے میں بڑی کامیاب ہے۔

کلکتے کی کال کوٹھری کے معمے کو اسی پروفیسر نے حل کیا ہے۔ اٹھارہ آدمیوں کو آٹھ گھنٹے تک ایک تہہ خانے میں، جس میں باہر سے بالکل ہوا نہیں جاسکتی تھی، بند کیا گیا۔ ان میں کے تیرہ ٹائپ کررہے تھے اور باقی لکھ رہے تھے، گرمیوں کے دن تھے پروفیسر بارکرافٹ بھی اُن کے ساتھ تھے اور ان کی حالت کا ریکارڈ رکھ رہے تھے

پہلی بار بجلی کے پنکھے برابر چلتے رہے اور سب اچھے رہے۔ دوسرے تجربے میں پنکھے ہٹا لئے گئے اور تہہ خانے میں تازہ ہوا بھر دی گئی۔ اس دفعہ ان لوگوں کی بہت بُری حالت ہوگئی۔ پروفیسر نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ بلیک ہول میں زیادہ تر لوگ گرمی کی شدت سے مرے۔ سخت حبس کی وجہ سے نہیں

غوطہ خور بھی بہت زیادہ تکلیف اُٹھاتے ہیں ان کو زیادہ گہرے پانی میں سے تیزی سے اوپر کھینچا جائے تو مر جاتے ہیں۔ اُن کے خون میں نائٹروجن کے بلبلے گھس جاتے ہیں۔ انسان کے جسم پر پانی کے دباؤ کے متعلق اور زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے دو بہادر سائنس دانوں نے اپنے آپ کو ایک بڑے لوہے کے بائیلر (ابلنا) میں قربان کردیا۔

ہوا کا معمولی دباؤ جسم کے ایک مربع انچ حصے پر پندرہ پونڈ ہے۔ یہ لوگ چت لیٹ گئے اور ہر ایک مربع انچ پر ۴۰، ۵۰ اور ۶۰ پونڈ کے حساب سے

دباؤ ڈالا گیا۔ ٹیلیفون سے انھوں نے اپنا حال کہا جس سے بعد میں بہت اچھے نتیجے اخذ کئے گئے۔ معلوم ہوا کہ دباؤ کی حالت میں چربی نائٹروجن کو پانچ گنا زیادہ جذب کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موٹے آدمی غوطہ لگانے یا پانی میں بنیاد ڈالنے کے کام کے نہیں ہوتے۔ ان تجربوں سے واقعتاً ہزاروں جانیں بچ گئیں۔

نمک اور غذا کے بغیر :-

کچھ لوگ نمک ناپسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم نمک دانی کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ مگر وہ نمک کھاتے ہیں۔ روٹی، پنیر، مکھن، گوشت اور تقریباً تمام دوسری غذاؤں میں نمک ہوتا ہے۔ نمک کے بغیر زندگی مشکل ہے خون سمندر کے پانی کی طرح کھاری ہوتا ہے۔

ایک یا دو سال پہلے تین طبّی طالب علموں اور ایک ڈاکٹر نے نمک چھوڑنے کا تہیّہ کیا۔ انھوں نے خاص روٹی، پھیکا مکھن، تین دفعہ اُبلی ہوئی ترکاریاں جام، پھل اور کافی پر گذر کرنا شروع کیا۔ وہ گرم بھاپ کا غسل کرتے تاکہ پسینہ جس میں نمک ہوتا ہے جہاں تک ہوسکے اُن کے جسم میں باقی نہ رہے۔

ایک ہفتہ بعد وہ پورے طور پر بلا نمک کی غذا کھانے لگے۔ آٹھویں یا نویں دن اُن کی بھوک مرگئی۔ مُنہ کا مزا جاتا رہا۔ بیمار معلوم ہونے لگے اور اتنے کم زور ہوگئے کہ ہلنا مشکل تھا۔ پٹھوں میں اینٹھن ہوگئی اور اس طرح نمک کی اہمیت ہمیشہ کے لئے ثابت ہوگئی۔

فوج کے لئے غذا کا سوال بڑا اہم رہا ہے۔ فوجیوں کو ایسی غذا دی جاتی ہے جو مقدار میں کم ہو مگر غذائیت میں زیادہ۔ چند سال ہوئے جرمن جرمنٹ میں سے کچھ آدمیوں کو مٹر کے آٹے کی غذا تجربتاً کھلائی گئی۔ تین دن تک یہ لوگ یہی کھاکر کام کرتے رہے لیکن چوتھے دن وہ گرنے لگے اور بیس میں سے صرف پانچ آدمی چھ دن تک اس غذا پر سنبھل سکے۔

ایسی ہی دوسری غذا کا تجربہ برطانوی فوج پر کیا گیا۔ ۵۰ سپاہیوں سے تین دن تک سخت محنت کرائی گئی۔ انھیں کافی کی ٹکیاں اور سالن دیا گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ بھی پہلے کی طرح نکلا۔ دوسرے دن ۵۰ میں سے ۴۶ آدمی بیکار ہوگئے۔ سب کے پیٹ میں درد ہوگیا اور طبی امداد سے وہ اچھے ہوئے بھلے لوگ سائنس کے تجربوں میں اپنی صحت اور جان صرف اس لئے قربان کردیتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کو اچھی صحت اور زندگی مل سکے۔ وہ لوگ قابلِ عزت ہیں اور انھیں ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔

(ملخص)

نیا کھلونا

آج ہم تمھیں ایک دلچسپ کھیل بنانے کی ترکیب بتاتے ہیں اس کی ترکیب بہت آسان ہے ہم نے خود کرکے دیکھی ہے۔ لکڑی یا دفتی کے چھ ٹکڑے دو انچ چوڑے اور تین انچ لمبے کاٹ لو ½ انچ چوڑا اور دو گز لمبا فیتا اور تھوڑا سا گوند بھی لے لو اب دفتی کے دو ٹکڑے لو۔ پہلے کے ایک طرف (۱) اور دوسری طرف (۲) اور دوسرے کے بھی اسی طرح ایک طرف (۳) اور دوسری طرف (۴) لکھو۔ اب فیتے میں سے تین ٹکڑے پونے پانچ پانچ انچ کے کاٹ لو۔ دفتی کے ٹکڑے نمبر ۱ پر فیتے کا ایک ٹکڑا ایک طرف بیچ میں چپکا دو۔ دوسرے دونوں فیتے دوسری طرف (شکل نمبر ۱) دوسرا دفتی کا ٹکڑا لو اور نمبر ۴ لکھی ہوئی طرف اوپر رکھو۔

(شکل نمبر ۱)

دفتی نمبر ۱ کے فیتے کے دونوں ٹکڑے نمبر ۱ کی طرف سے نمبر ۴ کے کناروں پر چپکاؤ۔ (دیکھو شکل نمبر ۲)
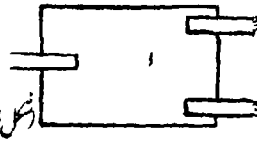
بیچ کا فیتا دفتی نمبر ۴ کے نیچے سے لا کر ۴ کے اوپر چپکاؤ۔ یہ تم (شکل نمبر ۲) دیکھ کر اچھی طرح سمجھ سکتے ہو۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ چپکے ہوئے ٹکڑے ٹھیک ہیں یا نہیں ایک ٹکڑے کو ہاتھ میں لے کر
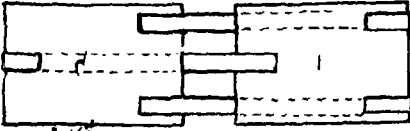
(شکل نمبر ۲)

ذرا جھکاؤ تو دوسرے ٹکڑے کے دونوں سرے خود بخود گر جائیں گے۔ دفتی کا تیسرا ٹکڑا لے کر ایک طرف ۵ اور دوسری طرف ۶ لکھو اور پہلے دو ٹکڑوں کے ساتھ چپکاؤ (شکل نمبر ۳) فیتے کے تین تین ٹکڑے جیسے پہلے کاٹے تھے ویسے ہی کاٹتے جاؤ اور دفتی کے باقی تین ٹکڑوں کو ایک ایک کرکے پہلے تین ٹکڑوں سے چپکا لو۔ دفتی نمبر ۱ کا اوپری سرا انگلیوں سے پکڑا اور تیر کا نشان (شکل نمبر ۴) جس رُخ کو دکھاتا ہے اس پر دوہرا کر دو۔ ایسا کرنے سے دفتی کا ہر ٹکڑا ایک دوسرے پر الٹ جائے گا۔ فیتوں کو بالکل سروں پر چپکانا۔ دیکھو کیسا اچھا کھلونا بن گیا۔

شکل نمبر ۳

شکل نمبر ۴
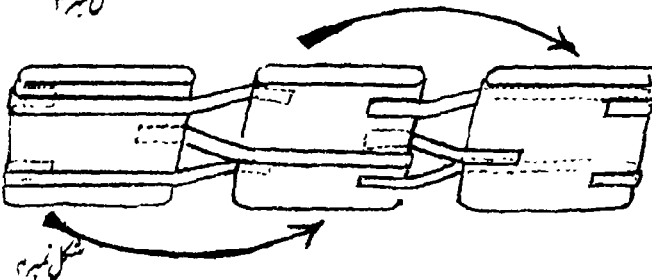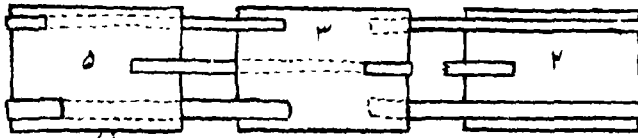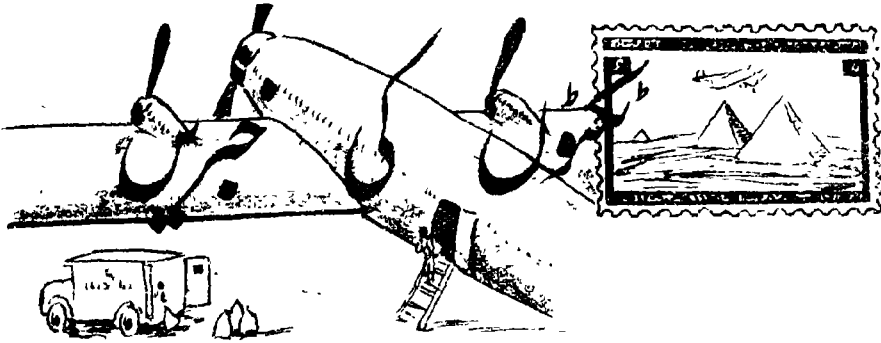
نیویارک ورلڈ فیر میں آئس لینڈ کی جو نشانی تھی اس قسم کی تصویر آئس لینڈ کے ایک ٹکٹ پر چھاپنے کا فیصلہ حکومت نے کیا ہے۔ اس ٹکٹ پر تھارفن کارسینفنی کی تصویر ہرے رنگ کی ہوگی۔

کارسینفنی، لیف آرسکن، امریکہ کے دریافت کرنے والے کا ہم عصر تھا اور اس نے ونڈ لینڈ کو آباد کرنا چاہا تھا مگر اس کی کوششیں ناکام رہیں۔

بلجیم نے تیسری دفعہ ایک سیٹ ارول ایے (گرجا) کو گرنے سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں چندہ جمع کرنے کے لئے جاری کیا تھا۔ یہ ٹکٹ اصلی اور ان پر لکھی ہوئی قیمت سے دگنی قیمت میں فروخت کئے گئے جو (75c + 75c) سے لگاکر (5 + 5) تک تھی۔ ان ٹکٹوں کی تصویروں میں ابے فرے، خانقاہیں اور گوشہ نشیں (پادری) مختلف مذہبی کاموں میں مشغول دکھائے گئے ہیں اور شاہ لیوپولڈ ثالث اور اس کے مرحوم باپ شاہ البرٹ کی تصویر بھی ہے۔

جنگ شروع ہونے سے چند دن پہلے فرانس میں (90c) کا ایک ٹکٹ جاری ہوا تھا۔ اس ٹکٹ میں چودھویں صدی کا پو کا قلعہ جو ایک شہر اور چھٹیاں گذارنے کی جگہ ہے بنایا گیا ہے اور پائیرنیز کا بھی ایک منظر تھا جو شراب کے لئے مشہور جگہ ہے۔ اس قلعے میں ہنری چہارم فرانس کا پہلا بادشاہ پیدا ہوا تھا اس بادشاہ کا ہنڈولا اور کتب خانہ اب تک قلعہ میں محفوظ ہے۔

جنیوا کی ریڈ کراس قائم کرنے والی مجلس کی یاد کے اعزاز میں سوئٹزرلینڈ سے دو خوبصورت ٹکٹ جاری ہوئے ہیں۔ ان ٹکٹوں میں جنیوا کا ایک منظر ہے اور ریڈ کراس بھی بنی ہوئی ہے (20c) کا ٹکٹ ہرا، سرخ اور پیلا اور (30c) کا ہرا، نیلا اور سرخ ہے۔

اشارات

دائیں سے بائیں

(۱) آہاہا! یہ معما تو بہت ہی .... ہے۔

(۳) وہ سنسان جنگل وہ نور ...... + وہ براق سا ہر طرف دشت و در

(۶) جرمنی میں ہٹلر کی پارٹی .... کہلاتی ہے۔

(۸) نیست ہو جانا۔

(۹) گلاب

(۱۰) غزل کے مشہور شاعر۔

(۱۱) کسان اب چلا کھیت کو چھوڑ کر + کہ گھر میں کرے چین سی.... بسر

(۱۳) پنجاب میں خوب پی جاتی ہے۔

(۱۵) اسلام میں اس شخص کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے۔
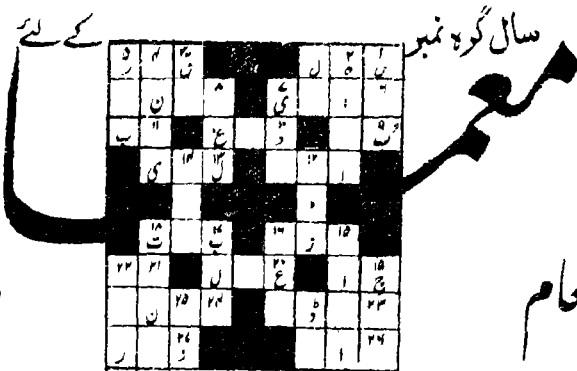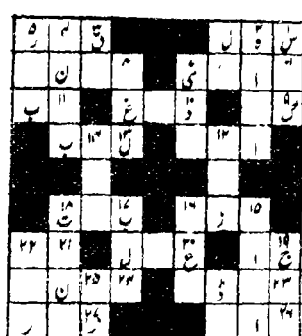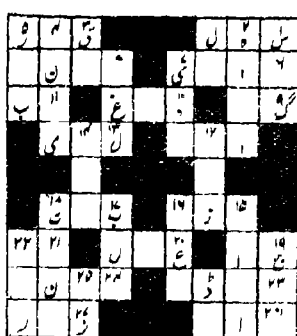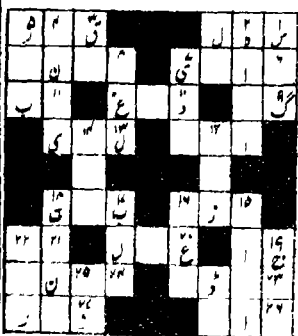
اوپر سے نیچے

(۱) پتھر

(۲) چاند کے گرداگرد .... ہوتا ہے

(۴) .... کی پہچان یہ ہے کان پر قلم ضرور ہوگا۔

(۵) میٹھی ہوتی ہے اور گنے کی بنتی ہے۔

(۷) ضدی (بے ترتیب)

(۸) اس خاندان کے بادشاہوں نے ہندوستان میں کئی سو سال حکومت کی ہے۔

(۱۲) بھید

(۱۴) اس سے بڑے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔

(۱۹) ہندؤں کا روزہ۔

(۲۰) بغیر .... کے علم بیکار ہے۔

(۲۱) ہنر

(۲۳) کبھی گندا .... نہ کھانا۔

(۲۴) چمکنے سے .... کے تھا اک سماں + ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں

(۲۶) بچوں کے چہروں پر چھوٹی سی .... ہوتی ہے۔

(۲۷) روس کے پرانے بادشاہ .... کہلاتے تھے۔

(۱۵) عقلمند

(۱۶) ہماری .... ہے کہ پیامی بڑے ہوکر کامیاب زندگی بسر کریں۔

(۱۷) جلب (بے ترتیب)

(۱۸) تین گنا

(۱۹) .... بڑی پیاری ہوتی ہے۔

(۲۲) رات گذری .... کا تڑکا ہوا + ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

(۲۵) تین فٹ کا ایک .... ہوتا ہے۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچّے حل کرنے میں حصّہ لے سکتے ہیں۔ استاد کی تصدیق ضروری ہے

(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۳) ایک سے زائد حل بھی بھیجے جاسکتے ہیں۔

(۴) دونوں انعام تقسیم کردئے جائیں گے۔ قرعہ اندازی نہیں ہوگی۔

(۵) تمام حل ۳۰ ر نومبر تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانا چاہیے۔

(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۷) لفافے کے بائیں کونے پر لفظ معمّا لکھ دیا جائے (۸) نام اور پتہ پورا اور صاف لکھو۔

اکتوبر کے معمّے کا حل

	ن	۳ ا	۲ غ	ف	۱ ا	
۷ پ		م	ا	۵ ک		۴ م
ی	۸ ز		ر		۶ ث	ی
ا	و	۱۰ ڈ		ت	ا	۹ ر
م	۱۳ م		۱۲ س		ر	۱۱ ث
ی		ر	ک	۱۴ س		ھ
	ف	ی	ر	ع	۱۵ ت	

آپا جان

عزیز بچیو اور بچو!

سب سے پہلے تو میں تمھیں عید کی مبارک باد دیتی ہوں۔ اس دن تم کتنے خوش و خرم ہوگے۔ کتنا اچھلو کودوگے۔ مجھے تو اس کے خیال ہی سے غیر معمولی مسرت ہوتی ہے اور کیوں صاحب اس دن تم اپنے دوستوں اور عزیزوں کو تحفے تحائف تو ضرور دوگے۔ اگر ایکی تحفے میں پیام تعلیم کا سال گرہ نمبر دو تو کیسا رہے! ہے نا اچھی تجویز؟ مگر اس پر عمل بھی ہونا چاہیئے۔

میری تجویز تھی کہ اس سال ۲۹ر اکتوبر کو مکتبے میں پیامیوں کا ایک جلسہ کیا جائے۔ ساتھ ہی ان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں کی نمائش بھی ہو۔ میں نے تو انتظام بھی شروع کر دیا تھا اور تمھیں اطلاع بھی دے دی تھی مگر عین وقت پر مجھے جامعہ کے ایک ضروری کام سے پونا جانا پڑا اور یہ کام ملتوی ہوگیا۔ کئی برس سے میری یہ خواہش ہے کہ میں اپنے پیامی بچوں سے ملوں۔ ان سے مفید باتیں سیکھوں، انھیں کچھ اچھی اچھی باتیں بتاؤں، مگر جب ارادہ کرتی ہوں کوئی ایسی ہی بات سامنے آجاتی ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ نومبر میں ایسا جلسہ کروں۔ مگر تاریخ ابھی نہیں بتاؤں گی۔ یہ بات خط و کتابت کے ذریعے طے ہوگی۔

اکسکرشن کے انعامی مقابلے میں بچّوں اور بچیوں نے کل گیارہ مضمون بھیجے ہیں ان میں مس جمیلہ عبداللہ کا مضمون سب سے اچھا ہے۔ جمیل الحق علی گڑھ کا نمبر دوسرا ہے۔

اب کے معمے کا حل کوئی ایک سو ساٹھ بچوں اور بچیوں نے بھیجا ہے ان بچوں کے حل صحیح ہیں۔

مشتاق احمد - کراچی	ملک مظفر احمد ۔ لائل پور	سید محمد آصف علی - علی گڑھ
منظور الحسن آرہ (بہار)	مسعود الرحمن فرخ آباد	محمد سیف غلام خاں

رئیس احمد فاروقی میرٹھ

عبدالغنی حسن (بلوچستان)

سلطان احمد اللہ والا۔ دہلی

خریدار نمبر ۲۰۷۹

عثمان علی حیدرآباد

قمر احمد حیدرآباد

آفتاب عالم بھاگلپور (بہار)

سید عارف بشیر علی گڑھ

احتشام احمد ہاشمی جھانسی

اقبال احمد ورنگل (حیدرآباد)

سید احمد زبیر بھاگلپور (بہار)

محمد عماد الدین ملتان پورہ (حیدرآباد)

خریدار نمبر ۶۹۱۸

مزمل الدین قیصر دھولیا

قدسیہ بیگم سیف آباد (حیدرآباد)

عبدالرافع ۳۶۵۱

اقبال محمد شفیع علی گڑھ

محمد الدین موحد بدایوں

اقبال قادری بدایونی (حیدرآباد)

انیس احمد چمپارن (بہار)

نصیر الدین حیدر بریلی

حمید عمر بلند شہر

ارک دان گونڈا

ملک اسرار احمد خاں شاہجہانپور

ہاجرہ سلطانہ لودھیانہ

نعیم پاشا پرویز میرٹھ

احمد سعید علی گڑھ

عبدالرؤف کانپور

ان بجھوں کے حل میں ایک غلطی ہے ۔

رقیہ سلطانہ

محمود الرحمٰن خاں فرخ آباد

احسان الحق قریشی دہلی

احسن اشفاق نینی تال

خریدار نمبر ۲۶۹۶

منظور احمد بستی

محمد احسن حیدرآباد

سعیدیہ سلطانہ حیدرآباد

نجمہ سلطان میرٹھ

ظہیر حسن خاں بریلی

جمیل یوسف حیدرآباد

محمد خورشید اقبال سہارنپور

عطاء الرحمٰن پھلواری شریف

ظفر الاسلام ۔ اندور

اختر مرزا اجمیر شریف

مبین احمد مونگیر (بہار)

قمر الدین امراوتی (برار)

محمد محسن علی حیدرآباد

خریداری نمبر ۳۱۰۳ بیجاپور

غلام یزدانی حیدرآباد

محمد حسن سارن

راما نند گوہر سیالکوٹ

غازی الرحمٰن کوئٹہ (بلوچستان)

حمید اللہ بنارس

سید حسن زیدی شملہ

انیس الرحمٰن حیدرآباد

نصیر الدین حسن بریلی

مرزا سعید الدین احمد (بنارس)

رافیہ بیگم الہ آباد

شمیم قمر کانپور

تارا سنگھ جھنڈوارہ

خریدار نمبر ۱۵۶

محمد حلیم نمبر ۱۵۸۵

محمد حنیف خاں پٹنہ
اختر حسین صدیقی علی گڑھ
شفیع احمد خاں پٹنہ
سید ظفر علی دہلی
مظہر علی علوی دہلی
محمد ظہور الحسن بہار
رام پال گونڈہ
سعید الزماں جعفری علی گڑھ
امان اللہ خاں سرحد
سید محمد ثقلین زیدی بجنور
محمد مغیث الدین کلکتہ
اسلام حسین گورکھپور
ایس کے بارہ بنکی
جون وکٹر سنگھ گونڈا
محمد یوسف بلند شہر
علی انور سیف الدین حیدرآباد
فرید احمد آگرہ
محمد اظہار حسین دہلی
حبیب احمد صدیقی بدایوں
محمد بشیر سیالکوٹ
خلیل عمر علی گڑھ
محمد غیاث الدین گیا (بہار)

عبدالجلیل عزیزی پٹنہ
زکیہ بیگم قاضیہ میرٹھ
منہاج محمد خاں ناگپور
علاء الدین احمد آگرہ
سید امیر حیدر رامپور
منصور الملک گونڈہ
محمد ستار الرب کانپور
شعیب قریشی رامپور
محمد مسعود انصاری گلبرگہ
حافظ محمد سلیم الدین حیدرآباد
افتخار احمد انصاری اعظم گڑھ
محمد عزیز الدین لاہور
اختری بیگم فقیہ تھانہ
ابو محمد غوث محی الدین انصاری لکھنؤ
محمد ظفر پیشاور
علی احمد جمال الدین حیدرآباد
محمد مجیب الدین خاں۔ شیرکوٹ
محمد خلیل الرحمٰن قدوائی بارہ بنکی
حامد علی خاں درانی بستی
محمد ظہیر الدین مونگیر
حبیب احمد علی گڑھ
محمد مہدی انصاری لکھنؤ

محمد یحییٰ پٹنہ
خورشید مصطفیٰ زبیری دہلی
سید محی الدین احمد پٹنہ
الطاف فاطمہ بیگم لکھنؤ
شیخ مختار مسعود علی گڑھ
بشیر یوسف گونڈہ
عزیز الاسلام زبیری ایٹہ
عبدالعزیز پٹنہ
احمد عبدالعزیز [illegible]
ملک ابرار احمد شاہجہانپور
خورشید بیگم گوالیار
پروین نگار
روزلین سنگھ گونڈا
علی احمد خلیل جالندھر
سراج السالکین نقی دہلی
محمد عبدالحئی حیدرآباد
محمد میاں دہلی
عشرت ریحانہ میرٹھ
سید نظام الدین پٹنہ
اقبال احمد۔ امروہا
شاہ عثمان احمد بارہ بنکی
ساجدہ لکھنؤ

معمے کی فیس میں نے کل اور رکھی ہے۔ اب یہ مسئلہ ذرا مشکل ہو گیا ہے کہ اتنے بچوں کو انعام میں کیا چیز دی جائے۔ میں نے معمہ بنانے والے صاحبوں کے مشورے سے یہ بات طے کی ہے کہ ارادہ ٹوکن چھپوالوں اور کم انعام والے لڑکوں کو یہ ٹوکن بھجوا دوں۔ یہ بچے ایک آنہ کے ٹکٹ کی جگہ اپنے حل کے ساتھ یہ ٹوکن بھیج سکتے ہیں[1]۔

ہاں ایک بات اور۔ ایڈیٹر صاحب کی خواہش ہے کہ تم سال گرہ نمبر کے بارے میں اپنی رائے ضرور لکھو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جو بچہ پوری آزادی مگر سلیقے اور تمیز سے اپنی رائے ظاہر کرے گا اسے انعام دیا جائے گا۔

اس مرتبہ بھی میرے پاس بہت سی شاخوں کی رودادیں آئی ہیں عزیزی حسن احمد قنوجی کا خاص طور پر اصرار ہے کہ جلسے کی روداد، قطب کی پکنک کا حال اور ممبروں کے بارے میں ان کا اعلان ضرور شائع کیا جائے مگر افسوس ہے کہ رسالہ میں گنجائش بالکل نہیں ہے۔ ہاں اس موقع پر اتنا ضرور بتا دوں کہ عزیزی حسن احمد نے جو اس سال دہلی کی پیام برادری کے سکریٹری تھے اپنی برادری کو بڑھانے اور ترقی دینے میں بہت محنت اور دل سوزی سے کام کیا۔ میں اپنی اور تمام پیامیوں کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آیندہ سکریٹری ان کی مثال سے سبق لے گا اور اپنی محنت اور جفاکشی سے اس کام کو اور آگے بڑھائے گا۔

اچھا اب رخصت

تمھاری آپا جان

جن بچوں اور بڑوں نے اگست کے انعامی مقابلے کے لئے کہانیاں لکھ کر بھیجی ہیں وہ تعداد میں چونکہ بہت زیادہ ہیں یعنی بیاسی (۸۲) - اس لئے جانچنے والے صاحب انھیں پورے طور پر جانچ نہیں سکے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب کو افسوس ہے کہ اس پرچے میں نتیجہ شائع نہ ہو سکا اب وہ خط کے ذریعے ان لوگوں کو اطلاع دے دیں گے جن کی کہانیاں مقابلے میں آگئی ہیں اور جنوری میں باقاعدہ نتیجہ شائع کریں گے۔ "منیجر"

[1] یہ ٹوکن بیچے بھی جائیں گے۔ ایک روپیہ میں بیس۔ جن بچوں یا شاخوں کو منگوانا ہوں وہ عمر بھیج کر منگوالیں۔

Regd No L 1961

اونچے درجے کے بچّوں کے لئے

مکتبہ جامعہ دہلی

سالنامہ
یام تعلیم
مکتبہ جامعہ دہلی

ہندوستانی کھیل

مصنفہ، الطاف علی صاحب نگراں تربیت جسمانی، جامعہ

ہمارے ملک میں بچے کی جسمانی تندرستی سے نہایت افسوس ناک حد تک بے اعتنائی برتی جاتی ہے اور اس کی تفریحی ضروریات کی طرف تو سرے سے توجہ نہیں دی جاتی۔ عام طور پر ہمارے ملک کے بچے جسمانی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور اُن کی چال ڈھال میں وہ مستعدی نہیں پائی جاتی جو ان بچوں میں ملتی ہے جنھیں کثرت سے کھیلنے کے مواقع ملتے ہیں۔ بچوں کو ۲ سے لے کر ۴ گھنٹے تک ہر روز آزادی کے ساتھ کھیلنے کا موقع دینا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اعصاب کی تربیت کرسکیں۔ جو بچہ ایسے ماحول میں تربیت پائے گا وہ ملک وملت کے لئے سرمایۂ افتخار ہوگا اور زندگی کے تمام نشیب و فراز میں اس پر اعتماد کیا جاسکے گا مصنف نے انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہندوستانی کھیل اس کتاب میں درج کئے ہیں جو مختلف عمر کے بچے کھیل سکتے ہیں۔

قیمت۔ عمر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ۔ بمبئی

پیامی بھائیوں کو ہو مبارک سالِ نو یارب
لگے علم و ہنر کی شمع سے ان سب کی لو یارب
دعا نیّر کی ہے پھولیں پھلیں یہ باغِ عالم میں
رہیں راہِ ترقی پر ہمیشہ تیز رو یارب
شفیع الدین نیّر
FIROZE

سالنامہ

پیامِ تعلیم دہلی

جلد ۲۰ نمبر ۱ و ۲

جنوری و فروری ۱۹۴۱ء

فہرست مضامین

قیمت سالانہ ۶

پیامی عزیزوں کو بڑی عید اور نیا سال مبارک۔ خدا سے دعا ہے کہ یہ نیا سال ان کے لئے نئی نئی کامیابیوں اور مسرّتوں کا پیام لائے۔ آمین

اس خوشی کے موقع پر سالنامے کا یہ تحفہ ہمیں یقین ہے کہ ان کی مسرّتوں کو اور بڑھادے گا۔ ہم نے اسے دلچسپ اور مفید بنانے کے لئے بہت محنت کی ہے۔ اگر ہمارے عزیز پیامیوں نے بھی اسے پسند کیا تو گویا ہماری محنت ٹھکانے لگی

پیام تعلیم کا سال گرہ نمبر اب تک اکتوبر میں شائع ہوتا تھا۔ مگر اس مرتبہ کچھ ایسی رکاوٹیں آ کر پڑیں کہ ہم پچھلے اکتوبر میں سالنامہ شائع نہ کرسکے۔ سب سے بڑی رکاوٹ آج کل کے حالات تھے۔ اس وقت لڑائی کی وجہ سے ہر چیز مہنگی ہے۔ کاغذ، چھپائی۔ اور بلاکوں کی بنوائی وغیرہ۔ تاہم اس سے ہمارے پیامیوں کو جو رنج اور ناامیدی ہوئی اس کا ہمیں احساس تھا۔ اسی احساس نے ہمیں جنوری میں سالنامہ نکالنے پر مجبور کیا۔

ہمیں پچھلے سالوں کے سالناموں کے مقابلے میں اس کی تیاری کے لئے وقت بہت کم ملا۔ کل ایک مہینہ۔ پھر مضمون نگاروں سے مضمون لکھوانا۔ ان کی کتابت کرانا۔ آرٹسٹ سے تصویریں بنوانا۔ تصویروں کے بلاک بنوانا۔ پھر ان سب کو چھپوا کر وقت پر تمہارے پاس بھیجنا غرض اتنی کم مدت میں یہ سب کچھ کرانا تھا۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ اور رات دن ایک کر دیا۔

ہم نے سال گرہ نمبر کے معیار کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ پھر بھی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ ہم اسے اپنی خواہش اور ارادوں کے مطابق تیار نہ کرسکے۔ وقت کی کمی ہی اس کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اس پرچے کی ترتیب میں ہمیں مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیّر سے خاص مدد ملی۔ انھوں نے ہمارے لئے

ایک دلچسپ کہانی لکھی۔ دو اچھی اچھی نظمیں لکھیں اور بچوں کی بہت سی نظموں کی اصلاح کی۔ ان کے علاوہ سید عروج الحسن صاحب معموں کے سلسلے میں سال بھر تک ہماری مدد کرتے رہے۔ سید نورالحسن صاحب ہاشمی (ایڈیٹر جامعہ) نے خود بھی مضمون لکھے اور دوسروں سے لکھوائے۔ جناب عبدالغفور صاحب لکچرار ٹریننگ کالج نے اپنے شاگردوں سے بہت قیمتی مضمون لکھوائے۔ حسن سبحانی صاحب بی۔ اے جامعہ نے محترمہ آپا جان کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ کیا۔ اور اسے ایک دلچسپ مضمون بنا دیا۔ اور وقتاً فوقتاً ہمارا ہاتھ بٹاتے رہے۔ جناب سعید انصاری صاحب (پرنسپل استادوں کا مدرسہ جامعہ) آخر تک مضمون لکھنے کا وعدہ کرتے رہے اور آخر میں انھیں وعدہ پورا نہ کرسکنے کا افسوس رہا۔ ان سب بزرگوں اور بھائیوں کا ہم دلی شکریہ ادا کرتے ہیں ان کی امداد اور مشوروں کے بغیر پیام تعلیم کو شاید اتنی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔

لڈو کا ٹکڑا والی نظم ہم نے نیر صاحب سے خاص طور سے لکھوائی ہے۔ پچھلے سال گرہ نمبر ۳۹ء کی نظم "پھل جیسی کو کس نے مارا" بچوں نے بہت پسند کی تھی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ بھی اسی طرح مقبول ہوگی

پچھلے پرچے میں ہم نے چند عنوانات پر بچوں کو مضمون لکھنے کی دعوت دی تھی۔ بہت کم بچوں نے اس طرف توجہ کی۔ شاید اس لئے اور بھی کہ وقت کم تھا۔ ان مضامین میں صدیقہ رضیہ سلطانہ مانا ودر اور محمد الدین مؤجد کے مضمون سب سے اچھے ہیں۔ انعام انھی کو دیا جائے گا امیراللہ خاں بھوپالی کا مضمون بھی بہت اچھا ہے لیکن وقت پر نہیں پہنچا۔ یہ مضمون اگلے پرچے میں چھپے گا۔

یہ پرچہ جنوری اور فروری کا مشترکہ نمبر ہے۔ اس لئے فروری میں پیام تعلیم کا انتظار نہ کرنا۔ اب یہ مارچ میں تمھارے پاس پہنچے گا

لفافے کی قیمت اب ۱؎ ہو گئی ہے مگر بعض بچے اب تک ایک ہی، آنے میں خط بھیجتے ہیں۔ ان کا خط بیرنگ ہو جاتا ہے۔ اور دفتر کو بہت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ امید ہے کہ بچے آئندہ خیال رکھیں گے۔

محمد شفیع الدین صاحب نیر

کسی شہر میں ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ مزدور تھا دن بھر کام کرتا۔ شام کو گھر آتا۔ مزدوری کے جو پیسے ملتے ان سے آٹا، دال، گھی، لکڑی، نمک، مرچ خریدتا، بیوی اناج پیستی، چولھا جلاتی کھانا پکاتی، کھانا پک چکتا تو سب کھانے کو بیٹھ جاتے۔ اور کھا پی کر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے۔

یہ میاں بیوی بہت غریب تھے میاں جو کچھ لاتا اس میں انکی کا خرچ مشکل سے چلتا۔ اس پر ان کے تین بچے بھی تھے۔ پھر بھی جیسے بن پڑتا۔ یہ کام چلاتے۔ میاں بیوی اور بچے خوش رہتے۔ جو کچھ روکھا سوکھا مل جاتا ہنسی خوشی کھا پی لیتے۔

ان کے تین بچوں میں سب سے چھوٹا بچہ عجیب طرح کا تھا آٹھ دس برس کا ہوگیا۔ مگر اس کا قد ایک فٹ سے زیادہ نہ بڑھا۔ نام تو نہ جانے کیا تھا۔ مگر سب لوگ اسے ٹلو میاں کہہ کہہ کر پکارتے تھے۔ یہ بہت تیز۔ باہمت اور سمجھ دار تھا۔ اس عمر میں ایسی ایسی باتیں کرتا کہ سب سن سن کر حیران ہوتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اس مزدور کو کئی دن تک کچھ کام نہ ملا۔
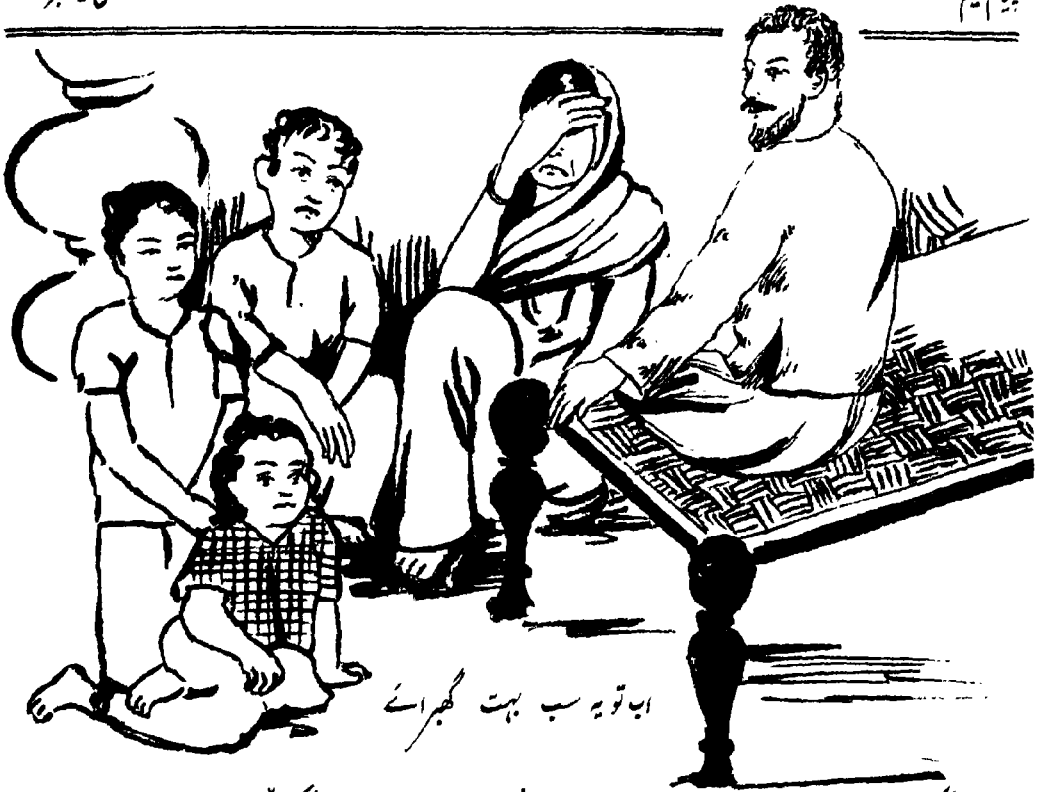
اب تو یہ سب بہت گھبرائے

اب تو گھر کا کام چلنا بند ہو گیا۔ ایک دو دن آدھے آدھے پیٹ کھا کر گذارہ کیا مگر جب اتنا بھی نہ ملا تو یہ سب بہت گھبرائے۔ ایک دن تنگ آ کر باپ نے کہا۔ "چلو جنگل چلیں۔ جنگلی جھاڑیوں میں بیر ویر مل جائیں تو وہی کھا پی کر پیٹ بھر لیں"۔ تینوں بچّے بولے "اچھا" ذرا اچھلتے کودتے چل دئے۔ چلتے چلتے وہ گھر سے بہت دور نکل گئے۔ اور ایک بہت ہی گھنے جنگل میں جا پہنچے۔ وہاں بہت سی جھاڑیوں میں بیر اور کچھ اور بھی پھل ملے۔ یہ بھوکے تو تھے ہی، بس ٹوٹ پڑے۔ باپ نے سوچا یہ بچّے یہاں کھالیں میں ذرا آگے بڑھ جاؤں۔ اور نئی جھاڑیاں تلاش کر کے ان کے پھل کھاؤں۔ اس نے ایسا ہی کیا مگر کھاتے کھاتے ذرا زیادہ دور نکل گیا۔ اتنے میں شام ہو گئی اور بچّوں کے پاس واپس

آنے کے لئے چلا مگر غریب راستہ بھول گیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ بچے مل جائیں مگر نہ ملے۔ آخر تھکا ہارا اُداس گھر پہنچا۔ اپنی بیوی سے سب حال کہا۔ دونوں بہت روئے پیٹے مگر فقط رونے پیٹنے سے کیا ہو سکتا تھا۔ اس لئے ان دونوں نے مل کر ان کو تلاش کرنا شروع کیا۔

اب بچوں کا حال سنئے۔ وہ مزے سے کھیلتے اَور کھاتے رہے کھانے اَور کھیلنے سے ان کا پیٹ خوب بھر گیا تو شام کا اندھیرا دیکھ کر ان کو بھی ہوش آیا۔ سب خوب زور زور سے "آبا! آبا!" کہہ کہہ کر چلائے۔ مگر کوئی جواب نہ ملا تو کہنے لگے اب کیا کریں! ایک نے کہا "جس رستے آئے ہو اسی رستے گھر لوٹ چلو" سب نے کہا "بات تو ٹھیک ہے" اب چلے تو یہ بھی راستہ بھول گئے۔ رات بھی ہو رہی تھی۔ جنگل کے جانوروں کی آوازیں سنائی دیں تو یہ بہت ڈرے۔ بڑے بھائی نے کہا "خدا خیر کرے آج بچتے نظر نہیں آتے" ٹلو میاں بولے "ہمت کیوں ہارتے ہو۔ جو ہونا ہوگا ہو جائے گا۔ مگر یوں جنگل میں مارا مارا پھرنا ٹھیک نہیں چلو کسی ٹیلے پر چڑھ کر دیکھیں شاید کہیں روشنی نظر آئے۔ بس اسی طرف چل پڑیں گے۔ آبادی میں رات گزار دیں گے صبح اپنے گھر چلے جائیں گے"

وہ اَور کرتے بھی کیا۔ سب نے کہا اچھا چلو۔ آگے آگے ٹلو میاں پیچھے پیچھے دونوں بھائی چلے جا رہے تھے۔ سامنے سے کبھی کوئی لومڑی گزر جاتی اَور کبھی گیدڑ۔ ان کا کلیجہ کانپ جاتا۔ یہ اچھا ہوا کہ بھیڑیا، بھالو یا شیر نہ ملا ورنہ ان کا نوالا بنا لیتا۔ چلتے چلتے یہ ایک ٹیلے کے پاس پہنچے۔ ٹیلا کیا تھا اچھی خاصی پہاڑی تھی۔ یہ جھٹ پٹ اس پر

چڑھ گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دوسری طرف جنگل ونگل کچھ نہیں ایک بہت لمبا چوڑا میدان ہے۔ اس میدان میں بہت دور ایک طرف انھیں کچھ روشنی بھی دکھائی دی۔

یہ بولے "بس وہیں چلو" یہ تینوں چلے۔ وہی آگے آگے ٹلّو میاں اور پیچھے پیچھے بھائی۔

یہ روشنی اصل میں ایک محل کے پھاٹک کی تھی۔ اس محل کا مالک ایک بہت ظالم دیو تھا۔ یہ وہاں پہنچے تو پھاٹک کھلا پایا۔ اندر داخل ہوئے تو ایک پری ان کو نظر آئی۔ یہ پری بہت ہی اچھے کپڑے پہنے محل کے باغ کی ایک روش پر ٹہل رہی تھی۔ اس نے جو انھیں دیکھا تو نرمی سے پوچھا "تم کون ہو؟"

ٹلّو میاں جھٹ آگے بڑھے اور انھوں نے پری کو اپنا حال کہہ سنایا۔

یہ پری بہت نیک تھی۔ اس کو ان پر رحم آگیا۔ بولی "بچو! تم اپنی جان بچانا چاہتے ہو تو یہاں سے ابھی چلے جاؤ۔ اس محل کا مالک دیو آگیا تو تمھیں کچا کھا جائے گا۔"

ٹلّو میاں نے کہا "جائیں کہاں؟ ہم اپنے گھر کا راستہ بھول گئے ہیں۔ اب تو یہیں رہیں گے۔ باہر گئے تو درندے شیر یا بھالو ہمیں کھا جائیں گے۔"

پری کیا کرتی۔ وہ بے چاری آپ دیو کی قید میں تھی۔ اس نے یہ بات بچوں کو بتا بھی دی مگر کچھ سوچ کر پھر اس نے کہا "اچھا تم کسی بہت ہی گھنے پیڑ پر چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ یہ رات کسی طرح گزار دو۔ وہ دیو صبح ہوتے ہی چلا جاتا ہے۔ وہ چلا جائے تو تم اپنے گھر چلے جانا۔"

بچوں نے کہا "اچھا" یہ کہہ کر وہ ایک بہت ہی گھنے پیڑ پر چڑھ گئے اور اس کے پتوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ اس پیڑ کے ٹہنے ایسے بڑے اور

پری نے پوچھا تم کون ہو

چوڑے تھے کہ ان پر اچھی طرح وہ لیٹ گئے۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، دونوں بھائی تو پیڑ کے ٹہنے پر لیٹتے ہی سو گئے مگر ٹلّو میاں جاگتے رہے۔ انھوں نے کبھی کوئی دیو نہ دیکھا تھا۔ انھوں نے سوچا آج دیو نہ دیکھا تو کچھ نہ دیکھا۔

اتنے میں ہوا کی سرسراہٹ سی ہوئی۔ ایک بہت لمبا تڑنگا دیو ایک تخت پر بیٹھا ہوا آیا۔ اس تخت کو چار اَور دیو اڑائے لا رہے تھے۔ انھوں نے یہ تخت باغ کے ایک ہرے بھرے میدان میں اُتارا۔ وہ دیو اتنا بڑا تھا کہ اگر ان بچّوں کو کھانے پر آتا تو سب کا ایک نوالا بنا کر کھا جاتا۔

ٹلّو میاں نے اس کی صورت دیکھی تو ڈر کے مارے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر بھی انھوں نے ہمّت سے کام لیا اَور چپ چاپ دم سادھے بیٹھے رہے۔ پری وہیں کھڑی ہوئی تھی دیو اس سے باتیں کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ٹلّو میاں نے سوچا، چلو دیو کو پاس سے ذرا اچھی طرح دیکھ لیں۔ یہ شوق اتنا بڑھا کہ ان کا سارا ڈر جاتا رہا۔

آپ چپکے چپکے جاکر دیو کے کمرے کی ایسی سمت میں کھڑے ہو گئے جہاں اُنھیں کوئی دیکھ نہ سکے۔

ٹلّو میاں کا بیان ہے کہ کمرے کے بیچ میں ایک بہت بڑی میز بچھی ہوئی تھی۔ اس پر کھانا چُنا ہوا تھا۔ ایک بیل کا قورمہ تھا۔ اَور پانچ بکروں کے گوشت کی بریانی۔ چار من دودھ کی کھیر تھی اَور دس بارہ من آٹے کی خمیری روٹیاں۔ چٹنی اچار کا وزن بھی سات آٹھ سیر سے کم نہ ہوگا۔ پری نے تو بہت تھوڑا سا کھانا کھایا مگر دیو یہ سب کھانا چٹ کر گیا۔ پانی

پینے پر آیا تو دس بارہ مٹکے پانی غٹ غٹ چڑھا گیا۔ کھا پی چکا تو ایسی ڈکار لی گویا توپ کا گولا چھُٹا۔ ٹلّو میاں اِک دم اچھل پڑے۔ اس آواز کو سن کر ان کا دِل دھڑکنے لگا۔

دیو کھانا کھا چکا تو بولا "آدمی کے دو چار بچوں کا گوشت اَور مل جاتا تو جی ذرا خوش ہوتا۔ خیر کل کوئی فکر کی جائے گی۔" یہ بات سن کر ٹلّو میاں کے بدن کا خون خشک ہوگیا۔

دیو کھا پی کر فارغ ہو چکا تو اس نے پری سے پوچھا "تم نے کیا سوچا؟ کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لئے تیار ہو بولو۔ جواب دو؟"!

پری سے کچھ جواب نہ بن پڑا اس پر وہ دیو اَور بھی غصے میں بھر گیا۔ آنکھیں نکال کر کہنے لگا "تم کو تین دن کی مہلت اَور دی جاتی ہے، اگر اس عرصے میں تم مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوئیں اَور ہنسی خوشی یہاں رہنا پسند نہ کیا تو چوتھے دن تمھاری خیر نہیں۔"

پری اب بھی چپ رہی اَور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دیو اٹھا۔ ہاتھ منہ دھو کر وہ بھی اپنے سونے کے کمرے میں گیا اَور پلنگ پر لیٹتے ہی بے خبر سو گیا۔

ٹلّو میاں بھی اس کے کمرے میں چلے گئے اَور کمرے کی ہر چیز غور سے دیکھنے لگے۔ اتنے میں اچانک دیو کے بولنے کی آواز سن کر وہ ڈر گئے اَور جھٹ اس کے پلنگ کے نیچے جا چھپے۔

دیو کہہ رہا تھا "آج میرے باغ میں ضرور کوئی نیا آدمی آیا ہے۔ کل اس کو کچا چبا ڈالوں گا۔ .... پری میرا کہا نہیں مانتی مجھ سے شادی نہیں کرتی۔ اس کو بھی سزا ملنی چاہیے۔ وہاں ماروں گا

جہاں پانی نہ ملے............کہتی تھی میں تجھ کو مار ڈالوں گی............مجھ کو مار ڈالے گی! ہاہاہا!!..........مجھ کو مار ڈالے گی!!! مجھ کو کوئی نہیں مار سکتا............ میری جان ایک انڈے میں بند ہے۔ کسی کو خبر نہیں کہ وہ انڈا کہاں رکھا ہے۔ میں کبھی کسی کو نہ بتاؤں گا..........اس کا پتا کوئی نہ پا سکے گا..........میں نے اس کو اپنے اِسی کمرے کے تہہ خانے میں رکھا ہے............ میرا باغ اور میرا محل کیسا اچھا ہے مگر یہ پری کسی بات کو خاطر ہی میں نہیں لاتی.......... میری جان لینا چاہتی ہے.......... تہہ خانے کا دروازہ میرے سوا کسی کو معلوم نہیں..........وہ میرے پلنگ کے نیچے ہے..........کوئی اس انڈے کو جو سونے کے ایک ڈبے میں بند ہے لے لے تو میں اس کے بس میں ہو جاتا ہوں۔ وہ جو کچھ کہے وہی کرنے لگتا ہوں۔ اگر کوئی زمین پر پٹک کر پھوڑ دے تو میں اسی وقت مر جاؤں۔ یہ انڈا اس پری کے فرشتوں کو بھی نہیں مل سکتا............اب تین روز کے بعد اس کی ضد کا اسے مزا چکھاؤں گا۔

یہ اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کرتا رہا۔ ٹلّو میاں سمجھ گئے کہ دیو یہ سب کچھ سونے کی حالت میں بک رہا ہے۔ اس لئے ان کا ڈر جاتا رہا۔ پلنگ کے نیچے چھپے ہوئے تو تھے ہی، ہاتھوں سے ٹٹولنا شروع کیا تو سچ مچ ایک دروازہ پایا۔ یہ دیکھ کر تو بہت خوش ہوئے دل میں کہنے لگے۔ اچھا بچّہ! اب بچ کر کہاں جائے گا۔ تیرے غرور، ظلم، اور طاقت کو نہ توڑا ہو تو ٹلّو میاں نام نہیں۔

(باقی آئندہ)

میری اچھی اماں جان

محمد شفیع الدین صاحب

بچّہ تھا میں اِک نادان — مجھ کو نہ تھی کچھ بھی پہچان
تم نے بڑھایا میرا مان — مجھ پہ رہیں صدقے قربان

میری اچھّی امّاں جان
میری پیاری امّاں جان

وقت پہ کھانا تم نے دیا — وقت پہ کپڑا تم نے دیا
میرے لئے سب کام کیا — پھر بھی بدلہ کچھ نہ لیا

میری اچھّی امّاں جان
میری پیاری امّاں جان

میرے لئے جھولا ڈالا — میرے لئے طوطا پالا
گورا تھا میں یا کالا — میرا بول رکھا بالا

میری اچھّی امّاں جان
میری پیاری امّاں جان

دکھ میں مجھ کو اگر پایا　　بھول گئیں تم سکھ اپنا
مجھ کو پلائی تم نے دوا　　خوش دیکھا تو چین ملا

میری اچھی اماں جان
میری پیاری ماں جان

کہنے کو تو عورت ہو　　میرے لئے اِک نعمت ہو
میرے حق میں جنّت ہو　　تم پہ خدا کی رحمت ہو

میری اچھی اماں جان
میری پیاری اماں جان

محمود، خالد، راشد، حفیظ، سلامت اور نہ جانے کتنے اور سب ایک ہی مدرسے میں پڑھنے والے تصور کے یہاں جمع ہوئے تھے۔ دعوت بڑوں کی تھی، یہ سب خالی دُم چھلے تھے۔ انھیں اچھے اچھے کپڑے پہنائے گئے، اور میزبان کے گھر لاکر چھوڑ دیا گیا کہ جو چاہو کرو مگر شرارت نہ کرو۔ تھوڑی دیر تک یہ کودتے پھاندتے رہے پھر چائے پلائی گئی۔ چائے کے بعد یہ پھر کھیلے کودے، مگر سردی کا زمانہ تھا، اندھیرا جلدی ہوگیا اور یہ سب اندر بلالئے گئے یہاں بڑوں کا ساتھ تھا، بچے جو کچھ کرتے وہ شرارت، جو کچھ کہتے وہ شور۔ آخر میں محمود سے نہ رہا گیا۔ اُس نے خالد سے کہا،۔ "آؤ بھئی خالد، ایک ڈراما کریں"۔ خالد کو معلوم نہیں تھا کہ ڈراما کسے کہتے ہیں، مگر خالی بیٹھے بیٹھے اس کی طبیعت اُکتا گئی تھی۔ کرنے کا نام سُنتے ہی وہ جاگ اُٹھا۔ اُس نے کہا: "آؤ، کریں"۔

محمود نے کہا: "اچھا دیکھو، تُم ہو بسکٹ والے۔ تُم ایک ٹوکری سر پر لے کر بانگ لگاتے ہوئے آؤ۔ "کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ!" میں اور راشد یہاں کھڑے ہوں گے۔ تم سامنے آؤ گے تو میں کہوں گا، "ارے بھئی کس حساب سے دیتے ہو؟" تُم ٹوکری اُٹھا کر زمین پر رکھ دینا، بسکٹوں

پر سے کپڑا ہٹا لینا، اور مجھے بتانا :۔" یہ جی
پیشے پیشے ہیں، یہ بڑے بڑے دو پیسے
کے ہیں" اس کے بعد میں بسکٹوں کو دیکھ
کر کہوں گا :" یہ پیسے پیسے والے چار
دے دو "تم چار بسکٹ مجھے دینا اور پیسو
کے لیے ہاتھ بڑھانا۔ میں بسکٹ لے لوں گا
اور تم کو ٹھینگا دکھا کر بھاگوں گا۔ تم میرے
پیچھے دوڑنا۔ جب تم ذرا دور نکل جاؤ گے تو
راشد تمھاری ٹوکری سے بسکٹ نکال کر
گود میں بھر لیں گے اور چمپت ہو جائیں گے۔
تم تھوڑی دیر بعد آؤ گے تو دیکھو گے کہ آدھی
ٹوکری غائب ہے ۔ اور بڑی کھسیانی
صورت بناؤ گے۔ اور ٹوکری سر پر رکھ کے پھر
چل دو گے۔ آؤ کرو، بڑا مزا آئے گا۔"

خالد نے کچھ سوچ کر کہا :" واہ میں
کھسیانی صورت کیوں بناؤں۔ تم آپ
بناؤ۔"

خالد کے ابا ماجد صاحب محمود کی
باتیں کان لگائے سن رہے تھے۔ خالد نے
بسکٹ والا بننے سے انکار کیا تو انھوں نے
کہا :۔" نہیں خالد، اس میں بگڑنے کی کوئی بات
نہیں۔ ڈراما میں بے وقوف کا پارٹ کرنے
سے کوئی بے وقوف نہیں بن جاتا۔ اگر تم نے
بسکٹ اسی طرح بیچے جیسے بسکٹ والا بیچتا
ہے ، اور دھوکا کھانے کے بعد ایسی صورت
بنائی جس سے معلوم ہو کہ تم نے سچ مچ دھوکا
کھایا ہے اور بہت پچتا رہے ہو تو لوگ کہیں
گے کہ تم بڑے ہوشیار ہو۔ بسکٹ والے
کا پارٹ خوب کرتے ہو۔ تم کو تو اس پر خوش
ہونا چاہیے۔ لیکن خالد کی سمجھ میں بات نہیں
آئی۔ وہ چپ رہا۔ پھر محمود نے کہا :۔" اچھا
تم اور راشد لڑکے بنو۔ میں بسکٹ والا
بنوں گا۔ چچا آپ مجھے ایک ٹوکری دلوا دیجیے"
ماجد صاحب اٹھ کر تصور کے والد

خورشید صاحب کے پاس گئے جو کچھ دور بیٹھے تھے اور اُن کے کان میں کچھ کہا۔ خورشید صاحب مسکرا کر اُٹھے اور اندر چلے گئے۔

ماجد صاحب نے واپس آکر محمود سے کہا "اچھّا، آؤ بھئی محمود، تم کو بسکٹ والے کی صورت بھی تو بنانا ہے۔"

محمود نے کہا "جی ہاں"، ماجد صاحب اس کا ہاتھ پکڑ کر بازو کے ایک کمرے میں لے گئے۔ یہ شاید خورشید صاحب کے سونے کا کمرہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد خورشید صاحب ایک میلی سی لنگی اور اتنا ہی میلا کرتا اور ٹوپی لے کر آئے۔ محمود نے اپنے اچھے اچھے کپڑے اُتار کر لنگی باندھی، کرتا پہنا اور ٹوپی سر پر رکھی۔ اتنے میں ایک نوکر چھوٹی سی ٹوکری لے کر آیا جس میں بسکٹ بھی رکھے تھے۔ ماجد صاحب نے کہا: "لو بھئی بسکٹ والے، اپنی ٹوکری سنبھالو۔ اچھّا مگر یہ تو بتاؤ، اِسے لے کر کیسے چلوگے" محمود نے ٹوکری اُٹھالی، ایک ٹانگ چھوٹی کرلی۔ بدن ایک طرف کو جھکایا گردن دوسری طرف کو اور سر پر ٹوکری رکھ کر بانگ لگائی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ" ! ماجد صاحب ہنس پڑے۔ انھوں نے کہا: "بھئی واہ، تُم تو بڑے اُستاد نکلے۔ اچھّا تم ذرا دیر ٹھہرو۔ میں ذرا جا کر اسٹیج ٹھیک کر آؤں۔"

ماجد صاحب نے جا کر مہمانوں سے کہا "حضرات، دو تین بچّے آپ کو ایک چھوٹا سا ڈراما دِکھانا چاہتے ہیں۔ آپ ذرا تکلیف کر کے ایک طرف کو بیٹھ جائیں جس میں اسٹیج کے لئے جگہ نکل آئے۔" مہمان خوشی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ماجد صاحب نے اسٹیج کے لئے اس طرح جگہ نکالی:

مہمان سب ٹھیک سے بیٹھ گئے تو ماجد صاحب خالد اور راشد کو لے کر اس کمرے میں گئے جہاں محمود انتظار کر رہا تھا۔ اُنھوں نے تینوں کو سامنے کھڑا کر کے کہا: "دیکھو بھئی، میں نے تمھارے ڈرامے کے لئے اسٹیج تیار کرا دیا ہے۔ اس میں دو دروازے ہیں۔ بائیں طرف جو دروازہ ہے۔ اس میں سے پہلے خالد اور راشد باتیں کرتے ہوئے جائیں گے۔ وہ دو چار قدم چلے ہوں گے جب پیچھے سے بسکٹ والے کی بانگ سنائی دے گی۔ خالد تم راشد کو وہیں کھڑا کر دینا اور خود ذرا آگے جا کر ٹھہر جانا۔ جب بسکٹ والا اندر آ جائے اور خالد کے قریب پہنچے تب وہ پوچھیں گے کہ بھئی کس حساب سے دیتے ہو۔ تم راشد اس وقت ذرا بسکٹ والے کی طرف بڑھ آنا، مگر اس طرح کہ اس کے اور تماشائیوں کے درمیان نہ آ جاؤ۔ اس کا ضرور خیال رکھنا۔ آگے تو تمھیں معلوم ہے نا؟"

تینوں نے کہا: "جی ہاں۔"

تماشائی سب بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں اسٹیج کی بائیں طرف سے اسکول کے دو لڑکے باتیں کرتے ہوئے آئے، اور اُن کے داخل ہوتے ہی ایک بانگ سنائی دی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ!" ایک لڑکے نے دوسرے کی طرف آنکھ ماری اور کہا: "ارے یہی ہے وہ بسکٹ والا۔" یہ کہہ کر اُس نے اپنے ساتھی کو وہیں روک دیا اور خود ذرا آگے بڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں بسکٹ والا داخل ہوا اور اس نے ایک اور بانگ لگائی۔ پہلے لڑکے نے، جو اسٹیج کے بیچ میں کھڑا تھا، کہا: "ارے بسکٹ والے ذرا دکھاؤ تو کیسے بسکٹ ہیں۔" بسکٹ والے

نے سر پر سے ٹوکری اُتارتے ہوئے کہا: "لو جی ایسے بسکٹ ہیں کہ شہر میں کہیں نہ ملیں گے خالص گھی کے ہیں۔ ایسے خستہ کہ کھاتے ہی مُنہ میں گُھل جائیں۔ یہ پیسے پیسے کے ہیں۔ یہ پیسے کے دو۔ یہ بڑے دو دو پیسے کے" بسکٹ والا لنگڑا کر چلتا تھا، کمر ٹیڑھی تھی گردن ٹیڑھی، ٹوپی ٹیڑھی۔ اب بسکٹ کے دام بتاتے ہوئے اس نے تماشائیوں کی طرف مُنہ پھیرا تو معلوم ہوا کہ وہ کانا بھی ہے اور بات کہنے کے بعد ایک طرف کو زبان بھی نکال دیتا ہے۔ تماشائیوں کو یہ سب دیکھ کر خوب مزا آیا۔ اور سب کے جی میں یہ بات آئی کہ اگر لڑکے اس کے ساتھ کوئی شرارت کریں تو بڑا اچھا ہو۔

پہلے لڑکے نے جس نے دام پوچھے تھے، اب کہا، "اچھا یہ پیسے پیسے والے چار دے دو۔" اس نے اپنی جیب میں ایک ہاتھ ڈالا، جیسے کوئی پیسے نکالنے کے لئے ڈالتا ہے۔ بسکٹ والے نے اس کے دوسرے ہاتھ میں بسکٹ دے دئے۔ اور پیسے دینے کے لئے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ لڑکے نے اس کے ہاتھ میں انگوٹھا چھلایا اور اسٹیج کے دوسرے دروازے سے بھاگ کر نکل گیا۔ بسکٹ والا اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا اُس کے پیچھے دوڑا۔ جب وہ دروازے سے نکل گیا تو دوسرے لڑکے نے جو چپ چاپ کھڑا تھا لپک کر ٹوکری سے بہت سے بسکٹ نکالے، کچھ جیبوں میں بھرے، کچھ گود میں، اور پہلے دروازے سے نکل کر غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد بسکٹ والا دوسرے دروازے سے ہانپتا کانپتا پھر داخل ہوا۔ اُس کی صورت شکل اور چال پر ویسے بھی ہنسی آتی تھی، ٹوکری خالی دیکھ کر اس نے جو کھسیانی صورت بنائی وہ تو بس غضب کی تھی۔ سارے تماشائی ہنسی سے لوٹ گئے۔ وہ تھوڑی دیر

آنکھیں بلکہ اپنی ایک آنکھ مچکاتا رہا، پھر ٹوکری اُٹھائی، اور دوسرے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پھر ایک بانگ لگائی: "کیا میٹھے ہیں بسکٹ! کیا خستہ ہیں بسکٹ! کرارے ہیں بسکٹ!" یہ بانگ بھی بڑی سبق آموز تھی کیوں کہ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ بسکٹ والے کی عقل حیران اور ٹوکری خالی ہے۔

ماجد صاحب، محمود، خالد اور راشد کو لے کر اسٹیج پر آئے۔ لوگوں نے خوب تالیاں بجائیں۔ ماجد صاحب نے کہا: "حضرات! آپ یہ ذرا سا تماشا دیکھ کر سمجھ گئے ہوں گے کہ ہمارے بچوں میں ڈراما کرنے کی کتنی قدرتی استعداد ہے۔ محمود بسکٹ والے کے شوق کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہو گیا ہے کہ ان بچوں کو ڈرامے کا فن سکھاؤں۔ آپ سے اُمید ہے کہ آپ اُن کی ہمت بڑھاتے رہیں گے اور جب کبھی یہ کوئی ڈراما تیار کریں تو اُسے دیکھیں گے۔ محمود میں تمھیں سب کی طرف سے مبارک باد دیتا ہوں۔ اب اگر تم خود نہ اُکتا گئے تو تمھیں ڈراما کرنے کے بہت سے موقعے ملیں گے اور لوگ تمھاری نقلوں کو دیکھنے کے لئے دور دور سے آئیں گے۔

محمود پھر لنگڑا اور ٹیڑھا اور کانا ہو گیا اُس نے ٹوکری سر پر رکھی اور بانگ لگائی۔ اس کے بعد وہ دروازے سے نکل کر بھاگ گیا اور لوگوں نے پھر خوب تالیاں بجائیں۔

باغ میں آم کے، جامن کے، نارنگی
کے، سنترے کے پیڑ تھے۔ جامن کے
پیڑ چاروں طرف باغ کے کونوں پر لگے
ہوئے تھے۔ آم کے تختے الگ، نارنگی
کے تختے الگ، سنترے کے تختے الگ،
ایک طرف پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ گلاب
کے پھول کی کیاری۔ گلابی پتیوں کا گلاب،
زرد پتیوں کا گلاب۔ چنبیلی کی بیلیں درختوں
پر لپٹی ہوئی تھیں۔ پھول تاروں کی طرح
چمک رہے تھے۔ باغ میں ایسی بہار
تھی کہ جی چاہتا تھا پھرتے ہی رہیں۔ ہم
اور الیاس دونوں پھر رہے تھے۔ الیاس
نے کہا "کیسا اچھا باغ ہے"۔ ہم نے کہا
"ہاں! بڑا اچھا باغ ہے"۔ اتنے میں بادل
آگئے۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی پپیہا بولا۔ کوئل
بولی۔ مور بولا۔ بگلے اُڑنے لگے۔ بادلوں
کے کالے کالے دھوئیں میں سفید سفید
بگلے۔ واہ!

چھم چھم مینہہ برسنے لگا۔ الیاس نے
کہا "بھاگو" ہم نے کہا "بھاگو"۔ ہمارا
گھر دور تھا۔ الیاس کا گھر پاس تھا۔ دونوں
بھاگے۔ الیاس اپنے گھر میں گھس گئے۔ ہم
بھی الیاس کے ساتھ۔

دونوں کے کپڑے بھیگ گئے تھے
دونوں نے کپڑے اُتارے۔ نیکر پہن لیے
الیاس کی امی نے گرم گرم کچوریاں کھلائیں

مزا آگیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے اور تعلیمی تاش کھیلنے لگے۔ کھیل میں اتنی دیر ہوگئی کہ ہم دونوں کے کپڑے سوکھ گئے۔

ہم نے کہا " بھائی الیاس شام کو تم ہمارے گھر آنا۔ ہم تمھیں گرم گرم کباب کھلائیں گے۔ چٹ پٹے اور سلونے۔

آج ہماری چھٹی کا دن تھا۔

نئے سال کی خوشی
اُچھلو پھاندو دوڑ لگاؤ
کھیلو کودو مزے اڑاؤ
میٹھے میٹھے گیت سنا کر
سارے جہاں کو مست بنا کر
سال گرہ کی خوشی مناؤ
باغ جہاں کی رنگت بدلی
سال نے دیکھو کروٹ بدلی
موسم نے بھی صورت بدلی
نقشہ تم بھی نیا جماؤ
سال گرہ کی خوشی مناؤ
عزم کو اپنے دگنا کردو
دنیا کو پھر جوش سے بھردو
ناممکن کو بھی ممکن کردو
آگے اپنا قدم بڑھاؤ
سال گرہ کی خوشی مناؤ
محمد حسین محسن حیات نگر
منہ کی کھائی
حافظ جی نے روٹی کھائی
سیر کی پھر کچھ دل میں سمائی
راہ میں پڑتی تھی اک کھائی
حافظ جی کی شامت آئی
کھائی دی ان کو نہ دکھائی
بولا اک "حافظ جی کھائی"
پیٹ دکھا کر بولے حضرت
ہاں ہاں آج تو خوب ہی کھائی
خوب ہی کھائی کہتے کہتے
کھائی میں اک ننھی کھائی
نیچے اس پر ہنس کر بولے
حافظ جی نے منہ کی کھائی
نورو دعا اب مانگو تم یہ
حق رکھے سب کی بینائی
نورالدین احمد نور بدایونی

سید ابو طاہر صاحب بی، اس، سی، ال، ٹی

رات کو جب سب اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے تو بھائی عرشی نے ایک کہانی کہنی شروع کی جسے میں انھی کی زبانی بیان کرتا ہوں

آنکھوں دیکھی کہتے ہیں، کانوں سنی نہیں کہتے، ثواب سننے والے کی گردن پر اور عذاب نہ سننے والے کے سر پر۔ کہتے ہیں ہمیشہ سے ایک بادشاہ چلا آتا ہے۔ جیسے ہمارا تمھارا خدا بادشاہ کہ نام اس کا دماغ، کام اس کا حکومت اور ملک اس کا جسم تھا۔ یہ بادشاہ بیدار مغزی اور ہوشیاری میں اپنا جواب نہ رکھتا، آج کے کاموں کے سوا اس کو کوئی دوسرا شوق نہ تھا۔ جب سے حکومت کی باگ سنبھالی کبھی رات کو پلک سے پلک نہ لگائی۔

دنیا کے بڑے بڑے رشی، منی اور صوفیوں نے اسے تسخیر کرنے کی دھن میں عمریں تیاگ دیں، لیکن وہ ان کے قبضہ سے ایسے نکل جاتا۔ جیسے مٹھی میں سے پانی۔

اس راجہ کی پانچ سندر راج کماریاں تھیں۔ جو اپنے پتا کے اشاروں پر چلنا ہی اپنا دھرم اور ایمان سمجھتیں۔ راجہ بھی انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا اور ان کے مشورے بغیر ایک قدم آگے نہ بڑھاتا۔ تمام راج کماریاں الگ الگ صوبوں پر راج شاستر کے مطابق حکومت کرتیں اور خود راجہ ایک ہوائی قلعہ میں بیٹھا حکم اور احکام جاری کرتا۔

اس اتفاق اور محبت کی وجہ سے راج کا سارا کام اس خوبی سے چلتا کہ دوست خوشحال اور دشمن پائمال تھے۔ دن عید اور رات شب برات تھی۔ راجہ بھی پرجا کے سکھ میں سکھی تھے مگر نہ جانے کیا راز تھا

کہ وہ اپنے قلعہ سے باہر قدم رکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ سب اس کی صورت دیکھنے کو ترستے لیکن وہ موجود ہو کر بھی نظر نہ آتا۔ راج کماریاں اس بھید کو اچھی طرح جانتی تھیں کہ جس دن راجہ نے قلعہ کی دہلیز پھلانگی اسی دن سارے راج پر تباہی کے بادل چھا جائیں گے۔ اس لئے وہ راج کے سوا کسی دوسری چیز کی طرف بھولے سے بھی خیال نہ لے جاتیں۔

ایک روز خدا کا کرنا یوں ہوا کہ سب سے بڑی لڑکی کان کماری کے دربار میں ایک بوڑھا گویا پھرتا پھراتا آنکلا۔ وہ کچھ اس طرح گاتا کہ کوئی اس کو ایک بار سن پاتا تو دل سے صبر و قرار ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے۔ چنانچہ راجہ کی بیٹی کی یہ حالت ہوگئی کہ دن رات گویا گاتا رہتا اور وہ اسے سننے میں محو رہتی۔ ادھر اس کی آواز تھوڑی دیر کے لئے بھی رکتی اور ادھر وہ بے تاب ہو جاتی جب کئی روز اسی طرح بیت گئے تو گوئے نے راج کماری سے رخصت طلب کی۔ اتنا سننا تھا کہ وہ فی الفور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ بوڑھے گوئیے نے جب یہ حال دیکھا کہ راج کماری راگ پر اپنا تن من نچھاور کر چکی ہے تو اس نے راج کماری کے کان میں جھک کر کہا "سن

لے راج کماری! راج کماردرن تیرے حسن و جمال کا شہرا سن کر بوڑھے گوئیے کا روپ دھار کر آیا تھا۔ اس نے جیسا سنا تھا ویسا ہی تجھ کو پایا۔ نبت کے راگ رنگ لائے۔ ......لے۔ اب میں جاتا ہوں مگر تو اپنے پتا جی سے اپنے من کا بھید ظاہر کر کے سوئمبر کی سوا گت کرنا۔ پھر میرے راگ تیرے دل کی دھڑکن سے سنسار کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کر کے اس دنیا کو جنت بنا دیں گے۔"

راج کماری نے یہ سب باتیں بڑے غور سے سنیں۔ لیکن جب اس نے آنکھ کھولی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ کیونکہ راج کماردرن اپنے اصلی روپ میں واپس آکر غائب ہو چکا تھا۔

اب راج کماری کو کسی کروٹ چین نہ تھا بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی۔ اور آہ وزاری کرتی تھی۔ دن رات درن کا نام تھا اور وہ تھی۔ لاکھ سب نے سمجھایا۔ دوائیں اور دعائیں کیں لیکن یہ جادو اس کے سر سے نہ اترنا تھا نہ اترا۔ یہاں تک حالت پہنچ گئی کہ راج کے کاروبار میں ابتری پھیل گئی اور ایک صوبہ کی خرابی تمام ملک کے انتظام پر اثر ڈالنے لگی۔ چنانچہ مخبروں نے راجہ کو سارا کچا چٹھا جا سنایا۔ سنتے ہی اس کے ہوش

حواس جاتے رہے۔ غصّے میں آگ بھبوکا ہو گیا
سر پر پانی کے تڑاڑے ڈالے گئے تو اس کا
دماغ ٹھکانے آیا۔ تھوڑی دیر تک سر نیچا کئے
بیٹھا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ وزیرِ عقل کو طلب
کیا۔ اس کی عقل بھی ماری گئی۔ مجبور ہو کر اپنے
استاد حکیم تقدیر سے عالمِ خیال میں جا کر ملاقات
کی اور سارا ماجرا رو رو کر بیان کیا۔ حکیم تقدیر
نے بموجب سننے اس کے ایک آہ کھینچی اور
پھر اپنی لمبی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر یوں گویا ہوا
کہ "اے دنیا کے سب سے زبردست راجہ!
مصیبت کے وقت ہوش و حواس برقرار رکھنا
ہی سب سے بڑی جواں مردی ہے۔ بیشک
تیرا ستارہ اقبال اس وقت نحوست کے طالع
میں سے گزر رہا ہے۔ تیری حکومت کا تختہ
الٹ رہا ہے کیونکہ جھاڑو میں سے کوئی سینک
نکل جائے تو بندھن ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ اب
مجھے تو اپنے دل کا حال بتا کہ آیا تو باپ
رہنا چاہتا ہے یا راجہ"۔

یہ سن کر راجہ نے جواب دیا کہ "اے پیروں
کے پیر اور اے مرشدوں کے مرشد!
اس وقت تو دونوں چیزیں میرے ہاتھوں
سے جا رہی ہیں۔ آج کان کماری کا سنجوگ
درن سے کر دیا۔ تو کل کو چاروں راج کماریاں
بھی بر مانگنے لگیں گی اور یہ راج اندھا گونگا
بہرا اور اپاہج ہو کر رہ جائے گا۔ اور اگر
میں ان سب کو قید کئے دیتا ہوں تو بھی یہی
مشکل پیش آتی ہے۔ اس لئے اے حکیم مطلق!
تو ان کے دلوں سے محبت نکال کر پھینک دے
اور فرض کو اس کی جگہ داخل کر دے۔ بس
یہ ہے میری مصیبت کا علاج اور اے استاد اس
وقت کچھ ایسی آن پڑی ہے کہ اگر تو میری بات
پوری نہیں کرتا تو میں بھی محبت کے دریا میں ڈوب
کر جان دے دوں گا"۔ یہ بات راجہ نے کچھ اس
طرح گڑگڑا کر کہی کہ حکیم کا دل پسیج گیا۔ اور اس
کے منہ سے بن سوچے نکل گیا۔ "جا راجہ ایسا ہی
ہوگا"۔ پھر ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہنے لگا "ہائے یہ میں
کیا کہہ گیا۔ خیر جو ہونا تھا ہو چکا۔ مگر اے راجہ ٹھیر!
راج کماریوں کی محبت تو چھین ہی لی اب اپنی
محبت کہاں لے چلا وہ بھی دے جا۔ میں اس
میں اپنی طرف سے کچھ اور ملا کر اسے راج
رانی دل کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اب تو جانے
اور تیری بیوی"۔ اتنا کہا اور آگے بڑھ کر غائب
ہی ہونا چاہتا تھا کہ راجہ نے لپک کر اس کا
دامن پکڑ لیا اور دکھی ہو کر کہنے لگا۔ "راجہ کو
بھکاری بنا کر مفت کی سزا تو دے دی۔ اور
راج کمار ورن کو میرا تماشا دیکھنے کے لئے

یونہی چھوڑ دیا۔ ابھی یہ الفاظ پُورے بھی نہ ہوئے تھے کہ آنکھ جھپکتے میں چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیارا چھا گیا۔ زمین اَور آسمان میں زلزلہ آگیا اَور ہر طرف سے "ہیہات" "ہیہات" کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ راجہ کی جو حالت ہوئی۔ اس کے لئے الفاظ نہیں کہ بیان کی جاسکے۔ بارے اس شور و غوغا کے تھم جانے کے بعد ایک مہیب سی آواز سنائی دی جس نے راجہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "لے راجہ تیری آخری درخواست بھی پُوری کی گئی محبت کی سزا بھی دے دی۔ دونوں کو ایک دُوسرے کی آنکھوں سے اوجھل کردیا گیا۔ ورن کو سوز اَور بے تابی دے کر کان کماری کے منہ پر تالے لگا دئے گئے ہیں۔ تاکہ قیامت تک ایک فریاد کرتا رہے اَور دُوسرا اُسے خاموشی سے سنتا رہے۔ جا۔ اب تو تیرے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی"

کہتے ہیں جب سے راج کمار ورن کے تلوؤں کے نیچے آگ سلگ رہی ہے۔ اسی لئے وہ ایک جگہ نہیں ٹھیر سکتا۔ اب اس کی چال قیامت ہو گئی ہے جدھر سے نکل جاتا درخت انگڑائیاں لینے لگتے۔ کلیاں چٹکنے لگتیں، چشموں کی جل پریاں اٹکھیلیاں کرتیں ذرّے ذرّے پر راگ کی مستی چھا جاتی ہنستا تو بہار آتی، روتا تو جل تھل بھر جاتے غصہ ہوتا تو آگ برستی، آہ کرتا تو شعلے بلند ہوتے۔ اَور سو جاتا تو سب کا دم نکلنے لگتا۔ وہ دن رات کان کماری کے قلعہ کے چکر لگاتا رہتا۔ اَور پردہ کے پاس آکر محبت کے راگ گایا کرتا ہے۔ اَور کان کماری سیپ کے حوض میں پانی کے بلبلوں کی پیٹھ پر ستار ہاتھ میں لئے بیٹھی ہوئی ہے۔ باہر سے راجکمار گاتا ہے۔ اَور اندر سے ستار کے تار خود بخود بجنے لگتے ہیں۔

جناب شجاعت سندیلوی

ایک تھا بنیا دولت والا کنجوسی میں سب سے نرالا
آگے پیچھے کوئی نہیں تھا یہ بنیا تنہا رہتا تھا
جھوٹ، فریب اور مکاری سے دھنی ہوا تھا عیاری سے
ساری خلقت دکھیا اس سے دیتا سب کو سودی قرضے
دھن ہی میں دم اٹکا رہتا دھن کا ہر دم کھٹکا رہتا

(۲)

اِک دن دل میں وہم سمایا سمجھا گھر میں چور ہے آیا
کانپا، لرزا، اور چلّایا چو چو چو چو چور ہے آیا
ہاتھ میں لے کر اپنے ڈنڈے آئے محلّے والے دوڑے
پوچھا اس سے چور کہاں ہے؟ چوری کا کیوں تم کو گماں ہے
بولا وہ تھا دھڑکا مجھ کو چوری کا تھا کھٹکا مجھ کو
جی میں ناخوش ہوگئے سارے لوٹ گئے وہ سب بے چارے

(۳)

اک دن پھر وہ یوں چلّایا　　دوڑو لوگو! چور ہے آیا

اس دن پھر کچھ آدمی آئے　　چور نہ پاکر سب گرمائے

بڈّھے سے کہا سب نے مل کر　　تم کو ہنسی یہ سوجھی کیوں کر

نیند میں حیراں کرتے ہو تم　　سب کو پریشاں کرتے ہو تم

چور سے ہو جب اتنا ڈرتے　　نوکر کیوں نہیں تم رکھ لیتے

ہو گئے واپس یہ کہہ کہہ کر　　چل دئے سب اپنے اپنے گھر

(۴)

اک دن سچ مچ چور جو آیا　　بڈّھے نے پھر شور مچایا

اس دن لیکن کوئی نہ آیا　　سمجھے یونہی ہے چلّایا

چور نے اس کو مارا پہلے　　چمپت ہوگیا پھر دھن لے کے

جھوٹ کا یہ انجام ہے بھائی

دولت کھوئی، جان گنوائی

اہرامِ سقارہ کی سیر

از جناب مولوی محمد سعدالدین صاحب انصاری ۔ فاضل جامعہ ازہر (مصر)

کل ۸ مارچ کو طلبہ ازہر کی ایک جماعت اہرام سقارہ کی سیر کو جانے والی تھی ۔ اپنے ازہری و مصری دوست محمود الدیب کے کہنے سے میں بھی اس جماعت کے ساتھ ہو لیا یوں بھی عرصے سے مجھے اس سیر کا شوق تھا، لیکن اچھے ساتھیوں اور مناسب موقع کی تلاش تھی۔

یہ جماعت ۷½ بجے صبح کو وزارت تعلیم کی دو نہایت عُمدہ موٹر لاریوں پر روانہ ہوئی۔ طلبار کی تعداد ساٹھ تھی ۔ سقارہ قاہرہ سے کوئی ۲۰ میل کے قریب ہوگا۔ شہر سے نکلنے کے بعد سقارہ تک راستہ نہایت پُرفضا تھا۔ نیل کی ایک نہر کے کنارے کنارے نہایت اچھی سڑک پر موٹر چل رہی تھی۔ چاروں طرف جہاں تک نظر جاتی تھی ہرے بھرے ربیع کے کھیت دلوں کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ منظر کی خوبی سے تمام طلبار پر خوشی کی ایک کیفیت طاری تھی۔ ایک طالب علم نے نہایت شیریں آواز میں عربی کی غزلیں گانی شروع کیں ۔ اکثر طالب علم اسے بہت شوق سے سُن رہے تھے۔ بیچ بیچ میں بعض ہنس مکھ طالب علم اپنے ظریفانہ فقروں سے اس نغمے کو موقوف کر دیتے اور اِس کی جگہ ہنسی اور قہقہے شروع ہو جاتے۔ اسی طرح مختلف دلچسپیوں کے ساتھ دونوں موٹریں کوئی ایک گھنٹے کے بعد منزل مقصود پر پہنچ گئیں۔

موٹروں سے اُتر کر ہم سب ایک عمارت کی طرف آئے جس کے اندر فراعنہ مصر کے ایک مشہور بادشاہ کا مجسمہ رکھا تھا۔ یہ مجسمہ ایک خاص نرم پتھر (جیری) سے (جو مصر میں بکثرت ہے) نہایت خوب صورتی سے بنا ہوا ہے۔ جسم نہایت سڈول اور ورزشی ہے ۔ پٹھے رگیں اور ایک ایک عضو فطرت کے موافق بنا ہوا ہے۔ سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہزاروں سال پہلے بھی ایسے ماہرین فن موجود تھے ۔ اس جماعت کے ساتھ دو تین اُستاد بھی تھے ۔ تاریخ کے ایک لائق اُستاد عبدالفتاح سرنجاوی اس جماعت کے رئیس تھے ۔ موصوف نے اس مجسّمے کی تاریخی طور پر نہایت عُمدہ تشریح کی ۔ بتایا کہ یہ وہ بادشاہ ہے جس نے پرانے زمانے میں اس جگہ ایک نہایت عُمدہ شہر منف کے نام سے بسایا تھا۔ مورخوں کے نزدیک یہ شہر اپنے زمانے میں بہت آباد اور بارونق

تھا۔ لیکن اس عظیم الشان شہر کے آثار تقریباً ناپید ہیں
یہ شہر دریائے نیل اور صحرائے لوبیا کے بیچ میں ذرا اونچائی
میں تھا۔ اس لئے اونچائی میں آباد کیا گیا تھا کہ دریائے نیل سے پوری
طرح سیراب ہو سکے۔ افسوس ہے کہ جس نیل نے اس
شہر کو سرسبز اور شاداب بنایا اسی نے اپنی ایک ظالمانہ
ادا سے راستہ بدل کر اس شہر کو برباد بھی کر دیا۔
اس کے بعد نیل کے سالانہ سیلابوں نے اپنی بے اندازہ
ریت سے اس شہر کو ایسا نیست و نابود کیا کہ اب مطلق
کوئی نشان اُس کا باقی نہیں ہے۔

اس شہر کے ایک طرف تو نیل ہے اور دوسری طرف
ریگستان کا کنارہ ہے۔ یہ کنارہ شہر کی نسبت بلند ہے
اور جا بجا ریت کے تودے پھیلے ہوئے ہیں۔ مینا کا
مجسمہ اور بعض دوسرے معمولی آثار مجسموں کی شکل میں
دیکھنے کے بعد ہم سب لوگ موٹر پر سوار ہوئے اور
کوئی میل دو میل کی مسافت طے کر کے اس ریگستان کے
کنارے پہنچے۔ یہاں قدیم مصریوں نے ایک شہر "مدینۃ
الاموات" کے نام سے بنایا تھا۔ مصری اپنے اعتقاد کے
موافق اپنے مُردوں کو ممی بنا کر بڑے اہتمام اور بڑی
حفاظت سے دفن کرتے تھے۔ چنانچہ آبادی کے قریب ہی
یہ "مدینۃ الاموات" یا قبرستان بنایا۔ یہ قبرستان بھی ناپید
تھا لیکن یورپ کے لوگوں نے اپنی اَن تھک کوششوں
سے بنجانے کیا کیا معلوم کر لیا ہے۔ ایک مشہور فرانسیسی
"مریٹ" نے (جو مصری حکومت سے پاشا کا خطاب پا کر
مریٹ پاشا کے نام سے مشہور ہے) خدیو اسمٰعیل کے
زمانے میں اپنی مسلسل کوششوں سے اس شہر کو معلوم
کیا۔ اس شہر میں رفتہ رفتہ بہت سے مقبرے ملے ہیں۔
یہ مقبرے جن کو مصری اپنی اصطلاح میں اہرام کہتے
ہیں عجیب غریب چیز ہیں۔ اور زمین کے اندر بہت
نیچے بڑے بڑے تہخانوں کی شکل میں بنے ہوئے ہیں۔

یہاں پہنچ کر پہلے ہم سب ایک اہرام کے اندر
داخل ہوئے۔ ایک بڑی سُرنگ کے ذریعے جو بتدریج
نشیب کے ساتھ زمین کے اندر گئی ہے۔ ایسی جگہ پہنچے
جہاں ایک بہت بڑا تہہ خانہ نظر آیا۔ سُرنگ اور اس
تمام تہہ خانے میں مصری حکومت نے سیاحوں کے لئے
جا بجا بجلی کا انتظام کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے
دیکھنے میں بڑی آسانی ہو گئی ہے۔ یہ تہہ خانہ بہت وسیع
ہے .... اس میں بڑے بڑے کمروں کی کئی
قطاریں ہیں۔ جن کے درمیان غلام گردش کی طرح راستے
گذرتے ہیں۔ انہی کمروں کے اندر مصری تابوت پتھر کے
بنے ہوئے رکھے ہیں۔ مصری لوگ ان میں اپنے ممی
کئے ہوئے مُردوں کو بڑی حفاظت سے رکھ دیتے
تھے۔ ممیاں تو سب نکل کر مشہور مشہور عجائب خانوں
میں پہنچ گئی ہیں۔ یہاں بس پتھر کے بڑے بڑے تابوت
باقی رہ گئے ہیں۔ یہ تابوت مصر کے مشہور پتھر گرانیٹ
کے بنے ہوئے ہیں۔ ان تابوتوں کا طول اندازاً
۵، ۶ گز اور عرض ۲، ۳ گز اور بلندی ۳، ۴ گز

ہوگی۔ تمام تابوت ایک طول و عرض کے نہیں ہیں۔ چھوٹے بڑے سبھی طرح کے ہیں۔ تابوت کے گرد کمرے کی دیواروں پر جو اکثر جیری پتھر کی ہیں۔ قدیم مصری زندگی کی تصویریں نہایت خوب صورتی سے اُبھرے ہوئے نقوش کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ تصویریں بہت عجیب و غریب ہیں اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مصر کی پرانی زندگی کا کوئی ایسا پہلو نہیں جو تصویروں کے ذریعے نہ دکھایا گیا ہو۔ کھیتی باڑی صنعت و حرفت، گھریلو زندگی۔ سیر و شکار۔ کشتی بانی۔ ناچ رنگ۔ کھانا پینا۔ پڑھنا لکھنا، فوج پولیس، لڑائی۔ حکومت کے انتظام اور مذہبی رسمیں غرض ہر چیز نہایت خوبی سے تصویروں کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ یہ تابوت اکثر بادشاہوں اور بڑے بڑے امیروں کے ہیں۔ جس کمرے میں جس کو دفن کرتے تھے اُس کی دیواروں پر اُسی کی زندگی کے حالات تصویروں کے ذریعے پیش کرتے تھے۔ یہ تصویریں درحقیقت مصری قوم کی کتابیں ہیں، بلکہ میرے خیال میں کتابوں سے بڑھ کر۔ اس لئے کہ ایک نظر میں ہر عالم و جاہل ان تصویروں کے ذریعے ہزاروں برس کے واقعات بڑی آسانی سے جان لیتا ہے۔ تصویریں اس کمال و باریکی کے ساتھ بنی ہیں۔ کہ عقل دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ شکل و صورت کی خوبی کے ساتھ خوشی، رنج اور مذہبی خشوع و خضوع کے فطری جذبات تک کی ترجمانی کی گئی ہے جو تصویریں رنگین ہیں اُن کے رنگ بھی فطرت سے قریب ہیں۔ یہ کمال اب تک فنِ مصوری کو پوری طرح حاصل نہیں ہوسکا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ یہ تصویریں سو دو سو یا ہزار دو ہزار برس پہلے کی نہیں بلکہ مؤرخوں اور کھوج لگانے والوں کے نزدیک ان کا سلسلہ ۸۰۰۰ ہزار برس پہلے تک پہنچتا ہے۔

اسی قسم کے کوئی ۶۰، ۷۰ اہراموں کی ہم سب نے سیر کی۔ ایک دو کے سوا باقی میں بجلی کا انتظام نہیں ہے ہمارے ساتھ موم کی شمعیں تھیں۔ ان کی مدد سے اندر کی چیزیں دیکھیں۔ بعض تہ خانے ایسے تنگ و تاریک تھے کہ اُن کے اندر دم گھٹتا تھا۔ مصریوں کا یہ مشہور اعتقاد ہے کہ مرنے کے بعد ہر شخص کی روح قیامت کے دن اُسی کے جسم کو ڈھونڈے گی۔ اگر جسم اُسے نہ ملا تو وہ روح بہت پریشان ہوگی۔ اس لئے مصری اپنے مُردوں کی حفاظت میں ایسا محفوظ اور مضبوط انتظام کرتے تھے کہ کسی انسان کا ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکے اور نہ ہزاروں برس گذرنے پر بھی ان پر بوسیدگی کا کوئی اثر ہو۔ لیکن انسان بھی کیا بلا ہے۔ ایک طرف اس نے نہ معلوم کن کن طریقوں سے اپنے مجسّموں کو محفوظ کیا اور دوسری طرف اسی کی آنے والی نسلوں نے ان چھپے ہوئے خزانوں کو کس کس طریقے سے ڈھونڈھ نکالا۔

سیر کا سلسلہ صبح ۹ بجے سے شام کے ۵ بجے تک رہا۔ بیچ میں کوئی دو بجے ڈیڑھ دو گھنٹے کے لئے ہم سب ایک خاص عمارت میں جمع ہوئے۔ یہ مریت پاشا کی یادگار

شہر منف کا ایک مشہور فرعون

مرمر کی طرح کے پتھر کے ایک بادشاہ کے سر مختلف رخوں سے

SAKKARA - Tomb of Ptahhotep - Cattle scene and poultry.

مویشی اور پالتو جانوروں کا ایک منظر

بکری کی شکل کا ایک آرائشی سامان

چند پیامی

وحیدہ جہاں بیگم قزل باش آگرہ

عظیم قادری حیدر آبادی

محمد احمد کلکتہ

محمد اسد پٹنہ

میں مصری حکومت نے سیاحوں کے آرام و راحت اور کھانے پینے کے لئے بنائی ہے۔ اس عمارت میں ایک بڑا ہال ہے اور چند چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ہال میں کھانے کے لئے بڑی بڑی میزیں بچھی ہوئی ہیں۔ ان کے چاروں طرف بیٹھنے کے لئے بنچیں ہیں۔ کھانے کا انتظام ہر ایک نے اپنا الگ الگ کیا تھا۔ لیکن یہاں سب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں اپنے ہم مذاق تقسیم ہو گئے، اور ہر ٹولی نے اپنا کھانا مزے سے کھایا پیا۔

طالب علم اس سیر سے اتنے خوش تھے کہ کھانے کے بعد اپنے اُستاد کا شکریہ اور اس تاریخی سیر کے دیکھنے سے ان پر جو اثر ہوا تھا اُس کا پرجوش تقریروں اور قصیدوں کے ذریعے اظہار شروع کر دیا حقیقت یہ ہے کہ عربوں کی یہ بیانی خصوصیت اب تک باقی ہے۔ نوجوان اکثر اس برجستگی سے تقریریں کرتے یا نظمیں پڑھتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اپنے ہاں تو ہم صرا پر بھی مشکل سے کوئی نوجوان جلسوں کے موقع پر بولنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ تقریروں میں زیادہ تر مصر کی تاریخی عظمت اور وطنی جذبات کا اظہار رہا۔ بعض طلبا نے وطنیت کی تنگ ذہنیت سے اختلاف بھی کیا۔ لیکن یہ اکثر غیر مصری تھے۔ استاد نے فرمایا کہ ہمارے لئے ان آثار میں مذہبی زندگی کے بھی موثر سبق ہیں۔ قدیم مصریوں میں کوئی باقاعدہ آسمانی شریعت نہ تھی پھر بھی دین داری اور آخرت کا اعتقاد انتہا تک پہنچا ہوا تھا۔

میں تقریر تو کیا کرتا لیکن حضرت استاد اور بعض طلبا سے دوران گفتگو میں بتایا کہ مصر کی طرح ہندوستان کے قدیم آثار بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ مصر کے برابر وہ پرانے تو غالباً نہیں ہیں لیکن نقاشی اور فن مصوری کے کمال میں وہ مصری آثار سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں میں نے اُن سے ایلورا اور اجنٹا کے غاروں کا کچھ حال بیان کیا جن کو میں دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ بعضوں نے یہ سن کر ہندوستان کی سیاحت کا شوق بھی ظاہر کیا۔ آخر میں میں نے کہا کہ اس دنیا میں جتنی ترقیاں ہوئی ہیں وہ کسی ایک قوم کا حصہ نہیں، بلکہ ہر قوم نے اپنی بساط کے موافق دنیا کی ترقی میں حصہ لیا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو آگے پیچھے ایک دوسری قوم سے متاثر نہ ہوئی ہو۔ باقی اس کا حقیقی طور پر پتہ چلانا کہ کس قوم کو معلّمی کی فضیلت سب سے پہلے حاصل ہوئی ہے، اوّلاً اب تک قیاس اور گمان سے آگے نہیں بڑھا۔ دوسرے اس قسم کے خیالات کا اظہار درحقیقت انسانوں میں تنگ وطنیت کے جذبات کو پیدا کرتا ہے جو دنیا کو ترقی دینے کے بجائے اس کو تباہی کی طرف زیادہ بڑھاتے ہیں۔

۵ بجے یہ پر لطف سیر ختم ہوگئی اور ہم سب پھر موٹروں میں بیٹھ کر راستے کے پر فضا منظروں سے لطف اُٹھاتے ہوئے واپس آگئے۔ خدا کرے ایسی سیر پھر نصیب ہو۔

تم میں سے زیادہ تر ایسے ہوں گے جنھیں کچھ اور نہیں تو کم از کم ٹکٹ جمع کرنے کا شوق توضرور ہوگا ۔ اسی طرح بہتوں کا مشغلہ سکے اور پتیاں وغیرہ جمع کرنا ہوگا ۔ مشغلے کی وبا اس قدر عام ہوگئی ہے کہ اپنے روزمرہ کے ضروری کام کے علاوہ اگر کوئی بھی اور شغل اختیار کرلیا جائے تو وہی مشغلہ یعنی ہوبی کہلانے لگتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ امریکہ کے ایک بڈھے سپاہی کو رنگ برنگ کے بٹن جمع کرنے کی دُھن تھی ۔ ابھی حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ نیوجرسی کے ایک قصبہ "پلین فیلڈ" میں ایک صاحب ہیں جن کا نام ہے " سی اسٹینلی جیکب " (تم آسانی کے لئے انھیں یعقوب کہہ سکتے ہو ۔) تو ان مسٹر یعقوب کو بندوق کی گولیوں اور چھرّوں کے خانے (کارتوس نہیں) اور قدیم عہد کی بارود دانیاں جمع کرنے کا شوق ہے ۔

آج سے کوئی ۳۰ سال پہلے انھیں اپنی مرحومہ دادی کی طرف سے وراثت میں بارود رکھنے کی ایک نلی (گائے کے سینگ جیسی) ملی تھی ۔ یہ نلی اس جنگ میں کام میں لائی گئی تھی جب کہ امریکہ کے باشندوں نے لڑ جھگڑ کر اپنے کو برطانیہ عظمیٰ سے علیحدہ کرلیا تھا اور خود کو آزاد کہنے لگے تھے ۔ اس جنگ کو امریکہ کی انقلابی جنگ کہتے ہیں ۔ ہاں تو یہی " نلی " مسٹر یعقوب کے اس عجیب وغریب مشغلے کی ابتدا تھی ۔

اس تیس سال کے عرصے میں انھوں نے اِدھر اُدھر سے مانگ کر یا خرید کر طرح طرح کی بارود رکھنے کی نلیاں اور بوتلیں ۔ صراحی دار شیشیاں ۔ پیپے ۔ کنستر اکٹھا کرلئے ہیں ۔ ان کا یہ عجائب خانہ ان کے مکان کی دوسری منزل پر واقع ہے اور اس وقت اس میں بارہ سو طرح طرح کی مختلف چیزیں موجود ہیں ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اپنے طرز کا یہ واحد اور بے مثل مجموعہ ہے ۔ اور ماہرین فن کے نزدیک اس کی قیمت ۱۰۰۰۰ ڈالر سے کسی حالت میں بھی کم نہیں ۔ زیادہ چاہے جتنی ہو ۔

ان میں بہت سی چیزیں تاریخی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اور آج تک اپنے پچھلے زمانے کی یاد دلا رہی ہیں ۔ چنانچہ اس مجموعے میں نامور جہاز " میگلین " کے نائب کپتان

جوین سباسٹین کی صُراحی دار بارُود رکھنے کی شیشی ہے اور مشہور سمندری ڈاکو سر ہنری مارگن کی سینگ نما نلی بھی ہے اور افریقہ کے وحشیوں، امریکہ کے ریڈ انڈین اور شاہانِ فارس کی بارُود دانیاں بھی۔ بہت سی شیشیاں اور نلیاں ایسی بھی ہیں جو ہرن کے سینگ، دوسرے بہت سے جانوروں کی بڑی بڑی ہڈیوں، کچھوے کی سخت کھال سے بنائی گئی ہیں۔ ایران اور ترکی کی

ہاتھی دانت اور پیتل کی بنی ہوئی چیزیں وہاں کی صنعت اور کاری گری کا بیش بہا نمونہ ہیں۔

اِس مجموعے میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہیں جو صرف بارُود رکھنے کے لئے مخصوص تھیں۔ مگر کچھ ایسے نمونے بھی ہیں جن میں بارُود اور چھرے رکھنے کے لئے الگ الگ خانے بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض بعض تو بالکل ایسے ہیں جیسے موجودہ زمانے کے پستول۔ یعنی گھوڑا دبانے سے بارُود اور چھرے اپنا کام بھی کرتے جاتے ہیں۔

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ ان یعقوب صاحب نے اپنے اس مشغلے کی خاطر تھوڑا بہت بلکہ بہت کچھ روپیہ صرف کیا ہوگا، لیکن اِس کے ساتھ ہی اُن کو بہت سی مشکلات اور دشواریوں سے سابقہ پڑا۔ اِس کا اُنھوں نے ہمت اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کیا۔ اُن کا بیان ہے کہ ایک بڈھے کے پاس بارُود رکھنے کی ایک نلی تھی میں نے بہت چاہا کہ کسی طرح وہ اسے میرے ہاتھ فروخت کردے مگر وہ راضی نہ ہوتا تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی۔ بہلایا پھسلایا طرح طرح کا لالچ دیا۔ ضرورت سے زیادہ قیمت لگادی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خدا معلوم کمبخت کو کیا ضد تھی، آخر میں صبر کرکے بیٹھ رہا۔ مگر ہمیشہ موقع کا منتظر رہتا تھا۔ خدا خدا کرکے کہیں دس سال کے بعد وہ بڈھا مرا اور تب وہی نلی نیلام ہوئی اور مجھے صرف ایک ڈالر میں مل گئی ؁

ڈو بابو اور اُن کے کتّے

مرتضیٰ قادری ہادی۔ کرنول

میں جو اک دن باغ گیا تھا
کہہ دوں بچو! کیا دیکھا تھا

رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے
پودے اک ہی صف میں کھڑے تھے

ہریالی ہی ہریالی تھی
جو سب کے جی کو بھاتی تھی

طرح طرح کے لوگ وہاں تھے
بچے بوڑھے اور جواں تھے

بعضے چپل دھوتی والے
تھوڑے اچکن ٹوپی والے

ان ہی میں کچھ وہ بھائی تھے
جو مغرب کے شیدائی تھے

کتّے کی ڈوری کو پکڑے
ٹہل رہے تھے اکڑے اکڑے

ان کے پیچھے ان کے کتّے
دمیں ہلاتے سر کو جھکائے

ساتھ میں آقاؤں کے پھرتے
یعنی وفا کا دم بھرتے تھے

دو بابو جب آ گئے اک جا
"ہلو" کہہ کر ہاتھ ملایا

ان کے ساتھی یعنی کتّے
جن کی وفا کے گھر گھر چرچے

جب ہم جنس کو دیکھا اپنے
لگے اسی دم بھوں بھوں کرنے

اس نے اس کتّے کو جھنجوڑا
اس نے اس کتّے کو بھنبوڑا

کتوں پر کیا رکھیں تہمت
ان کی تو یہ ہے ہی خصلت

آقا کے تو پاؤں چاٹیں
اور اپنوں کی گردن کاٹیں

رونا تو ہے انسانوں کا
اور بھارت کے نادانوں کا

ہمدردی غیروں سے رکھیں
بیدردی اپنوں سے برتیں

کیا ہی اچھا ہو اے ہادیؔ
بھائی کو ہم سمجھیں بھائی
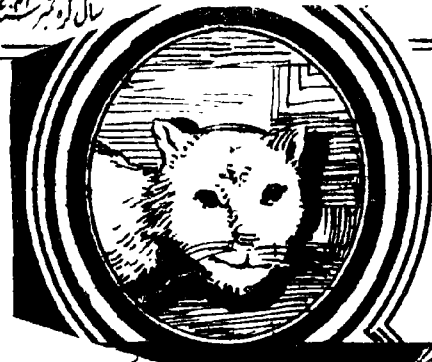
جانوروں میں تمدّن

ریاض الاسلام صاحب بی اے علیگ

اُوپر کا عنوان کچھ عجیب سا ہے۔ تم اپنے جی میں کہتے ہوگے، بھئی واہ کیا کہی ہے، جانور اور تمدن! تم پہلے ہماری بات سن لو۔ یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ ہم سب انسانوں کو مِل جُل کر رہنے کی عادت ہے اور یہ کوئی آج سے نہیں ہمیشہ سے۔ تم نے کبھی اپنے ماسٹر صاحب یا کسی اَور بڑے سے شاید جماعتی زندگی کا لفظ سُنا ہوگا۔ لیکن اس کا مطلب معلوم نہ ہوگا تو اس کا مطلب آج سمجھ لو۔ جماعتی زندگی کہتے ہیں آپس میں مل جل کر رہنے کو تمدن بھی گویا اس کا دُوسرا نام ہے۔ تو یہ جماعتی زندگی ہم تم ہی میں نہیں جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ جس طرح انسان مِل جُل کر رہتے ہیں۔ اسی طرح جانور بھی رہتے ہیں۔ جس طرح انسان آپس میں کام تقسیم کر لیتے ہیں، کوئی کاشتکاری کرتا ہے، کوئی کپڑے تیار کرتا ہے، کوئی مکان بناتا ہے۔ اسی طرح جانور بھی آپس میں کام بانٹ لیتے ہیں۔ تم نے کبھی کبھی چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کے طور طریق کو غور سے دیکھا ہوگا۔ تو تمھیں اس کا تھوڑا بہت ضرور اندازہ ہوگا۔ اگر یہ جانور اس طرح مِل جُل کر کام نہ کریں تو ان کا زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ ذرا سوچو ایک بے چاری ذرا سی چیونٹی کس طرح تمام مصیبتوں کا مقابلہ کر سکتی ہے اور کس طرح وہ تمام کام انجام دے سکتی ہے جو اس کی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ صرف جماعتی زندگی ہے جو اس کی مدد اور حفاظت کرتی ہے۔

غالباً سب سے زیادہ مہذب جانور چیونٹی ہے۔ اسی لئے وہ تمام جانوروں سے زیادہ ذہین ہے۔ یہ دنیا کے ہر حصہ میں پائی جاتی ہے۔ لیکن جس کثرت سے برازیل (جنوبی امریکہ) میں ہے۔ اتنی کسی دُوسرے ملک میں نہیں۔ اسی لئے اسے کبھی کبھی "چیونٹیوں کا ملک" کہا جاتا ہے۔ یہ چیونٹیاں

انسانوں کی طرح رہتی ہیں۔ ان کے نہایت عمدہ چھوٹے چھوٹے مکان ہیں۔ پٹی ہوئی گیلریاں ہیں اور مکانوں کے درمیان پکی سڑکیں ہیں۔ غلہ جمع کرنے کے لئے مضبوط کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ انڈے سینے کے لئے عمدہ عمارت ہوتی ہے۔ ان چیونٹیوں کے بہت سے گروہ ہوتے ہیں۔ ان گروہوں میں اکثر دشمنی ہو جاتی ہے۔ جیسے انسانوں کی جماعتوں میں۔ جب مخالف گروہوں کی دو دو چیونٹیاں ملتی ہیں۔ تو وہ ایک دوسرے سے بچنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اگر ایک ہی گروہ کی ہوتی ہیں تو آپس میں ملاقات کرکے اپنے اپنے کام کو چلی جاتی ہیں۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھوکی ہے۔ اور دوسری کی تھیلی بھری ہے تو بھوکی کھانا مانگتی ہے۔ دوسری اپنی تھیلی میں سے ایک قطرہ ٹپکا دیتی ہے جو بھوکی چیونٹی چاٹ جاتی ہے۔ اگر کوئی چیونٹی (باوجود اپنی تھیلی بھری ہونے کے) دوسری کو غذا نہ دے تو سارا گروہ اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ اور اکثر اس کو مار ڈالا جاتا ہے۔

چیونٹی کی بساط ہی کیا، لیکن اس یک جہتی کی وجہ سے وہ بڑے سے بڑے دشمن کا مقابلہ کر لیتی ہے اور بڑے بڑے کیڑے بھی اس سے ڈرتے ہیں۔ چڑے، مکڑے اور چھوٹے چھوٹے کیڑے اس سے بھاگتے ہیں کبھی کبھی چیونٹیاں بھڑوں کے چھتے پر حملہ کر دیتی ہیں، بہت سی لڑائی میں ماری جاتی ہیں۔ لیکن آخر کو جیت انھی ہی کی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) کے ایک جزیرہ کا نہایت دل چسپ اور خوف ناک واقعہ ہے۔ اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے یہ جزیرہ بہت آباد تھا۔ گنے کی فصل تیار کھڑی تھی کہ یکا یک چیونٹیوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ جزیرے والوں نے دیکھا کہ ایک دم ان کے کھیت سیاہی سے ڈھک گئے۔ اول اول ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا قصہ ہے۔ جب وہ آگے بڑھے تو دیکھا کہ چوہوں، خرگوشوں اور دوسرے جانوروں کے غول کے غول بے تحاشا بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ اور ان کے پیچھے ایک بڑھتا ہوا سیاہ سمندر ہے یہ چیونٹوں کی فوج تھی آدمیوں کے ہوش و حواس باختہ ہو گئے اور وہ بھی جان بچا کر بھاگے اور سمندر کے پانی میں جا کر پناہ لی۔ بہت سے ڈوب گئے۔ باقی

تیر کر دوسرے جزیرے میں پہنچ گئے۔ چیونٹے سارے جزیرے پر پھیل گئے۔ تمام جزیرہ سیاہی سے ڈھک گیا۔ اگر کوئی پرندہ زمین پر اترآتا تو وہ ایک دم کالی فوج کی صفوں میں چھپ جاتا اور تھوڑی دیر بعد صرف اس کی ہڈیاں نظر آتیں۔ بہت سے بھاگتے ہوئے جانوروں کو آگے پیچھے سے گھیر کر شکار کرلیا گیا۔ دریا بھی ان کے راستہ میں حائل نہ ہو سکا۔ کروڑوں چیونٹے پانی میں گھس گئے۔ یہاں تک کہ دریا پٹ گیا اور باقی کروڑوں پار ہوگئے۔ اسی طرح جب ان کے روکنے کے لئے آگ جلائی گئی تو انھوں نے اس کو بھی پاٹ کر بجھا دیا۔ حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو کوئی جزیرے کو چیونٹوں سے نجات دلائے اسے تین لاکھ کا انعام دیا جائے گا۔ لیکن اس عذاب کا کون مقابلہ کرتا اور کیسے کرتا۔ غرض کئی سال اس جزیرہ پر چیونٹوں کی حکومت رہی آخرکار قدرت نے خود ہی اس کا انتظام کیا کچھ سال بعد ایک نہایت زبردست طوفان آیا جس نے تمام چیونٹوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ لیکن اس کے بعد وہاں کی زمین بھی تباہ ہوگئی۔ اور کھیتی کے لائق نہ رہی۔ بہت عرصے تک وہاں کوئی آبادی نہ ہو سکی۔

شہد کی مکھیاں بھی اسی طرح آپس میں مل جُل کر رہتی ہیں۔ ان میں کام بانٹنے کی صلاحیت خاص طور سے زیادہ ہوتی ہے۔ جب کبھی ان کا غول کسی نئے چھتّے کی تلاش میں ہوتا ہے تو وہ پہلے کچھ مکھیاں معائنہ کے لئے بھیجتا ہے۔ جب ان کو کوئی موزوں جگہ مل جاتی ہے۔ تو وہ اس کی صفائی کرتی ہیں اور جب تک پورا غول نہ آجائے اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ شہد کی حفاظت کے لئے ایک سنتری گارد رہتا ہے۔ اگر کوئی مکھی اس میں سے شہد چرانے کی کوشش کرتی ہے۔ تو سنتری اسے مار ڈالتے ہیں۔ البتہ اگر کسی دوسرے چھتّے کی مکھی راستہ بھول کر آجائے تو اسے کچھ نہیں کہتے۔

شکاری جانور اکثر مل کر شکار کرتے ہیں۔ علم حیوانات کے ایک ماہر نے اس سلسلہ میں اپنا ایک دلچسپ قصّہ بیان کیا ہے ایک بار انھوں نے دیکھا کہ ایک عقاب آسمان میں چکر لگا رہا تھا۔ یکایک اس نے نہایت زور سے چیخ ماری جیسے وہ کسی کو بلا رہا ہے۔ دیکھتے دیکھتے بہت سے عقاب جمع ہوکر ایک جگہ اترے۔ وہاں ایک گھوڑے کی لاش

پڑی تھی۔ پہلے بڑی عمر والے عقابوں نے پیٹ بھرا، جب وہ کھا چکے تو چھوٹوں نے کھانا شروع کیا اور بڑے نگہبانی کرتے رہے۔

بگلے کی بعض قسمیں مچھلیوں کا شکار اس طرح کرتی ہیں کہ وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں۔ دونوں گروہ مل کر پانی میں ایک دائرہ بنا لیتے ہیں۔ پھر ایک گروہ دوسرے گروہ کی طرف بڑھتا ہے۔ دائرہ چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ جو مچھلیاں اس طرح پھنس جاتی ہیں ان کا آسانی سے شکار کر لیا جاتا ہے۔

ابابیلوں میں اکثر ایک ہی ابابیل شکار کرتی ہے۔ اور سب ساتھی مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ اگر کوئی شکرا ان پر حملہ کرتا ہے تو سب مل کر اس کو بھگا دیتی ہیں چیل حالانکہ عقاب سے کم زور ہوتی ہے لیکن اکثر کئی چیلیں مل کر عقاب سے شکار چھین لیتی ہیں۔ سارس بہت عقل مند ہوتے ہیں اور خوب مل جل کر بھائی چارے سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ان کا غول شکار کرتا ہے یا آرام میں ہوتا ہے۔ تو ان میں سے چند کا کام یہ ہوتا ہے کہ دیکھ بھال کرتے رہیں اور خطرے سے آگاہ کر دیں اگر کسی جگہ انھیں خطرے کا شبہ ہو جائے تو وہاں جانے سے پہلے معائنہ کے لئے اسکاوٹ بھیجتے ہیں۔ جب وہ واپس آکر اطلاع دیتے ہیں کہ کوئی خطرہ نہیں تو ایک اور گروہ اطمینان کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ جب بالکل یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی خطرہ نہیں۔ تب پورا غول وہاں اڑ کر آ جاتا ہے۔ سارس دن کا بہت تھوڑا حصہ شکار میں صرف کرتا ہے۔ باقی تمام دن خوش فعلیوں اور کھیل میں صرف ہوتا ہے۔ جس میں سب شریک ہوتے ہیں۔

پرندوں میں غالباً طوطا سب سے ذہین ہوتا ہے۔ جب طوطوں کے جھنڈ کو کسی کھیت پر حملہ کرنا ہوتا ہے۔ تو پہلے اسکاؤٹ بھیجے جاتے ہیں، جو کھیت کے چاروں طرف درختوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب وہ خوب دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی آدمی قریب نہیں تو وہ آواز دیتے ہیں "سب ٹھیک ہے" پھر پورا جھنڈ کھیت پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اگر ذرا کھٹکا ہو تو سب ایک دم اڑ جاتے ہیں طوطے آپس میں بہت محبت کرتے ہیں۔ اور اس لئے دوسرے جانور ان پر حملہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

بہار کے زمانے میں بہت سے پرند

شمالی ملکوں کی طرف چلے جاتے ہیں اور بڑے بڑے غولوں میں جنگلوں میں اور دریا کے کنارے اترتے ہیں۔ ان میں اکثر چھوٹے چھوٹے پرندے ہوتے ہیں۔ لیکن شکاری پرندوں کو ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اگر کبھی کوئی ان پر حملہ کرتا ہے تو سب مل کر یا تو اسے بھگا دیتے ہیں یا پانی کی چھینٹیں اس طرح اڑاتے ہیں کہ حملہ کرنے والا جانور گھبرا کر اڑ جاتا ہے۔

جانوروں کی باہمی امداد کی بہت اچھی مثالیں اس زمانے میں نظر آتی ہیں جب وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو سفر کرتے ہیں۔ یہ سفر عام طور سے موسمی تبدیلیوں کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔ جاڑوں میں بہت سے جانور جنوب کی طرف آ جاتے ہیں کیونکہ یہاں سردی کم ہوتی ہے۔ گرمی میں گرمی سے بچنے کے لئے شمال کی طرف چلے جاتے ہیں۔ جب کوئی سفر درپیش ہوتا ہے تو سب پرند ایک جگہ جمع ہونے لگتے ہیں۔ یہ سلسلہ کئی دن تک رہتا ہے تاکہ کوئی پرندہ رہ نہ جائے پھر ان کی فوج کی فوج وادیوں اور سمندروں کو طے کرتی چلی جاتی ہے۔

بندر غول میں رہنا پسند کرتا ہے۔ اور تنہائی سے بہت گھبراتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی پر کوئی مصیبت آ جائے تو اس کی آواز سن کر سب دوڑ آتے ہیں اور دشمن پر سب مل کر حملہ کرتے ہیں۔ اگر لڑائی میں کوئی بندر زخمی ہو جائے تو اسے اس وقت تک نہیں چھوڑتے جب تک یقین نہ ہو جائے کہ وہ مر گیا۔ بعض نسل کے بندر حفاظت کے لئے سنتری مقرر کر دیتے ہیں۔ جب بندر کہیں ڈاکا ڈالتے ہیں تو مالِ غنیمت دوسری جگہ بہت جلد پہنچانے کے لئے کچھ کچھ فاصلے سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور مال ہاتھوں ہاتھ کہیں کا کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ ٹی ٹی (چھوٹی نسل کے بندر جو بہت خوب صورت ہوتے ہیں) بارش میں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ اور اپنی دم ایک دوسرے کے گلے میں حفاظت کے لئے لپیٹ لیتے ہیں۔

پرندوں اور جانوروں میں ایک دوسرے کی مدد صرف حفاظت اور شکار ہی کے وقت نہیں کی جاتی۔ تفریح اور کھیل کے میدان میں بھی یہ چیز اسی حد تک پائی جاتی ہے۔ سارس کا اس سلسلے میں پہلے ذکر آ چکا ہے، کتوں بلوں اور بلی کے بچوں کو بھی تم نے کھیلتے دیکھا ہوگا۔ چڑیاں اکثر مل کر گاتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھا

گیا ہے کہ چڑیوں کے کئی جھنڈ ہوتے ہیں، پہلے
ایک پورا جھنڈ مل کر گاتا ہے۔ جب یہ خاموش
ہوجاتا ہے۔ تو پھر دوسرا گاتا ہے۔ اسی طرح
باری باری سب گاتے ہیں۔

ایک اور ماہر حیوانات نے جو قطب جنوبی
کے قریب پرندوں کی زندگی کا مطالعہ کرنے گئے
تھے اپنا ایک مشاہدہ اس طرح بیان کیا ہے
"میں تمام تمام دن پنگین (ایک سمندری چڑیا)
کے غولوں کو نہاتے دیکھا کرتا تھا۔ یہ چڑیاں ایک
ایک کرکے برف کے کنارے بیٹھنا شروع کرتیں
یہاں تک کہ ان کی ایک پوری پارٹی جمع ہوجاتی
پھر وہ اپنی شرارتیں اور کھیل شروع کرتیں اور ایک
دوسرے کے پیچھے اڑی اڑی پھرتیں۔ ہر پنگین
کی کوشش یہ ہوتی کہ کسی طرح کوئی دوسری پنگین پانی
میں پہلے داخل ہو۔ ان کی ایک قطار پیچھے سے اڑتی
اور دوڑتی ہوئی آتی تاکہ اگلی قطار کو پانی میں دھکیل
دے اور جب دوسری قطار بالکل کنارے پر پہنچ جاتی
اور پانی میں گرنے کو ہوتی تو فوراً اڑ کر وہ پچھلی والی
قطار کے پیچھے پہنچ جاتی اور پورا زور لگاتی کہ
اسے پانی میں پہنچادے۔ یہ کش مکش کچھ دیر جاری
رہتی آخر کو ہوتا یہ کہ کوئی ایک پنگین سرپٹ
دوڑتی ہوئی جاتی اور سر کے بل پانی میں غوطہ
مارتی اور کچھ دور جاکر پانی میں سے نکلتی
پھر باقی سب بھی یہی کرتیں اور سب اکٹھی ایک
جگہ جاکر نکلتیں۔ جب وہ پانی میں سے کودتی
اچھلتی نکلتیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ بہت سے
بچے مل کر شور مچا رہے ہیں۔ جب کبھی کوئی
برف کی سل بہتی ہوئی آجاتی تو کچھ چڑیاں
اس پر سوار ہوجاتیں اور جب یہ سل کنارے
کے قریب ہوکر گذرتی تو وہ کنارے پر
بیٹھی ہوئی چڑیوں کو دیکھ کر خوب شور مچاتیں
اور پھر جواب میں یہ ان سے بھی زیادہ چلاتیں
اکثر ان سلوں پر چڑیاں اتنی تعداد میں بیٹھ
جاتی تھیں کہ سل بالکل ان سے ڈھک جاتی تھی۔
ان چڑیوں کی یہ سب حرکتیں دیکھ کر یہ خیال مشکل سے آتا تھا
کہ یہ انسان نہیں بلکہ چڑیاں ہیں۔

جانوروں میں انصاف کا خیال بھی پایا جاتا ہے مثلاً اگر
کوئی ابابیل دوسری ابابیل کے گھونسلے پر قبضہ کرلے یا اس
میں سے کچھ چرالے تو گروہ کے دوسرے ممبر فوراً مداخلت کرتے ہیں
اور جس کا حق ہوتا ہے اسے واپس دلوا دیتے ہیں۔

سید محمد حسین صاحب صدر مدرس حمایت نگر

بیل گاڑی

گڑگڑ گڑگڑ گاڑی میری — دھیمی دھیمی چلتی ہے کیسی
اچھے اچھے بیل جتے ہیں — گدی تکئے اس میں رکھے ہیں
اس میں کیا آرام ہے دیکھو — چاہو بیٹھو چاہو لیٹو
جنگل ہو یا ندی نالا — پہنچے ہر جا گاڑی والا

تانگا

صاف اور ستھرا تانگا ہے کیسا — اس میں جتا ہے چنچل گھوڑا
ساز سے گھوڑا دولھا بنا ہے — تانگے کا رنگ چمک رہا ہے
دوڑا دوڑا جاتا ہے گھوڑا — وقت سفر میں لگتا ہے تھوڑا
ریل سے آنے والے مسافر — بیٹھ کے اس میں جاتے ہیں گھر گھر

سائیکل

سائیکل ہے یہ کیسی پیاری — دنیا بھر میں سبک سواری
پاؤں رکھا اور زور لگایا — چلی گئی بس یہ جا وہ جا
دانہ چارہ کچھ نہیں کھاتی — پھرتی ہے دن بھر دوڑ دکھاتی

نازک نازک پہیوں والی
چڑھ کر اس پر زور لگاؤ
چال ہے اس کی سب سے نرالی
ساری دنیا گھوم کر آؤ

موٹر

پم پم پم پم موٹر آئی
سواریوں میں ہے یہ رانی
گرد اڑا کر چلنے والی
ریل اور سائیکل۔ گھوڑا۔ گاڑی
کالی پیلی رنگت والی
چلتی ہے پی کر تیل اور پانی
میلوں کوسوں پھرنے والی
اس کے برابر دوڑے نہ کوئی

ریل

ریل وہ آئی شور مچاتی
ڈبے ہیں اس کے تیرہ چودہ
کھا کر کوئلے کا ایندھن
اولا پالا یا ہو آندھی
چھک چھک کرتی دھواں اڑاتی
ہر ایک ڈبہ گھر ہے گویا
بن گیا کالا پہاڑ سا انجن
وقت پر اپنے آن ہی پہنچی

ہوائی جہاز

آتی ہے زوں زوں زوں آواز
گھر کے جتنا بڑا سا ٹڈا
راہ میں دلدل ہو یا صحرا
ابھی زمیں پر ابھی ہوا میں
اڑ کر جاؤ جس جا چاہو
دیکھو وہ آیا ہوائی جہاز
ہوا میں اڑتا پھرتا ہے گویا
پہاڑ سے بھی یہ نہیں ہے ڈرتا
پلک جھپکتے گم ہے فضا میں
سیر و سفر کا لطف اٹھاؤ

ہمارے جغرافیہ کے ماسٹر صاحب بڑے اچھے ہیں۔ جغرافیے کی باتیں ایسی دلچسپی سے بتاتے ہیں کہ ہم سب لڑکے خوب محو ہو کر سنتے ہیں۔ یورپ میں آئے دن جغرافیے کے بارے میں نئی نئی تحقیقاتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ان کا ذکر اخباروں میں آتا رہتا ہے۔ ماسٹر صاحب ہمیں یہ خبریں ضرور سناتے ہیں۔ انھی سب باتوں کی وجہ سے ہم جس محنت اور شوق سے ماسٹر صاحب کا کام کرتے ہیں اور کسی ماسٹر کا نہیں کرتے۔

ایک دن ماسٹر صاحب درجے میں آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک انگریزی کا اخبار تھا۔ ہم سب سمجھ گئے کہ ماسٹر صاحب آج ضرور کوئی نئی بات سنائیں گے۔ درجے میں بالکل خاموشی چھا گئی اور ماسٹر صاحب نے فرمایا" لو بھئی ایک نئی خبر سنو۔ امریکہ میں کوئی صاحب ہیں۔ جے۔ ایچ۔ ڈِلکنس۔ یہ غوطہ خور کشتی کے ذریعے قطب شمالی تک پہنچنا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا" ماسٹر صاحب! قطب شمالی تو دریافت ہو چکا ہے۔" ماسٹر صاحب نے کہا" ہاں بھئی، مگر کپتان پیری جس نے قطب شمالی کو دریافت کیا ہے۔ وہ جہاز پر بیٹھ کر گیا تھا۔ اور پھر برف کے میدانوں اور برف کی سلوں پر سے ہوتا ہوا وہاں تک پہنچا تھا۔

کپتان پیری کا نام تو ہم سب نے سنا تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ قطب شمالی اسی نے دریافت کیا تھا۔ مگر اس کا حال نہیں معلوم تھا، نہ یہ کہ اس نے قطب شمالی کو کیسے دریافت کیا۔" بال کرشن بولا" ماسٹر صاحب! یہ پیری کون صاحب تھے۔ اور قطب شمالی تک کیسے پہنچ گئے" ماسٹر صاحب مسکرا کر بولے" یہ سوال آپ نے دلچسپ کیا۔ بھئی کپتان پیری کو نہیں جانتے ہو۔ یہ بہت مشہور شخص ہے۔ اس نے انجینیری کی تعلیم حاصل کی تھی۔ امریکہ کے بحری محکمے

میں نوکر تھا۔ جب وہ ۲۹ برس کا تھا تو اس نے گرین لینڈ کی دریافت پر ایک کتاب پڑھی۔ اسے پڑھ کر اس کے دل پر بہت اثر ہوا۔ دوسرے سال اس نے گرین لینڈ کا تنہا سفر کیا اور تبھی سے قطب شمالی کی دریافت کا خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا۔ وہ پورے بیس برس تک اس مہم کو سر کرنے میں لگا رہا۔ میں نے حیرت سے پوچھا "ماسٹر صاحب! پورے بیس برس! بڑی ہمت والا آدمی تھا ماسٹر صاحب!"
ماسٹر صاحب نے کہا "ایسے ہی مستقل مزاج لوگ تو اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور دنیا کے لئے مثال چھوڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اس مہم کو شروع کرنے سے پہلے۔ اس نے قطبی علاقے کے بہت سے چکر کئے۔ سمندر اور خشکی کے علاقوں کی جانچ کی۔ اس علاقے کے باشندوں یعنی اسکیمو لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ اس نے قطب شمالی تک پہنچنے کی بار بار کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ بعض مہموں میں اس کی بیوی بھی اس کے ساتھ تھی۔" بال کرشن بولا "ماسٹر صاحب! اس کی بیوی بھی؟ ہمارے ہاں کی عورتیں ایسی خطرناک جگہوں پر جانے کے لئے کبھی بھی تیار نہ ہوں۔" ماسٹر صاحب "ہاں میاں وہاں کی عورتیں بھی ایسی ہی باہمت نڈر اور بہادر ہوتی ہیں اگر ہماری ماؤں بہنوں میں یہ اچھی باتیں آجائیں تو ہمارا ملک کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔ خیر تو ان بار بار کی ناکامیوں سے پیری کی ہمت کبھی نہ ٹوٹی بلکہ ہر ناکامی سے اس نے ایک نیا سبق اور مفید تجربہ حاصل کیا۔ آخر بیس اکیس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد ۱۹۰۸ء میں اس نے ایک آخری کوشش کی۔ وہ ۶ جولائی ۱۹۰۸ء کو ایک بہت مضبوط جہاز میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔ ۲۶ کو وہ اس خطے میں پہنچا۔ جہاں چھ مہینے دن اور چھ مہینے رات ہوتی ہے۔ پہلی اگست کو کیپ یارک پہنچا۔ یہاں وہ اپنے اسکیمو دوستوں سے ملا اور اپنی مدد کے لئے ان میں سے کوئی ۴۹ آدمی چھانٹے۔ ان کے علاوہ ۲۴۶ کتے ساتھ لئے
اب آگے کا راستہ بہت مشکل تھا۔ چاروں طرف برف کے بڑے بڑے تودے تیر رہے تھے ایک آدھ جگہ جہاز برف کے تودے سے ٹکرایا بھی مگر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اتنا مضبوط جہاز تھا پھر بھی جہاز کے تمام لوگ ہر وقت سامان کے بنڈل ہاتھوں میں لئے تیار رہتے تھے کہ جہاز ٹوٹ جائے تو سامان سمیت کود پڑیں۔ ایک جگہ جہاز پورے ۵ روز تک برف کے تودوں میں کھڑا رہا۔ آخر ڈائنامیٹ کے ذریعے راستہ صاف کیا گیا۔ ۵ ستمبر کو جہاز شیرڈن پہنچا۔ یہاں سفر کی ایک منزل ختم ہوئی۔ اب جاڑے کا موسم شروع

ہو گیا تھا۔ آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ اس لئے طے ہوا کہ جاڑا کیپ شیریڈن میں گزارا جائے۔

۲۲ فروری کو جاڑے کا موسم ختم ہوا۔ تو کپتان پیری ۲۴ آدمیوں، ۱۶ کتا گاڑیوں ۱۴۲ کتوں کو ساتھ لے کر قطب شمالی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ برفانی راستہ چار سو میل لمبا تھا اور جہاز والے راستے سے کہیں زیادہ دشوار اور خطرناک۔ ایک جگہ کوئی چوتھائی میل تک لمبا نالہ ملا اور دن بھر رکنا پڑا۔ نالا برف سے بھر گیا تو آگے بڑھے۔ ایک جگہ نالا اس سے بھی زیادہ چوڑا تھا جہاں پانچ دن تک رکنا پڑا۔ ان کے علاوہ چھوٹے بڑے بہت سے نالے ملے۔ پھر اکثر برف کے تیرتے ہوئے تودوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ ذرا بھی پیر پھسلا اور پانی میں۔ ایک گاڑی کے چند کتے پھسل بھی گئے تھے۔ بڑی مشکل سے انھیں باہر نکالا گیا۔

چلتے چلتے قطب ۱۲۲ میل رہ گیا۔ پیری کے ساتھ اب صرف چار اسکیمو اور اس کا ایک حبشی خدمت گار تھا۔ باقی لوگوں کو واپس کردیا گیا تھا۔ ہوا بہت ٹھنڈی تھی۔ ہاتھ منہ پھٹ رہے تھے۔ تکلیف کے مارے نیند نہ آتی تھی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ لیکن کوئی ان باتوں کو خیال میں نہ لاتا تھا۔ برابر بڑھے چلے جا رہے تھے کامیابی کی امید نے دگنی قوت پیدا کردی تھی۔

آخر ۱۶ اپریل ۱۹۰۹ء کو چھ آدمیوں کا یہ مختصر گروہ قطب شمالی تک پہنچ گیا۔ کپتان پیری نے یہاں امریکہ کا قومی جھنڈا نصب کر دیا۔

کوئی تین گھنٹے تک انھوں نے قطب تک چکر لگایا۔ پھر اپنی اس غیر معمولی کامیابی پر خوش خوش وہاں سے لوٹ پڑے۔

سعید:۔ ماسٹر صاحب۔ سچ مچ کپتان پیری نے بڑا کام کیا۔

ماسٹر صاحب:۔ ہاں بھئی آزاد ملکوں کے لوگ ایسے ہی ہمت اور دلیری کا کام کرتے ہیں

کیلاش:۔ اور ماسٹر صاحب جے اچ ولکنس کا کیا قصہ ہے؟

ماسٹر صاحب:۔ ہاں آج میں یہی تو تمھیں سنانا چاہتا تھا۔

رشید:۔ تو ماسٹر صاحب جلدی سے بتا دیجئے نا، کہیں گھنٹہ ختم نہ ہو جائے۔

ماسٹر صاحب:۔ نہیں۔ (گھڑی دیکھ کر) ابھی بیس منٹ باقی ہیں۔ تو ابھی یہ تو تمھیں معلوم ہو گیا کہ پیری کہیں بیس سال تک کوشش کرنے کے بعد قطب شمالی پہنچ پایا۔ تمھیں یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس طرح کے سفر میں کتنے خطرے ہیں شدید سردی اور پھر برف کے تودے۔ اتنی شدید

سردی میں ہوائی جہاز کا بھی وہاں تک پہنچنا مشکل ہے۔ پھر برف پر کہاں اتارا جائے اور کہاں اڑایا جائے۔ وِل کِنس کا خیال ہے۔ کہ آبدوز کشتی کے سفر میں اس قسم کے خطرے نہیں ہیں اور اس کے ذریعے قطب شمالی تک آسانی سے پہنچ سکتے ہیں۔ وِل کِنس کا ارادہ ہے کہ پانی ہی پانی میں قطب شمالی کے بڑے بڑے سفر کرے۔

قطبی علاقہ پانی ہی پانی ہے۔ اس کے اوپر برف کی دو سے لے کر چار میٹر تک موٹی تہ جمی ہوئی ہے، کہیں کہیں یہ صرف ½ میٹر بھی ہے چنانچہ ایسی جگھوں میں والرس سانس لینے کے لئے برف کی تہ کو اپنے سر سے توڑ دیتا ہے۔ یہ سمندر (بحر منجمد شمالی) اوسطاً چار ہزار میٹر گہرا ہے۔ کہیں کہیں پانچ ہزار میٹر بھی۔ یورپ کا اونچے سے اونچا پہاڑ بھی اس کی گہرائی میں ڈوب جائے گا۔

بحر منجمد شمالی کی برف کو زپلن جہاز کے ذریعے دیکھا گیا ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ برف میں ایسے حصے یا سوراخ جگہ جگہ موجود ہیں جن میں بہتا ہوا پانی موجود ہے۔ قطب شمالی کے سارے سمندر میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کھلے ہوئے حصے ایک دوسرے سے زیادہ فاصلے پر ہوں۔ ان کھلے ہوئے حصوں میں آب دوز کشتی آسانی سے سطح کے اوپر آ سکتی ہے۔ اسی لئے تو وِل کِنس اور دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ برف کے نیچے کا راستہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔

اس کے علاوہ آب دوز کشتی کی شیشے والی کھڑکیوں سے پانی کے اندر کی ایسی عجیب و غریب چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ جو کبھی خواب میں نظر نہ آئی ہوں گی۔ مثلاً سمندری سطح پر تیرنے والے آبی جانور جو گھونگھے کی شکل کے ہوتے ہیں سمندر کی لہریں انھیں ادھر سے ادھر لئے پھرتی ہیں۔ یہ سمندر کی چھوٹی مخلوق کی غذا بنتی ہیں۔ اور یہ چھوٹی مخلوق بھی مچھلیوں۔ سیل اور وھیل کا شکار بن جاتی ہے۔ پھر آب دوز کشتی کے آلے کے ذریعے برف کے پہاڑوں کی بنیادیں نظر آ سکتی ہیں۔ برف کے ان پہاڑوں کا صرف ساتواں حصہ پانی کی سطح کے اوپر ہوتا ہے

لیکن ان کشتیوں کے لئے کچھ مشکلیں بھی ہیں اور اسی لئے بہت احتیاط سے سفر کرنے کی ضرورت ہے۔ کھلا ہوا حصہ جہاں برف پہاڑ کی صورت اختیار کر لیتا ہے

۱

۲

۳

۴

۶

۷

۸

۹

اَور برف کا تودا جو پانی میں بہت نیچے تک چلا جاتا ہے۔ آب دوز کشتیوں کے لئے خطرے کا سبب بن جاتا ہے۔ قطب شمالی کے سمندر میں عام طور سے زیادہ پہاڑ نہیں ملتے۔ لیکن قطب شمالی کی طرف جانے والی کشتیوں کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہئے

ارشد: ماسٹر صاحب! یہ مہم کامیاب ہو گئی تو بڑا عجیب کارنامہ ہوگا۔ اپنے مزے سے پانی کے اندر ہی اندر قطب شمالی پہنچ گئے۔

ماسٹر صاحب: اَور کیا۔ مگر ابھی صرف چھان بین کا کام ہو رہا ہے۔ اَور ہاں دیکھو، اس اخبار میں کچھ تصویریں بھی آئی ہیں۔ ان تصویروں کی مدد سے بہت کچھ سمجھ میں آ جائے گا۔ دیکھو (۱) یہ تو ہیں کپتان پیری اَور (۲) یہ ہیں جے اچ وِلکنس (۳) یہ تیسری تصویر زِپلین جہاز کے ذریعے لی گئی ہے۔ اس میں برف کی سفید اَور صاف سطح پر کچھ نشان دکھائی دے رہے ہیں۔ یہی وہ کھلے ہوئے حصے ہیں جن میں بہتا ہوا پانی مَوجود ہے یہ (۴) آبدوز کشتی کی تصویر ہے۔ یہ بڑی احتیاط کے ساتھ برف کے نیچے نیچے قطب شمالی تک پہنچنے کا راستہ تلاش کر رہی ہے اس (۵) تصویر میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آبدوز کشتی برف کے پہاڑوں کو اپنے آلے (دپر اسکوپ) کے ذریعے دیکھ سکتی ہے۔ اچھا یہ اَور (۶) دیکھو دالرس ہے۔ اس تصویر سے یہ بتانا مقصوُد ہے کہ دالرس سانس لینے کے لئے برف کی تہ کو توڑ دیتا ہے۔ اَور (۷) یہ گویا برف کا پہاڑ ہے۔ اس کا صرف ساتواں حصہ پانی پر ہے پھر بھی دیکھو سچ مچ پہاڑ کا پہاڑ نظر آتا ہے۔ قطب شمالی کا سمندر حقیقتاً دنیا کا وسطی حصہ ہے۔ یہ بہت اہم براعظموں سے گھرا ہوا ہے اَور جب ہوا بازی کا فن اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ تو یہ سمندر دنیا کی آمد و رفت کا مرکز بن جائے گا۔ اَور یہ تصویر (۸) غوطہ خور کی ہے۔ اس مہم میں غوطہ خور کو بہت اہمیت حاصل ہے یہ پتوار اَور پیچوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وہ برف تک تیر کر پہنچ سکتا ہے برف توڑنے کے لئے اپنی کشتی کو نقصان پہنچائے بغیر سرنگیں بچھا سکتا ہے۔ اسے تازہ ہوا کے لئے پانی کی سطح تک ایک

نکلی بھی ہے جانی پڑتی ہے۔

اور یہ دیکھو آخری (۹) تصویر ہے قطب شمالی کا اسٹیشن گویا سمندر کے علم کے ماہروں اور سمندر کا کھوج لگانے کا خواب اور پرانی آرزو۔ دیکھو برف کی سلیں برابر حرکت کرتی رہتی ہیں یہ یا تو ٹوٹ جاتی ہیں۔ یا دب جاتی ہیں۔ کچھ ایسے مضبوط تختے بھی ہوتے ہیں، جنھیں کافی عرصے تک کوئی صدمہ نہیں پہنچتا ان مضبوط تختوں پر انسان آباد ہو سکتا ہے اور ان پر تیراکوں کے لئے لکڑی کے گھر بنائے جا سکتے ہیں۔ اچھا تو فرض کرو دو برس میں جہاں بین کا کام ختم ہو گیا تو آب دوز کشتیاں قطبی اسٹیشن کی تلاش میں نکلیں گی۔ یہ اسٹیشن برف کی مسلسل حرکت کی وجہ سے کہیں اور ہٹ گیا ہوگا۔ آب دوز کشتی وائرلیس کے ذریعے معلومات حاصل کرکے (ڈیڑھ سے لے کر تین ہزار میٹر کے فاصلہ تک) اسٹیشن میں پہنچے گی اور پھر روشنی کے سگنل اور دھواں پھیلانے والے بم کے ذریعے معلوم ہو گا کہ کشتی نئے ملک کا کھوج لگانے والوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔ (گھڑی دیکھ کر) اب گھنٹے میں ڈیڑھ تین منٹ رہ گئے ہیں۔ میٹر اور کیلو میٹر کا حساب اپنے حساب کے ماسٹر صاحب سے پوچھ لینا۔

سب لڑکے:۔ ماسٹر صاحب! آج کا سبق تو اتنا مزے دار تھا کہ گھنٹہ کا پتہ ہی نہ چلا

ماسٹر صاحب:۔ جو کچھ میں نے بتایا ہے۔ سب یاد ہے؟

سب لڑکے:۔ ماسٹر صاحب ایک ایک حرف۔

ماسٹر صاحب:۔ تو سب لڑکے اسے کل تک مضمون کی شکل میں لکھ لائیں جس کا مضمون سب سے اچھا ہوگا، پیام تعلیم میں بھیج دیا جائے گا۔ جنوری میں اس کا سالنامہ شائع ہو رہا ہے۔ (کتابیں وغیرہ سمیٹتے ہوئے) دیکھو بھولنا مت۔ اور ہاں بہت خوش خط لکھ کر لانا خوب کھلا کھلا۔ کوئی بدخط مضمون کتنا ہی اچھا ہو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا۔

انچ کیپ

ترجمہ۔ علی عبّاس رضوی (لکھنوی)

اسکاٹ لینڈ کے پوُربی ساحل پر ایک جگہ بہت خطرناک چٹان ہے۔ یہ پانی میں ڈوُبی ہوئی ہے۔ اس کا نام انچ کیپ ہے۔ اندھیرے کُہر اور طوُفانی موسم میں ملاحوں کو خبردار کرنے کے لئے یہاں ایک بہت لمبا اور مضبوُط روشنی کا مینار بنا دیا گیا ہے۔ لیکن پرانے زمانے میں اس جگہ کوئی مینار وینار نہیں بنا تھا۔ جب تند و تیز پوُربی ہوائیں چلتیں تو مچھیروں کی کشتیاں ہی نہیں، بڑے بڑے جہاز بھی اس چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔

یہیں پاس ہی سمندر کے کنارے ایک خانقاہ تھی اس میں پادری رہتے تھے اس خانقاہ کے ساتھ ایک گرجا بھی تھا۔ پادریوں کا سردار ایبٹ بہت ہی خدا ترس اور نیک آدمی تھا وہ اس بات سے ہمیشہ اُداس رہتا کہ بہت سے غریب مچھیروں کی کشتیاں طوُفان میں ادھر چلی آتیں اور چٹان سے ٹکرا جاتیں۔

ایک دن ایبٹ نے اپنے شاگردوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ کشتیاں اور جہاز اس چٹان سے نہ ٹکرائیں۔ آخر تھوڑی دیر بحث کے بعد یہ طے پایا کہ گرجے کی بڑی گھنٹی چٹان پر لٹکا دی جائے۔ ہوائیں یا طوُفان آئے گا تو موجوں کی وجہ سے گھنٹی بجے گی۔ اور لوگ ادھر نہ آئیں گے۔ گھنٹی چٹان پر لٹکا دی گئی۔ اب طوُفان آتا اور موجیں اٹھتیں تو گھنٹی بجنے لگتی۔ اس طرح سینکڑوں آدمیوں کی جانیں بچ گئیں۔ ملاح گھنٹی کی آواز سن کر ایبٹ کو دعائیں دیتے اور کشتی کو چٹان سے بچا کر لے جاتے۔ انھی دنوں اس طرف "الف" نامی ایک سمندری ڈاکو کا بہت زور تھا۔ یہ سوداگروں کے جہاز لوُٹ لیتا تھا، کبھی کبھی خشکی پر بھی لوُٹ مار مچاتا وہ ایبٹ اور اس کے ساتھیوں سے بہت جلتا تھا ساری جلن اس بات کی تھی کہ ایبٹ مچھیروں کی

حفاظت کرتا تھا۔

ایک دن رالف کا جہاز انچ کیپ کے کنارے آ لگا۔ آسمان صاف تھا۔ اور سمندر خاموش۔ رالف نے اپنے جہاز سے چٹان پر گھنٹی لٹکی ہوئی دیکھی اور اپنے ساتھیوں سے بولا "کتنا اچھا موقع ہے۔ چلو اس گھنٹی کو وہاں سے کاٹ دیں۔ اہاہاہا! ایبٹ کتنا خفا ہوگا۔" اس کے ساتھی خوشی سے چلّانے لگے۔ "واہ واہ کتنا اچھا ارادہ ہے۔" اور کشتیوں کے ذریعے وہاں پہنچ گھنٹی کی زنجیریں کاٹ، اسے سمندر کے حوالے کر دیا۔ بہت خوش تھے کہ اب جو ملاح اِدھر آ پھنسیں گے وہ ایبٹ کو دعا نہیں دیں گے۔ اس کی تعریف سنتے سنتے کان پک گئے۔

رالف برابر جگہ جگہ ڈاکے ڈالتا اور لوٹ مار مچاتا رہا۔ یہاں تک کہ خوب مال دار ہو گیا۔ اب اس نے سوچا کہ میرے پاس اتنا روپیہ پیسہ جمع ہو گیا ہے۔ اور اس پیشے سے جی بھی اُکتا گیا ہے۔ اس لئے باقی زندگی اسکاٹ لینڈ میں آرام اور اطمینان سے گذارنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر اس نے اسکاٹ لینڈ جانے کی تیاری کی اور جہاز پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔

ایک رات سارا سمندر کُہرے سے ڈھکا ہوا تھا۔ خوب تند و تیز ہوائیں چل رہی تھیں ہواؤں کے طوفان نے رالف کے جہاز کو مشرقی ساحل کے کنارے پہنچا دیا۔ رالف پریشانی میں بڑبڑا رہا تھا۔ "کاش آج چاند نکلا ہوتا معلوم نہیں ہم لوگ کہاں ہیں......... (ساتھیوں سے) تم موجوں کا شور و غل نہیں سن رہے ہو؟ ....ہم انچ کیپ کے بالکل قریب ہیں ....کاش میں گھنٹی کی آواز سن سکتا.... ......اسی وقت ایک زور کا دھکا ہوا۔ جہاز چٹان سے ٹکرا چکا تھا۔ رالف کے ساتھی چلّائے "ہم ڈوب رہے ہیں۔ ہم ڈوب رہے ہیں" جہاز پاش پاش ہو گیا اور تھوڑی دیر میں سوائے چند تختوں کے جو سمندر کی سطح پر تیر رہے تھے وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

(ترجمہ بصرف)

کسی ملک کی شہزادی کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا، اس نے دُور دُور کے ملکوں سے قسم قسم کے چرند، پرند اور آبی جانور منگاکر جمع کئے تھے۔ ان سب کے رہنے کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرکے بہت بڑا سا باغ اپنے خاص محل کے نیچے بنوایا تھا۔ اس باغ میں شہزادی اپنے تمام جانور بالکل اس طرح رکھتی تھی۔ جیسے وہ جنگلوں میں رہا کرتے تھے مثلاً ننھی منّی چڑیاں باریک جالی کے بنے ہوئے پنجروں میں رہتی تھیں۔ یہ پنجرے اتنے بڑے تھے کہ ان کے اندر چھوٹے چھوٹے خوب صورت باغ لگے ہوئے تھے۔ بھولی چڑیاں دن بھر پھلوں سے لدے ہوئے درختوں پر چہچہاتیں، پھولوں کے گرد اڑتی پھرتیں، جھاڑیوں میں گھونسلے بنا بنا کر بچے نکالتیں اور رات کو گھنے پیڑوں کی شاخوں پر بسیرا لیتی تھیں۔ انھیں گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ پنجروں میں بند ہیں۔ اسی طرح طوطے اور دُوسرے پرند بھی پلے تھے۔ بڑے جانور، جیسے اونٹ، ہاتھی، شیر، بھالو، یہ سب مصنوعی غاروں اور کھوؤں میں رہتے تھے۔ ان کے گھومنے پھرنے کو بڑے بڑے کھلے میدان تھے۔ ان میدانوں کے چاروں طرف گہری گہری نہریں کھدواکر پانی سے بھروا دی تھیں۔ تاکہ یہ خونخوار جانور نکل نہ بھاگیں اور لوگوں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

عقل مند شہزادی نے پانی کے جانوروں کے رہنے کا اور بھی اچھا انتظام کیا تھا۔ راج ہنسوں کے تیرنے کو خوب صورت کنول سے بھرے ہوئے پانی کے حوض بنوائے تھے۔ راج ہنس شہزادی کو بہت پیارے تھے۔ انھیں دیکھنے وہ روزانہ باغ میں آتی اور اپنے ہاتھ سے دانہ کھلاتی۔ جانور پالنے کا یہ طریقہ آج کل کوئی عجیب چیز نہیں ہے۔ قریب قریب ہر بڑے شہر میں چڑیا گھر موجود ہیں جہاں بالکل اسی

طرح بلکہ اس سے بھی عجیب و غریب طریقہ پر جانور پالے جاتے ہیں مگر تم جانو، پرانے زمانے میں تو یہ بڑے تعجب کی بات تھی۔لوگ دور دور سے شہزادی کا چڑیا گھر دیکھنے آتے دیکھ کر حیران رہ جاتے اور شہزادی کی عقل کی داد دیتے تھے۔

یہ حال تو شہزادی کے چڑیا گھر کا رہا۔ اب کچھ جانور ایسے بھی تھے جو شہزادی کے خاص محل میں پل رہے تھے۔ان میں سب سے زیادہ فوقیت بلی گل رُخ کو حاصل تھی۔تم دل میں کہہ رہے ہوگے کہ یہ گل رُخ کون! لوسنو! گل رخ ایک ننھی سی زرد رنگ کی سیامی بلی کا نام تھا۔ یہ گل رُخ شہزادی کی بڑی لاڈلی تھیں اور اس بات پر انھیں غرور بھی بہت تھا۔کیوں نہ ہوتا! ان کے دوسرے ساتھی جانور گو اسی محل میں رہتے تھے مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ کود کر شہزادی کی گود میں بیٹھ جائے، یا دسترخوان پر کھانا کھائے۔ چاندی سونے کے تخت پر بیٹھے یا مخملی گدّوں کے بستر پر سوئے۔ یہ فخر تو صرف بی گل رخ ہی کو حاصل تھا۔ بات یہ تھی کہ گل رخ تھی بھی بہت خوب صورت۔ اس کی سیاہ گول مٹول شرارت سے بھری آنکھیں، ریشم ایسے ملائم بڑے بڑے بال، پھولی پھولی دُم اور ننھے ننھے پاؤں شہزادی کو بہت بھاتے تھے۔کبھی یہ اپنی ملکہ شہزادی سے ناراض بھی ہو جاتی اور اس کے ہاتھ پر پنجہ مار دیتی مگر وہ کبھی اسے سزا نہ دیتی بلکہ اور پیار کرتی تھی۔

غرض اس طرح بہت دن گذر گئے گل رُخ بڑی ہوئی، عقل و شعور آیا۔اب نہ پہلی سی شرارتیں رہیں اور نہ کھیل کود رہا۔شاہی محلوں میں پلی بڑھی تھی۔ اس پر شہزادی کی تربیت پائی تھی۔ خوب تمیز دار، بردبار اور عقل مند جوان بلّی بن گئی۔رنگ روپ بھی نکھر آیا۔

کچھ روز اور گزرے! ایک دن بیٹھے بیٹھے گل رخ کے دل میں خیال آیا۔ کہنے لگی میں نے آنکھ کھول کر سوائے شاہی محل کے اور کوئی جگہ نہیں دیکھی! کہتے ہیں کہ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔اس میں بہت سے مقام دیکھنے کے قابل ہیں۔ ایک دیہات ہی کو لے لو۔ہماری شہزادی کو دیہات کی زندگی کتنی پسند ہے وہ اکثر کہا کرتی ہیں کاش انھیں کچھ دن کے لئے دیہات میں رہنے کی اجازت مل جایا کرتی وہ دیہاتی لوگوں کی کیسی تعریفیں کرتی ہیں کہ وہ کتنے سیدھے سادے اور محنتی ہوتے ہیں لاؤ آج میں محل کے باہر جاؤں اور سب

سے پہلے دیہات کی سیر کروں مگر........
ہاں شہزادی مجھے نہیں جانے دیں گی. میں ذرا باغ میں جاتی ہوں تو وہ دو تین باندیاں میری تلاش میں بھیج دیتی ہیں۔ اچھا! ایک تدبیر ہے وہ یہ کہ آج رات کو جب شہزادی سو جائیں تو میں چپکے سے نکل جاؤں! دیہات کچھ دوٗر بھی تو نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہوتے واپس آ جاؤں گی۔ یہ سوچ کر گل رخ رات کا انتظار کرنے لگی۔ رات کے کھانے کے بعد جب شہزادی اپنی خواب گاہ کو جانے لگی تو معمول کے مطابق گل رخ کو پکارا گل رخ دوڑتی ہوئی شہزادی کے ساتھ ہولی، خواب گاہ میں پہنچ کر شہزادی کے بستر پر لیٹ گئی اور غرغر کرنے لگی۔ جب شہزادی بے خبر سو گئی تو چپکے سے اٹھی، باغ کے دروازے سے باہر نکلی اوٗر دیہات کا راستہ لیا۔ ابھی تھوڑی ہی دوٗر گئی تھی کہ جنگلی کتوں نے گھیرا مگر بی گُل رُخ کو اپنے بچاؤ کے داؤں پیچ خوب یاد تھے۔ کتوں کو دھوکا دے کر صاف نکل گئی! اور چلتے چلتے ایک گاؤں کے قریب پہنچ ہی گئی! چاندنی رات تھی۔ ہرے ہرے کھیت لہلہا رہے تھے جنگلی پھولوں کی خوشبو سے فضا مہکی ہوئی تھی۔ رات زیادہ جا چکی تھی۔ اس لئے گاؤں پر سناٹا اوٗر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بس ایک زمیندار کی چوپال میں دھندلی سی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یہ سماں گل رخ کو ایسا بھایا کہ کھیت کی مینڈ پر بیٹھ کر دیہاتی منظر کا لطف اٹھانے لگی۔ اتنے میں پاس کی جھاڑی میں کچھ آہٹ ہوئی اوٗر ایک دُبلی پتلی، میلی سی جنگلی بلی سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اوٗر گل رخ کو گھوٗر گھوٗر کر دیکھنے لگی۔ پھر فوراً گئی، گاؤں میں جا کر تمام دیہاتی بلیوں کو خبر دے دی کہ آج ایک نئی بلی کہیں سے آئی ہے بڑی خوب صورت ہے۔ کھیت پر بیٹھی ہے۔ اب کیا تھا وہی مثل ہوگئی" باولے گاؤں اونٹ آیا" ذرا سی دیر میں سارے گاؤں کی بلیاں گُل رُخ کے پاس جمع ہو گئیں اوٗر لگیں بھدے پن سے میاؤں میاؤں کرنے۔ ایک نے پوچھا اے بہن! تم کہاں سے آئی ہو؟ دوٗسری بولی" تمہارا گھر کہاں ہے؟" تیسری نے کہا" کہاں کی رہنے والی ہو؟" چوتھی بول اٹھی" بوا اتنی رات کو ہمارے گاؤں میں کیوں آئی ہو؟" الغرض گل رُخ پر سوالوں کی بوچھار ہونے لگی بے چاری کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کسے کسے جواب دے۔ اتنے میں ایک بوڑھی بلی آگے بڑھی اوٗر سب بلیوں کو مخاطب کر کے کہا" ان سے کیا پوچھتی ہو! دیکھتی نہیں، صاف معلوم ہو رہا ہے کہ شہر کی رہنے والی ہیں۔ گاؤں کی سیر کو جی چاہا ہوگا، چلی آئیں،

اب گل رُخ نے موقع غنیمت جان کر تمیز کے
ساتھ کہا "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں شہر میں شہزادی
کے پاس رہتی ہوں۔ میں نے کبھی دیہات نہیں
دیکھا تھا۔ آج شہزادی سے چھپ کر گاؤں کی
سیر کو چلی آئی ہوں" پھر اور بلیوں سے
مناسب بات چیت کرکے رخصت چاہی۔ پاس
ہی ایک نوجوان جنگلی بلا بیٹھا ہوا یہ سب باتیں
سن رہا تھا۔ گل رخ کی تمیز اور تہذیب اسے
بہت پسند آئی۔ گل رُخ اور جنگلی بلیوں میں
زمین آسمان کا فرق معلوم ہوا۔ فوراً گل رُخ
کے پاس آکر اپنا تعارف کرایا اور شادی کا
پیغام دیدیا۔ پہلے تو گل رُخ کو بلے کی جرأت پر
بڑا غصہ آیا۔ پھر اس کے بھولے پن اور سادہ
لوحی پر ہنسی بھی آئی۔ اس نے تنک کر جواب
دیا "واہ! میں تمہارے ساتھ شادی کیسے کرلوں
میرا بیاہ تو شہزادی اپنی سہیلی کے بلے کے
ساتھ ٹھیرا چکی ہیں؟" مگر پھر گل رُخ نے سوچا
کہ جنگلی بلا نیک، تندرست اور خوبصورت ہے
آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ بے چارے کو
کھیتوں اور جنگلوں میں رہ کر کچھ سیکھنے کا موقع
نہیں ملا ہے۔ اگر اسے لے جاکر شہر میں رکھا
جائے اور سکھایا پڑھایا جائے تو بڑا قابل بن
جائے گا۔ شہزادی کی سہیلی کا بلا جس کے ساتھ
میری منگنی ہوئی ہے امیروں کی صحبت میں
رہ کر مزاج کا خراب، آرام طلب اور کاہل
ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر گل رخ نے نرمی کے
لہجہ میں مگر شرارت سے کہا "شادی کرنے
میں تو کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں تمہارے
ساتھ شادی کرسکتی ہوں مگر تم تو نرے گنوار
ہو۔ تمہاری بھونڈی حرکتیں دیکھ کر میری شہزادی
ایک دن بھی تمھیں اپنے پاس نہ رہنے دیں گی"
جواب معقول تھا۔ بلے کو کچھ کہتے بن نہ پڑا
بلکہ ندامت سے گردن جھکالی۔ کچھ دیر کے بعد
اتنا پوچھا "تو پھر ہماری شادی نہیں ہوسکتی؟"
گل رُخ نے جواب دیا "ایک شرط پر ہوسکتی
ہے۔ اگر تم تمیز و تہذیب سیکھ لو" بلے نے
مایوسی سے کہا "کیسے سیکھوں، یہ باتیں سکھلانے
والا یہاں کون ہے!" گل رخ بولی "اگر تم وعدہ
کرو کہ جو میں کہوں اس پر عمل کروگے اور
اچھی اچھی باتیں دل لگا کر سیکھوگے۔ تو میں
تمھیں اپنے ساتھ لے چلوں۔ ہماری شہزادی
جانوروں پر بہت مہربان ہیں۔ تم سے ناراض
نہ ہوں گی تھوڑے دنوں کے بعد جب تم
ایک اچھے اور تمیز دار بلے بن جاؤگے تو
میں شہزادی سے کہہ کر تمہارے ساتھ
شادی کرلوں گی" یہ رائے بلے کو پسند

آئی اور وہ گل رخ کے ساتھ چلا گیا۔

تم جانو! محنت سے ہر مشکل آسان ہوجاتی ہے اور کوشش سے ہر کام پورا ہوتا ہے تو بس، چند دنوں کی محنت اور کوشش سے وہ جنگلی بلاّ بڑا تمیز دار، مہذب اور اچھا بن گیا۔ گل رخ نے اس کے ساتھ شادی کری اور دونوں ہنسی خوشی شہزادی کے پاس رہنے لگے۔

خورشید اور صندل

خورشید　آ آ صندل دودھ پلاؤں　　بسکٹ میٹھا تجھ کو کھلاؤں
جھو جھو جھولا تجھ کو جھلاؤں　　تھپک تھپک کر تجھ کو سلاؤں

صندل　خورشید بیگم آتا ہوں میں　　آپ کا ہی گن گاتا ہوں میں
ماؤں ماؤں ماؤں ماؤں

خورشید　آ آ تیرا بیاہ رچاؤں　　ننھی سی ایک دلہن لاؤں
چاٹ اور مکھن اس کو چٹاؤں　　تجھ کو تازہ دودھ پلاؤں

صندل　پیاری بیگم آتا ہوں میں　　گیت تمہارا گاتا ہوں میں
پاؤں میں لوٹوں دم کو ہلاؤں　　گیت پیارے پیارے سناؤں
ماؤں ماؤں ماؤں ماؤں

خورشید　آ آ صندل دھوم مچائیں　　کھیلیں کودیں مل کر گائیں
تتلی پکڑیں پھول سنگھائیں　　پھولوں کی ایک گینڈ بنائیں

صندل　پیاری بیگم آتا ہوں میں　　گینڈ اٹھا کر لاتا ہوں میں
حکم کے ملتے گینڈ اٹھاؤں　　نغمۂ الفت اپنا گاؤں
ماؤں ماؤں ماؤں ماؤں

مولوی علیم الدین صاحب بیرنگ ہاشمی

بچوں کی نظمیں

مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی اصلاح کے بعد

طوطا ہم نے ایک خریدا — اس کو اک پنجرہ میں ڈالا
رنگت اس کی پیاری پیاری — ہو جیسے پھولوں کی کیاری
گلے میں اس کے نازک کنٹھی — کتنی اچھی ہے وہ لگتی
سبز پری کہتے ہیں اس کو — نام ہے اس کا کتنا پیارا
آنکھیں ہے وہ کیسی پھراتا — مجھ کو ہے وہ دل سے بھاتا
ٹیں ٹیں کرکے ہے چلاتا — دن بھر ہے وہ شور مچاتا
دیتی ہوں جب پھل کا ٹکڑا — پنجے سے ہے اپنے اٹھاتا
صبح سویرے اٹھتا ہے وہ
حمد خدا کی کرتا ہے وہ

(فہیم جہاں بیگم قزلباش) عمر ۷ سال (آگرہ)

ننھے! کس کو تکتے ہو — پر کچھ کہہ نہیں سکتے ہو
آؤ بتلاؤں ہے کیا؟ — گول سے یہ چہرے والا
چندا ماموں نام ان کا — روشنی دینا کام ان کا
جگ کو روشن کرتے ہیں — نور سے دنیا بھرتے ہیں
ننھے! بتلاؤ تو بھلا — میں نے تمھیں کیا سمجھایا
تم تو انگوٹھا چوستے ہو
میری بات کو کیا سمجھو

محمد اکرام۔ لاہور

تجھ سے وابستہ ہے ہر کام پیام تعلیم
تو جب آتا ہے تو ہم عید سمجھتے ہیں وہ وقت
تیرے مضمون انوکھے تیرے قصے دلچسپ
تو ہے تعلیم کی ترغیب دلانے والا
اتنی دلچسپیاں اور قیمت سالانہ کم
سال نو خیر سے آغاز ہوا ہے تیرا
ہے حبیبہ کی دعا حق سے کہ دنیا بھر میں

ہے بہت خوب ترا نام پیام تعلیم
رات ہو صبح ہو یا شام پیام تعلیم
کیوں نہ دنیا ہو تری رام پیام تعلیم
دل کا ہم سب کے ہے آرام پیام تعلیم
مجھ سے پوچھو تو ہے بے دام پیام تعلیم
خیر کے ساتھ ہوا انجام پیام تعلیم
خوب روشن ہو ترا نام پیام تعلیم

حبیبہ خاتون۔ بدایوں

یہ کس شوکت سے نکلا سالنامہ بھائیو اب کی
وہ نظمیں اور قصے ہیں جنھیں تم پڑھ کے خوش ہوگے
پیامی بھائیو! تم سب خوشی سے ناچنے لگنا
لطیفے بھی سنا کر اباجی کو تم ہنساؤ گے
یہی اس قادر مطلق سے ہے عالم دعا اپنی

کہ دیکھو جس طرف بھی اس طرف ہی دھوم ہے اسکی
جو آئیں گے عزیز اور دوست ان سب کو دکھاؤ گے
شفیع صاحب کی نظمیں آئیں گی اس میں اہاہاہا
کبھی وہ مسکرائیں گے کبھی تم کھل کھلاؤ گے
ترقی اس کی ہو دائم ہمیشہ خوش رہیں پیامی

عالم وارثی کانپور

ایک لڑکا تھا بھولا بھالا
گھر بھر میں تھا سب کو دلارا
مدرسے اپنے شوق سے جاتا
اچھی طرح ہر چیز کو رکھتا
اپنے بڑوں کا ادب وہ کرتا
جھوٹی باتیں کبھی نہ کرتا
سب ہی سے ہمدردی رکھتا
سب کہتے وہ جہاں بھی جاتا

ننھا منا پیارا پیارا
ماں اور باپ کی آنکھ کا تارا
پڑھ کے گھر میں خوش خوش آتا
استادوں کی بات وہ سنتا
چھوٹوں سے بھی محبت رکھتا
سچ وہ ہمیشہ بولا کرتا
کام سبھی کا شوق سے کرتا
ہے یہ بچہ کیسا پیارا

آسودہ بیگم حیدرآباد دکن

چلو آؤ سب مل کے یہ گیت گائیں
زمیں پر چلی ہیں معطر ہوائیں
نہ ہوں رنجشیں دل میں پیدا کسی کے
ہنود اور مسلم ہیں سب بھائی بھائی

نیا سال آیا ہے خوشیاں منائیں
فلک پر اٹھی ہیں خوشی کی گھٹائیں
محبت کی گنگا میں چل کر نہائیں
ہیں جھگڑے جو آپس کے ان کو مٹائیں

وطن کی محبت کا نغمہ سنائیں
نیا سال آیا ہے خوشیاں منائیں

یہ چاند اور تارے سنہری ضیائیں
چلو ایسی فطرت کی رنگین فضائیں
یہاں ایک محبت کا مندر بنائیں

گلوں کی وہ بستی میں رنگیں فضائیں
محبت کی چھوٹی سی دنیا بنائیں
محبت کے گانے سبھی کو سنائیں

وطن کی محبت کا نغمہ سنائیں
نیا سال آیا ہے خوشیاں منائیں

اسد حسین پٹنہ

جاگو اور جگاؤ

سارا عالم جاگ رہا ہے
تم بھی دوڑے جاؤ
قوم کا بیڑا غرق نہ کرنا
سوئے بہت اٹھ جاؤ
ملک کی خاطر کام کرو کچھ
قوم کو اپنی بچاؤ
اٹھنے میں اب دیر کرو گے
وقت ہے کم آ جاؤ
مغنی کا پیغام یہی ہے
ملک کے کام بناؤ

سوئے ترقی بھاگ رہا ہے
جاگو اور جگاؤ
رسوا نام شرق نہ کرنا
جاگو اور جگاؤ
پیدا جہاں میں نام کرو کچھ
جاگو اور جگاؤ
تو گویا اندھیر کرو گے
جاگو اور جگاؤ
چین یہی آرام یہی ہے
جاگو اور جگاؤ

سید محمد عبدالمغنی۔ اجمیر
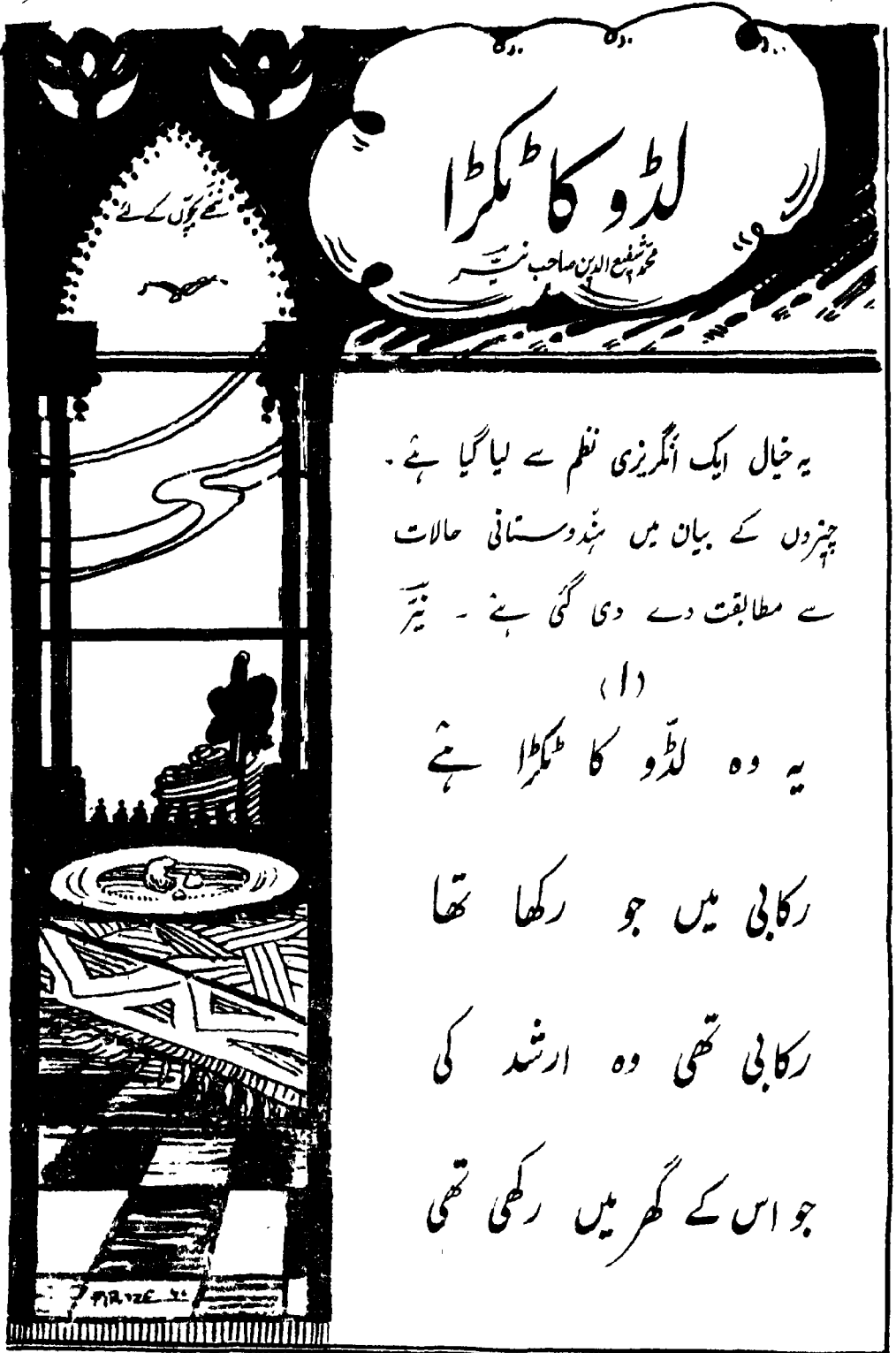
لڈو کا ٹکڑا

محمد شفیع الدین صاحب نیر

یہ خیال ایک انگریزی نظم سے لیا گیا ہے۔ چیزوں کے بیان میں ہندوستانی حالات سے مطابقت دے دی گئی ہے۔ نیرؔ

(۱)

یہ وہ لڈّو کا ٹکڑا ہے

رکابی میں جو رکھا تھا

رکابی تھی وہ ارشد کی

جو اس کے گھر میں رکھی تھی
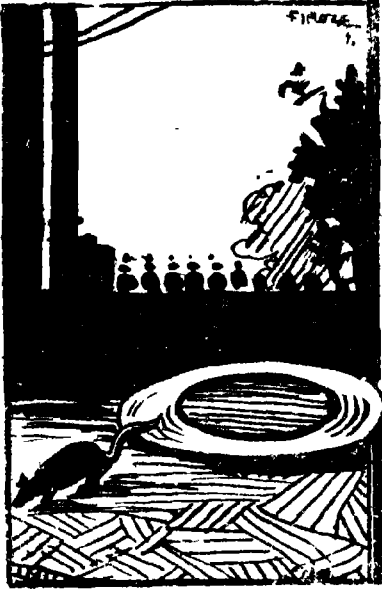
(۲)

یہ چوہا جو یہاں آیا
ذرا دل میں نہ شرمایا
اِسی نے کھا لیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

(۳)

یہی بلّی ہے وہ خالا
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ذرا دل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

(۴)

یہ دیکھو ہے وہی کُتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا
وہی بلّی جو ہے خالا
کہ جس نے چوُہے کو مارا
وہ چوُہا جو یہاں آیا
ڈرا دل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھّا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اس کے گھر میں رکھی تھی

(۵)

یہ ہے کس شخص کا بکرا؟
کہ جس نے کُتّے کو مارا
وہی کُتّا وہی کُتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا
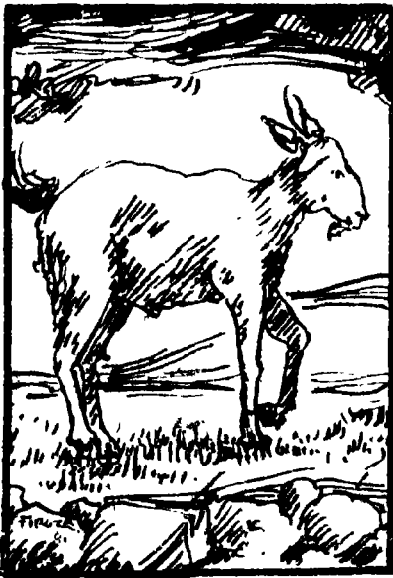
وہی بلّی جو ہے خالا
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ڈرا دل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اس کے گھر میں رکھی تھی

(٦)

گڈریے کا یہ ہے لڑکا
یہ لڑکا ہے بہت اچھا
اسی کا تو وہ بکرا تھا
کہ جس نے کتّے کو مارا
وہی کتّا وہی کتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا

وہی بلّی جو ہے خالا

کہ جِس نے چوُہے کو مارا

وہ چوُہا جو یہاں آیا

ڈرا دِل میں نہ شرمایا

اُٹھا کر کھا گیا ٹُکڑا

رکابی میں جو رکھّا تھا

رکابی تھی وہ ارشد کی

جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

(۷)

یہی تو گھر ہے لڑکے کا
جو لڑکا ہے گڈریے کا
اسی لڑکے کا تھا بکرا
کہ جس نے کُتّے کو ڈانٹا
وہی کُتّا وہی کُتّا
کہ جس نے بلّی کو گھیرا
وہی بلّی جو ہے خالا
کہ جس نے چوہے کو مارا
وہ چوہا جو یہاں آیا
ڈرا دل میں نہ شرمایا
اُٹھا کر کھا گیا ٹکڑا
رکابی میں جو رکھا تھا
رکابی تھی وہ ارشد کی
جو اُس کے گھر میں رکھی تھی

پرندوں کا سفر
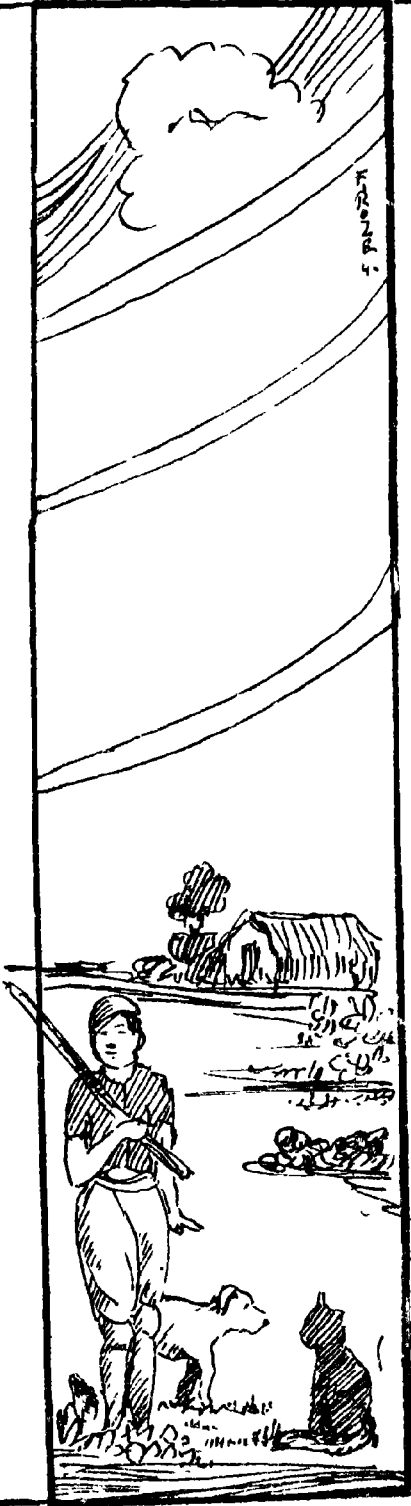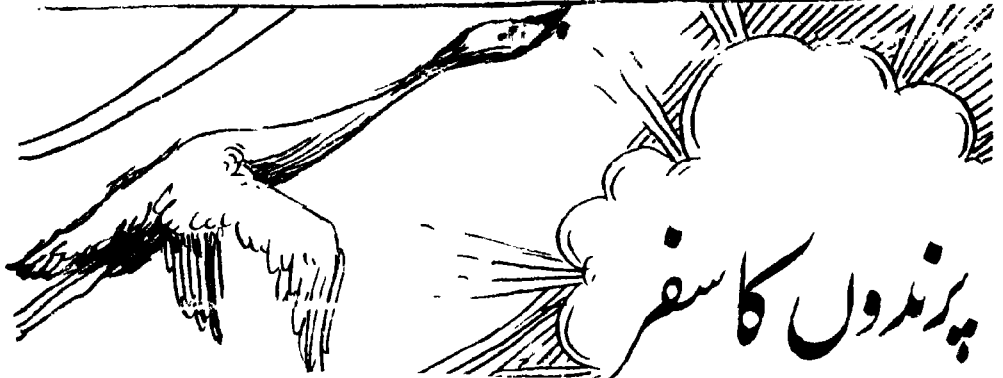
ورزش اور چہل قدمی کے فائدوں سے بھلا کون انکار کرسکتا ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ عادتیں بڑھتے بڑھتے مرض کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ ہمارے دوست ہاشمی صاحب بھی کچھ اسی طرح کے مریض ہیں۔ دفتر کے کام کے علاوہ ان کے بس دو ہی مشغلے ہیں۔ پرندوں پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا اور ٹہلنے کے لئے دور دور نکل جانا۔ اکثر مجھ پر بھی کرم فرماتے ہیں۔ ان کے ساتھ ٹہلنے میں ایک بات ضرور ہے، چاہے کتنے دور چلے جائیے۔ تھکن نہیں معلوم ہوتی۔ باتیں ایسی دلچسپ اور چٹخارے دار کرتے ہیں کہ آدمی کا دھیان بٹا رہتا ہے۔

ایک دن ہم ٹھنڈی سڑک پر ٹہلنے گئے۔ باتیں کرتے کرتے دور نکل گئے۔ ہاشمی صاحب نے کہا "چلو سامنے کی پہاڑی پر بیٹھ کر ذرا دم لے لیں پھر واپس چلیں"۔ جب ذرا دھندلکا سا ہوا تو ہم واپس چلنے کے لئے تیار ہوئے اتفاق سے اس وقت میری نظر اوپر اُٹھ گئی۔ پرندوں کے غول کے غول ایک طرف کو اُڑے چلے جارہے تھے۔ میں نے کہا "دیکھئے اس وقت شفق پھول رہی ہے سامنے دُھندلی دُھندلی دلّی کی جامع مسجد نظر آرہی ہے ایسے میں ان چڑیوں کا اُڑنا کیسا اچھا لگ رہا ہے۔"

ہم دونوں بڑی دیر تک نظر جمائے اُنھیں دیکھتے رہے۔ آہستہ آہستہ وہ نظروں سے غائب ہونے لگیں اور آخر میں بس ایک دُھندلا سا نشان باقی رہ گیا۔ میں نے کہا "ہاشمی صاحب چلئے اب واپس چلیں، دیکھئے پرندے بھی بسیرا لینے کے لئے اپنے ٹھکانوں پر جارہے ہیں۔" ہاشمی صاحب اس وقت کچھ گم صم کھوئے ہوئے تھے میری بات سن کر چونکے اور چلنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے پہاڑی سے نیچے آکر کہنے لگے "یہ پرند اس وقت بسیرا لینے نہیں جارہے ہیں بلکہ سفر میں ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں برسات ختم ہوگئی ہے۔ جاڑے کا موسم شروع ہونے والا ہے اس وقت بہت سے پرند ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جاتے ہیں۔ یہ آمد ورفت موسموں کے لحاظ سے برابر جاری رہتی ہے۔" میں نے کہا "اتنا تو میں نے بھی سُنا ہے کہ بعض موسموں میں چڑیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جاتی ہیں۔ مگر بس اتنا ہی جانتا ہوں اس سے زیادہ نہیں"

کہنے لگے "جی ہاں دن بھر بیٹھے گپ ہانکنے سے وقت تو بے شک اچھا گذر جاتا ہے مگر اس میں تھوڑا سا نقصان ہے اور وہ یہ کہ آدمی ذرا جاہل رہ جاتا ہے۔ ارے بھئی مؤسم بدلتے وقت پرند تو پرند اکثر چوپائے اور مچھلیاں تک ایک جگہ سے دوسری جگہ چلی جاتی ہیں۔ مثلاً سیل مچھلی سردیوں کے مؤسم میں پری بی لوف (PRIBILOF) جزیروں سے بیرنگ سی (BERING SEA) میں جنوبی کیلی فورنیا تک چلی جاتی ہے۔ قطبی ہرن یا رینڈیر اسی مؤسم میں چارے اور گل مہندی اور صنوبر کے سایے کی تلاش میں جنوب کی طرف برٹش امریکہ کے اندرونی حصے تک پہنچ جاتے ہیں۔ شاڈ (SHAD) اور سالومن (SALMON) مچھلیاں محض انڈے دینے کے لئے سمندری دریاؤں تک سینکڑوں میل کا سفر کرتی ہیں۔ اسی طرح ٹڈے اور بعض قسم کی تتلیاں دُور دُور کا چکر لگاتی ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی یہاں تک کہ انسان بھی سیاحت اور سفر میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔" میں نے کہا "ہاشمی صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ انسانوں نے دُنیا کے چکر لگائے ہیں ساری دُنیا کے بھلا اُن کا اور پرندوں کا کیا مقابلہ" ہاشمی صاحب بولے "جی ہاں یہ صحیح ہے لیکن ذرا اِس پر بھی تو غور کیجئے کہ انسان یہ سفر دوسروں کی مدد کے بغیر نہیں کرسکتا۔ وہ زمین یا میدان پر جہاں چاہے جاسکتا ہے۔ مگر جتنا فاصلہ وہ دنوں میں طے کرے گا چڑیاں اتنی دُور ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گی۔ پھر سمندر کے سفر کے لئے انسان کو کشتی یا جہاز کی ضرورت ہوگی۔ راستہ معلوم کرنے کے لئے قطب نما اور نقشے ساتھ لینا ہوں گے۔ مسافروں اور جہازرانوں کے لئے کھانے پینے کا ذخیرہ رکھنا ہوگا۔"

لیکن سفر کرنے والے پرندے اس قسم کی مدد سے بے نیاز ہیں۔ اُن کے پاس ریل ہے، نہ موٹر، نہ جہاز، وہ اپنے ساتھ نہ نقشے رکھتے ہیں نہ قطب نما۔ باوجود اس کے وہ دنیا کے بعض ایسے حصوں میں آسانی سے پہنچ جاتے ہیں جہاں انسان کو پہنچتے پہنچتے برسیں لگ جائیں۔ بلکہ وہ تو ایسی جگہوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں جو انسان کے لئے ابھی تک نامعلوم ہیں۔

آپ نے قطب شمالی کی مہموں کا حال تو پڑھا ہوگا۔ کن مشکلوں سے انسان برف کے بہتے ہوئے تودوں کے درمیان راستہ بناتا ہے۔ کبھی کبھی تو آگے بڑھنا قریب قریب ناممکن ہوجاتا ہے۔ پھر برف کے پہاڑوں سے ٹکرانے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے اور جس وقت یہ انسان اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آگے کی طرف راستہ نکالنے میں لگا ہوتا ہے، مرغابیاں آسمان میں اس کے سر پر بڑے اطمینان سے بغیر پر ہلائے سفر کرتی یا ہوا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

پینگن (ایک بحری پرندہ) قطب جنوبی کے سمندر میں بڑے مزے سے تیرتا ہے اور جہاں اُسے برف کی وجہ سے سطح پر راستہ نہیں ملتا وہ پانی کے اندر غوطہ لگاتا ہے

پانی کی سطح کے مقابلے میں پانی کے اندر وہ زیادہ تیزی اور زیادہ آرام کے ساتھ سفر طے کرتا ہے، بالکل جیسے پر والی آب دوز کشتی۔

پہاڑوں کی بہت سی چوٹیاں اتنی اونچی اور اس قدر ڈھلواں ہیں کہ اب تک انسان کے قدم وہاں تک نہیں پہنچ سکے ہیں لیکن پرند ان پر بیٹھ کر گویا اپنے سفر کی تھکن دور کرتے ہیں بلکہ وہ ان سے بھی اوپر۔ کہیں بلندی پر اُڑتے ہیں۔ کہئے اب تو آپ کو یقین ہو گیا کہ چڑیاں دنیا میں سب سے زیادہ ہوا باز بلکہ سب سے زیادہ سفر کرنے والی ہیں انسان بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

میں نے عرض کیا " لیکن قبلہ ایک بات تو بتائیے انسان کا معاملہ تو یہ ہے کہ یا تو وہ خود سفر کرتا ہے۔ اس سے اسے نئے نئے تجربے نئی نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نئے نئے منظر دیکھنے میں آتے ہیں نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے یا پھر وہ سیاحوں کے سفر نامے پڑھتا ہے۔ مگر چڑیاں اپنے سفر کے متعلق ڈائری لکھ سکتی ہیں نہ کتابیں۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ انسان ان کے سفر کا حال معلوم کرنے کے لئے ہوائی جہاز ہی پر بیٹھ کر سہی، ان کے پیچھے پیچھے پھرے پھر آخر یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوتی ہیں۔" ہاشمی صاحب ہنس کر کہنے لگے " واہ بھائی اب تو آپ عقل کی باتیں کرنے لگے۔ بھائی صاحب خدا کے بہت سے بندوں نے پرندوں کے مختلف حالات معلوم کرنے کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ ان میں سے کچھ تو پرندوں کی غذا کی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ کچھ ان کی گھونسلا بنانے کی عادت کی اور کچھ ان کے سیر و سفر کی۔

یورپ میں بہت سے لوگ برسوں سے اس طرح کی چھان بین کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے محض اِسی لئے جنوب کا سفر کیا ہے جو بہت سے پرندوں کا یوں سمجھئے کہ گرمی کا وطن ہے۔ وہ شمال کی طرف گئے ہیں جو ان کا موسم سرما کا وطن ہے۔ اُنھوں نے ان پرندوں کو اِدھر اُدھر سفر کرتے دیکھا ہے اور دم لینے کے لئے جہازوں پر بیٹھتے دیکھا ہے۔ اُنھوں نے سمندر کے چھوٹے چھوٹے جزیروں پر اُنھیں غذا کی تلاش میں رکتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر اُنھیں رات میں سفر کرتے دیکھا ہے اور جناب والا یہ تجربے ان تحقیق کرنے والوں نے کتابوں میں لکھے ہیں اور یہ کتابیں مجھے دیکھنے کا موقع ملا ہے ...."

ہم دونوں اس گفتگو میں محو بڑی تیزی سے قدم بڑھا رہے تھے۔ اتنے میں ہاشمی صاحب کا گھر آگیا مجھے بھوک لگ رہی تھی اس لئے آگے بڑھ گیا۔ ہاشمی صاحب کو اور کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا میں ذرا دور نکل گیا تو ہاشمی صاحب چلّا کر بولے "کل اسی موضوع پر ہماری آپ کی پھر گفتگو ہوگی اور میں آپ کو پرندوں کے سفر کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتاؤں گا۔ مثلاً پرندے کس طرح سفر کی تیاری کرتے ہیں کہاں جاتے ہیں اور کب جاتے ہیں۔ کس طرح اپنا راستہ تلاش کرتے ہیں اور اپنی منزل پر پہنچ کر وہاں کس طرح رہتے سہتے ہیں۔ میں نے وہیں سے جواب دیا " ضرور۔ مجھے بھی اب دلچسپی پیدا ہو گئی ہے" اس پوری گفتگو کو آپ سالگرہ نمبر میں دیکھیں گے میری طرح پیامیوں کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی تو ہماری آپ کی تمام بات چیت پیام تعلیم میں چھاپ دی جائے گی۔ اچھا آداب عرض۔

منظر

دریا کا کنارہ ہے۔ ایک طرف ایک مربع میں خیمے لگے ہوئے ہیں۔ کیمپ کے بیچوں بیچ صحن میں ببول کا ایک پیڑ ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر آگ روشن ہے۔ آگ کے گرد کچھ اسکاؤٹ اپنے ایک استاد کے ساتھ تفریح کی باتوں سے دن بھر کی تکان اُتار رہے ہیں۔ آسمان تاروں سے جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔

غوث :(تاروں کی طرف کھوئے ہوئے سے عالم میں دیکھتے ہوئے) ماٹ صاحب! اگر مجھے کوئی جادو کا گھوڑا مل جائے تو ایک ایک کرکے اِن سارے ستاروں کی سیر کر ڈالوں۔

سکندر :(ناک سے آواز نکالتے ہوئے) لو بھئی لو، انھیں تو بڑی دور کی سوجھی۔ اتنی جلدی دُنیا سے گھبرا گئے۔ (سب قہقہہ لگاتے ہیں)۔ ارے تم سب ہنستے کس بات پر ہو۔ ٹھیک تو کہہ رہا ہوں۔

غوث :۔ دیکھو سکندر ہر وقت کا مذاق ٹھیک نہیں
تم نہیں جانتے میری عادت بہت بُری ہے

سکندر :۔ یہ تو خوب جانتا ہوں کہ تمھاری عادت کتنی بُری ہے۔ تمھاری عادت کو ہم ہی نے بگاڑا ... رہیں زمین پر خواب دیکھیں تاروں کے۔ ماٹ صاحب ...... آپ انھیں سبز پری والا جادو کا گھوڑا ابھی منگوا دیجئے۔

اُستاد :۔ بھائی مشکل تو یہی ہے کہ آخر غوث میاں کو کون سی سواری دی جائے کہ وہاں تک پہنچ جائیں۔

مشکور :۔ (جلدی جلدی آنکھیں مچکاتے ہوئے۔) صاحب اِن کے لئے ایروپلنگ کا انتظام کر............

(سب کے سب ہنس پڑتے ہیں۔ ایک آواز۔ بھائی یہ ایروپلنگ خوب ہے اسے ضرور حاصل کرو۔ (مشکور جھینپ گئے۔ وہ ایروپلین (ہوائی جہاز) کہنا چاہتے تھے)

اخلاق :۔ (استاد کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔)
ماٹ صاحب! تو آپ کی بات تو رہی جا رہی ہے!
(سب خاموش ہو جاتے ہیں)۔ ہاں ماٹ صاحب۔
استاد :۔ بھئی مشکور۔ تمھارے ہوائی جہاز سے کام نہیں چلے گا۔
پیچھے سے ایک آواز :۔ ایروپلنگ کی اردو ہوائی جہاز۔ نوٹ فرمالیں لوگ (قہقہہ۔)
اخلاق :۔ (پھر ہاتھ اٹھاتے ہوئے) ارے برادر! ذرا چپ بھی رہو گے نہیں ..... احمد شاہ! بھائی تمھیں بہت تخول سوجھ رہا ہے۔
استاد :۔ ہوائی جہاز کی رفتار قریب قریب ۵۰۰ میل فی گھنٹہ ہے۔
جمیل :۔ اُف او۔ ماٹ صاحب، تو پھر کیا مشکل ہے تاروں تک پہنچنا۔
استاد :۔ بات یہ ہے جمیل میاں کہ ستارے ہم سے اس قدر دور ہیں کہ اگر تم پیدا ہوتے ہی تیز سے تیز رفتار جہاز میں سوار ہو کر ستاروں کی طرف اڑنے لگے۔ تو تمھارا بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا اور موت۔ کی ساری منزلیں راستے ہی میں ختم ہو جائیں اور پھر بھی تم سب سے قریب کے ستارے تک بھی نہیں پہنچ سکتے۔
احمد، غوث، رٹ فرمایا؟
غوث :۔ ارے ۔ بھئی جہاز نہ سہی تو اور کوئی سہی ماٹ صاحب ابھی بتائیں گے۔
اُستاد :۔ کائنات میں سب سے زیادہ تیزی سے سفر کرنے والی چیز روشنی ہے۔
صمد :۔ ارے! ماسٹر صاب! کیا رفتار ہوگی اس کی؟
استاد :۔ اس کی رفتار ہے ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ۔
مشکور :۔ اوں ہوں۔ ایک لاکھ۔ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ۔
ایک نامعلوم آواز :۔ پھر بولے!
جمیل :۔ تو روشنی کے ذریعے اگر کوئی انتظام کیا جائے تو تو ہم تاروں کی دنیا تک چند منٹوں میں پہنچ جائیں گے۔
غوث :۔ اور کیا۔
استاد :۔ ویسے ہی کہہ دیا اور کیا۔ ستارے ہم سے کس قدر دور ہیں۔ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ہم سے سب سے قریب کا جو ستارہ ہے اس کی روشنی کو ہم تک پہنچنے میں ۴ سال ۴ مہینے لگتے ہیں۔
صمد :۔ اس ستارے کا نام کیا ہے، ماس صاب؟
استاد :۔ بھئی اس کا نام ہے (ALPHA CENTAURI)
احمد :۔ اس کا اردو میں کیا نام ہے۔ صاب؟
استاد :۔ بھئی ہمیں تو یہی انگریزی کا نام معلوم ہے

ہاں عربی میں اسے رجل القنطورس کہتے ہیں۔
مشکور:۔ (آسمان پر نظر ڈالتے ہوئے) یہ کون سا ستارہ ہے۔ ماٹ صاحب؟
اُستاد:۔ یہ ستارہ زمین کے شمالی نصف میں نظر نہیں آتا۔ اس سے بعد کا جو قریبی ستارہ ہے اس کی روشنی کو ہم تک آنے میں ۹ سال لگتے ہیں اس کا نام سری اس SRIUS یا DOG STAR ہے۔ عربی میں اسے شعرائے یانی کہتے ہیں۔
اخلاق:۔ اور سورج کی روشنی ماٹ صاحب؟
اُستاد:۔ سورج کی روشنی تو ہم تک صرف ۸½ منٹ میں آ جاتی ہے۔
اعجاز:۔ DOG STAR سے دور تو اور بہت سے ستارے ہوں گے۔
اُستاد:۔ ہاں ستارے تعداد میں تو اتنے ہیں کہ ابھی تک اُن کا شمار نہیں ہو سکا ہے۔ ۶۰۰۰ ستارے تو بغیر دوربین کی مدد کے دیکھے جا سکتے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ دوربین کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ستارے گن لئے جائیں۔
غوث:۔ دوربین سے گننا کون سی مشکل ہے سب دکھائی دیتے ہوں گے اس میں تو۔
اُستاد:۔ دوربین کی جیسے جیسے طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ اتنے ہی زیادہ ستاروں کے متعلق معلومات بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔
صمد:۔ تو ماٹ صاحب اب تک کتنی طاقت کی دوربین بن چکی ہے۔
اُستاد:۔ امریکہ میں رصدگاہ وِسن کی دوربین دُنیا کی سب سے بڑی دوربین ہے۔ اس کے شیشے کا قطر ۱۰۰ انچ کا ہے۔ اس دوربین سے ایک ارب پچاس لاکھ ستاروں کی تصویریں لی جا چکی ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ اب ایک ایسی دوربین بنائی جائے جس کے شیشے کا قطر ۲۰۰ انچ ہو۔
مشکور:۔ یہ ستارے بھی چاند کی طرح کیا سورج کی روشنی سے چمکتے ہیں؟
اُستاد:۔ نہیں، بلکہ ہر ستارہ اپنی جگہ ایک سورج ہے۔ سری اس (شعرائے یانی) کی روشنی تمھارے سورج سے ۳۰ گنا زاید ہے۔
غوث:۔ اوہ! معلوم یہ ہوا ماسٹر صاحب کہ ہماری زمین، ہمارا چاند اور ہمارا سورج تو کائنات میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے۔
استاد:۔ اس میں کیا شک ہے، ہماری دُنیا تو ریگستان میں ریت کے ذرّے کی طرح ہے۔ کائنات کی حدیں کہاں ختم ہوتی ہیں، یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ ریڈیو پر آواز انگلستان سے آسٹریلیا صرف ⅛ سکنڈ میں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اکثر ستاروں سے

بھیجا ہوا ریڈیو کا پیغام ہم تک ہزاروں برس میں بھی تو نہیں پہنچے گا۔

جمیل:۔ ماسٹر صاحب وہ ستارہ ان میں سے کون سا ہے جس سے سمتیں معلوم کرتے ہیں۔

احمد:۔ لو دیکھو، بھائی کو ابھی تک قطب تارہ بھی معلوم نہیں۔

حسن:۔ (طنز کے ساتھ) اچھا تو تم ہی بتا دو نا شاہ صاحب!

(احمد شاہ نے جھینپتے ہوئے انداز میں آسمان پر نظر دوڑائی۔ ان کے ساتھی مذاق میں اِدھر اُدھر یوں ہی انگلی اٹھا دیتے اور چاہتے "وہ رہا قطب تارہ!" جھ کوئی دوسرا کہتا "نہیں وہ نہیں یار۔ وہ ہے۔ وہ دیکھو وہ!"

استاد:۔ بھئی سنئے! وقت تھوڑا ہے۔ رخصت کی سیٹی بج گئی تو یہ بات رہ جائے گی۔

حسن:۔ احمد شاہ بھائی تمھیں جو سوجھتی ہے، ایسی ہی سوجھتی ہے۔ کیا کچھ اب بھی چڑھی ہوئی ہے۔

(اس آخری فقرے پر سب ہنس دیتے ہیں۔ کیوں کہ احمد شاہ نے پچھلی کیمپ فائر التفریح کے وقت، میں چرس پینے والے جوگی کا پارٹ کیا تھا۔)

استاد:۔ ذرا چپ بھی ہو جاؤ۔ دیکھو آسمان پر سرکے اوپر ایک سرے سے دوسرے سرے تک نظر ڈالو تمھیں چار ستارے اس شکل میں نظر آئیں گے دیکھو اس طرح (زمین پر انگلی سے نقشہ بناتے ہوئے)

```
*  ........  *
.            .
.            .
.            *
 *
```
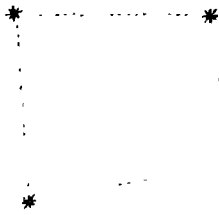
ایک آواز:۔ ارے یہ تو دکھ گیا ماسٹر صاحب، وہ رہا ایک کھٹولا سا!

اخلاق:۔ (پھر ایک طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔) اب کھڑے اور بڑبڑ نہ کرتے رہو جو ماسٹر صاحب کہہ رہے ہیں اُسے سن لو۔

استاد:۔ اچھا اس کھٹولے کے ایک پائے کی طرف تین تارے اور ہیں۔ دیکھو

```
*     *
        *      (دب اکبر)        *
*   .  *   *
              *
```
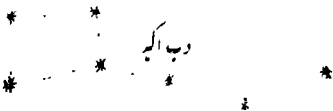
کئی آوازیں ایک ساتھ:۔ ارے ماسٹر صاحب وہ تو یہ رہے۔ یہ رہے۔ ہاں بھئی یہ ہیں۔

استاد:۔ اب اس کے دوسرے پائے کی سیدھ میں نظر ڈالو۔ ارے یہ دیکھو، یہ

یہ ہے قطب تارہ

دُب اکبر
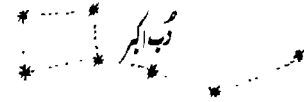
قطب تارا

ایک آواز :- جمیل میاں دکھائی دیا۔
جمیل :- بھائی شاہ صاحب سے پوچھو۔
صمد :- اس کا ڈھونڈنا تو بڑا آسان ہے۔
استاد :- ہاں یہ تارہ ہمیشہ قطب شمالی کی طرف ہوتا ہے۔ اور اسی سے شمال کی سمت معلوم کی جاتی ہے۔ اور کھٹولے کے چار ستارے اور تین ستارے زنجیر بناتے ہوئے اس کے چاروں طرف گردش کرتے ہیں۔ لیکن قطب تارہ کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا۔ باقی سات تاروں کو "دُب اکبر" کہتے ہیں۔ اور قطب تارے کے ساتھ کبھی ان کی شکل یہ ہوتی ہے
(زمین پر انگلی سے شکل بناتے ہوئے۔)

قطب تارا

دُب اکبر

کبھی یہ

دُب اکبر

قطب تارہ

اور کبھی یہ
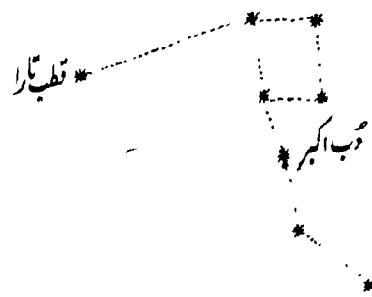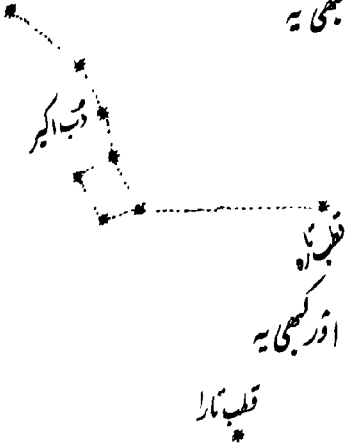
قطب تارا

دُب اکبر

قطب تارے کو ڈھونڈنے کی ایک اور آسان ترکیب یہ ہے کہ دُب اکبر سے مخالف طرف قطب تارے سے اتنے ہی فاصلے پر جتنے فاصلے پر اس سے دُب اکبر ہے ایک ستاروں کا بُرج اس شکل کا ہوتا ہے
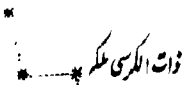
ذات الکرسی ملکہ

ایک آواز :- یہ تو ماسٹر صاحب (M یا W) کی شکل ہے۔
اُستاد :- ہاں بالکل یہی۔ اس کا نام ذات الکرسی ملکہ (CASSIOPEIA) ہے۔ اب دُب اکبر قطب تارہ اور ملکہ ذات الکرسی کا باہمی تعلق ان شکلوں سے اور

صاف ہو جائے گا۔

استاد :۔ اچھا بھائی۔

دُبِّ اکبر
قطب تارا
ملکہ ذات الکرسی
قطب تارہ
دُبِّ اکبر
ذات الکرسی
قطب تارہ
دُبِّ اکبر
دُبِّ اکبر
قطب تارہ

اعجاز :۔ یہ شکلیں تو بڑے کام کی ہیں۔ انھیں تو کاپی پر بنالیں گے۔

(ایک طرف سے سیٹی کی آواز آتی ہے۔)

احمد :۔ ارے ابھی سے ۹ بج گئے۔ گھڑی تو دیکھو کوئی۔

حسن :۔ ہاں بھئی ٹھیک نو بجے ہیں۔
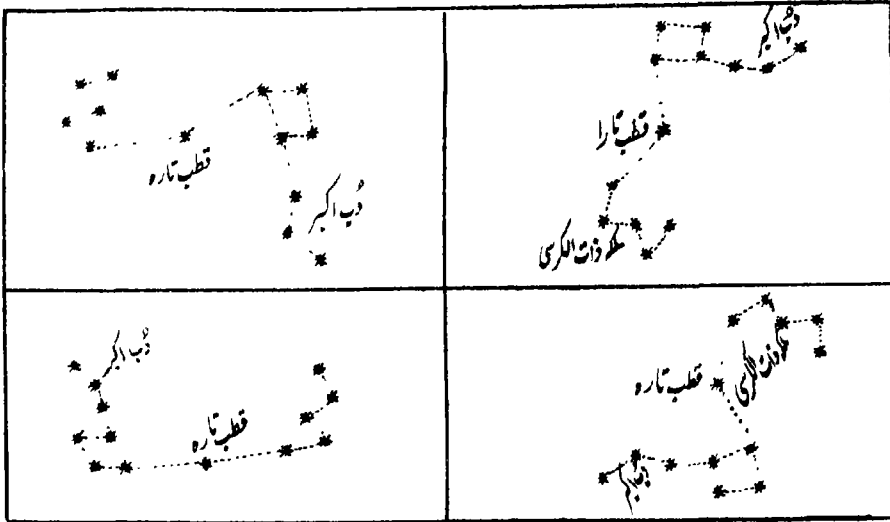
اخلاق :۔ ماسٹر صاحب، ذرا ایک دفعہ وہ تو ہو جائے...... وہ

اعجاز :۔ کیا کہا ......؟

سب ایک ساتھ بولتے ہیں۔ ہاں، ہاں ماسٹر صاحب، ضرور ہو گی ..... سب مل کر گاتے ہیں، کیا کہا ٹماٹر نے جب گیا......

اچھے شہری

جناب لطیف فاروقی صاحب ایڈیٹر سعادت

تارے چھپے نہ ہوں جب
اٹھ کر کریں دعائیں
بن جائیں اچھے شہری

اٹھیں سویرے ہم سب
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

دل میں نہ یہ کبھی ہو
اور لیں نہ بد دعائیں
بن جائیں اچھے شہری

تکلیف دیں کسی کو
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

اخلاق رکھیں اپنے
خوش خوش وہ پیش آئیں
بن جائیں اچھے شہری

خوش ہوں پرائے اپنے
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

ہم سے جسے بھی دکھ ہو
خلق اپنا یہ دکھائیں
بن جائیں اچھے شہری

کہہ دیں معاف کر دو
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

باتیں کہیں نہ جھوٹی
جھوٹی نہ قسمیں کھائیں
بن جائیں اچھے شہری

باتیں سہیں نہ جھوٹی
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

اپنوں سے ہو محبت
یوں سب سے لو لگائیں
بن جائیں اچھے شہری

غیروں سے ہو محبت
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

دل میں نہ ہو بڑائی
اکڑیں نہ سر جھکائیں
بن جائیں اچھے شہری

عاجز نہ دیں دکھائی
آؤ یہ گیت گائیں
بن جائیں اچھے شہری

ایک چرواہا چشمے کے پاس اُداس بیٹھا اپنا دُکھڑا رو رہا تھا، اپنی مصیبت اور ناقابلِ تلافی نقصان کی داستان سُنا رہا تھا۔ سبب یہ تھا کہ کچھ دن پہلے اس کا ایک پیارا بکری کا بچّہ دریا میں ڈوب کر مر گیا تھا۔ چرواہے کی داستان سن کر چشمہ غصّے سے سرسرانے لگا۔ اس نے کہا: "ارے لالچی دریا، کیا ہوتا اگر کہیں تیری تہہ ویسی صاف اور سب کی نظروں کے سامنے کھلی رکھی ہوتی جیسی کہ میری اور ہر شخص تیری گندلی تہہ میں ان تمام چیزوں کو دیکھ سکتا جنھیں تو اپنی ہوس میں نگل گیا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں تو شرم کے مارے زمین کے اندر گھس جاتا اور تاریک گہرائیوں میں اپنا مُنہ چھپا کر بیٹھ رہتا۔ مجھے پانی اسی افراط سے نصیب ہوا ہوتا جیسے کہ تجھ کو تو میں تو قدرت کا ایک زیور بن کر دنیا کو سجا دیتا۔ اور چھوٹی سی چھوٹی چیز کو کو نقصان نہ پہنچاتا۔ میرا پانی سنبھل سنبھل کر بہتا اور ہر جھونپڑی اور جھاڑ کو بچا کر نکل جاتا۔ وہ کنارے جنھیں چھوٹے چھوٹے دریا کاٹتے رہتے ہیں میرے گن گاتے۔ میں وادیوں اور چراگاہوں کو سرسبز کرتا اور ان کی ایک سوکھی پتی کو بھی بہا نہ لے جاتا! مختصر یہ کہ میں بھلائی کرنے والوں کی راہ پر چلتا، کسی کو دُکھ پہنچاتا نہ نقصان، اور میرا پانی سمندر میں گرتا تو ایسا چمکیلا ہوتا جیسے چاندی"۔

چشمے نے زبان سے یہ سب کہا: اور اس کے دل میں بھی یہی بات تھی۔ پھر ہوا کیا؟ اس بات کو کچھ ہفتے بھی گزرے تھے جب ایک طوفانی بادل قریب کے کسی پہاڑ پر برس پڑا چشمے میں پانی کی ویسی ہی افراط ہو گئی جیسی کہ دریا میں۔ مگر ہائے اب چشمے کی وہ نیکی ساری غائب ہو گئی۔ اس کا گندلا پانی تھپیڑے مارتا ہوا کناروں سے بہہ نکلا، ابلا، گرجا اس کے گرد [illegible] میلا میلا پھین اچھلنے لگا۔ اس نے سینکڑوں برس پرانے درختوں کو لٹا دیا۔ اس کا پتہ دھماکوں کی آواز دور سے دینے لگی ...... اور تو اور وہی چرواہا جس کی خاطر چشمے نے دریا کو ایسے دل نشین الفاظ میں لعنت ملامت کی تھی، خود اس میں ڈوب گیا، اس کا گلہ سارا بہہ گیا اور اس کی جھونپڑی کا نام و نشان تک مٹ گیا

ایسے بہت سے چشمے ہیں جو مسکین معلوم ہوتے ہیں۔ م

جو آہستہ آہستہ بہتے ہیں، اور اپنی رفتار سے دل کو خوش کرتے ہیں [illegible]

ہوائی جہاز کی کہانی

FIROZE

نورالحسن صاحب ہاشمی
ایم۔اے علیگ

ہوا میں اڑنا کون نہیں پسند کرتا۔ پرانے زمانے سے لوگ اب تک برابر سوچتے آئے ہیں کہ ہوا میں کیوں کر اڑا جائے۔ کوئی سوپ باندھ کر اڑنے کی کوشش کرتا کوئی بڑے بڑے پر بنا کر لٹکا لیتا ایک قصہ مشہور ہے کہ جزیرہ کریٹ میں ایک شخص داداس نام کا تھا۔ اس نے ایک بھول بھلیاں بنائی تھی تاکہ مجرموں اور ملک کے دشمنوں کو اس میں بند کیا جائے۔ اتفاق سے کریٹ کا بادشاہ خود داداس سے ناراض ہو گیا۔ اس کو اور اس کے لڑکے ایکارس کو اس بھول بھلیاں میں بند کر دیا اور یہاں داداس بھی اس سے نکلنے کا راستہ بھول گیا۔ دونوں نے کئی دن تک اس میں چکر کاٹے۔ آخر کار انھوں نے ایک ترکیب سوچی اور پروں کو موم سے جوڑ جوڑ کر چار بڑے بڑے پر تیار کئے۔ دو اپنے لئے دو اپنے لڑکے کے لئے اور ان پروں کو اپنے بازوؤں پر لگا کر اس بھول بھلیاں سے اڑ کر بھاگے۔ کہتے ہیں کہ داداس بغیر کسی حادثے کے جزیرے میں پہنچ گیا۔ لیکن اس کا لڑکا ایکارس بہت اونچا اڑ گیا۔ اونچا اڑنے سے سورج کی گرم گرم کرنیں اس کے پروں پر پڑیں۔ موم پگھل گیا اور وہ سمندر میں گر کر ڈوب گیا۔

اس طرح کی اور بھی کئی کہانیاں مشہور ہیں لیکن یہ سب کہانیاں ہی ہیں۔ دراصل سب سے پہلی سمجھ داری کی کوشش ۱۷۸۳ء میں شروع ہوئی۔ فرانس میں وارسائی کے قریب ایک گاؤں انونے کے وہاں کے کچھ لوگوں نے جون کے مہینے میں کتان کے کپڑے کا ایک بہت بڑا غبارہ بنایا اور ایک کھیت میں اُس

کو رکھ کر اس کے نیچے آگ جلا دی تاکہ اس میں خوب
دھواں بھر جائے۔ تم نے آتش بازی والے غبارے
دیکھے ہوں گے۔ جس طرح اِس کے نیچے آگ جلا دیتے
ہیں اور وہ اُڑتا چلا جاتا ہے اِسی طرح اس غبارے
میں بھی یہی کیا گیا۔ کیوں کہ دھواں ہوا سے ہلکا ہوتا
ہے اور ہمیشہ اوپر کو اُڑتا ہے۔ اِس لیے خیال تھا کہ
یہ غبارے کو بھی اوپر اُٹھا دے گا۔ چنانچہ سچ مچ وہ
غبارہ ربڑ کے پھکنے کی طرح پھول گیا۔ اور اوپر اُٹھا
لوگوں نے اس کی رسیاں کاٹ دیں جن سے وہ زمین
سے بندھا ہوا تھا۔ غبارہ ہوا میں اونچا اٹھا اور ہوا
کے رُخ پر کوئی دس منٹ تک برابر اُڑتا رہا اور قریب ڈیڑھ
میل کے فاصلے پر جا کر گر گیا۔ ہوا میں سچ مچ اُڑنے کی
یہ پہلی کوشش تھی اور اس کے بنانے والے جو دو
فرانسیسی بھائی مانگلفیر نامی تھے واقعی بڑی تعریف کے
مستحق ہیں۔

جب اِن لوگوں کو چسکا لگ گیا تو اُنھوں نے ستمبر
۱۷۸۳ء میں پھر ایک بڑا غبارہ وارسائی سے اُڑایا۔
اور اس میں دو تین جانور یعنی مرغی اور بھیڑ بھی رکھ
دیے۔ یہ تین جانور گویا پہلے جان دار تھے جو ہوا میں
اُڑے۔ غبارہ آٹھ منٹ تک ہوا میں اُڑتا رہا۔ اور
پھر دو میل پر جا کر گر گیا۔

جب اس میں کامیابی ہوئی تو پھر اسی سال نومبر
میں ایک فرانسیسی شخص اوزیر نامی نے طے کیا کہ اب وہ
خود غبارے میں بیٹھ کر جائے گا۔ چنانچہ جان پر کھیل
کر یہ شخص غبارے میں بیٹھ گیا۔ غبارہ حسبِ معمول اُڑا
اور کوئی ۲۵ منٹ اُڑتا رہا۔ اس کے بعد ۵ میل کے
فاصلے پر جا کر گر گیا۔ ذرا سوچو اس پہلے شخص کو کتنا
لطف آیا ہو گا جب وہ یہ محسوس کر رہا ہو گا کہ میں پہلا
شخص ہوں جو اُڑ رہا ہوں۔

اب تک تو یہ ہوتا تھا کہ غبارے میں پھوس
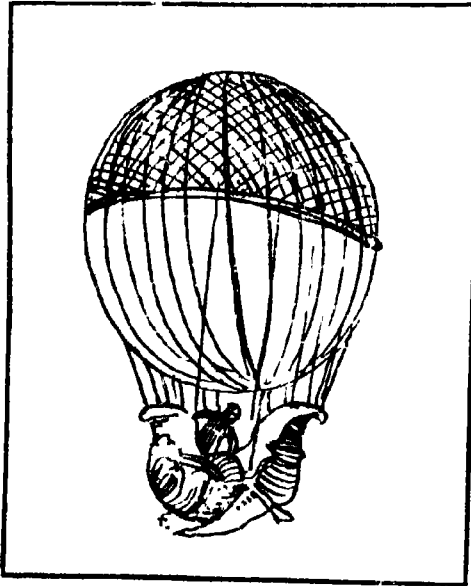
لکڑی وغیرہ کی آگ جلا کر دھواں بھر دیتے تھے لیکن کچھ
دنوں بعد مانگلفیر بھائیوں نے محسوس کیا کہ دراصل
دھوئیں کی وجہ سے غبارہ نہیں اُڑتا بلکہ گرم ہوا کی وجہ
سے اُڑتا ہے۔ کیوں کہ گرم ہوا ہلکی ہوتی ہے اور ہلکی ہونے
کے سبب سے اوپر اُٹھتی ہے۔ جب یہ بات اُن کو
معلوم ہوئی تو اُنھوں نے ایسا انتظام کیا کہ آگ برابر

غبارے کے نیچے جلتی رہے (جیساکہ تم آتش بازی کے غباروں میں دیکھتے ہوگے۔) اس ترکیب سے واقعی غبارہ اوپر دور جانے لگا۔ لیکن اس میں یہ دقت پھر بھی باقی رہی کہ زیادہ کوئلہ، زیادہ جگہ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں رکھا جا سکتا تھا۔

چنانچہ اب لوگوں نے سوچنا شروع کیا۔ کہ کوئی اور ایسی چیز بھی ہے جو معمولی ٹھنڈی ہوا سے ہلکی ہو؟ لوگوں نے خوب خوب سوچا اور بہت سے تجربے کئے۔ ہوا میں جتنی مختلف گیسیں ہوتی ہیں سب کو جانچا اور آخرکار پتہ لگا ہی لیا کہ ہائیڈروجن گیس ہوا سے چودہ گنا کم ہلکی ہوتی ہے۔ بس پھر کیا تھا یہ بھید معلوم ہوتے ہی گرم ہوا کی بجائے غباروں میں ہائیڈروجن گیس بھری جانے لگی اور خوب خوب غبارے اُڑنے لگے۔ لیکن ابھی پھر بھی اس میں ایک کمی تھی وہ یہ کہ غبارہ اسی طرف اُڑتا جدھر کی ہوا ہوتی تھی۔ یعنی غبارہ بالکل ہوا کی مرضی پر تھا۔ جدھر وہ چاہے اُڑائے جائے۔

پھر لوگوں نے ترکیبیں کرنا شروع کیں۔ جس میں سے ایک بڑی دلچسپ ہے۔ ایک صاحب نے یہ ترکیب کی کہ کپڑے کے چپو بنائے اور جس طرح کشتی کو پانی میں کھینچتے ہیں اسی طرح غبارے کو ہوا میں کھینچنا چاہا تمام لوگ دیکھتے اور ہنستے تھے۔ لیکن خیر رفتہ رفتہ لوگوں نے اس کی ترکیبیں سوچ لیں اور اب غبارے سگار کی شکل کے بنائے جانے لگے۔ جن میں انجن اور پنکھے لگائے جاتے ہیں۔ تاکہ ہوا کے خلاف اُڑ سکیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۱ء میں سنتاس ودمن نامی ایک شخص نے ایک بہت بڑے سگار کی شکل کے غبارے کو پیرس کے مشہور ایفل مینار کے چاروں طرف ۱۹ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑایا۔ اس وقت سے یہ سمجھا جانے لگا کہ بس اب تمام مراحل طے ہوگئے اور اب ہوابازی خوب خوب ترقی کرے گی۔

جرمنی نے جو یہ دیکھا کہ واقعی ہوابازی سے بہت فائدے ہوں گے تو اُس نے بھی فرانس کی دیکھا دیکھی اس میں ترقی کرنا شروع کی۔ اِس خیال سے اور بھی کہ جب کبھی لڑائی ہوگی تو اِس میں اس سے کام لیا جائے گا جرمنی تو پرانا لڑاکا ہے ہی۔

جرمنی میں ایک شخص کاؤنٹ زیپلین (ZEPLEN) نے تو ہوائی جہاز بنانے کو اپنی زندگی کا مقصد ہی ٹھہرا لیا اور اس نے اس میں خوب نئی نئی باتیں نکالیں۔ یہاں تک کہ جرمنی فنِ ہوابازی میں بہت جلد فرانس سے بڑھ گیا۔

زیپلین نے اس میں بڑی ترقیاں کیں۔ اس نے دیکھا کہ گیس کے تھیلوں میں اوپر جاکر بے تکے کوڑے نکل آتے ہیں اِس لئے اس نے اپنے جہاز کا ڈھانچہ المونیم سے تیار کیا۔ اور اس کے اندر چھوٹے چھوٹے سے خلئے بنا کر ہائیڈروجن گیس بھر دی اور

اندر ریشم کی استر کاری بھی کر دی۔ یہ گویا پہلا ہوائی جہاز تھا۔ اس کی رفتار بھی زیادہ کر دی اور جدھر چاہئے اس کو بآسانی موڑا جا سکتا تھا۔ اس جہاز کا نام اسی کے نام پر زیپلن رکھا گیا۔

جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو جرمنی کے پاس بہت سے زیپلن قسم کے ہوائی جہاز تھے اور جرمنی کو خیال تھا کہ وہ ان پر سے بم گرا کر فرانس اور انگلستان کو بڑا نقصان

پہنچائے گا اور تھوڑا بہت اس نے نقصان پہنچایا بھی مگر جیسا سب کو معلوم ہے کہ جرمنی کی امیدیں پوری نہ ہو سکیں لیکن ابھی اس میں ایک کمی پھر بھی باقی رہی۔ بات یہ ہے کہ ہائیڈروجن گیس ایسی گیس ہے جس میں آگ بڑی آسانی سے لگ جاتی ہے انجن کی گرمی سے اکثر و بیشتر جہاز میں آگ لگ جایا کرتی تھی۔ اس کے چلانے والے ہوابازوں کو ہر وقت خوف لگا رہتا کہ کہیں آگ نہ لگ جائے۔ چنانچہ اب پھر اس کی تلاش ہوئی کہ اس زیپلین میں کوئی اور چیز بھر دی جائے جس میں آگ لگنے کا اتنا اندیشہ نہ ہو۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ایک دوسری گیس ہیلیم نامی ہے جو ہلکی بھی ہے اور جس میں آگ بھی نہیں لگتی۔ چنانچہ ۱۹۱۶ء سے اس گیس کا استعمال ہونے لگا اس وقت سے زیپلین ہوائی جہاز آرام دہ اور محفوظ ہو گئے۔ ہیلیم گیس پہلے بہت کم مقدار میں ملتی تھی لیکن اس کو بنایا بھی جانے لگا جس سے اور بھی آسانی ہو گئی۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں ایک بڑا جہاز (R.101) آر ۱۰۱ نامی زیپلین کے طرز کا بنایا گیا اور اس کو انگلستان سے امریکہ تک اڑایا گیا۔ یہ پہلا جہاز تھا جس نے بحر ظلمات (اٹلانٹک) کو پار کیا۔ اڈنبرا سے نیویارک کا سفر اس نے ۱۰۸ گھنٹوں میں طے کیا اور پھر واپسی میں اسی سفر کو ۷۵ گھنٹوں میں ختم کیا۔ گویا اسی زمانے کے بڑے سے تیز پانی کے جہازوں کے مقابلے میں پورے دو دن کم لگائے۔

(باقی)

ہماری کیمپنگ

حسن احمد قنوجی
متعلم جامعہ

جب سے ہم جامعہ نگر اوکھلا آئے ہیں نئی نئی دلچسپیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہماری زندگی بالکل بدل گئی ہے۔ کھلا میدان صاف ہوا۔ ڈرل اسکاؤٹنگ کھیل کود، تیراکی غرض کیا کیا بتاؤں۔ بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں جان پیدا ہوگئی ہے۔ پچھلے دنوں استادوں کے مدرسے کے ساتھ ہم کیمپنگ کے لئے گئے تھے۔ بہت دلچسپی رہی۔ میں یہاں اس کا مختصر سا حال لکھتا ہوں شاید پیامیوں کو بھی کیمپنگ کی زندگی کا لطف آجائے۔

ہمیں کچھ دنوں پہلے معلوم ہوگیا تھا کہ کیمپنگ کے لئے فریدآباد جانا ہے۔ یہ اوکھلے سے کوئی دس، بارہ میل ہوگا۔ جتنے جانے والے لڑکے تھے سب خوش تھے۔ اور بے چین تھے کہ کب وہ دن آتا ہے۔ جانے سے ایک دن پہلے سب نے اپنا اپنا سامان درست کیا اور صبح تڑکے چلنے کی تیاری ہوئی۔ سب انصاری روڈ پر جمع ہوئے اور دایاں بایاں کرتے ہوئے پیدل روانہ ہوگئے۔ سنگ ساتھ میں سفر بہت دلچسپی سے کٹ رہا تھا جمنا کی نہر ہمارے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ چلتے چلتے کوئی آٹھ بج گئے تو ناشتے کی فکر ہوئی۔ ایک جگہ کنوئیں کے پاس درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ایک صاحب نے کمال کیا چپکے سے ایک پراٹھا لے سیدھے درخت پر۔ بہتیرا دوڑ دھکڑ ہوئی مگر وہ حضرت وہیں اطمینان سے ناشتہ کرنے کے بعد نیچے اُترے۔ ہم لوگ کھا پی کر فارغ ہو، پھر چل کھڑے ہوئے۔

اب فریدآباد بس ایک میل رہ گیا تھا یہ ایک میل پچھلے دس میلوں سے زیادہ سخت تھا۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری اور منزل پر پہنچ کر دم لیا۔ یہ نہر کے پاس ہی ایک باغ تھا۔ بہت لمبا۔ اس میں آدھے میں آم اور آدھے میں امرود، لیموں، بڑھل اور شریفے وغیرہ کے درخت تھے۔ بندر بھی بہت تھے۔

ہماری پوری جماعت کے پانچ پٹرول، گروپ یا ٹولیاں کردی گئیں۔ دو پٹرول مدرسہ ثانوی کے لڑکوں کے دو اُستادوں کے مدرسے کے اور ایک اُستادوں کا۔ ہمارے یعنی ثانوی کے دونوں پٹرولوں میں چھ چھ لڑکے تھے۔ استادوں کے مدرسے والے پٹرولوں میں آٹھ آٹھ اور اُستادوں کے

ہمارا اسکاؤٹ کلاس

نہر میں تیرنا ہمارا روزانہ کا مشغلہ تھا

پکانے کی مشق

پیام برادری کے چند رکن چاء پر

مرزا نور عالم قزلباش آگرہ

فضل الرحمان دہلی

کالی گھٹا

پٹرول میں پانچ۔ ان میں ایک اسکاوٹ ماسٹر تھے۔ ایک صبح کی ورزش کے انچارج۔ ایک کھیلوں کے نگراں ایک کیمپ کے نگہبان۔ ایک ڈاکٹر۔ ہر پٹرول میں سے ایک پٹرول لیڈر چنا گیا۔ اور پورے کیمپ میں سے ایک لڑکے کو ڈے آفیسر کا عہدہ دیا گیا۔ یہ عہدے روزانہ تبدیل ہوتے رہے۔ پٹرول لیڈر کا کام یہ تھا کہ اپنے کیمپ یعنی پٹرول کا پورا ذمہ دار رہے اور اس کی صفائی اور انتظام کی پوری نگرانی کرے۔ ڈے آفیسر پر دن بھر کے تمام کاموں کی ذمہ داری تھی۔ تمام کیمپ کی خبر رکھنا اور کھانے کے وقت لوگوں کی مدد کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔

شام کے وقت ہم اپنے اپنے بستر درختوں کے نیچے لگا چکے تھے کہ خیموں کی گاڑی آگئی۔ مگر کچھ تھکن اور کچھ آنکھوں میں سستی سی پیدا ہوگئی تھی۔ مگر ہمارے نگہبان صاحب نے کہا۔ "یہاں تھکنے کا نام نہ لینا۔ اس جگہ ہم فوجی زندگی گذارنے آئے ہیں۔ کھڑے ہو جاؤ۔" پھر کیا تھا ذرا کے ذرا میں خیمے لگ گئے۔ رات میں بڑی اچھی نیند آئی۔ ہمارے ایک ساتھی چوروں سے بہت ڈر رہے تھے۔ بار بار جگاتے تھے۔ مگر انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا گیا۔

صبح اٹھے تو سیٹی سنائی دی۔ یہ ورزش کی تیاری کی اطلاع یا الارم تھا۔ ہم لوگ ضرورت سے فارغ ہونے کے لئے (جسے کیمپ کی اصطلاح میں سو قدم اور تین سو قدم کہتے ہیں) کیمپ سے باہر نکلے۔ سردی کا عالم نہ پوچھئے۔ ہوا اور پھر جنگل کی۔ واپس آ ہی رہے تھے کہ ایک سیٹی اور بجی جس کا مطلب تھا کہ ورزش میں صرف پانچ منٹ اور ہیں۔ جلدی سے لباس (اسکاوٹ یونی فارم) پہنا اور میدان میں جا پہنچے۔ ایک صاحب ذرا پیچھے رہ گئے تھے وہ بھاگتے ہوئے آئے۔ انچارج صاحب نے انھیں یہ سزا دی کہ میدان کے چار چکر لگائیں۔ کچھ دیر تک الٹے سیدھے کی مشق رہی۔ اس کے بعد میدان صاف کیا۔ میدان کے ایک طرف اسکاوٹ جھنڈے کے لئے آدھا دائرہ بنایا، جھنڈا گاڑا اور ایک ترانے کے بعد جھنڈے کی سلامی کی رسم ادا کی گئی اس کے بعد تین مرتبہ زوردار نعرہ لگایا گیا جو یہ تھا۔ "ٹپ، ٹپ ٹپ، ٹپ، ٹپ، ٹپ جامعہ اسکاوٹنگ۔ جامعہ اسکاوٹنگ۔ جامعہ اسکاوٹنگ۔ ہندوستان زندہ باد ہندوستان زندہ باد۔ ہندوستان زندہ باد۔" اس کے بعد ہم نے ڈرل شروع کی اور پھر مختلف قسم کے دلچسپ کھیل کھیلے ۶ بجے سے ۸ بجے تک یہ پروگرام رہا۔

۸ بجے کھڑے کھڑے ناشتہ کیا۔ اپنے اپنے خیموں میں واپس آئے اور معائنے کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ خیمے کے چاروں طرف خوب صفائی کی۔ پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ خیمے کے اندر تمام چیزیں سلیقے سے رکھیں۔ غرض جس طرح بن پڑا خیمے کے اندر اور اس کے چاروں طرف خوش نما بنانے میں پوری کوشش کی۔ سیٹی کی آواز آئی۔ معائنہ شروع ہوگیا۔ ہم وردی میں باہر آکر کھڑے ہو گئے۔ تین حضرات تشریف لائے

تمام چیزیں دیکھیں اور چلے گئے۔ اسی طرح انھوں نے تمام خیموں کا معائنہ کیا۔ پھر بلانے کی سیٹی ہوئی۔ سب کے سب جمع ہوگئے۔ آج کے معائنے کا نتیجہ سُنایا گیا۔ ہم خوشی سے اچھل پڑے آج ہم نے سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے تھے اور انعامی جھنڈے کے مستحق تھے۔ پٹرول لیڈر نے جھنڈا لاکر خیمے پر نصب کر دیا۔

پھر جماعت کی سیٹی ہوئی ہم فوراً پہنچے۔ اسکاوٹ ماسٹر صاحب نے بہت کچھ بتایا۔ اسکاوٹ کی تاریخ اور اس کے فرائض وغیرہ پر تقریر کی۔ مثلاً

۱۔ اسکاوٹ مصیبت کے وقت مسکراتا اور سیٹی بجاتا ہے۔

۲۔ اسکاوٹ جانوروں کا دوست ہوتا ہے۔

خدا خدا کرکے ۱۰ بجے ہم پھر خیموں میں آئے اور تیرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس زندگی میں یہ سب سے دلچسپ مشغلہ تھا۔ خوب تیرے۔ ۱۲ بجے واپس آئے اور کھانا کھایا۔ اس کے بعد آرام کے لئے لیٹ گئے۔ ۲½ بجے دوبارہ درجے کی سیٹی ہوئی اور ہم جلدی سے پہنچے۔ اس وقت مختلف قسم کی گانٹھیں بتائی گئیں اور پھر گانا شروع ہوا۔ تقریباً چار بجے ہم چلئے سے فارغ ہوگئے اور میدان پہنچے۔ وہاں والی بال، بیڈمنٹن، گیند بلا اور دوسرے کھیلوں میں مشغول ہوگئے۔ مغرب کے وقت واپس آئے اور کیمپ فائر کا پروگرام سوچنے لگے۔ اتنے میں کھانے کی سیٹی ہوئی اور ہم کھانا کھانے چلے گئے رکھانے کے بعد ہی کیمپ فائر شروع ہوا۔

ہم کھلی فضا میں دائرہ بناکر بیٹھ گئے۔ درمیان میں آگ روشن ہوئی۔ اور سب نے اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ تمام پٹرول والوں کی طرف سے کوئی ڈراما گانا، مکالمہ یا نقل وغیرہ ہوئی۔ کوئی ۸½ بجے تک یہ دلچسپ مجلس رہی۔ اب نتیجہ سُنایا گیا۔ ہمارے نمبر تمام پٹرول والوں سے زیادہ تھے اور یہ ہماری دُوسری شاندار کامیابی تھی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ کل ہم کیمپ فائر کی صدارت کریں گے۔

۸½ بجے یہ مشغلہ ختم ہوا۔ ڈے آفیسر نے نگہبان سے مل کر واچ ورڈ مقرر کیا اور تمام خیموں میں آکر پٹرول لیڈر کو بتلادیا۔ آج کا واچ ورڈ آزادی تھا۔ اس کے بعد ہم سو گئے۔

یہ تھا ہماری کیمپ زندگی کا ایک دن آئندہ ہر روز تقریباً یہی پروگرام رہا۔ واچ ورڈ کے متعلق بھی سن لیجئے۔ کیمپ میں روزانہ ایک پٹرول پہرا دیتا تھا اور باقی کیمپ والے ۹½ بجے کے بعد سو رہتے تھے۔ مقرر وقت کے بعد اگر کسی شخص کو باہر جانے کی حاجت ہو تو اُسے واچ ورڈ یاد ہونا ضروری ہے۔ اگر پہرے دار نے اس سے واچ ورڈ پوچھا اور اُس نے نہ بتایا تو پہرے دار کو اختیار ہے کہ رات بھر اُسے باہر ہی رہنے دے یا صرف نام اور پتہ لکھ کر چھوڑ دے۔ اور صبح کو اس شخص کو کیمپ کے قانون کے مطابق سزا

دی جائے۔ دوسری عجیب بات کیمپ میں یہ تھی کہ اگر چوری کرو اور پکڑے نہ جاؤ تو کوئی مضائقہ نہیں۔ خواہ بعد میں پتہ چل جائے اور جو پکڑے گئے تو سزا ملی! ایک واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا۔ ایک رات ہماری پہرہ دینے کی باری تھی۔ اتفاق سے ہم میں سے ایک صاحب غافل ہوگئے۔ انچارج صاحب کہیں پیشاب کے لئے اُٹھے تھے۔ پہرے دار کو غافل دیکھ کر کیمپ میں سے دو کوٹ لے اُڑے۔ صبح کے وقت ہم کو یہ سزا سنائی گئی کہ ہم اپنی تفریح کے وقت میں ایک گھنٹے تک دھوپ میں پریڈ کریں۔ لطف یہ کہ جن صاحب کی وجہ سے سب کو سزا ملی تھی وہ ڈھول بجا رہے تھے اور ہم اس کی آواز پر پریڈ میں مشغول تھے۔

ہم نے کیمپ فائر میں بہت حصّہ لیا اور ہمیشہ نمایاں کامیابی حاصل کی۔ انعامی جھنڈا بھی پانچ مرتبہ ہمارے پاس رہا۔ اور رفتہ رفتہ چند ہی دن میں ہم اس زندگی کے پوری طرح عادی ہوگئے۔ لیکن افسوس نویں دن ہمیں اپنا کیمپ اُکھاڑ کر ادھر آنا پڑا اور اب پھر وہی زندگی ہماری ہے ؏

اپنے خریداروں سے چند ضروری باتیں

شروع سال ۱۹۳۲ء سے رسالہ پیام تعلیم کی روانگی وغیرہ کے انتظام میں چند اہم تبدیلیاں کی جارہی ہیں۔ براہِ کرم ان کو اچھی طرح سے نوٹ فرمالیجئے۔

۱۔ جنوری کا پیام تعلیم ۲۸ دسمبر سے روانہ کیا جائے گا۔ جو تمام خریداروں کے پاس ۱۰ جنوری ۱۹۳۲ء تک ضرور پہنچ جائے گا جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ ۱۵ جنوری تک خط لکھ کر رسالہ دوبارہ دفتر سے منگا سکتے ہیں۔ ۱۵ جنوری کے بعد رسالہ روانہ نہ کیا جائے گا۔

۲۔ تمام خریداروں کے نمبر خریداری تبدیل ہوگئے ہیں۔ جدید نمبر خریداری سب رسائل پر لکھے ہوئے ہیں خریدار ان نمبروں کو نوٹ فرمالیں

۳۔ خریدار خطوط اور منی آرڈر کوپن پر اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیں۔ جو خطوط بغیر نمبر خریداری کے موصول ہوں گے اُن کی تعمیل نہ کی جائے گی۔

۴۔ آیندہ ماہ تمام خریداروں کے پتے مع نمبر خریداری کے چھپ جائیں گے۔ جو صاحب پتوں میں تبدیلی کرانا چاہیں ان کے خطوط بھی ۱۵ جنوری ۱۹۳۲ء تک آجانے چاہئیں خطوط میں نئے نمبر خریداری کا ضرور حوالہ دیا جائے ورنہ پتے تبدیل نہ ہوسکیں گے۔

منیجر "پیام تعلیم"

محمد عظیم اللہ صاحب
بی اے

آج کوئی چار سو (۱۵۴۲ء) برس پہلے کی بات ہے اسپین کا ایک باشندہ فرانسسکو پزارو سونے کے ملک کی تلاش میں جنوبی امریکہ کی طرف روانہ ہوا اور کوئیٹو شہر تک پہنچا۔ کوئیٹو جنوبی امریکہ میں خط استوا کے قریب ایک شہر ہے کوئیٹو سے اس نے اپنے ساتھیوں کو دو طرف روانہ کیا کچھ لوگ جنوبی امریکہ کے مغربی کنارے ہوتے ہوئے چلی پہنچے۔ ایک جماعت فرانسسکو پزارو کے بھائی گونزالو پزارو کے ہمراہ ۱۵۳۹ء پورب کی طرف روانہ ہوئی۔ یہ لوگ جنگلوں اور جھاڑیوں میں اپنا راستہ بناتے اور بڑی مشکلوں کا سامنا کرتے ہوئے نیپو نام دریا کے کنارے پہنچے۔ یہاں ان کا ارادہ ہوا کہ دریا کے ذریعے سفر کیا جائے۔ کشتی بنانے کے لئے جنگل میں لکڑی تو کافی تھی لیکن اور کوئی سامان نہ تھا اُنھوں نے کیلیں مرے ہوئے گھوڑوں کے نعلوں کی بنائیں۔ درختوں کے گوندسے تارکول کا کام لیا اور کپڑے پھاڑ پھاڑ کر تختوں کے سوراخ بند کئے اور کچھ لوگ کشتی میں اور کچھ پیدل آگے بڑھے۔ بہت سے آدمی راستے کی تکلیف اور بھوک سے مر گئے۔ آخر انھیں معلوم ہوا کہ کچھ فاصلے پر ایک گاؤں ہے جہاں کھانے پینے کی چیزیں مل سکتی ہیں۔ اس لئے طے ہوا کہ کچھ لوگ کشتی میں بیٹھ کر جلد سے جلد کھانے کا سامان لے آئیں۔ فرانسسکو ڈی اوریلنا کو اس کشتی کا افسر بنایا گیا۔ اوریلنا کئی دن تک دریا میں سفر کرتا رہا لیکن گاؤں نظر نہ آیا۔ چلتے چلتے وہ ایسی جگہ پہنچا جہاں یہ دریا ایک اور دریا میں مل گیا تھا۔ یہ دریا بہت بڑا تھا اور بہت تیز بہتا تھا۔ لوگ کشتی کو بہاؤ کے خلاف نہیں چلا سکتے تھے۔ اوریلنا یہ سوچ کر کہ اب گونزالو کے پاس پہنچنا مشکل ہے۔ آگے کی طرف بڑھتا رہا ادھر گونزالو اوریلنا کا انتظار کرتے کرتے ناامید ہو گیا تو کوئیٹو واپس چلا گیا راستے میں اس نے بہت تکلیفیں اُٹھائیں اور اُس کے بہت سے ساتھی مر گئے۔

اب اوریلنا کا قصہ سُنو۔ یہ برابر آگے ہی بڑھتا گیا راستے میں اُسے بہت سے جنگل اور دلدلی زمینیں ملیں آخر وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا۔ جہاں اسے اس جنگل کے پرانے باشندے نظر آئے۔ اُن میں سے کچھ مردوں کا حلیہ ایسا تھا کہ بظاہر وہ عورت معلوم ہوتے تھے بعد کو معلوم ہوا کہ یہ مرد تھے۔ اوریلنا پہلے انھیں عورت

سمجھا تھا اس لئے اس نے ان کا نام ایمے زن رکھ دیا۔

ایمے زن یونانی لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں زنانہ سپاہی۔ اوریلنا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ "یہ زنانہ سپاہی لمبے اور خوب صورت تھے۔ اُن کے ہاتھ میں تیر کمان تھے اور یہ بہت بہادر اور لڑاکا سپاہی تھے۔"

اوریلنا راستے کی دقتوں کو سہتا، مصیبتیں اُٹھاتا اس دریا کے دہانے تک پہنچ گیا۔ یہاں اُسے معلوم ہوا کہ وہ بحر اٹلانٹک میں ہے۔ اُس کا سفر جنوبی امریکہ کے معربی ساحل کی ٹھیک سیدھ میں مشرقی ساحل پر ختم ہوا۔ یہاں سے وہ اسپین واپس آگیا۔ اپنے ملک میں پہنچ کر اس نے لوگوں کو اپنے سفر کے واقعات سنائے اور اُن لوگوں کا حال بتایا جن کا نام اس نے ایمے زن رکھا تھا۔ بعد میں اس دریا کا نام ایمے زن پڑ گیا۔

ایمے زن دنیا کے بہت بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے۔ اس کی لمبائی کوئی چار ہزار میل ہے یہ کوہ انڈیز سے نکل کر خطِ استوا کے پاس سے بہتا ہوا بحر اٹلانٹک میں گرتا ہے۔ اس علاقے میں بارش بہت ہوتی ہے۔ آب ہوا گرم اور مرطوب اور تندرستی کے لئے مضر ہے۔

اوریلنا کے سفرنامے کو پڑھ کر اور دریائے ایمے زن کے کنارے کا حال سن کر بہت سے لوگوں کو اس دریا کی سیر کا شوق ہوا۔ ہنری والٹر بیٹس اور الفریڈ رسل ولیس کے سفر کی کہانی بہت دلچسپ مگر لمبی ہے اس سیاحت کا حال تم کسی اگلے نمبر میں پڑھنا ؀

ہاتھ سے کاغذ بنانے کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔ شاید تم نے کسی اخبار یا رسالے میں پڑھی بھی ہو۔ تمھارے پیام تعلیم (سال گرہ نمبر ۳۸ء) ہی میں کاغذ بنانے پر ایک مضمون چھپ چکا ہے۔

یہاں ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ ہاتھ سے کاغذ بنانا کس قدر آسان ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ بنانے کی ترکیب پر ایک لمبا سا مضمون لکھ دیا جائے۔ لیکن خالی مضمون پڑھنے سے تمھیں اتنی دلچسپی نہ ہوتی اس لئے ہر بات تصویروں کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ تصویریں جامعہ تعلیمی مرکز نمبر ۱ کے درجۂ ششم کے بچوں کی ہیں۔ یہ بچے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ باغبانی، گتے اور ابری کا کام سیکھتے ہیں۔ اس سال انھیں ہاتھ سے کاغذ بنانے کا کام بھی سکھایا جا رہا ہے۔

یوں تو کاغذ ہر ریشے دار چیز سے بن سکتا ہے۔ لیکن جس قدر آسانی سے ردی کاغذ سے بنتا ہے۔ اور کسی چیز سے نہیں بنتا۔ ہم نے بھی ردی کاغذ سے کاغذ بنانا شروع کیا ہے

کام شروع کرنے کے لئے بہت تھوڑے سامان کی ضرورت ہے۔ پہلی تصویر میں وہ سب چیزیں دکھائی گئی ہیں جنھیں ہم استعمال کر رہے ہیں

دوسری تصویر میں دو بچے ردی کاغذوں میں سے رنگین، میلا اور اخبار کا کاغذ اور دوسری چیزیں الگ کر رہے ہیں۔ تاکہ کاغذ بنانے کے لئے اچھا کاغذ باقی رہ جائے۔ اس صاف کی ہوئی ردی کو ایک دو دن تک پانی میں بھگوئے رکھتے ہیں۔ بھیگی ہوئی ردی کو جلد گلانے کے لئے ردی کے وزن کا کوئی دو فیصدی کاسٹک سوڈا ملا دیتے ہیں۔

ردی خوب گل جاتی ہے تو اسے پیروں سے اس قدر کچلتے ہیں کہ لگدی سی بن جاتی ہے۔ اور کاغذ کا ذرا سا ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ تیسری تصویر میں دو لڑکے یہی کام

۱

۳

۲

۴

۵

۶

۷

۸
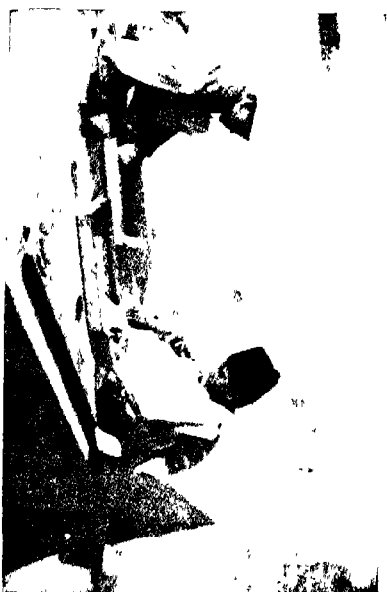
کر رہے ہیں۔

اب اس لگدی میں ردّی کے وزن کا تین یا چار فی صدی صابن ملا کر خوب دھوتے ہیں۔ چوتھی تصویر میں یہی کام ہو رہا ہے دھونے کے بعد لگدی کو حوض میں ڈال دیتے ہیں۔ پانی لگدی کی مناسبت سے ملانا چاہئے۔ زیادہ پانی ہوگا تو پتلا کاغذ بنے گا ورنہ موٹا۔ پانچویں تصویر میں اس حوض پر چار لڑکے بیٹھے ہیں۔ ایک لڑکا جالی کے فریم پر کوئی آدھے انچ چوڑی لکڑی کا ایک اور فریم رکھ کر کاغذ اٹھا رہا ہے۔ جالی کو لگدی ملے ہوئے پانی میں ڈال کر آہستگی سے اٹھا لیتے ہیں۔ پانی نیچے گر جاتا ہے۔ لگدی پانی پر رہ جاتی ہے۔ اب دو لڑکے کا بنوری لٹھے کا ایک رومال چاروں کونے پکڑ کر اس جالی پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اس جالی کو الٹ کر ایک تختے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ اب جالی کو آہستہ سے اٹھا لیتے ہیں لیجئے کاغذ بن گیا۔ اسی طرح ایک کے اوپر دوسرا کاغذ رکھتے جاتے ہیں۔ ایک دوسرے تختے سے انھیں دباتے بھی رہتے ہیں۔ تاکہ پانی نکل جائے۔

اب ان رومالوں کو جن پر کاغذ لگا ہوا ہے دیوار پر برش کے ذریعے چپکا دیتے ہیں۔ کاغذ دیوار کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے لئے سیمنٹ کی دیواریں ہونی چاہئیں۔ چھٹی تصویر میں کاغذ دیوار پر لگانے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

کاغذ سوکھ جاتا ہے تو اسے کپڑے سے الگ کر لیتے ہیں۔ اور تمام تیار کاغذ کے وزن سے چار گنے پانی میں چار فیصدی پھٹکری اور ایک فی صدی سریش ملا کر خوب پکا لیتے ہیں اور کاغذ کو اس میں سے گذارتے ہیں۔ (دیکھو ساتویں تصویر)

اس کے بعد کاغذ کو سکھانے کے لئے ماروں یا تاگوں پر پھیلا دیتے ہیں۔ جب یہ کاغذ سوکھ جاتے ہیں، تو انھیں لکڑی کے چکنے تختے پر رکھ کر بڑی کوڑی چکنے پتھر، یا شیشے کے پیپر ویٹ سے خوب رگڑتے ہیں۔ اس سے کاغذ چکنا اور ہموار ہو جاتا ہے آٹھویں تصویر میں دو بچے کاغذ رگڑ رہے ہیں۔

ہاں ایک بات اور سمجھ لو کاغذ کو جب دیوار سے اتارتے ہیں تو وہ جاذب بن جاتا ہے لکھنے کے کام کا یہ تبھی بنتا ہے جب اس پر بعد کے عمل کئے جاتے ہیں۔ دیکھو کتنا آسان نسخہ ہے۔ اور کس قدر دلچسپ۔ ہمارے ہاں کے بچے تو اب بہت آسانی سے کاغذ بنا لیتے ہیں۔ تم بھی ذرا کوشش کر کے دیکھو۔ کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے پوچھ لینا۔
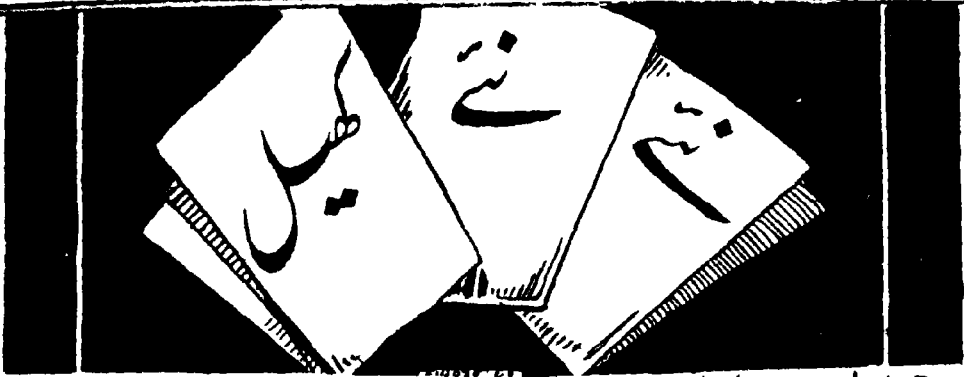
الطاف علی صاحب نگراں ورزش جسمانی جامعہ نگر

۱۔ چھو جانے پر دوڑ جاؤ

تعداد :۔ آٹھ سے چالیس تک۔

جگہ :۔ صحن یا میدان
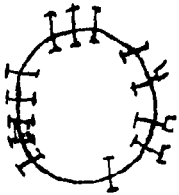
طریقہ :۔ ایک دائرے میں کم از کم تین تین فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہو جاؤ۔ ایک لڑکا دائرے کے گرد دوڑنا شروع کرے۔ دوڑتے دوڑتے پیچھے سے کسی ایک کھلاڑی کو چھوئے اور خود دائرے کے گرد بھاگنا جاری رکھے۔ اب یہ دوسرا کھلاڑی تیسرے کو چھوئے اور اپنی دوڑ جاری رکھے۔ تیسرا اس کے پیچھے دوڑے اور پہلے کی طرح چوتھے کو چھوڑ کر کھیل جاری رکھے۔ ہر دوڑنے والا جس کو چھوئے اس کی جگہ پر ایک دفعہ دائرے کے گرد دوڑ کر کھڑا ہو جائے اس طرح کھیل جاری رہے۔

احتیاط :۔ (۱) چھوتے وقت ہاتھ زور سے نہیں مارنا چاہیے۔

(۲) دوڑنے والا جلد ہی دوسرے کو چھوئے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں سات آٹھ کھلاڑی دائرے کے گرد دوڑتے ہوتے ہیں۔ اس سے کھیل میں بہت دلچسپی رہتی ہے۔

۲۔ تم کہاں ہو؟

تعداد :۔ آٹھ سے چالیس۔

جگہ :۔ کمرہ، صحن یا کھیل کا میدان
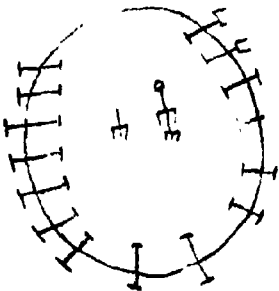
طریقہ :۔ کھلاڑی دائرے میں کھڑے ہو جائیں۔ دو کھلاڑیوں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کو

دیکھ نہ سکیں - پھر دونوں دائرے کے اندر ایک دوسرے سے ہٹ کر کھڑے ہو جائیں۔ ایک کھلاڑی دوسرے سے پوچھے "تم کہاں ہو" دوسرا کھلاڑی جواب میں تالی بجائے - پہلا کھلاڑی تالی کی آواز پر چلے، اور اسے پکڑنے کی کوشش کرے - تالی بجانے والا تالی بجائے تو اپنی جگہ سے ہٹ جائے - اس طرح کھیل جاری رہے۔

احتیاط:- (۱) پٹی کس کر نہ باندھی جائے۔

(۲) پٹی اس طرح باندھی جائے کہ دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔

۴- اُٹھاؤ اور پیالے میں ڈالو

تعداد:- دس تا پچاس۔

جگہ:- آنگن یا کھیل کا میدان یا کلاس روم۔

طریقہ:- کھلاڑی دو قطاروں میں ایک دوسرے کے مقابل دو دو گز کے فاصلے پر بیٹھ جائیں۔ ہر قطار میں برابر کے کھلاڑی ہوں - ہر قطار میں ایک چھوڑ بیچ کا کھلاڑی اپنے ہاتھوں کو ملا کر پیالے کی طرح بنائے اور تھوڑا سا آگے بڑھا دے - لیکن قطار کے پہلے اور آخری کھلاڑی کو اپنے ہاتھوں کا پیالا نہیں بنانا چاہیے جب یہ ہو چکے تو ہر قطار کے ایک سرے پر چند معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھ دی جائیں۔ یہ چیزیں تعداد اور قسم میں یکساں ہوں۔

پھر ریفری کے حکم سے ہر قطار کا پہلا کھلاڑی ایک ایک چیز اُٹھائے اور اپنے ساتھ والے کھلاڑی کے پیالے میں رکھ دے۔ پھر پیالے والے کھلاڑی سے اگلا کھلاڑی اُس چیز کو اس کے پیالے میں سے اُٹھا کر اگلے کھلاڑی کے پیالے میں ڈال دے اس طرح کھیل جاری رہے - یہاں تک کہ ہر قطار کی سب چیزیں ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچ جائیں - جس قطار کی چیزیں پہلے پہنچیں گی وہ جیت جائے گی۔

احتیاط:- (۱) کھیل بہت تیزی سے کھیلنا چاہیے۔

(۲) تمام چیزیں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ایک کر کے پہنچانی چاہئیں۔

(۳) جو چیزیں استعمال کی جائیں - وہ زیادہ قیمتی نہیں ہونی چاہئیں اور نہ بہت چھوٹی ہوں۔

~ ۵ ~
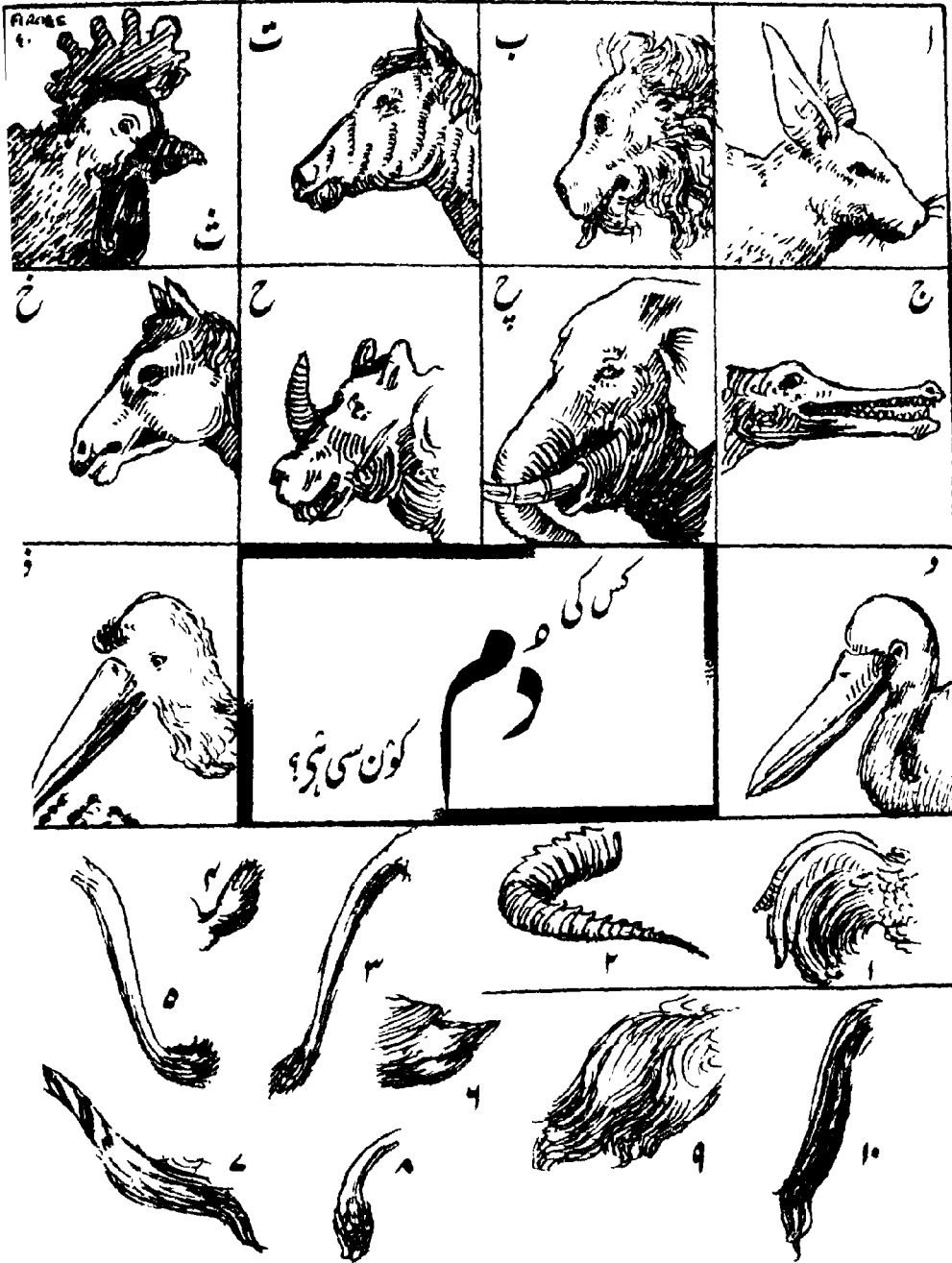
تصویر میں جتنے جانور موجود ہیں۔ ان کی دُمیں کون سی ہیں۔ ہر جانور کے حرف کے پاس اس کی ٹھیک دُم کا عدد لکھ دو۔

(ح۔م۔اسلم)

بُرے پھنسے

۱- ایک دن جبکہ بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ان بچوں نے آپس میں بازار چلنے کا مشورہ کیا اور ایک بڑی سی چھتری لگا کر خوشی خوشی بازار روانہ ہوگئے۔ ان کا خیال تھا کہ چھتری بھیگنے سے بچالے گی۔

۲- تھوڑی دور چلنے کے بعد انھیں خیال آیا کہ چھتری بڑی ہے کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ اس لئے دونوں نے چھتری کو مضبوطی سے پکڑ لیا ہے۔

۳- بارش زیادہ ہونے لگی۔ اور ہوا بھی تیز چلنے لگی۔ دل میں سوچ رہے ہیں بُرے پھنسے۔

۴- آندھی خوب زوروں پر ہے۔ لو بھی ان کی چھتری ہی اُلٹ گئی۔ ارے چھتری میں تو ہوا بھر گئی جو انھیں آگے کو کھینچ رہی ہے۔ کبھی تمھیں بھی ایسا تجربہ ہوا ہے۔

محمود حسن بجنوری

پیاری بچیو اور بچو۔ خوش رہو اور تندرست۔ ان صفحوں تک پہنچتے پہنچتے تم نے اپنے سالنامے کے بہت سے مضمون پڑھ ڈالے ہوں گے کہو، کچھ پسند بھی آئے۔ بھئی ہم نے تو اپنی سی بہت کوشش کی کہ یہ تحفہ تمھارے لئے سچ مچ اتنا اچھا ہو کہ تم دیکھتے ہی پھڑک اٹھو۔ آج کل تمھیں معلوم ہے کہ حالات کیسے نازک ہیں اور دوسرے رسالے اور اخبار کتنی کفایت شعاری سے کام لے رہے ہیں۔ پھر بھی ہم نے خرچ کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ اور پورے سو صفحے کا رسالہ نکال دیا۔ لیتھو اور بلاک کی اتنی بہت سی تصویریں شائع کیں۔ باتصویر مضمون شائع کئے یہ بات بچوں کے کسی رسالے میں تمھیں شاید ہی ملے۔ اچھا بھئی اگر تمھیں اپنا سالنامہ پسند آگیا تو ہم تم سے ایک درخواست کریں گے۔ اور وہ یہ کہ یہ سالنامہ تم اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو دکھاؤ اور انھیں جیسے بھی بن پڑے پیام تعلیم کی خریداری پر آمادہ کرو۔ ہمارے پیامیوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ اگر سب نے کوشش کر ڈالی تو بات کہتے میں کئی ہزار خریدار پیدا ہو جائیں گے اور اتنے خریدار پیدا ہو گئے تو پیام تعلیم کے عام نمبر بھی ایسے شان دار نکلیں گے کہ تم حیران رہ جاؤ گے۔ اور سالنامے کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ جو پیامی سب سے زیادہ خریدار بنائیں گے۔ انھیں ہم بہت اچھا سا انعام بھی دیں گے۔ ۲۵ فروری تک ہم اس کی مدت مقرر کرتے ہیں۔

معما نمبر ۲ کے صحیح حل ان بچوں نے بھیجے ہیں

صحیح حل — اوّل انعام — فی کس عہ

۱۔ منظور علی — راجپوتانہ
۲۔ محمد محمود خاں — کلکتہ
۳۔ فہیم جہاں بیگم — آگرہ
۴۔ عبد اللہ خاں — گوالیار
۵۔ مرزا اسکندر بیگ — گورکھپور

ہر ایک کے حساب میں کل عہ پڑتے ہیں۔ ان سب کو انعام بھیج دیا گیا ہے

ان بچوں کے حل میں ایک غلطی ہے

۱- مقبول احمد ساگر ۲- وارث رشید قدوائی دہلی ۳- احمد حسن لکھنؤ ۴- عبدالکریم بسمت نگر ۵- منہاج حسین میرٹھ ۶- محمد حسن لکھنؤ ۷- جمیل اختر امرتسر ۸- کنور محمد عزاد آر حسین دیوگاؤں اسٹیٹ ۹- حامد شاہ خاں رامپور ۱۰- مس اسمٰعیل کالی کٹ ۱۱- رحیم الدین دہلی ۱۲- سید منصور حسین، دہلی ۱۳- سلطان احمد اللہ والا دہلی ۱۴- ابرار احمد فاروقی تھولینڈی ۱۵- عبدالوحید دہلی ۱۶- محمد مجیب الرحمٰن خاں شروانی حبیب گنج ۱۷- محمد ظفر الہدیٰ بہاری دہلی ۱۸- عبدالجلیل عزیزی ۱۹- مس شمیم حفیظ احمد حیدرآباد دکن ۲۰- احمد نور اوجین ۲۱- طاہرہ صدیقہ ایوت محل ۲۲- محمد عزیز کھریانواں ۲۳- محمد خالد دہلی ۲۴- سید محفوظ الرحمٰن استھانواں ۲۵- افضال احمد ساگر ۲۶- اعجاز احمد نئی دہلی۔

ہر ایک کے حساب میں کوئی پونے تین آنے پڑتے ہیں۔ اتنے کم داموں کا انعام کیا بھیجیں۔ یہ بچے سالنامے کے معمے کے چار حل مفت بھیج سکتے ہیں۔ مگر اس بات کا حوالہ ضرور دیں کہ پچھلے حل میں ہماری ایک غلطی آئی تھی۔ اور ہاں اپنا نمبر بھی لکھیں۔ نمبر وہی جو اس وقت ہر ایک نام کے ساتھ ہے

نئے سال کی خوشی میں ہم نے معمے کا انعام بڑھا دیا ہے۔ یعنی صحیح حل بھیجنے والوں کے لئے بجائے چھ کے دس روپئے کردئے ہیں۔ اور ایک غلطی والوں کے لئے بجائے چار کے چھ روپئے۔ معما بنانے اور جانچنے والے صاحب نے ایک اعلان کی ہمیں اور اجازت دی ہے۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ لفافے کی قیمت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے کئی بچے ایک ہی لفافے میں اپنے حل بھیج سکتے ہیں۔ اور ہاں اس مرتبہ انھوں نے مدت بھی بڑھا دی ہے۔ یعنی بجائے پندرہ کے پچیس[۲۵] کر دی ہے۔

بعض بچوں نے ہمیں شکایت لکھی ہے۔ کہ اکثر انھیں اپنے سرپرستوں یا استادوں کے تصدیقی دستخط حاصل کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ جن بچوں کو یہ مجبوری ہو وہ بغیر دستخط کے اپنے حل بھیج سکتے ہیں۔

تمھیں یہ سن کر خوشی ہو گی کہ کرنول (مدراس) کے پیامیوں نے اپنے یہاں برادری قائم کر لی ہے۔ برادری کے دو جلسے بھی ہو چکے ہیں۔ پہلا جلسہ عہدے داروں کے انتخاب کا تھا۔ چاء وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا تھا عالی جناب حضرت سید ظہور اللہ حسینی صاحب۔ وائس پرنسپل اسلامیہ عربیہ کالج سرپرست منتخب ہوئے۔ جناب سید مرتضیٰ قادری صاحب ہادی لکچرر اسلامیہ عربیہ کالج صدر۔ سید عبدالستار ثریا ناظم اور شیخ محمود صدیقی نائب ناظم۔ دوسرے جلسے میں مشیرالدین احمد صدیقی نے کلام پاک کی تلاوت سے جلسے کی ابتدا کی۔ محمد شریف نے نعت پڑھی۔ ناظم نے پچھلے جلسے کی روداد سنائی رشید بیگ اور محمد حسین نے کوشش پر مضمون پڑھے۔ شیخ محمود صدیقی اور سید ابراہیم خلیل نے اپنی تقریروں میں بتایا کہ ہم پیام برادری کو کس طرح کامیاب بنا سکتے

ہیں۔ جناب صدر نے اپنی افتتاحی تقریر میں پیامیوں کو بہت سی مفید باتیں بتائیں۔

ہم کرنوں کے پیامیوں کو اس بات پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ امید ہے کہ برادری ان عزیزوں کی علمی اور تعلیمی ترقی میں بہت کچھ مدد کرے گی۔

کچھ عرصے سے پیام برادری کی سرگرمیاں ذرا ہلکی پڑ گئی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ برادری کی ممبری کی شرط سولہ سال تک کی عمر ہے۔ بہت سے پیامی اس حد سے نکل گئے ہیں۔ اور کچھ تو ایسے ہیں جو اسکول چھوڑ کر کالجوں میں پہنچ گئے ہیں۔ تاہم پیام تعلیم اور پیام برادری سے ان کی دلچسپی اور تعلق اسی طرح ہے۔ ایسے پیامیوں کے لئے ایک تجویز میرے ذہن میں آئی ہے۔ اور وہ یہ کہ اس عمر کو پہنچنے کے بعد وہ برادری کو اپنے چھوٹے بھائیوں کے ہاتھ میں دے دیں۔ اور خود اپنے لئے پیام کلب کے نام سے ایک انجمن بنالیں۔ اس طرح ان کی دلچسپیوں میں زیادہ وسعت کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ چھوٹی برادری کی نگرانی اور ہدایت بھی انھی کے ذمے ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ پیامی اس مسئلے پر غور کر کے اپنے مشورے سے مجھے مطلع کریں گے۔

ہمارے محترم بھائی جناب مولوی محمد شفیع الدین صاحب نیر کی تجویز ہے۔ کہ بچوں کی نظموں کی طرح چھوٹے بچوں کے مضمون بھی پیام تعلیم میں چھپنے چاہئیں۔ میرے خیال میں یہ تجویز بہت اچھی ہے۔ پیام تعلیم کے چار صفحے اس کے لئے خاص کئے جا سکتے ہیں۔ مگر مضمون زیادہ سے زیادہ ایک صفحے کے ہوں۔ بہت صاف اور خوش خط۔ ہر سطر کے بعد ایک سطر اصلاح کے لئے چھوٹی ہوئی۔

اچھا بھئی! آج میں نے تم سے بہت باتیں کر ڈالیں تم بھی اکتا گئے ہو گے۔ اب انشاء اللہ پہلی مارچ کو ہماری تمھاری ملاقات ہو گی۔ اس لئے کہ فروری میں تو تمھارا پیام تعلیم چھپے گا نہیں۔ ہاں چلتے چلتے ایک بات اور کہہ دوں۔ سالنامے کے بارے میں تم اپنی رائے مجھے ضرور لکھنا بھولنا مت!

تمھارا

محمد حسین حسان

یہ پرچہ جنوری و فروری کا مشترکہ نمبر ہے اگلا پرچہ مارچ میں نکلے گا۔ منیجر

معما نمبر ۱۵

پہلا انعام عـ۵ـہ ر

دوسرا انعام ـ۶ـہ ر

مشقی کوپن

۵ ا	۴	■	ک	۳ ر	۲ ا	ب	۱ م
ن	■	۷ ر	■	و	۶	■	
	■	ت		۹ س	■	۸	■
ا	۱۲ ی	۱۱	■		■	ک	۱۰
م	۱۶	■	۱۵	■	۱۴	ر	۱۳ ن
■	و	■	د		۱۷ و	■	
۲۰	■	۱۹	۱۸ ن	■	ب	■	و
ر		د	ہ	۲۲	■		۲۱ ر

اشارات

دائیں سے بائیں

۱۔ ہماری طرف سے تمام پیامیوں کو نیا سال ...... ہو۔
۴۔ .. دا ــ آبا کے آبا۔
۶۔ بلانے کا اشارہ۔
۹۔ اگر استاد .... ہے تو اکثر طلبا اس سے ناخوش رہتے ہیں۔
۱۰۔ ایک
۱۱۔ ہر ... سال ایک انقلاب لے کر آتا ہے۔
۱۳۔ بے میل
۱۹۔ ماں
۱۷۔ ... جس دل میں ہو اس دل کی دوا بن جاؤں
کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں — افسر
۱۸۔ .. نقد نہ تیرہ اُدھار۔
۲۱۔ شطرنج کا ایک مہرہ
۲۲۔ آج کل ..... وہی ہے جو تن من دھن سے اپنے ملک کی خاطر قربان ہو جائے۔ (بے ترتیب)

اُوپر سے نیچے

۱۔ چالیس سیر کہہ لو یا ایک ..
۲۔
۳۔ ..... انقلاب مزدوروں نے کیا تھا۔
۵۔ معما حل کرتے ہی اس کی فکر ہو جاتی ہے۔
۷۔ اکبر کے نو ... مشہور ہیں۔
۸۔ مصیبت میں گنہگار بھی خدا کا ... کرنے لگتا ہے۔
۱۰۔ چمن کا موتیا .....
۱۲۔ سچی ... وہی ہے جو دل سے کی جائے۔
۱۴۔ بے ... بے نصیب با ... بانصیب
۱۵۔ آزادی کی قربان گاہ پر سینکڑوں بھینٹ چڑھ رہے ہیں
۱۹۔ معما صحیح حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہر اشارہ .... تین بار ضرور پڑھا جائے۔ (اُلٹا)
۲۰۔ اگر کسی پرند کا ... کاٹ دیا جائے تو وہ اُڑ ہی کیا سکتا ہے۔

۱- معما بجائے پندرہ کے پچیس[۲۵] جنوری تک بھیج سکتے ہو۔
۲- ایک ہی لفافے میں کئی بچے حل بھیج سکتے ہیں۔
۳- لفافے کی قیمت اب پانچ پیسے ہو گئی ہے۔

قواعد

(۱) تمام مدرسوں کے بچے حل میں حصہ لے سکتے ہیں۔ استاد یا سرپرست کی تصدیق ضروری ہے۔ صرف دستخط کافی ہیں، عبارت لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) ایک حل کے ساتھ ایک آنے کا ٹکٹ آنا ضروری ہے۔

(۳) ایک سے زیادہ حل بھی بھیجے جا سکتے ہیں۔ چار حلوں کی رعایتی فیس ۳ر ۔ حلوں کی ہے۔

(۴) دونوں انعام تقسیم کر دیے جائیں گے قرعہ اندازی نہ ہو گی۔

(۵) تمام حل ۱۵ر جنوری ۱۹۶۱ء تک دفتر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ دہلی پہنچ جانے چاہئیں

(۶) ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہو گا۔

(۷) پیام میں چھپے ہوئے کوپن کے علاوہ اور کوئی کوپن نہیں لیا جائے گا۔

(۸) کوپن کے چاروں طرف جو نقطے والی لائن ہے۔ وہاں سے کاٹ کر بھیجو۔

(۹) کسی کوپن میں کوئی حرف کٹا یا مٹا ہوا ہو گا یا پنسل سے بھرا ہوا ہو گا تو مقابلے میں شامل نہ کیا جائے گا

(۱۰) ایک لفافے میں صرف ایک نام سے معمے آنے چاہئیں۔

(۱۱) علاوہ کوپن اور ٹکٹ کے لفافے میں کوئی خط وغیرہ نہ ہونا چاہیے

(۱۲) معما حل کرنے سے پہلے اشارے غور سے پڑھو

(۱۳) ایک خانے میں دو حرف نہ ہوں۔

(۱۴) ڈال اور واؤ کا فرق نمایاں ہو۔ (ڈ ۔ و)

(۱۵) چھوٹی اور بڑی ے کا فرق لازمی ہے (ی ۔ ے)

(۱۶) جہاں جہاں نقطے کا استعمال ہو وہاں نقطہ ضرور ہونا چاہیے

(۱۷) املا کی غلطی بھی غلطی شمار کی جائے گی۔

(۱۸) تمام حل ڈاک خانے کے لفافے پر بھیجے جائیں

(۱۹) نام اور پورا پتہ صاف اور خوش خط لکھو۔

(۲۰) پتہ: سب ایڈیٹر پیام تعلیم مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ نئی دہلی

169195 96
22.1

معما نمبر ۱۴ کا صحیح حل

۵ ح	۴ ب	■	۳ د	ا	۲ ز	۱ ا
ن	۸ م	■	ع	■	ن	۶ ج
ج	■	۹ ل	ا	ش	■	■
ا	م	۱۱ ہ	■	ا	ف	۱۰ خ
■	■	ر	۱۳ ق	۱۲ س	■	س
۱۷ ب	۱۶ ل	■	ن	■	۱۵ ط	۱۴ ر
و	د	ر	۱۹ ا	■	ا	۱۸ و